امامِ اہلِ سنّت

حضرت علّامہ محمّد عبد الشکور فاروقی لکھنوی ؒ

حیات و خدمات

پروفیسر محمد عبد الحیّ فاروقی

ادارہ تحقیقاتِ اہلِ سنّت

امام اہل سنت

حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی لکھنوی رح

حیات و خدمات

مصنف

پروفیسر محمد عبدالحیٔ فاروقی

سابق صدر شعبہ مطالعات اسلامیہ

جامعہ ہمدرد نئی دہلی

ادارہ تحقیقات اہل سنّت

بلال پارک، بیگم پورہ، لاہور

میں بڑے ادب واحترام کے ساتھ

اس کتاب کا

انتساب

کرتا ہوں

والد مرحوم کے نام

جنھوں نے نہایت دلسوزی اور ایثار وقربانی کے ساتھ مجھے پڑھایا لکھایا، ادب وتمیز سکھائی، اچھے وبُرے کی پہچان کرائی اور اپنے عمیق تجربوں کی روشنی میں مجھے شاہراہِ زندگی پر رواں دواں رہنے کی تربیت دی اور جب میں کسی قابل ہوا تو خود اُس سفر پر روانہ ہوگئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا

اور

والدۂ مرحومہ کے نام

جنھوں نے ہر طرح کے دُکھ درد اُٹھا کے مجھے پالا پوسا اور پرورش کیا، جن کی ذات میرے لیے ہمیشہ ایک شجر سایہ دار بنی رہی اور جن کی دعائے نیم شبی نے میری رُوح کی گہرائیوں میں سوز وگداز، دین کی تڑپ اور رسولؐ واصحابِ رسول کی بے پناہ محبت وعقیدت کی شمع روشن کی۔

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا

فہرست مضامین

دوسرا باب ۷۴

(پیدائش، تعلیم وتربیت اور نکاح)

تیسرا باب ۸۷

(اخلاق وعادات، طرزِ معاشرت اور اسفارِ حج)

چوتھا باب ۱۰۱

(زہد وتوکل، عبادت وریاضت اور معمولاتِ روز وشب)

پانچواں باب ۱۱۳

(درس وتدریس اور مختلف اداروں سے تعلق)

چھٹا باب

(ماہنامہ علم الفقہ اور رسالہ النجم کا اجراء)

آٹھواں باب
(سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ اور ہندوستان)

نواں باب
(بیعت وارشاد، تعلیمات اور اصلاح باطن)

دسواں باب ۱۹۳

(اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کا دینی وسماجی پس منظر)

گیارہواں باب ۲۱۳

(شیعہ سنّی اختلافات اور تحریک مدح صحابہ کا آغاز)

بارھواں باب ۲۳۰

(پگٹ کمیشن کا قیام)

پندرہواں باب ۲۸۵

(تحریک مدح صحابہ کی یوپی اسمبلی میں گونج، آئینی کمیٹی اور انجم کی خاموش مساعی)

سولہواں باب ۳۰۰

(السپ کمیشن کا قیام)

سترہواں باب ۳۱۲

(کمیشن رپورٹ اور اس کی سفارشات کا مسلم عوام پر اثر)

اٹھارہواں باب ۳۲۶

(جلوس مدح صحابہ کی اجازت)

اُنیسواں باب ۳۴۳
(شیعی تبرا ایجی ٹیشن)

بیسواں باب ۳۴۲
(تحریک مدح صحابہ اور اس کے اثرات ونتائج)

اکیسواں باب ۳۶۶
(مناظرے ومباحثے)

بائیسواں باب ۴۸۰

(تصنیفات وتالیفات وتراجم)

تیئیسواں باب ۵۹۲

(مخصوص افکار ونظریات)

چوبیسواں باب ۶۲۹

(تردید شیعیت)

پچیسواں باب ۶۷۳

(وفات، تکفین و تدفین اور اولاد و احفاد)

چھبیسواں باب

ستائیسواں باب ۷۳۱

(منظوم خراج عقیدت)

فہرست مشاہیر جن کے مختصر حالات حواشی میں درج ہیں

فہرست مقامات مختلفہ

پیش لفظ

از: مرتب

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله و کفیٰ و سلام علیٰ عباده الذین اصطفیٰ

اللہ ربّ العزت کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ اس نے اس کتاب کو اتنی مقبولیت بخشی کہ اب اس کا یہ دوسرا ایڈیشن نظرِ ثانی اور مزید اضافوں کے ساتھ پہلے سے بہتر اور خوبصورت انداز میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن سالہا سال کی محنت شاقہ اور شب و روز کی تگ و دو و جانکاہی کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچا تھا۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی و کم سوادی کی بنا پر اس کا پورا احساس ہے کہ یہ کتاب امام اہلسنّت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کی عظیم الشان دینی و اصلاحی خدمات کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ان کا حق ادا ہو سکا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اپنی بساط اور محدود وسائل کو دیکھتے ہوئے جتنا کچھ ہو سکتا تھا اس سے ذرا بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ ان سب کے باوجود اگر اس کتاب میں کوئی کمی یا خامی نظر آئے تو اس کو مرتب کی بشری معذوری پر محمول کیا جائے۔ حضرت لکھنویؒ کا وصال اپریل ۱۹۶۲ء میں ہوا تھا مگر اب تک ان کی حیات و خدمات پر کوئی مکمل و مبسوط کتاب منظر عام پر نہیں آ سکی جبکہ یہ کام آج سے پچیس تیس سال پہلے ہی مرتب ہو کر شائع ہو جانا چاہیے تھا۔ اس بات کو اب تک ایک اتفاق ہی تصور کیا جا رہا تھا مگر درحقیقت یہ سب کچھ قادر مطلق کی طرف سے ایک طے شدہ غیبی نظام کے تحت ہو رہا تھا کیونکہ یہ خدمت اس نے اس ناچیز مرتبِ کتاب کے حق میں مقرر کر رکھی تھی:

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

جنوری ۱۹۶۷ء میں والدی الماجد حضرت مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ کے انتقال کے

بعد راقم کا مستقلاً لکھنؤ سے دہلی آ کر قیام ہو گیا۔ ابھی یہاں کے ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ۱۹۷۳ء میں عم اکبر حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ کا بھی لکھنؤ میں وصال ہو گیا۔ اس طرح چند برسوں کے اندر خاندان کے کئی ذمہ دار بزرگ اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ ان پے در پے حوادث کی بنا پر احساس ہوا کہ اسلاف کے بارے میں جاننے اور بتانے والے بڑی جلدی جلدی دنیا سے اُٹھتے جا رہے ہیں اور اگر یہی رفتار رہی تو ہماری آئندہ نسلیں اپنے اکابر کے کارناموں سے واقف نہ ہو سکیں گی۔ اس طرح ان حالات نے دل میں اس کتاب کے مرتب کرنے کا داعیہ پیدا کر دیا تاکہ ماضی کی حقیقتیں حال کے ہاتھوں سے مستقبل تک پہنچائی جا سکیں۔ اس خیال کا تذکرہ میں نے سب سے پہلے اپنی والدہ مرحومہ سے کیا جنھوں نے بے حد مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مجھے فوراً کام شروع کر دینے کی ہدایت دی۔ اب مسئلہ یہ پیش آیا کہ میں وطن سے کوسوں دور دہلی میں اور اس کام سے متعلق ساری کتابیں اور معاون چیزیں سب لکھنؤ میں تھیں چنانچہ میں نے لکھنؤ کا سفر کیا اور وہاں اپنے دوسرے اکابر سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے بھی میری حوصلہ افزائی کی اور ہر طرح کے تعاون کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد سے اب جلد جلد میرا لکھنؤ کا سفر ہونے لگا اور وہاں دارالمبلغین کے کتب خانہ میں بیٹھ کر النجم کی پرانی فائلیں، حضرت مولاناؒ کی تصانیف اور اعزہ کے گھروں کے پرانے اور بوسیدہ کاغذات کے ذخائر کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ یہ تمام ریکارڈ اتنے زیادہ خستہ اور کمزور حالت میں تھے کہ ان سے استفادہ کرنا بھی بڑا صبر آزما کام تھا لیکن اب میرا معمول ہو گیا تھا کہ سال میں دو تین بار محض اسی مقصد سے لکھنؤ جایا کرتا تھا اور بجائے اس کے کہ اعزہ سے ملاقاتیں ہوتیں میں قدیم اور کرم خوردہ کتابوں کی ورق گردانی کرتا تھا اور جو کاغذات کے ذخیرے دوسروں کی نگاہوں میں پرانے اور بے مصرف ہو چکے تھے ان کے منتشر ٹکڑوں کو جمع کیا کرتا تھا۔ میرے اس جنون اور بظاہر سعیٔ لاحاصل پر اکثر حضرات خندہ زن ہوا کرتے تھے لیکن میں نے اپنی اسی دُھن اور لگن سے انھی پرانے کاغذات کے ذخیرے سے بیش قیمت ہیرے و جواہرات حاصل کر لیے جو آج اس کتابی شکل میں پیش ہو رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مجھے لکھنؤ کے علاوہ دیوبند، امروہہ، مرادآباد، الہ آباد اور پٹنہ کے بھی علمی سفر اور متعدد اہل علم و باخبر حضرات سے روابط قائم کرنا پڑے ہیں۔ اس کام میں جو ذہنی اور دماغی توانائی صرف کرنا پڑی اور جس طرح اپنے قیمتی اوقات کا استعمال کرنا پڑا ہے

اس کا صحیح اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جن کو تصنیف و تالیف کا ذوق ہے۔ ایک عرصہ تک اسی مشغلہ کو میں نے اپنا مقصد وحید اور اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اسی کے تکملہ میں روز و شب مصروف رہا۔ میں نے اس کتاب کی تکمیل انتہائی محنت اور جاں گسل جدوجہد کے ساتھ کی ہے اور اس میں نہ جانے کتنے مقامات پر آنسوؤں کے دریا بہائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بے پایاں احسان ہے کہ آج نہ صرف اس کتاب کی تکمیل ہوئی ہے بلکہ اس کا یہ دوسرا نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن بھی اشاعت پذیر ہونے جارہا ہے۔

اس کام کے آغاز سے لے کر اب تک مجھے حضرت لکھنویؒ پر لکھے گئے صرف چند مختصر مضامین ہی دستیاب ہو سکے ہیں، کوئی مستقل کتاب یا کوئی اور دوسری ایسی تفصیلی دستاویز حاصل نہیں ہو سکی جس سے سوانح نگاری میں کچھ مدد ملتی۔ اس سلسلہ میں جو کچھ تحریری شکل میں ہماری نظر سے گذرا ہے اس کی مختصر فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔ سب سے پہلا کام وہ چند ورقی خودنوشت حالات ہیں جنھیں حضرت لکھنویؒ نے شجرۂ طیبہ میں خود لکھ کر ۱۹۴۵ء میں اپنے متوسلین کے لیے شائع کیے تھے۔

۲۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے مئی ۱۹۶۲ء کے الفرقان لکھنؤ میں حضرتؒ کی وفات کے بعد فوراً ایک تعزیتی اور تاثراتی مضمون شائع کیا تھا۔ ایک عرصہ تک آپ کے حالات میں یہی مضمون ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسی مضمون کو جناب مولانا قاضی مظہر حسین صاحب چکوال ضلع جہلم (پاکستان) نے اپنے تعزیتی نوٹ کے ساتھ ۱۹۸۰ء میں ایک کتابچے کی شکل میں شائع کر دیا تھا۔

۳۔ والدی الماجد حضرت مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ نے حضرت کی سوانح مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس کی دو تین قسطیں بھی اپنے ہفت روزہ اخبار حرم لکھنؤ میں ۱۹۶۴ء میں شائع کی تھیں جس کی عوام و خواص دونوں میں بڑی پذیرائی ہوئی تھی کیونکہ اس وقت حضرت لکھنویؒ کی وفات کو صرف سال ڈیڑھ سال کا عرصہ ہی گذرا تھا اور لوگوں کے دلوں میں ان کی یادیں تازہ تھیں اور ان سے محبت و تعلق رکھنے والے حضرات بھی حیات تھے مگر اپنی مسلسل خرابی صحت کی بنا پر وہ اس کام کو آگے نہ بڑھا سکے یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد اخبار حرم بھی بند ہو گیا اور خود وہ بھی جنوری ۱۹۶۷ء میں اپنی حیاتِ مستعار پوری کر کے

مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

۴۔ مزید برآں انھوں نے حرم کا ایک خصوصی نمبر امام اہلسنّت نمبر کے نام سے بھی ۱۹۶۴ء میں نکالا تھا جس میں حضرت مولاناؒ پر بعض بڑے اہم مضامین شائع کیے تھے جو ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔

۵۔ مولانا حکیم سیّد عبدالحی حسنی صاحبؒ نے اپنی مشہور زمانہ تالیف نزہۃ الخواطر، جلد ہشتم، حیدرآباد، ۱۹۷۰ء میں حضرتؒ کے مختصر حالات لکھے تھے جس کا تتمہ ان کے فاضل خلف اور جانشین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے قلم سے لکھ کر مکمل کیا ہے۔

۶۔ حکیم نثار احمد علوی کاکوروی مرحوم متوطن کراچی نے اپنی کتاب سخنورانِ کاکوری میں بھی حضرت پر چند ورقی حالات و تاثرات تحریر کیے تھے جو ۱۹۷۱ء میں کراچی سے شائع ہوئے تھے جس کے کچھ مندرجات خلاف تحقیق ہیں۔

۷۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے خود بھی اپنی تصنیف پرانے چراغ، حصہ دوم میں حضرت لکھنویؒ پر ایک مشاہداتی مضمون لکھ کر شائع کیا تھا جو ۱۹۸۰ء میں لکھنؤ سے اشاعت پذیر ہوا تھا۔

۸۔ ماہنامہ البدر کاکوری نے بھی ۱۹۸۱ء میں اپنا امام اہلسنّت نمبر نکالا تھا۔ اس نمبر کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس میں کچھ نئے مضامین کے علاوہ اب تک کے وہ تمام مضامین بھی یکجا کر کے شائع کر دیے گئے تھے جو مختلف خصوصی نمبروں، رسالوں اور کتابوں میں شائع ہو چکے تھے۔

یہ خلاصہ ہے اب تک کے ان کاموں کا جو حضرت لکھنویؒ پر ہوئے تھے۔ ہمیں ان مضامین سے اتنا تو ضرور فائدہ پہنچا کہ جو معلومات ہمیں پہلے سے حاصل تھیں ان کی مزید تصدیق و تائید ہو گئی اور جو نئی معلومات حاصل ہوئیں انھیں ہم نے بلا تامل حوالہ کے ساتھ اپنا لیا ہے۔

مذکورہ بالا مضامین ایک کتاب لکھنے کے لیے قطعاً ناکافی تھے لیکن پھر بھی ان سے استفادہ کیا گیا۔ اس کام کو شروع کرنے کے بعد تسلسل سے انجام نہیں دیا جا سکا بلکہ اپنے فرائض منصبی اور دیگر مصروفیات کے باعث اس میں تاخیر و تعویق بھی ہوتی رہی اور بعض بعض زمانے میں تو مہینوں اور برسوں اس میں تعطل رہا یہاں تک کہ ایسے حالات بھی پیدا ہوئے کہ اس کے تکملہ کا

تصور بھی ذہن سے نکل گیا مگر اللہ تعالیٰ میری والدہ مرحومہ کی قبر کو اپنی رحمتوں سے معمور کرے جو اپنے بار بار کے تقاضوں اور پیہم اصرار سے مجھے پھر اس کام کو مکمل کرنے کے لیے آمادہ کرتی رہیں۔ ان کے علاوہ میرے بعض خاندانی اکابر اور حضرتؒ سے عقیدت مندانہ تعلق رکھنے والے حضرات کی یاد دہانیاں بھی میرے خوابیدہ عزائم کو بیدار کرتی رہیں چنانچہ ۱۹۹۱ء سے میں اس کام میں اپنے مفوضہ فرائض سے عہد برآ ہوتے ہوئے پھر ہمہ تن مصروف ہو گیا جس کے نتیجہ میں آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس عرصہ میں اس کتاب سے دلچسپی رکھنے والے منتظر و مشتاق نہ جانے کتنے حضرات اس دنیا سے رخصت ہو گئے حتیٰ کہ میری والدہ صاحبہ کی وفات بھی ۱۹۹۱ء میں ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت کاملہ فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

اس کتاب کو ۲۷، ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدائی چند ابواب حضرتؒ کے وطن، خاندان اور تعلیم و تربیت جیسے ذاتی احوال پر مشتمل ہیں، اس کے بعد چند ابواب تحریک مدح صحابہؓ سے متعلق ہیں، اس تحریک کو حضرت مولاناؒ نے اپنے رفقاء کے ساتھ بڑی قربانیوں اور قید و بند کی صعوبتوں کے ساتھ چلایا تھا۔ ایک خاص بات یہاں ذکر کرنا ضروری ہے کہ میں نے اس کتاب میں تحریک مدح صحابہؓ کی تاریخ مرتب کرنے کی سعی نہیں کی ہے بلکہ اس کو ایک ضمنی درجہ میں رکھا ہے کیونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور اس کے لیے پوری ایک تصنیف کی ضرورت ہے۔ سردست اس کتاب میں اس تحریک کو ۱۹۴۷ء تک ہی محدود رکھا گیا ہے اور صرف انھی واقعات کو شامل کیا گیا ہے جن کا براہِ راست تعلق حضرت مولاناؒ کی ذات سے تھا کیونکہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے مولاناؒ نے بر بنائے پیری و کبر سنی تقریباً گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ کتاب کے آخری ابواب بہت اہم ہیں۔ انھی میں حضرتؒ کے مناظرے، تصنیفات و تالیفات اور مختلف مسائل پر آپ کی تحقیقات عالیہ اور افکار و نظریات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مناظروں اور تصنیفات کے یہ ابواب نسبتاً کچھ ضخیم بھی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے اکثر مناظروں کی کچھ تفصیلات بھی دے دی ہیں جن میں ان کے موضوعات اور فریق مقابل کے اعتراضات پر مولاناؒ کے جوابات کا خلاصہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح تصنیفات کے باب میں تصانیف کے موضوعات اور ان کی اہمیت و افادیت پر بھی مختصراً اظہار خیال کیا گیا ہے، اسی لیے صرف کتابوں اور تراجم کے نام ہی تحریر کر دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے۔ اب یہ کتابیں اور مناظروں کی رودادیں نایاب ہوتی جا رہی ہیں لہٰذا اس کی

تلافی اسی طرح ہوسکتی تھی کہ کم از کم ان کا خلاصہ ہی لکھ کر محفوظ کر دیا جائے۔ کتاب میں ایک باب مولاناؒ کی باقیات صالحات اور ایک باب آپ کے معاصرین کے افکار و خیالات سے بھی متعلق ہے جن سے آپ کے کاموں کی اہمیت اور ان کے مفید اثرات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ کتاب میں اس بات کا بھی التزام رکھا گیا ہے کہ جن موافق اور مخالف شخصیات کا کہیں ذکر آیا ہے وہیں حاشیہ میں ان کے مختصر حالات بھی دے دیے گئے ہیں تاکہ ناظرین ان سے بھی اجمالی طور پر واقف ہو جائیں البتہ جو حضرات بہت معروف ہیں ان پر کچھ لکھنا ضروری نہیں خیال کیا گیا ہے۔

پہلے عام طور سے ہجری سنہ ہی لکھے جاتے تھے مگر اس کتاب میں نئی نسل کی آسانی کے لیے انھیں عیسوی سنہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مقصد سے مولانا محمد ابرار حسین فاروقی گوپامویؒ کی مرتبہ تقویم عدد السنین والحساب کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن اس طرح کی مطابقت میں بعض اوقات کچھ تفاوت بھی ہو جاتا ہے اس لیے ممکن ہے کہ تھوڑا بہت فرق یہاں بھی محسوس ہو لہٰذا اس فرق کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

حضرت لکھنویؒ نے اپنا میدان عمل نہایت سنگلاخ اور مشکل زمین کو بنایا تھا۔ کسی مصنف کے لیے مثبت پہلوؤں پر خامہ فرسائی کرنا بہت آسان ہوتا ہے مگر تردیدی اور منفی پہلو پر کام کرنا بڑا دشوار کام ہے، اس میں فریق مقابل کے مذہب و مسلک سے متعلق لٹریچر پر کامل عبور ہونا بے حد ضروری ہے، جب تک یہ قدرت نہ ہو کسی مقابلہ کی دنیا میں کامیاب نہیں ہوا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے مولاناؒ کی تخلیق ہی محض اس قسم کے کاموں کے لیے ہی کی تھی چنانچہ ان کی زبان و قلم سے وہ حکیمانہ کارنامے انجام پائے ہیں جنھیں اہل ایمان عرصہ تک یاد رکھیں گے۔ مولاناؒ نے اپنی تمام تحقیقات و تخلیقات بے کم و کاست عوام و خواص کے سامنے رکھ دیں۔ وہ مذہب اور عقیدہ کے سلسلہ میں مصلحت کوشی یا کسی قسم کی لگی لپٹی بات کہنے کے قائل نہ تھے۔ حق بات کے کہنے میں وہ بے حد جری اور نڈر تھے، اس کی پاداش میں مخالفین نے انھیں جو لسانی و قلمی ایذائیں پہنچائیں وہ اپنی جگہ پر تھیں مگر بعض اپنوں نے بھی ان کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ اپنے وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی تعلقات، دنیاوی مفادات اور وقتی مصالح کے پیش نظر دین کو ثانوی درجہ میں رکھتے تھے۔ ایسے لوگوں کو ضرور اس کتاب سے کچھ خوشی نہ ہو گی مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولاناؒ سے محبت و عقیدت رکھنے والے اور ان کے کاموں کی قدر کرنے والے ان

لوگوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں ان کو ضرور فرحت وانبساط اور طمانیت روح حاصل ہوگی اور ان کے قلب مومن سے ضرور دعاء خیر نکلے گی۔ فی الوقت ہماری اس کوشش کا ماحصل یہی ہے۔

حضرت مولاناؒ طبعاً انتہائی متین و سنجیدہ، خاموش طبع اور بڑے بُردبار و پُروقار عالم تھے، اپنی تحریروں اور تقریروں میں کبھی انھوں نے کسی کے خلاف کوئی اشتعال انگیز الفاظ استعمال نہیں کیے اور نہ ہی کسی کی ذاتیات پر کسی قسم کا حملہ کیا، ہمیشہ اپنے مخالف کو انھی الفاظ سے مخاطب کیا جن سے ان کے ہم عقیدہ لوگ انھیں مخاطب کیا کرتے تھے۔ یہ ان کا ایک امتیازی وصف تھا جس سے انھوں نے کبھی انحراف نہیں کیا۔ اس کتاب میں بھی مولاناؒ کی اس روش کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر ایک کی عزت وتکریم کا پورا لحاظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہم اپنی تحقیقات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے بعد برصغیر میں مخالفین صحابہؓ کی مذہبی کتابوں کا جتنا عمیق مطالعہ انھوں نے کیا تھا شاید کسی اور نے نہیں کیا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ مخالف کی کتابوں ہی سے مخالف کو لاجواب بنایا ہے اور پھر ان کے بارے میں جو ان کا آخری اور دوٹوک فیصلہ ہے وہ برصغیر کی دینی تاریخ میں اوّلین فیصلہ ہے جس کو دوسروں نے بہت بعد میں آگے بڑھایا ہے۔ علامہ بحرالعلوم فرنگی محلیؒ کی ذات گرامی اس سلسلہ میں مستثنیٰ ہے، انھوں نے فریق مخالف کی صرف ایک کتاب کو دیکھ کر ہی اپنا فیصلہ صادر فرمادیا تھا۔

ایک بات کا بڑے دکھ کے ساتھ اظہار ضروری ہے کہ چونکہ مولاناؒ کی حیات وخدمات پر اب تک کوئی مفصل کام نہیں ہوا تھا غالباً اسی وجہ سے بعض حضرات نے ان کی تحقیقات کو بڑی بے دردی کے ساتھ استعمال کر کے انھیں اپنی ذاتی تحقیق ہونے کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے، پوری پوری عبارتیں انھی کے الفاظ میں نقل کر ڈالیں اور کہیں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ ہم اس کے سوا اور کیا کہیں کہ ہمارے قارئین اس سلسلہ میں اصل ونقل کا امتیاز ضرور پیش نظر رکھیں۔

اس کتاب کی تیاری میں ہندوستان کے مشہور ومعروف کتب خانوں اور لائبریریوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے جن میں خاص طور سے دارالمبلغین لکھنؤ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ، محمودیہ لائبریری ملحقہ دفتر جمعیۃ علماء ہند نئی دہلی، ڈاکٹر ذاکر حسین سینٹرل لائبریری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند اور حکیم محمد سعید سینٹرل

لائبریری، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی سے میں نے بڑا استفادہ کیا ہے۔ میں ان تمام کتب خانوں اور لائبریریوں کے ذمہ داروں کا تہہ دل سے ممنون اور شکر گذار ہوں۔

کچھ حضرات نے اپنے ذاتی ذخیرے سے مولاناؒ کے مکتوبات اور ان کی نقلیں مجھے عنایت فرمائیں جن میں فخر الاماثل محدث شہیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ، مولانا حافظ مغیث الدین صاحب الہ آبادیؒ اور پروفیسر حکیم سید مودود اشرف صاحب علی گڑھ کا میں تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ مولاناؒ کی بعض نادر کتابیں اور النجم کے بعض اہم شمارے عم محترم جناب مولانا عبدالمہیمن صاحب فاروقیؒ نے مجھے عنایت فرمائے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مجھے بعض قیمتی معلومات بھی فراہم کی تھیں۔ اسی طرح بعض خاندانی حالات بقید تاریخ وسنہ عم محترم حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ سابق مدیر ماہنامہ الداعی لکھنؤ و سابق مہتمم و بانی دارالعلوم فاروقیہ کاکوری ضلع لکھنؤ نے بھی مجھے مہیا کیے تھے اور اس سلسلہ میں مختلف مسائل میں میری رہنمائی فرمائی تھی، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزاء خیر عطا فرمائے اور مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

اس جدید ایڈیشن کے سلسلہ میں مجھے مندرجہ ذیل حضرات نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا ہے جن میں خاص طور پر عزیز گرامی مولانا عبدالعلی صاحب فاروقی مدیر ماہنامہ البدر و مہتمم دارالعلوم فاروقیہ، کاکوری ضلع لکھنؤ، مولانا مفتی سیّد محمد سلمان صاحب منصور پوری مرتب ماہنامہ ندائے شاہی و استاذ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد اور مقبول و مشہور ادیب و شاعر جناب تسنیم فاروقی صاحب لکھنوی قابل ذکر ہیں۔ میں ان سب حضرات کا ممنون ہوں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے ہمدردوں اور بہی خواہوں کا بھی تعاون مجھے حاصل ہوتا رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اچھے سے اچھا صلہ عطا فرمائے:

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیم صبح تیری مہربانی

ناچیز
عبدالحئی فاروقی

جامعہ ہمدرد، نئی دہلی،
اپریل ۲۰۰۲ء

کچھ اپنی سرگذشت

از مرتب

سپرد کس کو مرے بعد ہو امانت عشق
اٹھائے کون یہ بار گراں نہیں معلوم

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ ہمارے بعض علماء و مشائخ نے اپنے حالات خود بھی قلمبند کیے ہیں جن سے آج تذکرہ نگاروں کو اپنی تحقیقات میں بڑی مدد ملتی ہے۔ان خود نوشت تذکرہ نگاروں میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت میرزا مظہر جانجانان شہید دہلوی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین جیسے اکابر کے حالات ہمارے سامنے ہیں۔ان حالات میں کسی قسم کی کوئی تعلّی، خودستائی یا خودنمائی کے جذبہ کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ بعد کی نسلوں کو اس سے کچھ ہدایت، رہنمائی اور سبق ہی ملنے کی توقع کی جاتی ہے۔اسی مقصد کے پیش نظر ناچیز راقم الحروف کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ کچھ اپنے بھی منتشر حالات یکجا کر دیئے جائیں تاکہ شاید آئندہ ہماری نسلوں کو اس سے کوئی رہنمائی مل سکے۔

میری پیدائش میرے نانہال قصبہ ٹانڈہ ضلع امبیڈکر نگر (سابق ضلع فیض آباد یو پی) کے ایک معروف سادات خاندان میں ہوئی۔میرے نانا مولوی سید بشیر الدین صاحبؒ اپنے علاقہ کے خوشحال اور معزز زمینداروں میں تھے جو اپنے تقوی اور پرہیز گاری کی وجہ سے بڑی عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ان کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔میرےؒ والد ماجد حضرت مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ امام اہلسنّت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کے صاحبزادہ تھے جن کے تفصیلی حالات اس کتاب کے اندر آچکے ہیں۔

خاندانی ماحول کے مطابق میری تعلیم خالص دینی اور مذہبی انداز میں ہوئی چنانچہ پانچ سال کی عمر میں تعلیم کی بسم اللہ میرے جدامجد حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے کرائی، اس موقع پر خاندان میں بڑی خوشی منائی گئی تھی اور تمام اعزہ واقارب کی دعوت کی گئی تھی۔ حروف شناسی کے بعد ناظرہ قرآن مجید شروع کرایا گیا جس کا کچھ حصہ لکھنؤ کے بعض مشہور اساتذہ نے پڑھایا جن میں خاص طور سے مدرسہ تعلیم الاسلام، نادان محل پارک لکھنؤ کے دو استاذ جناب حافظ عبدالستار صاحب اور جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سلطانپوری نے جو بعد میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں استاذ ہوگئے تھے بڑی شفقت ودل سوزی سے پڑھایا تھا۔ ناظرہ کا بڑا حصہ مدرسہ کنزالعلوم، ٹانڈہ یوپی میں پورا ہوا جہاں میری نانہال تھی۔ یہیں اُردو، حساب اور تختی لکھنے کی بھی مشق کرائی گئی۔ یہاں حافظ مجیب اللہ صاحب بستوی مرحوم نے جو نانا صاحب کے مکان ہی پر رہا کرتے تھے فاضل اوقات میں بڑی محنت اور دلجوئی سے بحیثیت اتالیق پڑھایا تھا۔ ان سے پڑھنے والوں میں میرے علاوہ میرے خالہ زاد بھائی حضرت مولانا سید رشیدالدین صاحب حمیدیؒ سابق مہتمم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد اور ماموں زاد بھائیوں میں مولانا حکیم سید عبیدالرحمٰن صاحب اور عزیزی سید عتیق الرحمٰن صاحب بھی تھے۔

خوش قسمتی سے مجھے بچپن ہی سے اپنے اکابر کی بے حد شفقت ومحبت حاصل رہی ہے۔ دادا صاحب (حضرت مولانا لکھنویؒ) کو میرے ساتھ بے مثال قلبی تعلق تھا، وہ مجھے ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے چنانچہ میرا قیام بھی انہی کے ساتھ دارالمبلغین ہی میں رہا کرتا تھا، اکثر اسفار میں بھی ان کی معیت حاصل ہوتی رہتی تھی حتیٰ کہ پہلے حج کی سعادت بھی انہی کی بدولت مجھے حاصل ہوئی تھی۔ ان کی ان خصوصی توجہات کو دیکھ کر ان سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی میرے ساتھ دلجوئی اور تکریم کا معاملہ کرتے تھے، اس طرح بڑے ناز ونعم میں میری پرورش وپرداخت ہوئی۔

ناظرہ مکمل ہونے کے بعد دادا صاحب نے مجھے حفظ قرآن مجید کے لیے مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے ایک مشہور وجید حافظ صاحب کے سپرد کردیا جن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مدرسہ میں حفظ کا سب سے بڑا درجہ انہی کے پاس تھا۔ میں نے سات آٹھ پارے ان کے پاس حفظ کرلیے تھے اور تجوید کی مشق بھی اسی مدرسہ کے قاری محمد شاہد صاحب سے کرلی تھی جو بعد میں پاکستان منتقل ہوگئے لیکن اس درمیان مدرسہ کی تعلیم سے میری طبیعت اچاٹ ہونے لگی اور وہاں

کے ماحول سے ایک قسم کا بعد پیدا ہونے لگا یہاں تک کہ میری صحت بھی خراب رہنے لگی جس کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے تعلیم بھی مجبوراً موقوف کرنا پڑی۔

والد صاحب مرحوم اِن حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے اور وہ اصل حقیقت تک پہنچ چکے تھے چنانچہ انھوں نے خاندان کے قدیم دستور کے برعکس مدرسہ کی تعلیم ختم کرا کے مجھے انگریزی تعلیم میں لگا دیا۔ ان کا یہ اقدام میری زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ خاندان کے بعض اکابر نے اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا مگر وہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہے۔

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ مدارس کے اکثر حفاظ اور اساتذہ حضرات طلباء کے ساتھ ضرورت سے زائد سخت گیری اور تادیب ضربی سے کام لیتے ہیں جس کی بعض طبائع متحمل نہیں ہوتی ہیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ کتاب وسنت کی تعلیم تو بچوں کو مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ دی جائے اور دنیا کے چند حقیر زخارف کو حاصل کرنے میں مدد دینے والی تعلیم انتہائی چمک دمک والے اسکولوں میں کھیل کھلا کر، کہانیاں سنا کر، بچوں کو ٹافیاں دے کر اور خوش اخلاق خواتین کے ذریعہ دلائی جائے۔ ظاہر ہے کہ اپنی طرف متوجہ کرنے کی طاقت جدھر زیادہ ہوگی طالب علم اِدھر ہی زیادہ مائل ہوگا۔ غالباً ہمارے بزرگوں کا مدارس ومکاتب قائم کرتے وقت اس بات کی طرف دھیان نہ گیا ہوگا کہ یہاں کا طریق تعلیم آگے چل کر ایسا ہو جائے گا ورنہ وہ ضرور اس کے متعلق بھی کوئی لائحہ عمل مرتب کر دیتے۔

درحقیقت مدارس میں آنے والے یہ بچے بڑے قابلِ قدر ہوتے ہیں، ان کا جذبۂ ایثار و قربانی یہی کیا کم ہے کہ وہ دنیاوی چمک دمک کو چھوڑ کر مدارس کے ٹاٹ کے فرش پر بیٹھ کر اپنی عمر اور مزاج کے برعکس کچھ "غیر دلچسپ اور خشک" مضامین کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر یہی بچے آگے چل کر قوم کی دینی واخلاقی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ہمارے مدارس کے ذمہ داروں کو اپنے اس طریقۂ کار پر غور کرنا چاہیے۔

انگریزی تعلیم شروع ہونے کے بعد والد صاحب کی نگرانی میرے اوپر دن بدن بڑھنے لگی اور وہ میری ہر نقل وحرکت پر نظر رکھنے لگے، میرے لباس، وضع قطع اور بالوں کی تراش خراش پر ہمیشہ ان کی تنقیدی نگاہ رہتی تھی۔ اس دور میں عام طور سے لوگ اور خاص کر علماء انگریزی تعلیم سے دامن کشاں رہتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی پڑھ کر بچے دین سے دور ہو جاتے ہیں،

چونکہ میں اپنے خاندان کا پہلا طالب علم تھا جس کو انگریزی اسکول میں داخل کیا گیا تھا اور نہ اب تک ہمارے یہاں کے نوجوان مدارس میں رہ کر علم دین حاصل کرتے تھے جو ہمارے خاندان کا اختصاص تھا اس لیے والد صاحب مرحوم بڑے حساس ہو گئے تھے، ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ میرا نام ایسے اسکولوں میں لکھوائیں جہاں مخلوط تعلیم نہ ہو اور یونیفارم وغیرہ پہننا لازمی نہ ہو اس لیے میری ابتدائی تعلیم سُنّی ہائیر سکنڈری اسکول لکھنؤ میں (جواب انٹر کالج ہو گیا ہے) دلائی گئی۔ چونکہ سائنس میں میرا ذہن زیادہ چلتا تھا اس لیے والد صاحب نے مجھے کچھ دنوں کے بعد امین آباد انٹر کالج لکھنؤ کے نویں درجہ میں داخل کرادیا۔ اسی عرصہ میں والد صاحب مدرسہ عالیہ (گورنمنٹ اورینٹل کالج) رام پور میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہو گئے لہٰذا انھوں نے ہم سب لوگوں کو بھی رام پور بلا لیا جہاں میں نے گورنمنٹ رضا انٹر کالج سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران رام پور کے زمانہ قیام میں فارسی کا مکمل نصاب میں نے مدرسہ عالیہ رام پور کے بعض سینئر اساتذہ سے پڑھا جس کی بنیاد پر لکھنؤ یونیورسٹی کے دبیر ماہر (فارسی) اور دبیر کامل (فارسی) کے امتحانات میں نے نمایاں نمبروں سے پاس کیے اور ساتھ ہی ساتھ ادیب ماہر (اردو) اور ادیب کامل (اردو) کے امتحانات میں بھی اعلیٰ نمبروں میں کامیابی حاصل کی۔ کچھ عرصہ کے بعد والد صاحب کی رائے ہوئی کہ میں لکھنؤ یونیورسٹی سے امتحان ''عالم'' میں بھی شرکت کروں چنانچہ یہ امتحان بھی میں نے امتیازی نمبروں میں پاس کیا جس کی بنیاد پر لکھنؤ یونیورسٹی نے ایک سال کے لیے میرا وظیفہ منظور کر دیا۔

دادا صاحبؒ اور والد صاحبؒ کو اس کا احساس بڑی شدومد کے ساتھ تھا کہ میری مدرسہ کی تعلیم منقطع کرا کے انگریزی تعلیم شروع کرائی گئی ہے لہٰذا ان حضرات کی یہی کوشش رہا کرتی تھی کہ یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خاندانی دستور کے مطابق مجھے عربی و فارسی کی تعلیم بھی دی جاتی رہے چنانچہ میرے لیے درس نظامی کا ایک ''شارٹ کٹ'' نصاب جو مختلف کتابوں اور مختلف اہم ابواب پر مشتمل تھا وضع کرایا گیا اور اسی کے مطابق دادا صاحب کے مشورہ سے حضرت والدی الماجد، حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ مہتمم دارالمبلغین لکھنؤ اور مولانا قاری محمد صدیق صاحب استاذ مدرسہ ہٰذا اور بعض دیگر اساتذہ نے عربی ادب، تفسیر، فقہ اور حدیث کی منتخب وضروری کتابیں پڑھا کر مکمل کرایا۔ اسی درمیان میں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے اور

ایم۔اے (معاشیات) کا امتحان بھی پاس کرلیا چنانچہ اب ان کا حکم ہوا کہ مجھے دوسرا ایم۔اے عربی ادب میں کرنا چاہیے لیکن میں چاہتا تھا کہ اگر ایم۔اے ہی کرنا ہے تو فارسی یا اُردو ادب میں کروں مگر جب ان کا اصرار حد سے زیادہ بڑھا تو مجھے لکھنؤ یونیورسٹی کے ایم۔اے (عربی) میں داخلہ لینا پڑا۔ یہ ایم۔اے میں نے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا۔اس میں مجھے اتنے زیادہ نمبرات ملے تھے کہ یونیورسٹی نے مجھے گولڈ میڈل عطا کیا اور آئندہ پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ایک گرانقدر وظیفہ بھی مقرر کردیا۔میری یہ سب کامیابیاں والد صاحبؒ کی ذاتی دلچسپی ونگرانی کی رہین منت ہیں۔ ذہانت میرے خاندان کا ورثہ ہے، شاید اس کا بھی اس میں کچھ دخل ہو، میری ساری عصری تعلیم ایک خاص قسم کے ''خوف کی نفسیات'' کے تحت بڑی پیش بندیوں اور حزم احتیاط کے ساتھ ایک منصوبہ بند طریقہ پر ہوئی تھی جس میں والد صاحب کا رول نہایت غالب تھا، وہ ہر مقام پر میرے تعلیمی معاملات میں اتنا دخیل رہتے تھے کہ گویا وہ خود ہی طالب علم ہیں۔لکھنؤ یونیورسٹی میں میں نے شعبہ عربی میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لے لیا تھا اور میرے تحقیقی مقالہ کے لیے یونیورسٹی نے ''علم تفسیر اور اس کا ارتقاء عہد نبوی سے عہد عباسی تک'' کا عنوان مقرر کیا تھا۔ میں نے دو سال تک اس پر کام بھی کیا مگر اسی عرصہ میں والد صاحب کا ۱۹۶۷ء میں انتقال ہوگیا جس سے میری خانگی زندگی کا نظام منتشر ہوگیا اور اس کے نتیجہ میں تعلیمی سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔

رام پور کے زمانۂ قیام میں جس سال میں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا اسی سال دادا صاحب نے میرا رشتۂ ازدواج عم محترم حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی کی بڑی بیٹی کے ساتھ تجویز فرما کر والد صاحب کی رائے طلب کی مگر وہ اتنی کم عمری اور زمانۂ طالب علمی میں میرا رشتہ کرنا مناسب نہیں خیال کرتے تھے اس لیے دادا صاحب سے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے گریزاں رہتے تھے مگر جب ان کی طرف سے اصرار زیادہ ہوا تو والد صاحب نے دادا صاحب سے پوچھا کہ اس رشتہ کے بارے میں آپ کا یہ مشورہ ہے یا آپ کا حکم ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں اسے حکم ہی سمجھو، والد صاحب نے کہا کہ اگر آپ کا حکم ہے تو پھر یہی ہوگا چنانچہ میری شادی میرے بڑے چچا کی بڑی بیٹی سے ہوگئی۔ان کے اس اصرار کا راز بعد میں کھلا کہ یہ رشتہ مستقبل میں میرے لیے خیر ہی خیر ثابت ہوا، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

اللہ کا احسان و کرم ہے کہ اس نے مجھے چار بیٹے اور تین بیٹیاں عطا فرمائیں ہیں۔ بیٹوں میں سب سے بڑے عزیزی مولوی حافظ عبدالملک فاروقی سلمہ ہیں، ان کے ماشاء اللہ دولڑکیاں اور ایک بیٹے عزیزی حافظ عبدالماجد فاروقی سلمہ ہیں جنھوں نے اب فارسی اور عربی شروع کی ہے۔ دوسرے بیٹے عزیزی ڈاکٹر عبدالہادی فاروقی سلمہ ہیں جو ایم ڈی (یونانی) ہیں، ان کے بھی دو بیٹیاں ہیں، ان سے چھوٹے عزیزی ڈاکٹر عبدالناصر فاروقی سلمہ ہیں، یہ بھی ایم ڈی (یونانی) ہیں اور دہلی کے ایک مشہور طبیہ کالج میں لکچرر ہیں، ان کے بھی دو بیٹیاں ہیں۔ میرے چوتھے بیٹے عزیزی عبدالواحد فاروقی ہیں جو فرسٹ کلاس فرسٹ ایم کام ہیں اور اسی مضمون میں پی ایچ ڈی کرر ہے ہیں، ان کی شادی بھی چند ماہ پہلے ہوچکی ہے۔ میری بڑی بیٹی کی شادی عزیزی مولوی حافظ عبدالولی فاروقی سلمہ فاضل دارالعلوم دیوبند ابن عم محترم حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ سے ہوئی ہے جن کے الحمدللہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے، میری دوسری بیٹی منصور پور ضلع مظفر نگر یوپی کے ایک معزز زمیندار خاندان میں عزیزی سیّد محمد ساجد زیدی سلمہ سے منسوب ہے اس کے بھی دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ میری تیسری بیٹی کی شادی چند سال پہلے میرے خالہ زاد بھائی عزیز گرامی جناب مولانا سیّد ارشد مدنی صاحب ناظم تعلیمات و استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادہ عزیزی سیّد محمد ازہر مدنی سلمہ فاضل دارالعلوم دیوبند سے ہوئی ہے جو کہ میرے حقیقی بھانجہ بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو آباد و خوشحال رکھے آمین۔

۱۹۶۷ء میں جب والد صاحب کا انتقال ہوگیا تو میرے بڑے خالو حضرت مولانا سیّد حمید الدین صاحب شیخ الحدیث مدرسہ عالیہ کلکتہ نے میری بھرپور سرپرستی ورہنمائی فرمائی، ان کے مشورہ سے میں دہلی آ گیا جہاں امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب مدظلہٗ العالی صدر جمعیۃ علماء ہند و سابق ممبر پارلیمنٹ نے میری ہر طرح سے سرپرستی فرمائی اور وہی دہلی میں میرے قدم جمانے کا ذریعہ و وسیلہ بنے۔ یہاں مختلف جگہوں پر مختلف حیثیتوں سے کام کرنے کے بعد میرا رابطہ ہندوستان کی جانی مانی علمی شخصیت جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلویؒ سے ہوا جنھوں نے مجھے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ نئی دہلی کے ایک اہم پروجیکٹ میں کام کرنے کا موقع عنایت کیا، اس پروجیکٹ کے تحت عالم اسلام کے مشہور و معروف طبیب و فلسفی شیخ الرئیس علامہ ابن سینا کی شہرہ آفاق کتاب ''القانون فی الطب'' کے

عربی متن کے تدوین اوراس کے انگریزی ترجمہ کا کام تازہ تازہ شروع ہوا تھا۔ اس پروجیکٹ سے حکیم صاحب کوخصوصی طور پر بڑی دلچسپی تھی اوروہ خودبھی اس میں شریک کار تھے چنانچہ ان کی نگرانی میں اس پروجیکٹ پر میں نے کام شروع کردیا یہاں تک کہ ۱۹۸۹ء میں حکومت ہند نے اس انسٹی ٹیوٹ کواوراس کے متعلقہ اداروں کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا، اب اس وقت شعبہ اسلامیات میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کررہا ہوں اور تین سال تک میں نے صدر شعبہ کی حیثیت سے بھی یہاں کام کیا ہے۔اب اس پروجیکٹ کا کام بڑی حدتک شائع ہوچکا ہے۔

میں ہمیشہ اس بات کا کوشاں رہا ہوں کہ میرا اور میری اولاد کا رہن سہن، وضع قطع اور صورت شکل سب اپنے اسلاف کے مطابق رہے۔ الحمدللہ میں اس میں کامیاب ہوں۔ عصری علوم سے وابستہ ہوتے ہوئے اپنی نجی زندگی میں ''قدامت پسند'' واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک ممکن ہوسکا ہے میں نے اپنے بچوں کواچھی سے اچھی تعلیم دلانے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اسلامی قدروں کا بھی حامل بنانے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ انھیں نیکی و دینداری، میل ومحبت اور بلا اختلاف مذہب وملت سب کے ساتھ بھلائی وخیرخواہی کا برتاؤ کرنے کی تلقین کرتا رہا ہوں کیونکہ میرے رگ وپۓ میں یہ یقین سرایت کرچکا ہے کہ آج مجھے جوکچھ بھی حاصل ہوا ہے وہ رزق حلال، اکابر کی صحبت، بزرگوں کی پیروی اور والدین کی خدمت اوران کی دعاؤں کے صلہ میں ہی حاصل ہوا ہے، اسی لیے امید ہے کہ:

رہے گا ذکر مرا قصہ و فسانہ میں
مجھے بھی یاد کریں گے کسی زمانہ میں

OO

تاثرات

حضرت مولانا حکیم محمد عبدالغنی صاحب فاروقی مدظلہٗ

صاحبزادۂ گرامی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ

میرے والد ماجد کے حالات پر آپ کی کتاب حرفِ آخر کہی جائے گی، اسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی اور دلی مسرت ہوئی۔ آپ نے اپنی اس کتاب میں مجھ ناکارہ کا بھی تذکرہ کیا ہے جس پر مجھے شرمندگی ہے۔ میں کوتاہ قلم اور بے علم آدمی ہوں اور اب تو یہاں میرا کوئی شناسا بھی نہیں ہے۔ آپ کی کتاب علامت نگاری اور حقیقت نگاری کی بہترین کتاب ہے۔ میں نے اسے پڑھوا کر اور خود بھی کہیں کہیں سے دیکھ کر آپ کی محنت پر دل سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک فخریہ کارنامہ ہے جس پر آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب میں جہاں آپ نے ہمارے خاندانی تذکرے لکھے ہیں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی جذباتیت نہیں ملتی، آپ ایک بازار سے گذرے اور پوری بازار دیکھتے چلے گئے اور کوئی چیز خریدی نہیں۔ یہ بات آپ کی سونے پر سہاگہ ہے اور کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ آپ نے واقعی میرے لیے سرِ شام سحر کردی:

موسم گل نے کروٹیں لے کر\
نقش کتنے حسیں ابھارے ہیں

میری طرف سے آپ کو اور آپ کے بچوں کو بہت بہت دعائیں پیش ہیں۔ فقط والسلام۔

ناچیز\
محمد عبدالغنی فاروقی\
خادم دارالعلوم موضع پلیا کاکوری ضلع لکھنؤ

۲۱؍فروری ۲۰۰۲ء\
یوم پنجشنبہ بعد عصر

مادّہ ہائے تاریخ

از

جناب مولانا محمد عثمان صاحب معروفیؒ

مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنوی

۱ ۸ ۳ ۱ ھ

○

حیات ، کمالات و خدمات

۲ ۶ ۹ ۱ ء

○

حیاتِ پاک طینت و خدمات

۲ ۶ ۹ ۱ ء

○

مرتبہ جادو کلک مولانا عبدالحی فاروقی

۱ ۸ ۳ ۱ ھ

○

محمد عثمان معروفی کان اللہ الواحدلہٗ

۱ ۸ ۳ ۱ ھ

مادّہ ہائے مزیّن بتاریخ

۱۳۸۱ھ

نحمدُ اللہ المُعید اللّطیف وَ نُصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم

۱۳۸۱ھ

مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھناوی

بانیٔ گلشنِ زیبا دارالمبلّغین لکھنؤ

۱۳۸۱ھ

۱۳۸۱ھ

پاک ادا حضرت مولانا فاروقی

امام اہل سنّت عالی جاہ عبدالشکور

۱۹۶۲ء

۱ ۳ ۸ ۱ ھ

مولانا عبدالشکور صاحب مدیرِ وحید "النجم" لکھنؤ

۱۳۸۱ھ

طالب ظفر مداح صحابہؓ

رونق فزا بعظمت صحابہؓ

۱۳۸۱ھ

۱۹۶۲ء

مسیح الانفاس ماحیٔ رفض و بدعت

غفر اللہ لہ'

۱۹۶۲ء

۱۳۸۱ھ

نوّر مرقدہُ اللہ المسقط العظیم

۱۹۶۲ء

برّد مضجعہ' المعز الحکیم

۱۳۸۱ھ

اعوذ باللہ الرّقیب من الشیطان الرجیم

۱۹۶۲ء

بسم اللّٰہ العزیز العظیم الرحمان الرحیم

۱۹۶۲ء

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُوْ الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ الْحَسِيْب

۱۹۶۲ء

قال اللّٰہ وسقاهم ربّهم شراباً طهورا

۱۳۸۱ھ

قالَ الجامعُ الجليل فهو في عيشة راضيةٍ

۱۹۶۲ء

قَالَ الْوَاسِعُ الْوَاحِدُ سَلامٌ عَلَيْكُمْ اُدْخُلُو الْجَنَّة

۱۳۸۱ھ

لقد قال النبيُّ الموتُ جسرٌ يوصلُ الحبيب الي الحبيب

۱۳۸۱ھ

انّ الباسطَ المنانُ يرفع العلم برفعِ العلماء

۱۳۸۱ھ

باللّٰه الولي موتُ العالِم موتُ العالَم

۱۳۸۱ھ

ما كان قيسٌ هلكهٗ هُلْكُ واحدٍ ولكنّهٗ جُدرانُ قومٍ تهدّمَا

۱۳۸۱ھ

آہ راہِ حق کا لائق رہنما جاتا رہا

۱۳۸۱ھ

آج گل ہو گیا ہے چراغِ وطن

۱۳۸۱ھ

دارِ نعیم خوش رفتا

۱۹۶۲ء

برخاک ہمام سلامتی شدہ

۱۹۶۲ء

نامہ نویس محمد عثمان معروفی

۱۳۸۱ھ

قلم ہیچ محمد عثمان اعظمی

۱۹۶۲ء

OO

پہلا باب

وطن ○ خاندان ○ اور — آباء واجداد

کاکوری ضلع لکھنؤ:

مشرقی یوپی کا وہ خطّہ جو اَودھ کہلاتا ہے اس کے اکثر و بیشتر دیہات وقصبات بہت مشہور ہوئے ہیں۔ انہی میں ''کاکوری'' بھی ایک منتخب روزگار قصبہ ہے جہاں عہدِ اسلامی سے لے کر برطانوی حکومت کے اختتام تک ہر دَور میں ایسے صاحبِ سیف وقلم، اہلِ علم وعمل اور ماہرین تدبیر وسیاست پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اپنے وطن کی تاریخ کو ملک میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے، یہی وہ لوگ تھے جن کے علم وفضل اور شان وشوکت سے متاثر ہو کر ایک شاعر بے اختیار کہہ اٹھا تھا:

خصوصاً روزِ عیدین وادینہ نماید شہر کاکوری مدینہ[1]

اسی قسم کے مردم خیز قصبات کے متعلق شاہجہاں بادشاہِ دہلی کہا کرتے تھے کہ ''پورب شیراز ماست[2]'' یعنی ہماری مملکت میں پورب کے قصبات جہاں فضلاء وفقراء وعلماء اور اربابِ دول پیدا ہوتے رہے ہیں وہاں کا ہر قصبہ باعتبار مردم خیزی شیراز کا ہم پلہ ہے۔

قصبہ کاکوری اُترپردیش کی راجدھانی لکھنؤ سے ۱۱ کلومیٹر دُور مراد آباد جانے والی نادرن ریلوے لائن پر واقع ہے اور اِسی نام پر اس کا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور اس سے چند میل آگے آموں کی مشہور منڈی ملیح آباد واقع ہے۔

تاریخی اعتبار سے یہ قصبہ بڑے نشیب وفراز سے گذرا ہے اور شکست وفتح کے بیشمار مناظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ مؤرخین کے قول کے مطابق چوتھی صدی ہجری سے قبل تک یہ خطّہ بالکل ویران تھا البتہ پانچویں صدی کے اوائل میں راجہ کنس والیٔ کسمنڈی کلاں اس پورے علاقہ کو اپنے تصرّف میں لایا، اسی عرصہ میں ۱۰۳۰ء میں حضرت سیّد سالار مسعود غازیؒ (م ۱۰۳۴ء) اپنے نیم عسکری قافلہ کے ساتھ شمالی ہند وارد ہوئے اور سفر کرتے کرتے اس مقام

---

[1] تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۹ [2] مآثر الکرام دفتر اوّل، ص ۲۲۲

تک پہنچ گئے۔ یہاں راجہ کنس ان سے آمادۂ جنگ ہوگیا۔ چنانچہ چھ ماہ تک مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ موجودہ قصبہ کے قریب بھی شدید جنگ ہوئی جس میں کچھ مجاہدین شہید بھی ہوئے جن کی قبریں اب تک یہاں موجود ہیں، اس شدید جنگ میں راجہ کنس اور اس کا سارا خاندان قتل ہوگیا اور کاکوری مجاہدین کے قبضہ میں آ گیا۔

حضرت سیّد سالار مسعود غازیؒ کی شہادت کے بعد اور مجاہدین کی مجموعی قوت منتشر ہو جانے کی وجہ سے یہ تمام مفتوحہ علاقے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ۱۱۹۳ء سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا باقاعدہ دَور شروع ہوا، اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلطان قطب الدین ایبک (م ۱۲۱۰ء) نے اَودھ اور بہار پر قبضہ کر کے محمد بن بختیار خلجی (م ۱۲۰۶ء) کو یہاں کے لشکر کا سردار اور حاکم بنا دیا، ابھی یہ تسخیر پورے طور پر مکمل بھی ہونے نہیں پائی تھی کہ ۱۲۲۵ء میں سلطان شمس الدین التمش (م ۱۲۳۶ء) نے ملک ناصرالدین (م ۱۲۶۶ء) کو اس مہم پر مامور کر دیا جس نے مسلسل حملہ کر کے اس خطہ کو غیروں سے آزاد کرایا، اس وقت سے یہ قصبہ پھر سلاطینِ دہلی کے اختیار میں آ گیا[1] ۱۳۹۴ء کا زمانہ ہندوستان میں خانہ جنگیوں کا زمانہ تھا اور خاندانِ تغلق زوال پذیر ہو رہا تھا، چنانچہ ان حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک جنگجو قوم ''بھر'' نے کاکوری اور اس کے نواح پر پھر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

کاکوری کی وجہ تسمیہ

اس جدید قبضہ اور تسلّط کے وقت قوم بھر کا جو فرمانروا تھا اس کا نام راجہ ککور تھا جس نے لکھنؤ کے جنوبی حصہ میں ککور گڈھ کے نام سے ایک خام قلعہ بھی تعمیر کیا تھا، یہ قلعہ اس قدر وسیع و عریض تھا کہ موجودہ قصبہ کاکوری اسی حلقہ کے اندر آباد ہے، اس قلعہ کی عمارت خام تھی جس کے چاروں طرف گہری خندق اور نہایت گھنے خاردار درختوں کا جنگل تھا۔ یہی قلعہ ککور گڈھ آگے چل کر کثرتِ استعمال کی وجہ سے کاکوری ہو گیا۔[2]

۱۴۰۱ء میں سلاطینِ شرقیہ جونپور کے مشہور فرمانروا سلطان ابراہیم شرقی (م ۱۴۴۰ء) نے اپنی حکومت قائم کرتے ہی بھروں پر فوج کشی کر دی جس کے نتیجہ میں مختلف مقامات پر سخت جنگیں

---

[1] تاریخ قصبہ کاکوری، ص ۳ بحوالہ مرأۃ مسعودی مؤلفہ مولانا عبدالرحمٰن امیٹھوی [2] تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص ۱۱

ہوئیں۔ بالآخر قصبہ مانک پور کے نزدیک ایک سخت معرکہ ہوا جس میں راجہ ککور مارا گیا اور اس طرح قوم بھر کی حکومت ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ اس فتح کے بعد سلطان ابراہیم شرقی نے مختلف مقامات پر اسلامی آبادیاں قائم کرائیں جس میں قصبہ کاکوری کا بھی از سرِ نو سنگ بنیاد انھیں کے حق پرست ہاتھوں سے رکھا گیا۔[1]

۱۴۷۸ء تک یہ قصبہ سلاطینِ شرقیہ کی حکومت میں رہا لیکن شرقی حکومت کے زوال پذیر ہونے پر راجہ ستھنا کے لڑکے تلوک چند نے حملہ کر کے کاکوری پر پھر قبضہ کر لیا اور ۱۴۸۸ء تک وہ اور اس کی اولاد اس پر قابض و متصرف رہی۔ تلوک چند کے مرنے کے بعد یہ قصبہ سکندر لودھی (م۱۵۲۶ء) کے قبضہ میں آیا اور پھر اس وقت سے لے کر سلطنتِ اَودھ کے انتزاع تک قصبہ کاکوری مسلم حکمرانوں کے زیرِ نگیں رہا۔

شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (م۱۶۰۵ء) کے دورِ حکومت میں ایک نیا صوبہ بنام سرکار لکھنؤ قائم ہوا جس میں ایک مستقل صوبہ دار حکومت کی طرف سے رہنے لگا۔ لکھنؤ کے متصل ہی ایک جدید پرگنہ کاکوری بھی قائم ہوا، قصبہ کے وسط میں ایک پختہ قلعہ بھی تعمیر کیا گیا جس میں فوج دار مع اپنے لشکر و عملہ کے رہتا تھا۔ اَودھ کے نواب نصیر الدین حیدر (م۱۸۳۷ء) کے عہد تک یہ پرگنہ کبھی سندیلہ اور کبھی لکھنؤ میں شامل ہوتا رہا۔ نواب واجد علی شاہ (معزول ۱۸۵۶ء) کے عہد میں اس کے کل مواضعات محلاتِ شاہی کو عطا کر دیئے گئے۔ سلطنتِ اَودھ کے انتزاع کے بعد ۱۸۵۷ء میں برطانوی حکومت نے عہدِ اکبری کے قائم کردہ پرگنہ کو دوبارہ پھر قائم کیا جو آخر تک موجود رہا۔[2]

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب یہ قصبہ اُتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ کے ضلع کا ایک اہم حصہ ہے۔ آزادیٔ وطن کے بعد کاکوری کی رونق اور شان و شوکت میں بڑی کمی آ گئی تھی جس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اکثر شرفاء اور با اثر لوگ ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے یا لکھنؤ اور دوسرے شہروں یا مختلف ریاستوں میں جا کر آباد ہو گئے جس کی وجہ سے یہاں ویرانی اور بے رونقی پیدا ہو گئی، مگر اب پھر وقت کے گذرنے سے اس قصبہ میں تبدیلی ہوئی ہے اور دوبارہ نئی آب و تاب پیدا ہوتی دِکھائی دے رہی ہے۔

یہی قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنویؒ کا آبائی وطن ہے جہاں

---

[1] تاریخ قصبہ کاکوری، ص۴ [2] تذکرہ مشاہیر کاکوری، ص۱۳-۱۴

کئی پشتوں سے آپ کے خاندانی اکابر سکونت پذیر ہوتے چلے آرہے ہیں، البتہ خود آپ نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کاکوری کے بجائے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور پھر تاعمر یہیں قیام پذیر رہ کر اپنی تمام تر تدریسی، علمی اور اصلاحی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس طرح آج ان کے خاندان کا وطن بھی لکھنؤ ہی قرار پا چکا ہے۔

سلسلۂ نسب

حسب ونسب کی اچھائی برائی انسان کی خود پیدا کردہ ہے، شریعتِ محمدیہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ قرآن حکیم کا صاف اعلان ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ[1] یعنی خدا کے یہاں سب سے بڑا شریف اور بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو، اس کے علاوہ احادیثِ نبویہ، آثارِ صحابہ اور بزرگانِ دین کے اقوال واعمال سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کی طرف منسوب یہ مشہور شعر ہے:

اَلنَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَاءُ　　　اَبُوْهُمْ آدَمُ وَ الْاُمُّ حَوَّاءُ[2]

یعنی سارے لوگ چہرے مہرے کے اعتبار سے یکساں ہیں کیونکہ سب کے باپ آدمؑ اور سب کی ماں حوا ہیں۔ تاریخِ اسلام کا یہ باب بڑے دلچسپ و دل آویز واقعات سے بھرا ہوا ہے، اس کے مطالعہ کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام نے کبھی بھی محض اس وجہ سے کہ یہ قریشی ہے یا ہاشمی و مُطّلبی ہے کسی دوسرے خاندان کے افراد پر کسی کو ترجیح و اہمیت نہیں دی، چنانچہ حضرت بلال حبشیؓ شکل وصورت اور خاندانی روایات کے اعتبار سے کوئی خاص مقام نہیں رکھتے تھے مگر عہدِ صحابہؓ میں بڑے سے بڑے خاندانی عرب نے بھی انھیں کبھی حقیر و کمتر نہیں جانا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو اِنَّـــــہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ[3] کہہ کر کبھی غرقِ طوفان نہ کر دیا جاتا۔ عہدِ اسلام میں ابوجہل، ابولہب، عتبہ و عتیبہ جیسے بڑے حسب ونسب کے لوگ بھی تھے مگر جو عزّت و بزرگی بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ کو ملی وہ انھیں حاصل نہیں ہو سکی۔ اسلام کے نزدیک کالے، گورے اور عربی و عجمی کی کوئی قیمت نہیں، نہ جانے کتنے عالم و بزرگ ایسے گذرے ہیں جو اپنے معمولی پیشے اور پسماندہ خاندانی القاب و الفاظ کے باوجود ہمیشہ عزّت و توقیر کے معیاری رشتے

---

[1] الحجرات: ۱۳ [2] دیوان امیر المومنین علی ابن ابی طالبؓ، اُردو ترجمہ مولوی محمد سعید اعظمی، ص ۲ [3] ہود: ۴۶

میں منسلک سمجھے جاتے رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ:

اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

پھر بھی آدم وحوا کی بہت سی شاخیں آج تک اپنے آباء واجداد کا سلسلۂ نسب محفوظ رکھتی چلی آئی ہیں، کاش اس کا استعمال محض تذکرہ وتعارف ہی تک محدود رہتا تو اچھا تھا۔

مذکورہ بالا اصول کے پیشِ نظر حضرت مولانا لکھنویؒ کے خاندان کے بزرگوں اور ذمہ داروں نے کبھی باضابطہ نسب نامہ مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں دی پھر بھی پرانے کاغذات اور نسلی روایات سے آپ کا جو سلسلۂ نسب معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے:

''امام اہلسنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ بن مولوی حافظ ناظر علیؒ بن حکیم فضل علیؒ بن قادر علیؒ بن رحمت علیؒ بن مظہر علیؒ بن حبیب علیؒ بن مولانا محمد شاکر بن مولانا قاضی عصمت اللہؒ[1] بن مولانا عبدالقادرؒ (اوّل) بن مخدوم سلطانؒ بن مخدوم الہ دادؒ بن مخدوم لادؒ بن مولانا شیخ فریدؒ[2] بن مولانا عبدالقادر محدثؒ (دوم) بن مولانا قطب الدین محدثؒ بن مولانا خضر محدثؒ بن سلطان حسینؒ[3] (اوّل) بن سلطان مبارکؒ بن سلطان عثمانؒ بن امیر محی الدینؒ بن امیر غیاث الدینؒ[4] بن ابوبکرؒ بن حسینؒ (دوم) بن شیخ فرید الدینؒ[5] بن عبدالکریمؒ بن شیخ عبدالعزیزؒ بن شیخ عبداللطیفؒ بن شیخ عبدالجلیلؒ بن حضرت عبیداللہؓ بن حضرت عبداللہؓ بن امیر المومنین سیّدنا فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔[6]

مندرجہ بالا نسب نامہ کے مطابق مولانا لکھنویؒ اور امیر المومنین سیّدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ کے درمیان اکتیس واسطوں کا فاصلہ ہے۔ معتبر حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ مولانا شیخ خضرؒ محدّث بلخ سے ہندوستان آئے تھے اور جونپور میں آکر

1۔ ہمارے خاندانی شجرہ میں اس نام کی جگہ ''مخدوم شیخ عظمت اللہ'' لکھا ہے مگر الاعلام جلد ۶، ص ۲۲۴ میں یہاں قاضی عصمت اللہؒ کا نام درج ہے، ہمارے نزدیک بھی یہی صحیح ہے۔

2۔ الاعلام جلد ۵، ص ۲۵۴ میں اس نام کا اضافہ ہے جسے ہم نے بھی قبول کرلیا ہے۔

3۔ مذکورہ بالا حوالوں میں یہاں شیخ حسن درج ہے۔

4۔ مذکورہ بالا حوالوں میں یہاں امیر عماد الدین درج ہے۔

5۔ مذکورہ بالا حوالوں میں یہاں معز الدین درج ہے۔

6۔ حضرت مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ نے ہفت روزہ ''حرم'' لکھنؤ، ۲۶ر نومبر ۱۹۶۳ء میں سب سے پہلے اپنے اس خاندانی شجرہ کو شائع کیا تھا، ہم نے اسے الاعلام، تذکرہ علماء ہند اور بحر ذخار کی مدد سے مزید معتبر و مستند بنادیا ہے۔ (مؤلف)

اقامت اختیار کی تھی۔ اس زمانہ میں یہاں سلطان ابراہیم شرقی (۱۴۰۲ء-۱۴۴۰ء) فرمانروا تھا اور اس کی علم نوازی کی عام شہرت تھی۔ سلطان نے آپ کے علم و فضل کو دیکھ کر آپ کو لکھنؤ میں تدریس کی خدمت پر مامور کر دیا اور ملیح آباد کے اطراف میں کئی گاؤں جاگیر میں عطا کیے[1]۔ آپ کے بیٹے اور پوتے مولانا قطب الدینؒ اور مولانا عبدالقادر محدثؒ (دوم) بھی نہایت جید عالم تھے[2]۔ اسی سلسلۂ نسب میں مولانا عبدالقادرؒ (اوّل) کا نام نامی بھی ہے جو بعض روایات کے مطابق لکھنؤ میں اور بقول بعض کسمنڈی ضلع لکھنؤ میں ۱۵۸۷ء میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن کے بعد مزید حصولِ علم کے لیے لاہور وغیرہ کا سفر کیا اور تکمیل کر کے لکھنؤ آئے اور یہاں اپنی مسندِ درس آراستہ کی۔ آپ بڑے عابد و زاہد تھے۔ عشاء کے بعد ریا سے بچنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتے تھے اور جب سب لوگ سو جاتے تو خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر ساری رات عبادت میں مصروف رہا کرتے تھے۔ آپ کے شاگردوں میں حضرت شاہ پیر محمد صاحب لکھنویؒ، سید محمد شفیع دہلویؒ، شیخ قطب الدین سہالویؒ، سید غلام مصطفیٰ جائسیؒ، شیخ محمد زماں کاکورویؒ، شیخ محبیؒ قلندر لاہر پوریؒ، سید حسن رسول نما دہلویؒ اور نواب مختار خاںؒ امیر بنگالہ وغیرہ کے نام ملتے ہیں[3]۔ انہی مولانا قاضی عبدالقادرؒ (اوّل) کے صاحبزادے مولانا قاضی عصمت اللہ لکھنویؒ (م ۱۷۰۱ء) تھے جنھوں نے اپنے والد ماجد کے علاوہ مفتی وجیہہ الدین گوپامئویؒ سے بھی علم حاصل کیا تھا۔ آپ شیخ پیر محمد سلونوی (م ۱۶۸۷ء) سے بیعت تھے۔ آگے چل کر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تایا حضرت شاہ ابو رضا محمدؒ (م ۱۶۸۹ء) سے بھی آپ کے روابط پیدا ہوئے۔ ان دونوں حضرات کے درمیان مراسلت بھی ہوا کرتی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ان سے بھی کچھ اصلاحی تعلق رکھتے تھے[4]۔ آپ اپنے علم و عمل کو مخفی رکھنے کے لیے ہمیشہ سپاہیانہ لباس استعمال کرتے تھے، بادشاہِ ہند اورنگ زیب عالمگیر غازیؒ کے دربار میں آپ کو بڑا تقرب حاصل تھا جنھوں نے آپ کو مراد آباد کا قاضی و حاکم مقرر کیا تھا جہاں آپ مدتوں رہے ہیں۔ مولانا شیخ رفیع الدین فاروقی مراد آبادیؒ

---

[1] دیارِ پورب کے علم و علماء، ص ۵۳

[2] الاعلام، جلد ۳، ص ۹۳

[3] الاعلام، جلد ۵، ص ۲۵۴-۲۵۵، تذکرۂ علماء ہند، ص ۱۲۸-۱۲۹

[4] تذکرہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ و شاہ ابوالرضا دہلویؒ، ص ۳۵ تا ص ۴۳

شاگردرشید حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ آپ ہی کے پوتے تھے۔اورنگ زیب ہی نے آپ کوفتاویٰ ہندیہ کے مرتبین میں بھی نامزد کیا تھا، آپ کی سخاوت وفیاضی کے بہت سے واقعات مشہور تھے۔ آپ کے دسترخوان پر دوسو طلباء روز کھانا کھاتے تھے اور رمضان المبارک میں تو آپ کے مطبخ سے ایک ہزار لوگوں کو کھانا ملتا تھا۔ بے شمار علماء ومشائخ کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ مرادآباد کے علاوہ اور بھی دیگر مقامات پر آپ قاضی وحاکم مقرر ہوتے رہے۔ بادشاہ کی طرف سے علاقۂ دکن میں کسی مہم پر گئے ہوئے تھے وہاں سے واپسی پر ساحلِ نرمدا پر آپ کا انتقال ہوگیا اور لاش لکھنؤ لائی گئی اور محلّہ بھدانوہ (موجودہ بھدیواں) میں تدفین عمل میں آئی۔[1]

قاضی عصمت اللہ لکھنویؒ کے صاحبزادہ مولانا محمد شاکرؒ (م۱۷۲۰ء) تھے جنھوں نے اپنے والدؒ، داداؒ، مفتی وجیہہ الدین گوپامئویؒ اور شیخ پیر محمد لکھنویؒ وغیرہ سے تحصیلِ علم کیا تھا، اس کے بعد لکھنؤ میں اپنی مسندِ درس بچھائی، آپ صاحبِ تصانیف عالم تھے۔ آپ کی تالیفات میں (۱) شرح تہذیب المنطق تفتازانی (۲) الرسالۃ الاعتقادیہ (۳) الرسالۃ القاسمیہ (۴) رسالہ احوالِ موتیٰ (۵) خلاصۃ المناقب (۶) حلِ لغاتِ قرآنیہ، اور (۷) رسالۂ وصایا وغیرہ بہت مقبول ہوئیں۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کی فرمائش پر قصیدہ بردہ کی شرح بھی آپ نے لکھی تھی جس پر بادشاہ نے آپ کو بڑے انعام واکرام سے نوازا تھا۔[2]

اس طرح یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ہر دَور میں اس خاندان کے اندر بڑے بڑے علماء، فضلاء، صوفیاء، مشائخ اور مصنّفین پیدا ہوتے رہے ہیں۔ سلاطینِ وقت بھی ان کے علم وفضل کے ہمیشہ معترف اور قدرداں رہے۔ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف اس خاندان کا خصوصی مشغلہ رہا ہے۔ ان میں سے اکثر اصحاب ملیح آباد، کسمنڈی، سندیلہ، صفی پور اور نیوتنی وغیرہ میں بھی آباد ہوئے ہیں چنانچہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں بھی اس کی ایک شاخ آکر آباد ہوئی جس کے سربراہ شیخ حبیب علیؒ تھے جن کی شادی کاکوری کے مشہور بزرگ شیخ جاراللہؒ (بعہد اورنگ زیب عالم گیرؒ) کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ کاکوری آنے کے بعد موصوف نے محلّہ کٹرہ میں سکونت اختیار کی جہاں کئی پشتوں تک یہ خاندان آباد رہا لیکن اخیر میں مولاناؒ کے جدِمحترم حکیم شیخ فضل علیؒ (م۱۹۰۱ء)

---

[1] الاعلام، جلد ۶، ص ۱۸۷، تذکرہ علماء ہند، ص ۱۴۰

[2] الاعلام، جلد ۶، ص ۳۲۴، دیار پورب کے علم وعلماء، ص ۱۰۱

نے اپنے شیخ طریقت شاہ کرامت[1] علیؒ کی والہانہ محبت وعقیدت میں محلہ شیخ سعدی میں جہاں اب خود شاہ کرامت علیؒ کا مزار بھی ہے، سکونت اختیار کی۔ مولانا کے بزرگوں میں ان کے جد محترم حکیم شیخ فضل علیؒ اور والد ماجد مولوی حافظ ناظر علیؒ (م ۱۹۱۱ء) کے حالات جو معلوم ہو سکے ہیں وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کو کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔

مولوی حکیم شیخ فضل علیؒ

حکیم شیخ فضل علیؒ بن شیخ قادر علیؒ مولانا لکھنویؒ کے جد امجد تھے، حکیم صاحبؒ ایک ذی علم بزرگ اور طبیب حاذق تھے۔ کاکوری اور اس کے جوار میں ان کی اچھی خاصی شہرت تھی، اللہ تعالیٰ نے انھیں زہد وورع کے ساتھ ساتھ دستِ شفا بھی دے رکھا تھا، ہر وقت مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی، لوگ انھیں گھروں پر بھی مریضوں کو دِکھانے کے لیے لے جاتے جس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ ان کی یہ عادت تھی کہ اکثر وبیشتر مریضوں کو دوائیں مفت تقسیم کرتے اور خود بہت قلیل آمدنی پر گذر بسر فرماتے تھے۔

ابتدائی عمر میں انھوں نے ضلع فتح پور یو پی کی کلکٹری میں بحیثیت محرّر نیلام کے ملازمت کر لی تھی، دورانِ ملازمت نہایت ایمانداری اور محنت کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیئے اسی

---

[1] شاہ کرامت علیؒ بن شیخ محمد غنیؒ، مخدوم شیخ نظام الدینؒ (م ۱۵۷۳ء) کی اولاد میں تھے۔ آپ نے مولانا شاہ حمایت علی قلندرؒ (م ۱۸۱۱ء) سے تعلیم حاصل کی۔ بیعت شاہ صبغت اللہ قلندر کاکوروی (م ۱۷۹۶ء) سے تھی لیکن تعلیم وتربیت اجازت وخلافت شاہ میر محمد قلندرؒ (م ۱۸۲۸ء) سے حاصل ہوئی، بچپن سے طبیعت میں زہد وورع، علائق دنیا سے بے تعلقی اور مخلوقِ خدا کی خدمت ونفع رسانی درجہ کمال پر تھی، عمر کا سارا حصہ عبادت وریاضت اور مجاہدات میں گذرا، اپنے پیر ومرشد کے وصال کے بعد گوشہ نشینی اور فقر وقناعت اختیار کر لی اور ان کے مزار پر جاروب کشی کو اپنے لیے فریضہ بنا لیا۔ شب وروز حجرے کا دروازہ بند کر کے یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے، ہمیشہ روزہ رکھتے، صرف جمعہ کے روز اپنے اعزا واقربا کی ملاقات کو تشریف لے جاتے، مسکنت وغربت اور خاکساری مزاج میں بہت تھی۔ اخیر عمر میں جذب کی حالت پیدا ہو گئی تھی آپ کی کرامات بہت مشہور ہیں، جو بات زبان سے نکلتی تھی پوری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک بار بحالت جذب فرمایا کہ میرے جنازہ کے ساتھ باجہ ضرور بجے، لہٰذا آپ کے بعض متوسلین نے اس کو وصیت سمجھ کر انجام دینا چاہا مگر علماء وقت نے روکا اور ایسا نہ ہونے دیا لیکن جب جنازہ گھر سے نکالا گیا تو تھوڑے فاصلہ پر ایک بارات مع باجہ کے نکلی، باراتیوں نے باجہ بند کرنا چاہا مگر مُریدین ومتوسلین نے کہا کہ کوئی حرج نہیں اسی طرح بجاتے چلو، غرضیکہ آگے آگے بارات اور پیچھے پیچھے جنازہ روانہ ہوا۔ بارات کا یہ ساتھ قبرستان تک برابر جاری رہا۔ اس طرح ایک فقیر بے نوا کی زبان سے نکلی ہوئی بات اللہ نے پوری کر دی۔ آپ کے مریدین ومتوسلین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ قصبہ کے بیشتر عمائدین اور اطراف کے اکثر لوگ آپ کے حلقہ بگوش تھے نہایت پاک باز اور عابدانہ ومجاہدانہ زندگی گذار کر ۴ رجمادی الآخر ۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۷ء کو آپ نے وفات پائی اور محلہ شیخ سعدی کاکوری میں مدفون ہوئے۔ (تذکرہ مشاہیر کاکوری ۳۵-۳۴۴)

لیے افسرانِ بالا اُن پر بڑا اعتماد اور بھروسہ کرتے تھے۔ اسی ملازمت کی وجہ سے کچھ عرصہ کے بعد آپ کے بیٹے مولوی حافظ ناظر علیؒ (مولاناؒ کے والد ماجد) اسی محکمہ میں ملازم ہوئے۔ طبیعت میں توکل، استغناء اور سادگی بیحد تھی چنانچہ ملازمت کو راہِ سلوک میں رُکاوٹ محسوس کرتے ہوئے آپ نے نومبر ۱۸۶۲ء میں اس سے سبکدوشی حاصل کر کے کاکوری آکر مستقل سکونت اختیار کر لی اور طبابت کو ذریعہ معاش بنایا، اس کے علاوہ کچھ آمدنی بذریعہ کاشتکاری بھی حاصل ہو جاتی تھی۔

حکیم صاحبؒ کے اپنے وقت کے اکثر مشائخ سے روابط تھے جن میں مولانا شاہ عبدالسلام ہنسویؒ[1] بھی تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنے بعض مکتوبات میں حکیم صاحبؒ کا ذکر بڑے احترام اور محبت سے کیا ہے اور اپنے متعدد مکاتیب میں اُن سے دعاء کی درخواست بھی کی ہے جس سے ان کی رُوحانی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حکیم صاحبؒ کو بیعت کا تعلق کاکوری میں سلسلۂ چشتیہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ کرامت علیؒ سے تھا اور انھیں سے آپ کو خلافت بھی حاصل ہوئی جن کا مزارِ مقدس آج بھی محلہ شیخ سعدی کاکوری میں مرکزِ خیر و برکت بنا ہوا ہے۔ حکیم صاحب کو اپنے شیخ سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی اور شیخ کی بھی نظرِ التفات آپ پر بہت تھی۔ اسی عقیدت و تعلّق کی بنا پر حکیم صاحبؒ نے اپنے آخر وقت میں یہ وصیت کی تھی کہ انھیں وفات کے بعد شیخ کی درگاہ کے صدر دروازہ کے پاس اس جگہ دفن کیا جائے جہاں حاضرین و زائرین جوتے اتارتے ہیں۔ لہٰذا آپ کو وفات کے بعد وصیت کے مطابق اسی مقام پر دفن کیا گیا۔ چنانچہ درگاہ کے بیرونی احاطہ کے اُس دروازے[2] کے سامنے جو مغرب کی جانب واقع ہے آپ کی آخری آرامگاہ بنائی

---

[1] حضرت مولانا سید شاہ عبدالسلام ہنسویؒ ۱۸۱۸ء میں ہنسوہ ضلع فتح پور (یوپی) میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد سیّد شاہ ابوالقاسم نقشبندیؒ تھے۔ آپ کا تاریخی نام سیّد ریاض الحسن تھا، بہت عبادت گذار اور متقی بزرگ تھے، حفظِ قرآنِ مجید کے بعد اکثر ابتدائی کتب درسیہ اپنے چچا مولوی سراج الدین احمدؒ سے پڑھیں، اس کے بعد مولوی معین الدین کڑویؒ اور مولوی محمد معین لکھنویؒ وغیرہ سے تکمیل کی۔ صحاحِ ستہ کی سند حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدّث دہلویؒ سے حاصل کی۔ ۱۸۵۴ء میں تحصیلِ علم سے فراغت ہوئی۔ حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددیؒ سے آپ نے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی اور انھیں سے خلافت حاصل کی۔ ۱۸۶۵ء میں حج و زیارت کے لیے گئے اور وہاں شیخ احمد دحلان مکی شافعیؒ سے تکمیلِ حدیث کی، پھر اس کے بعد مخلوقِ خدا کے لیے رُشد و ہدایت کا سبب بنے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے شوال ۱۸۸۱ء میں بعارضہ دبل وفات پائی اور ہنسوہ ہی میں مدفون ہوئے۔ شیخ محمد علی طلیق ہنسویؒ نے 'نور اللہ تربتہٗ' سے تاریخِ وفات نکالی تھی۔ (تذکرہ علماء ہند، ص ۲۱-۱۲۰)

[2] درگاہ کے ذمہ داروں نے اب یہ دروازہ بند کرا دیا ہے۔

گئی۔ اسی تعلق کی بنا پر آج بھی اس خاندان کے بہت سے افراد اسی خطہ میں دفن ہوتے رہے ہیں۔ شیخ کی محبت وعقیدت ہی کی وجہ سے حکیم صاحبؒ نے اپنے آباء واجداد کی قدیم رہائشی جگہ محلہ کٹرہ کو چھوڑ کر محلہ شیخ سعدی میں ایک قطعہ آراضی خرید کر اپنا مکان بنوایا اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے اور پھر اسی مکان سے بالآخر آپ نے ۱۹۰۱ء میں سفر آخرت بھی طے کیا، آپ کے بعد آج تک آپ کی نسلیں اسی محلہ میں سکونت پذیر ہوتی رہی ہیں۔

حکیم فضل علیؒ کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جن میں سب سے بڑے بیٹے مولوی حافظ محمد ناظر علیؒ تھے جو مولانا لکھنویؒ کے والد ماجد تھے، باقی دو بیٹوں میں ایک شیخ محمد نقی علیؒ اور دوسرے حکیم محمد یوسف حسینؒ تھے۔ شیخ محمد نقی علیؒ کی شادی صفی پور ضلع اُناؤ (یوپی) میں ہوئی تھی جن سے تین بیٹے شیخ محمد تقی علیؒ، حافظ محمد ظہورؒ اور منشی محمد عبدالظاہرؒ اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ حکیم محمد یوسف حسینؒ کی شادی بھی صفی پور ضلع اُناؤ (یوپی) میں ہوئی تھی، جن سے تین بیٹے منشی محمد یعقوب حسینؒ، منشی محمد ایوب حسینؒ، منشی محمد مصطفیٰ حسینؒ اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ ان سب حضرات کی اکثر اولادیں اب بھی کاکوری میں سکونت پذیر ہیں۔

مولوی حافظ محمد ناظر علیؒ کے حالات کو کچھ تفصیلی طور پر بیان کیا جائے گا کیونکہ مولانا لکھنویؒ کی شخصیت اور کردار سازی میں جن تین بزرگوں کا حصہ رہا ہے ان میں پہلے بزرگ حافظ صاحبؒ ہی ہیں جو اُن کے والد ماجد تھے اور جن کی شفقت اور تربیت کے سایہ میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ اُن کے حالات سے یہ اندازہ ہوگا کہ کتنے بابرکت اور برگزیدہ والدین کی گود میں مولاناؒ نے آنکھ کھولی تھی۔ جنھوں نے مستقبل کی ایک ایسی شخصیت کے کردار کی تعمیر کی جس نے ملّت کے سوتے ہوئے لوگوں کو جگایا اور حق و باطل کے درمیان ایک نشانِ امتیاز قائم کر دیا۔

مولوی حافظ محمد ناظر علیؒ (۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۱ء)

مولوی حافظ محمد ناظر علیؒ عربی اور فارسی کے جیّد عالم تھے، علم طریقت کے ایک پختہ کار بزرگ ہونے کے ساتھ دنیاوی حیثیت سے بھی ایک ممتاز مقام کے مالک تھے۔ سلطنت اودھ کے زوال پذیر دور اور برطانوی اقتدار کے ابتدائی نقوش اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھے۔ اپنے آبائی وطن کاکوری ضلع لکھنؤ میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کاکوری ہی میں ہوئی اور

بچپن کا زمانہ بھی وہیں گذرا، جب بڑے ہو کر سنِ شعور کو پہنچے تو والد ماجد حکیم شیخ فضل علی (م ۱۹۰۱ء) آپ کو لے کر لکھنؤ آئے اور یہاں کے بعض مشہور اساتذہ کے سپرد کر دیا۔ اس زمانے میں تعلیم و تعلّم کے لیے آج کل کی طرح مدارس نہ تھے بلکہ ہر علم و فن کے اساتذہ کے اپنے مخصوص اور نجی حلقے ہوا کرتے تھے جن میں وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے چنانچہ انھیں حلقوں میں سے بعض میں حافظ صاحبؒ بھی شریک ہونے لگے۔ جمعہ کی شام کو کاکوری سے لکھنؤ پیدل آتے اور پھر جمعرات کی شام کو لکھنؤ سے کاکوری واپس جاتے۔ یہ سات آٹھ میل کا راستہ اس طرح طے ہوتا کہ لکھنؤ اور کاکوری سے روانہ ہوتے وقت بھُنے ہوئے چنے جیب میں بھر لیتے اور راستے میں اسے چباتے ہوئے روانہ ہوتے یہاں تک کہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتے۔ لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں اکثر کھانا خود اپنے ہاتھ سے پکاتے اور خود ہی کپڑے بھی دھولیا کرتے تھے۔ اس طرح سادگی اور محنت کے ساتھ آپ نے تعلیم حاصل کی۔ فارسی کا مروّجہ نصاب مکمل کرنے کے بعد عربی کی درسیات بھی مکمل کیں۔ فراغت کے بعد اپنے والد ماجد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ باوجود تلاش و تحقیق کے یہ پتہ نہ چل سکا کہ حافظ صاحبؒ نے اس زمانے کے کن اساتذہ سے استفادہ کیا تھا۔ آپ کے بعض مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو فقہ سے کافی دلچسپی تھی چنانچہ بعض مکتوبات میں فقہ کے بڑے دقیق مسائل پر کلام کیا ہے۔ غالباً اسی علمی ذوق کی بنا پر مسند وقت حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ (م ۱۸۸۶ء) سے بھی آپ کے خاصے روابط تھے اور باہم علمی معاملات میں مراسلت بھی ہوا کرتی تھی۔

شادی خانہ آبادی

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کے والد کو آپ کی شادی کی فکر ہوئی، لہٰذا قصبہ صفی پور ضلع اُناؤ کے ایک ممتاز سیّد گھرانے میں آپ کا عقد کر دیا گیا۔ آپ کے خسر سیّد نصیر الدینؒ بن سیّد مسیح الدین صفی پور کے باعزت اور خوشحال لوگوں میں سے تھے۔ آپ کی اہلیہ محترمہ جنھیں سارا خاندان 'بی بی' کہا کرتا تھا نہایت دیندار، پابندِ صوم و صلوٰۃ اور تہجد گذار خاتون تھیں۔ اپنے حسنِ انتظام اور سلیقہ مندی کی بنا پر پورے خاندان پر ان کا اثر تھا۔ ان کی یادداشت اور خاندانی معلومات بھی بہت وسیع تھیں جن کا اکثر وہ اظہار کیا کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کی عمر میں بڑی برکت عطا فرمائی

تھی۔ حافظ صاحبؒ کے وصال کے کافی عرصہ بعد تک وہ حیات رہیں۔ راقم الحروف کو ان کی زیارت کا شرف حاصل ہو چکا ہے، اس وقت وہ اپنی سماعت اور بصارت دونوں سے تقریباً محروم ہو چکی تھیں مگر ہوش و حواس پوری طرح کارفرما تھے۔

حضرت مولانا لکھنویؒ اپنی والدہ ماجدہ کی زیارت اور مزاج پرسی کے لیے برابر کاکوری تشریف لے جایا کرتے تھے اور اپنے ساتھ کچھ نرم اور ملائم پھل بھی لے جاتے اور خود اپنے ہاتھ سے انھیں کھلاتے تھے۔ اس وقت وہ کبرسنی کی وجہ سے از خود چل پھر نہیں سکتی تھیں مگر نماز اور دیگر اوراد و وظائف بیٹھے بیٹھے سب ادا کرتی تھیں۔ چوڑی دار پاجامہ، سفید کرتا اور سفید دوپٹہ ان کا لباس تھا۔ تقدس اور بزرگی بالخصوص وجاہت اور حشمت ان کے چہرے سے عیاں ہوتی تھی۔ پان کی وہ بہت شوقین تھیں اور اس سلسلہ میں بڑا اہتمام کرتی تھیں۔ آخر میں کچھ دن علیل رہ کر تقریباً نواسی (۸۹) سال کی عمر پر پہنچ کر ربیع الثانی ۱۳۶۱ھ یعنی ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔ تجہیز و تکفین کاکوری میں ہوئی اور اپنے اسی آم کے باغ میں جہاں حافظ صاحب مدفون ہیں وہ بھی دفن ہوئیں۔

ملازمت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حافظ صاحبؒ کے والد ماجد حکیم فضل علی ضلع فتح پور کی کلکٹری میں محرر نیلام کی حیثیت سے ملازم تھے۔ جب وہ حافظ صاحبؒ کی تعلیم اور شادی سے فارغ ہوئے تو ان کو ان کے لیے بھی کسی مشغلہ کی فکر ہوئی، اسی اثناء میں حکیم صاحبؒ کو اتفاقاً بعض خانگی ضروریات کے لیے ایک ماہ کی رخصت لینے کی ضرورت پیش آئی لہٰذا آپ نے اپنی جگہ عوضی میں حافظ صاحبؒ سے درخواست دلوادی۔ حکیم صاحبؒ اپنے محکمہ میں بہت نیک نام اور ہر دلعزیز تھے اس لیے فوراً درخواست منظور کر لی گئی۔ اس طرح حافظ صاحبؒ ۱۰/دسمبر ۱۸۶۲ء کو فتح پور کلکٹری میں اپنے والد کی عوضی میں محرر مقرر ہو گئے۔ جب رخصت کی مدت پوری ہونے کا وقت آیا تو حکیم صاحب نے آئندہ خود ملازمت کرنے کا ارادہ ختم کر دیا اور قبل از وقت سبکدوشی حاصل کر لی لہٰذا اسی جگہ پر حافظ صاحبؒ فروری ۱۸۶۳ء میں مستقل کر دیئے گئے۔ آپ نے اپنے فرائض منصبی اتنی مستعدی، لیاقت اور دیانتداری کے ساتھ انجام دیئے کہ آپ کے حکام بالا یعنی ضلع کلکٹر وغیرہ جو اس زمانے میں انگریز ہوا کرتے تھے بہت متاثر ہوتے اور اظہارِ مسرت کرتے

تھے، اسی لیے آپ کو بہت جلد جلد اپنے محکمہ میں ترقی ملتی گئی چنانچہ ۱۰ر دسمبر ۱۸۶۶ء میں آپ قانون گو کے عہدے پر فائز کردیئے گئے، اس وقت آپ کی تنخواہ بیس روپیہ ماہوار تھی پھر ۲۵ر اپریل ۱۸۷۱ء میں چالیس روپیہ ماہوار پر پیش کار بنادیئے گئے۔ کام کی لگن، محنت اور خلوص ہمیشہ پیشِ نظر تھا جس کے نتیجہ میں ۳ر مارچ ۱۸۷۳ء میں تحصیل فتح پور میں نائب تحصیلدار بنادیئے گئے۔ یکم جولائی ۱۸۷۸ء میں قائم مقام تحصیلدار درجہ دوم مقرّر ہوئے اور پھر اس وقت سے رٹائر ہونے تک مسلسل تحصیلداری کے عہدے پر فائز رہے۔ ملازمت کی زیادہ تر مدّت ضلع فتح پور کی مختلف تحصیلوں میں گذری جن میں تحصیل فتح پور، کھھریڑو، غازی پور، کلیان پور، کھاگا اور کوڑا جہان آباد وغیرہ شامل تھیں۔ کچھ عرصہ کے بعد ان میں سے بعض تحصیلیں شکست ہوگئیں۔

اپنے فرائض میں چابکدستی اور رعایا کے ساتھ انصاف و دیانتداری کا برتاؤ دیکھتے ہوئے افسران بالا نے ۱۶ر نومبر ۱۸۹۲ء میں حافظ صاحب کو مجسٹریٹ کے اختیارات بھی سونپ دیئے تھے۔ لہٰذا اس کے بعد جب تک آپ اپنی ملازمت میں رہے ضلع مجسٹریٹ کے بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ ملازمت کے آخری تین چار سال تحصیل کماسن ضلع باندہ (یوپی) میں گذرے اور پھر وہیں سے ۱۸۹۸ء میں آپ ریٹائر ہوگئے۔[1]

وضع قطع اور رہن سہن

وضع قطع کے لحاظ سے آپ انتہائی سادگی پسند تھے۔ ہمیشہ فقیرانہ زندگی بسر کی۔ امارت کی بُو کبھی پاس تک نہ پھٹکی، وہی پرانی وضع کے کُرتے اور چوڑی مہری کے اونچے پائجامے پہنتے تھے، ڈوری دار جوتے کبھی نہیں پہنے، البتہ جب عدالت میں بیٹھتے تو بہت صاف ستھرا انگرکھا زیب تن فرماتے، اور نہایت پُروقار انداز میں فیصلہ سناتے تھے، عمدہ کھانے کا شوق بھی کبھی نہ تھا، مٹی کے برتن میں اکثر کھانا کھاتے اور اسی کو پسند فرماتے تھے۔ برطانوی حکومت کے درباروں میں ہمیشہ مدعو کیے جاتے مگر ایک بار کے علاوہ کبھی شریک نہیں ہوئے، مزاج میں حکومت اور تکبّر بالکل نہ تھا، تمام ماتحت زمیندار اور چپراسی سے لے کر نائب تحصیلدار تک سب آپ سے بڑی محبت اور عزّت کے ساتھ پیش آتے تھے، یہی وجہ تھی کہ گھر اور گھر کے باہر سب ہی لوگ آپ کو 'بابا' کہہ کر

---

[1] النجم ہفت روزہ، لکھنؤ ۲۱ر ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ

پکارتے تھے۔

انصاف اور رحم دلی

باوجودیکہ دین میں پختگی بہت غالب تھی مگر کبھی رعایا اور ماتحت عملہ کو جن میں ہندو اور شیعہ دونوں ہوتے تھے ان پر تعصب کا گمان کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ریٹائرمنٹ کے زمانے میں ایک صاحب میر سعید الدین ان کے ماتحت شیعہ نائب تحصیلدار تھے، انھوں نے آپ کے ریٹائر ہونے کا بہت صدمہ کیا تھا، رحیم و کریم اس قدر تھے کہ کسی کو سزا و قید بہت کم دیتے تھے۔ کبھی مجبوراً کسی کو ایسی سزا دیتے بھی تو فیصلہ لکھتے وقت خود بھی رونے لگتے تھے۔ آپ کے انصاف اور تقویٰ و طہارت کے معترف آپ کے حکّام بھی تھے۔ اسی لیے انھوں نے آپ کی کارکردگی اور بہترین صلاحیتوں کے اعتراف میں بہت سے سرٹیفکیٹ دیئے تھے جو شاید ہی کسی کو ایسے ملے ہوں گے۔ یہ سرٹیفکیٹ آج بھی محفوظ ہیں اور راقم الحروف نے انھیں دیکھا ہے۔ یورپین حکّام سے بہت کم ملتے تھے مگر جب ملتے تھے تو بڑی آن بان کے ساتھ ملتے تھے۔ مسٹر رستم جی کلکٹر فتح پور نے ایک مرتبہ اپنے ضلع کے تمام تحصیلداروں کے نام یہ روبکار جاری کیا تھا کہ وہ لوگ اس طرح فیصلہ لکھا کریں جس طرح مولوی ناظر علی فیصلہ لکھتے ہیں۔[1]

کاکوری کی آنریری مجسٹریٹی

جب آپ ریٹائرمنٹ کے وقت مسٹر سمسن کلکٹر سے آخری ملاقات کو گئے تو اُن سے کہا:

> ”کچھ سرکاری کاغذ، قلم اور روشنائی میرے نجی کاموں میں بھی خرچ ہوئی ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ گورنمنٹ کو اس کی اطلاع کر کے مجھے معاف کرادیں۔[2]“

اس بات کا کلکٹر پر بڑا اثر ہوا چنانچہ جب وہ لکھنؤ میں ڈپٹی کمشنر ہو کر آئے تو آپ سے خاص طور پر آ کر ملاقات کی اور کاکوری کی آنریری مجسٹریٹی کا عہدہ قبول کرنے پر اصرار کیا مگر آپ نے معذرت کرتے ہوئے انکار کر دیا۔

محبّتِ اولاد

حافظ صاحب کو اپنی اولاد کے ساتھ بہت تعلّق تھا۔ مولانا لکھنویؒ فرماتے ہیں:

---

[1] النجم ہفت روزہ، لکھنؤ، ۲۱ رذی الحجہ ۱۳۲۹ھ [2] ایضاً

''میں نے کسی باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ ایسی محبت کرتے نہیں دیکھا، جب میں ایام تعطیل میں گھر آتا تو بہت خوش ہوتے اور جب میرے چلنے کا وقت آتا تو بہت روتے تھے۔''[۱]

ایک مرتبہ کلکٹر اور کمشنر دونوں قحط سالی کا معائنہ کرنے مقام کروی ضلع باندہ آئے اور حافظ صاحب کو طلب کیا لہٰذا آپ گئے، اس وقت صاحبزادوں میں سے کوئی علیل تھا اس وجہ سے شب کو کروی میں ٹھہرنے سے معذرت کی مگر کمشنر نے اجازت دینے میں کچھ تامل کیا تو آپ نے اس قدر بلند آواز اور نہایت سخت لہجہ میں اپنی ناراضی کا اظہار کیا کہ شاید کمشنر کے برابر کا کوئی دوسرا عہدہ دار بھی ان سے ایسی گفتگو نہ کرتا۔ کلکٹر مسٹر فراڈ بہت مزاج شناس تھے، انھوں نے ملاطفت کر کے ان کے غصہ کو فرو کیا۔ آپ کی دو اولادوں کا آپ کے سامنے انتقال ہوا تھا جن میں ایک بچی مریم عمر سات سال اور دوسرے صاحبزدے عبدالرحمٰن عمر چار سال تھے مگر آپ نے ان دونوں کی وفات پر جس صبر و تحمل سے کام لیا اس کی مثال کم ہی ملے گی۔

علم دین اور توکّل علی اللہ

لوگ عموماً اپنی اولاد کو تعلیم و تربیت ایسی دینا چاہتے ہیں جو زمانے اور حالات کے مطابق ہو تاکہ اس سے اولاد زیادہ سے زیادہ دُنیاوی فائدہ حاصل کر کے خاندان کو خوشحال اور فارغ البال بنا سکے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کے تسلّط و اقتدار کے اثر سے کچھ ایسی صورتِ حال پیدا ہوئی کہ دینی تعلیم کے بجائے انگریزی زبان سیکھنا زیادہ فائدہ منداور اعلیٰ مناصب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہو گیا۔ چنانچہ عربی فارسی کی تعلیم کی اہمیت گھٹنے لگی خاص طور سے علومِ دینیہ کی طرف سے لوگوں کی رغبت کم سے کم تر ہونے لگی، اسی ماحول سے حافظ صاحب کو بھی سابقہ پڑا۔ چنانچہ مولانا کی تعلیم کے زمانے میں بھی بہت سے اصحاب حافظ صاحبؒ سے یہ کہتے کہ آپ اپنے لڑکے کی عمر کیوں ضائع کر رہے ہیں، کچھ تھوڑی بہت فارسی پڑھا کر انگریزی پڑھوایئے، اب زمانہ انگریزی کا ہے، خدا نے آپ کو ایسے گراں قدر عہدے پر فائز کیا ہے اور یورپین حکّام بھی آپ کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں لہٰذا آپ کی سفارش ہرگز رائیگاں نہیں جائے گی۔ اوّلاً احباب کے اس قسم کے اصرار کو خاموشی سے ٹال دیتے مگر جب

---

[۱] النجم ہفت روزہ، لکھنؤ، ۲۱ ذی الحجہ، ۱۳۲۹ھ

بہت مجبور کیا جاتا تو فرماتے:

''بھائی! دنیا تو کسی نہ کسی طرح گذر ہی جائے گی، رزق کا ذمہ دار تو حق جل شانہٗ ہو ہی چکا ہے پھر اس کے لیے اس قدر پریشانی اور اس قدر بلیغ کوشش کی کیا ضرورت ہے، ہاں! جو کچھ کوشش ہو سکے دین کے لیے ہونی چاہیے۔

غم دیں خور کہ غم غم دین است   ہمہ غمہا فرو تر ازاین است[1]

یہ تو ان کے احباب کی کیفیت تھی، کئی مرتبہ ان سے ان کے یورپین حکام نے بھی اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ اپنے لڑکے کو انگریزی پڑھائیں ہم ابتداء ہی میں اس کو کوئی بڑا عہدہ دے دیں گے، خاص کر مولوی حشمت اللہ مرحوم نے جو اس وقت فتح پور میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے اور پھر بعد میں کہیں کلکٹر بھی ہو گئے تھے بہت ضد کی مگر آپ کے ارادے میں ذرا بھی جنبش نہیں پیدا ہوئی اور اس سلسلہ میں وہ حضرت رب العزّت سے جو عہد کر چکے تھے اس پر خوب مضبوطی سے قائم رہے۔[2]

یہ تھا علم دین سے لگاؤ، شغف اور توکّل علی اللہ کہ دُنیاوی ترقی اور فلاح و بہبودی کے تمام وسائل موجود تھے بلکہ قدموں کے نیچے تھے لیکن ان کے عزم و ثبات میں ذرا بھی تزلزل نہیں آیا، چاہتے تو صاحبزادے کو انگریزی پڑھا کر اونچے سے اونچا عہدہ دلوا سکتے تھے جس سے خود بھی مادی فائدہ اٹھاتے اور ان کی آنے والی نسلیں بھی فائدہ اٹھاتیں، مگر اللہ رے ثابت قدمی اور تقویٰ و قناعت پسندی! اگر مولانا لکھنویؒ انگریزی تعلیم حاصل کر کے دنیاوی مفادات کے حصول میں لگ جاتے تو آگے چل کر دین کی یہ خدمت اور اعدائے دین سے یہ دفاع کون کرتا جو قدرت کو اُن کے ہاتھوں سے کرانا تھا۔ درحقیقت مولانا نے جو بھی دین کی خدمت اور جو کچھ بھی علمی خدمات انجام دی ہیں وہ یقیناً سب ہی حافظ ناظر علیؒ ہی کی رہین منّت ہیں کیونکہ اگر وہ انھیں اس راستے پر نہ لگا جاتے تو کم از کم ایک مخصوص پسِ منظر میں برصغیر کی دینی حالت وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔

بیعت

حافظ صاحبؒ قدس سرہٗ محض اپنی ذاتی صلاحیت اور لیاقت کی وجہ سے بہت جلد تحصیلداری کے معزز عہدے پر فائز کو دیئے گئے تھے، اس زمانے میں یہ عہدہ آمدنی اور تنخواہ اور عزّت و وقار کے لحاظ سے بہت بڑی چیز سمجھا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں آپ کا شمار کاکوری کے خوشحال

---

[1] النجم ہفت روزہ، لکھنؤ، ۲۱ رذی الحجہ، ۱۳۲۹ھ   [2] النجم ہفت روزہ، لکھنؤ، ۱۳۲۹ھ

اور متمول افراد میں ہوتا تھا، اپنے فرائض منصبی اور کثرتِ کار کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس اور زہد و اتقا کے تقاضہ پر کسی شیخ کامل کی تلاش و جستجو بھی جاری رہتی تھی۔ یہ بھی حسن اتفاق تھا کہ آپ کی ملازمت کا بیشتر حصہ فتح پور اور ضلع فتح پور (یو پی) میں گذرا، سوائے ان آخری چار برسوں کے جو تحصیل کماسن ضلع باندہ میں گذرے تھے۔ فتح پور کے زمانۂ قیام میں انھیں جہاں دنیوی عزت و مرتبہ حاصل ہوا تھا وہیں روحانی ترقی اور سلوک کی اعلیٰ منزل پر پہنچنے کا ذریعہ بھی ہاتھ آ گیا۔ یعنی آپ نے قدیم خاندانی روایات سے ہٹ کر سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک گوہر نایاب کو حاصل کر ہی لیا۔ اس طرح آپ کو حضرت مولانا سید شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ سے شرفِ بیعت حاصل ہوا۔ شاہ صاحبؒ کے خاندان کے اکثر افراد آج بھی ہنسوہ ضلع فتح پور، تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی اور لکھنؤ وغیرہ میں بحمد اللہ موجود ہیں۔ مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنی[1] سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی ان کے بہت ہی قریبی عزیز تھے۔

حافظ ناظر علی کو شاہ عبدالسلام ہنسویؒ سے بیعت و خلافت حاصل ہوئی، شاہ صاحب ہنسویؒ خلیفہ تھے شاہ احمد سعید صاحب دہلویؒ (م ۱۸۶۰ء) کے، وہ خلیفہ تھے اپنے والد ماجد شاہ ابوسعید صاحب دہلویؒ (م ۱۸۳۵ء) کے جو مجدد مأۃ ثالث عشر مولانا شاہ غلام علی مجددی دہلویؒ

---

[1] مولوی حکیم سید عبدالحی حسنیؒ ۱۸۶۹ء میں دائرہ شاہ علم اللہ حسنیؒ رائے بریلی (یو پی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کرنے کے بعد آپ نے الٰہ آباد، بھوپال اور لکھنؤ میں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کی جن میں مولانا محمد حسین الٰہ آبادیؒ، مولانا سید احمد دہلویؒ، شیخ حسین بن محسن انصاری یمانیؒ، مولانا شیخ محمد عربؒ، حکیم عبدالعلی لکھنویؒ، مولانا فتح محمد تائبؒ اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلیؒ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ۱۳۱۱ھ میں حکیم عبدالعزیز لکھنویؒ سے طب پڑھی اور حکیم عبدالولیؒ سے نسخہ نویسی کی مشق کی۔ آپ کو مولانا شیخ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے بیعت کا بھی تعلق تھا لیکن باطنی تعلیم و تربیت اپنے خسر شیخ ضیاء النبیؒ، والد ماجد مولوی حکیم سید فخرالدین حسنی خیالیؒ اور ماموں حضرت مولانا سید عبدالسلام صاحب ہنسویؒ سے حاصل کی۔ ۱۸۹۴ء میں ہندوستان کے مشہور علمی مراکز کا سفر کیا جہاں مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ، مولانا عبدالعلی صاحب دہلویؒ، قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتیؒ سائیں توکل شاہ انبالویؒ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بھی کسب فیض کیا۔ ۱۸۹۵ء میں مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ کی ماتحتی میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کام شروع کیا اور ۱۹۰۵ء میں وہاں کے نائب ناظم بنائے گئے اور پھر بعد میں ۱۹۱۵ء میں ندوہ کے ناظم مقرر ہوئے، آپ کئی اہم کتابوں کے مصنف بھی تھے جس میں نزہۃ الخواطر (آٹھ جلدوں میں) الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، گلِ رعنا وغیرہ بہت زیادہ مشہور و مقبول ہوئیں۔ ۲ر فروری ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں آپ کا انتقال ہوا اور تکیہ شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلی میں دفن ہوئے۔

(م ۱۸۲۴ء) کے خلیفہ تھے، جن کی خانقاہ آج بھی محلہ چتلی قبر دہلی میں مرجع خلائق ہے۔ حافظ صاحبؒ کی پوری زندگی بڑی پاک وصاف اور روحانی اعتبار سے نہایت اَرفع واعلیٰ تھی۔ کچھ تو ان کی فطرت ہی سعید تھی اور کچھ ان کے شیخ کامل نے ان کو باکمال بنا دیا تھا۔

دینداری اور سلوک باطن

دینداری اور سلوک باطن کے آثار دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو ظاہری اعضاء وجوارح سے نمایاں ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جن کی نورانیت کا تعلق صرف باطن ہی سے رہتا ہے، لہٰذا اس ضمن میں ہم آپ کے وہی حالات لکھ سکتے ہیں جن کا اثر ظاہری طور پر نمایاں تھا اور جن کے ادراک تک حواسِ ظاہری کی رسائی ہوسکتی ہے، باقی رہیں ان کی باطنی کیفیات تو ان کے بارے میں ہم جیسے کم فہم اور بے ادراک لوگ کیا بیان کر سکتے ہیں، پھر بھی حضرت شاہ عبدالسلام ہنسویؒ کی بعض ان تحریرات سے جو انھوں نے حافظ صاحبؒ کے نام وقتاً فوقتاً بھیجی تھیں جو کچھ اندازہ ہوتا ہے اسے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔ پیرومرشد جب بھی اپنے مرید مخلص کو کوئی مکتوب روانہ فرماتے تو انھیں عزیز دلی، سعید ازلی، عزیز قلبی، قرۃ عینی، محب الفقراء، عزیز سعید، صلاحیت نشاں اور سعادت نشاں جیسے محبت آمیز القاب سے یاد فرماتے تھے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ کے ان مکتوبات کی تعداد ستر اسّی کے قریب ہے جو انھوں نے متعدد موقعوں پر حافظ صاحب کو تحریر فرمائے تھے۔ ان مکاتیب کا بیشتر حصہ اب بھی ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہ خطوط عجیب و غریب اور پُر تاثیر ہیں، ان سے دونوں بزرگوں کے تعلقات اور تحائف وغیرہ کے باہم تبادلے کے علاوہ حافظ صاحب کی دینداری اور ان کی روحانی عظمتوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت شاہ صاحبؒ اپنے ایک مکتوب میں حافظ صاحب کو اس طرح لکھتے ہیں:

الحمدللہ کہ آں عزیز بہ تعمیل مرضاۃ اللہ بہمہ تن مصروف اند کہ ثمراتش بہ ظہور می رسند، جزاک اللہ فی الدارین خیراً و آنچہ از فقیر سبق گرفتہ اند بتکرارش مشغول باشند غفلت نہ ورزند۔[1]

خدا کا شکر ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشا کی تعمیل میں ہمہ تن مصروف ہیں (انشاء اللہ) اس کے ثمرات ظاہر ہوں گے، اللہ تعالیٰ آپ کو دین ودنیا دونوں جگہ بہتر جزا عطا فرمائے، فقیر سے جو کچھ آپ نے سیکھا ہے اس کی تکرار میں مشغول رہیں غفلت اختیار نہ کریں۔

---

[1] مکتوبات شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (قلمی) مملوکہ راقم الحروف، ص ۱۹

ایک دوسرے مکتوب میں آپ کے احوالِ قلبی معلوم کر کے بڑی مسرّت اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں:

بعد سلام مسنون و دعا مطالعہ نمائند کہ خط فرحت نمط رسید، از کیفیت قلبی و رُوحی مژدہا و مسرّتہا رسانید، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِک اَللّٰھُمَّ زِدْ وَلَا تَنْقُص، گاہ گاہ ازیں کیفیت مطلع کردہ باشند۔[1]

بعد سلام مسنون و دعا کے معلوم ہو کہ آپ کا مسرّت افزا خط ملا، آپ کی کیفیت قلبی و رُوحی سے بہت مسرّت اور خوشی حاصل ہوئی، الحمد للہ علیٰ ذالک، اللہ اس کو زیادہ کرے اور کمی نہ لائے اس کیفیت سے کبھی کبھی مطلع فرماتے رہا کریں۔

اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ لکھتے ہوئے کچھ بڑی قیمتی نصیحتیں تحریر فرماتے ہیں:

بزبانی عبدالغفور خیریت شما معلوم شد اطمینان گردید، ہروقت و ہمہ لحظہ از یادِ الٰہی غافل نہ باشند و ہردم موت را یاد دارند ورنہ حسرت و ندامت نقد وقت است۔[2]

عبدالغفور کی زبانی آپ کی خیریت معلوم ہوئی جس سے اطمینان ہوا، کسی وقت اور کسی لمحہ یادِ الٰہی سے غافل نہ رہیں اور موت کو ہر وقت یاد رکھیں ورنہ حسرت وندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

حافظ صاحب کو اپنے شیخ سے بیحد محبت تھی جس کا اندازہ ان کے مکاتیب سے بخوبی ہوتا ہے۔ چونکہ وہ ضلع میں نائب تحصیلدار اور تحصیلدار کی حیثیت سے تھے اس لیے اکثر مکاتیب میں حضرت شاہ صاحبؒ نے مختلف ضرورت مندوں کے لیے سفارشات بھی لکھی ہیں جنھیں وہ بسر وچشم پورا بھی کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحبؒ کسی غیر مستحق کی سفارش ہرگز نہ کرتے ہوں گے اور نہ ہی ان کی سفارش سے کسی جائز حق دار کی حق تلفی ہوتی ہوگی۔ خلق اللہ کی خدمت کے جذبہ سے یہ حضرات سفارشات سے گریز نہ کرتے تھے اور پرہیزگار و متقی حکام حق وانصاف کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر ضرور ان کی تعمیل کرتے تھے۔ ارشاد نبویؐ کی اتباع میں لائق مرید اپنے شیخ کی خدمت میں بعض تحائف بھی پیش کیا کرتے تھے۔ ان مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر حضرت شاہ صاحبؒ خود بھی کسی چیز کی فرمائش کر دیا کرتے تھے جیسا کہ پرخلوص تعلقات میں عموماً ہوا کرتا ہے مگر اس کے باوجود اگر مرید کی طرف سے کوئی ادنیٰ امر بھی شریعت کی رُوح کے منافی ہوتا تو شیخ کی جبین طریقت پر بل پڑ جاتے اور فوراً ٹوک دیتے تھے، یہ تھا اصلاحِ نفس اور تزکیۂ باطن کا طریقۂ کار! چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں اسی قسم کے ایک واقعہ پر حضرت شاہ صاحبؒ تحریر کرتے ہیں:

---

[1] مکتوبات شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (قلمی) مملوکہ راقم الحروف، ص ۱۸ [2] ایضاً، ص ۲۰

مکرر آنکہ فقیر یک عدد کھیس از شما طلبیدہ بود، دو چرا فرستادند، ایں زیادتی آں عزیز خوش نمی آید، آئندہ چیزے نخواہم کرد، اگر واپس می سازم ناخوش شوند، پس بہ لحاظ شما از واپسی باز ماندم، آئندہ را ازیں زیادتی خود را دور دارند، ایں محض تکلف است[۱]

مزید برآں فقیر نے آپ سے ایک عدد کھیس[۲] طلب کی تھی، آپ نے دو عدد کیوں بھیج دیں؟ آپ کی یہ زیادتی اچھی نہیں لگی، آئندہ کوئی چیز طلب نہیں کروں گا، اگر واپس کردوں تو اس سے آپ کو ناخوشی ہوگی، اس لیے آپ کی خاطر واپسی سے باز رہتا ہوں، آئندہ اس قسم کی زیادتی سے اپنے آپ کو دور رکھیں، یہ محض ایک تکلف ہے۔

اس طرح معمولی سی معمولی فروگذاشت شیخ کی شریعت پسند طبیعت کو گوارہ نہ تھی۔ شاہ صاحبؒ اپنے دوسرے مکتوب میں حافظ صاحب کے باطنی احوال پر مطلع ہو کر کس درجہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

باستدراک کیفیتِ باطنی من قبل عروج و نزول و جذب وارادت و شرحِ صدر و حضور وغیر ذالک خیلے مسرور الوقت شدم، الحمد للّٰہ علیٰ ذالک، اللّٰھم زدہ، یوماً فیوماً ولا تنقصہ، واز مدت احوال شما ازیں معاملہ معلوم نہ بود ایں از کمال انعام و افضال الٰہی است بر شما کہ باوجود تعلقات شتیٰ دُنیاوی ازیں نعمت غیر مترقبہ محروم نہ ساختہ اند، بہر نصیبی شکر منعم حقیقی جل شانہٗ باید کرد و از یادِ الٰہی غافل نہ باشند، ایں ہمہ احوال شما صحیح اند، تردد نہ کنند[۳]

عروج و نزول و جذب وارادت و شرح صدر اور حضور وغیرہ جیسے باطنی حالات معلوم کرکے اس وقت بہت خوشی ہوئی الحمدللہ علیٰ ذالک، اللہ تعالیٰ اس میں دن بدن ترقی عطا فرمائے اور کوئی کمی نہ لائے، بہت دنوں سے اس معاملہ میں آپ کے حالات معلوم نہ تھے، یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام آپ پر ہے کہ باوجود دنیاوی بکھیڑوں کے اس نے آپ کو اس نعمت غیر مترقبہ سے محروم نہیں رکھا، بہرحال منعم حقیقی جل شانہٗ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کی یاد سے غافل نہ رہنا چاہیے، آپ کے یہ سب احوال بالکل صحیح ہیں (اس میں) شک و شبہ نہ کریں۔

اللہ اللہ خود شیخ اپنے محبوب مرید کے احوال کی تصدیق و تائید کررہے ہیں، کتنے خوش نصیب تھے وہ

۱۔ مکتوبات شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (قلمی) مملوکہ راقم الحروف، ص ۲۲

۲۔ کھیس ایک قسم کی موٹی چادر ہوتی ہے جو اکثر دیہات و قصبات میں استعمال کی جاتی ہے۔

۳۔ مکتوبات شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (قلمی) مملوکہ راقم الحروف، ص ۲۲

شیخ اور کتنے مقدّر والے تھے وہ مرید! اللہ تعالیٰ دونوں بزرگوں کے مدارج بلند فرمائے، شاہ صاحبؒ نے اپنی وفات سے ایک ماہ اور چند روز قبل جو مکتوب آپ کو لکھا تھا وہ آپ کے لیے ایک سند کا درجہ رکھتا ہے۔ یوں تو وہ آپ کو خلافت اور اجازت بیعت بہت پہلے ہی دے چکے تھے مگر ذیل کے مکتوب سے بھی کچھ اس قسم کے اشارے ملتے ہیں۔

دریں وقت از یارانِ طریقت کہ شریک حلقہ فقیر اندکم ایں کیفیت دارند کہ شما دارید[1]

اس وقت جو احباب طریقت فقیر کے حلقہ میں شریک ہیں وہ ایسی کیفیات کم رکھتے ہیں جیسی کہ آپ رکھتے ہیں۔

ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں:

ایں کیفیت را از مغتنمات دانند، فقیر از استعداد شما نہایت خوش وقت است، وایں دُوری ومہجوری بحق شما مفید تر است از حضوری اِلّا گاہ بگاہ حضوری فی الجملہ درکار است[2]

اس کیفیت کو غنیمت جانیں، فقیر آپ کی استعداد سے نہایت خوش ہے، یہ دوری ومہجوری آپ کے حق میں حضوری سے زیادہ مفید ہے۔ ہاں کبھی کبھی حضوری کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

اب تک جن مکتوبات کی عبارتیں پیش کی گئیں ہیں اُن میں آپ کے مقامات عروج پر اظہارِ خوشنودی ومسرّت تھا، شاہ صاحبؒ کے جملہ مکاتیب اسی قسم کے مضامین سے بھرے ہوئے ہیں، ان احوال کی تصدیق وتائید بڑے جذب ومستی کے عالم میں فرماتے ہیں، ان مکاتیب کو دیکھ کر بعض اوقات حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب دہلویؒ قدس سرہٗ اور حضرت مجددالف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے باہم روابط اور تعلقات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ وہاں بھی شیخ ومرید میں یہی مناسبت تھی اور خواجہ دہلویؒ اسی طرح اپنے مرید شیخ سرہندیؒ پر فخر فرماتے تھے۔ آپ کے مکتوبات بھی اسی طرح تعریف وتوصیف سے لبریز ہیں۔ شاہ عبدالسلام صاحبؒ کے مکاتیب میں اکثر مقامات پر ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اکثر وہ لکھ دیا کرتے تھے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ اور کہیں کہیں جوش میں آکر بُشْرٰی لَکُمُ الْیَوْمَ کا نعرہ لگاتے تھے۔ اسی طرح بہت سے کلمات ہیں جن کو تحریر میں لانے سے طولِ عبارت کا خطرہ ہے۔ اخیر میں صرف ایک عبارت

---

[1] مکتوبات شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (قلمی) مملوکہ راقم الحروف، ص ۲۲ [2] ایضاً، ص ۲۴

اور پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جس میں شاہ صاحبؒ نے حافظ صاحبؒ کو دین و دُنیا کی بھلائیوں کی دُعا سے نوازا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

حق سبحانہٗ وتعالیٰ آں عزیز را از جمیع مکروہات دُنیاوی محفوظ داشتہ بہ نسبت حضراتِ صوفیۂ صافیہ مشرف فرمودہ ہموارہ بیاد خود داشتہ بحسن خاتمہ مشرف فرمائد[1]

حق سبحانہ تعالیٰ آپ کو تمام دُنیاوی مکروہات سے محفوظ رکھے اور حضراتِ صوفیۂ کرام کی نسبت سے مشرف فرمائے اور اپنی یاد کی معیت عطا فرمائے اور حسنِ خاتمہ کی دولت نصیب فرمائے۔

ذوقِ شعروسخن

اس دَور کے لکھنؤ کے ماحول کے مطابق مولوی صاحبؒ کو شعروادب سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ شعرادب کے مختلف اصناف میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے جن میں غزل، مثنوی، نعت اور منقبت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے کلام میں اودھ کی زبان کی نرمی اور چاشنی، سلاست وروانی اور تخیل کی بلند پروازی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ تلاش وتحقیق کے باوجود یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ شعروسخن کی دُنیا میں آپ کا سلسلۂ تلمذ کس سے تھا۔ اس بارے میں مختلف اساتذہ شعراء کے نام لیے جاتے ہیں مگر وہ متحقق نہیں ہیں۔ آپ اپنے نام کے ایک جز کو ہی بطور تخلص اختیار کرتے تھے یعنی ناظر تخلص تھا، شعروسخن کا یہ ذوق آپ کو اوائل عمر میں ہی تھا لیکن آگے چل کر ان تمام مشاغل سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ اور سوائے یادِ الٰہی کے اور کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا اس لیے کلام کا بیشتر حصہ ضائع ہوگیا، ہمارے سامنے آپ کا بس وہی کلام ہے جو مولانا لکھنویؒ نے اپنے علمی ودینی ماہنامہ ''النجم'' میں قسط وار شائع کردیا تھا، آپ نے اُردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کی ہے جو زیادہ تر اسلامی تاریخ اور نعت ومنقبت پر مشتمل ہے۔ ہم نمونہ کے طور پر آپ کے چند اشعار پیش کررہے ہیں، پہلے اُردو کا ایک بند درج کیا جارہا ہے جو نعت کا ہے لیکن غزل کے رنگ میں ہے اور خالص لکھنوی انداز میں ہے:

سرِ خجلت جھکایا جب بروزِ حشر اُمت نے ‏ ‏ ‏ اُتارا سر سے عمامے کو سرگرم شفاعت نے
نسیم مغفرت بہنے لگی بکھری جو وہ کاکل ‏ ‏ ‏ کیے گیسو پریشاں ہم سیہ کاروں کی شامت نے

ماہنامہ ''النجم''، لکھنؤ میں آپ کی ایک مثنوی بھی شائع ہوئی تھی جس میں نعتیہ اشعار کے بعد

---

[1] مکتوباتِ شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (قلمی) مملوکہ راقم الحروف، ص ۲۱

خلفائے راشدین کی مدح اور واقعاتِ ہجرت کی پوری منظرکشی ہے، صحابۂ کرامؓ اور بالخصوص خلفائے اربعہؓ کے مناقب میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں انھیں بھی نظم کیا گیا ہے:

خلق پر حجتِ خدا ہیں آپؐ　　مہدی وہادی و ہدیٰ ہیں آپؐ
آپ ہی مہدیٔ خلائق ہیں　　رہنمائی میں سب سے فائق ہیں
آپؐ ہی ہیں مقدم و سابق　　سب نبیوں سے سابق و لائق
نامِ نامی ہدایت اللہ ہے　　آپ کی ذات نعمت اللہ ہے
ہیں ہدایت کے مکتفی و کافی　　مرضِ کفر کے لیے شافی
آپ ہی تو نبیٔ رحمت ہیں　　آپؐ ہی تو نبیٔ توبت ہیں
سب میں ہیں آپؐ ہی صفی اللہ　　سب میں ہیں آپؐ ہی نجی اللہ
سب رسولوں کے آپؐ ہیں خاتم　　سب کے ہیں آپؐ جامع وقیّم
آپؐ کا ہے خطاب مدثر　　آپؐ ہی ہیں مبشر و منذر
آپؐ کی ذات ہے سراجِ منیر　　آپؐ لاریب ہیں بشیر و نذیر
آپ ہی سب میں ہیں خطیبِ اُمم　　آپؐ ہیں سیّدِ بنی آدم
آپؐ ہی تو ہیں سیّد الکونین　　آپؐ ہی تو ہیں سیّد دارین[1]

واقعۂ معراج کو اس طرح نظم کیا ہے:

کس کو معراج یوں ہوئی ظاہر　　کس کو یہ قربِ حق ہو آخر
کون سوتے سے یوں جگایا گیا　　کون یوں پیار سے بلایا گیا
کس نے مرکب بُراق سا پایا　　کس نے رفرف پہ جلوہ فرمایا
کرسیٔ عرش کس کا فرش ہوا　　زیرِ نعلین کس کے عرش ہوا
کس کو قربِ دنیٰ ہوا حاصل　　فتدلّیٰ سے کون تھا واصل
سدرۃُ المنتہیٰ سے گذرا کون　　حق سے اتنا قریب پہنچا کون
کون جبریلؑ سے بڑھا آگے　　خود خدا کس کو لے گیا آگے
قاب قوسین سے قریب تھا کون　　حق سے واں سائل ومجیب تھا کون[2]

---

[1] ماہنامہ النجم لکھنؤ، ۲۱؍رمضان ۱۳۳۰ھ　[2] ایضاً

آپ کے کلام کا بڑا حصہ فارسی میں تھا جس کے کچھ اشعار ہم بطور نمونہ درج کر رہے ہیں جو نعت رسول علیہ السلام سے تعلق رکھتے ہیں:

از دل و جاں یا نبی مشتاق دیدارِ تو ام — روئے خود بنماند آخر عاشقِ زارِ تو ام
مردہ ام خواہم تمنا زندگی جاوداں — از لبِ معجز نما مشتاق گفتارِ توام
یک نگاہِ لطف برحالِ من مسکین بکن — یارسول اللہ آخر کشش بردارِ تو ام
اے خوشا روزے کہ بوسم پا و گوئی کیستی — گویم اے جانم فدایت من نمک خوارِ توام

اس نعت مدحیہ غزل کا مقطع اس طرح ہے:

ایں قدر از من تغافل با چرا داری روا — ناظر دل خستہ ام مشتاق دیدارِ تو ام[1]

ایک دوسری نعت کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

جاں بجاں از درد ہجراں یا محمدؐ استغیث — بہر ہر درد از تو درماں یا محمدؐ استغیث
اے خوشا وقتے کہ در شہرِ مدینہ جاں دہم — گویمت در رفتن جاں یا محمدؐ استغیث
چوں نکیرین از منِ عاصی سوال خود کنند — آں زماں محبوبِ یزداں یا محمدؐ استغیث
چوں رسد ناظر بوائے روضۂ تو دسترس — زیرِ محرومی ست پنہاں یا محمد استغیث[2]

مولانا جامیؒ کی ایک غزل پر خمسہ کے دو بند ملاحظہ ہوں:

قد بالائے تو چوں سرو جہاں ساختہ اند — لب چوں برگِ گل و چوں غنچہ دہاں ساختہ اند
تخت تازگئی روح رواں ساختہ اند — حقۂ لعل تو از گوہر جاں ساختہ اند
کام ہر خستہ دراں حقہ نہاں ساختہ اند

دلبری شکل پری چیں بہ جبیں ابرو خم — ہر دم ایجاد ستم دشمنِ جانِ عالم
آں کہ دل برد ز من نام حق این است صنم — شوخئ و ناز و کرشمہ ہمہ آوردہ ستم
فتنۂ عالم و آشوبِ جہاں ساختہ اند[3]

ایک کرامت

حافظ صاحبؒ کی روحانی عظمت کا اندازہ شاہ عبدالسلام صاحب کے ان مکاتیب سے کچھ ہو گیا ہے، مزید برآں مرض الموت میں بھی آپ سے ایک عجیب و غریب کرامت صادر ہوئی، وہ

---

[1] ماہنامہ النجم لکھنؤ، ۲۱ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ [2] ایضاً [3] ایضاً

یہ کہ جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو مولانا لکھنویؒ نے آپ کے معالجہ کے لیے مولانا حکیم سیّد عبدالحیٰ صاحب حسنیؒ (م ۱۹۲۳ء) سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو منتخب فرمایا اور انھیں اپنے گھر لے گئے، حکیم صاحبؒ نے حافظ صاحبؒ کو دیکھا، ان کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ہاتھ رکھتے ہی تھوڑی دیر کے لیے ایک دم ساکت ہوگئے اور کچھ دوائیں تجویز کر کے واپس آ گئے، اثناء راہ میں مولاناؒ سے فرمایا:

"مولانا! میں اب تک بہت سے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھا ہوں مگر آپ کے والد ماجد جیسی حالت و کیفیت کہیں نہیں پائی، میں نے جیسے ہی اُن کی نبض پر ہاتھ رکھا میرے تمام لطائف قلبی فوراً جاری ہوگئے۔"[1]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحبؒ کی کیفیت قلبی بہت بڑھی ہوئی تھی اور آپ بڑی تاثیر و قوت کے مالک تھے، اسی طرح مولانا شاہ ابوالخیر صاحب نقشبندی دہلویؒ[2] کی خدمت میں بھی حافظ صاحب کی آمد و رفت تھی، جب بھی دہلی جانا ہوتا تو شاہ صاحبؒ کی خدمت میں بھی ضرور حاضری ہوتی۔ ایک دفعہ شاہ صاحبؒ نے ان کے بارے میں عالم جذب و کیف میں یہاں تک کہہ دیا کہ —— "ارے میاں! انھوں نے تو حضرت جبریل کی بھی زیارت کی ہے۔"[3] حضرت

---

[1] ہفت روزہ حرم لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

[2] حضرت مولانا شاہ عبداللہ، محی الدین، ابوالخیر قدس سرہ ۶ رجنوری ۱۸۵۶ء میں خانقاہ حضرت شاہ غلام علی نقشبندی دہلویؒ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت شاہ محمد عمر بن حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی دہلویؒ تھے۔ نو سال کی عمر میں مکہ مکرمہ میں قرآن مجید حفظ کیا۔ علوم دینیہ کی تحصیل مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکی، مولانا سید حبیب الرحمٰن صاحب رُدولوی مہاجر مکی سے کی اور حدیث کی تعلیم حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث و مہاجر مدنی، شیخ الاسلام سید احمد دحلان مفتی شافعیہ، عم اکبر شاہ محمد مظہر صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین سے کی تھی۔ اُردو، ہندی اور فارسی میں شعر و سخن سے بھی مشغلہ رہا ہے۔ ابتدائی بیعت اپنے جد امجد حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی دہلویؒ سے کی پھر بقیہ سلوک کی مکمل تعلیم اپنے والد گرامی قدر سے حاصل کی اور کچھ تعلیم حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث سے بھی حاصل کی تھی۔ آپ بڑے صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ کی ذات سے صوبہ سرحد اور افغانستان میں سلسلہ نقشبندیہ کی بڑی اشاعت ہوئی۔ مولانا زید ابوالحسن فاروقیؒ آپ ہی کے صاحبزادے تھے۔ شاہ صاحب کی فروری ۱۹۲۳ء کو دہلی میں وفات ہوئی اور اپنی خانقاہ شریف میں دفن ہوئے۔
(مقامات خیر، موئفہ مولانا زید ابوالحسن فاروقیؒ، مطبوعہ دہلی)

[3] یادایام، مولوی ضیاء الحسن علوی، ص ۲۰

مولانا سیّد عین القضاۃ صاحب[1] بانی مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ نے حضرت لکھنوئیؒ سے ان کے والد

---

[1] حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحب حیدر آبادی ثم لکھنویؒ ۱۸۵۸ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد کا نام سیّد محمد وزیر بن سیّد محمد جعفر حسنیؒ (م ۱۹۱۲ء) تھا۔ آپ صحیح النسب سادات میں سے تھے، آپ کا خاندانی سلسلہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے جا کر ملتا ہے۔ چار سال کی عمر میں آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا جس سے دل برداشتہ ہو کر آپ کے والد آپ کو لے کر مکہ معظمہ چلے گئے اور مسلسل گیارہ سال وہاں آپ کا قیام رہا۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی، مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ کے والد آپ کو لکھنؤ لائے، اس وقت وہاں استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ (م ۱۸۸۶ء) کی مسندِ درس آراستہ تھی چنانچہ آپ کو بھی اسی حلقہ میں داخل کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ آپ کی ذہانت اور علمی ذوق وشوق کے جوہر کھلے جس سے آپ استاد کی توجہ، شفقت اور محبت کا مرکز بن گئے یہاں تک کہ حضرت استاذ نے اپنا آبائی مکان بھی آپ کو رہنے کے لیے دے دیا۔ چند کتب درسیہ مولانا فرنگی محلیؒ کے بعض منتہی طلبہ سے بھی پڑھیں جن میں شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ (م ۱۹۰۴ء) کا نام قابلِ ذکر ہے۔ عربی اور فارسی ادب کی کچھ کتابیں مفتی سیّد محمد عباس شوستری (م ۱۸۸۹ء) سے بھی پڑھی تھیں۔ درسیات سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد کے ساتھ مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔ مولانا اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے، آپ نے تمام عمر شادی بھی نہیں کی، لباس اور غذا کے لحاظ سے انتہائی سادہ طبیعت کے مالک تھے، مہمان نوازی اور تواضع میں بے مثال تھے۔ آپ کا حلقۂ درس اپنے استاذ کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا اور کافی شہرت ہو چکی تھی، سلیقۂ تعلیم اور طریق درس ایسا عمدہ اور دل نشین تھا کہ جو بھی طالب علم ایک کتاب بھی آپ سے سمجھ کر پڑھ لیتا اس میں ایک قسم کی علمی استعداد پیدا ہو جاتی تھی اور چند ہی اسباق کے بعد مطالعہ کرنے کا سلیقہ آ جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ آپ کو مولانا فرنگی محلیؒ کا علمی جانشیں قرار دیا گیا تھا۔ آپ کو بیعت وخلافت کا شرف شیخ موسیٰ جی ترکیسریؒ (م ۱۸۹۱ء) سے حاصل تھا۔ جو سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک مشہور بزرگ تھے اور مولانا نظام الدینؒ کے خلیفہ تھے، مولانا نظام الدینؒ حضرت شاہ غلام علی صاحب مجدّدی دہلویؒ کے خلیفہ تھے۔ مولانا کے والد ماجد نے لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا مکان خرید کر اس میں رہائش اور ایک چھوٹا سا مکتب بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کے لیے قائم کیا تھا، بعد میں اسی مکتب کو مولاناؒ نے ایک عظیم الشان مدرسہ کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کا نام مدرسہ عالیہ فرقانیہ تجویز فرمایا۔ اس مدرسہ میں ملک کے مشہور حفاظ، قراء اور علماء کو مناسب مشاہرہ پر بلا کر متعین کیا گیا تھا۔ جب قرآن مجید کی اعلیٰ اور معیاری تعلیم کا انتظام ہو گیا تو مولاناؒ نے مکمل درسِ نظامی کے درجات بھی قائم فرمائے اور ایک شاندار دارالحدیث بھی تعمیر کرایا۔ اس مدرسہ کی ایک نمایاں خدمت یہ ہے کہ آج شمالی ہند میں حفظ وقرأت کا جو چرچا ہے وہ اسی مدرسہ کی بدولت ہے، اب ہر مدرسہ میں حفظ کے ساتھ ساتھ قرأت کا بھی بندوبست کیا جاتا ہے، مدرسہ فرقانیہ کے طلباء واساتذہ کے پڑھنے کا انداز اپنا منفرد ہے جو ہر جگہ شناخت کر لیا جاتا ہے۔ تدریسی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ مولانا نے چند کتب ورسائل بھی تحریر کیے تھے جو تمام شائع ہو چکے ہیں لیکن اب نایاب ہیں، چند سال پہلے تک ان کے کچھ نسخے مدرسہ کے کتب خانہ میں موجود تھے، خدا کرے اب بھی ہوں۔ وہ رسائل یہ ہیں:
(۱) حاشیہ شرح ہدایت الحکمۃ للمیبذی۔ (۲) نخبۃ المعارف فی تحریم الاغنیۃ والمعازف۔ (۳) البیان الصائب فی تفسیر علم الغائب (۴) التحقیق المجتبیٰ فی غیب المصطفیٰ (۵) ازاحۃ العیب فی مبحث علم الغیب (۶) ابرار المکنون فی مبحث العلم ما کان وما یکون (۷) نہایت الارشاد الی الاحتفال المیلاد۔ (۸) خیر النواہی عن ارتکاب الملاہی، (۹) الاغناء تحریم الغناء، (۱۰) التحقیقات الوثیقہ فی بعض ما یتعلق بالعقیقہ (۱۱) فتویٰ، جماعت تہجد در ماہ رمضان وغیرہ۔ ۲ر رجب ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۸ر جنوری ۱۹۲۵ء کو مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ کا ۶۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے صحن چمن میں مدفون ہوئے۔ (تفصیلی حالات کے لیے دیکھیں راقم الحروف کا مضمون مطبوعہ برہان دہلی ۱۹۷۵ء، نزہۃ الخواطر حصہ ۸، مصباح المشائخ مرتبہ حکیم ہادی رضا خاں ماہر لکھنؤ، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مارچ ۱۹۹۳ء)

ماجد کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''مولوی ناظر علی صاحب بڑے بزرگ آدمی تھے، افسوس کہ ان کو کسی نے پہچانا نہیں[1]''

وفات

حافظ صاحبؒ ۱۸۹۸ء میں تحصیلداری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے، اس کے بعد تقریباً زندگی کے سارے ایام کاکوری اور لکھنؤ میں ہی گذرے، چند بار دہلی بھی جانا ہوا۔ آپ نے محلہ شیخ سعدی کاکوری میں اپنا ذاتی مکان بھی تعمیر کرایا تھا جو آج بھی ان کی یاد تازہ کرتا ہے اس کے وسیع و کشادہ کمرے وصحن اور دالانیں بنانے والے کی طبعی کشادگی کا ثبوت دے رہی ہیں، ریٹائرمنٹ کے بعد لگ بھگ گیارہ بارہ سال تک وہ حیات رہے، اخیر میں ایک سال پہلے سے کچھ نہ کچھ علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، درمیان میں کبھی کبھی افاقہ بھی ہو جاتا تھا چنانچہ زندگی کے آخری رمضان المبارک میں پورے روزے رکھے اور پورے مہینے کی تراویح بھی انھوں نے بیٹھ کر ادا کیں لیکن جمعۃ الوداع کے دن پھر انھیں شدید بخار لاحق ہو گیا جس کا سلسلہ ایک ماہ سے زیادہ جاری رہ کر بالآخر پیغامِ وصال بن کر ہی ختم ہوا۔ وفات سے کئی روز پہلے سے مرض کی شدّت اور کرب کی کیفیت زیادہ تھی خصوصاً اس شب میں جس کی صبح کو انھوں نے داعیٔ اَجل کو لبیک کہا، لیکن فجر کی نماز پڑھنے کے بعد تمام تکالیف میں دفعتاً افاقہ ہو گیا، جاڑوں کا زمانہ تھا، اپنی چارپائی دھوپ میں بچھوائی، اکثر باتیں سمجھ میں نہ آتی تھیں، یکا یک اس وقت آنکھوں میں کچھ تغیر پیدا ہوا جس سے معلوم ہوا کہ اب آخری وقت آ پہنچا ہے۔ حضرت مولانا سرہانے موجود تھے۔ انھوں نے تلقین کے لیے کلمۂ طیبہ کی تلاوت شروع کر دی، قرینہ سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کہنا چاہتے ہیں مگر زبان مساعدت نہیں کر رہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''اس حالت سے مجھے سخت قلق ہوا کیونکہ انھیں اس بات کی بڑی تمنا تھی، اکثر رو رو کر دُعا مانگا کرتے تھے کہ: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ آخِرَ کَلَامِنَا فِی الدُّنیا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ بارے حق تعالیٰ کے فضل بے استحقاق نے دستگیری فرمائی اور وہ حالت ان کی زائل ہو گئی اور پھر بہت دیر تک کہتے رہے کہ یا اللہ اپنی محبت میں رکھ! اس کے بعد کلمۂ طیبہ پڑھنا شروع کر دیا اور بہت جلد جلد اور صاف صاف کہ دور تک لوگ اچھی طرح سنتے تھے یہاں تک کہ اسی

---

[1] ہفت روزہ حرم لکھنؤ، ۲۶ مئی ۱۹۶۴ء

کلمۂ شہادت پڑھ کر روح نے پرواز کی۔ وہ وقت عجیب عبرت کا تھا۔ حق تعالیٰ نے اپنے اس کلام پاک کا جلوہ سب لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیا۔ یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوٰۃ الدنیا"[1]

اس مبارک انداز سے آپ ۴؍جنوری ۱۹۱۱ء مطابق ۲۹؍ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ کو بمقام کاکوری اس دُنیا سے رخصت ہوئے، ۳ بجے دن کو آبائی قبرستان سے ہٹ کر اپنے ذاتی خرید کردہ آم کے باغ میں جو مقبرہ شیخ سعدی کاکوریؒ سے ذرا آگے بجانب غرب واقع ہے سپرد رحمت کیے گئے۔ نمازِ جنازہ اور تدفین وغیرہ میں علماء وصلحاء کی بڑی تعداد شریک تھی، وصال کے بعد حضرت مولانا کے پاس تعزیتی خطوط اور اظہار ہمدردی کے پیغامات کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، چنانچہ ان سب خطوط کا جواب النجم میں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں اپنے ان احباب کو مطلع کرتا ہوں کہ صبر تو بڑی چیز ہے میں اس کا تو دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن بحمداللہ میں نے کوئی کلمہ جزع وفزع زبان سے نہیں نکالا اور نہ دل میں ایسے خیالات ہی آئے، نہ صرف میں بلکہ میری بہنیں اور میری والدہ ماجدہ بارک اللہ فی حیاتہا کی بھی یہی حالت ہے۔ ان کی موت ہی کچھ ایسے عمدہ عنوان سے ہوئی کہ اس نے سب کو صبر دے دیا اور عبرت بخشی"[2]

آپ کی اولادیں

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آپ کا رشتۂ ازدواج اَودھ کے قدیم قصبہ صفی پور ضلع اُناؤ (یو پی) کے ایک باعزت سادات گھرانے میں ہوا تھا جس کے کچھ نام لیوا اب بھی برصغیر کے مختلف گوشوں میں موجود ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس خاندان میں زیادہ تر رشتے سادات ہی میں ہوتے چلے آرہے ہیں۔ حافظ صاحبؒ کے آٹھ اولادیں ہوئیں جن میں تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں، ان میں سے ایک بیٹے عبدالرحمٰن اور تین بیٹیوں حور النساء ہادیہ اور مریم کا بچپن میں انتقال ہوا تھا لہٰذا صرف دو بیٹوں اور دو بیٹیوں ہی سے نسل آگے بڑھی، ایک بیٹی کا عقد حافظ محمد ظہورؒ بن مولوی نقی علیؒ سے ہوا اور دوسری بیٹی کا عقد منشی خلیل اللہؒ بن شیخ روح اللہؒ ساکن نیوتنی ضلع اُناؤ سے ہوا۔ حافظ صاحبؒ کی تمام اولادوں میں حضرت مولانا لکھنویؒ ہی سب سے بڑے تھے جن کے بصیرت افروز حالات کے لیے یہ کتاب مرتب کی جا رہی ہے۔ حافظ صاحبؒ کے سب سے چھوٹے

---

[1] النجم ہفت روزہ، لکھنؤ ذی القعدہ ۱۳۲۹ء [2] النجم لکھنؤ، ۲۸؍ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ

بیٹے مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ (م ۱۹۵۶ء) تھے جن کے حالات ہم یہاں لکھ رہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ (۱۸۸۷ء تا ۱۹۵۶ء)

آپ کی پیدائش ۱۸۸۷ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مختلف مقامات پر ہوئی کیونکہ آپ کے والد ماجد مولوی حافظ ناظر علی (م ۱۹۱۲ء) کا بسلسلۂ ملازمت تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ شعور سنبھالنے اور ابتدائی تعلیم پوری ہونے کے بعد مدرسہ قدیمہ فرنگی محل میں داخل کردیئے گئے جہاں شمس العلماء، مولانا عبدالحمید فرنگی محلیؒ اور شمس العلماء، مولانا عبدالمجید فرنگی محلیؒ سے درس لیا۔ بعض بنیادی کتابیں اپنے بڑے بھائی حضرت لکھنویؒ سے پڑھیں اور پھر مولانا حفیظ اللہ صاحبؒ شاگرد حضرت مولانا عبدالحی صاحبؒ فرنگی محلی سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ کچھ دنوں آپ نے مدرسہ یوسفیہ مینڈھو ضلع علی گڈھ میں مولانا عبدالوحید صاحبؒ سے بھی درس لیا تھا۔ ان متفرق جگہوں سے پڑھ کر ایک سال کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے مظاہر علوم سہارنپور آ گئے جہاں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ سے پڑھ کر ۱۹۱۳ء میں فراغت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں مدرس ہوئے اور کچھ عرصہ مدرسہ عالیہ فرنگی محل میں بھی پڑھایا۔ اسی ابتدائی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک محلّہ چھوٹی شہزادی کی ڈیوڑھی میں ایک مدرسہ ''خزینۃ العلوم'' کے نام سے قائم کیا تھا اور اسی عمارت میں ایک 'مدرسہ لیلیہ' بھی شروع کیا تھا جو کافی عرصہ تک قائم رہا۔ حضرت لکھنویؒ نے جب لکھنؤ میں دارالمبلّغین قائم کیا تو آپ اس میں بحیثیت استاذ و مبلّغ مقرر ہوئے اور پھر اپنی ساری زندگی اسی ادارہ کی خدمت کرنے میں گذار دی۔ اس مدرسہ میں آپ کی حیثیت لازم وملزوم کی سی تھی۔ آخری زمانۂ حیات میں مدرسہ کے لیے مالیات کا ایک بڑا حصہ آپ ہی کی جدوجہد سے حاصل ہوتا تھا۔

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ بے حد ذہین، صاحبِ فضل، علم دوست، متواضع اور عابد شب زندہ دار بزرگ تھے۔ درسیات پر پورا عبور حاصل تھا، اکثر متنوں کے اوراق زبانی یاد تھے اور کتنا ہی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ یا عبارت ہو اسے آسان بنا کر طالب علم کو سمجھا دینا ان کے امتیازات میں سے تھا۔ اس طرح درس وتدریس تو گویا اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اپنے وقت کے نہایت کامیاب اور مقبول مقرر تھے اس سلسلہ میں دُور دُور بلائے جاتے تھے، کئی کئی گھنٹہ آپ

کا وعظ ہوتا تھا اور سارا مجمع اخیر تک پوری دلچسپی کے ساتھ سماعت کرتا تھا۔ راقم الحروف کو کئی بار آپ کے مواعظ کو سننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ذہانت اور فکر رسا کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ آپ کو عربی، فارسی اور اُردو کے استاد شعراء کے کئی لاکھ اشعار یاد تھے۔ اگر کبھی کچھ ہم مذاق اور ہم مشرب حضرات کے مجمع میں آپ سے اشعار کی فرمائش ہوجاتی تو گھنٹوں اشعار سناتے تھے اور وہ بھی موضوعات کی قید اور صاحبِ دیوان شعراء کے حوالوں کے ساتھ سناتے تھے، اس معاملہ میں وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ آل انڈیا مدح صحابہ مشاعروں میں اسٹیج پر بیٹھ کر اچھے اشعار پر بے اختیار کھل کر داد دیتے تھے۔ اکثر اس عالم میں جوش میں آ کر شعراء کی حوصلہ افزائی میں کھڑے ہوکر داد دینے لگتے جس سے پورے مشاعرے پر ایک بیخودی سی طاری ہوجاتی تھی۔ آپ کی ادب نوازی اور شعر فہمی شعراء وادباء کے درمیان مسلّم تھی۔

اپنے بڑے بھائی حضرت لکھنویؒ کا اتنا ادب ولحاظ کرتے تھے کہ آج کل کے اکثر علماء کے گھرانوں کے نوجوان اپنے والدین کا ادب ولحاظ اتنا نہیں کرتے۔ وہ آپ کے بڑے بھائی مربّی وسرپرست اور استاد سب کچھ تھے جس کا لحاظ انھوں نے عمر بھر رکھا۔ ان کے اکثر طویل سفروں اور خصوصاً سفر حج میں آپ شریک رہا کرتے تھے۔ طبیعت میں ظرافت اور شگفتگی بہت تھی۔ جس مجلس میں بیٹھتے وہ باغ و بہار بن جاتی۔ علم مجلسی سے خوب واقف تھے، گفتگو بڑی پُر لطف، دلچسپ اور پُر مذاق ہوتی تھی۔ اپنے دَور کے اکابر علماء کی مجالس میں بہت بے تکلّف اور بیباک تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ خصوصاً ان سے بہت بے تکلف تھے اور ان کی بڑی قدر ومنزلت کرتے تھے۔ ہر شخص ان سے مل کر بہت خوش ہوتا تھا اس طرح وہ بہت خوش مزاج، خوش طبع اور خوش وضع اور اپنے ہمعصر علماء ومشائخ میں بہت ہر دلعزیز تھے۔

تحریک مدح صحابہؓ کے صفِ اوّل کے قائدین میں سے تھے۔ اس سلسلہ میں ۱۹۳۷ء میں اور پھر ۱۹۴۱ء میں جیل بھی گئے۔ تحریک چلانے کی تنظیمی صلاحیت آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مشرقی یوپی، بہار و بنگال کے اکثر اضلاع اور گجرات ومہاراشٹر کی طرف آپ کے اسفار بہت ہوتے تھے۔ بمبئی تو گویا آپ کا مستقر بن گیا تھا اور سال کا اکثر حصہ وہیں گذرتا تھا۔

۱۹۰۶ء میں پہلا عقد چچازاد بہن کے ساتھ کاکوری میں ہوا تھا جن سے چار بیٹیاں اور ایک بیٹے مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ پیدا ہوئے۔ ان اہلیہ صاحبہ کا جب نومبر ۱۹۲۸ء میں انتقال ہوگیا تو دوسرا عقد ۱۹۳۲ء میں ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یوپی) کے سادات کے ایک مشہور گھرانے

میں ہوا جن سے دو بیٹیاں اور ایک عبدالصمد نامی بیٹا پیدا ہوا جو صغر سنی میں ہی فوت ہو گیا البتہ دونوں بیٹیاں الحمدللہ موجود ہیں[1] اور صاحب اولاد ہیں، مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ آپ کی تنہا نرینہ اولاد تھے انہی سے آپ کی نسل چلی۔ مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور ۱۹۳۶ء میں انھوں نے شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی تھی۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۳۷ء میں دارالمبلغین کے شعبۂ تبلیغ کی وابستگی سے ہوا تھا۔ اپنے دور میں آپ نے دارالمبلغین کے مشن کو بہت آگے بڑھایا اور ترقی دی۔ دارالمبلغین اپنے بانی حضرت لکھنویؒ کے خلوص نیت کا ایک شیریں پھل اور ان کے خوابوں کی ایک حسین تعبیر ہے جس کو مادی صورت میں پروان چڑھانے میں مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ کا زبردست ہاتھ تھا۔ دارالمبلغین سے آپ کا تعلق ۱۹۷۲ء تک رہا۔ پھر اس کے بعد یکسوئی سے آپ دارالعلوم فاروقیہ کو مستحکم کرنے اور اسے ترقی دینے میں منہمک ہو گئے۔ تحریک مدحِ صحابہ میں آپ کا قائدانہ رول آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ ۴ر جون ۱۹۹۴ء کو یہ مجاہد جلیل ابدی نیند سو گیا اور مولانا عبدالشکورؒ ہال رکاب گنج لکھنؤ کے عقبی احاطہ میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقیؒ کا پہلا عقد اپنی چچا زاد بہن سے ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا جو حضرت لکھنویؒ کی اکلوتی چہیتی بیٹی تھیں مگر ایک سال کے اندر ہی ان بیوی صاحبہ کی وفات ہو گئی پھر ۱۹۳۹ء میں دوسرا عقد یوسف پور ضلع غازی پور میں ہوا جن سے چار بیٹے اور تین بیٹیاں الحمدللہ موجود ہیں۔ بڑے بیٹے مولوی عبدالعلی فاروقی ہیں جو دارالعلوم فاروقیہ کے مہتمم اور ماہنامہ البدر کاکوری کے مدیر ہیں۔ دوسرے بیٹے مولوی عبدالولی فاروقی ہیں جو اسی مدرسہ میں استاذ ہیں اور البدر کے معاون مدیر ہیں۔ یہ دونوں بھائی دارالعلوم دیوبند کے فارغ ہیں۔ تیسرے بیٹے حافظ عبدالکریم فاروقی اور چوتھے بیٹے عبدالوحید فاروقی ہیں۔ الحمدللہ یہ سب بھائی اور بہنیں صاحبِ اولاد ہیں۔ اس طرح حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ اپنے پیچھے ایک آباد اور خوشحال خاندان چھوڑ کر ۲۴ر دسمبر ۱۹۵۶ء کو بمرض فالج انتقال فرما گئے اور احاطۂ میاں چپ شاہ چکمنڈی لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

---

[1] اب ان دو بیٹیوں میں سے بڑی بیٹی کا بھی اکتوبر ۲۰۰۰ء میں انتقال ہو گیا۔

[2] مولانا مرحوم کے حالات اور خدمات کی تفصیلات کے لیے دیکھیں (البدر کاکوری کا 'مولانا عبدالحلیم فاروقی نمبر' جولائی ر ستمبر ۱۹۹۴ء جو اس سلسلہ میں ایک مکمل دستاویز ہے۔)

دوسرا باب

پیدائش ○ تعلیم وتربیت ○ اور نکاح

تیرہویں صدی ہجری کے آخری ایام خصوصی طور پر خیر و برکت اور علم و معرفت کے انوار سے معمور تھے۔ اگر ایک طرف ملک کے گوشہ گوشہ میں مسند درس وتدریس آراستہ تھی تو دوسری طرف مراکز رشد وہدایت اور خانقاہیں بھی خاصانِ خدا اور صاحبانِ نسبت کے انفاسِ قدسیہ سے جگمگا رہی تھیں۔ اس طرح علم شریعت اور علم طریقت دونوں ہی کی فیض رسانی سے ہندوستان کی سرزمین مالا مال ہورہی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر تبلیغِ دین کا ایک مخصوص گوشہ جس کو اب تک حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ، مولانا رشید الدین خاں دہلویؒ اور نواب صدیق حسن خاں بھوپالی نے اپنی بے لاگ اور بیباک علمی وعملی مساعی سے آباد کر رکھا تھا، اب خالی ہوتا جارہا تھا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، مولانا امیر حسن سہسوانی اور استاذ الاساتذہ مولانا عبدالحئیؒ فرنگی محلی جیسے اکابرِ امت جس مرض کی روک تھام کے لیے زبان وقلم کی بازی لگائے ہوئے تھے اب وہ پھر بار بار سر اٹھانے اور اُبھرنے کے لیے بے چین تھا۔ لہٰذا ضرورت اور وقت کا تقاضا تھا کہ ملت کے اس دبے ہوئے اور پرانے مرض کا علاج کرنے کے لیے پھر کوئی طبیب حاذق پیدا ہو جو اس کا خاطر خواہ تدارک کر سکے۔

پیدائش

قدرت کے اس اہم تقاضہ کو پورا کرنے کے لیے لکھنؤ سے ۱۱ کیلومیٹر دور اَودھ کے تاریخی اور مردم خیز قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں ۲۳ر ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء بوقتِ صبح صادق مولوی حافظ ناظر علیؒ کے نیک نام وبابرکت گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کو آگے چل کر امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ کے نام نامی سے جانا اور پہچانا گیا، حسنِ اتفاق سے یہ وہی صدی تھی جس میں مجدّد مأۃ ثالث عشر حضرت مولانا شاہ غلام علی قدس سرہٗ (م ۱۸۲۴ء)

کے وجود مبارک سے سرزمین ہند جگمگا رہی تھی[1]

آپ کی پیدائش کی خوشخبری حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (م ۱۸۸۱ء) نے پہلے ہی آپ کے والد ماجد کو دے دی تھی اور فرما دیا تھا کہ انشاء اللہ تم کو ایک نیک فرزند عطا ہوگا جس سے تمھارے گھر میں خیر و برکت ہوگی۔ عقیقہ کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے اس بچہ پر توجہ باطنی بھی فرمائی تھی اور کہا تھا کہ ''بیج ڈال دیا گیا ہے انشاء اللہ بارآور ہوگا۔'' ان مبشرات کے ساتھ آپ کا بچپن گذرا، والد ماجد نے آپ کی پیدائش پر بڑا اظہار مسرّت کیا تھا اور اس خوشی میں کاکوری و ہنسوہ ضلع فتح پور دونوں جگہ پر شیرینی تقسیم کی گئی تھی، کم سنی کا زمانہ ختم ہوا، سن شعور کو پہنچے تو والد ماجد نے اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالسلامؒ سے آپ کی بسم اللہ کرائی، اس زمانہ میں آپ کے والد ماجد تحصیل کھکھریڑو ضلع فتح پور (یو پی) میں نائب تحصیلداری کے فرائض انجام دے رہے تھے، اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے آپ کے لیے یہ دُعا بھی فرمائی تھی کہ خدا تعالیٰ برخوردار را از علومِ نافعہ بہرہ ور گرداند[2]

تعلیم

آپ کی ابتدائی تعلیم ضلع فتح پور میں ہوئی، قاعدہ بغدادی، پارہ عم اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں مولوی عبدالوہاب ساکن ہنسوہ ضلع فتح پور سے پڑھیں۔ اس کے بعد فارسی کی باقی کتب درسیہ مولانا سیّد مظہر حسینؒ متوطن کوڑا جہان آباد ضلع فتح پور سے پڑھیں۔ انھوں نے بڑی توجہ اور دلسوزی سے پڑھایا اور فارسی بولنے اور لکھنے کی مشق بھی کرائی، فارسی سے فراغت پانے کے بعد میزان، منشعب، پنج گنج و زبدہ وغیرہ بھی وہیں پڑھیں[3]۔ دوسری کتابیں مولوی سیّد تعشق حسینؒ کوڑوی اور مولوی محمد یٰسین خاںؒ ساکن گنتی ضلع پرتاب گڈھ سے تحصیل کوڑا اور فتح پور میں پڑھیں۔ یہ زمانہ آپ کے والد ماجد کی نائب تحصیلداری اور سررشتہ داریٔ مال کا تھا۔ اس زمانے میں کچھ کتابیں مولوی محمد حسین مانکپوریؒ سے فتح پور و تحصیل کھکھریڑو میں (جو بعد میں شکست ہوگئی) پڑھیں۔

---

[1] شجرۂ طیبہ، مرتبہ حضرت مولانا لکھنوی، ص ۳۱

[2] راحۃ القلوب بذکر المحبوب (قلمی) مرتبہ مولانا لکھنوی، نامکمل، ص ۲

[3] ایضاً، ص ۲

اس کے بعد دوسری کتابیں مثلاً صرف میں فصول اکبری تک، نحو میں شرح جامی تک، منطق میں قطبی میر تک، فقہ میں شرح وقایہ اوّلین وہدایہ آخرین، اصول فقہ میں اصول الشاشی اور نور الانوار وغیرہ مختلف اساتذہ منجملہ مولانا سیّد مظہر حسینؒ سے ضلع فتح پور اور دیگر مقامات پر پڑھیں[1]

مذکورۂ بالا جن اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب آپ کو بحیثیت اتالیق تعلیم دیتے تھے، والد ماجد نے ان متدیّن اور قابل اساتذہ کی خدمات آپ کی تعلیم وتربیت کے لیے حاصل کی تھیں۔ چونکہ آپ کے ساتھ انھیں بڑی محبت اور لگاؤ تھا اور وہ آپ کو اپنے سے جدا کرنا گوارا نہیں کرتے تھے اس لیے گھر پر ہی آپ کی تعلیم کا انتظام فرمایا تھا لیکن اُونچی کتابوں کے لیے جب فتح پور میں قابل اور لائق اساتذہ نہ مل سکے تو پھر مجبور ہوکر آپ کو باہر بھیجنے کا ارادہ کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً سولہ سترہ برس کی عمر تک آپ کی تعلیم ضلع فتح پور اور کماسن ضلع باندہ یوپی جیسے مقامات پر ہوتی رہی۔

آپ کے والد ماجد کو یہ بڑی تمنا تھی کہ آپ کو مسند وقت علامہ ابوالحسنات مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی شاگردی میں دے دیں مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا چنانچہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں جب آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ پہنچے تو اس وقت حضرت مولانا فرنگی محلیؒ وفات پا چکے تھے لہٰذا اُن کے مخصوص شاگرد اور جانشین حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ کی خدمت میں آپ کی حاضری ہوئی۔

حضرت مولانا سیّد عین القضاۃؒ کی درسگاہ عالیہ میں

اس طرح آپ اپنے اصلی مربیّ واستاذ خصوصی مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ کے حلقۂ درس میں داخل کردیے گئے، اس سلسلہ میں حضرت مولانا لکھنویؒ خود تحریر فرماتے ہیں:

"اس وقت حضرت مرحوم نے پڑھانے کا سلسلہ بہت کم بلکہ قریب قریب ترک کردیا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ اب دماغ بھی بہت ضعیف ہوگیا ہے اور طلبہ کی حالت دیکھ کر کہ نہ مطالعہ میں محنت کرتے ہیں اور نہ ہی کتاب سمجھنے و یاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا پڑھانے کو دل نہیں چاہتا۔ اس جواب نے (مجھے) مایوس تو بہت کیا مگر میں نے حاضری کا سلسلہ برابر قائم رکھا۔ تھوڑے دنوں کے بعد فرمایا کہ ایک صاحب نے علم الفرائض شروع کی ہے اگر آپ کا جی چاہے تو شریک ہوجایئے، چنانچہ میں نے شرکت شروع کردی، دوسرے ہی دن جب آپ نے دیکھا

---

[1] راحۃ القلوب (قلمی)، مملوکہ راقم الحروف، ص ۳

کہ وہ صاحب جو اصل سبق پڑھنے والے تھے سبق یاد کرنے میں مجھ سے پیچھے رہ گئے تو (آپ نے) میری طرف خصوصی نظر التفات مبذول کی جو یوماً فیوماً بڑھتی گئی۔[1]

اس طرح مولانا عین القضاۃؒ کی خدمت میں مسلسل سات سال تک آپ نے باضابطہ بقیہ علوم وفنون کی تکمیل فرمائی۔ آپ نے یہاں حسب ذیل کتب درسیہ پڑھیں:

فرائض میں علم الفرائض، منطق میں حمد اللہ، حواشی میر زاہد بر ملّا جلال، رسالہ میر زاہد، قاضی مبارک تحقیقاتِ مرضیہ، فلسفہ اور حکمت میں میبذی، شمس بازغۃ، صدرا، علم الکلام میں میر زاہد شرح شرح مواقف، ہیئت میں بست باب اسطرلاب، خیالی مع حاشیہ عبدالکریم، اصولِ فقہ میں مسلّم الثبوت، ریاضی میں شرح الملخص للعلامہ چغمینی اور اقلیدس، حدیث میں مشکوٰۃ، ترمذی اور بخاری اور اصولِ حدیث میں شرح نخبۃ الفکر وغیرہ۔ ان ساری کتب میں سوائے ترمذی اور شمس بازغۃ کے ساری کتابوں کی اوّل سے آخر تک استاذ کے سامنے قرأت بھی خود کرتے تھے۔[2] استاذِ محترم کا قاعدہ یہ تھا کہ جو طالبعلم غلط عبارت پڑھتا یا صرف ونحو میں اس کی استعداد اچھی نہ ہوتی تو اس کو قرأت کی اجازت نہ دیتے تھے۔ چونکہ حضرت مولانا شروع ہی سے ذہین اور محنتی تھے اور علمی استعداد بھی پختہ تھی اس لیے اپنے معاصرین اور ہم سبقوں میں قرأت کا شرف بھی انھیں کو حاصل ہوتا رہا۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات متعین ہوگئی ہے کہ مولانا کو حضرت مولانا سیّد عین القضاۃؒ کے ذریعہ سے بہ یک واسطہ استاذ الاساتذہ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ سے تلمذ کا فخر حاصل تھا اور مولانا فرنگی محلیؒ کو بہ طرق کثیرہ شاہ عبدالغنی محدّث دہلویؒ (م ۱۸۷۸ء) اور شاہ محمد اسحاق محدّث دہلویؒ (م ۱۸۴۶ء) سے شرف استناد حاصل تھا۔ مولانا فرنگی محلیؒ کے سلاسل میں ان بزرگوں کے علاوہ متعدد حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی علماء کے نام نامی بھی کتب معتبرہ میں درج ہیں۔ حضرت کو اس سلسلۃ الذہب کے علاوہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۹۰۵ء) سے بھی بہ یک واسطہ رشتۂ شاگردی حاصل تھا۔

قیامِ لکھنؤ

لکھنؤ کے زمانۂ طالبعلمی میں مولانا کا قیام محلہ رانی کٹرہ کی مسجد میں رہا کرتا تھا اور آپ وہیں سے روزانہ اپنے استاذ مولانا سیّد عین القضاۃؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ دن کا بیشتر

---

[1] النجم لکھنؤ، نمبر ۱۱، جلد دوم، ۱۳۴۳ھ [2] ایضاً

حصہ شفیق استاذ کے پاس ہی گذرتا تھا۔ ادھر استاذ کی نگاہِ التفات بھی دن بدن بڑھتی جارہی تھی یہاں تک کہ اپنے معاصر طلبہ کے مقابلہ میں استاذ کی نظروں میں آپ سب سے زیادہ محبوب ہوگئے تھے۔ آپ کے والد ماجد نے آپ کے آرام وآسائش کی خاطر آپ کے ساتھ ایک ملازم بھی کردیا تھا وہ آپ کا کھانا بھی پکاتا تھا اور دوسرے خدمت کے کام بھی کرتا تھا۔ آپ کے ساتھ آپ کے ایک چچازاد بھائی مولوی محمد تقیؒ بھی رہتے تھے اور وہ بھی عربی پڑھتے تھے۔ والد ماجد کسی ماہ آپ کو بیس روپیہ اور کبھی پچیس روپیہ اور کبھی تیس روپیہ اور بعض اوقات اس سے بھی زائد مصارف بھیجا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ اُس دور میں یہ کوئی معمولی رقم نہ تھی، لہٰذا آپ کا بچپن اور طالبعلمی کا زمانہ نہایت فارغ البالی کے ساتھ گذرا۔ مولانا سیّد عین القضاۃؒ سے پڑھنے کا سلسلہ ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں ختم ہوا اور آپ مکمل طور پر فارغ التحصیل ہوگئے۔

طِب کی تعلیم

طب کی تعلیم بھی مولانا کے خاندان کے قدیم امتیازات میں سے ہے۔ گذشتہ نسلوں میں کئی حضرات ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے پیدا ہوچکے تھے۔ آپ کے جدّ محترم مولوی شیخ فضل علیؒ (م ۱۹۰۱ء) بھی ایک کامیاب اور جیّد طبیب تھے جن کی شہرت نہ صرف کاکوری بلکہ دوسرے مقامات پر بھی تھی، اسی طرح شیخ صاحبؒ کے ایک صاحبزادے مولوی یوسف حسینؒ بھی ایک طبیب تھے۔ ان حضرات کے علاوہ اور لوگ بھی طبّی علوم سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ غالباً اسی روش کو اپناتے ہوئے مولاناؒ نے بھی علم طب کی تحصیل کی طرف توجّہ فرمائی، اُس زمانے میں لکھنؤ کے حکماء میں خاندانِ جھوائی ٹولہ میں مختلف قابل اور نامور اطباء موجود تھے، اسی علمی اور طبّی گھوارہ میں مولوی حکیم عبدالولیؒ[1] بھی نہایت کامیاب اور تجربہ کار طبیب تھے۔

---

[1] حکیم حافظ عبدالولی بن حکیم عبدالعلی لکھنویؒ ۱۲۹۰ھ (مطابق ۱۸۷۳ء) میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے، دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، ابتدائی عربی کی تعلیم مولوی سیّد محمد مقیم بن محمد معین حسنی رائے بریلویؒ سے حاصل کی، منطق اور حکمت کی تعلیم فرنگی محل میں مولوی افہام اللہ لکھنویؒ سے اور طبّی تعلیم اپنے والد حکیم عبدالعلیؒ اور چچا حکیم عبدالعزیز مرحوم سے حاصل کی، اس طرح آپ لکھنؤ کے خاندانِ عزیزی (جھوائی ٹولہ) کی علمی وفنّی قدروں کے امین بنے۔

عام روش سے ہٹ کر حکیم صاحبؒ نے اپنے درس میں عبارت کے بجائے مسائل طبیہ پر روشنی ڈالنے اور ان پر بحث وگفتگو کرنے کو اپنا شعار بنالیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم عرصہ میں ان کی شہرت قابل اساتذہ کی طرح ہوگئی اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حکیم صاحب مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ اور مولانا سیّد عین القضاۃؒ کے انتہائی معتقدین میں سے تھے، مولانا نے اُن سے طب کی تعلیم حاصل کی اور اس فن کی متداول کتابیں پڑھیں، بعض ثقہ حضرات کی اطلاع کے مطابق آپ نے کچھ دنوں مطب بھی کیا تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اپنے استاذِ عالی مقام کے ایماء پر مطب کرنے کا سلسلہ بند کر دیا اور اسی دن سے درس و تدریس اور علومِ دینیہ کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور زندگی کے آخری سانس تک اسی کام میں مشغول رہے چنانچہ آپ نے روزانہ صبح کے وقت قرآن مجید کا آسان اور عام فہم ترجمہ بیان کرنے کی ابتدا کی جس کا سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا، پھر کچھ دِنوں کے بعد ہی سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

تقریر و خطابت

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے استاذ محترم کے مشورہ پر مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے سامنے والی مسجد میں جہاں وہ خود بھی نماز پڑھتے تھے ترجمہ کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ جیسے جیسے لوگوں کو علم ہوتا گیا شریک ہونے والوں کی تعداد بڑھتی گئی، کبھی کبھی استاذ محترم بھی پوشیدہ طریقے سے آپ کا بیان سنا کرتے تھے، انھیں آپ کا اندازِ بیان اور اس کی علمی شان بڑی پسند آئی اور بے حد خوش ہوئے ایک روز بلا کر فرمایا۔ ”اگر لوگ آپ سے بیان

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) جوق در جوق طلبا ان کے درس میں آنے لگے۔ چنانچہ ایک وقت میں ساٹھ ستر طلبا ان کے حلقۂ درس میں شرکت کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے جس میں اکثر بڑے لائق اور صاحبِ تصنیف و تالیف لوگ گذرے ہیں جن میں مولوی حکیم سیّد عبدالحی حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء، شفاء الملک حکیم عبدالحبیب دریابادیؒ اور مولانا عنایت اللہ فرنگی محلیؒ وغیرہ لائقِ ذکر ہیں۔

حکیم صاحبؒ یونانی طب کے ساتھ آیورویدک کے اختلاط کے موافق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۰ء میں آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے ساتھ مل کر سرگرم حصہ لیا اور اس کانفرنس کا ایک شاندار اجلاس اپنے زیرِ انتظام لکھنؤ میں بھی منعقد کرایا جو ایک عرصہ تک شدید اختلاف کا باعث رہا۔ حکیم عبدالولی بہت وسیع النظر، حوصلہ مند اور ملّی درد رکھنے والے طبیب تھے، ان کے اندر قائدانہ صلاحتیں بدرجہ اتم تھیں، وہ ملک میں مروّج تمام طریقہ ہائے علاج سے فائدہ اٹھا کر طب یونانی کے دامن کو وسیع تر بنانا چاہتے تھے، انتہائی مہمان نواز تھے، اور شعر و ادب اور موسیقی سے بھی انھیں خاص لگاؤ تھا۔ اپنے آخری دور میں ملکی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تھے۔

بالآخر ان گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے حکیم صاحبؒ کی صحت جلد خراب ہو گئی چنانچہ ۴۱ سال کی عمر میں استسقاء میں مبتلا ہو کر ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ (نزہۃ الخواطر جلد ۸، ص ۳۱۶، اور تذکرہ خاندانِ عزیزی ۲۱۶، ۲۰۶)

کرانے کے لیے کسی جگہ چلنے کو کہیں تو آپ چلے جایا کیجیے اور بیان کر دیا کیجیے۔'' مولانا نے جب اس پر کچھ عذر کیا تو انھوں نے فرمایا۔ ''آپ بہت اچھا ترجمہ قرآن مجید بیان کرتے ہیں اور تقریر بھی بہت اچھی کر لیتے ہیں، آگے چل کر اور بھی اچھی تقریر کرنے لگیں گے لہٰذا اس میں تکلف سے کام نہ لیجیے۔''

اس طرح استاذ محترم کی ایما پر مولانا نے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا جو عوام میں بہت پسند کیا جانے لگا۔ تحریک مدح صحابہؓ کے ابتدائی ایام میں آپ کی تقریریں بہت طویل ہوتی تھیں اور چھ سات گھنٹے تک مسلسل آپ کا خطاب ہوا کرتا تھا، جلسہ گاہ میں ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا اور سارے لوگ گوش بر آواز ہوتے تھے۔ یہ تقریریں انتہائی پُر وقار اور عالمانہ شان لیے ہوتی تھیں، ان میں کوئی ظاہری جوش وخروش، آواز کا اُتار وچڑھاؤ اور خطیبانہ اشاروں، کنایوں کا کوئی شائبہ نہ ہوتا تھا۔

جس مسئلہ پر بھی تقریر ہوتی تھی وہ مستند دلائل اور حوالوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ اکثر تقاریر میں کتابوں کے اوراق مع صفحہ نمبر کے برجستہ پڑھتے چلے جاتے تھے۔ ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ ہزاروں کے مجمع کے کو آپ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے خطاب کیا کرتے تھے اور ہر ایک شخص آپ کی آواز کو آسانی کے ساتھ سن لیتا تھا، یہ آپ کی ایک کرامت تھی، تقریروں میں کبھی مشتعل نہیں ہوتے تھے اور کسی کی شان میں کوئی گستاخانہ الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ چار چھ گھنٹوں کی تقریریں تو راقم الحروف کے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی تھیں البتہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی تقریریں اچھی طرح یاد ہیں لیکن زندگی کے آخری ایام میں جبکہ آپ پر ضعف پیری کا بہت غلبہ ہو گیا تھا صرف پانچ چھ منٹ کی ہی تقریریں ہوا کرتی تھیں اور ان مختصر تقاریر کے سننے کی خواہش میں بھی لوگ دُور دُور سے چل کر آیا کرتے تھے۔

تقریروں کے بنیادی موضوعات سیرتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم، فضائل ومناقب صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عقائد وتعلیماتِ اسلامیہ اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات ہوا کرتے تھے۔

تردیدی تقاریر عام طور سے بہت کم کیا کرتے تھے۔ اس طرح کی تقریریں صرف مناظروں ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ آخری زمانہ کی تقریروں میں تو نماز کی فضیلت اور اہمیت اور اس کی تاکید ہی موضوع ہوتا تھا۔

زندگی کا بڑا حصہ انہی خطابات کے سلسلہ میں اسفار میں گزرا ہے اور لوگوں کے اصرار پر دور دراز کے اسفار کیے تھے۔ ان سب کے باوجود آپ کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی وہ تصانیف و تالیفات ہیں جو آج بھی زندہ ہیں اور آئندہ بھی انشاءاللہ زندہ رہیں گی اور ہماری رہنمائی کرتی رہیں گی۔

نکاح

آپ کی تعلیم کے دوران میں ہی آپ کے والد ماجد نے آپ کے نکاح کا فیصلہ کرلیا، اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۱۷-۱۸ سال کی رہی ہوگی کہ ربیع الاول ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں تقریب نکاح عمل میں آئی۔ اہلیہ محترمہ قصبہ نیوتنی ضلع اُناؤ (یوپی) کی رہنے والی تھیں، ان کے والد ماجد سیّد ذاکر علیؒ بن سیّد مالک علیؒ قصبہ کے ممتاز خاندانِ رضویہ کے ایک فرد تھے اور نجیب الطرفین سیّد تھے۔ اہلیہ محترمہ کے حالات آج کی نسل کے لیے باعث عبرت ہیں۔ راقم نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ جب اہلیہ محترمہ بیاہ کر اس خاندان میں آئیں تو اس وقت وہ بہت کم عمر تھیں لیکن دینداری، تقویٰ، پرہیزگاری، حلم و مروّت، صلہ رحمی اور اعزا و اقرباء کی پاسداری ان کا طرۂ امتیاز تھی، کیوں نہ ہوتی وہ کس شوہر کی بیوی تھیں اور انھیں کن ہونہار فرزندوں کی ماں بننے کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔ مولانا لکھنویؒ سے انھیں انتہائی والہانہ تعلّق تھا اور ان کے آرام و آسائش کی خاطر اپنا سکھ چین سب انھوں نے تج دیا تھا۔ ان کے ایثار اور قربانی کی ادنیٰ مثال یہ تھی کہ جب تک گھر کا ہر فرد کھانا نہ کھالیتا وہ خود کچھ نہ چکھتی تھیں اور آخر میں جو کچھ بچ رہتا بس اُسی پر اکتفا کرتیں، اچھے اور نئے کپڑے پہننے کا شوق بھی انھیں بالکل نہ تھا، گھر میں صاحبزادوں کے کپڑے جو پرانے ہوجاتے اکثر انہی کو ٹھیک ٹھاک کر کے خود استعمال کرتیں۔ یہ بات کسی بخل یا جزرسی کی وجہ سے نہ تھی، اللہ نے انھیں سب کچھ دے رکھا تھا، شوہر کی بے انتہا محبت بھی انھیں حاصل تھی، وہ جو چاہتیں کرسکتی تھیں مگر یہ ان کی کمالِ سادگی و قناعت پسندی کا عملی ثبوت تھا۔

اقربا پروری اور صلہ رحمی ان میں انتہا سے زیادہ تھی، اگرچہ ہم جیسوں کو ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوسکا مگر حضرت مولاناؒ کی زبان سے اکثر یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ''انھیں جو تعلّق میرے اعزاء کے ساتھ تھا وہ کم ہی کسی کے اندر ہوتا ہے۔'' وہ مولانا سے خود اصرار کر کے

ان کے عزیزوں کی امداد کراتی تھیں اور اپنے آپ بھی مختلف حیلوں اور بہانوں سے مدد کیا کرتی تھیں چنانچہ بعض معمر خواتین جنھوں نے مرحومہ کو دیکھا تھا ان کی داد و دہش اور صلہ رحمی کے واقعات سنایا کرتی تھیں۔

مولانا لکھنوی کا قیام جن دنوں دہلی میں تھا ان دنوں اہلیہ محترمہ بھی ان کے ساتھ دہلی آ کر رہی تھیں، اس زمانے میں کوچہ پنڈت میں ایک کرایہ کے مکان میں آپ کا قیام تھا، یہ وہی زمانہ تھا جبکہ دہلی حضرت شاہ ابوالخیر صاحب مجددی نقشبندیؒ (م ۱۹۲۳ء) کے انوار و برکات سے معمور تھی، سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک نامور بزرگ ہونے کی وجہ سے مولانا کی آمد و رفت اکثر حضرت شاہ صاحب کی خانقاہ عالیہ میں ہوا کرتی تھی چنانچہ اسی زمانہ میں اہلیہ صاحبہ کو آپ نے حضرت شاہ صاحب سے مرید بھی کرا دیا تھا اور سلوک کی ابتدائی تربیت بھی ان کو انہی سے حاصل ہوئی تھی[1] مولانا کا قیام دہلی میں زیادہ نہیں رہ سکا اور وہ لکھنؤ واپس آ گئے لہٰذا اہلیہ صاحبہ "حضرت شاہ صاحب" سے مزید کسب فیض نہ کر سکیں لیکن بعد میں سلوک کی تعلیم و تربیت اپنے خسر محترم مولوی حافظ ناظر علیؒ (م ۱۹۱۱ء) سے حاصل کی، مولوی صاحب کو بھی آپ سے بہت محبت تھی اور غالباً یہی وجہ رہی ہوگی کہ آپ کی توجہ اور نسبت کا پورا پورا اثر آپ کے اندر موجود تھا۔

حسنِ سلوک اور تقویٰ

اہلیہ صاحبہ میں بہت سے ایسے نیک اوصاف تھے کہ جو آج اکثر مردوں میں بھی نہیں پائے جاتے مثلاً سخاوت اور صلہ رحمی کہ اس کے واقعات اگر جمع کیے جائیں تو بہت طول ہو، حلم اور حسنِ خلق ایسا تھا کہ کسی سے اگر کوئی ایذا پہنچتی تو کبھی انتقام کا خیال بھی ان کے دل میں نہ آتا، ہر ایک کے دکھ درد میں اس طرح شرکت کرتیں کہ گویا یہ واقعہ خود انھیں پر پیش آیا ہے۔ غیبت کبھی کسی کی نہ کرتیں اور حتی الامکان غیبت سننے سے بھی پرہیز کرتی تھیں، طہارت کا اس درجہ خیال تھا کہ جس زمانے میں چھوٹے بچے گود میں ہوتے تھے اُس زمانے میں بھی جسم اور لباس کی پاکی پورے طور پر قائم رکھتی تھیں اور اس کے لیے بڑا اہتمام کرتی تھیں، زہد و عبادت میں تو قابلِ رشک حالت تھی۔ مرض الموت میں مبتلا ہوتے ہی طاقت ایسی مسلوب ہو گئی تھی کہ شاید تین چار وقت کی نماز

[1] مقامات خیر، ص ۴۹۸

بمشکل بیٹھ کر پڑھ سکتی تھیں۔ اور بعد میں تو بیٹھ کر بھی پڑھنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ بایں ہمہ زندگی میں ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوئی۔

صبر واستقامت

مرحومہ میں صبر واستقامت کی صفت بھی ایسی عمدہ تھی کہ باید وشاید۔ ان کی زندگی میں دو صاحبزادوں کا انتقال ہوا، صدمہ تو ظاہر تھا، محبت مادری کا کہنا ہی کیا، ان دونوں بچوں کی یاد دل سے کبھی نہیں گئی حتیٰ کہ اپنی آخری بیماری میں ایک بار یہ بھی کہا کہ میرے دونوں بیٹے جنت میں بہت خوش ہوں گے کہ بہت دنوں کے بعد ہماری ماں ہم کو مل گئیں۔ ان دونوں بچوں کے علاوہ ان کے والدین کا بھی یکے بعد دیگرے ایک ماہ کے اندر انتقال ہو چکا تھا اور وہ بھی اس حال میں کہ اپنے والدین کو مدّت سے دیکھا تک نہ تھا۔ مگر ان سب صدمات میں کوئی کلمہ جزع وفزع ان کی زبان سے نہ نکلا تھا۔ مرض الموت میں بڑی شدّت کا بخار تھا اور ساتھ ہی سینے میں درد بھی تھا کہ دیکھنے والے پریشان ہوتے تھے مگر مرحومہ کی زبان سے کوئی لفظ شکایت کا نہیں سنا گیا۔[1]

بعض غیبی اشارات

حضرت مولاناؒ نے مرحومہ کے حالات کے ضمن میں کچھ ایسے غیبی اشارات کا بھی النجم میں ذکر کیا ہے جن سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اب ان کے دنیا سے جانے کا وقت بہت قریب آ گیا ہے اور زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں، ان اشارات کو مبشرات کہنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ ان میں ان کے متعلق بعض بڑی خوش آئند اور مبارک پیشین گوئیاں تھیں، چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ ہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

"مرحومہ نے آخری رمضان المبارک کے بعد پے در پے متعدد خواب دیکھے جن میں صاف صاف ان کو موت سے آگاہ کیا گیا تھا، البتہ وقت کی تعیین نہ تھی، آخری بیماری میں تو ایک لحہ کے لیے بھی دن اور رات کسی وقت بھی نیند نہیں آئی تھی اس لیے بیماری میں جو کچھ بھی وہ دیکھتی تھیں بالکل مشاہدہ تھا خواب نہ تھا، ازاں جملہ اپنی رحلت سے دو دن پہلے جبکہ پیاس کی بہت شدت تھی اور حکیموں ڈاکٹروں نے ٹھنڈے پانی سے سخت پرہیز بتایا تھا اس وقت انھوں[1] نے مجھ سے

---

[1] النجم لکھنؤ، شوال وذی قعدہ ۱۳۵۱ھ

(حضرت مولانا سے) کہا کہ ابھی حضرت حسینؓ آئے تھے، انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ بیٹی! گھبراؤ نہیں، اس کے بعد کہنے لگیں کہ اب ہم وہیں جا کر ٹھنڈا پانی پئیں گے۔ اسی طرح شوال کے مہینے میں خود میں نے (مولانا نے) ایک خواب دیکھا کہ مرحومہ سفید لباس پہنے ہوئے ہیں اور ایک مکان میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ لیٹے ہوئے ہیں، مرحومہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ اس خواب کو دیکھ کر شب ہی میں میری آنکھ کھل گئی، تعبیر بالکل ظاہر تھی لہٰذا دل پر اثر ہوا مگر چونکہ وقت کی تعیین نہ تھی اس لیے تسکین ہوگئی۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"مرحومہ کی علالت کا تیسرا دن تھا کہ بعد نمازِ فجر مدرسہ دارالمبلغین، میں درسِ قرآن مجید کے لیے بیٹھا تو یہ آیت آئی وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ...... اِلیٰ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ[1] اسی وقت دل میں یہ کھٹکا ہوا کہ شاید اسی واقعہ کی طرف خبر دی جا رہی ہے۔"[2]

مرض الموت وشبِ آخر

آپ کی آخری بیماری شدید بخار اور وجع الصدر تھی اور یہی بیماری چند دن کے اندر جان لیوا ثابت ہوئی۔ مرحومہ کی آخری رات شدتِ مرض کے لحاظ سے بھی آخری درجہ پر تھی۔ انتہائی بے چینی اور تکلیف تھی مگر ساری رات "اے میرے اللہ" کہہ کر ختم ہوئی اس رات میں یہ دُعا سب ہی نے ان کی زبان سے سنی۔ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي الْمَوْتِ وَفِيْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَتُبْ عَلَيْنَا قَبْلَ الْمَوْتِ وَهَوِّنْ عَلَيْنَا سَكَرَاتِ الْمَوْتِ۔ بالآخر وقت موعود آ ہی گیا اور ۷؍ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء کو اس دنیا سے رحلت کر گئیں۔ آخری وقت میں سوائے حق تعالیٰ کی یاد کے اور تمام باتوں سے ایک قابلِ غبطہ بے تعلّقی پیدا ہوگئی تھی، چنانچہ آخر وقت میں جب سب اولادیں بہت بے قرار ہو رہی تھیں تو کہنے لگیں کہ میں نے تم سب کو اللہ کے سپرد کیا، تم سب

---

[1] ترجمہ: اور ہم کسی قدر خوف، بھوک، مال، جانوں اور میووں کے نقصانات سے تمھاری آزمائش کریں گے لہٰذا صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) خوش خبری سُنا دو۔ ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (البقرہ ۱۵۵-۱۵۶)

[2] النجم لکھنؤ، شوال و ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ

میرے لیے رونا نہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالمومن فاروقیؒ (م ۱۹۶۷ء) اپنی والدہ مرحومہ کے وصال کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے:

''جب آپا کے انتقال کا وقت قریب آیا تو ہم سب لوگ ان کے سرہانے ہی موجود تھے، ان کی ہر اولاد جو اس وقت سمجھ دار تھی مضطرب و بے قرار ہو رہی تھی، مولانا بھی قریب ہی میں تشریف فرما تھے، جب وقت آخر قریب آ پہنچا اور سانس کی رفتار میں فرق پیدا ہونے لگا تو حضرت نے اپنی اولادوں سے فرمایا ''دیکھو! اب تمھاری ماں رخصت ہو رہی ہیں جن کے پیروں کے نیچے تم لوگوں کی جنت تھی یہ سنتے ہی میں تڑپ اُٹھا اور بے قرار ہو کر پکارنا شروع کر دیا آپا! آپا اللہ ایک بار آنکھیں کھول دیجیے۔''

ان کا احساس تھا کہ ان کی آواز پر ایک بار انھوں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش بھی کی مگر وہ پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ اس حادثہ پر مولانا کی بے چینی اور بیتابی ظاہر تھی مگر کیا مجال کہ زبان سے ایک کلمہ بھی خلاف شریعت نکل جائے۔ جب تک جنازہ گھر سے اپنی آخری منزل کے لیے روانہ نہیں ہوا، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تشریف لاتے، قریب کھڑے ہوتے اور انا للہ پڑھتے ہوئے واپس چلے جاتے اور جب زیادہ بے چینی بڑھتی تو نماز کی نیت باندھ لیتے۔ تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ آبائی وطن کاکوری لے جایا گیا اور اپنے ذاتی آم کے باغ میں جہاں ان کے شفیق و مربی خسر پہلے ہی سے مدفون تھے وہیں انھیں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس طرح حضرتؒ کے ساتھ ان کی بیالیس سالہ رفاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ کا ذکر خیر ختم کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ حضرت کا وہ تحریری نوٹ پیش کر دیا جائے جس میں آپ نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی ہے اور اپنی خوشنودی سے نوازا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''اس تمام مدّت کے متعلق میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اُن کو کبھی دُنیا کی طرف مائل نہیں پایا، نیکی و دینداری ان کی سرشت میں تھی، سچ ہے اَلسَّعِیْدُ مَنْ سَعِدَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ، نیک اور دیندار بی بی کا عطا ہونا اللہ کا ایک بڑا احسان تھا جس طرح اور بہت سے لاتعد ولاتحصیٰ، انعامات حق تعالیٰ کے ہوئے اور ہو رہے ہیں اسی طرح یہ انعام بھی بڑا عظیم الشان تھا وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْهَا[1]۔ یا اللہ اس صاحب قبر پر اپنی رحمت کی بارش برسا دے، خداوندا جس نے

---

[1] اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے۔ النحل، ص ۱۸

اپنی عمر کے آخری لمحوں میں کرب و بے چینی کی حالت میں تیرا نام پاک لے لے کر پوری رات ختم کی ہو تیری رحمتِ وسیعہ کب گوارہ کرے گی کہ وہ تیری بخشش و کرم سے محروم رہے۔[1]

یقیناً وہ بڑی خوش قسمت اور مقدر والی خاتون تھیں جنھوں نے ایک ایسا برگزیدہ شوہر پایا، عمر بھر ان کی خدمت کی اور پھر اس دنیا سے جانے کے بعد بھی شوہر کے دل میں قدر و قیمت یہ ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اُن کی مغفرت کاملہ اور بلندیٔ درجات کے لیے کس والہانہ اور دردمندانہ انداز سے عرض گذار ہیں۔ اس مفارقت کا غم اس قدر تھا کہ حضرت تمام عمر اس کو بھلا نہ سکے، آپ کی خانگی زندگی میں انقلاب آ گیا تھا، گھریلو معاملات میں یک لخت دلچسپی لینا چھوڑ دی، امورِ خانہ داری سے بے تعلق ہو کر سارے معاملات اپنے منجھلے صاحبزادہ مولانا عبدالمومن فاروقیؒ (م۱۹۶۷ء) کے سپرد کر دیئے کیونکہ اس وقت لکھنؤ میں صاحبزادوں میں وہی ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے تھے۔ اخبار النجم کی ادارت، ترتیب و تسوید بھی باضابطہ وہی کرتے تھے۔ بڑے صاحبزادہ مولانا عبدالسلام فاروقیؒ (م۱۹۷۳ء) کا قیام ان دنوں لکھنؤ میں نہیں تھا بلکہ وہ گورکھپور یوپی میں انجمن اسلامیہ کے مدرسہ میں بسلسلۂ تدریس مقیم تھے۔ خانگی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جانے کے باوجود اُس وقت تک مولانا نے گھر میں رہنا سہنا ترک نہیں کیا تھا جیسا کہ آگے چل کر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس کا سبب صرف آپ کی اکلوتی صاحبزادی مرحومہ کی ذات تھی جو کہ اس وقت حیات تھیں اور ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی، چونکہ وہ سات بیٹوں میں تنہا بیٹی تھیں اس لیے مولانا کو ان کے ساتھ بے پناہ محبت اور تعلق تھا۔ صاحبزادی مرحومہ کے دینی حالات اور نیک خصائل کا تذکرہ آئندہ اپنے مقام پر آئے گا۔ بہر کیف آں مرحومہ کی محبت اور دل جوئی کی خاطر آپ نے گھر میں لیٹنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا سلسلہ بدستور قائم رکھا تھا جو صرف اس وقت تک باقی رہا جب تک کہ وہ زندہ رہیں لیکن جب کچھ دنوں کے بعد اللہ ربّ العزت کے یہاں سے ان کا بھی بلاوہ آ گیا تو یہ تھوڑا سا رہا سہا گھریلو تعلق بھی ختم ہو گیا اور دارالمبلغین لکھنؤ کے اس کمرے میں سکونت اختیار کر لی جو سڑک کی جانب بالائی منزل کے مشرقی حصہ میں واقع ہے اور وہیں سے آپ نے سفرِ آخرت بھی اختیار کیا، رہے نام اللہ کا۔

[1] النجم لکھنؤ، شوال و ذی قعدہ ۱۳۵۱ھ

تیسرا باب

اخلاق و عادات ○ طرزِ معاشرت ○ اور اسفارِ حج

انسان کے عادات و خصائل اور مزاج و طبیعت اس کے فطری جذبات و احساسات اور طبعی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔اسی لیے ہر بڑے آدمی اور غیر معمولی کارنامے انجام دینے والے افراد کی زندگی میں سب سے زیادہ سبق آموز اور لائقِ دید اُس کے روزمرّہ کے معمولات ہوتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے روز و شب کس طرح بسر ہوتے ہیں اور اس نے اپنے کاموں کو انجام دینے کے لیے اپنے اوقات کی تقسیم کس طرح کی ہے۔اللہ تعالیٰ کی مشیت ہمیشہ کچھ ایسی ہی رہی ہے کہ اس کو جن بندوں سے کوئی اہم خدمت لینا ہوتی ہے اُن کے اوقاتِ کار میں برکت عطا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے تھوڑے وقت میں ایسے اہم کام انجام پا جاتے ہیں جو عام افراد سے سالہا سال میں بھی پورے نہیں ہو سکتے ہیں۔اوقات اور اعمال کی یہ برکت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ نعمت من جانب اللہ ودیعت ہوتی ہے۔اسی طرح دنیا کے ہر بڑے آدمی کی زندگی کے مطالعہ سے یہ بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے کہ اس کے ان کارناموں میں جن سے اسے قبولیت عامہ حاصل ہوئی ہے اس کے مزاج، رہن سہن، اخلاق و عادات اور طرزِ فکر کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر دُور رس نگاہیں ایسے افراد کو اوائلِ عمر ہی میں دیکھ کر پہچان لیتی ہیں کہ یہ شخص مستقبل میں کوئی ممتاز مقام حاصل کرے گا۔اور دنیا کو اس کی ذات سے رہنمائی حاصل ہوگی،اسی عام قاعدے کے مطابق ہم نے حضرت مولاناؒ کی علمی خدمات اور دینی اصلاحات کے ذکر سے پیشتر یہ ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے اُن کے ذاتی اوصاف و خصائل بیان کر دیئے جائیں تا کہ ان کی شخصیت کو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہو،اسی لیے یہ باب اور اس کے بعد والا باب انہی خصوصیات پر مشتمل ہے۔

حُلیہ

آپ کا قد متوسط، رنگ گندم گوں مگر سفیدی مائل تھا، داڑھی خوبصورت گول اور گھنی تھی،

پیشانی کشادہ، روشن اور آیۂ سِیمَاهُمْ فِی وُجُوهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ[1] کی مکمل آئینہ دار تھی، سرمگیں آنکھوں کے ساتھ شکل وصورت انوار و وجاہت اور آثار ولایت سے درخشاں تھی۔ چہرے سے خوبصورتی اور ملاحت کے ساتھ آثارِ رعب وہیبت بھی ظاہر وباہر تھے۔ سر کے بال مسنون طریقہ پر اکثر کانوں کی لو تک رہا کرتے تھے مگر ایام حج میں استرا بھی پھروا دیتے تھے، چال ڈھال سے وقار وسنجیدگی اور متانت وبردباری ظاہر ہوتی تھی۔

لباس ووضع

حضرت کا لباس انتہائی سادہ اور ہر قسم کے تکلّفات سے بالاتر تھا، گرمیوں کے موسم میں سفید ململ کا لانبا کرُتا جس کا گریبان اکثر کھلا رہتا اور سفید لٹھے کی پنجابی طرز کی شلوار جس کو ہمارے عرف میں 'شرعی پاجامہ' کہا جاتا ہے جو ٹخنوں سے کافی اونچا ہوتا تھا استعمال فرماتے تھے۔ ہمیشہ سادے قسم کا ناگرہ جوتا پہنتے تھے۔ ٹوپی گول اور سفید باریک کپڑے کی ہوتی تھی جس پر چاروں طرف سے کپڑے کے چاند اور تین گول پتّی کے نشانات بنے ہوتے تھے، جب کبھی سفر پر تشریف لے جاتے یا شہر ہی میں کہیں جانا ہوتا تو ہلکے سبز رنگ کا پنجابی عمامہ باندھتے تھے جو واپس آنے پر اسی طرح بندھا ہوا سر سے اُتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیتے تھے، بنیان بہت کم استعمال کرتے، اور شیروانی تو بالکل نہیں پہنتے تھے، جاڑوں کے موسم میں اکثر گرم کرُتا اور گرم صدری کا بھی معمول تھا، زیادہ سردیوں میں صبح وشام روئی یا اون کا کنٹوپ بھی استعمال فرماتے تھے، اس کے علاوہ کبھی فرغل، گرم چادر یا ہلکی رضائی کا بھی استعمال ہوتا تھا، کپڑے ہمیشہ سفید پہنتے تھے، رنگین کپڑے کبھی نہیں پہنے، البتہ کبھی کبھی صدری کا رنگ ضرور ہلکا گلابی یا ہلکا ہرا ہوتا تھا، گھر کے باہر نکلتے وقت مرزاپوری چھڑی ہاتھ میں رہتی تھی جس میں کوئی دستہ یا موٹھ وغیرہ نہیں ہوتی تھی، زیادہ تر اپنے کپڑے خود ہی دھو لیتے تھے، غالباً اس میں بھی اتباعِ سنت اور کسرِ نفسی ہی کی نیت رہی ہوگی، صرف یہی نہیں بلکہ جو استعمالی کپڑے کہیں سے کچھ بوسیدہ ہو جاتے انھیں اپنے ہاتھ ہی سے سی بھی لیتے تھے اسی لیے سوئی تاگہ اور اس قسم کی دوسری اشیاء ہمیشہ ان کے پاس رہتی تھیں۔

---

[1] سجدوں کی (کثرت کی) وجہ سے اُن کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔ الحجرات، ص ۲۹

مزاج اور اندازِ گفتگو

آپ بہت ہی نرم مزاج تھے، آپ کو کبھی کسی پر غصہ کرتے یا بُرا بھلا کہتے نہیں سُنا گیا، ہمیشہ ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ کوئی بھی ہو اور کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے، چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہر وقت طاری رہتی تھی مگر بایں ہمہ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک مشہور و معروف بزرگ حضرت مرزا مظہر جانجانان شہیدؒ (م ۱۷۸۰ء) کی طرح طبیعت میں نفاست اور نزاکت بے انتہا تھی، گندگی اور بے سلیقگی سے بڑی نفرت تھی، لباس کی صفائی اور پاکیزگی کا ہر وقت خیال رہتا تھا، انھیں کبھی بھی میلے کپڑوں میں نہیں دیکھا گیا۔ دارالمبلّغین لکھنؤ کے جس حصہ میں قیام تھا، اس کی صفائی اور دُھلائی خود اپنے ہاتھوں سے کیا کرتے تھے۔ کمرے میں ہر چیز کے لیے ایک جگہ مقرر تھی، یہ گوارہ نہ تھا کہ کوئی چیز اپنے مقررہ مقام سے ہٹا کر رکھی جائے، اگر کبھی کسی کی غلطی سے ایسا ہو جاتا تو بڑی اذیت محسوس کرتے تھے۔ طبیعت میں خودداری بے پناہ تھی، جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا اپنا کوئی کام کسی دوسرے سے لینا پسند نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ خود ہی کرلیا کرتے تھے۔ آپ کے خاندان میں اولادیں، بہویں اور پوتے پوتیاں سب ہی موجود تھیں اگر چاہتے تو اپنا ہر کام بڑی آسانی سے حکم دے کر لے سکتے تھے مگر اللہ رے استغناء! اپنی کسی ذاتی ضرورت کا کبھی اظہار تک نہیں فرمایا۔ اکثر لوگ چاہا کرتے اور اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ آپ اپنا کوئی ذاتی کام ہم لوگوں سے لیں مگر زیادہ تر اس میں ناکامی ہی ہوتی تھی۔

کھانے پینے کے معاملات میں بھی یہی معمول تھا، ہر وہ چیز جو دسترخوان پر موجود ہوتی بہ طیبِ خاطر نوش فرماتے، کبھی کسی کھانے کے بارے میں کوئی پسند یا ناپسند کا ذکر نہ ہوتا، البتہ ہمارے مشرقی قصبات میں جو گھریلو پکوان مروّج ہیں ان میں سے اکثر بہت مرغوب خاطر تھے، ہر موسم کی ترکاریاں اور پھلوں کو بڑے شوق سے استعمال فرماتے اور سب متعلقین کو بھی استعمال کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اخیر زمانۂ حیات تک یہ معمول تھا کہ جب کسی خاص پھل کا موسم آتا جیسے آم، خربوزے، تربوز، مٹر کی پھلیاں اور شکر قند وغیرہ تو موسم میں دو چار بار بازار سے منگوا کر متعلقین کے گھروں میں بھجوا دیتے تھے۔

تواضع و انکساری

طبعاً بہت منکسر المزاج تھے، اگر کوئی بات کبھی طبیعت کے خلاف بھی واقع ہو جاتی تو اس کا

اظہار نہ فرماتے، کبھی کسی تعلق رکھنے والے کی کوئی دعوت یا درخواست رد نہیں ہوتی تھی۔ بڑی خوشی سے تشریف لے جاتے تھے اور نہ صرف خود جاتے بلکہ گھر کے سب بچوں کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتے۔ مولانا کے اس معمول کو سب ہی تعلق رکھنے والے جانتے تھے لہٰذا وہ لوگ خود بھی اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ گفتگو ہمیشہ بہت نرمی اور نیچی آواز میں فرماتے، اکثر بات چیت کرتے وقت اپنی نگاہیں نیچی رکھا کرتے تھے، اسی طرح راستہ چلتے وقت بھی نظریں نیچی رہا کرتی تھیں بعض بڑوں سے سُنا ہے کہ جوانی میں مزاج کچھ سخت تھا کسی نامناسب بات کو دیکھنا یا سننا گوارہ نہ تھا۔ تربیت کے معاملہ میں بھی بہت سخت تھے، بچوں کا شور وغل، شرارت یا بیجا کھیل کود بالکل پسند نہ تھا، اسی بنا پر اپنے صاحبزادوں کی تنبیہ بھی فرمایا کرتے تھے۔ راقم نے اپنے والد ماجد اور چچا حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ اگرچہ خود بھی بڑھاپے کی منزل میں آچکے تھے اور پوتے پوتیوں والے ہو چکے تھے مگر مولانا کے ادب اور رعب کا یہ حال تھا کہ ان کے سامنے بے خوف ہو کر برجستہ بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کبھی کسی بات پر کچھ ناراضگی کا اظہار کرتے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ عرض ومعروض کر سکے، کسی فروگذاشت پر صفائی یا تاویل آپ کو بہت ناپسند تھی اگر کوئی ایسا کرتا تو اس سے ناگواری اور بڑھ جاتی تھی۔

سادگی

مولانا کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی، ان کی کوئی چیز اور کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ تصنع اور بناوٹ اور ظاہر داری سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا، یہ خصوصیات ان کی زندگی کے ہر پہلو سے نمایاں تھیں، لباس، غذا اور رہن سہن غرضیکہ ہر چیز انتہائی سادہ اور ریا سے پاک وصاف تھی، لباس کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ کرتا پاجامہ اور کبھی کبھی صدری کے علاوہ کوئی دوسرا لباس استعمال نہیں فرماتے تھے اور یہ چیزیں بھی کوئی بہت اعلیٰ اور مہنگے کپڑے کی نہیں ہوا کرتی تھیں بلکہ وہ کپڑا ہوتا تھا جس کو ایک عام اور متوسط الحال مسلمان استعمال کر سکتا تھا۔ آپ کو گھریلو اشیاء اور خانگی ساز و سامان اکٹھا کرنے کا کبھی شوق نہیں رہا بلکہ ہمیشہ اس کی مذمت کیا کرتے اور فرماتے کہ:

"گھر میں بس اتنا ہی سامان ہونا چاہیے جس سے ضروریاتِ زندگی آسانی سے پوری ہوسکیں، کیونکہ اس ساز وسامان کی طرف انسان کا دل مائل ہوتا ہے جس سے قلب میں غفلت اور

موت سے وحشت پیدا ہوتی ہے، جس کے نتیجہ میں سوائے حسرت و یاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"
حضرت کی عادت یہ تھی کہ اس قسم کے ناصحانہ الفاظ ہر وقت یا بار بار نہیں ادا فرماتے تھے بلکہ کبھی کبھی اس قسم کی باتیں زبان پر آتی تھیں وہ بھی سفرِ حج یا کسی لمبے سفر پر تشریف لے جاتے تو گھر والوں کے سامنے اس قسم کی باتیں فرمائی جاتی تھیں۔

استغناء

مولانا علیہ الرحمہ نے ساری عمر میں کوئی جائداد نہیں بنائی، بس وہی چند کھیت اور دو ایک باغ جو آباء واجداد سے آپ کو وراثت میں ملے تھے اس کے علاوہ کوئی نئی جائداد آپ نے نہیں بنائی البتہ لکھنؤ میں جو ذاتی مکان ہے وہ چونکہ زندگی کی ایک بنیادی ضرورت تھی اس لیے آپ نے اسے خرید کرایا مگر وہ بھی نام سے نہیں بلکہ اپنی بعض اولادوں کے نام سے لیا جو اب تک باقی ہے۔
یہ اس شخص کا حال ہے جس کے ادنیٰ اشارے پر ہزاروں نہیں لاکھوں روپے جمع ہو سکتے تھے مگر اس طرف کبھی تصوّر اور شائبہ بھی نہیں ہوا اور پوری عمر قناعت اور درویشی میں گذار دی۔ ترکِ دُنیا اور سادگی کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب وصال ہوا تو آپ نے جو اشیاء اپنے ورثاء کے لیے چھوڑیں ان میں صرف ٹوٹا ہوا بغیر تالے کا ایک بکس، چار جوڑے کپڑے، دو عدد عمامے، دو عدد صدریاں، ایک عدد نیا جوتا، تھوڑا سا لکھنے کا سامان، ایک عینک ایک لوٹا، ایک گلاس، ایک قلمدان اور ایک اُگالدان تھا۔[1] اکثر کپڑوں کو گٹھری میں باندھ کر کھونٹی پر لٹکا دیا کرتے تھے انھیں کبھی بکس میں رکھنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ ان کے علاوہ ایک بہت ہی پرانا بستر تھا جس میں سبز رنگ کی ایک اوڑھنے کی چادر بھی شامل تھی۔ یہ تھی ان کی کل کائنات جن کو دنیا 'امام اہل سنّت' کہا کرتی تھی، جنھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے باطل کے مضبوط قلعوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور جن کے ٹھوس علمی دلائل کے سامنے بڑے سے بڑے فخفخے اور دبدبے والے سیاہ پوش 'جناب' بھی مقابلے میں آتے ہوئے تامل کرتے تھے اور اسی میں عافیت خیال کرتے تھے کہ وہ اپنے گھر ہی کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تقیہ و تبرّاء کے تیر چلاتے رہیں۔
آپ کے پاس آپ کا ایک بہت بڑا ذاتی کتب خانہ بھی تھا جس میں مختلف علوم وفنون سے متعلق نایاب و نادر کتابیں تھیں۔ اس کتب خانہ میں مختلف فرقوں کی بالخصوص مذہب شیعہ کی تقریباً

[1] ہفت روزہ حرم لکھنؤ، ۲۶ ر جولائی ۱۹۶۴ء

تمام ہی اہم اور بنیادی کتابیں تھیں۔اب یہ کتب خانہ دارالمبلغین لکھنؤ کی اندرونی دوسری منزل کے ایک ہال میں محفوظ ہے اور مدرسہ ہی اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

وصال کے بعد مولانا کے کاغذات میں ڈاک خانہ کی ایک پاس بک بھی ملی تھی جس میں مبلغ گیارہ سو روپے جمع تھے۔یہ وہ رقم تھی جو آپ کے تجارتی ادارے 'فاروقیہ بک ایجنسی' کے ذریعہ آپ کو اپنی کتابوں کی فروختگی سے وقتاً فوقتاً وصول ہوا کرتی تھی۔یہ رقم بعد میں آپ کے ورثاء کے درمیان بحصۂ شرعی تبرکاً تقسیم ہوگئی تھی۔اولیاء اور صلحاء امت کی زندگیوں کا جو خاکہ تذکرہ کی کتب معتبرہ میں بہ کثرت دیکھنے کو ملتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہم لوگوں نے جیتے جاگتے آپ کی زندگی اور اعمال میں دیکھ لیا تھا۔

صلہ رحمی

اگرچہ آپ خود بھی کثیر العیال تھے اور بظاہر کوئی وافر اور مستقل آمدنی بھی نہ تھی مگر آپ کا گھر مہمانوں کا مرکز تھا۔اہلِ خاندان سے خصوصی لگاؤ تھا۔بہنوں اور ان کی اولادوں کے ساتھ بھی بڑا تعلق تھا۔اپنے چھوٹے بھائی مولانا شاہ عبدالرحیم صاحبؒ (جن کا مفصل ذکر پہلے گذر چکا ہے) کو تو بالکل اولاد کی طرح لکھایا پڑھایا اور پرورش کیا تھا اور خود وہ بھی اپنے بڑے بھائی کو بالکل باپ ہی کی طرح قابلِ احترام سمجھتے تھے۔یہ تو سگے بھائی بہنوں کا معاملہ تھا آپ کا اپنے چچیرے بھائیوں سے بھی اسی طرح کا برتاؤ تھا۔ان میں سے اکثر کا قیام وغیرہ بھی آپ ہی کے ساتھ تھا۔بعض اعزاء کی کفالت بھی آپ مکمل طور پر کرتے تھے۔مولانا کی بیوہ والدہ تو بہت عرصہ تک حیات رہیں اُن کے سارے اخراجات مع تمام متعلقین کے حضرت مولانا ہی کے ذمے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ والدہ ماجدہ کی زیارت کے لیے کاکوری تشریف لے جاتے اور ان کی خدمت میں پھل اور شیرینی وغیرہ پیش کرتے تھے۔

اولاد اور اہلِ خاندان سے محبّت

فطری طور پر حضرت مولانا علیہ الرحمہ بڑے رقیق القلب واقع ہوئے تھے۔اپنی اولاد اور متعلقین کی کوئی ادنیٰ سی بھی تکلیف گوارہ نہ تھی۔ذرا سی بھی کسی کی کوئی تکلیف یا پریشانی کا علم ہوجاتا تو بے چین ہوجاتے،باربار دریافت حال کے لیے گھر آنا اور اسی عالم پریشانی میں واپس

مدرسہ جانا معمول ہو جاتا تھا۔ حضرت کو اپنے والدین کے ساتھ بے انتہا تعلق تھا۔ جب تک وہ حیات رہے ان کی بڑی خدمت کی اور یہ خدمت بدنی اور مالی دونوں طرح کی تھی۔ والد ماجد مولوی ناظر علیؒ (م ۱۹۱۱ء) سے تو تعلق و محبت کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ آپ پوتے اور پڑپوتے کی عمر کو پہنچ چکے تھے مگر ان کا تذکرہ کرتے ہی آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ آپ کے پاس اپنے والد ماجد کی بعض اشیاء مستعملہ بھی تھیں جن میں ایک عینک، ایک قلمدان اور قلمی مکتوبات و دیگر بہت سی تحریری سندیں جو انھیں زمانۂ تحصیلداری میں ان کے بعض انگریز افسروں نے دی تھیں قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں متبرک چیزوں میں حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ہنسویؒ اور حضرت مولانا شاہ احمد سعید صاحب دہلویؒ کے متعدد خطوط بھی ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ آپ کا معمول تھا کہ اکثر سب خاندان والوں کو جمع کرتے اور مختلف قسم کی نصیحتیں فرماتے جس میں خاص طور سے دنیا اور حصولِ دنیا کی مذمّت، آخرت کی یاد اور تعلق مع اللہ کا ذکر ہوتا تھا اور جب یہ کلمات ادا ہوتے تو اس وقت خود ان پر ایک خوف و رجاء کا عالم طاری ہوتا اور آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے تھے۔ اہل اللہ اور خاصانِ خدا پر خشیتِ الٰہی کا اکثر ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نجی معاملات میں بھی انتہائی منکسر المزاج اور رقیق القلب ہو جاتے ہیں چنانچہ یہی کیفیت ان کی روح میں سوز و گداز اور بالیدگی پیدا کرنے کا سبب ہوتی ہے۔

اسی طرح مولاناؒ کو اپنی اہلیہ سے بھی بے حد محبت تھی۔ اپنے آخر زمانۂ حیات میں جبکہ اہلیہ صاحبہ کو انتقال فرمائے ہوئے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا، بات بات پر انھیں یاد فرماتے اور آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے، ان کی ایک ایک خوبی اور ایک ایک نیکی کا تذکرہ کر کے گھر والوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین فرماتے اور بڑے سوز و درد کے ساتھ ان کے لیے دُعائے مغفرت کرتے۔ واقعی وہ کتنی خوش نصیب تھیں کہ دُنیا سے اٹھ جانے کے بعد بھی نہ جانے کس قدر ایصالِ ثواب کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتی رہی ہوں گی، اللہ بہتر جانتا ہے کہ کتنے قرآن مجید اُن کے لیے پڑھے گئے ہوں گے، کتنے عمرے کیے گئے ہوں گے، کتنی قربانیاں ان کی طرف سے کی گئی ہوں گی، کتنے فقراء اور مساکین اور اہلِ حاجت کی ضروریات ان کی طرف سے رفع کی گئی ہوں گی۔ اور پھر مزید برآں اُن کی اولادوں نے تمام عمر ان کی مغفرت کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہوگا، یقیناً یہ نعمتیں اور ابدی دولتیں ہر ایک کو کہاں میسّر ہو سکتی ہیں۔

حج بیت اللہ

اللہ رب العزت نے آپ کو ہر طرح کی دینی و دنیاوی نعمتوں سے نوازا تھا چنانچہ حج بیت اللہ کی نعمت عظمیٰ سے بھی آپ کو کئی بار سرفراز فرمایا۔ اللہ کے گھر کی زیارت اور اس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضری کی تمنا ہر مؤمن صادق کی زندگی کی بہترین تمنا ہوتی ہے۔ جس کسی کو مسلسل جدو جہد اور عمر بھر کی تیاریوں کے بعد اگر ایک بار یہ سعادت حاصل ہو جاتی ہے تو گویا اس کی دینی زندگی ایک عظیم الشان کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ کو منعم حقیقی نے حج بیت اللہ کی سعادت سات بار عطا فرمائی تھی۔ سب سے پہلا حج آپ نے ۱۹۳۱ء میں کیا تھا، اس سفر میں آپ کے ہمراہ آپ کے سب سے بڑے فرزند مولانا حافظ عبدالغفور (م ۱۹۳۵ء) تھے۔ دوسری بار ۱۹۳۸ء میں آپ تشریف لے گئے، اس موقع پر آپ کے عزیز بھائی مولانا عبدالرحیم صاحبؒ (م ۱۹۵۶ء) اور فرزندوں میں مولانا حافظ عبدالعزیزؒ (م ۱۹۵۴ء) اور مولوی حکیم عبدالغنی صاحب مدظلہٗ (پیدائش ۱۹۲۳ء) ہمراہ تھے۔ تیسرا حج ۱۹۴۵ء میں کیا جس میں آپ کے منجھلے فرزند مولانا حافظ عبدالسلام صاحب (م ۱۹۷۳ء) ساتھ تھے۔ چوتھا حج ۱۹۴۶ء میں اور پانچواں حج ۱۹۴۹ء میں بہ ہمراہی مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کیا۔ چھٹا حج ۱۹۵۵ء میں ہوا جس میں راقم الحروف کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ساتواں اور زندگی کا آخری حج ۱۹۵۸ء میں آپ نے کیا تھا، اس موقع پر بھی حضرت مولانا عبدالسلام صاحب رفیق سفر تھے۔

سفر حج کے سلسلہ میں آپ بڑے اخفا سے کام لیتے تھے، گھر والوں کو بھی چند روز پہلے ہی علم ہو پاتا تھا اور وہ بھی دوسروں کی زبانی کیونکہ آپ خود کبھی اس کا اظہار نہ فرماتے تھے۔ سامانِ سفر بھی بہت مختصر ہوتا تھا۔ ان اسفار کو اتنا مخفی رکھنے کے باوجود شہر کے تعلق رکھنے والے حضرات کو اطلاع ہو ہی جاتی تھی اور ملنے آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا یہاں تک کہ روانگی کے دن تو محلہ کی گلیوں اور سڑک پر تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ محبت و عقیدت رکھنے والوں کا یہ مجمع ایک جلوس کی شکل میں آپ کے ہمراہ ریلوے اسٹیشن تک جاتا تھا، چنانچہ اس دن لکھنؤ کا ریلوے اسٹیشن دیندار مسلمانوں سے بھرا ہوا نظر آتا تھا، اکثر حضرات کانپور تک آپ کو پہنچانے جاتے تھے اور کچھ لوگ بمبئی تک بھی شرفِ معیت حاصل کرتے تھے۔ اس سفر میں آپ کا معمول بھوپال

اتر نے کا بھی تھا۔ آپ کے پیرزادہ حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی[1] (م ۱۹۷۰ء) کو پہلے سے اطلاع مل جاتی تھی اور وہ بنفس نفیس اسٹیشن پر آپ کے استقبال کے لیے تشریف لاتے تھے۔ وہاں خانقاہ شریف میں حاضری اور پھر شام کو اپنے شیخ حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہٗ (م ۱۹۲۳ء) کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔

تمام حج آپ نے بحری جہاز سے کیے اور اس میں بھی زیادہ تر ڈیک کلاس میں سفر کرتے تھے جہاں کوئی بھی شان و شوکت اور تزک و احتشام کا ادنیٰ سا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا، ایک ادنیٰ مسلمان کی طرح دیارِ محبوب کی طرف ایک خاص وارفتگی کے عالم میں اللہ کا یہ مخلص بندہ رواں دواں ہوتا تھا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں معلم و مزوّر کے ذریعہ فراہم کردہ مکان میں ہی قیام ہوتا۔ آپ اپنے لیے کسی خصوصی قیام گاہ کا بندوبست نہیں کرتے تھے۔ آخری چند سفروں میں الحاج اصطنا خاں صاحبؒ مالک کارخانہ عطر و تیل اصغر علی و محمد علی لکھنؤ کے اصرار پر مدینہ منورہ میں "اصطنا منزل" میں قیام ہونے لگا تھا۔ سفرِ حج کے دوران سلطان عبدالعزیز بن سعود والی حجاز کی

---

[1] حضرت مولانا شاہ محمد یعقوبؒ بن مولانا شاہ ابواحمد صاحب مجددیؒ کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں ہوئی تھی، ابتدائی گھریلو تعلیم کے بعد قرآن مجید حفظ کرنے میں مشغول ہوئے، ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ آپ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں ۱۹۰۴ء میں حیدرآباد کا رُخ کیا، کچھ روز وہاں قیام کر کے ۱۹۰۵ء میں حجاز روانہ ہو گئے۔ ۱۹۰۶ء میں وہاں سے حیدرآباد واپسی ہوئی۔ حیدرآباد میں مختلف مقامات پر قیام کر کے آپ دینی تعلیم کے حصول میں مصروف رہے۔ کچھ عرصہ گلبرگہ میں حضرت خواجہ سیّد محمد گیسودراز علیہ الرحمۃ کی درگاہ میں بھی قیام رہا۔ حیدرآباد میں تقریباً ۱۷ سال قیام رہا، اس عرصہ میں آپ صعوبتوں اور سخت دشوار گذار حالات سے دوچار ہوئے، وہاں ہر خیال اور ہر مشرب کے علماء و مشائخ اور صوفیہ سے صحبتیں رہیں، انھیں اسباب سے خیالات میں وسعت، بے تعصبی اور فراخی آ گئی تھی اور طبیعت میں جفاکشی اور نفس کشی پیدا ہو گئی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں والد ماجد کے اصرار پر بالکلیہ طور پر بھوپال آ گئے اور خانقاہ شریف کی ذمہ داری سنبھال لی ۱۹۲۳ء میں والد ماجد نے اپنی جانشینی عطا فرمائی اور خلافت سے سرفراز فرمایا، آپ کے دور میں خانقاہ تعلیم و تدریس کا مرکز بن گئی تھی، خود بھی درس دیتے تھے اور دوسرے علماء سے درس لیتے بھی تھے، تلاوتِ کلام پاک آپ کا محبوب مشغلہ تھا، زندگی انتہائی سادہ، بے تکلف اور مجاہدات سے لبریز تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ پر اسرارِ شریعت اور رموزِ طریقت پوری طرح منکشف کر دیے تھے۔ چنانچہ گفتگو بڑی حکیمانہ اور سبق آموز ہوا کرتی تھی، اہلِ خانقاہ کے لیے آپ نے اپنے ملفوظات کا کچھ حصہ خود مرتب کر دیا تھا جس کا نام 'اضغاث و احلام' تھا، اس کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی 'صحبتے با اہلِ دل' کے نام سے ملفوظات کا ایک مجموعہ مرتب کر کے شائع کر دیا تھا۔ آپ کو طب میں بھی خاصی مہارت تھی اور علاج و معالجہ بھی کیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں ضلع مظفرنگر یوپی کے ایک قصبہ میں آپ کا عقد ہوا تھا جن سے پانچ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ ۱۹۷۰ء میں مختصر علالت کے بعد بھوپال میں وصال فرمایا اور وہیں اپنے آبائی قبرستان جہانگیرآباد میں مدفون ہوئے۔

طرف سے شاہی دعوت نامہ بھی آپ کے پاس آتا تھا جس میں ایک یا دو بار کے علاوہ کسی موقع پر آپ نے شاہی مہمان بننا پسند نہیں فرمایا۔ ایک بار شاہ کی طرف سے آپ کو ایک خطیر رقم کی پیشکش بھی کی گئی تھی تاکہ آپ کی تصنیفات کا عربی ترجمہ کرا کے شائع کیا جائے مگر آپ کی خوددار طبیعت نے اس کو قبول نہ کیا۔

دورانِ سفر میں جن جن مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے وہاں آپ کے رفقاء سفر بھی ساتھ ہوتے مگر وہاں پہنچ کر آپ مجمع میں کچھ اس طرح گھل مل جاتے کہ لوگوں کو پتہ نہ چلتا تھا کہ آپ کہاں ہیں اور کس طرح عبادت فرما رہے ہیں اسی لیے وہاں کی عبادتوں کی تفصیل کوئی نہیں بتلا سکتا، یہ آپ کی ایک کرامت تھی۔

زیارتِ روضۂ مقدسہ کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر

حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ مقدسہ سے آپ کو جو خصوصی لگاؤ تھا اس کا مشاہدہ سفر حج میں بخوبی ہوتا تھا ۱۹۵۵ء کے حج میں جبکہ یہ راقم الحروف بھی آپ کے ہمراہ تھا یہ بات برابر مشاہدہ میں آتی تھی کہ آپ پر انابت الی اللہ اور گریہ کی کیفیت کا اکثر غلبہ رہا کرتا تھا، عام دنوں میں بھی تقریر کے درمیان جب بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا نامِ نامی زبان پر آتا تھا تو آواز گلوگیر ہو جاتی تھی اور آنسو گرنے لگتے تھے۔ آپ کی پوری زندگی سنتِ نبویؐ کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ مدینہ منورہ کی ہر چیز سے آپ کو ایک والہانہ تعلق تھا، وہاں کا گلاب، پودینہ اور وہاں کی خاک شفا آپ ہمیشہ اپنے ساتھ لایا کرتے تھے اور بڑی رغبت و احترام کے ساتھ دوسروں کو بھی پیش کرتے تھے۔ زیارت روضۂ اطہر کے فضائل بیان کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

> ''حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سرمایۂ سعادتِ دنیا و آخرت ہے اور اہلِ ایمان و محبت کا مقصد اصلی اور حقیقی غایت ہے اس کے فضائل بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں، قسم ہے ربّ العرش کے عزت و جلالِ بے زوال کی کہ اگر اس زیارت میں کچھ بھی ثواب نہ رکھا جاتا اور اس کا معاوضہ آخرت میں کچھ بھی نہ دیا جاتا تب بھی مشتاقانِ بے دل کی یہی حالت ہوتی اور حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والے اس وقت بھی اسی طرح مہینوں بلکہ برسوں کا سفر اختیار کر کے دشوار گذار راستوں سے عبور کر کے فوج در فوج آستانہ عالی کی

زیارت کے لیے آتے، ان کے مصائبِ سفر اور تمام تکالیف کا یہی معاوضہ بس ہے کہ روضۂ محبوب کی زیارت نصیب ہو جائے اور سردارِ انبیاء کی مقدس چوکھٹ پر جبہہ سائی کی دولت مل جائے...... مگر اس بارگاہِ رحمت و کرامت کی فیاضی کا مقتضیٰ ہے کہ جو لوگ اس آستانۂ عالی کی زیارت کے لیے جاتے ہیں ان کے لیے علاوہ اس دولت بے بہا یعنی دیدارِ جمالِ بے مثالِ روضۂ سرورِ انبیاء کے اور بھی بڑے بڑے اعلیٰ مدارج کا وعدہ کیا گیا ہے[1]۔''

زیارت کے بارے میں ان پاکیزہ خیالات کے اظہار کے بعد آپ نے چند احادیث نقل کی ہیں جن میں قبر اطہر کی زیارت کی تاکید آئی ہے پھر اس کے بعد لکھا ہے کہ قرآن مجید میں بھی اشاراتِ صریحہ موجود ہیں جو زیارت قبرِ اطہر و اقدس کی ترغیب دیتے ہیں منجملہ ان کے ایک آیت یہ بھی ہے: وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَلَمُوْآ اَنْفُسَھُمْ جَآءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوْا اللّٰهَ وَ اسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّاباً رَحِیْماً[2]۔ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ آیت خاص لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے مگر تمام مسلمانوں کا متفقہ اصول ہے کہ آیت اپنے موردِ نزول کے ساتھ خاص نہیں رہتی۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانا اور ان سے استغفار کرانا باعثِ مغفرت ہے، انبیاء علیہم السلام کے لیے حیاتِ ابدی کا ثبوت تمام اہلِ اسلام کو مسلّم ہے اور قرآن و حدیث سے واضح طور پر ظاہر ہے، لہٰذا یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ فضیلت صرف اُسی زمانے کے لوگوں کو نصیب ہو سکتی تھی اور اب اس کا وقت نہیں رہا ہے۔ اس موقع پر آپ نے حافظ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ محمد بن حرب ہلالی کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ گیا اور قبر شریف کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَوْ اَنَّھُمْ...... الآیۃ۔ لہٰذا میں اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوں اور آپ کو اپنا شفیع بنانے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ بہت رویا اور اس نے ولولۂ شوق میں کچھ اشعار پڑھے۔ محمد بن حرب کہتے ہیں کہ اس اعرابی کے لوٹ جانے کے بعد میں نے حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپؐ فرماتے ہیں کہ اس

---

[1] علم الفقہ جلد پنجم، ۹۶-۹۷۔

[2] (ترجمہ) اور اگر وہ لوگ جبکہ اپنی جانوں پر ظلم کر چکے تھے (اے نبیؐ) تمھارے پاس آتے اور پھر وہ اللہ سے استغفار کرتے اور رسول (یعنی تم بھی) ان کے لیے استغفار کرتے تو بے شک وہ اللہ کو بخشنے والا مہربان پاتے۔ (سورۂ نساء، ص ۶۴)

اعرابی سے جا کر ملو اور اس کو بشارت دو کہ اللہ نے تیرے گناہ میری شفاعت سے بخش دیئے[1]
ان شواہد کی روشنی میں زیارت قبر شریف کے بارے میں اپنی رائے لکھتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

''اب باقی رہا یہ مسئلہ کہ زیارت قبر شریف کا کیا حکم ہے یعنی وہ سنت ہے یا واجب، علماء محققین اس کے وجوب کے قائل ہیں اور (بعض) احادیث سے بھی انھی کی تائید ہوتی ہے...... تمام علماء سلف سے آج تک تارکین زیارت پر رد و قدح کرنا اور ترک زیارت کو معیوب سمجھنا بھی اسی امر کی دلیل ہے کہ وہ لوگ زیارت کو واجب سمجھتے تھے، ورنہ سنت یا مستحب کے ترک پر ایسے سخت کلمات کا استعمال جنھیں تارکین زیارت پر ان لوگوں نے کیا ہے نہیں ہوا...... اکثر علماء حنفیہ اس کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ محقق ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ وہ قریب واجب کے ہے۔ چنانچہ بعض علماء اس زیارت کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ شارح لباب المناسک نے الدرۃ المضیۃ میں اور فقیہ خیر الدین رملی نے منح کے حاشیہ میں اور (دوسرے) علماء نے دوسری کتابوں میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ راقم ناچیز بھی اسی قول کو اقویٰ اور اختیار کرنے کے لیے اولیٰ سمجھتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم[2]

اس موقع پر آپ نے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ (۱۲۶۳-۱۳۲۸ء) کے اس قول کا ردّ کیا ہے جس میں انھوں نے زیارت مقدسہ کے لیے سفر کر کے جانا ناجائز بیان کیا ہے۔ علاّمہ ابن تیمیہؒ صحیح بخاری کی اس حدیث **لا تشد والرحال الا الیٰ ثلا ثة مساجد مسجد الحرام و مسجد الاقصیٰ و مسجدی ھٰذا**[3] سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ ان مساجد کے علاوہ اور کسی مقام کی زیارت کے لیے سفر کرنا جائز نہیں۔ اس قول کی تردید میں مولانا لکھنویؒ فرماتے ہیں:

''اس حدیث سے ان کا استدلال کسی طرح صحیح نہیں کیونکہ مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ سوا ان تین مسجدوں کے کسی اور مسجد کے لیے سفر نہ کیا جائے۔ قاعدہ نحوی بھی اسی کا مقتضیٰ ہے کیونکہ جب مستثنیٰ منہ مذکور نہیں ہوتا تو وہاں وہی چیز مستثنیٰ منہ مانی جاتی ہے جو مستثنیٰ کی ہم جنس ہو، پس یہاں مستثنیٰ مساجدِ ثلاثہ ہیں لہٰذا مستثنیٰ منہ بھی مسجد ہی کے قبیل سے ہونا چاہیے۔ پس اس حدیث سے اگر عدم جواز ثابت ہوگا تو ان تین مسجدوں کے سوا کسی اور مسجد کی زیارت کے لیے سفر کرنے کا

۱۔ علم الفقہ جلد پنجم، ص ۹۸ ۲۔ علم الفقہ جلد پنجم، ص ۹۹

۳۔ (ترجمہ) کجاوے نہ باندھے جاویں (یعنی سفر نہ کیا جائے) سوا تین مساجد کے، (اوّل) مسجد الحرام، (دوم) مسجد الاقصیٰ اور (سوم) میری یہ مسجد (یعنی مسجد نبوی)

(ہوگا) نہ کہ زیارت قبر سیّد المرسلینؐ یا اور صلحاء امّت کی قبور متبرکہ کی زیارت کے لیے سفر کرنے کا۔ مثلاً کوئی شخص دہلی کی جامع مسجد کی زیارت کے لیے آئے تو یہ نا جائز ہے اور اگر حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کی زیارت کے لیے آئے تو نا جائز نہ ہوگا۔ یہی مطلب اس حدیث کا بیان کیا ہے اکثر علماء حدیث نے مثل شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ کے اور اسی مطلب کی تائید مسند امام احمد کی حدیث سے ہوتی ہے وہ اس حدیث کو ان الفاظ سے روایت کرتے ہیں۔ **لاینبغی للمصلی ان یشد رحاله الیٰ مسجد یبتغی فیه الصلوٰة غیر المسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ و مسجدی**[1] ایجیے اب تو کوئی جھگڑا ہی نہ رہا۔ حدیث کی شرح خود حدیث سے ہوگئی۔ کیا اب بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ بخاری کی حدیث سے زیارت قبر اقدس سرور انبیاء کے لیے سفر کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ حاشا ثم حاشا۔ کوئی ذی علم ایسی بات نہیں کہہ سکتا اور اگر یہ مان لیا جائے کہ سوا ان تین مسجدوں کی زیارت کے اور کسی کام کے لیے سفر جائز نہیں تو چاہیے کہ طلب علم، کسب معاش اور ملاقات احباب واعزہ بلکہ حج کرنے کے لیے بھی سفر نا جائز ہو حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ علاوہ اس کے زیارتِ قبر اقدس کے لیے، صحابہؓ کا سفر کر کے آنا اور دوسروں کو اس زیارت کے لیے سفر کرنے کی ترغیب دینا جیسا کہ حضرت بلال اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے کیا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اس حدیث کا وہ مطلب نہیں ہے جو علامہ ابن تیمیہؒ یا ان کے ہم خیال لوگوں نے سمجھا ہے۔ پھر خاص احادیث نبویہ جو ترغیب زیارت کے باب میں وارد ہوئی ہیں اور تارک زیارت کے لیے جو وعید احادیث میں وارد ہوئی ہیں ان کا کیا جواب دیا جائے گا[2]۔"

اس طرح آپ نے علامہ ابن تیمیہ کے قول کی نہ صرف تردید ہی کی ہے بلکہ زیارت روضۂ اقدس کے وجوب کی تائید بھی کی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ:

"اگر علماء سلف میں سے کسی کو غلط فہمی ہوگئی اور بطور خطائے اجتہادی وہ اس امر کے قائل ہوگئے کہ اس سے زیارتِ مقدسہ کے لیے سفر نا جائز ہے تو خدا غفور ورحیم ہے، امید ہے کہ بخش دے کیونکہ وہ خطائے اجتہادی پر مواخذہ نہیں کرتا، خطا ظاہر ہو جانے کے بعد اس کی تقلید کرنا البتہ ایک سنگین جرم ہے جو کسی طرح قابل معاف کرنے کے نہیں ہے[3]۔"

---

[1] (ترجمہ) نماز پڑھنے والے کو زیبا نہیں کہ سوائے کعبہ اور بیت المقدس اور میری مسجد کے اور کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے سفر کرے۔ [2] علم الفقہ جلد پنجم، ص ۱۰۱-۱۰۲ [3] ایضاً، ص ۱۰۱

مولانا کی ایک وصیت

علم الفقہ جلد پنجم کو مرتب کرتے وقت جب روضۂ اقدس پر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا طریقہ آپ نے لکھا تو اس موقع پر آپ نے اپنے ناظرین کے لیے بڑے دردمندانہ انداز سے اپنی ایک وصیت تحریر کی ہے اور پھر جو اس وصیت پر عمل کرے اس کو ایک بڑی قیمتی دُعا دی ہے۔ اب ہم اس وصیت کو ناظرین تک پہنچا رہے ہیں تاکہ ہم بھی اس کا وسیلہ بن سکیں، خدا سے اُمید ہے کہ وہ اپنے سعید بندوں کے ذریعہ آپ کی اس وصیت کو پورا کراتا رہے گا اور اس طرح اس دُعا کے حق داروں میں ذریعہ اور وسیلہ بننے کی وجہ سے ہمارا نام بھی شامل ہوتا رہے گا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"ناظرین میں جس اقبال مند خوش نصیب کو یہ دولت نصیب ہو اور حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے وہ مشرف ہو تو اس سے نہایت التجا کے ساتھ میری وصیت ہے کہ اس ذرّۂ بے مقدار کا سلام بھی اس کے آقائے نامدار کو پہنچا دے کہ یارسول اللہ آپ کے ادنیٰ غلام عبدالشکور بن ناظر علی نے حضورؐ کی جناب میں سلام عرض کیا ہے اور آپ کے لطف و کرم اور رحمت و شفاعت کا امیدوار ہے۔ یارسول اللہ حق تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین اور رؤف ورحیم فرمایا ہے، یارسول اللہ آپ کی رحمت و رأفت تو خدا کی تمام مخلوق پر محیط ہے، یارسول اللہ خدا کی مخلوق میں سے میں بھی ہوں بلکہ آپ پر ایمان لایا ہوں اگرچہ نیک بندوں میں نہیں لیکن آپ کی امّت کے گنہگاروں میں تو ہوں:

تو ابر رحمتی آں بہ کہ گاہے   کنی برحالِ لب خشکاں نگاہے
نہ آخر رحمۃ للعالمینی   زمحر و ماں چرا غافل نشینی

اللھم صل علیٰ سیدنا محمدن النبی الامی وعلیٰ الہٖ و صحبہٖ وبارک وسلم۔ جو شخص میری اس وصیت کو پورا کرے حق جل شانہٗ اس کو بہ طفیل حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم جزائے خیر دے اور صلاح دنیا و آخرت اس کو نصیب کرے اور ایمان پر اس کی زندگی ختم کرے۔ آمین:

سلامی یانسیم الصبح بلغ   الیٰ من قرّ فی صدری ھواہ
فجسمی ظاھراً منہ بعید   بعین باطنِ قلبی یراہ[1]

---

[1] علم الفقہ جلد پنجم ص ۱۱۰ و ۱۱۱

چوتھا باب

زہد و توکل، عبادت و ریاضت اور معمولاتِ روز و شب

حضرت لکھنویؒ کی حیات کا ایک ایک ورق اسلامی تعلیمات اور علم و عمل کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھا، آج کے اس دورِ انحطاط میں جبکہ خالص اسلامی طرزِ زندگی صرف پرانی کتابوں کے صفحات میں ہی محدود و محصور ہو کر رہ گیا ہے آپ نے اپنی عملی زندگی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ طریقِ حیات نہ صرف قابلِ عمل و قابلِ تقلید ہے بلکہ یہی طریقہ دنیاوی سربلندی اور آخرت کی سرخروئی کے حصول کا واحد ذریعہ بھی ہے۔ آپ کے شب و روز زہد و توکل، سادگی و قناعت پسندی اور اخفاءِ حال کے مشاہدے سے صحابۂ کرامؓ، تابعین عظامؒ اور اولیاء اللہ کی حیاتِ مقدسہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ آج کل کے ظاہر بین، روحانیت ناشناس اور علومِ نبویہ کی معرفت سے تہی دست لوگ اس سادہ و صاف اور بے ریا طرزِ زندگی کو کتنا ہی ناقابلِ اعتنا سمجھیں مگر جو حقیقت ہے وہ حقیقت ہی رہے گی چنانچہ اس سائنسی دور میں جبکہ مادیت اس قدر غالب ہو رہی ہو کہ باپ اپنے بیٹے کی خدمت و سعادت سے محروم بیٹا باپ کی شفقت و سرپرستی سے ناآشنا، اعزا و اقرباء کے حقوق کی پامالی اور دوستوں و پڑوسیوں کے واجبات سے روگردانی عام ہو گئی ہو اور خود غرضی و مفاد پرستی کا ہر طرف دور دورہ ہو تو معاشرہ اور اجتماعی زندگی ایک عذاب اور اپنی المناکیوں کے لحاظ سے جہنم زار بن جاتی ہے لہٰذا جب چاروں طرف اس قسم کے واقعات نظر کے سامنے سے گذرتے ہیں تو ہر ذی شعور اور سلیم الفطرت انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر یہ مروجہ طرزِ زندگی ہمیں سکون و راحت بہم نہیں پہنچا سکتا تو وہ کون سا راستہ ہے جس پر گامزن ہونے سے دنیا اور دنیا کے بعد والی زندگی کامیابیوں اور کامرانیوں کا وسیلہ اور ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس وقت یقیناً یہی کہنا پڑے گا کہ بس وہی طرزِ زندگی اور وہی طریقِ حیات باعث خیر و برکت ہے جس پر ہمارے اسلاف اور اکابر ہمیشہ چلتے رہے اور اس طرح اپنے عمل سے اس کو ہمارے لیے قابلِ عمل بنا گئے۔

مولانا گنگوہیؒ کی زندگی میں دنیا اور لوازمات دنیا کا ادنیٰ سا شائبہ نہ تھا۔ متوسلین اور تعلق رکھنے والے لوگوں میں امراء بھی تھے اور غرباء بھی، اہل علم بھی تھے اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی لیکن ہر شخص اپنے متعلق یہی خیال کرتا تھا کہ آپ اس کے ساتھ بڑی محبت فرماتے ہیں، اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ ان کی مجلس میں امیر وغریب، اونچ نیچ اور اعلیٰ وادنیٰ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ایک غریب اور سیدھے، پڑھے لکھے ضرورت مند کو بھی آپ کی مجلس میں وہی مقام حاصل تھا جو کسی رئیس اور خوشحال تاجر کو تھا۔ اس مساوات فقر وقناعت میں کسی امیر کو محض اس بنا پر فوقیت نہیں دی جاتی تھی کہ وہ دولت مند ہے اور کسی شخص کو صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ کسی عزت وعظمت والے عہدہ کا مالک نہیں ہے، ہر طبقہ کے لوگ جب آپ کے پاس آتے اور اپنے مسائل اور دکھ درد کی روداد سناتے تو آپ بڑی توجہ اور شفقت کے ساتھ ان کی بات سنتے اور ان کو ٹھیک رائے دے کر مطمئن فرما دیتے تھے۔

استغناءِ حال

استغناءِ حال کا عالم یہ تھا کہ آپ کبھی اپنے سفر کے احوال وکوائف نہ صرف مجلس میں بلکہ اپنے گھر والوں سے بھی بیان نہیں فرماتے تھے۔ اگر کوئی ہمت کر کے پوچھ بھی لیتا تو بہت ہی مختصر تو بہی سے جواب دے کر خاموش ہو جاتے، اگر کبھی کوئی شخص آپ کی علمی خدمات کا تذکرہ آپ کے سامنے کرتا تو فوراً چہرے سے معلوم ہو جاتا کہ آپ انتہائی شرمندہ ہو رہے ہیں اور آپ کی طبیعت پر یہ تذکرہ بار ہو رہا ہے۔ عالم یہ تھا کہ جب تک ضعفِ پیری زیادہ غالب نہ ہوا تھا آپ مسلسل سفر پر رہا کرتے تھے اور جہاں کا بھی سفر ہوتا تھا وہاں کے لوگوں کے بار بار اصرار پر ہوتا تھا۔ محبت اور تعلق رکھنے والے لوگ اپنے خلوص اور عقیدت کے اظہار کے لیے پر جوش استقبال کرتے اور اسٹیشن سے لے کر قیام گاہ تک موٹر گاڑیوں اور دوسری سواریوں کا ایک قافلہ ہوتا لیکن اللہ کا یہ مقبول بندہ اپنی جگہ نگاہ نیچی کیے ہوئے شرمندہ نظری کے ساتھ بیٹھا ہوا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد استغفر اللّٰہ ربی من کل ذنبٍ وَاتوبُ اِلیہِ کا ورد کرتا رہتا تھا۔ اگر ایک طرف جاں نثاروں اور فدا کاروں کا ہجوم ہوتا تو دوسری طرف سراپا عجز وانکساری اور مجسم خاکساری و شرمساری کے ساتھ ماحول سے بے نیاز و بے گانہ جلوت میں خلوت کا مشاہدہ ہو رہا ہوتا تھا۔

غالباً اپنے کو کسی طرح سے بھی ممتاز نہ ہونے دینے کے جذبے سے ہی آپ کی یہ روش تھی

کہ عام طور پر ریل کے تیسرے درجہ (اور آج کے سیکنڈ کلاس) میں سفر کرتے تھے لیکن طویل سفر کی مجبوری کی وجہ سے کبھی کبھی فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بھی سفر ہوتا تھا۔ ہمیشہ یہ معمول تھا کہ ٹرین کی روانگی سے کافی دیر پہلے اسٹیشن پر پہنچ جایا کرتے تھے اور اس میں تاخیر بالکل گوارہ نہ تھی۔ منتظمین جلسہ یا اربابِ مدرسہ سے جب شرکت کا وعدہ کر لیتے تو پھر کسی حال میں بھی سفر میں تبدیلی یا التواء پسند خاطر نہ تھا۔ اپنے پہلے سے مقرر کردہ وقت پر پہنچنے کا بہت اہتمام فرماتے تھے، عموماً تنہا سفر ہوتا تھا کبھی کسی خادم یا رفیق سفر کو لے جانے کا معمول نہ تھا، سامانِ سفر میں باقاعدہ کوئی بستر بند، اٹیچی یا ہینڈ بیگ وغیرہ نہ ہوتا تھا، صرف ایک دری، ایک چادر اور ایک تکیہ رسّی سے بندھا ہوا اور ایک مٹی کا لوٹا اور ایک عدد مسواک ساتھ ہوتی تھی۔ بس یہ کل کائناتِ سفر تھی اللہ کے اس بندے کی جس کو لوگ 'حجۃ الاسلام' اور 'امام اہل سنّت' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

قناعت اور خدا پر اعتماد

آپ نے کبھی روپے پیسے کو جمع کر کے نہیں رکھا، جو بھی آمدنی ہوتی تھی اور وہ جس مقصد کے لیے ہوتی تھی اسی میں صرف کر دیا کرتے تھے، کبھی اپنے لیے بچا کر نہ رکھتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ بھی بڑا کارساز ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے مخلص بندے نے محض اس کی ذات پر تکیہ کر رکھا ہے اور اپنی تمام مادی حاجتیں اسی کے فضل و کرم کے سپرد کر رکھی ہیں تو وہ بھی اپنی رحمت کے دریچے کھول دیتا ہے اور اپنی گوناگوں نعمتوں کی بارش کر دیتا ہے، بالکل یہی معاملہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کا مولانا کے ساتھ تھا۔ سوائے ان مختصر ایام کے جن میں اپنے بعض مخلصین کے اصرار پر آپ نے ملازمت کر لی تھی کبھی آپ کی کوئی متعین اور لگی بندھی آمدنی نہ تھی، مزید برآں ایک بہت بڑے کنبے کی کفالت آپ کے ذمہ تھی، تبلیغی اسفار بھی تھے، اعلیٰ درجہ کے تصنیفی مشاغل بھی تھے، فرق ضالّہ (باطل و گمراہ فرقوں) کی تردید اور مذہب حق کی تائید و مدافعت بھی آپ کے سپرد تھی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ ہمہ جہت مصروفیات بلا کسی متعین آمدنی کے کس طرح جاری رہتی ہوں گی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کو کبھی کسی قسم کی مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ کے ہر کام اور ہر ضرورت کو اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ پورا فرما دیتا تھا۔ جب اتفاقاً پیسے سے ہاتھ خالی ہوتا تو فرماتے تھے:

"آج کل میرا ہاتھ خالی ہے اور اب جلد ہی کہیں سے روپیہ آنے والا ہے، بس صبح و شام کی دیر

ہے کیونکہ جب میرا ہاتھ خالی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ جلد ہی دوسرے پاس بھیج دیتا ہے"

اپنے مخصوص متوسلین اور تعلق رکھنے والوں سے کبھی کبھی ہدیہ بھی قبول فرما لیتے تھے مگر یہ اعزاز صرف انھیں کو حاصل ہوتا تھا جن سے آپ کو انس ہوتا تھا۔ اسی لیے بعض اوقات کسی غریب اور کم حیثیت مخلص کا معمولی سا ہدیہ بھی بطیب خاطر قبول ہو جاتا مگر کسی ایسے شخص سے جس سے آپ کو کوئی انس یا تعلق نہ ہوتا اس کا ہدیہ ہرگز قبول نہیں فرماتے تھے۔ درحقیقت ان حضرات کے نزدیک ہدیہ کی مقدار اور تعداد کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کی اہمیت کا پیمانہ محبت اور انس ہوتا ہے۔

اتّباعِ سنّت

حضرت امامِ ربانی مجدّد و منور الفِ ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

بدانکہ حاصل طریقۂ حضرات خواجگاں قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم اعتقاد اہل سنت و جماعت است و اتباع سنت سنیہ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیہ، واجتناب اَست از بدعت و ہوائے نفسانیہ و عمل بعزیمت امور مہما امکن و احتراز از عمل برخصت و استہلاک و اضمحلال است اولاً درجہت جذبہ[1]

جاننا چاہیے کہ حضرات خواجگان قدس سرہم کے طریقہ کا ماحصل یہ ہے کہ اہل سنت و جماعت کے عقائد کے مطابق اپنا اعتقاد رکھیں، سنت سنیہ مصطفویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کریں، بدعت اور ہوائے نفسانی سے پرہیز کریں جہاں تک ہو سکے عزیمت پر عمل کریں اور رخصت سے احتراز کریں، اس کے بعد اوّل جذبہ میں استہلاک و اضمحلال یعنی فنا و استغراق حاصل کریں۔

مذکورہ بالا مکتوب میں حضرت امام ربانی قدس سرہٗ نے خاص طور سے ان تین باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن پر عمل پیرا ہونا ہر صاحبِ ایمان پر ضروری ہے یعنی عقائد اہلِ سنت و جماعت پر عمل، سنت نبویہ کی پیروی اور بدعت و خواہشات نفس سے اجتناب، یہ تینوں صفات مولانا لکھنویؒ کی زندگی میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور آپ کی تعلیمات بھی انھیں کے مطابق تھیں چنانچہ خود ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

"اتباعِ سنت کا حرص اپنے دل میں پیدا کرنا چاہیے، نہ صرف عبادات میں بلکہ عادات میں بھی، مثلاً کھانے پینے، سونے جاگنے، بولنے چپ رہنے اور استنجا و طہارت میں، غرضیکہ ہر حالت میں یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان کاموں کو ہم اس طرح کریں جس طرح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مکتوبات امام ربانی، دفتر اوّل، مکتوب دوصد و نود و دوم، ص ۴۰۲

نے کہا ہے..... اتباع سنت کا حرص جب کسی کے دل میں گھر کر لیتا ہے تو اس کو ایک خاص تعلق رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہو جاتا ہے اور یہی تعلق اصل چیز اور تمام فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے اور ایسے شخص پر خاص رحمت خداوندی یہ ہوتی ہے کہ افعال اضطراریہ میں بھی منجانب اللہ خلاف سنت حرکات سے اس کی حفاظت ہوتی ہے۔[1]

مولانا علیہ الرحمۃ کی زندگی اس قول کا پورا عملی نمونہ تھی، وہ واقعی سنت نبویہ کے حریص تھے۔ صرف عبادت ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں آپ نے اس پر عمل کیا، قدم قدم پر اس کی پیروی کی اور کسی حال میں بھی سرمو فرق نہیں آنے دیا۔ نماز میں خشوع وخضوع اور کمال اتباع سنت پیش نظر تھا، نہایت سکون اور پر وقار انداز میں نماز ادا فرماتے تھے، حالت قیام میں ایسے یکسو اور سید ھے کھڑے ہوتے کہ کیا مجال اِدھر اُدھر کوئی میلان یا حرکت ہو، علاوہ تہجد کے اور وقتوں کی نمازیں زیادہ طویل نہیں ہوتی تھیں، رکوع و سجود و قعود غرض ہر رکن میں سنت کی پوری رعایت ملحوظ خاطر رہتی، تعدیل وسکون اور آداب و مستحبات کا کامل خیال رہتا، ایسی پُرسکون اور پر وقار نماز ہوتی تھی کہ دیکھنے والے کے دل میں اس کی محبت و عظمت قائم ہو جاتی۔ صحابہؓ اور بزرگان دین رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے حالات میں جو نمازوں کی کیفیت ملتی ہے وہ ہو بہو آپ کی نماز میں لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ نماز کی سنت و نوافل کا بڑا اہتمام فرماتے، سنتیں اکثر قیام گاہ پر پڑھ کر مسجد تشریف لے جاتے، پنجوقتہ نمازیں آپ اپنے مدرسہ کے سامنے والی مسجد میں ادا فرماتے تھے۔ اور کبھی بھی بلا کسی شدید عذر کے کوئی جماعت چھوٹنے نہیں پائی، اوّل تو خود امامت سے گریز فرماتے مگر جب امامت کرنی ہی پڑ جاتی تو جہری نمازوں میں مسنون سورتوں میں جو سب سے چھوٹی اور مختصر ہوتی اس کی تلاوت فرماتے اور بہت اطمینان اور ٹھہر ٹھہر کر نماز کے تمام ارکان ادا کرتے تھے۔ آپ کی نماز ایسی تھی کہ جیسے کوئی اللہ کا بندہ نہایت عاجزی کے ساتھ خوف و رجا کے عالم میں اپنے مالک کے حضور کھڑا ہو، یہ کیفیت ایک ایسی کیفیت تھی کہ جس کے دیکھنے ہی سے اللہ کی یاد، نماز کی رغبت، گناہوں سے نفرت اور دین کی محبت دل میں پیدا ہوتی تھی۔

آپ کا معمول تھا کہ جب اپنے اعزاء کے یہاں تشریف لے جاتے تو سب سے پہلے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اجازت طلب کرتے اور جب اندر سے جواب آ جاتا تب آپ مکان میں تشریف لے جاتے، یہی طریقہ قریب سے قریب تر عزیز کے ساتھ بھی تھا، گھر میں

---

[1] شجرۂ طیبہ ص ۴۷ - ۴۸

تھوڑی دیر تشریف رکھتے، خیر و عافیت دریافت فرماتے، اگر کسی کی طبیعت ناساز ہوتی تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دم فرماتے اور ختم خواجگان رحمہم اللہ اجمعین کے موقع پر دم کیا ہوا پانی پلانے کی تاکید فرماتے اور پھر مدرسہ واپس آجاتے۔ راستہ میں کبھی بھی نگاہ اِدھر اُدھر نہیں اٹھتی تھی، ہمیشہ چلتے وقت نظریں نیچی رکھتے تھے، راستہ میں گفتگو کرنا بھی پسند نہ تھا، اگر کوئی شخص اثنائے راہ میں کوئی ضروری بات کرتا بھی تو خاموشی کے ساتھ سن تو لیتے مگر خود کوئی سوال و جواب نہ فرماتے بس ہاں نہیں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت عطا فرمائی تھی، ذات نبویؐ سے تعلق کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ معمولی سے معمولی باتوں میں بھی آپ سنت نبوی کا اہتمام فرماتے اور دوسروں کو تاکید فرماتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہمیشہ مٹی کے برتن استعمال فرماتے تھے حتیٰ کہ آپ کی چائے کی پیالیاں اور طشتریاں بھی مٹی ہی کی ہوتی تھیں، گھر والوں کو بھی مٹی ہی کے برتن استعمال کرنے کی ترغیب دیتے، بعض اوقات جب گھر میں تشریف لاتے اور چینی یا تام چینی کے برتن رکھے ہوئے دیکھتے تو بہت ناگوار گذرتا اور فرماتے 'میرے جی میں آتا ہے کہ میں ان برتنوں کو توڑ ڈالوں، جب یہ برتن نہ رہیں گے تب ہی تم لوگ مٹی کے برتن استعمال کرنا شروع کرو گے۔

حضرتؒ کا خاندان بہت وسیع تھا مگر آپ اپنا ذاتی کام کسی سے نہیں لیتے تھے، سارا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، اکثر اپنے کپڑے بھی خود ہی دھولیا کرتے تھے، اگر کوئی لباس بوسیدہ ہو جاتا تو اپنے ہی ہاتھوں سے سی بھی لیا کرتے تھے، سنت کے خلاف کوئی عمل ہوتے دیکھ کر خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو فوراً ٹوک دیتے تھے، اگر کسی کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھ لیتے یا ایک سانس میں پیتے ہوئے دیکھتے تو سخت اذیت محسوس فرماتے اور فوراً سنت کے مطابق تین دفعہ میں بیٹھ کر پانی پینے کی ہدایت فرماتے تھے۔ اسی طرح گانے بجانے کی آوازوں سے سخت نفرت تھی، بعض اوقات آپ کو ان آوازوں کے سننے سے ہی جلال آجاتا تھا اور فرماتے تھے کہ یہ خبیث آوازیں ہیں ان میں کان بند کر لینا چاہیے۔ موسیقی کی آوازوں سے اتنی نفرت تھی کہ ختم خواجگان کے روزمرہ معمولات میں جو پتھر کے دانے شمار کے لیے کام میں لائے جاتے تھے پڑھتے وقت ان کے آپس میں ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی تھی وہ بھی کانوں کو گراں گذرتی تھی اور فرماتے تھے کہ اس طرح پڑھو کہ پتھر کی کنکریوں میں آواز پیدا نہ ہو۔ بایں ہمہ اگر کوئی خوش الحان قاری آپ کے سامنے تلاوتِ قرآن مجید کرتا تو آپ اس سے بہت محظوظ ہوتے اور آنکھیں بند کر کے

سماعت میں مصروف ہو جاتے۔ اس وقت آپ پر ایک کیف و سرور کا عالم طاری ہوتا تھا، اس درمیان میں کبھی کبھی سرد آہیں بھی نکل جاتی تھیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ گرامی میں مدح اور صحابۂ کرامؓ کی منقبت کے اشعار بھی بڑے ذوق وشوق سے سنتے تھے۔ بعض اوقات جلسوں میں شعراء کے کلام پر داد بھی دیتے تھے، راقم الحروف کے سامنے ایک بار جگر مرادآبادی مرحوم آپؒ سے ملنے کے لیے قیام گاہ پر آئے تو آپ نے ضروری بات چیت کے بعد جگر صاحب سے کچھ نعت ومنقبت کے اشعار سنانے کی فرمائش کی چنانچہ جگر صاحب نے اپنے مخصوص والہانہ انداز سے آپ کی فرمائش کی تعمیل کی، اسی طرح زائر حرم حمید صدیقی لکھنوی مرحوم اور علامہ اقبال سہیل اعظمی مرحوم سے بھی آپ کو بڑا انس تھا، اکثر جلسوں میں آپ ان حضرات سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔

روزمرہ کے معمولات

مولانا لکھنویؒ کی ساری زندگی ایک منظم نظام کے ماتحت مربوط تھی، شب کا کھانا نمازِ مغرب کے فوراً بعد ہی تناول فرماتے تھے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے کھانے میں کچھ تاخیر ہو جاتی تو بہت گرانی محسوس ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام فرما کر اوّل وقت عشا کی اذان دلوا دیتے اور اذان کے بعد وضو فرما کر مسجد تشریف لے جاتے تھے۔ ہمیشہ اپنے جوتے اتار کر خود اپنے ہاتھ سے مسجد کے اندر لے جا کر ایک متعین جگہ پر رکھ دیتے اور اسی طرح اپنی چھڑی بھی مسجد میں ایک مخصوص جگہ پر لے جا کر دیوار سے لگا کر الٹی کھڑی کر دیتے تھے۔ نماز میں خود امامت کرنے سے گریزاں رہتے تھے اگر آپ کے بڑے صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحبؒ مسجد میں موجود ہوتے تو ان کو ورنہ کسی دوسرے مناسب شخص کو امامت کرنے کو فرماتے، نماز کے بعد سنتیں مسجد میں ادا کرتے اور پھر قیام گاہ پر واپس آجاتے۔ وتر کی نماز تہجد کے وقت کے لیے اٹھا رکھتے تھے، عشا کے بعد پھر کسی سے ملاقات کرنے، بات چیت کرنے یا کچھ لکھنے پڑھنے کی عادت نہ تھی بلکہ فوراً لیٹ جانے کا معمول تھا۔ بستر پر جانے سے پہلے مسنون طریقہ پر سرمہ لگاتے پھر لیٹنے کے بعد سورۂ ملک کی تلاوت آہستہ آواز میں کرتے اور ایک تسبیح درود شریف کی پڑھ کر بہ طریق سنت کروٹ لے کر سو جاتے تھے، نصف شب کے بعد تہجد کے لیے بیدار ہوتے اور اہتمام سے وضو کر کے اپنی چارپائی کے قریب ہی فرش پر نمازِ تہجد ادا کرتے، تہجد کی رکعتیں مختلف زمانوں اور

مختلف حالات میں مختلف ہوا کرتی تھیں، کبھی چھ، کبھی آٹھ، کبھی بارہ اور کبھی صرف چار رکعت پر ہی اکتفا فرماتے اور اس کے بعد مصلّے پر ہی بیٹھ کر دیگر اَوراد پورے کرتے یہاں تک کہ فجر کی اذان ہوجاتی، فجر کی سنتیں قیام گاہ پر پڑھ کر مسجد تشریف لے جاتے اور جماعت میں شریک ہوتے، نماز فجر کے بعد اکثر دنوں میں چند آیاتِ قرآنی کا ترجمہ بیان کرنے کا بھی معمول رہتا تھا لیکن اسفار کی وجہ سے اور اخیر عمر میں ضعف و نقاہت کے لاحق ہوجانے سے اس معمول میں فرق بھی آجاتا تھا اور مہینوں تک یہ سلسلہ منقطع رہتا تھا۔

نمازِ فجر کے بعد سلسلۂ نقشبندیہ کے دستور کے مطابق ختم خواجگان پڑھنے کا اجتماعی معمول تھا، اس ختم شریف میں شریک ہونے کے لیے شہر کے دور دراز محلّوں سے متوسّلین اور تعلق رکھنے والے حضرات روزانہ دارالمبلّغین آتے اور نمازِ فجر یہاں ہی آکر پڑھتے اور ختم میں شرکت کرتے تھے مگر جو لوگ داخل سلسلہ نہ ہوتے ان کی شرکت پسند خاطر نہ تھی۔ ان معمولات سے فرصت پانے کے بعد چائے نوش فرماتے، ابتداءً صبح کو چائے گھر میں پیتے تھے۔ لیکن بعد میں دارالمبلّغین کے اپنے رہائشی کمرے میں چائے نوش فرمانے کا معمول ہوگیا تھا۔ ناشتہ سے فرصت پانے کے بعد اکثر اخبار کا مطالعہ فرماتے تھے اور پھر اس کے بعد اپنے اعزاء سے ملنے کے لیے ان کے گھر تشریف لاتے یہاں سے واپسی پر نماز چاشت ادا فرماتے اور پھر کچھ دیر تلاوت کرتے تھے۔

دوپہر کا کھانا دس بجے دن کو کھانے کا معمول تھا اس کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کی عادت تھی، بارہ بجے کے قریب بیدار ہوجاتے، حاجتِ ضروریہ سے فارغ ہوکر وضو فرماتے اور نماز فئ الزوال ادا کرتے، اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو پھر کچھ دیر آرام کے لیے لیٹ جاتے اور اگر جاڑے کا موسم ہوتا تو پھر نمازِ ظہر کی تیاری میں مصروف ہوجاتے، نمازِ ظہر کے بعد پھر تلاوتِ قرآن مجید کا معمول تھا اور اس کے بعد کا وقت خطوط کے جوابات لکھنے کے لیے مخصوص تھا۔ اگر کوئی تصنیفی سلسلہ چلتا ہوتا تو وہ کام بھی اسی وقت ہوتا تھا یہاں تک کہ عصر کی نماز کا وقت آجاتا اور آپ مسجد تشریف لے جاتے۔ عصر کے بعد کا وقت احباب و متوسّلین سے ملنے کے لیے تھا، اس مقصد کے لیے زیادہ تر آپ دارالمبلّغین کے نیچے والے ہال کے درمیانی دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور جتنی دیر بھی بیٹھنا ہوتا وہیں تشریف رکھتے۔ اخیر زمانے میں جب ضعف کا غلبہ زیادہ ہوگیا تھا تو یہ نشست دارالمبلّغین کے بالائی کمرے میں اپنی قیام گاہ پر ہی ہوتی تھی۔ اس نشست میں اہل

سلسلہ کے احوال سنتے اور انھیں ہدایت وتلقین فرماتے، شہر و بیرون شہر کے دوسرے اہل علم حضرات بھی اکثر اسی دوران ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ یہ نشست اکثر مغرب کی اذان کے وقت تک جاری رہتی تھی، اذان ہوتے ہی آپ مسجد تشریف لے جاتے اور حاضرین بھی ساتھ ہی اٹھ کر نماز میں شریک ہو جاتے تھے۔

رمضان المبارک کے معمولات

رمضان المبارک کا مہینہ تو یونہی ہر مسلمان کے لیے چاہے وہ کتنا ہی مذہب اور عبادت سے دُور ہو کچھ نہ کچھ نیکیاں کما لینے کا سبب بن جاتا ہے چہ جائیکہ اہل اللہ اور خاصانِ خدا کے لیے تو یہ مبارک مہینہ اور بھی زیادہ عبادت و ریاضت میں جولانی پیدا کر دیتا ہے اور نیکیاں و ثواب کے حصول کے جو جو طریقے ممکن ہو سکتے ہیں اس میں وہ کوئی دریغ نہیں کرتے خواہ کتنی ہی اس میں مشقت اور تعب اٹھانا پڑے۔ بالکل یہی کیفیت حضرت مولانا لکھنویؒ کی تھی۔ عام دنوں کے برعکس رمضان المبارک میں آپ کے یہاں ختم خواجگان عصر کی نماز کے بعد ہوتا تھا اور اس میں شریک ہونے والوں کی تعداد بھی رمضان المبارک میں بہت زیادہ ہو جاتی تھی۔ یہ ختم شریف عام طور پر دارالمبلّغین کے ہال میں پڑھا جاتا تھا، ختم کے بعد آپ قرآن مجید کا ترجمہ بیان فرماتے وہ اس طرح کہ کوئی صاحب سامنے بیٹھ کر چند آیات کی تلاوت کرتے اور خود آپ ان کا ترجمہ وتفسیر بیان کرتے، یہ ترجمہ آپ کی زبان سے ایک عجیب تاثیر رکھتا تھا اور عوام وخواص دونوں ہی میں بے حد مقبول و پسندیدہ تھا۔ دور دور سے لوگ اس میں شرکت کرنے کے لیے آتے تھے، ترجمہ میں اکثر ایسے نکات و لطائف بیان کرتے تھے کہ دسیوں کتابوں کی وَرق گردانی کے بعد بھی وہ چیز نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

ترجمہ قرآن مجید کے بعد بعض زمانے میں احادیث کے ترجمہ کا سلسلہ بھی چلتا تھا اور کبھی مکتوبات حضرت امام ربانی مجدّد الف ثانیؒ کے اقتباسات کا ترجمہ بھی بیان فرماتے تھے۔ یہ سلسلہ افطار سے چند منٹ قبل تک جاری رہتا اور پھر اجتماعی دُعا پر ختم ہوتا تھا۔ یہ دُعا بھی اپنی جگہ بڑی پُر اثر اور عجیب کیفیت کی حامل ہوتی تھی۔ رمضان المبارک میں خاص طور سے آپ گھڑیوں کی درستگی کا بڑا اہتمام فرماتے اور افطار میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اکثر معمول یہ تھا کہ زمزم، کھجور، یا پھر کسی میٹھی چیز سے روزہ افطار فرماتے، جاڑے کے موسم میں اکثر افطار کے وقت لیموں کی چائے کا بھی دستور تھا۔ آپ کے اور آپ کے مہمانوں کے لیے مختلف قسم کی افطاریاں

محلہ اور شہر کے اہل تعلق حضرات دارالمبلغین میں بھیجا کرتے تھے، افطاریاں اتنی کثرت سے آتی تھیں کہ مہمانوں سے بچ کر محلہ کے غرباء میں بھی تقسیم ہو جاتی تھیں۔ اس طرح افطاریوں کی آمد اور ان کی تقسیم کا ایک عجیب وغریب سماں ہوتا تھا۔

اطمینان سے افطار کرنے کے بعد مغرب کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے جاتے یا پھر اپنے مہمانوں کے ساتھ دارالمبلغین کے ہی ہال میں باجماعت نماز ادا فرماتے، نماز کے فوراً بعد گھر سے کھانا آجاتا تھا، بعض دوسرے حضرات بھی اپنے گھروں سے متعدد قسم کے کھانے پکوا کر لاتے تھے وہ سب دسترخوان پر لگا دیے جاتے تھے۔ روزانہ حاضرینِ مجلس میں سے بھی کچھ لوگوں کو کھانے پر مدعو کر لیا جاتا تھا۔ ابتداءً رمضان المبارک میں آپ اپنے یہاں روز آنے والے حضرات اور دوسرے مخلصین کی ایک دو بار افطار اور کھانے کی دعوت فرماتے تھے مگر آخری دور میں دعوت کا یہ سلسلہ موقوف ہو گیا تھا۔ شب کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام فرماتے یہاں تک کہ نمازِ عشاء کا وقت آجاتا اور آپ اس کی تیاری فرما کر مسجد تشریف لے جاتے۔

حفظ قرآن مجید

آپ بچپن سے حافظ نہیں تھے بلکہ تحریک مدح صحابہؓ کے دنوں میں جب بار بار آپ کو جیل جانا پڑا تو ان دنوں میں آپ نے جیل کی تنہائیوں کو ایک غنیمت موقع جان کر حفظ قرآن کی دولت حاصل کر لی تھی چنانچہ اس سلسلہ میں اپنے ایک مکتوب میں آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

> ”بڑھاپے میں یہ نعمت غیر مترقبہ کریم وہاب نے اپنے اس گنہگار بندے کو عطا فرمائی کہ قرآن مجید حفظ ہو گیا۔ اس سال بعض لوگوں کے اصرار سے تراویح میں پڑھ رہا ہوں، کل سورۂ مریم ختم ہو چکی ہے آج سورۂ طٰہٰ انشاء اللہ تعالیٰ شروع ہو گی، سب احباب و مخلصین کے لیے دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی محبت عطا فرمائے اور ایمان پر خاتمہ فرمائے اور اپنے لیے بھی اُن سے اسی دُعا کی درخواست ہے۔“[1]

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ”اب کی مرتبہ تراویح میں قرآن مجید سُنایا، پرسوں ختم ہو گیا، یہ محض فضل ہی فضل تھا اسباب ظاہر کچھ نہ تھے، اللہ تعالیٰ نے بے فصل کا میوہ عطا فرمایا۔“[2]

---

[1] مکتوب بنام مولانا مغیث الدین صاحب مرحوم سابق استاد فارسی مدحوسدن انٹر کالج سلطانپور (یوپی) ۸؍رمضان ۱۳۶۱ھ

[2] ایضاً، ۱۸؍رمضان ۱۳۶۲ھ

تراویح میں پہلا قرآن مجید آپ نے اپنے محلہ کی بڑی مسجد جہاں جمعہ کی نماز ہوتی تھی سنایا تھا لیکن دوسرے سال یعنی ۱۹۴۲ء-۱۹۴۳ء میں محلہ چکمنڈی (مولوی گنج) کی بڑی مسجد میں آپ نے تراویح میں قرآن مجید سنایا تھا اس محلہ کے لوگوں کو آپ سے خصوصی لگاؤ تھا اور اسی بنا پر آپ کو بھی اس محلہ اور اس کے قرب و جوار کے لوگوں سے بڑا تعلق تھا، اسی دوطرفہ تعلق کا نتیجہ تھا کہ آپ کی ابدی آرامگاہ بھی اسی محلہ میں بنائی گئی۔

جب سے آپ نے باقاعدہ ہر سال خود تراویح میں قرآن مجید سنانا شروع کیا تو سوا پارہ یا ڈیڑھ پارہ سے زیادہ پڑھنے کا معمول نہ تھا۔ بڑے پُرسکون اور پروقار انداز سے ٹھہر ٹھہر کر قرآن مجید پڑھتے تھے اور رکعتیں بھی بہت متوسط اور ہلکی پھلکی ہوتی تھیں۔ پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کی بنا پر اخیر عمر میں تراویح میں خود قرآن مجید سنانا موقوف کر دیا تھا اور اپنے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالسلام صاحبؒ کے پیچھے سننا شروع کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ زندگی کے آخری رمضان المبارک تک جاری رہا۔ مولانا علیہ الرحمۃ نے رمضان المبارک کی تمام تراویح سوائے ابتدائی چند برسوں کو چھوڑ کر اُسی مسجد میں ادا فرمائی جو اب بھی دارالمبلغین لکھنؤ کے عین سامنے واقع ہے۔ اب یہ مسجد از سرِنو دوبارہ دومنزلہ تعمیر ہوگئی ہے۔

تراویح سے فارغ ہونے کے بعد آپ اپنی قیام گاہ پر واپس تشریف لاتے اور پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد نصف شب کے قریب اُٹھ کر حسبِ عادت نمازِ تہجد اور دیگر اوراد و اشغال میں مصروف ہو جاتے یہاں تک کہ سحر کا وقت آ جاتا، سحر میں بہت مختصر غذا نوش فرمانے کی عادت تھی مگر اس کے ساتھ چائے ضرور ہوتی اور پان بھی استعمال فرماتے تھے۔ سحر میں عجلت کی عادت نہ تھی بلکہ بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ خود بھی سحری کھاتے اور جب تک کہ وقت میں تھوڑی سی بھی گنجائش ہوتی کسی کو کھانے یا چائے وغیرہ سے نہ روکتے۔ سحر کا وقت ختم ہو جانے کے بعد فوراً ہی فجر کی اذان دِلوا دیتے تھے اور پھر اس کے پندرہ منٹ کے بعد جماعت کھڑی ہو جاتی۔ نمازِ فجر سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر آکر کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتے، اس وقت کچھ اچھی نیند بھی آ جاتی تھی۔

جب تک زیادہ ضعف کا غلبہ نہ ہوا تھا اس وقت تک برابر ہر جمعہ کی نماز محلہ چکمنڈی (مولوی گنج) کی بڑی مسجد میں خود پڑھاتے تھے اور پھر نماز کے بعد مسجد ہی میں وعظ بھی فرماتے جس کا سلسلہ ایک گھنٹہ سے کم نہ ہوتا تھا مگر آخری دور میں ہر جمعہ کو چکمنڈی جانا بند کر دیا تھا لیکن رمضان

المبارک کے ہر جمعہ کی نماز اور عیدین کی نماز چکمنڈی میں ضرور پڑھاتے تھے، عیدین کی نماز سے فراغت کے بعد اور لوگوں سے ملاقات کے بعد احاطہ میاں چپ[1] شاہ میں اپنے اعزاء کے مزارات پر جا کر فاتحہ خوانی فرماتے اور اس کے بعد چکمنڈی کے ایک صاحبِ اخلاص متوسّل حاجی عبدالرحیم صاحب آپ کو اپنے مکان پر لے جاتے چنانچہ دوپہر کا پر تکلّف کھانا وہیں نوش فرماتے، اس دعوت میں مولانا علیہ الرحمۃ کے ساتھ جو لوگ بھی ہوتے وہ سب اس میں شرکت کرتے تھے۔ یہ معمول سالہا سال سے تھا اور برابر قائم رہا۔

رمضان المبارک میں آپ کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ اس کے آخری عشرہ میں کسی ایک دن اپنے شفیق استاذ حضرت مولانا سیّد عین القضاۃؒ (م ۱۹۲۵ء) کے مزار واقع مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ پر فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور اسی آخری عشرہ میں ایک بار مولانا شاہ مراد اللہ تھانیسریؒ[2] کے مزارِ مقدس پر بھی برائے ایصالِ ثواب حاضری دیتے تھے، شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کا مزار یوپی اسمبلی کے قریب رائل ہوٹل کے پیچھے ایک گلی میں واقع ہے اور بڑی نورانیت اور کیفیات کا حامل ہے۔

۱۔ احاطہ میاں چپ شاہؒ محلہ چکمنڈی لکھنؤ کے بالکل وسط میں بڑی مسجد کے سامنے واقع ہے، میاں چپ شاہؒ کے معتبر حالات پردۂ خفاء میں ہیں۔ ابتداءً اس احاطہ میں صرف شاہ صاحبؒ اور ان کے متعلقین کی تین پختہ قبریں ایک چھت گیری کے اندر بنی تھیں ان کے علاوہ دو ایک قبریں اہلِ محلّہ کی تھیں۔ مولاناؒ کو اپنے ایک پوتے میاں عبدالہادی بن مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ سے بے حد محبت تھی یہ بچہ سوا سال کی عمر میں چیچک میں مبتلا ہو کر وفات پا گیا جس کا مولاناؒ کو بے حد صدمہ ہوا، آپ کے اس تعلق خاطر کو دیکھتے ہوئے چکمنڈی کے اہل تعلق لوگوں نے اس بچہ کو یہاں دفن کرنے کی پیشکش کی جس کو آپ نے بہ طیب خاطر منظور کر لیا اور اس طرح خاندانی دستور کے برعکس ۲۰ر جون ۱۹۴۸ء کو سب سے پہلے اس بچہ کی تدفین یہاں عمل میں آئی اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں اپنے ایک صاحبزادہ مولانا عبدالعزیز صاحب فاروقیؒ کو آپ نے یہاں دفن کیا اور اخیر میں اپنے تنہا چھوٹے بھائی مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ کو بھی یہاں ۱۹۵۶ء میں دفن کیا۔ مولانا کی حیات میں صرف یہی تین افراد یہاں مدفون ہوئے۔ باقی کچھ حضرات آپ کے بعد یہاں دفن کیے گئے جن کا تفصیلی تذکرہ آئندہ اپنے مقام پر آئے گا۔

۲۔ مولانا شاہ مراد اللہ صاحب فاروقی تھانیسریؒ سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت شاہ نعیم اللہ صاحب بہرائچیؒ (متوفی ۱۸۰۳ء) کے خلیفہ و جانشین تھے۔ اپنے شیخ کے اشارے پر لکھنؤ آکر سکونت پذیر ہو گئے اور لگ بھگ چالیس سال تک یہاں مرکز رشد و ہدایت بنے رہے، یہاں کے عوام کو شرک و بدعت سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ اور زہد و عبادت، تزکیۂ نفس اور اتباعِ سنت کی ترویج و اشاعت میں مصروف رہے۔ اپنے وقت کے عارف کامل شمار کیے جاتے تھے ۸۲ سال کی عمر میں ۱۸۳۲ء میں لکھنؤ میں وفات پائی۔ آپ کے اجل خلفاء میں مولوی ابوالحسن نصیر آبادیؒ (م ۱۸۵۵ء) تھے۔ (تذکرہ علماء ہند۔ مولوی رحمان علی، ص ۲۲۳)

پانچواں باب

درس وتدریس اور مختلف اداروں سے تعلق

گذشتہ صفحات میں ہم تفصیل سے لکھ آئے ہیں کہ مولانا لکھنویؒ کی تعلیم ۱۸۹۹ء میں حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ کے ہاتھوں مکمل ہوئی تھی، چونکہ معاش کی طرف سے بے فکری تھی اس لیے فوری طور پر اس کی ضرورت نہ تھی کہ آپ کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے پر مجبور ہوتے لیکن اپنے کو مصروف رکھنے کے لیے آپ نے ابتداءً طبابت کا مشغلہ اختیار کیا اور مطب کرنا شروع کردیا، یہ مشغلہ آپ کے اکثر بزرگوں کا رہا تھا، لہٰذا خود آپ نے بھی لکھنؤ کے طبّی خانوادہ یعنی خاندان عزیزی کے مشہور طبیب حکیم حافظ عبدالولی صاحب مرحوم سے باضابطہ طب کی تعلیم حاصل کی تھی، مگر استاذ محترم مولانا عین القضاۃؒ صاحب کی مرضی نہ پاکر یہ مشغلہ ترک کرکے اپنے حقیقی رجحان کے مطابق درس وتدریس کی طرف مائل ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ تصنیفی مشاغل بھی شروع کردیئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے وابستگی

درس وتدریس کا آغاز آپ نے سب سے پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے کیا۔ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (م ۱۹۲۷ء) اس وقت ناظم ندوۃ العلماء تھے، انہی کی خواہش پر آپ نے وہاں پر بحیثیت مدرس عربی کام کرنا قبول کیا تھا، اسی زمانہ میں مولانا حفیظ اللہ صاحبؒ (م ۱۹۴۳ء) بھی دارالعلوم کے مدرس عربی دوم تھے، اس وقت دارالعلوم خاتون منزل، گولا گنج لکھنؤ میں قائم کیا گیا تھا، دوسرے اساتذہ میں مولانا مفتی عبداللطیف سنبھلیؒ (م ۱۹۵۹ء) بھی مدرس عربی تھے، کچھ

عرصے کے بعد مولانا محمد فاروق چریا کوٹی[1] (م ۱۹۰۹ء) دارالعلوم کے مدرس اعلیٰ ہو گئے تھے جو بقول مولانا سیّد سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ء) ادب وفقہ کے امام تھے[2]۔ اس فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ندویؒ کی نگاہوں میں مولانا چریا کوٹی کی کتنی وقعت تھی۔ مولانا چریا کوٹی مولانا لکھنویؒ کے بہت معترف تھے چنانچہ جب مولانا نے ایک سال ملازمت کرنے کے بعد دارالعلوم سے استعفیٰ دیا تو اس تحریر کو مولانا چریا کوٹی نے 'ورق نامۂ فراق' سے تعبیر کیا تھا۔ اس موقع پر مولانا لکھنویؒ خود تحریر کرتے ہیں:

> "۱۳۱۶ھ میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا افتتاح ہوا، اس وقت جن لوگوں کے ذریعہ تدریس کا آغاز ہوا اُن میں یہ حقیر بھی تھا، تقریباً ایک سال دارالعلوم میں اس خدمت کو انجام دیا پھر اس کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ جناب مولوی محمد فاروق صاحب چریا کوٹی ان دنوں مدرس اعلیٰ تھے، استعفیٰ جب ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس حقیر کو ایک خط بھیجا جس کا ایک فقرہ یہ تھا آں ورق نامۂ فراق را بجمعیۃِ مجلسِ نظم سپردم:
>
> لولا مفارقة الاحباب ماوجدت لها المنايا الیٰ ارواحنا سبلا[3]

دارالعلوم کی ملازمت میں مولانا کی تنخواہ بیس روپیہ ماہوار تھی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ مولوی ضیاء الحسن علوی کاکورویؒ اور مولانا منظور النبی سہارنپوریؒ وغیرہ اس دور میں دارالعلوم کے طلبہ میں تھے، کم وبیش ایک سال کی تدریس کے بعد آپ نے دارالعلوم سے از خود استعفیٰ دے کر

۱۔ مولانا محمد فاروق بن مولوی علی اکبر عباسی اپنے وطن چریا کوٹ ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ منطق اور حکمت کی تعلیم مولوی عنایت رسول اور مولوی ابوالحسن منطقی سے حاصل کی۔ ہیئت کی کتابیں مولوی رحمت اللہ بن نور اللہ لکھنوی سے پڑھیں۔ فقہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف بن مولوی محمد اصغر لکھنوی سے جون پور میں پڑھا۔ اس کے بعد حج وزیارت کے لئے حجاز کا سفر فرمایا۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد وہاں مختلف علماء سے بھی استفادہ کیا۔ آخر عمر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے تھے جہاں کئی سال تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعض فنون میں آپ نے کچھ رسائل بھی تحریر کیے تھے۔ عربی اور فارسی میں فکرِ سخن بھی کرتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کی وفات ہوئی۔ (نزہۃ الخواطر، جلد ۸، ص ۳۵۱ وص ۳۵۲)

۲۔ ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، جولائی ۱۹۴۵ء و تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اوّل، ص ۲۲۰

۳۔ راحۃ القلوب بذکر المحبوب (قلمی) مرتبہ مولانا لکھنویؒ، ص ۴-۵

سبکدوشی حاصل کرلی اور ہمہ وقت اپنے تصنیفی و تالیفی کاموں میں مصروف ہو گئے[1]

قیامِ دہلی

۱۸۹۹ء میں مولانا نے لکھنؤ سے اپنا فقہی ماہنامہ 'علم الفقہ' جاری کیا تھا، اس کو شروع ہی سے جتنی قبولیت حاصل ہوئی اتنی کسی دوسرے ماہنامہ کو کم ہی حاصل ہوئی ہوگی یہی وجہ ہے کہ اس دور کے مذہبی اخبار و جرائد اور دینی کام کرنے والے اکثر ادارے آپ سے بخوبی واقف ہو چکے تھے، چنانچہ ۱۹۰۰ء میں کسی وقتی ضرورت کی بنا پر دہلی کا سفر درپیش ہوا اور اسی سفر میں مرزا حیرت دہلوی (م ۴؍مئی ۱۹۲۸ء)[2] سے آپ کی ملاقات ہوئی، مرزا صاحب کا اخبار ''کرزن گزٹ'' کے نام سے دہلی سے شائع ہوتا تھا جس کی بہت شہرت تھی اور لوگوں میں بہت پڑھا جاتا تھا، اس کے ساتھ ان کا ایک دینی مکتبہ بھی تھا جس میں اور موضوعات کے علاوہ ردّ شیعیت پر بھی مستقل کتابیں شائع ہوا کرتی تھیں اور مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیئے جاتے تھے، انھوں نے اپنے مطبع میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے لیے آپ کو ایک معقول مشاہرہ پر دعوت دے دی، مرزا صاحبؒ کو ایسے صاحبِ قلم اور ذی علم حضرات کی تلاش رہا کرتی تھی جو اُن کے مزاج کے لیے تصنیف و تالیف کا کام کریں اور ان کے کاموں میں علمی معاونت کریں، غالباً اسی خیال کے پیشِ نظر انھوں نے مولانا کو بھی اپنے یہاں کام کرنے کی دعوت دی ہوگی۔ مرزا حیرت کے یہاں کام کرنے کے لیے ہمارے نزدیک دو داعیہ ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ردِّ شیعیت دونوں حضرات کا مشترک موضوع تھا، دوسرے یہ کہ لکھنؤ کے مخصوص مذہبی ماحول کی وجہ سے مولانا کو یہاں سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی اس لیے آپ لکھنؤ کو اپنا مستقل مستقر بنانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں اپنے استاذ محترم مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ کو تحریر کرتے ہیں:

''لکھنؤ میں میرا قیام آپ کی ذات سے تھا ورنہ اس شہر سے مجھے طبعی نفرت ہے''[3]

لہٰذا مرزا حیرت دہلوی کے بعض مختلف فیہ عقائد کے باوجود آپ نے ان کی پیشکش قبول کرلی۔

---

[1] یادِ ایام، مولوی ضیاء الحسن علوی، ص ۲۰

[2] ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک، نومبر ۱۹۷۸ء

[3] مکتوب بنام استاذ محترم مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ مورخہ ۱۷؍صفر ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۵ء مملوکہ راقم الحروف

اپنے دورانِ قیام میں آپ نے مرزا صاحب کے یہاں ''کرزن گزٹ'' میں مختلف مضامین لکھنے کے علاوہ بعض تصنیف و تالیف کا کام بھی کیا تھا مگر اس کی کوئی تفصیل اب تک ہمارے علم میں نہیں آسکی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگ بعض کاموں کو متعین کر کے بتاتے ہیں مگر اس کا کوئی پختہ ثبوت نہیں ہے کیونکہ مولانا علیہ الرحمہ نے خود اس کے بارے میں نہ کہیں کچھ لکھا ہے اور نہ ہی ان کے ذریعہ سے کوئی روایت ہم تک پہنچی ہے اس لیے وثوق سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ وہاں انھوں نے کیا علمی خدمات انجام دی تھیں۔

دہلی میں مرزا حیرت اور ان کا اخبار 'کرزن گزٹ' دونوں ہی کافی مشہور و معروف تھے، مرزا صاحب کے بعض عقائد بہت انتہا پسندانہ تھے، ان میں سے کچھ تو اہل سنت و جماعت کے مسلک اعتدال سے بھی ہٹے ہوئے تھے۔ وہ ایک پر جوش واعظ بھی تھے لیکن ان کے وعظ اور ان کی تحریر دونوں میں کافی تضاد ہوتا تھا چنانچہ جن باتوں کی تردید وہ اپنے رسائل یا اخبار میں کیا کرتے تھے خود انہی باتوں کو عوام کے مزاج کے موافق بنا کر بیان کر کے دادِ تحسین بھی حاصل کرتے تھے اپنے معاصرین میں اکثر لوگوں کے ساتھ ان کی نوک جھونک بھی چلا کرتی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی سے ان کے بہت تعلقات تھے مگر وہ بھی ان کی زد سے نہ بچ سکے۔ جب مولانا محمد علی جوہر اور خواجہ حسن نظامی کی چلی تو مرزا صاحب مولانا محمد علی کے طرفداروں میں ہو گئے اور 'درۂ عمر' میں خواجہ صاحب کے خلاف لکھتے رہے[1] غرض مرزا صاحب ایک ہنگامہ خیز زندگی گزار کر ۴؍ مئی ۱۹۲۸ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے اور آج دہلی میں ان کے نام لیواؤں میں بھی کوئی باقی نہیں بچا ہے۔

دہلی میں مولانا علیہ الرحمہ کا قیام پورے چار سال رہا۔ اس زمانہ میں دہلی سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک باکمال بزرگ حضرت شاہ ابوالخیر صاحب مجددی قدس سرہٗ (م ۱۹۳۲ء) کے وجود مسعود سے منور تھی۔ آپ بھی خانقاہ شریف میں برابر حاضری دیا کرتے تھے، آپ کے والد ماجد مولوی حافظ ناظر علی بھی حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے معتقدین میں سے تھے اور بہت قریبی تعلقات رکھتے تھے اسی عقیدت و تعلق کی بنا پر مولانا نے اپنی اہلیہ صاحبہ کو شاہ صاحبؒ سے بیعت کرادیا تھا۔[2]

---

[1] بزم خوش نفساں، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی [2] مقامات خیر، ۴۹۸

دہلی کے قیام میں حضرات مشائخ نقشبندیہ بالخصوص حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ، حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ اور خواجہ نور محمد بدایونیؒ وغیرہم کے مزارات پر حاضری بھی معمولات میں سے تھی، دہلی کی سرزمین سے آپ کو بڑا انس تھا، اکثر اس دَور کے واقعات اپنی مجالس میں بیان فرمایا کرتے تھے، دہلی میں آپ کا قیام زیادہ تر کوچہ پنڈت اور کوچہ رحمٰن میں رہا ہے۔ اہلیہ صاحبہ بھی ساتھ رہا کرتی تھیں اور آپ کے والد ماجد بھی برابر یہاں آیا کرتے تھے۔

لکھنؤ واپسی

۱۹۰۴ء کے آس پاس کا زمانہ تھا کہ مولوی مقبول احمد شیعی[۱] (م ۱۹۲۱ء) مجلسیں پڑھنے لکھنؤ آنے لگے، انھوں نے اپنی دل آزار شعلہ بیانیوں اور تبرائی تقریروں سے لکھنؤ کے پرسکون ماحول کو دَرہم برہم کر دیا، مذہبی چھیڑ چھاڑ، بلند بانگ دعوے اور اہل سنّت و جماعت پر فقرے بازی

۱؎ مولوی مقبول احمد بن غضنفر علی ۱۸۷۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، ان کی پیدائش ایک سنّی گھرانے میں ہوئی تھی مگر سات سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے بعض شیعہ معلّمین کی زیر تربیت آ گئے اور انھیں کی صحبت کے اثر سے مذہب شیعہ اختیار کیا، جوشِ مذہب میں اپنی شیعیت کا اعلان جا بجا کرتے پھرتے تھے ۱۸۸۵ء میں اینگلو عربک اسکول سے مڈل اور ۱۸۸۷ء میں مشن کالج سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے تعلیم ترک کر دی، عربی کی تعلیم مولوی آفتاب حسین سے حاصل کی جو سادات بجنور سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں راجہ باقر علی خاں آف پنڈراول سے منسلک ہو گئے لیکن یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء میں راجہ صاحب کے مرنے کے بعد ختم ہو گیا۔ دہلی میں ایک یونانی دواخانہ بھی کھولا تھا جو کچھ عرصہ تک چلتا رہا، آخری عمر میں ریاست رام پور سے تعلق ہو گیا تھا جو بارہ سال تک قائم رہا۔ موصوف کی شہرت اپنے زمانے میں مقرر کی حیثیت سے تھی، تقریر میں مناظرانہ رنگ غالب رہتا تھا اور اختلافی مسائل پر زیادہ تقریر کرتے تھے جس سے مختلف مقامات پر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو جانے سے فساد ہو جاتا تھا، مزاج میں شوخی اور ظرافت بہت تھی جس کی جھلک تقریر میں بھی ہوتی تھی اسی افتادِ طبع کے باعث بزرگانِ اسلام پر رکیک حملے اور مسلّمہ معتقدات پر چٹکیاں لیتے تھے جس کی وجہ سے شیعوں کے مذہبی حلقے خصوصاً اودھ کے شیعہ مراکز لکھنؤ جون پور اور فیض آباد کے لوگ انھیں زیادہ پسند کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ان کی بڑی پذیرائی ہوتی تھی اور یہاں کی شیعہ مجالس میں بڑی اشتعال انگیز تقریریں کرتے تھے اور علماء اہل سنّت کو برملا مناظرہ کا چیلنج دیا کرتے تھے، موصوف کی کچھ تصانیف بھی ہیں مگر وہ زیادہ تر تراجم پر مشتمل ہیں البتہ انھوں نے شیعہ عقیدے کے مطابق قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا تھا جو شیعوں میں آج بھی پسند کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں دہلی میں انتقال ہوا۔ (مکتوب مولانا سید کلب عابد مجتہد لکھنؤ، بنام راقم)

ان کا وطیرہ تھا، اسی لیے لکھنؤ کے شیعی عوام میں انھیں بہت پسند کیا جانے لگا تھا اور یہاں ان کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی، موصوف اپنی تقریروں میں بزعم خود اہل سنت پر کچھ اعتراضات وارد کرتے اور پھر علماء اہل سنّت کے متعلق کہتے کہ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ جو میرے مقابلہ میں آئے اور میرے اعتراضات کے جواب دے۔ ان باتوں سے لکھنؤ میں شیعہ سنی کشیدگی پیدا ہوگئی، سنی عوام ان باتوں سے بہت ملول اور رنجیدہ ہوتے تھے۔ موجودہ شیعہ سنی کشمکش جس سے اب پورا برصغیر متاثر ہے اس سلسلہ کا آغاز یہیں سے ہوا تھا اور شیعہ سنّی مناظرے بازی کی داغ بیل اسی دور میں پڑی تھی جس کے محرک یہی مولوی مقبول احمد شیعی بنے۔ یہ صرف ہمارا ہی خیال نہیں ہے بلکہ خود لکھنؤ کے ایک ذمّہ دار شیعہ مجتہد نے بھی مقبول احمد دہلوی کے بارے میں کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے جو گذشتہ صفحہ کے حاشیہ پر درج ہے، چنانچہ علمائے اہل سنّت نے بھی اب اس مسئلہ کے ہر پہلو پر سوچنا شروع کر دیا۔ لہٰذا سرخیل علماء اہل سنّت حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحب قدس سرہٗ نے مقامی علماء اور اپنے تمام شاگردوں کو جمع کر کے صورتِ حال پر غور وخوض کیا، آپ کی رائے یہ ہوئی کہ دہلی سے مولانا عبدالشکور صاحبؒ کو لکھنؤ بلایا جائے، وہی علماء اہل سنّت کی طرف سے مدافعت کا فریضہ پوری طرح ادا کر سکتے ہیں، اتفاقاً اسی زمانہ میں مولانا لکھنویؒ اپنی کسی خانگی ضرورت کی وجہ سے لکھنؤ تشریف لائے ہوئے تھے تو حضرت استاذ نے آپ کے سامنے پوری صورت حال رکھی اور فرمائش کی کہ آپ مستقل طور پر لکھنؤ آجائیں اور اہلِ حق کی طرف سے مدافعت کا کام سنبھالیں۔ استاذ گرامی کا اصرار اور پھر مقامی حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر آپ نے مجبوراً لکھنؤ آجانے کا فیصلہ کر لیا اور مرزا حیرت دہلوی کے یہاں استعفیٰ دے کر مستقل طور پر لکھنؤ آگئے۔

ایک بار مولوی مقبول احمد شیعی حسب سابق لکھنؤ آئے اور اپنی مجلسوں میں حسب دستور اہل سنّت کی دل آزاری اور طعن وتشنیع کے ساتھ ساتھ مناظرہ کا بھی چیلنج دینے لگے تو اس موقع پر مولانا نے انھیں کہلا بھیجا کہ میں مناظرہ کے لیے تیار ہوں، آپ جب چاہیں اس کے لیے وقت مقرّر کر لیں۔ مولوی مقبول احمد کو حقیقتاً مناظرہ کرنا تو مقصود نہ تھا اور نہ ان میں اتنی لیاقت تھی وہ تو صرف اپنے ہم عقیدہ لوگوں میں اپنا بھرم باقی رکھنا چاہتے تھے اور اہل سنّت کو مرعوب کرنا چاہتے

تھے اس لیے مناظرہ پر راضی نہ ہوئے اور دامن بچاتے ہوئے بعض دوسرے اسفار کا بہانہ بنا کر لکھنؤ سے روانہ ہو گئے۔ ان باتوں سے اتنا ضرور ہوا کہ شہر میں شیعہ سنی کشیدگی پیدا ہو گئی اور سنّی جو اَب تک شیعوں کی مجالس اور تقریبات میں برابر ان کے ساتھ شریک ہوتے تھے وہ اب دل برداشتہ ہو کر علیحدہ ہونے لگے اور انھیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ ہمیں اپنی مجالس میں مدعو کر کے ذلیل کیا جاتا ہے اور ہمارے سامنے ہمارے بزرگوں کو بُرا کہا جاتا ہے۔

مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ سے تعلق

حضرت مولاناؒ کے لکھنؤ آ جانے کے بعد حضرت استاذؒ نے اپنے مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں آپ کو بہ حیثیت استاذ کام کرنے کی پیشکش کر دی اور اصرار کیا کہ آپ مدرسہ کے معاملات میں بھی میرا ہاتھ بٹائیں، اس طرح ۱۹۰۴ء میں آپ مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ سے وابستہ ہو گئے اور اس وقت سے لے کر ۱۹۰۹ء تک آپ اپنے استاذ علیہ الرحمۃ کے ساتھ معاون مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک آپ نے مدرس عربی و فارسی کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ استاذ محترم جو سرپرست مدرسہ بھی تھے آپ پر بے حد شفقت و عنایت فرماتے تھے۔ مدرسہ کی زیادہ تر ذمہ داری آپ ہی کے سپرد تھی، ابتداء میں آپ کی تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار تھی مگر اب آپ کی تدریس اور حسنِ انتظام کو دیکھ کر استاذ محترم نے سو روپیہ ماہوار مشاہرہ کر دیا اور عہدہ بھی بڑھا دیا اس طرح ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک آپ افسر مدرس اور مفتی مدرسہ رہے، اس زمانہ میں مدرسہ میں جو بھی استفتا آتے تھے اِن کے جوابات آپ ہی تحریر فرمایا کرتے تھے اور ان پر اپنے دستخط کیا کرتے تھے۔ آج بھی مدرسہ کے ریکارڈ میں آپ کے تحریر کردہ فتاویٰ موجود ہیں، کاش کوئی اہل علم انھیں مرتب کر کے شائع کر دیتا تو بڑا کام ہوتا۔ اسی زمانہ میں مدرسہ میں قرآن مجید کے علاوہ عربی درجات بھی کھول دیئے گئے تھے، عربی سالِ اول اور سالِ دوم کی تعلیم آپ ہی کے سپرد تھی۔ مدرسہ فرقانیہ سے اس تعلق کا سلسلہ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر ۱۹۱۵ء میں آپ کے استعفیٰ دینے سے ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک پھر آپ نے کوئی ملازمت نہیں کی اور پوری توجہ ''النجم'' کی ادارت اور تصنیف و تالیف پر ہی مبذول رکھی۔

مدرسہ عالیہ عربیہ (چلّہ) امروہہ[1] (یوپی) سے تعلق

امروہہ ضلع مرادآباد (یوپی) سے آپ کا تعلق بہت پرانا تھا، وہاں رفض و بدعت کا بہت زور تھا، اس سلسلہ میں اکثر آپ کا وہاں جانا آنا ہوتا تھا، وہاں آپ کے دو مناظرے بھی ہوئے تھے جن میں سے ایک شیعوں سے اور دوسرا رضا خانیوں سے ہوا تھا اور ان دونوں میں فریق مخالف کو انتہائی ذلت آمیز شکست ہوئی تھی، ان دونوں مناظروں کی روداد یں متعدد بار شائع ہو چکی ہیں۔ امروہہ کے مشہور دیندار بزرگ حکیم محمد اسماعیل صاحب مرحوم[2] ساکن محلہ چلّہ آپ

۱۔ مدرسہ عالیہ اسلامیہ عربیہ محلہ چلہ امروہہ ضلع مرادآباد جے پی نگر (یوپی) جمادی الثانی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں محلہ چلّہ کی اس تاریخی مسجد میں قائم کیا گیا تھا جس کی تعمیر بہ عہد جہانگیری ۱۰۲۹ھ مطابق ۱۶۱۹ء ہوئی تھی۔ حضرت مولانا لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ اس مدرسہ میں حضرت مولانا سیّد محمد صاحب امروہویؒ، مولانا سراج احمد خاں امروہویؒ، مولانا سیّد احمد امینؒ، قاری حمید اللہ میرٹھیؒ، مولانا انوار الحق صدیقی امروہویؒ، مولانا فضل احمد امروہویؒ، مولانا محمد اسماعیل سنبھلیؒ، مولانا انصار الحق صدیقی امروہویؒ، حکیم محمد اسماعیل عباسی امروہویؒ، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ مولانا سردار احمد خاںؒ اور حکیم حیات اللہ صاحب امروہویؒ وغیرہ مختلف حیثیتوں سے منسلک رہے ہیں۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب بھی اس مدرسہ میں تدریسی فرائض انجام دے چکے ہیں۔ آج بھی یہ مدرسہ اپنی دیرینہ روایات پر قائم رہتے ہوئے دینی و علمی خدمات انجام دے رہا ہے۔

(روداد مدرسہ، مرتبہ حکیم حیات اللہ صاحب امروہویؒ)

۲۔ حکیم مولوی محمد اسماعیل ابن حکیم خلیفہ محمد ابراہیم عباسی مرحوم امروہہ ضلع مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ انھیں مختلف علوم و فنون بالخصوص علم طب پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ القانون فی الطب اور دیگر طبی کتب کا درس آپ دارالعلوم چلّہ میں دیتے تھے، آپ کی حذاقت اور تبحر علمی کے معترف حکیم اجمل خاں مرحوم بھی تھے اور اطبائے لکھنؤ بھی آپ کی قدردانی کرتے تھے خاص طور سے حکیم عبدالحلیم صاحب لکھنوی آپ کے بہت عقیدت مند تھے۔ آپ فخر المحدثین مولانا سیّد احمد حسن صاحب امروہوی (م ۱۹۱۲ء) کے شاگرد تھے، منطق، فلسفہ، تفسیر اور حدیث پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔ ایک جید حافظ ہونے کے ساتھ فن تجوید میں بھی ایک اعلیٰ مقام کے مالک تھے، دارالعلوم چلّہ کے بانیوں میں سے تھے اور تاعمر آپ اس کے صدر مہتمم رہے۔ ۱۹۵۴ء میں مدرسہ ہی کے کام سے بمبئی وغیرہ کے سفر پر گئے تھے وہاں سے واپسی پر امروہہ کے قریب پہنچ کر ایک حادثہ کا شکار ہوئے اور اسی میں انتقال فرمایا۔ آپ کے پسماندگان میں حکیم محمد احمد صاحب اثر امروہویؒ بھی ایک جید عالم اور طبیب تھے اور ان کا مطب بھی بہت کامیاب اور مشہور تھا، ان کے علاوہ حکیم محمود احمد عباسیؒ، جناب مسرور احمد عباسیؒ، جناب منظور احمد عباسی مقیم حال لکھنؤ، حکیم مسعود احمد عباسی مرحوم میرٹھ اور حکیم مشکور احمد عباسی مرحوم غازی آباد بھی تھے۔ فی الوقت حکیم حامد سعید عباسی ابن حکیم محمد احمد عباسیؒ اپنے دادا علیہ الرحمۃ کے سلسلہ مطب کو امروہہ میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

کے انتہائی عقیدت مند متوسّلین میں سے تھے، اس زمانے میں امروہہ میں ان کے مطلب کی بہت شہرت تھی، مولانا جب بھی امروہہ تشریف لے جاتے تو قیام حکیم اسماعیل صاحب مرحوم کے یہاں ہی ہوتا تھا۔ امروہہ میں رفض و بدعت کی رد میں آپ کی بے شمار تقریریں ہوئیں جس سے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ چنانچہ مولانا مفتی نسیم احمد فریدی امروہوی ؒ (م ۱۹۸۸ء) اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت ؒ نے قیام امروہہ کے زمانے میں تمام مسلمانان امروہہ کو اپنے مواعظ وارشادات سے مستفیض فرمایا، خود فرماتے تھے کہ یہاں میں نے ایک دن میں تین تین وعظ کہے ہیں، آپ نے امروہہ میں عقائد اہل سنت کی ترویج و اشاعت اور رسوم و بدعات کی تردید بڑے عزم اور حوصلہ کے ساتھ فرمائی''[1]

امروہہ میں رفض کا بہت زور تھا، مسلمانوں کے اکثر خاندان دو حصوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک سنّی اور دوسرا شیعہ، شوہر سنّی ہے تو بیوی شیعہ، اسی طرح اگر ایک بھائی سنّی ہے تو دوسرا بھائی شیعہ تھا۔ غرضیکہ عجیب حالات تھے، مسلمانوں میں غفلت و ناواقفیت کی انتہا تھی۔ امروہہ میں مولانا کی آمد و رفت، وعظ و نصیحت اور تبلیغی و اصلاحی کوششوں کے نتیجہ میں لوگوں میں دینی شعور بیدار ہوا، اسلام کی صحیح اور سچی تصویر ان کے سامنے آنے لگی، اسی عرصہ میں شیعوں اور رضا خانی علماء سے معرکۃ الآراء مناظرے بھی ہوئے جس سے اور بھی لوگوں میں مذہبی حمیت پیدا ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ سنت و جماعت اپنے مسلک میں خوب پختہ ہو گئے اور مستقبل میں شیعوں سے شادی بیاہ کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

امروہہ کے محلہ چلّہ میں جب ایک عربی مدرسہ قائم کیا گیا تو اس کی صدر مدرسی کے لیے اہلِ شہر نے مولانا ہی سے گذارش کی، چونکہ امروہہ سے آپ کو خصوصی تعلّق تھا اس لیے آپ نے یہ پیشکش قبول فرمالی۔ اور ذی قعدہ ۱۳۴۰ھ-۱۹۲۱ء سے آپ نے اس مدرسہ میں کام شروع کر دیا، اس عہدہ پر آپ کی تنخواہ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئی، آپ ہی نے اس مدرسہ میں درس نظامی کا پورا

---

[1] امام اہل سنت ؒ کے چار مکتوب، مرتبہ مولانا مفتی نسیم احمد فریدی، ستمبر ۱۹۸۱ء

[2] ماہنامہ الفرقان لکھنؤ، مئی ۱۹۶۲ء، الفرقان وفیات نمبر اپریل تا، جون ۱۹۷۷ء

مروجہ نصاب شروع کرایا اور حدیث کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ مولانا منظور نعمانی صاحبؒ اپنی طالب علمی کے زمانے میں مولانا کی زیارت کے لیے جب اس مدرسہ میں پہنچے تو آپ اس وقت طب کی مشہور کتاب نفیسی کا درس دے رہے تھے[2]۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو طبی علوم پر کافی عبور حاصل تھا، مدرسہ کی ملازمت کے دوران آپ کا مالیات کے سلسلہ میں کمالِ احتیاط اور تقوے کی ایک مثال حکیم صیانت اللہ صاحب امروہویؒ نے تحریر کی ہے:

''امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ سے اس نوخیز دینی ادارہ کی سرپرستی قبول کرنے کی درخواست کی گئی جسے شرف قبول حاصل ہوا، مولانا تشریف لے آئے تو گویا ادارہ کو چار چاند لگ گئے، اب باقاعدہ دورۂ حدیث کا آغاز ہوگیا، اس محل پر بطور جملۂ معترضہ دیانت وامانت کا ایک واقعہ بیان کیا جائے تو چنداں بے جانہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ امامِ اہلِ سنت صرف چھ دن کے لیے اپنے وطن تشریف لے گئے تھے لیکن موصوف نے ان چھ دنوں کی تنخواہ اپنے ماہانہ مشاہرہ سے وضع کرادی اور حق رخصت تک استعمال نہیں کیا۔ مولانا کی یہ دیانت دین کی خدمت کرنے والوں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال ہے[1]۔''

مدرسہ سے اس تعلق کا سلسلہ ذی قعدہ ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء تک جاری رہا۔ جن ایام میں آپ نے مدرسہ میں نہیں پڑھایا ان ایام کی تنخواہ نہیں لی۔ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۳ء میں لکھنؤ کی گوناں گوں مصروفیات کی وجہ سے امروہہ میں جم کر رہنا ممکن نہ رہا اس لیے آپ امروہہ کا قیام ترک کرکے پھر لکھنؤ واپس آگئے اور آخر عمر تک پھر کبھی دوسری ملازمت نہیں کی۔ اس مدرسہ سے قلبی تعلق ہمیشہ باقی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے صاحبزادوں اور دوسرے اعزاء کو بھی یہاں بھیج کر تعلیم دلائی تھی جن میں مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ، مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ، مولانا عبدالعزیز صاحب فاروقیؒ اور مولانا حکیم عبدالغنی صاحب فاروقیؒ (چاروں صاحبزادے) مولانا عبدالحکیم صاحب فاروقیؒ (بھتیجے) اور مولانا عبدالاوّل صاحب فاروقیؒ و مولوی عبدالمغنی فاروقی سلمہٗ اور مولوی عبدالمغنی کا (تینوں پوتے) لائق ذکر ہیں۔

---

[1] روداد مدرسہ مرتبہ حکیم صیانت اللہ صاحب امروہویؒ، ص ۲۵

چھٹا باب

ماہنامہ علم الفقہ اور رسالہ النجم کا اجراء

ماہنامہ علم الفقہ کا اجراء

حضرت مولانا لکھنویؒ کو تصنیف و تالیف سے مناسبت بچپن ہی سے تھی چنانچہ زمانہ طالب علمی ہی میں آپ نے لکھنؤ کے مشہور شیعہ مجتہد مولوی حامد حسین (م ۱۸۸۸ء) کی کتاب "استقصاء الافهام و استيفاء الانتقام فى نقض منتهى الكلام" کے بعض حصوں کے جواب میں ایک رسالہ فارسی میں 'انتصار الاسلام بجواب استقصاء الافهام' تحریر کیا تھا جس کا اردو ترجمہ بعد میں النجم میں بھی شائع کر دیا تھا۔ اسی طرح آپ نے ۱۸۹۲ء میں جبکہ آپ لکھنؤ میں مولانا سیّد عین القضاةؒ سے درجہ وسطیٰ کی کتابیں پڑھ رہے تھے ایک مناظرہ کی روداد مرتب کر کے شائع کی تھی جس کا نام 'النصرة الغيبيه علىٰ الفرقة الشيعيه' تھا۔ اپنے اسی فطری ذوق کی بنا پر آپ نے ۱۸۹۹ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد فوراً تدریسی مشاغل کے ساتھ ساتھ ایک ماہوار علمی رسالہ "علم الفقہ" کے نام سے لکھنؤ سے جاری کیا، جو پورے چھ سال تک پابندی سے نکلتا رہا۔ یہ رسالہ خالص فقہی مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ روز مرّہ کے مسائل فقہیہ کو ایک خاص نظام اور ترتیب کے ساتھ اُردو میں مرتب کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی، اس سے پہلے اُردو زبان میں کوئی اتنی مفصل اور مکمل فقہی کتاب موجود نہ تھی، حتیٰ کہ بہشتی زیور، جیسی مشہور کتاب کے بعض حصے بھی اس کے بعد لکھے گئے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۹۴۳ء) نے 'بہشتی گوہر' کے دیباچہ میں جہاں اپنے مآخذ کا تذکرہ کیا ہے وہیں انھوں نے علم الفقہ کو بھی شامل کیا ہے۔ اس لحاظ سے 'علم الفقہ' اُردو زبان میں فقہی مسائل کی سب سے پہلی مکمل کتاب کہی جاسکتی ہے۔

رسالہ 'علم الفقہ' میں ہر ماہ دینی مسائل کو مخصوص ترتیب کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا، جب ایک سلسلہ کے مسائل مکمل ہوجاتے تو انھیں ایک جلد قرار دے کر دوسری جلد شروع کر دی جاتی

تھی، اس طرح آج اس کی مکمل چھ جلدیں مدون ہوکر عوام و خواص کے درمیان یکساں طور پر مقبول ہو چکی ہیں۔ جلد اوّل طہارت کے بیان میں ہے، جلد دوم نماز، جلد سوم روزہ، جلد چہارم زکوٰۃ، جلد پنجم حج و زیارت اور جلد ششم نکاح کے مسائل سے متعلق ہے۔ اس کے بعد آپ کا ارادہ طلاق کے مسائل پر بھی ایک جلد مرتب کرنے کا تھا بلکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے یہ جلد مکمل بھی کر دی تھی مگر بعض ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے وہ زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکی اور کچھ عرصہ کے بعد اس کا مسودہ بھی نایاب ہو گیا، اگر ایسا نہ ہوتا تو آج اُردو زبان میں دینی مسائل کا ایک نہایت معتبر و معتمد اور کامل و اکمل ذخیرہ ہمارے درمیان موجود ہوتا۔ 'علم الفقہ' کی دینی و علمی حیثیت پر تصنیفات کے باب میں تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

النجم کا اجراء

۱۹۰۴ء میں شیعوں کی طرف سے لکھنؤ میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کی کوششیں ہونے لگی تھیں۔ دہلی کے شیعہ واعظ مولوی مقبول احمد نے جن کا ذکر ہم گذشتہ باب میں کر چکے ہیں اودھ کے کچھ شہروں میں اشتعال انگیز تقریریں شروع کر دیں جن سے مسلمانوں کو سخت صدمہ اور دُکھ پہنچا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لکھنؤ میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ایک طرف مقبول احمد کی شعلہ فشانی اور مناظرہ کا چیلنج تھا تو دوسری طرف ملک کے مختلف حصوں میں شیعہ اخبارات و رسائل نے مذہبی چھیڑ چھاڑ کا بازار گرم کر رکھا تھا، ان جرائد میں نت نئے طریقوں سے مسلمانوں کے عقائد کی تردید اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کھل کر تبرا کیا جاتا تھا۔ ان احوال کا تقاضا تھا کہ اسلامیانِ ہند کی طرف سے کوئی ایسا اخبار نکلے جو معاندین کے پیہم تحریری حملوں کا دفاع کر سکے اور مسلم عوام کو گمراہی اور شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے سے بچائے، چنانچہ مولانا لکھنویؒ نے ۷ر رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ مطابق ۲۶ر اکتوبر ۱۹۰۴ء کو 'النجم' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار لکھنؤ سے جاری کیا جو ہر قمری مہینے کی ۷-۱۴-۲۱- اور ۲۸ تاریخوں کو ۱۸-۲۲ سائز کے ۱۲ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔

النجم کے اغراض و مقاصد

اخبار النجم کے اغراض و مقاصد کو مولانا علیہ الرحمہ نے ان الفاظ میں تحریر کیا تھا:

"النجم کا اصلی مقصد حمایتِ اسلام اور نصیحت مسلمین ہے۔ مسلمانوں کے عقائد وخیالات، عادات و خصائل اور عبادات و معاملات کی اصلاح اور ہر امر میں اتباعِ شریعتِ حقّۂ محمدیہ کی ترغیب اور خلافِ شریعت اُمور سے حتی الامکان ان کو بچانا ہے، اسی مبارک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کے حسب ذیل مستقل عنوانات قائم کیے گئے ہیں (۱) اہلِ علم کی مراسلت جو خاص مذہبی اور ضروری مسائل سے متعلق ہو۔ (۲) غیر مذاہب کے حملوں سے اسلام کی حفاظت اور اسلام کی حقیقت کا تمام مذاہب پر اظہار (۳) بزرگانِ سلف اور ائمہ دین کے حالات اور (۴) کچھ حصہ خبروں کا بھی ہر شمارہ میں رہے گا اور اس کے لیے خاص طور پر یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اسلامی خبریں عربی اخبارات سے منتخب ہوں[۱]۔"

مولانا نے اخبار 'النجم' کی ضرورت اور اہمیت پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے ہندوستان میں یہ پہلا اخبار ہے جو خاص مسلمانوں کی دینی بہبودی اور صرف دینی اغراض اور مذہبی مقاصد کی تکمیل کے لیے شائع ہو رہا ہے، اگر خدا کو منظور ہے تو اس اخبار سے مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوگا جیسا کہ اس کے مقاصد سے ظاہر ہے، اس پر آشوب زمانے میں جبکہ اسلام ایک غریب الدیار مسافر کی طرح بے یار و مددگار ہو رہا ہے وہ لوگ بہت کم ہیں جو اسلام کی عزّت و آبرو کو اپنی ذاتی عزّت و آبرو پر ترجیح دیتے ہوں، مخالفین کی طرف سے جو حملے اسلام پر ہو رہے ہیں وہ ایک طرف ہیں خود مسلمانوں ہی میں عجب اختلافات اور فسادات برپا ہو رہے ہیں (چنانچہ) ایک طالبِ حق کو سخت حیرانی در پیش ہو جاتی ہے اور وہ بیچارہ اکثر باوجود سخت کوشش کے بھی راہِ مقصود کا پتہ نہیں پاتا۔ ان تمام امور پر نظر کر کے بڑی ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ ایک اسلامی اخبار شائع کیا جائے جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کرے اور علماء کی بے توجہی اور عالم نما جاہلوں کی درخور سے جو جو خرابیاں مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں پیدا ہوگئی ہیں ان کو دور کر کے انھیں سچا پکا مسلمان بنادے اور مخالفین کے حملوں کا نہایت تہذیب کے ساتھ جواب دے کر حق پسند طبیعتوں پر اس امر کو ظاہر کردے کہ آج دنیا میں جس قدر مذاہبِ مختلفہ رائج ہیں ان میں حق کون ہے[۲]۔"

شیعہ اخبارات و رسائل

النجم کا جس زمانے میں اجراء ہوا اس وقت ملک کے مختلف حصوں میں شیعوں کے تقریباً پچیس اخبارات و رسائل نکل رہے تھے جن میں سوائے مسلمانوں کے مسلّمہ عقائد کی تردید کے

۱۔ النجم لکھنؤ، ۷رشوال ۱۳۲۲ھ ۲۔ النجم لکھنؤ ۱۴رشوال ۱۳۲۲ھ

اور کچھ نہیں ہوتا تھا، ان رسائل میں کچھ تو ایسے تھے جو محض 'النجم' کے جواب میں ہی نکالے گئے تھے۔ وہ النجم کے کسی مضمون کا جواب تو کیا دیتے ہاں دُشنام طرازیوں اور تبرائی طعن وتشنوں سے ضرور اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچا لیتے تھے۔ ان اخبارات و رسائل میں جو ردِّ اہل سنت میں خاص طور سے پیش پیش تھے ان میں اصلاح (کھجوا ضلع سیوان) شیعہ (لاہور) اثنا عشری (دہلی) روشنی (لکھنؤ) امامیہ (لکھنؤ) الحکم (لکھنؤ) اور سہیل یمن (لکھنؤ) قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ذوالفقار، نظارہ، الرحیم، اسد، سرفراز، اور الواعظ جیسے اخبارات و رسائل بھی تھے جنھوں نے اہلِ سنّت و جماعت کی دل آزاری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔[1]

ان رسائل میں کچھ ایسے بھی تھے جو دس پندرہ سال سے ردِ اہلِ سنّت میں نکل رہے تھے، ان کے بنیادی مقاصد تین تھے، اوّل مسلمانوں کے اُس طبقہ کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرنا جو اپنے مذہبی عقائد کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا، دوم شیعہ عوام میں خود اعتمادی پیدا کرنا نیز ان کے جارحانہ عزائم کی حوصلہ افزائی کرنا، اور سوم مسلم عوام کی جہالت، غربت اور مذہبی شعور کے فقدان سے فائدہ اٹھا کر شیعیت کی تبلیغ کرنا وغیرہ۔ ان جرائد کے پرانے ریکارڈ آج بھی شاہد ہیں کہ بلا استثناء ان کے ہر صفحہ پر صحابۂ کرام کی شان میں گستاخی، اہل سنّت کے عقائد پر تنقید اور اسلامی تاریخ کی مسخ شدہ تصویر ثبت ہے۔ انہی حالات سے متاثر ہو کر النجم کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ النجم کا منشاء کسی فرقہ کی دل آزاری کرنا ہرگز نہ تھا اور نہ ہی کسی گروہ کے مذہبی معتقدات پر کسی قسم کا حملہ کرنا تھا، اس کا منشاء صرف اہل سنت کی طرف سے دفاع کا فریضہ انجام دینا تھا اور بس۔

النجم کے مستقل عنوانات

النجم ایک علمی و دینی جریدہ تھا اس میں شائع ہونے والے تمام مضامین انفرادیت اور ندرت کے حامل تھے ان مضامین کے علاوہ اس میں کچھ مستقل عنوانات بھی متعین تھے جن کے ذیل میں بڑی مفید اور کار آمد باتیں اشاعت پذیر ہوتی تھیں، ان عنوانات میں ایک عنوان 'العقائد الحقہ' تھا جس میں اسلامی عقائد کی تشریح و توضیح اور عام مسلمانوں کے بعض فاسد عقائد کی تصحیح

---

[1] النجم ہفت روزہ لکھنؤ، کربلا نمبر، مارچ ۱۹۳۷ء اور مئی ۱۹۳۷ء

کے لیے سلفِ صالحین کی مفید اور مختصر تصنیفات ترجمہ کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔ اسی عنوان کے تحت بعض مشائخ کے حالات اور ملفوظات بھی شائع کیے جاتے تھے خاص طور سے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ اور حضرت شاہ احمد سعید مجددیؒ وغیرہم کے اہم مکتوبات ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا کرتے تھے۔ دوسرا عنوان 'التقریظ و الانتقاد' تھا جس میں مختلف ہم عصر اخبار و رسائل پر تبصرہ درج ہوتا تھا یا خود 'النجم' کے بارے میں دوسرے جرائد جو اظہار خیال کرتے تھے انھیں نقل کیا جاتا تھا، اسی ضمن میں صحابۂ کرامؓ کے بعض خصوصی حالات اور ان کے فضائل و مناقب کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ 'المراسلات' کے تحت ایسے فتاویٰ اور ان کے جوابات درج کیے جاتے تھے جو دفتر النجم میں موصول ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح اکثر اہلِ علم کی وہ تحریریں جو دینی مسائل سے تعلق رکھتی تھیں وہ بھی اسی عنوان کے تحت شائع ہوتی تھیں، اس طرح بہت سے اہم مضامین اس عنوان کے ذیل میں اشاعت پذیر ہو گئے تھے۔ 'الحوادث المحلیه' کے تحت مقامی خبریں درج کی جاتی تھیں اور 'الحوادث العمومیه' کے اندر ملکی خبریں اور ممالک اسلامیہ میں ہونے والے اہم واقعات درج کیے جاتے تھے۔ اسی طرح 'العزاء و الرثاء' کے کالم میں مشہور علمی و دینی شخصیات کی وفات پر تعزیتی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ 'ان کلمة الله هی العلیا' کے ذیل میں غیر مسلم حضرات میں اسلام کی مقبولیت اور ان میں سے بعض کے اسلام لے آنے کے واقعات مندرج ہوتے تھے۔ ایک عنوان 'زھد و رقائق' کا بھی تھا جس میں بعض مخصوص مشائخ کے حالات، فرمودات اور ان کے منتخب مکاتیب شائع کیے جاتے تھے، اس طرح تصوف کے اہم مسائل بھی زیر بحث آتے اور ان پر اظہارِ خیال ہوتا تھا۔ علمی مضامین اور وہ مقالات جو معترضینِ اسلام کے جواب میں ہوتے تھے وہ ان عنوانات کے علاوہ ہوتے تھے۔

النجم کی حیات کے مختلف دَور

النجم اپنی خصوصیات اور بنیادی مقاصد کے ساتھ کم و بیش ۳۳ سال تک شائع ہوتا رہا مگر اس مدّت میں اس کے سائز، صفحات اور وقفۂ اشاعت میں تغیر و تبدل ہوتا رہا، ابتداءً یہ ہفت روزہ اخبار کی شکل میں نکلا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ماہنامہ کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔ ایک دَور ایسا بھی آیا کہ ماہنامہ کے بجائے پندرہ روزہ رسالہ کی حیثیت سے شائع ہونے لگا۔ یہ تبدیلی ۷/ذی الحجہ

۱۳۲۹ھ - ۱۹۱۱ء کو عمل میں آئی تھی، کچھ عرصہ کے بعد پھر دوبارہ ماہنامہ کی شکل میں شائع ہونے لگا۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے پھر ہفت روزہ اخبار کی شکل میں نکالا گیا، کثرت کار اور بعض نامساعد حالات کی بنا پر اکثر اس کی اشاعت میں تعطل بھی ہوتا رہا اسی لیے ایک زمانہ میں یہ ''النجم دَور جدید'' کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔

۱۹۳۲ء تک 'النجم' براہِ راست مولانا لکھنویؒ کی زیر ادارت نکلتا رہا، اس مدّت میں اس میں زیادہ تر انہی کی تصنیفات، تراجم کتب اور علمی مضامین شائع ہوتے تھے، اس کے علاوہ 'النجم' کے خصوصی میدانِ عمل اور بنیادی پالیسیوں سے مطابقت رکھنے والے دوسرے اہل علم حضرات کے مقالات بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۳۲ء کے بعد 'النجم' کی دیکھ بھال اور اس کی ترتیب و تسوید کی اکثر ذمہ داری حضرت کے صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالمومن فاروقیؒ (م ۱۹۶۷ء) کے سپرد ہوئی، یہ زمانہ مولانا فاروقیؒ کی نوجوانی کا تھا اور اسی زمانہ میں وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے تازہ تازہ لکھنؤ آئے تھے، ان کے پُر جوش اور ولولہ انگیز قلم نے 'النجم' کے حلقہ میں ایک ہلچل مچادی، 'النجم' جواب تک محض دفاعی مضامین، افہام و تفہیم اور معاندین کے اعتراضات کے مدلل علمی جوابات تحریر کرنے پر ہی کاربند تھا اب اس نے ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار کر لی، اب تک اس کا حلقہ خواص اور اہلِ علم تک ہی محدود تھا مگر اس نوجوان اور نئی ابھرتی صحافت نے اُسے عوام کے ہاتھوں تک پہنچادیا۔ یہی وجہ تھی کہ جنوری ۱۹۳۴ء سے 'النجم' ایک ماہوار رسالہ کے بجائے پھر تیسری بار ہفت روزہ اخبار کی شکل میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔

مولانا فاروقیؒ نے اپنی ادارت میں 'النجم' کی پالیسی اور اس کی ترتیب میں بھی مختلف تبدیلیاں کیں، اہلِ سنّت کی ترجمانی میں انھوں نے زیادہ پُرجوش رویّہ اختیار کیا، صحابۂ کرامؓ کے فضائل و مناقب میں بہت مؤثر اور سبق آموز مضامین شائع کیے، نعتیہ اور مدحیہ نظموں کو بھی شامل اشاعت کرنا شروع کر دیا، 'النجم' میں منظومات کی اس شمولیت کے نتیجہ میں ملک میں شعراء کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آنے لگا جو نعت کے ساتھ ساتھ صحابۂ کرامؓ کی شان اقدس میں خالص منقبتی نظموں کی طرف بھی طبع آزمائی کرنے لگا۔ اس طرح بہت سے شعراء اب صرف مدحِ صحابہ کے شاعر ہونے کی حیثیت سے متعارف ہونے لگے۔ اس نئے عہد کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ تھوڑے وقفہ کے بعد تقریباً دو درجن 'النجم' کے خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے۔ یہ خصوصی نمبر مختلف عنوانات پر مبنی

ہوتے تھے اور ان ہی عنوانات سے متعلق ان میں مشاہیر اہلِ قلم حضرات کے وقیع اور نہایت معلومات افزا مضامین ہوتے تھے، ساتھ ہی ساتھ مدحِ صحابہؓ سے متعلق نظمیں بھی خاصی تعداد میں شائع ہوتی تھیں۔ ان نمبروں میں چند کے عنوانات اور تاریخ اشاعت درج ذیل ہیں:

خلافت نمبر (۱۳/اپریل ۱۹۳۴ء)، رسالت نمبر (۲۵/جون ۱۹۳۴ء)، عاشورا نمبر (۱۴/جون ۱۹۳۵ء) خاتون نمبر (۲۳/اپریل ۱۹۳۵ء) صحابہ نمبر (۱۴/جون ۱۹۳۵ء) ذبیح اللہ نمبر (۲/مارچ ۱۹۳۶ء)، شہداء نمبر (۴/اپریل ۱۹۳۶ء) ہجرت نمبر (۳/جون ۱۹۳۶ء) مدح صحابہ نمبر (۷/اگست ۱۹۳۶ء) ناموسِ اسلام نمبر (۲۸/اگست ۱۹۳۶ء) احتجاج نمبر (۲۵/ستمبر ۱۹۳۶ء) امامت نمبر (یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء) استقلال نمبر (۱۳/نومبر ۱۹۳۶ء) تحریک نمبر (۱۱/دسمبر ۱۹۳۶ء) کربلا نمبر (مارچ ۱۹۳۷ء) اور ان کے علاوہ عتیق نمبر اور کمیشن نمبر بھی شائع ہوئے تھے مگر ان کی تاریخیں معلوم نہ ہوسکیں۔

النجم کی خدمات

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ 'النجم' کی اشاعت سے پہلے اور بعد میں بھی لکھنؤ اور دوسرے مختلف شہروں سے اہلِ سنّت کی تردید میں متعدد اخبارات و رسائل نکل رہے تھے، ان جرائد کا وطیرہ یہی تھا کہ وہ اسلامی معتقدات کی دن رات تضحیک کریں اور اکابر اہلِ سنّت پر رکیک حملے اور دُشنام طرازیاں کرکے اپنے عیوب کی پردہ پوشی کریں، علمائے اہل سنّت اپنی عمومی وسعت نظری اور رواداری کے پیشِ نظر ان مفاسد کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتے تھے اور انھیں معمولی بات سمجھ کر نظر انداز کردیا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ہر دور میں کچھ ایسے دور اندیش اور حق نگار علماء ضرور رہے جنھوں نے اس مسئلہ خصوصی پر قلم اٹھایا ہے اور امّت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ النجم بھی انھیں حالات میں نکالا گیا تھا، اس نے امّتِ مسلمہ میں ایک تحریک پیدا کی، اس نے نہ صرف مخالف حملوں سے مدافعت ہی کی بلکہ بہت سی ایسی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کیا جن میں عوام تو عوام ہیں خواص اور بعض اہلِ علم حضرات بھی مبتلا تھے، النجم نے روافض کے ان عقائد سے باخبر کیا جو اَب تک ان کی بنیادی کتابوں میں ہی پوشیدہ تھے، ان عقائد کے سامنے آنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ ان کا اسلام سے تعلق کتنا اور کیسا ہے۔ یہی معاملہ دوسرے فرق باطلہ

(گمراہ فرقے) کے سلسلہ میں بھی ہوا۔ یہ النجم ہی کی برکات ہیں کہ آج ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ان مسائل پر پوری واقفیت کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں اور حق و باطل میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ کچھ دن پہلے تک لوگ شیعہ سنی اختلافات کو محض فروعی اختلافات سمجھ کر ٹال دیا کرتے تھے لیکن النجم کی اشاعت اور حضرت مولانا لکھنوی کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں ان اختلافات کی گہرائی و گیرائی اور اصل حقیقت معلوم ہوگئی کہ اسلام کیا ہے اور رفض کیا ہے۔

مولانا کی جتنی تصانیف، تراجم اور تالیفات ہیں وہ سب کی سب پہلے النجم ہی کے ذریعہ منصۂ شہود پر آئیں۔ ابتداءً یہ مضامین قسط وار النجم میں شائع ہوتے تھے اور پھر بعد میں انھیں علیحدہ کتابی شکل میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ آپ کے اکثر اہم مضامین اور بعض تصانیف اب تک النجم ہی کے صفحات پر محفوظ ہیں اور علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع نہیں ہوسکیں۔ فقہی مسائل کو سب سے پہلے اُردو زبان میں مرتب و مدوّن کرنے کی خصوصیت آپ ہی کو حاصل ہوئی جو علم الفقہ کے نام سے مشہور و معروف ہوئی، اسی طرح صحابۂ کرامؓ کے حالات کو اُردو زبان میں سب سے پہلے منتقل کرنے کا فریضہ آپ ہی نے ادا کیا، اس سلسلہ میں علاّمہ ابن اثیر جزریؒ کی ضخیم کتاب اُسد الغابہ کو آسان اُردو میں ترجمہ کر کے آپ ہی نے النجم میں شائع کیا، سیرت نبوی پر اُردو میں بچوّں، عورتوں اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے آپ ہی نے نفحۂ عنبریہ، مختصر سیرت نبویہ اور فضائل و مناقب میں سیرت خلفائے راشدین لکھ کر النجم میں شائع کیا جو بعد میں علیحدہ چھپ کر کافی مقبول ہوئیں۔ النجم کی ان خدمات کا اعتراف اس وقت کے اکثر جرائد نے کیا تھا۔

النجم کا طرزِ تحریر بہت آسان سلیس اور شگفتہ تھا، خالص علمی اور فقہی مسائل کو بھی اس طرح آسان کر کے لکھا جاتا تھا کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی اسے نہایت ذوق و شوق سے پڑھتے تھے اور رہنمائی حاصل کرتے تھے، النجم کا یہ اسلوب اُس دَور کے لیے بالکل نیا تھا، اس دور میں جو علمی و دینی کتابیں اُردو زبان میں لکھی گئی ہیں ان کی زبان بہت ادق اور ثقیل ہوا کرتی تھی لیکن النجم نے دین کو آسان بنا کر اور اسلام کے بنیادی عقائد کو نہایت سہل انداز میں عام مسلمانوں تک پہنچانے میں بڑی مدد دی، اس طرح سے سیرت نبوی، حالات صحابہ، اسلامی فقہ، اور بزرگانِ دین کے فضائل و مناقب کی دولت سے اُردو زبان کو سب سے پہلے مالا مال کرنے کی جو سعادت النجم کو حاصل ہوئی ہے اسے اُردو زبان کی تاریخ کا ایک روشن باب قرار دیا جا سکتا ہے۔

النجم کا ایک خاص امتیاز یہ بھی تھا کہ مناظرانہ مضامین اور شدید اعتراضی حملوں کا جواب دیتے وقت بھی اس کا لب ولہجہ اور طرزِ تحریر نہایت مہذّب اور شائستہ ہوتا تھا، اس کی نگارش میں تلخی، غصہ اور اشتعال کی کوئی مثال ملنی مشکل ہے جبکہ مخاطب کا رویہ اس کے بالکل برعکس ہوتا تھا، ان کی طرف سے اشتعال انگیزیاں، دُشنام طرازیاں، ذاتیات پر حملے اور عبارتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کر کے گمراہ کرنے کی کوششیں بالکل عام تھیں، ان باتوں کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ عام ذہنوں کو اصل مسئلہ سے ہٹا کر اس طرح برانگیختہ کر دیا جائے کہ تصادم کی نوبت آ جائے اور اختلافات کی خلیج بجائے کم ہونے کے اور زیادہ بڑھ جائے۔ النجم اس راز سے واقف تھا چنانچہ اس نے اپنا رویہ بہت معتدل، نرم اور حق پسندانہ رکھا، یہی وجہ تھی کہ النجم مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پڑھا جاتا تھا وہ ان حلقوں میں بھی پڑھا جاتا تھا جو مناظرانہ تحریروں کے پڑھنے کے عادی نہیں ہوتے تھے۔

جنوری ۱۹۳۴ء سے لے کر جولائی ۱۹۳۷ء تک النجم ہفت روزہ اخبار کی شکل میں نکلتا رہا، یہ دَور اس کی اشاعت کا بہت جوشیلا دور تھا، اس کی اشاعت بہت بڑھ چکی تھیں، اہلِ سنت کے عقائد اور شعائر کی تبلیغ و ترویج کے ساتھ اس وقت کی ملکی سیاست اور قومی مسائل پر بھی مضامین شائع ہونے لگے تھے جس کے نتیجہ میں یہ دَور النجم کے لیے بہت پر آشوب دَور ثابت ہوا اور ہر طرف سے اس کے چراغِ ہستی کو گل کر دینے کی تدبیریں کی جانے لگیں، رفض، قادیانیت عیسائیت، رضاخانیت، آریہ سماجی تحریکات اور علامہ مشرقی کی بیلچہ بردار جماعت النجم کے مقابلہ پر صف آرا ہو گئیں۔ انگریز حکومت بھی نہیں چاہتی تھی کہ مسلمانوں میں اتحاد اور دینی بیداری پیدا ہو اس لیے وہ بھی دَر پردہ ان مخالف طاقتوں کو شہ دیا کرتی تھی اور مختلف حیلوں بہانوں سے وقتاً فوقتاً النجم پر نقد ضمانت کی سزا عائد کر دیا کرتی تھی، اوّلاً جہاں تک ہو سکا یہ ضمانتیں حکومت کے خزانے میں جمع کی جاتی رہیں مگر جولائی ۱۹۳۷ء میں حکومت کی طرف سے مبلغ پندرہ سو روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی جس کے جمع نہ کیے جانے کی صورت میں اس کی اشاعت ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

النجم کے قلمی معاونین

النجم نے اُس وقت تک پورے ملک میں اپنی منفرد حیثیت کو منوا لیا تھا اور وہ اہلِ حق کے ہر

طبقہ میں پڑھا جاتا تھا چنانچہ اس دَور کے اکثر دینی و علمی مضامین لکھنے والے حضرات کی قلمی کاوشیں برابر اس میں شائع ہوا کرتی تھیں، اُن حضرات میں مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مولانا عبداللہ عمادیؒ، مولانا حبیب احمد کیرانویؒ، مولانا احمد عبدالحلیم صاحب کانپوریؒ، مولانا ابوالبیان شمس آبادیؒ اور مولانا محمد یونس خالدیؒ وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔

ملک کے مشہور و معروف شعراء کا کلام بھی النجم کے صفحات پر بکثرت شائع ہوا کرتا تھا ان میں جناب سیمابؔ اکبرآبادی، مولانا ظفر علی خاں، ابوالاثر حفیظ جالندھری، امجدؔ حیدرآبادی، اثرؔ زبیری لکھنوی، ضیاؔ لکھنوی، مولوی عبدالرب صوفیؔ، علّامہ انور صابری، یحییٰ اعظمی، علّامہ اقبالؔ سہیلؔ اعظمی، عمرؔ انصاری لکھنوی اور مولانا عبدالشاہد خاں شیروانی وغیرہم کے اسماء گرامی بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

النجم اپنے معاصر علماء اور صحافیوں کی نظر میں

جس دور میں النجم نکلتا تھا اُس دَور کے علماء، دانشور اور صحافت کے میدان کے ممتاز اہلِ قلم حضرات نے النجم کی علمی خدمات اور دینی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی مثبت آراء کا اظہار کیا تھا، ان میں سے چند آراء کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ حضرت مولانا سیّد محمد علی صاحبؒ رحمانی مونگیری بانی و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

''از فقیر محمد علی رحمانی کان اللہ لہٗ تمام برادرانِ دینی، احباب مخلصین اور مریدین سلسلۂ عالیۂ رحمانیہ کو بعد سلام مسنون معلوم ہو کہ آج کل روافض کی طرف سے جو حملے مذہب اہلِ سنّت پر ہو رہے ہیں وہ بہت زیادہ قابلِ توجہ ہیں، ان کے پچیس چھبیس رسائل و اخبار ردِّ اہلِ سنّت میں نکل رہے ہیں اور ان کی چھوٹی بڑی کتابیں بھی روز مرہ نکلا کرتی ہیں، ان کے واعظین بھی جابجا گشت کرکے لوگوں کو بہکا رہے ہیں اور ہندوستان بھر میں سوا میرے محبِّ مخلص جامع الفضائل مولانا محمد عبدالشکور صاحب لکھنوی کے مذہبِ روافض پر کامل عبور رکھنے والا اور ان کے اعتراضات کا شافی جواب دینے والا کوئی دوسرا معلوم نہیں ہوتا، انہی کا ایک رسالہ النجم ہے جو لکھنؤ سے ہر مہینے میں دو بار شائع ہوتا ہے اور تمام اہلِ سنّت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہا

ہے، حق یہ ہے کہ ردِّ روافض میں النجم بے نظیر ہے، علاوہ ردِّ روافض کے کبھی کبھی دوسرے مذاہب باطلہ کا رد اور خود مسلمانوں کی مذہبی معلومات اور معارفِ قرآنیہ کا ذخیرہ بھی اس میں شائع ہوتا رہتا ہے، لہٰذا یہ فقیر اپنے مخلصین ومحبین سے متوقع ہے کہ وہ رسالہ مذکورہ کے خریدار ہوکر اس دینی خدمت میں مدد دیں گے، فقیر ان سے نہایت خوش ہوگا۔ صحابۂ کرامؓ کی حمایت کرنا، ان کے دشمنوں کے اعتراضات کا جواب دینا اور اس کام میں مدد دینا یقیناً موجب خوشنودیٔ خدا اور رسول ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّي اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِي اَبْغَضَهُمْ یعنی جو شخص صحابۂ کرامؓ سے محبت کرتا ہے وہ میری محبت کے سبب سے ان سے محبت کرتا ہے اور جو اُن سے بغض رکھتا ہے وہ میرے بغض کے سبب سے بغض رکھتا ہے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِذَا لَعَنَ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا فَمَنْ كَتَمَ حَدِيْثًا فَقَدْ كَتَمَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ (ابن ماجہ) یعنی جس وقت امت کے پچھلے لوگ اگلوں کو (صحابہ کرام کو) بُرا کہیں اس وقت جس شخص نے (صحابۂ کرامؓ کی فضیلت کی) ایک بات بھی چھپائی تو بہ تحقیق اُس نے اللہ کی اتاری ہوئی شریعت پوری کی پوری چھپادی۔ نعوذ باللہ منہ[1]"

۲۔ ماہنامہ القاسم دیوبند

"یہ مجلۂ مبارکہ ان مخصوص خدماتِ اسلامی کے سبب سے جو ہمیشہ اس کا امتیازی فخر رہا ہے آج اربابِ بصیرت کی بارگاہ میں محتاجِ تعارف نہیں، اس کے مُدیر فخر المناظرین حضرت مولانا الحاج مولوی عبدالشکور صاحب مدظلہم العالی ہیں، ان کے اسمِ گرامی کے بعد النجم کی ظاہری ومعنوی محاسن وخوبیوں کی طرف رہبری کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ النجم کس آفتابِ رشد وہدایت کی طرف منسوب ہے، اس سے کہ جس نے اپنی ضیا پاش کرنوں سے جراثیم رفض وبدعت کو فنا کیا اور اپنی سنانِ لسان اور زبان قلم سے رفض وبدعت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا اور اس کو روبہ قضا ہونے پر مجبور کیا، کون نہیں جانتا کہ قصرِ رفض میں ان ہی کی مساعی سے زلزلہ آیا ہوا ہے اور تبرا بازوں کی حقیقت ان ہی کی بدولت کالشمس فی النہار ہے۔ پس النجم اس ذاتِ مقدس کے علمی ومذہبی برکات وفیوض کا مجموعہ وترجمان ہے اور ہندوستان بھر

---

[1] النجم لکھنؤ، ربیع الاوّل، ۱۳۴۵ھ

میں صرف یہی ایک جریدہ ہے کہ جو دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں سینہ سپر بنا ہوا ہے کہ جس کی تجلی نے عالم تشیع پر ایک عام بجلی گرا رکھی ہے۔ ہم افرادِ قوم سے پُرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مجلۂ علمیہ کی توسیع و اشاعت میں ہر ممکن سعی سے دریغ نہ فرمائیں[1]۔"

۳۔ اخبار سچ، لکھنؤ

"مولانا عبدالشکور صاحب مدیر النجم اپنے رسالہ نیز اپنی تالیفات کے ذریعہ علم و مذہب کی جو مفید و گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اس کا اعتراف ان صفحات میں اس سے پیشتر بھی ہو چکا ہے۔ سیرت نبوی میں ان کا مختصر مگر جامع رسالہ نفحۂ عنبریہ ابھی شائع ہوا ہے۔ النجم میں یہ مضمون پہلے بھی نکل چکا ہے لیکن اب بعد نظر ثانی و اضافۂ مضامین یہ رسالہ کی صورت میں مرتب ہو کر شائع ہوا ہے۔ ابتدائی سولہ صفحوں میں عقائد پر ایک مقدمہ ہے جس میں عقیدۂ توحید، عقیدۂ نبوت اور عقیدۂ قیامت کی تشریح کی گئی ہے اس کے بعد صفحہ ۱۷ سے لے کر آخر تک ولادت مبارکہ، نسب، رضاعت، بعثت قبل ہجرت و بعد ہجرت، معجزات، اخلاق و عادات، متعلقین و مخصوصین وغیرہ مختلف عنوانات کے ماتحت سیرت مبارکہ سے متعلق تمام ضروری مطالب باوجود اختصار کے حیرت انگیز جامعیت کے ساتھ آ گئے ہیں، زبان صاف، سادہ و سلیس ہے، ہر طبقہ اور ہر خیال کے اہلِ سنت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ارباب ہمت کے لیے موقع ہے کہ اس کے نسخے زیادہ تعداد میں خرید فرما کر تقسیم کریں[2]۔"

۴۔ اُردو کے مشہور ادیب و انشاء پرداز مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

"النجم لکھنؤ سے مولانا محمد عبدالشکور صاحب کے اہتمام میں شیعوں کی مخالفت اور تردید میں بڑی آب و تاب اور تحقیق سے نکلتا ہے، یہ اپنی نوعیت کا اکیلا ایک رسالہ ہے۔ حضرات شیعہ کی جانب سے سنّیوں کی تردید میں بڑے وسیع پیمانہ پر کوششیں ہو رہی ہیں لہٰذا اہلِ سنت کو اس رسالہ کی قدر کرنا چاہیے اور فیاضی کے ساتھ مدد کرنا چاہیے۔ سنّیوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ النجم کی اعانت میں

---

[1] ماہنامہ القاسم، دیوبند، جمادی الاولیٰ ۱۳۴۵ھ

[2] اخبار سچ، لکھنؤ ۱۵ر نومبر ۱۹۲۶ء

کوتاہی کرنا خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے، افسوس یہ ہے کہ اہلِ سنّت اس بارے میں شیعوں کے مقابل زیادہ غافل ہیں، باہمی مختلف فیہ مسائل میں شیعوں کا ایک بچہ بھی جس قدر واقف ہوتا ہے سُنیوں کے جاہل ہی نہیں پڑھے لکھے جوان بلکہ میں کہوں گا کہ بہت سے ذی علم حضرات بھی آگاہ نہیں ہوتے، اس غفلت کو چھوڑ کر ہر سنّی کا فرض ہے کہ وہ رسالہ النجم کی مدد کرے[1]۔"

مولانا عبدالحلیم شرؔر اپنے ایک دوسرے جریدے میں النجم کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تاہم النجم ایک ایسا کام کر رہا ہے جس کو بہت سے سنّی پسند کرتے ہیں، جن اہلِ سنّت کو شیعوں کے مناظروں اور اپنی جانب کی خموشی سے یہ نظر آتا تھا کہ ہم کمزور ہیں اب انھیں اپنا پلّہ بھی بھاری نظر آنے لگا، غنیمت یہ ہے کہ النجم میں بحث اعتدال اور تہذیب سے کی جاتی ہے، فریق مخالف کے علماء اور مقتداؤں کے نام ادب و تعظیم سے لیے جاتے ہیں اور استدلال بادی النظر میں نہایت ہی موجہ اور معقول نظر آتا ہے گو اس کی حقیقی معقولیت انھیں لوگوں کو معلوم ہو سکتی ہے جنھوں نے مختلف فیہ مسائل کو خوب غور سے مطالعہ کیا ہے، تاہم عام سُنیوں کی طرف سے ہم مولوی عبدالشکور صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اس لیے کہ ہندوستان کے تمام اہلِ سنّت بڑی گرم جوشی سے ان کی مستعدی کی قدر کر رہے ہیں۔

النجم ایک بہت بڑا عام احسان بھی اُردو لٹریچر پر کر رہا ہے وہ یہ کہ اس کے صفحوں پر ابن اثیر جزریؒ کی مشہور و مستند کتاب اسد الغابہ کا ترجمہ سلسلہ وار شائع ہو رہا ہے جو حالاتِ صحابہؓ میں ایک نہایت اہم اور ضروری کتاب ہے اور اتنی بڑی ضخیم کتاب ہے کہ بہت سی جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ مولوی محمد عبدالشکور صاحب نے اگر اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں مکمل کر لیا تو ہماری زبان پر ان کا ایسا احسان ہوگا جو بہت بڑا ہوگا اور ہمیشہ قائم رہے گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ ترجمہ اسد الغابہ کا کم از کم ایک جز ہر ہفتہ شائع ہوا کرتا جس کے لیے ہم بھی اپنی امکانی مدد دینے کو تیار ہیں[2]۔"

۵۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ

"یہ مذہبی رسالہ مدّت سے جاری ہے، یہ خاص اہلِ سنّت کا رسالہ ہے اور انہی کی امداد کا محتاج

---

[1] ماہنامہ دل گداز لکھنؤ نمبر ۱۱، جلد ۲۶ نومبر ۱۹۲۶ء۔

[2] ہفت روزہ النجم لکھنؤ ۷ محرم ۱۳۲۳ھ بحوالہ اخبار اتحاد لکھنؤ مدیر مولانا عبدالحلیم شرؔر

ہے، مولانا عبدالشکور صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں، اپنے رنگ میں لاجواب ہے، دین الٰہی سے اگر محبت ہے تو ضروری ہے کہ دین کے سب سے پہلے خادم سب سے پہلے معلّم و مبلّغ یعنی صحابہ کرامؓ سے محبت ہو اور ناممکن ہے کہ ان حضرات پر ناروا اتہامات لگائے جائیں اور ان کے جواب میں خاموشی اختیار کی جائے، النجم تمام مسلمانوں کی طرف سے اس فرض کفایہ کو انجام دے رہا ہے۔ اس کی بقا کا سامان کرنا سب پر فرض ہے۔"[۱]

معاصر معارف اپنی دوسری اشاعت میں اس طرح رقمطراز ہے:

"لکھنؤ کا النجم پہلے اخباری صورت میں تھا اب کچھ دنوں پہلے پندرہ روزہ رسالہ کی شکل میں ہوگیا ہے، اہلِ سنّت کا یہ واحد رسالہ ہے جو اہل تشیع کے دس پندرہ اخبارات و رسائل کے مقابلہ میں سینہ سپر رہتا ہے۔ مولانا عبدالشکور صاحب جو اس کے ایڈیٹر ہیں شیعہ و سنّی کے اختلافی مسائل کے سوال و جواب اور مناظرہ میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں اور جو چیز ان کی قابلِ تعریف ہے وہ یہ ہے کہ وہ جوابات میں عام مناظرین کی طرح اپنے دامن کو ابتذال و سب و شتم سے آلودہ نہیں کرتے، موصوف نے اہلِ سنّت سے اپیل کی ہے کہ وہ کم از کم دو ہزار اس کے خریدار پیدا کریں تو یہ رسالہ اپنی خدمات پوری طرح بجالائے۔ النجم میں صوری تغیر کے ساتھ ایک معنوی تغیر یہ بھی ہوا ہے کہ وہ اہل تشیع کے ساتھ آریہ سماجی لٹریچر کا بھی جواب دینے لگا ہے۔"[۲]

۶۔ اخبار اہلِ حدیث امرتسر

"رسالہ النجم شیعوں کے مقابلہ میں مذہبِ اہلِ سنّت کی حمایت کرنے والا پرچہ لکھنؤ سے جاری ہے مگر اہلِ سنّت کی ناقدری کا ہمیشہ شاکی ہے۔ اہلِ سنّت اصحاب کو شکایت کا رفع کرنا ضروری ہے۔"[۳]

۷۔ روزنامہ الوحید (سندھی) کراچی

"النجم اُردو زبان میں پندرہ روزہ رسالہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ایک بے نظیر رسالہ ہے جس میں اہل تشیع اور اہل بدعت کے عقائد فاسدہ کی تردید میں بلند پایہ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مسلمانانِ سندھ کا فرض ہے کہ وہ اس نایاب رسالہ کے خریدار بن کر مستفید ہوں۔"[۴]

۱۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ، دسمبر ۱۹۲۶ء ۲۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ جنوری ۱۹۲۷ء

۳۔ اخبار اہل حدیث، امرتسر ۱۷ر دسمبر ۱۹۲۶ء ۴۔ روزنامہ الوحید (سندھی) کراچی ۲۵ر دسمبر ۱۹۲۶ء

ساتواں باب

دار المبلّغین کا قیام اور اس کا عہد آفریں تعلیمی نظام

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ایک نئی تہذیب وثقافت اور نئے علوم وفنون کی درآمد کا سلسلہ شروع ہوا، مسلم علماء ودانشوروں میں یہاں جو بھی جس خطّہ سے آیا وہ اپنے ساتھ وہاں کی علمی خصوصیات اور درس وتدریس کا ایک مخصوص نظام بھی لایا۔ ملک کے مختلف علاقوں میں علمی مراکز قائم ہوئے جہاں ماہرینِ فن دنیا کے ہر گوشہ سے سمٹ کر جمع ہونے لگے۔ مغلوں سے پہلے سلاطین کے عہد میں ہندوستان کے اسلامی نصاب تعلیم میں قرآن وحدیث کے ساتھ ساتھ تصوف فقہ اور اصول فقہ کو بھی ایک مقام حاصل تھا، بعض اعتبار سے یہ عہد پھر غنیمت تھا اس عہد میں غوری خاندان سے لے کر لودھی خاندان تک جتنے بھی سلاطین سریر آرائے سلطنت ہوئے وہ تقریباً سب ہی مسلکاً سنی وحنفی تھے اس لیے سلطنت کا نظام تعلیم بھی سنی وحنفی مسلک کا ترجمان رہا۔ لیکن عہد مغلیہ میں ہمایوں کے زمانے سے ایرانیوں سے روابط زیادہ بڑھنے لگے چنانچہ اس کے بعد جتنے بھی مغل بادشاہ آئے وہ بعض سیاسی حالات کی وجہ سے اپنے کو ایران کا مرہونِ منت سمجھنے لگے تھے اس لیے وہاں سے آنے والوں کو بڑی قدر ومنزلت کے ساتھ ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جانے لگا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ایرانی علماء، ادباء، شعراء اور اہلِ سیاست بڑی تعداد میں ہندوستان آئے اور اپنے ساتھ کچھ مخصوص افکار وخیالات اور جداگانہ دینی وادبی ذخیرے کو بھی یہاں لائے حکومت کی سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے انھیں ان چیزوں کے رائج کرنے اور مقبول بنانے میں بڑی مدد ملی۔ اس طرح سے ایک نیا نظامِ تعلیم یہاں وجود میں آیا جس میں منقولات کے بجائے معقولات اور قرآن وحدیث کے بجائے فلسفہ، منطق اور دوسرے علوم کو فوقیت حاصل ہوئی اور جن علوم کو قرآن وحدیث کے سیکھنے کا ذریعہ بنایا گیا تھا اب وہ اصل قرار دیئے جانے لگے جبکہ روزِ اوّل سے مسلمانوں کا مقصدِ اصلی قرآن کی تعلیم وتعلّم کے سوا اور

کچھ نہ تھا، حدیثِ نبوی خَیرُ کُم مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرآن و علّمه' اور بلغوا عنی ولو آیة اس کے ثبوت میں کافی ہیں، چنانچہ حضرت فاروق اعظمؓ کا حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں اور اس کے بعد اپنے دورِ خلافت میں قرآن کی اشاعت اور اس کے درس وتدریس میں بے مثل اہتمام کرنا اور اسی کام کو اپنی خلافت ہی نہیں بلکہ پوری زندگی کا مقصد وحید قرار دینا اسی بات کی روشن دلیل ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرے صحابۂ کرامؓ اور ان کے شاگردوں کے افعال واقوال بھی اس کی تائید میں بے شمار ہیں۔

سنت کی تعلیم بھی جس کو عرف میں علم حدیث کہتے ہیں قرآن مجید کی تعلیم وتعلم کی تکمیل ہی کے لیے ضروری قرار پائی تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ احکامِ قرآنی پر عمل کرنے کا طریقہ اور اس کے معالم کے ادراک کا صحیح راستہ مشکوٰۃ نبوت ہی کی روشنی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ سنت کے علاوہ دوسرے علوم وفنون بھی جو اسلامی نصاب تعلیم میں داخل کیے گئے تھے وہ سب کسی نہ کسی درجہ میں قرآن مجید کے خادم ہونے کی حیثیت میں ہی تھے مگر اب معاملہ اس کے برعکس تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا شناسی اور اتباعِ سنت کا جذبہ روز بروز کم سے کم تر ہوتا گیا اور لفظی گورکھ دھندے اور عقلی بھول بھلیوں میں ساری علمی صلاحیتیں کھو کر رہ گئیں، ان تاریک حالات میں دین کا صحیح درد رکھنے والے اور مستقبل کے بھیانک نتائج کو محسوس کرنے والے حضرات کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۷۶۲ء) نے انہی حالات سے مجبور ومضطر ہو کر علماء وقت کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔

> "میں اُن طلباء علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کے زمرے میں شمار کرتے ہیں کہ اے ناسمجھو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف ونحو ومعانی کے حصول میں لگ گئے ہو اور یہ خیال کر بیٹھے ہو کہ علم انھیں چیزوں کا نام ہے، حالانکہ علم نام ہے کتاب اللہ کی آیتِ محکمہ کا، تم اس کو اس طرح سیکھو کہ پہلے اس کے غریب لغات کی تفسیر معلوم کرو پھر سبب نزول معلوم کر کے اس کے مشکل مقامات کا حل تلاش کرو۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کو جو صحیح ثابت ہو چکی ہیں یاد کرو کہ آپؐ کس طرح نماز پڑھتے تھے؟ کیسے وضو فرماتے تھے اور کس طرح اپنی ضرورت کے لیے کہیں تشریف لے جاتے تھے؟ آپ کیسے روزے رکھتے تھے؟ کیسے حج کرتے، جہاد کرتے، کلام کرتے اور کس طرح زبان کی حفاظت فرماتے تھے اور یہ کہ آپ کا اخلاق کیسا

تھا؟ لہٰذا ضروری ہے کہ ان سب امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو[1]۔‘‘

حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ نصیحت آپ کے پورے تعلیمی نظریہ کی ترجمان ہے، چنانچہ آپ کی یہ پکار خالی نہ گئی، سعید اور خوش بخت رُوحوں نے اس پر لبیک کہا اور اہلِ حق کی ایک جماعت نے اس نصیحت پر عمل پیرا ہونے اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے دیو بند ضلع سہارنپور میں ایک دینی قلعہ کی بنیاد ڈال دی، یہی وہ مدرسۂ دیوبند ہے جو بعد میں دارالعلوم کے نام سے جانا پہچانا گیا۔ آگے چل کر اسی نہج پر سہارنپور، گلاؤٹھی اور مرادآباد کے علاوہ دوسرے مقامات پر علم دین کی شمعیں روشن کی گئیں۔ اس قسم کے دینی گہواروں سے تعلیم و تربیت پا کر جو جماعت نکلی اس نے پورے برصغیر میں دینی مدارس کا ایک جال سا بچھا دیا جس کے نتیجہ میں تھوڑے ہی دنوں میں اللہ اور اس کے رسول کے احکامات و فرمودات کی تبلیغ و اشاعت کا کام دور دراز کے مقامات تک پھیل گیا، پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا جبکہ بعض حالات اور ضرورت وقت کے پیش نظر نئے تعلیمی اصولوں اور جدید نصابی تبدیلیوں کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا قیام عمل میں لایا گیا اس طرح ملک کے دینی حلقوں میں سے ایک حلقہ اس نئے نظام تعلیم سے بھی منسلک ہو گیا۔

تعلیمی و دینی پسِ منظر

برطانوی دور حکومت میں برصغیر کے اندر جو ظلم و تشدد اور استحصال کا سلسلہ شروع ہوا اس سے یہاں کی ملت اسلامیہ دوسروں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ متاثر ہوئی، چونکہ ملک کا سیاسی اقتدار انگریزوں نے مسلمانوں ہی سے غصب کیا تھا اس لیے موردِ عتاب اور غیظ و غضب کا شکار بھی وہی زیادہ ہوئے، انگریزوں نے جہاں مسلمانوں کو بہت سے نقصانات پہنچائے وہیں اس نے ایک چال یہ بھی چلی کہ ان باطل فرقوں کو جو اسلام کا نام لے کر اسلام کو نقصان پہنچا رہے تھے ان کو در پردہ شہ دے کر اور طرح طرح سے کمک پہنچا کر حقیقی اسلام کے مدّ مقابل لا کر کھڑا کر دیا، اس طرح سے یہ دور مذہبی نقطۂ نظر سے بڑا نازک دور تھا، چاروں طرف سے کفر و الحاد و نیز بدعات و ارتداد اور مخالفینِ اسلام کے منظم حملے ہو رہے تھے، ناواقف اور سادہ لوح مسلمان

---

[1] تفہیمات الٰہیہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، جلد اوّل، ص ۲۱۴۔

عیسائی مشنریوں اور شدھی سنگٹھنوں کے شکار ہو رہے تھے، مزید برآں بابی اور قادیانی فتنے بھی مسلمانوں کو مرتد بنانے میں پوری طرح سے سرگرم عمل تھے، ہمارے جدید تعلیم یافتہ نوجوان دہریت کی طرف مائل ہو کر عقلیت اور اشتراکیت کو اپنا مسلک قرار دینے لگے تھے، رہی سہی کسر یہ بھی پوری ہوگئی کہ ہندوستانی شیعہ جو اپنی اقلیت اور مذہبی کمزوری کی بنا پر اب تک سر بہ گریباں تھے وہ بھی مسلمانوں کے مقابل آ کر برسرِ پیکار ہوگئے اور طرح طرح سے مسلم عوام کو ان کے عقائد سے بدظن و بدگمان کرنے لگے اور اپنی مذہبی مجالس میں علماء اہلِ سنّت کو برملا مناظروں کا چیلنج دینے لگے۔ اس سنگین صورتِ حال میں مدارس اسلامیہ کا مروجہ طریقۂ کار اور نظامِ تعلیم پوری طرح ہم آہنگ نہ تھا اور ملّت کے پاس ایسے افراد کی کوئی معقول تعداد نہ تھی جو حق و باطل کے معرکہ میں نڈر اور بے خوف ہو کر حق کی ترجمانی کر سکے الّا ماشاء اللہ، اکابر میں ایسی بھاری بھرکم شخصیتیں ضرور پیدا ہوتی رہی ہیں جو اعلاء کلمۃ الحق کرتی رہی ہیں لیکن وہ اپنی ملّی حمیت وغیرت اور اپنے ذاتی ذوق و وجدان کے تحت ہی اس فریضہ کو انجام دیتی رہی تھیں، چنانچہ اس سلسلہ میں کوئی باضابطہ تنظیم یا کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جو اس ملّی ضرورت کو پورا کرتا۔ مدارس کا عمومی ماحول اور ان کے فضلاء کی عموماً جو علمی صلاحیت ہوتی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا لکھنویؒ خود ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

”اب آج کل تو حالت یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ سے جو طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اُن میں اکثریت اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو علوم و فنون تو کجا زبانِ عربی سے بھی اجنبی ہوتے ہیں کہ گویا آواز بھی اس کی ان کے کانوں تک نہیں پہنچی، باقی رہی اقلیت تو اس کا یہ حال ہے الّا ماشاء اللہ کہ تمام کتب درسیہ ختم ہوگئیں مگر قرآن مجید سے بالکل بے گانگی ہی رہی، اس اقلیت میں جو اقل قلیل ایسے ہوتے ہیں کہ کتب درسیہ میں اچھی استعداد رکھتے ہیں اور بخوبی پڑھا سکتے ہیں بلکہ پڑھاتے ہیں تو وہ بھی قرآن مجید سے کچھ زیادہ آشنا نہیں ہوتے...... یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس معاملہ میں مدارسِ عربیہ کا زیادہ قصور نہیں ہے بلکہ قدرت کی طرف سے کچھ اسباب ہی ایسے مہیا ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے یہ حالات رونما ہوئے ہیں۔ قرآن مجید سے اس بے تعلقی ہی کا نتیجہ ہے کہ نہ ہمارے عقائد ٹھیک رہے اور نہ اعمال، نہ ہم صحیح تبلیغ کر سکتے ہیں اور نہ کسی گمراہ کو راہ پر لا سکتے ہیں، جب ہم خود ہی اسلام کی حقیقت سے ناواقف ہوگئے تو دوسروں کے سامنے کیا پیش

کریں گے، دینِ اسلام جو خدا پرستی کا حقیقی مرکز تھا وہاں آج لڑنے جھگڑنے کے سوا کوئی کام ہی نہ رہا، یہ آپس کے روز افزوں اختلافات ہی نہیں بلکہ نزاعات اور یہ نئے نئے فرقوں کی پیدائش اوران کی نمائش سب قرآن کریم سے بے تعلقی کے ثمرات ہیں۔[1]''

مذکورہ بالا ماحول میں یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ اب علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو علومِ نبویّہ کے حامل ہونے کے ساتھ فرقِ باطلہ کے مذہبی افکار و خیالات سے بھی پوری طرح واقف ہو اور جان بوجھ کر پھیلائی گئی گمراہیوں کے جواب میں اسلام کی صحیح اور سچی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ بھی انجام دے سکے۔

داعیۂ خیال

انھیں اسباب کی وجہ سے حضرت لکھنویؒ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ لکھنؤ میں ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالی جائے جو مذکورہ بالا کمیوں کو پورا کرتے ہوئے دوسرے اَدیان اور فرقوں کے عقائد و خیالات سے بھی طلباء کو واقف کرائے جس سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مدد ملے۔ ۱۹۳۲ء کا زمانہ تھا، لوگوں کا اصرار ہوا کہ لکھنؤ میں کسی خاص مقام پر پہلے سے اعلان کر کے آپ کے وعظ کا بندوبست کیا جائے چنانچہ شیخ امیرحسن صاحب مرحوم کے مکان واقع محلّہ رکاب گنج لکھنؤ میں اس کا انتظام کیا گیا، پہلے ہی دن لوگوں میں اس قدر ذوق وشوق پیدا ہوا کہ باوجود ایک وسیع میدان ہونے کے جگہ کی قلّت ہوگئی لہٰذا مچان باندھ کر نشست کا بندوبست کیا گیا، لوگوں کا خیال تھا کہ ایسا اجتماع خالص واعظانہ محفل کی حیثیت سے لکھنؤ میں کبھی نہیں ہوا تھا، وعظ کا یہ سلسلہ دو دو تین تین دن کے وقفہ کے ساتھ جاری رہا یہاں تک کہ اس سلسلہ کے چوالیس وعظ ہوئے۔ اثر کی یہ کیفیت ہوئی کہ مساجد میں نمازیوں کی تعداد دونی اور تین گنی ہوگئی اور بغیر کہے سنے بہت سی بُری رسموں اور بدعتوں کو مسلمانوں نے خود بخود ترک کردیا، اسی طرح پچاس فیصد سنّیوں کی تعزیہ داری انھیں مواعظ کی برکت سے ختم ہوگئی۔ ان مواعظ میں عوام، علماء اور مدرسین کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی بڑی پابندی سے شرکت کرنے لگے چنانچہ انھیں سامعین میں لکھنؤ کے

---

[1] ''دار المبلّغین اور اس کی پنج سالہ سرگذشت'' محررہ حضرت مولانا لکھنویؒ مشمولہ پنج سالہ رپورٹ انجمن ہدایت المسلمین لکھنؤ (ستمبر ۱۹۳۲ء تا ستمبر ۱۹۳۷ء)

مشہور، معزز، اور دیندار قانون داں مولوی محمد نسیم ایڈوکیٹ[1] بھی تھے جو بلا ناغہ شریک محفل ہوا کرتے تھے، ان مواعظ کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے بھی اس خیال کی تائید کی کہ لکھنؤ میں ایسا ادارہ قائم ہونا چاہیے جس میں ایسے واعظ اور مبلغ تیار کیے جائیں جو معارفِ قرآنیہ کی صحیح تبلیغ کر سکیں اور عوام وخواص میں قرآن مجید کا درس دے سکیں، انھوں نے ایسے ادارہ کو قائم کرنے کے لیے عمائدین شہر کو بھی آمادہ کیا اور اس سلسلہ میں مالی امداد بھی سب سے زیادہ انھوں نے ہی دی۔[2]

دارالمبلّغین کا افتتاح

۲؍ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ یعنی ۱۹۳۲ء کی صبح وہ مبارک اور سعید صبح تھی جبکہ لکھنؤ میں معززین شہر کا ایک مختصر اجتماع ہوا اور اس میں ایک ادارہ کا افتتاح عمل میں آیا جس کا نام خود بانی ادارہ نے دارالمبلّغین، تجویز کیا، اس افتتاحی تقریب میں انھوں نے ہی سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کی پندرہ منٹ تک تفسیر بیان کی اور اس کے بعد ادارہ کے مقاصد اور اس کے ضروری قواعد وضوابط کا ایک مجمل خاکہ بھی حاضرین کے سامنے پیش کیا، اس مبارک موقع پر دوسرے مدارس کے کچھ فارغ التحصیل طلباء بھی خبر سن کر آگئے تھے لہٰذا انھیں کے ساتھ بیٹھ کر دوسرے دن سے کام شروع کر دیا گیا اور اس کام کا آغاز بھی درس قرآن کریم سے ہوا، اس طرح اس ادارہ کی خشتِ اوّل درسِ قرآن سے رکھی گئی۔[3]

دراصل قرآن مجید ہی سارے علوم وفنون کا سرچشمہ ہے اور اسی کی تعلیمات ہی سے انسان کو ہدایت کا راستہ مل سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے حسبنا کتاب اللہ[4] کا اعادہ اس وقت کیا تھا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے فرائض نبوت کو باحسن وجوہ پورا

۱۔ آنریبل مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ مرحوم گڑھی، بھلول ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے رہنے والے تھے، اودھ کے چوٹی کے وکیلوں میں ان کا شمار تھا اور ایک زمانہ میں تو لکھنؤ میں ان کا طوطی بولتا تھا لیکن اسی کے ساتھ دینی رجحان بھی نمایاں تھا، مولانا شاہ وارث حسن صاحب کوڑہ جہان آبادیؒ سے بیعت کا تعلق تھا اور نہایت خوش اوقات بزرگ تھے۔ آخر عمر میں دینی کتابوں کے مطالعہ اور اذکار کا اشغال سے ہی شغل رہ گیا تھا، اپنے دَور کے علماء وبزرگانِ دین اور دینی وعلمی اداروں سے خصوصی تعلق تھا۔ آپ کے تین فرزند تھے۔ سب سے بڑے محمد وسیم بیرسٹر جو پاکستان کے پہلے ایڈوکیٹ جنرل تھے، دوسرے بیٹے پروفیسر محمد حبیب سابق صدر شعبۂ تاریخ وسیاسیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تھے، اور تیسرے بیٹے پروفیسر محمد مجیب سابق وائس چانسلر جامعہ ملّیہ اسلامیہ نئی دہلی تھے۔ مولوی محمد نسیم ایڈوکیٹ کا انتقال ۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ (حیات عبدالحیٔ مؤلفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

۲۔ پنج سالہ سرگزشت۔ مرتبہ حضرت مولانا لکھنویؒ ۳۔ ایضاً ۴۔ ترجمہ: ہمارے لیے کتاب اللہ کافی ہے۔

کر کے دنیا سے پردہ پوش ہونے کے لیے پابہ رکاب تھے، یہ مقولہ حضرت فاروق اعظمؓ کے ان کارناموں میں سب کا سرتاج ہے جو عہد نبوت میں بتوفیق الٰہی ان سے صادر ہوئے تھے۔

دارالمبلغین کے بنیادی مقاصد

اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ دارالمبلغین میں طلبہ کو قرآنی تعلیمات کو ترجیحی بنیاد پر صاف وسادے طریقہ سے عوام کے سامنے پیش کرنے کی تربیت دی جائے گی اور علماء کی ایک ایسی جماعت تیار کی جائے گی جو اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ مسلک اہل سنت و جماعت کے عقائد حقہ کی نشرو اشاعت اور فِرق باطلہ کے الزامات کی تردید بھی خصوصی طور پر کرسکے، چنانچہ جس دور میں یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا اس دور کی مکروہ ومسموم فضا میں تبلیغ واصلاح کی اہمیت و ضرورت نے تمام ہندوستانی مسلمانوں کو مضطرب و بے چین کررکھا تھا اور چونکہ اس کی ذمّہ داری بلاتخصیص ہر مسلمان پر عائد ہوتی تھی اس لیے ہر خطّہ اور ہر علاقہ کے دیندار حضرات نے اپنے طور پر مدارسِ دینیہ، اصلاحی انجمنیں اور یتیم خانے قائم کرکے اور ان کے ذریعہ ضمناً تبلیغ اسلام کی جدوجہد شروع کردی تھی چنانچہ اس میں کچھ کامیابی بھی ہوئی مگر چونکہ ان کا یہ کام ضمنی تھا اس لیے اس کی پوری طرح مقصد براری نہیں ہوئی۔ دوسری طرف تبلیغ دین اور اصلاح عقائد کی ضرورت روز بروز بڑھتی گئی اور اطراف وجوانب سے مبلغین ومقررین کی مانگ بھی بڑھنے لگی لیکن چونکہ اب تک ایسا کوئی مرکزی ادارہ نہ تھا جو ملّت کی اس اہم ضرورت کو بخوبی پوری کرتا اس لیے یہ طے کیا گیا کہ دارالمبلّغین میں مدارس کے فارغ التحصیل طلباء کو داخل کرکے معارفِ قرآنیہ کے ساتھ ساتھ صحیح طریقہ سے تبلیغ ومناظرہ کی تعلیم دے کر مبلّغین، مقررین اور مناظرین کی طلب کو پورا کیا جائے اس طرح دارالمبلغین میں مختلف ادیان اور مختلف مسلکوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنے اور ان کے بارے میں پوری معلومات فراہم کرنے کا بندوبست کیا گیا چنانچہ دارالمبلغین کے اغراض ومقاصد میں یہ تین چیزیں بھی شامل کی گئیں:

(الف) اہل سنت کے اندر صحیح مذہبی واقفیت پیدا کرکے ان کو پابند مذہب بنانے کی سعی کرنا۔

(ب) غیر شرعی اعمال کی وجہ سے جو دینی اخلاقی اور سماجی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اہل سُنّت کو اُن سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد کرنا۔

(ج) تحریر وتقریر کے ذریعہ اسلام کے محاسن ومکارم کی تبلیغ واشاعت کرنا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے قرآنی تعلیمات کو بنیاد بنایا گیا چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

''دارالمبلغین نے اپنا مقصدِ وحید یہ قرار دیا کہ مدارسِ عربیہ کے فارغ التحصیل ذی استعداد لوگ لیے جائیں اور ان کو سبقاً سبقاً قرآن مجید کی من اولہ الیٰ آخرہٖ تعلیم دی جائے۔ اس سلسلہ میں طرز تعلیم وہ رکھا گیا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے وصیّت نامہ میں ذکر فرمایا ہے اور اس کی خاص تاکید کی ہے نیز اس کو اپنی بے نظیر کتاب ازالۃ الخفاء میں بھی جا بجا بیان فرمایا ہے اور کتابِ مذکور کے مقصد اول کی فصل ششم تو حقیقتاً اس طرز تعلیم کا بہترین نمونہ ہے، راقم الحروف اس طرز تعلیم میں خود صاحب تجربہ ہے، چار سال تک مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں اسی طرز پر اس خدمت کو اپنے استاذ بزرگوار خیر اللاحقین بالائمۃ الہداۃ مولانا السیّد محمد عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ کے ظل عاطفت میں انجام دے چکا ہے۔ دو سال میں بآسانی اس طرز پر قرآن مجید کی تعلیم مکمل ہو جاتی ہے[۱]''

ترجمہ قرآن مجید

مذکورہ بالا تحریر کے مطابق مولانا لکھنویؒ نے اس طرزِ خاص پر لکھنؤ میں سب سے پہلے ترجمۂ قرآن مجید بیان کرنے کی بنیاد ڈالی جس کا آغاز دارالمبلغین کی عمارت میں ہوا۔ قرآن مجید کا یہ درس روزانہ نماز فجر کے اتنے وقفہ کے بعد شروع ہوتا تھا کہ دور دور کے محلوں کے لوگ آسانی سے پہونچ سکیں۔ اس درس میں ہر روز کچھ نہ کچھ ایسی عمدہ تحقیقات آیاتِ قرآنیہ کے ماتحت آجاتی تھیں کہ ان سے اکثر علماء بھی واقف نہ ہوتے تھے۔ ان تحقیقات میں کوئی تحقیق مہمات عقائد کے متعلق ہوتی تھی تو کوئی فروع فقہیہ سے تعلق رکھتی تھی، کوئی اصولِ فقہ سے، کوئی ابطال مذاہب غیر اسلام سے اور کوئی صرف ونحو سے متعلق ہوتی تھی، ان تحقیقاتِ علمیہ کا کچھ حصّہ قلمبند بھی ہو چکا تھا مگر افسوس وہ نایاب ہو چکا ہے۔ اس حلقۂ درس میں دارالمبلغین کے متعلمین کے علاوہ شہر کے باشندے، لکھنؤ کے دیگر مدارس کے مدرسین اور بیرونی علماء وغیر علماء بھی شریک ہوتے تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ قرآن مجید کے درس میں کوئی شخص شریک ہوتا خواہ تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی اور وہ

۱۔ پنج سالہ سرگذشت، از مولانا لکھنویؒ

قرآن مجید کے فیوض سے جس کو حق تعالیٰ نے روحاً مِن اَمرنا اور مَایُحیِیکُم فرمایا ہے محروم چلا جاتا۔ اکثر اوقات درس قرآنی کے فیوض و برکات حاضرین حلقہ درس کے مشاہدہ میں بھی آجاتے تھے۔

مختلف مذاہب و مکاتب فکر کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ معارفِ قرآنیہ کی اہمیت وضرورت پر اپنے قلبی تاثرات کو ظاہر کرتے ہوئے مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:-

قرآن مجید کے درس کے علاوہ دارالمبلغین میں کچھ اور کتابوں کا مطالعہ بھی خاص اہتمام سے کرایا جاتا ہے جیسا کہ اس کے نصاب تعلیم سے ظاہر ہے اور تقریر و تحریر کی مشق بھی کرائی جاتی ہے مگر مقصد اصلی درس قرآنی ہی ہے:

مراد من سخن از بزم ساقی است　　　دگر از ہرچہ گویم اتفاقی است

قرآن مجید کی تعلیم بطرز مذکور ہمارے تمام مقاصد کو باحسن وجوہ پورا کرنے کے لیے کافی ووافی ہے، بے جان جسموں میں روح کا پیدا کرنا قرآن کریم کا خاص کام ہے، اسی وجہ سے جابجا قرآن مجید میں قرآن مجید کو 'روح' اور 'حیات آفریں' فرمایا گیا ہے۔ صحیح واعظ و معلّم اور اصلی مناظر و مبلّغ کا پیدا کرنا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیل. نِعْمَ الْمَوْلیٰ وَ نِعْمَ النَّصِیر۔ بارگاہِ الٰہی میں بصد تضرع وزاری یہ التجا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی خدمت کا ذوق ہمارے دلوں سے کم نہ کرے بلکہ یہ پیاس روزافزوں ترقی کرتی رہے ضَاعَفَ اللّٰہ بِہٖ کُل زمان عطشی' اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے سب برادرانِ اسلامی کے دلوں میں یہ ذوق پیدا کردے اور جن میں اس ذوق کی اہلیت ہو ان کو اہلِ ذوق کے ساتھ تشبّہ کی توفیق عطا فرمائے:

گر نیست ترا عشق بتحقیق ز تقلید　　　چاکے بگریباں زن وخاکے بسر افگن[1]

دارالمبلّغین کا نصاب تعلیم

دارالمبلّغین کے قیام کا بنیادی مقصد تو تعلیماتِ قرآنیہ کی تبلیغ ہی تھا مگر اس کے ساتھ ہی ان مذاہب کا تقابلی مطالعہ بھی کرانا تھا جو اکثر اہلِ حق سے مزاحم ہوا کرتے ہیں چنانچہ اس ادارے کے قیام کے بعد اس کا نصاب تعلیم بھی انھیں تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مقرر کیا گیا۔ یہ نصاب

---

[1] پنج سالہ سرگذشت، از مولانا لکھنویؒ

اپنے طرز کا منفرد نصاب تھا اور چونکہ یہ مدارس کے فضلاء کے لیے ترتیب دیا گیا تھا اس لیے اس کا شمار تخصّص اور مطالعات عالیہ میں کیا جا سکتا ہے، کم از کم ہندوستان میں اس طرز کا مدرسہ اور نصاب کہیں رائج نہیں تھا۔ پورا نصاب دو سال پر مشتمل تھا، اس دو سالہ نصاب کو مکمل کر لینے کے بعد طلباء کو مدرسہ کی جانب سے سند عطا کی جاتی تھی۔ نصاب کی تفصیل یہ ہے:

سال اوّل

کتبِ درسیہ:

۱- ترجمہ قرآن مجید نصف اوّل
۲- منتخبات منہاج السنة، علاّمہ ابن تیمیہؒ
۳- الرسالة الحمیدیہ، شیخ حسن آفندی طرابلسیؒ
۴- القرآن والعلوم العصریہ، شیخ جوہری طنطاویؒ
۵- حجة اللہ البالغہ نصف اول، شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ
۶- الفارق بین الحق والباطل نصف اول

کتب برائے مطالعہ:

۱- الاتقان فی علوم القرآن، شیخ جلال الدین سیوطیؒ
۲- مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر، امام فخر الدین رازیؒ
۳- الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم معروف بہ تفسیر طنطاوی، شیخ طنطاوی جوہری مصریؒ
۴- تفسیر حقانی (فتح المنّان) مولانا عبدالحق حقانی دہلویؒ
۵- زاد المعاد فی سیرت خیر العباد، علاّمہ ابن قیم جوزیؒ
۶- ازالة الخفاء، شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ
۷- تحفہ اثنا عشریہ، مقصد اول، شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ
۸- نصیحة الشیعه کامل، مولانا احتشام الدین صاحب مرادآبادیؒ
۹- تالیفات حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ
۱۰- عقیدة الاسلام فی حیاة عیسیٰ علیہ السّلام، علاّمہ انور شاہ کشمیریؒ
۱۱- التصریح بما تواتر فی نزول المسیحؑ، علاّمہ انور شاہ کشمیریؒ

۱۲- ہدیۃ المہدیین فی آیۃ خاتم النبیینؐ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

۱۳- عشرۂ کاملہ، مولوی محمد یعقوب پٹیالویؒ

۱۴- تقریر دل پذیر، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

۱۵- دین ودانش، مولوی محمود علی پروفیسر کپورتھلہ

۱۶- ستیارتھ پرکاش، سوامی دیانند سرسوتی

۱۷- رِگ وید

۱۸- آدی بھومیکا

۱۹- بائبل

سالِ دوم

کتبِ درسیہ:

۱- ترجمہ قرآن مجید نصف ثانی

۲- منتخبات الملل والنحل، علّامہ ابن حزمؒ

۳- منتخبات شرح تجرید، قوشجیؒ

۴- منتخبات احقاق الحق، قاضی نوراللہ شوستری شیعی

۵- حجۃ اللہ البالغہ نصف آخر، شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ

۶- الفارق بین الحق والباطل نصف آخر

کتب برائے مطالعہ:

۱- مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر، امام فخرالدین رازیؒ

۲- الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم، شیخ طنطاوی جوہریؒ

۳- مقدمہ تفسیر حقانی، مولانا عبدالحق حقانی دہلویؒ

۴- تفسیر مولانا محمد علی لاہوری

۵- ترجمہ قرآن مجید، مقبول احمد شیعی

۶- منتہی الکلام، مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ

۷- استقصاء الافہام، مولوی حامد حسین مجتہد شیعہ

۸- آیاتِ بینات، نواب مہدی علی خاںؒ

۹- الکاویہ علی الغاویہ، مولانا محمد عالم آسی معتمد انجمن خدام الحنفیہ امرتسر

۱۰- تالیفاتِ خانقاہ رحمانیہ مونگیر برائے ردقادیانیت

۱۱- کلیاتِ آریہ، پنڈت لیکھ رام آریہ مسافر

۱۲- رسالہ مسافر آگرہ، پنڈت بھوج دت [۱]

مذکورہ بالا نصاب کو دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس دوسالہ مدتِ تعلیم میں قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اس کے بعد مختلف مذاہب کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ ان مذاہب میں عیسائیت، شیعیت، قادیانیت، اور آریہ سماج کے افکار وعقائد پر بھی خاص طور پر توجہ دی جاتی تھی۔ دورانِ تعلیم میں طلباء کو تحریر وتقریر کی بھی مشق کرائی جاتی تھی اور بالخصوص مذکورہ بالا فرقوں سے مذہبی مسائل پر گفتگو کرنے اور ان پر احقاقِ حق اور اتمامِ حجت قائم کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ شہر اور بیرونِ شہر جہاں سے بھی کسی واعظ کے لیے کوئی طلب آتی تھی وہاں عموماً دارالمبلغین کے طلباء کو ہی بھیجا جاتا تھا اسی طرح اکثر مدارسِ اسلامیہ اپنے یہاں اساتذہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہاں سے فرمائش کرتے تھے لہٰذا ذہین فارغ التحصیل طلباء کو یہاں سے بسلسلہ ملازمت بھیج دیا جاتا تھا۔ طلباء اور اہل علم حضرات کے لیے مولانا علیہ الرحمۃ نے اپنا ذاتی کتب خانہ بھی مدرسہ کو عاریۃً دے رکھا تھا جو آج بھی مدرسہ میں موجود ہے، اس کتب خانہ میں ہر فن کی نادر کتابیں خاص طور سے ردشیعیت اور ردقادیانیت سے متعلق بنیادی کتابیں محفوظ ہیں، مذکورہ فرقوں کے عقائد وخیالات کو جاننے کے لیے جتنی ضروری کتابیں یہاں مل سکتی ہیں اتنی کسی اور جگہ مشکل ہی سے ملیں گی۔ اس کتب خانہ کو دیگر حضرات نے بھی اپنی کتابوں کا ذخیرہ عطا کیا تھا جس میں ایک بڑی تعداد دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد سے بھی تحفۃً ملی تھی، اس کے علاوہ خود مدرسہ نے بھی کثیر رقم خرچ کر کے قیمتی اور مفید کتابوں کی فراہمی کی ہے۔

مدرسہ کے مختلف شعبے اور ان کی خدمات

درس وتدریس کے علاوہ دارالمبلغین میں اور بھی دوسرے شعبے تھے جنھوں نے بڑی مفید

---

[۱] دستور العمل برائے دارالمبلغین مرتبہ مولانا لکھنویؒ (قلمی) مخزونہ مدرسہ مذکورہ لکھنؤ، ان نصابی کتب کے بعض مصنفین کے نام راقم الحروف کے اضافہ کردہ ہیں۔

خدمات انجام دی ہیں جن کا تذکرہ کرنا دارالمبلغین ہی کی اہم خدمات کا تذکرہ کرنا ہے۔ ان شعبوں میں ایک تبلیغ کا شعبہ ہے۔ تبلیغی نقطۂ نظر سے سب سے پہلے لکھنؤ شہر کو ترجیح دی گئی تھی جہاں بے دینی کی بہت سی رسمیں رواج پذیر تھیں، انہی رسموں میں تعزیہ داری کی رسم بھی یہاں بڑی شدّومد کے ساتھ جاری تھی لہٰذا کوشش کی گئی کہ کم از کم مسلمانوں کے اندر سے اس قسم کی رسومِ بد کا خاتمہ ہو جائے اور وہ سچّے پکّے مسلمان بن کر اپنے فرائض مذہبی کے پابند ہو جائیں، اسی مقصد کے لیے انجمن ہدایت المسلمین جس کے زیر انتظام دارالمبلغین ہے قائم کی گئی۔ اور اسی طرز پر شہر کے مختلف مسلم محلّوں میں بھی انجمنیں بنائی گئیں جن میں باقاعدہ نماز با جماعت کی تبلیغ و تلقین کی جاتی تھی، مسلمانوں میں دینی عقائد کی تعلیم کے لیے دارالمبلغین کے فاضل طلباء کو مواعظ کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ ان انجمنوں کی وجہ سے تعزیہ داری کی بدعت کو مسلمانوں سے چھڑانے میں بہت مدد ملی اور نماز با جماعت کی پابندی پیدا ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مساجد جو اب تک ویران اور سنسان تھیں اور نمازیوں کے لیے ترسا کرتی تھیں وہ آباد ہونے لگیں اور وہ لکھنؤ جو اب تک لہو و لعب اور رفض و بدعت کا مرکز بنا ہوا تھا وہاں ایک نئے سرے سے دین کی ہوائیں چلنے لگیں۔

اُس دور میں عیسائی مشنریوں کی آمد کا بہت زور تھا اور چونکہ انھیں حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اس لیے انھیں اپنے مذہب کے پھیلانے میں مدد بھی کافی ملی چنانچہ لکھنؤ میں بھی انھوں نے اپنا جال بچھایا اور مسلم آبادیوں کو بالخصوص اپنا ہدف بنایا، اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے دارالمبلغین نے مختلف محلّوں میں اپنی شاخیں کھولیں جس میں بچّوں کو دینی تعلیم دینے کے علاوہ بالغوں میں تبلیغ اسلام کا کام بھی کیا جانے لگا جس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے تقریباً ہر شہر میں دارالمبلغین کے فضلاء اور اساتذہ نے اپنے مواعظ سے اسلام کی نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیا ہے اور الحمدللہ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

دارالمبلغین میں ایک شعبۂ نشر و اشاعت بھی قائم کیا گیا تھا۔ اس شعبہ نے بھی بڑے مفید کام انجام دیئے ہیں۔ اس شعبہ کی طرف سے متعدد اہم کتابیں اور رسائل شائع کیے گئے جن میں خاص طور سے 'فتنۂ ابن سبا' قابلِ ذکر ہے، اس کتاب میں بڑی تحقیق کے ساتھ تاریخ مذہب شیعہ کو مرتب کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس مذہب کا بانی ابن سبا یہودی تھا۔ دوسری کتاب 'تحفۃ الایمان لاہل قادیان' مؤلفہ مولوی عبدالرزاق پشاوری ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر

ہے یہ رسالہ ردِّ قادیانیت میں بہت معلومات افزا ہے۔ ایک رسالہ 'تحفۃ الاسلام لجمیع الاقوام' ہے جس میں اسلام کے آفاقی اور فطری مذہب ہونے کے دلائل اور اس کی خصوصی برکات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''اچھوت کدھر جائیں'' اس نام سے ایک رسالہ ایک صاف دماغ ہندو قانون داں بابو جگنّاتھ پرشاد ایڈوکیٹ لکھنؤ نے تحریر کیا تھا جس میں مؤلف نے تمام مذاہب کا موازنہ کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ اسلام ہی وہ سچّا مذہب ہے جس کی پیروی کر کے موجودہ پست اقوام باعزّت اور ترقی یافتہ معاشرے کے دوش بدوش زندگی بسر کر سکتی ہیں، اسی طرح انجمن تحفظ ملّت اور مدحِ صحابہ کمیٹی کی جانب سے وقتاً فوقتاً جو بھی رسالے اور پمفلٹ شائع ہوتے رہے وہ سب ہی دارالمبلّغین کے اساتذہ اور طلباء کی کاوش کا نتیجہ تھے۔

دارالمبلّغین نے ماضی میں دینی خدمات کے علاوہ عام مسلمانوں کی سماجی فلاح و بہبودی کے لیے بھی مفید کام انجام دیئے ہیں۔ یہاں سے ہر ماہ مسلم یتیم بچوّں اور بیواؤں کو وظائف دیئے جاتے تھے اور خاص طور سے ان خاندانوں کی دیکھ ریکھ پر بڑی توجّہ دی جاتی تھی جن کے افراد شیعہ سنی فسادات میں شہید ہو جاتے یا ان کے گھروں اور دوکانوں کو لوٹ لیا جاتا تھا، اس سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی، بے گناہوں کی ضمانتیں اور مقدمات کی پیروی وغیرہ کا بھی اس ادارے کے اراکین بندوبست کرتے تھے، اس کے علاوہ عام غرباء کو بھی یہاں سے امداد دی جاتی تھی۔ لکھنؤ شہر میں اکثر وبائی امراض پھوٹ پڑتے تھے اور دریائے گومتی کے قریب ہونے کی وجہ سے اکثر سیلاب آجایا کرتے تھے لہٰذا ان مواقع پر ادارے کے ذمّہ داروں کی طرف سے ریلیف، راحت کاری اور باز آبادکاری کے لیے کیمپ قائم کر دیئے جاتے تھے جس کے ذریعہ ہر قسم کی امداد بلاامتیاز مذہب و ملّت بہم پہنچائی جاتی تھی۔

دارالمبلّغین کے ترجمان رسائل

دارالمبلّغین کے قیام سے لے کر اب تک ہر دور میں اس کے ترجمان کی حیثیت سے مختلف ماہنامے اور پندرہ روزہ اخبار بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ابتداء میں ''خورشید'' نام کا ایک ماہوار قلمی رسالہ نکالا گیا اس میں زیادہ تر مدرسہ کے اساتذہ اور طلباء کے مضامین ہوا کرتے تھے، یہ رسالہ کئی سال تک برابر دستی لکھ کر دارالمبلّغین کی دیواروں پر آویزاں کیا جاتا رہا تھا۔ کاش اس

کے مضامین آج محفوظ ہوتے تو بڑا مفید ذخیرہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا۔ ۱۹۳۸ء میں مدرسہ کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ 'الداعی' جاری ہوا جس کے مدیر مولانا عبدالحلیم فاروقی (م ۱۹۹۴ء) بنائے گئے۔ 'الداعی' نے بہت مفید خدمات انجام دیں، بانی مدرسہ کے بہت سے غیر مطبوعہ مسودات اس کے صفحات پر اشاعت پذیر ہوئے۔ دوسرے یہ کہ 'النجم' کے بعض اہم اور قیمتی مضامین کا انتخاب بھی اس میں شائع ہوتا رہتا تھا، اس دور میں تحریک مدحِ صحابہ سے متعلق جو اہم واقعات پیش آتے تھے ان کی تفصیلات بھی ہم کو 'الداعی' کے صفحات پر ملتی ہیں، دارالمبلّغین کے شب و روز اور اس کے احوال و کوائف بھی 'الداعی' کے صفحات پر درج کیے جاتے تھے۔ یہ ماہنامہ آٹھ سال تک نکلتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں بعض مجبوریوں کے تحت اس کی اشاعت بند ہوگئی۔

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن کے بعد سیاسی صورتِ حال میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان سے ہندوستانی مسلمان بہت متاثر ہوئے اور ایک عرصہ تک ان کا مستقبل غیر یقینی بنا رہا۔ اسی لیے ہندوستانی مسلمانوں کی دینی و ملّی تحریکات پر بھی ایک زمانہ تک جمود طاری رہا چنانچہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۸ء تک دارالمبلّغین کا کوئی ترجمان آرگن نہیں نکل سکا لیکن دسمبر ۱۹۷۸ء میں یہاں سے پندرہ روزہ 'ندائے سنّت' جاری کیا گیا، کچھ دنوں کے بعد یہ رسالہ ماہنامہ کر دیا گیا مگر افسوس ہے کہ اب یہ بھی بند ہو چکا ہے۔ اس رسالے میں اکثر بڑے قیمتی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ حضرت لکھنویؒ کی نادر و نایاب تحریریں بھی اس میں اشاعت پذیر ہوا کرتی تھیں اور توقع ہو چلی تھی کہ یہ باقی رہے گا اور دارالمبلّغین کے ترجمان ہونے کی حیثیت سے اپنا نمایاں مقام حاصل کرے گا مگر ایسا نہ ہو سکا اور وہ بند ہو گیا۔

دارالمبلّغین کے ابتدائی دنوں میں ایک شعبہ اور بھی قائم کیا گیا تھا جس میں انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کو باقاعدہ داخلہ دے کر تبلیغ دین کی تربیت دی جاتی تھی اور ایسے طلباء کو مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کرایا جاتا تھا، اس کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے اور اس شعبہ کے بعض فارغ التحصیل طلباء نے بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

دارالمبلّغین کے اساتذہ و رفقاء

دارالمبلّغین کے قائم کرنے کے مقاصد نہایت اعلیٰ اور ضرورتِ وقت کے لحاظ سے بہت

مناسب تھے، اس کے بانی و سرپرست کی ذات بھی ایسی معتبر اور مستند تھی جو محتاجِ تعارف نہ تھی اسی لیے اس ادارے کو ایسے اساتذہ و رفقاء کا تعاون حاصل ہوا جو خود اپنی جگہ ایک مقام رکھتے تھے اور جنھوں نے آگے چل کر نمایاں دینی و علمی خدمات انجام دی ہیں۔ ان حضرات میں محدّث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مشہور عالم دین اور صحافی مولانا محمد منظور نعمانیؒ مدیر الفرقان، لکھنؤ، دینی اجتماعات کے کامیاب خطیب و واعظ مولانا ابوالوفاء شاہ جہاں پوریؒ، مشہور مناظر اور فقیہ مولانا سیّد مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ، محقق و مصنف مولانا احمد عبدالحلیم کان پوریؒ، مولانا انوارالحق امروہویؒ، مولانا عبدالرحیم فاروقیؒ، خطیب ملت مولانا عبدالسلام فاروقیؒ، مولانا قاری محمد صدّیق لکھنویؒ، مولانا کلیم اللہ الٰہ آبادیؒ اور معروف خطیب و مقرّر مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان سب حضرات نے بانی و سرپرست ادارہ کے ظلِ عاطفت میں رہ کر ادارہ کی افادیت اور شہرت بڑھانے میں بیش از بیش حصّہ لیا۔ الحمدللہ آج بھی دارالمبلغین اپنی اسی آب و تاب کے ساتھ قائم ہے، قابل اور محنتی اساتذہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں منہمک رہتے ہیں اور اپنے اس مشن کو جس کے لیے اسے قائم کیا گیا تھا کامیابی کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

دارالمبلغین کو شروع ہی سے عام مسلمانوں کی طرف سے شرعی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے معاشرے کے مختلف مسائل سے متعلق فتاوے بھی موصول ہوا کرتے تھے جن کے جوابات نہایت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مرتب کر کے بھیجے جاتے تھے، یہ سلسلہ آج بھی بدستور قائم ہے، اگر یہ تمام فتاوے مرتب کر کے شائع کر دیئے جائیں تو اس کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔

دارالمبلّغین کی نشأة ثانیہ

حضرت مولانا قدس سرہٗ کی وفات کے بعد مدرسہ کا اہتمام اور سرپرستی آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالسلام فاروقیؒ کے سپرد کی گئی ان کے دور اہتمام میں مدرسہ نے بڑی ترقی کی اور بانی مدرسہ کے مشن کے مطابق ساری سرگرمیاں بدستور جاری رہیں۔ حضرت کی حیات کے آخری سال میں خزینۃ العلوم کے نام سے ایک نیا شعبہ دارالمبلّغین میں کھولا گیا جس کے ذریعہ درس نظامی کی بھی باضابطہ اور مکمل تعلیم ہونے لگی تھی اور ساتھ ہی ساتھ درجات حفظ و ناظرہ بھی کھول دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے طلباء کی تعداد بڑھ گئی اور اساتذہ کی تعداد میں بھی

اضافہ ہوا، ان درجات کے کھولنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہاں سے جو طلباء فارغ ہو کر نکلیں انہی میں سے کچھ ذہین اور ہونہار طلباء کا دارالمبلغین کے متعینہ نصاب کے لیے انتخاب کر لیا جائے، اس طرح خزینۃ العلوم نے آپ کی حیات میں خاصی ترقی کر لی تھی۔

دارالمبلغین کی موجودہ عمارت ایک عرصہ سے ناکافی محسوس کی جا رہی تھی اور یہ کوشش کی جا رہی تھی کہ کہیں کوئی مناسب اور کشادہ جگہ مل جائے تو اس کے کچھ شعبے وہاں منتقل کر دیئے جائیں۔ چنانچہ احاطہ شیخ شوکت علی مرحوم جو تحریک مدحِ صحابہ کے آغاز سے ہی دینی اور سماجی اجتماعات کے لیے خاصا مشہور ہو چکا تھا اس کے ایک بڑے حصّہ کو خرید لیا گیا اور اس پورے احاطہ کو ایک مسقف ہال میں تبدیل کر دیا گیا جو آج بھی دینی اجتماعات اور بالخصوص محرم کے شہدائے اسلام نامی پندرہ روزہ جلسوں کے انعقاد کے کام آتا ہے۔ اب اس کا نام "مولانا عبدالشکورؒ ہال" رکھا گیا ہے۔ اس کی اوپری منزل میں دارالمبلغین کے مختلف شعبوں کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی ایک آرام دہ اور ضروری آسائش سے مزین مہمان خانہ اور طلباء کی رہائش گاہ کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے اس طرح سے مدرسہ اب مزید دینی تعلیمات و سماجی خدمات کو بہتر سے بہتر طریقے سے انجام دینے کا اہل ہو گیا ہے۔

مولاناؒ کے تلامذہ

مولانا لکھنویؒ سے استفادہ کرنے والے حضرات کی تعداد بہت بڑی ہے مگر اس کے بارے میں کوئی ریکارڈ نہیں مل سکا پھر بھی ہم نے بڑی تلاش اور جستجو کے بعد چند حضرات کا پتہ چلایا ہے جنھوں نے مختلف اوقات میں الگ الگ اداروں میں آپ سے درس لیا تھا ان میں سے چند حضرات حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ (صاحبزادہ) (۲) حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ (برادر اصغر) (۳) حکیم عبداللطیف صاحبؒ فلسفی، سابق پرنسپل اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڈھ (۴) مولانا قاری محمد صدیق صاحبؒ، استاذ دارالمبلغین (۵) قاری محبوب علی ابوداؤد لکھنوی (۶) مولانا مصطفیٰ حسن صاحب فریاد علوی رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند و استاد عربی لکھنؤ یونیورسٹی (۷) مولانا قاری عبدالہادی سکندر معلّم مکہ معظّمہ (۸) مولانا منظور النبی سہارنپوری

سابق ایم۔ایل۔اے (۹) مولوی ضیاء الحسن علوی سابق رجسٹرار عربی و فارسی الٰہ آباد (۱۰) مولانا عبدالسمیع حمزہ پوری، ایم۔ایل۔اے (۱۱) مولانا مغیث الدین الٰہ آبادیؒ (۱۲) مولانا محمد اسباط صاحب استاذ مدرسہ عالیہ فرقانیہ (۱۳) مولانا عبدالودود صاحب امروہوی (۱۴) مولانا قاری عبیداللہ صاحب الٰہ آبادی (۱۵) مولانا عبیداللہ صاحب سنبھلیؒ (۱۶) مولانا احمد علی مونگیری صاحبزادہ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (۱۷) مولانا سیّد نورالحسن صاحب بخاری پاکستان (۱۸) مولانا احمد حسین بخاری پاکستان (۱۹) مولانا اللہ یار خاں صاحب پاکستان (۲۰) مولانا لال حسین اخترؔ مشہور مناظر، پاکستان (۲۱) مولانا عبدالستار تونسوی پاکستان (۲۲) مولانا صوفی عبدالعزیز بخاری، مہاجر مدنی (۲۳) مولانا مجیدالدین اثرؔ زبیری پاکستان (۲۴) مولانا صوفی حکیم عبدالحمید خان صاحب سواتی، برادر اصغر مولانا محمد سرفراز خاں صفدر شیخ الحدیث پاکستان (۲۵) مولانا عبدالحکیم صاحب شاہجہانپوری (۲۶) مولانا محمد کثیر صاحب تبتی (۲۷) مولانا عبدالحق صاحب بلیاوی سابق پیشکار دارالعلوم دیوبند (۲۸) مولانا عبدالحق خان صاحب فتح پوری، مؤلف اشرف السوانح (۲۹) مولانا انصارالحق صاحب امروہوی (۳۰) مولانا کلیم اللہ صاحب الٰہ آبادی (۳۱) مولانا ہدایت جہاں صاحب بستوی (۳۲) مولانا محمد نبی رحم صاحب بستوی (۳۳) مولانا کلیم اللہ صاحب بہرائچی (۳۴) مولانا حبیب اللہ صاحب بہرائچی (۳۵) مولانا حکیم عبدالباری صاحب شادؔ بہرائچی (۳۶) مولانا محمد سلیمان صاحب شمسی خیرآبادی اعظمی سابق شیخ الحدیث مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں (۳۷) مولانا عبدالسلام صاحب زید پوری، سابق شیخ الحدیث مدینۃ العلوم رسولی ضلع بارہ بنکی (۳۸) مولانا محمد عمر صاحب مبارکپوری (۳۹) مولانا محمد یحییٰ صاحب مبارکپوری (۴۰) قاری عبدالرزاق صاحب گونڈوی (۴۱) حکیم مولوی محمد احمد صاحب امروہویؒ وغیرہ۔

ان حضرات کے علاوہ آپ کے صاحبزادگان میں جناب مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ، مولانا عبدالمہیمن صاحب فاروقیؒ، مولانا عبدالعزیز صاحب فاروقیؒ اور مولوی حکیم عبدالغنی صاحب فاروقی نے بھی ابتدائی تعلیم حضرت لکھنویؒ سے ہی حاصل کی تھی۔ اگر دارالمبلغین اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں اس زمانہ کا ریکارڈ محفوظ ہوتا تو اور بھی بہت سے مشہور اہل علم کے اسمائے گرامی معلوم ہو جاتے۔

آٹھواں باب

سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ اور ہندوستان

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر دور میں علماء ربانی اور صلحاء امت نے اگر ایک طرف اپنے دماغ و ذہن کو علمی کمالات سے جلا بخشی ہے تو دوسری طرف انھوں نے اپنے قلب و روح کو علوم معرفت سے بھی منور کیا ہے یعنی وہ علم ظاہر سے بھی آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے اور علم باطن اور تزکیہ نفس سے بھی مزین ہوا کرتے تھے، اس طرح ان دونوں صلاحیتوں کو کام میں لا کر دینی و دنیاوی خدمات کو انجام دیتے تھے۔ خواجہ حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ ائمہ اربعہؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، امام جلال الدین سیوطیؒ، امام غزالیؒ اور ہندوستانی علماء میں شیخ احمد سرہندیؒ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا شمار ایسے علماء و صوفیاء میں ہوتا ہے جن کا رتبہ علمی اعتبار سے بھی بہت ارفع و اعلیٰ تھا اور روحانی اعتبار سے بھی نہایت بلند و بالا تھا۔

در حقیقت ایک عالمگیر اور فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہونے کا دعویٰ کرنے والے مذہب کے لیے ایسے افراد کا پیدا ہونا ناگزیر اور لابدی ہے ورنہ جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں وہاں مذہب صرف ایک نظریہ اور ایک مکتبۂ فکر بن کر رہ جاتا ہے، وہاں خالق کے حضور میں شان عبودیت نہیں پیدا ہوتی، محبت و عقیدت کا جذبہ نہیں بیدار ہوتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عبادت و ریاضت میں خلوص اور دل میں سوز و گداز نہیں پیدا ہوتا جو سکون قلب اور تعلق مع اللہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے، ایثار و خلوص، محبت و عقیدت اور جاں نثاری و قربانی کے جذبے ہی سے سرشار ہو کر انسان مذہب کو اپنی زندگی کے ہر رگ و پے میں سرایت کر سکتا ہے ورنہ عمر بھر علم ظاہر کی پر پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتا پھرے گا تب بھی اس کو سکون قلب اور ابدی زندگی کی راحتوں کا سراغ نہ مل سکے گا، اسی لیے علماء امت نے اسلام کو علمی طور پر بھی مالا مال کیا ہے اور روح کو بیدار کر کے و نیز نفس کا تزکیہ کر کے بندے کو مولیٰ سے ملانے کی عملی راہ بھی دکھائی ہے۔

احسان یا تصوف

مذہب کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ بندہ جس ذات کو اپنا خدا سمجھتا ہے اس سے اس کا رابطہ بھی ہو جائے، وہ اسے قلب و روح کی آنکھوں سے دیکھے اور اُسے اپنے اندر پائے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا:

الاحسان ان تعبدالله کانک تراہ فان لم تکن تراہ نانہ یراک[1]	احسان یہ ہے کہ تم اس طرح اللہ کی عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو دیکھ نہیں رہے ہو تو گویا وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

یہی احسان آگے چل کر مسلمانوں میں 'تصوف' کی علمی اصطلاح کی شکل میں سامنے آیا، ہر مذہب میں جو اصل جذبہ کام کرتا ہے وہ ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا کو جاننا اور اس تک پہنچنے کے وسائل تلاش کرنا۔ مذہب کی ظاہری شکل اور عملی نظام کو ہم 'شریعت' کہتے ہیں اور جن ذرائع و وسائل سے انسان کے دل کی آنکھیں بینا ہو جاتی ہیں جس کے ذریعہ اس کا قرب حاصل ہوتا ہے اُسے ہم 'تصوف' یا 'طریقت' کے نام سے پکارتے ہیں، طریقت اور تصوف انسان میں یہ صلاحیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ اس زندگی میں قلب کی آنکھوں سے اپنے مالک حقیقی کو دیکھ سکے۔ قانون اور شریعت کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کو کچھ مخصوص قیود و پابندیوں کے ساتھ انفرادی اجتماعی زندگی گذارنے کے لیے ایک لائحہ عمل دے چنانچہ مذہب انھیں دونوں عناصر کے مجموعہ کا نام ہے۔ شریعت اور طریقت دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں جو لوگ ان دونوں کو علاحدہ اور ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں وہ گمراہی میں مبتلا ہیں۔ اگر شریعت جسم ہے تو طریقت اس کی روح ہے، ایک کا کام ظاہری اعمال میں خلوص و محبت کی چاشنی پیدا کرنا ہے تو دوسرے کا مقصد باطنی زندگی کا سدھارنا اور سنوارنا ہے۔ جب شریعت اپنی روح یعنی جذبۂ خداشناسی سے محروم ہو جائے تو اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے، اسی طرح جب طریقت شریعت کے قواعد و ضوابط کو بالائے طاق رکھ دے تو وہ ایک ایسی تیز رفتار سواری کے مانند ہو جاتی ہے جس کے بریک فیل ہو گئے ہوں جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ سوائے ہلاکت اور بربادی کے کچھ نہیں ہوتا۔[2]

---

[1] جامع ترمذی، جلد دوم، ابواب الایمان، ص ۸۵

[2] مولانا عبیداللہ سندھی، حالاتِ زندگی، تعلیمات وسیاسی افکار، ص ۱۳۸

احسان کا مقصد درحقیقت یہی ہے کہ بندے کو خدا کا تقرب حاصل ہو جائے اور بس۔ ہمارے حواسِ خمسہ بہت محدود ہیں جو صرف کسی چیز کو سننے، دیکھنے، سونگھنے، ٹٹولنے اور چکھنے کی حد تک ہی کام آتے ہیں جب کہ وہ ذات عزّ وجل سرتاپا مجرد اور ہمارے ہر خیال سے بلند و بالا ہے، ایک اتنا ہیچ اور کمتر اور دوسرا اتنا جلیل القدر اور برتر، اب دونوں کا اتصال ہو تو کیسے ہو، ان مسائل پر غور کرنا، انھیں سمجھنا اور سمجھانا ہی احسان یا تصوف کا کام ہے۔

سلاسل تصوّف اور ہندوستان

قربِ خداوندی اور ملاء اعلیٰ سے اتصال پیدا کرنے اور ایک خالص و مخلص بندے کی حیثیت سے بارگاہ احد الصمد میں باریابی حاصل کرنے کے لیے صوفیاء کرام اور اولیاء اللہ نے مختلف طریقے اور راستے متعین فرمائے ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے تجربات و مشاہدات اور ریاضتوں و مجاہدوں کی روشنی میں تذکیۂ باطن اور تصفیۂ روح کے لیے الگ الگ ضابطے مقرر کیے ہیں، انھی ضابطوں اور راستوں کو تصوّف کی اصطلاح میں 'طریقہ' یا 'سلسلہ' کہتے ہیں۔ چنانچہ کہیں چشتی سلسلہ رائج ہوا، کہیں سہروردی سلسلہ مقبول ہوا، کہیں قادری سلسلہ کو شہرت حاصل ہوئی تو کہیں نقشبندی سلسلہ کو سب سے بہتر قرار دیا گیا۔

ہندوستان کی تاریخ بڑی عجیب و غریب ہے، یہاں اسلام کی نشر و اشاعت اور اس کی تبلیغ و ترویج کا کام سلاطین و فاتحین کے ہاتھوں زیادہ نہیں ہوسکا اور نہ ہی ان سلاطین کا بنیادی مقصد تبلیغ دین تھا، دراصل یہ کام تو صوفیاء کرام اور اولیاء عظام ہی کے ذریعہ ہندوستان میں ہوا۔ ان بزرگوں نے تن بہ تقدیر پاپیادہ دور دراز اور دشوار گذار فاصلے طے کر کے سرزمین ہند کو اپنے قدوم سے منور کیا۔ اور اپنے انفاسِ قدسیہ سے یہاں شمع ہدایت روشن کی، اعلاء کلمۃ الحق کا فریضہ انجام دیا اور عوام الناس کو سیدھی و سچی راہ دکھا کر گمراہی و ضلالت سے بچایا۔ اگر بزرگان دین اس دلسوزی اور جانگدازی کے ساتھ یہاں پیغام حق نہ پہنچاتے تو آج ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ سلاطین وقت کے پیش نظر تو ہمیشہ سیاسی مقاصد ہی رہے، انھیں اسلام کی نشر و اشاعت سے کوئی زیادہ دلچسپی نہ تھی لہٰذا ہندوستان خاص طور سے انھی اہلِ حق کا رہینِ منت ہے جو ہر قسم کے مصائب اور نامساعد حالات کا سامنا کرتے ہوئے دین کی تبلیغ کرتے رہے۔ انھوں نے یہاں

کے چپّہ چپّہ پر اپنی خانقاہوں اور رشد و ہدایت کے مراکز قائم کر کے حق شناسی کے چشمے جاری کر دیئے۔ یہ مشائخ مختلف دَور میں ہندوستان آتے رہے اور جن خانوادوں سے ان کا روحانی تعلق رہا تھا ان کے طریق تصوّف بھی اپنے ساتھ لائے اور انھیں یہاں پھیلایا۔ ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلہ رائج ہونے سے بہت پہلے کئی اور دوسرے سلاسل یہاں آچکے تھے اور سرزمینِ ہند ان سے متعارف ہو چکی تھی۔ علاّمہ ابوالفضل (م۱۶۰۲ء) نے ہندوستان میں چودہ سلسلوں کی ایک فہرست بیان کی ہے جن میں اکثر اب معدوم ہو چکے ہیں[۱]۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں کی دینی و مذہبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ اسلامیان ہند کی روحانی تربیت و اصلاح کا کام خاص طور سے جن سلاسل کے ذریعہ ہوا ہے اُن میں سلسلۂ چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، فردوسیہ، اور نقشبندیہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

سلسلۂ نقشبندیہ ہندوستان میں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مذکورہ بالا سلاسل نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ و توسیع اور اصلاحِ باطن کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں لیکن حالات اور ماحول بدلنے کی وجہ سے اس بات کا احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ اب تجدید دین اور تزکیۂ باطن کے لیے کچھ ایسے نئے طریقے اختیار کیے جائیں جو حالات سے مطابقت رکھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے طریقوں سے زیادہ موٴثر و مفید ثابت ہوں۔ مغل سلطنت میں جلال الدین محمد اکبر (م۱۶۰۵ء) کا دَور مذہبی اعتبار سے بہت مایوس کن تھا، شعائرِ اسلامی کی بے محابا پامالی، گمراہی و ضلالت کا ہر طرف دَور دورہ، بدعت و شیعیت کا چرچا اور مزید یہ کہ ان ملحدانہ زندیقانہ طاقتوں کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملّت اسلام جاہل بدووں میں پیدا ہوئی تھی لہٰذا کسی مہذّب طبقہ اور شائستہ قوم کے لیے وہ موزوں نہیں ہے، یہی وجہ تھی کہ نبوت، وحی، حشر و نشر، جنت و دوزخ ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا، قرآن کا کلامِ الٰہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد، مرنے کے بعد ثواب و عذاب غیر یقینی، البتہ تناسخ کو ہر آئینہ ممکن و اقرب الی الصّواب اور معراج کو علانیہ محال قرار دیا جاتا، ذاتِ نبویؐ پر اعتراضات کیے جاتے، خصوصاً آپ کی ازواج کے تعدد پر اور آپ

---

[۱] آئینِ اکبری، جلد دوم، علاّمہ ابوالفضل، اُردو ترجمہ مولوی فدا علی طالب، ص۲۱-۳۲۰

کے غزوات وسرایا پر زبان طعن دراز کی جاتی تھی یہاں تک کہ لفظ احمد، محمد سے بھی بیزاری ہوگئی تھی، جن کے ناموں میں یہ لفظ شامل ہوتا تھا ان کے نام بدلے جانے لگے تھے اور دنیا پرست علماء نے تو اپنی کتابوں کے خطبوں میں نعت لکھنی تک چھوڑ دی تھی[1]

دینی اعتبار سے یہی وہ بھیانک دور تھا جبکہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ (م ۱۶۰۳ء) نقشبندی سلسلہ کو لے کر ہندوستان تشریف لائے اور ملتان و لاہور ہوتے ہوئے دہلی میں اقامت پذیر ہوئے، بقول اقبال مجددی:

> "اگر سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے شروع کی مذہبی اور روحانی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی ذاتِ گرامی احیاء سنت کی تمام تحریکوں کا منبع تھی، آپ کے ملفوظات ومکتوبات کا ایک ایک حرف آپ کی مجددانہ مساعی اور بلندیٔ فکرونظر کا شاہکار ہے، (چنانچہ) جب سترہویں صدی کی دو جلیل القدر ہستیوں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما نے احیاء علومِ دینیہ کا بیڑا اٹھایا تو حضرت خواجہ باقی اللہؒ کے انوار سے مستفیض ہونا ازبس لازم سمجھا[2]"

غرضیکہ حضرت خواجہ کی ذات اقدس ہندوستان میں شرک وبدعت اور گمراہی وضلالت کی بنیادیں ہلا دینے کا سبب بنی اور کیوں نہ بنتی آپ ہی کے دامن عاطفت میں امامِ ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۶۲۴ء) کی تربیت ہوئی تھی جن کی تخلیق ہی منشاء خداوندی کے مطابق بدعت و گمراہی کے خلاف حق وصداقت اور احیاء سنت کا آوازہ بلند کرنے کے لیے ہوئی تھی۔ حضرت مجددؒ نے آپ سے بیعت کر کے فیض حاصل کیا اور راہِ سلوک کی جو منازل سالہا سال میں طے ہوتی تھیں وہ چند دنوں میں طے کیں اور اس طرح ایک آفتابِ رشد وہدایت بن کر اکبر و جہانگیر کے اسلام مخالف نظریات کے خلاف صف آرا ہوگئے اور ہر طرح کے آلام ومصائب اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے ہندوستان میں ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔ شہنشاہ نورالدین جہانگیر (م ۱۶۲۷ء) کی بہت کچھ اصلاح حضرت مجددؒ کے ہاتھوں ہوئی اور بادشاہ غازی اورنگ زیب عالمگیرؒ (م ۱۷۰۷ء) کی روحانی تربیت آپ کے صاحبزادہ حضرت خواجہ محمد معصومؒ (م ۱۶۶۸ء)

---

[1] اکبر اور اس کے عہد کے مذہبی افکار وحالات کے سلسلہ میں تفصیل کے لیے دیکھیں منتخب التواریخ مؤلفہ ملا عبدالقادر بن ملوک شاہ بداؤنی، کالج پریس کلکتہ ۱۸۶۵ء اور الفرقان بریلی، شاہ ولی اللہ نمبر، بریلی ۱۳۵۹ء

[2] حدیقۃ الاولیاء، مفتی غلام سرور لاہوری، تحقیق وتعلیق محمد اقبال مجددی، ص ۱۱۶

اور حضرت خواجہ سیف الدینؒ (م ۱۶۸۵ء) کے ذریعہ ہوئی۔

ہندوستان میں اب تک جو سلاسل رائج تھے ان میں خاص طور سے سلسلۂ چشتیہ کا بنیادی اصول یہ تھا کہ صوفیوں اور درویشوں کو سلاطین وقت اور امراء زمانہ سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنا چاہیے، چنانچہ اس سلسلہ کے تمام بزرگ اپنے ملفوظات ومکتوبات میں اپنے تمام مریدین اور متوسلین کو یہی تلقین کرتے چلے آرہے تھے۔ لیکن اب صورتِ حال نے کروٹ بدلی اور اصلاح و تزکیۂ نفس کے موجودہ طریقے میں تبدیلی پیدا ہوئی، چنانچہ نقشبندی مجددی بزرگوں نے چشتیوں کے برعکس یہ حکمتِ عملی اختیار کی کہ پہلے ارباب حکومت اور اصحاب اقتدار سے روابط پیدا کیے جائیں اور ان کی اصلاح کی جائے جب یہ صلاحیت پذیر ہو جائیں گے تو ان کے زیر اثر عوام خود بخود اچھے اثرات قبول کرلیں گے، چنانچہ یہ حکمتِ عملی بڑی کامیاب ثابت ہوئی بالخصوص حضرت مجددؒ نے حکومت کے ذمہ دار ارکان کی اس طرح بڑی اصلاح فرمائی اور ملک کے برسرِ اقتدار حلقوں میں سلسلہ کی ترویج واشاعت کا اہم کارنامہ انجام دیا جس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ برآمد ہوا، حالات میں تبدیلی پیدا ہوئی، ملک کی دینی فضا میں اکبر جیسے بادشاہوں نے جو کثافت اور تعفن پیدا کر دیا تھا اُسے حضرت مجددؒ، اُن کی لائق اولاد اور صالح خلفاء نے نہ صرف یہ کہ پاک وصاف کیا بلکہ دینی وروحانی مطلع کو مطلع الانوار بنادیا۔

بھوپال میں سلسلہ کی آمد

اٹھارہویں صدی کے آغاز سے جب ہندوستان میں اسلامی معاشرہ اور سیاست کا زوال شروع ہوا اور ہر طرف افراتفری، دینی انحطاط اور کساد بازاری کا دور دورہ ہوا تو اس وقت مشائخ نقشبندیہ نے بڑی ثابت قدمی اور جانفشانی کے ساتھ سلسلہ کی نشر واشاعت اور بقا کے لیے کام کیا۔ دہلی میں حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ (م ۱۷۸۱ء) اور حضرت شاہ غلام علیؒ (م ۱۸۲۴ء) نے آندھیوں کی زد پر اگر ایک طرف چراغِ ہدایت روشن کر رکھا تھا تو دوسری طرف حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے لائق جانشینوں نے علمِ دین کی شمع جلا رکھی تھی، نقشبندیت کی ترویج اور اس کا فیضان دہلی کے باہر ہندوستان کے دوسرے گوشوں میں پھیلانے کا کام جتنا حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ کے ہاتھوں ہوا اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکے گی۔ اگر چہ آپ خود پایہ تخت دہلی ہی میں متمکن رہے مگر اپنے خلفاء کی ایک بڑی تعداد ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچادی،

ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ اور خطہ محروم رہا ہو جہاں آپ کا کوئی جانشین اور خلیفہ نہ پہنچا ہو۔ دہلی میں اسلامی حکومت ختم ہونے کے بعد اسلامی تہذیب وتمدّن، علم وفن اور روحانی تربیت کے مراکز پایۂ تخت سے منتقل ہوکر متعدد ریاستوں میں قائم ہو گئے تھے جن میں حیدر آباد، رام پور اور ٹونک قابلِ ذکر ہیں، انھیں اسلامی ریاستوں میں سے بھوپال کی تقدیر نے بھی یاوری کی جہاں ۱۸۱۷ء میں حضرت شاہ غلام علی قدس سرہ کے خلفاء کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی حضرت شاہ رؤف احمد رافتؒ تشریف لائے۔

شاہ رؤف احمد رافتؒ

حضرت شاہ رؤف احمد رافتؒ (۱۷۸۶ء تا ۱۸۳۷ء) نسباً اور نسبتاً اوّل سے آخر تک مجددی تھے، آپ کا سلسلۂ نسب چار واسطوں سے حضرت خواجہ محمد یحییٰؒ (م ۱۶۸۴ء) فرزند حضرت مجدد الف ثانیؒ اور سلسلۂ طریقت چار واسطوں سے حضرت خواجہ محمد معصوم (م ۱۶۶۸ء) فرزند و خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ تک پہنچتا ہے[1] شاہ رؤف احمدؒ نے حدیث اپنے ماموں شاہ سراج احمد (م ۱۸۱۴ء) شارح ترمذی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ (م ۱۸۲۴ء) سے پڑھی اور طریقت کی تعلیم اپنے سلسلہ کے نامور شیخ شاہ درگاہی نقشبندی رامپوریؒ (م ۱۸۱۱ء) سے حاصل کر کے دہلی آئے اور یہاں حضرت شاہ غلام علی قدس سرہٗ کی خدمت میں رہ کر مکمل کیا چنانچہ خلافت شاہ غلام علیؒ ہی نے عنایت فرمائی اور انھیں کے ایماء پر آپ بھوپال آکر قیام پذیر ہوئے۔ شاہ صاحبؒ کی بارگاہ میں آپ کو بڑی خصوصیت اور قربت حاصل تھی حتیٰ کہ شیخ کو اپنے جن خلفاء پر فخر تھا ان میں سے ایک شاہ رؤفؒ احمد بھی تھے۔

شاہ رؤف احمدؒ کو شعر وسخن سے بھی لگاؤ تھا اور اس سلسلہ میں آپ شیخ قلندر بخش جرأتؔ کے شاگرد تھے۔ کلّیات رأفتؔ آپ کی یادگار ہے۔ اس کے علاوہ آپ صاحبِ تصانیف بھی تھے چنانچہ حضرت شاہ غلام علی صاحب مجدّدیؒ کے ملفوظات کا مجموعہ درالمعارف، اور آپ کے حالات میں 'جواہر علویہ' کے نام سے کتابیں آپ نے مرتب فرمائی تھیں۔ ان کے علاوہ تفسیر رؤفی، ارکانِ اسلام، مثنوی اسرار غیب، مکتوبات فارسی، مثنوی یوسف زلیخا ہندی، مثنوی سراپا سوز، رسالہ صادقہ مصدوقہ، مراتب الوصول، سلوک العارفین، معراج نامہ، شرابِ رحیق، مولود شریف، فقہ ہندی،

---

[1] صحبتے با اہلِ دل، مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۴

اور مجموعہ اوراد ماثورہ آپ کے علمی آثار ہیں، ان میں سے اکثر مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ بھی ہیں۔

شاہ رؤف احمدؒ نے ۱۸۳۶ء میں سفرِ حج کا ارادہ کیا اور بھوپال ہی سے احرام باندھ کر روانہ سفر ہوئے۔ ۲۷/ ذی قعدہ ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء کو آپ کا جہاز بادبانی بندر لیٹ پہنچا جہاں آپ نے ایک مختصر علالت کے بعد بحالتِ احرام وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ کے سن وفات میں اختلاف ہے، یہاں ہم نے صحبتے با اہل دل کے مؤلف کے بیان کردہ سن وفات کو لائق ترجیح قرار دیا ہے[1]۔ شاہ صاحبؒ کے پسماندگان میں دو صاحبزادے تھے جن میں سے ایک شاہ خطیب احمدؒ صاحب اور دوسرے شاہ حسیب احمد صاحبؒ تھے۔

شاہ خطیب احمد صاحبؒ

آپ کی ولادت ۱۹/ رمضان ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء کو ہوئی، تعلیم و تربیت اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور سلوک کی منازل بھی انہی سے طے کیں۔ سفر و حضر میں آپ ہمیشہ اپنے والد ماجد کے ساتھ رہا کرتے تھے اسی لیے آخری سفرِ حج میں بھی آپ ہی ساتھ تھے۔ والد ماجد کی وفات کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور بھوپال میں مستقلاً قیام اختیار فرمایا، سلوک میں اعلیٰ مقام پر فائز اور باطنی کمالات سے آراستہ تھے، نہایت متبع شریعت، زاہد شب زندہ دار اور مشائخ کی نسبت عالیہ کے امین تھے، اپنے اسلاف اور بزرگوں کے نقش قدم پر ساری عمر چل کر ۱۸۴۹ء میں بیالیس سال کی عمر میں وفات پائی اور بھوپال ہی میں مدفون ہوئے[2]۔

حضرت شاہ خطیب احمدؒ کے دو صاحبزادے تھے، ایک محمد ابوالبرکاتؒ جن کی وفات مدینہ منورہ میں ہوئی اور دوسرے حضرت شاہ ابواحمد صاحبؒ قدس سرہ تھے جو صاحب تذکرہ حضرت مولانا لکھنویؒ کے شیخ تھے اور ان عناصر ثلاثہ میں سے ایک تھے جن کی تربیت اور صحبت نے حضرت لکھنویؒ کی شخصیت کو سنوارا، نکھارا اور جلا بخشی تھی، پیر اور مرشد دونوں ہی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔ پیر جود و عطا میں ممتاز اور مرید اخذ و کسب میں مستعد و آمادہ، ایک طرف فیوض و برکات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اور دوسری طرف حقیقی تشنگی اور طلب صادق رکھنے والا اللہ کا ایک بندہ۔ اگر اس حسین امتزاج سے معرفت کی شراب ناب دو آتشہ نہیں بلکہ سہ آتشہ بن کر نکلی تو کیا تعجب ہے۔ **وَاللہ یعطی من یشاء بغیر حساب۔**

---

۱ صحبتے با اہلِ دل، ص ۲۷، تذکرہ علماء ہند مترجمہ ۹۹-۱۹۸، تذکرہ کاملانِ رام پور، ص ۱۴۳ تا ۱۴۷

۲ صحبتے با اہلِ دل، ص ۲۸

اس مقام پر دل چاہتا ہے کہ حضرت مولانا شاہ ابو احمد صاحب نقشبندی مجددیؒ کے حالات ذرا تفصیل کے ساتھ لکھے جائیں تاکہ اس محسن جلیل کی طیب و طاہر اور متوکل علی اللہ زندگی کے بصیرت افروز واقعات ہمارے لیے ایک اسوہ بن سکیں ممکن ہے کہ اس دریائے فیض کے چند قطرے کسی کی مرجھائی ہوئی کشتِ دل کو سیراب کر کے سرسبز و شاداب کر دیں اور وہ اپنی مراد کو پہنچ جائے۔

شیخ کامل مرشد وقت حضرت مولانا شاہ ابو احمد صاحب قدس سرہٗ

اس دور آخر میں جبکہ ہر طرف قحط الرجال ہے آپ کی ذات اقدس بڑی بابرکت اور ذریعہ حصولِ سعادت تھی، حضرت لکھنویؒ کو آپ ہی سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل تھا آپ کی پیدائش ۱۱ ررمضان المبارک ۱۲۶۰ھ-۱۸۴۴ء میں بھوپال میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وہیں رہ کر حاصل کی، آپ کے والد ماجد شاہ خطیب احمدؒ کا جب وصال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر صرف چھ سال کی تھی اس لیے آپ اُن سے کچھ استفادہ نہ کر سکے البتہ جب آپ سنِ شعور کو پہنچے تو مدینہ منورہ جا کر حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجدّدی مہاجر مدنیؒ (م ۱۸۷۸ء) سے جو آپ کے حقیقی پھوپھا اور رشتہ میں چچا ہوتے تھے کسبِ فیض کیا اور سلوک و معرفت کی تعلیم حاصل کی چنانچہ آپ نے مدینہ منورہ میں اٹھارہ ماہ قیام کر کے تکمیل سلوک کی اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنیؒ سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجدّدیؒ (م ۱۸۶۰ء) کے چھوٹے بھائی تھے اور شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلویؒ (م ۱۹۴۶ء) کے نہایت ممتاز تلامذہ میں سے تھے اور ہندوستان کے نامور اساتذۂ حدیث میں سے تھے۔ آپ کے شاگردوں میں قطب الاقطاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۹۰۵ء) حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ (م ۱۸۸۰ء) اور دوسرے علماء و مشائخ حدیث ہیں، ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں پہلی جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی تو وقتی طور پر اُسے کامیابی نہیں حاصل ہوئی جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت اور بھی مستحکم ہوگئی جس سے اسلامی سلطنت کا رہا سہا شیرازہ بھی منتشرہ ہوگیا، ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر شاہ عبدالغنی صاحب ہندوستان سے مدینہ منورہ ہجرت کر گئے اور بقیہ ساری عمر وہیں گذار دی، اس طرح تمام عمر درس و تدریس اور تعلیم و تربیت میں مشغول رہ کر ۶ رمحرم الحرام ۱۲۹۶ھ-۱۸۷۸ء کو آپ کی وفات ہوگئی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔[1]

---

[1] حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مجددیؒ کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی مؤلفہ علامہ محسن ترہتیؒ مطبوعہ جید پریس، دہلی ۱۳۴۹ھ

اتباعِ سنت اور استغناء

حضرت شاہ ابو احمد صاحب قدس سرہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ پیر ابو احمد صاحبؒ اپنے عہد کے مشائخ کبار میں سے تھے اور اس آخر دور میں کم سے کم ہندوستان میں نسبتِ مجدد کا ان سے بڑھ کر مظہر اور اس طریقہ کے کمالات وعلوم اور معارف وحقائق کا ان سے بڑھ کر عارف وترجمان نظر نہیں آتا۔ وہ غایت درجہ میں سنت کے متبع اور آدابِ طریقت کے امین ومحافظ تھے، تجرید وتفرید، تبتل وانقطاع، اہل دنیا سے بے رغبتی امراء واہل دول سے بے تعلقی اور زہد وقناعت میں دور دوران کی نظیر نہیں ملتی تھی[1]''

شاہ صاحبؒ کی پوری زندگی سنتِ نبوی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، آپ سنت کے عامل ہی نہیں بلکہ اس کے حریص تھے، ادعیۂ ماثورہ اور اذکار مسنونہ کا بے حد اہتمام فرماتے تھے، زیادہ اوقات اذکار واشغال اور مراقبات میں گذارتے تھے، ہر چیز میں اتباعِ سنت کو مقدم رکھتے تھے، اپنے معمولات کا بہت اہتمام رکھتے تھے، روزانہ ختم خواجگان اور ختم حضرت مجدّد اور دوسرے بزرگوں کے ختمات کا معمول تھا، بعد نماز فجر اور بعد نماز ظہر تلاوت قرآن مجید فرماتے تھے، بہت تھوڑا سا وقت چاشت کے بعد اور بہت تھوڑا وقت نماز عصر کے بعد لوگوں سے بات کرنے کے لیے رکھا تھا[2] شرعی امور میں ادنیٰ سی بھی لچک گوارہ نہ تھی اور فوراً چہرے سے آثار جلال ظاہر ہو جاتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بڑی توجہ اور رعایت سے بھی کام لیتے تھے۔

حضرت کے معمولات میں سے ختم خواجگان کا معمول بہت اہم تھا اس میں ناغہ کرنا کبھی پسند نہ فرماتے تھے اسی لیے عام علماء ومشائخ کی روش سے ہٹ کر بس ایک جگہ یعنی بھوپال میں جم کر بیٹھ گئے تھے اور یہیں اپنی خانقاہ شریف میں تزکیۂ نفس اور خدمت خلق میں ساری عمر مصروف رہے، یہی وجہ ہے کہ سفر سے بہت گریز کرتے تھے کیونکہ اس سے اذکار ومعمولات میں بڑا خلل واقع ہوتا تھا۔ اپنے اکابر مشائخ نقشبندیہ کے عام شیوہ کے مطابق مکتوبات امام ربانی کی تعلیم اور مطالعہ آپ کی خانقاہ میں بھی بہت اہمیت رکھتا تھا اور خود آپ بھی ان مکتوبات کے اسرار وحکم کے

---

[1] صحبتے با اہلِ دل، ص ۲۹-۲۸ [2] شجرۂ طیبہ، ص ۲۹

شناسا اور علوم و معارف کے اس بحرِ بے کنار کے غواص تھے، زندگی کے آخری زمانے میں دنیا سے یکسوئی، انقطاع اور اتباعِ سنت و تعلق مع اللہ بہت بڑھ گیا تھا۔ یہ اسی خاندان کی برکت تھی کہ بھوپال جو اُس زمانے میں ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے معروف تھا، دینی و علمی سرگرمیوں کا بھی گہوارہ بنا ہوا تھا۔ نواب جہانگیر محمد خاں سے لے کر نواب حمید اللہ خاں تک تمام اراکین شاہی اور بیگمات وغیرہ اسی خاندان سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے تھے۔ جب اعیانِ ریاست کا یہ حال تھا تو عوام کا پوچھنا ہی کیا، یہی وجہ ہے کہ بھوپال اور اس کے قرب و جوار میں ایک دینی شعور اور پاکیزہ ماحول پیدا ہو گیا تھا جس کا اثر اب تک کچھ نہ کچھ باقی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو اتباعِ شریعت کا اتنا لحاظ تھا کہ باوجودیکہ حضرت مجددؒ قدس سرہٗ سے نسبی اور روحانی دونوں تعلق تھا مگر عرس کے موقع پر سرہند کبھی تشریف نہیں لے گئے اور نہ ہی اپنے متوسلین کو اس کی ترغیب دی۔

قناعت پسندی کا عالم یہ تھا کہ کبھی تحائف و نذرانے قبول نہ فرماتے تھے والیِ ریاست نواب سلطان جہاں بیگم اور نواب شاہ جہاں بیگم حضرت سے بیحد عقیدت رکھتی تھیں اور خانقاہ شریف میں حاضر ہونے کی اجازت چاہا کرتی تھیں مگر اکثر محروم رہتی تھیں۔ گذر بسر کے لیے بس وہ رقم تھی جو ریاست سے خانقاہ شریف کو ملتی تھی یا پھر زراعت سے جو کچھ میسر ہوتا تھا وہ کام آتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے صاحبزادے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی (م ١٩٧٠ء) کو خلافت اور جانشینی سے مفتخر فرماتے وقت جو نصیحت فرمائی تھی وہ استغناء اور توکل کے باب میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے، آپ نے فرمایا:

> "بیٹے ذرا بھی دنیا کی عزت نہ کرنا، میں نے اور تمھاری والدہ نے کدوا بال ابال کر کھائے لیکن دنیا والوں کی کبھی پرواہ نہ کی، اسی پر استقامت کرنا، اللہ تم کو برکات سے مالا مال فرمائے گا۔"[1]

یہ عجیب اتفاق ہے اور بعد کی آنے والوں نسلوں کے لیے بڑی محرومی کی بات ہے کہ ایسے جلیل القدر اور متبع سنت شیخ کامل کے حالات و کمالات اور ان کے ملفوظات و افادات سے متعلق کوئی کتاب اس وقت تک نظر سے نہیں گذری ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری معلومات کا محدود ذریعہ صرف دو چیزیں ہیں ایک تو حضرت لکھنویؒ کا وہ تعزیتی مضمون جو آپ نے النجم (دورِ جدید) بابت محرم ١٣٤٣ھ میں شائع فرمایا تھا اور دوسرے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وہ کتاب جو

---

[1] صحبتے با اہلِ دل، ص ٤٨

'صحبتے با اہلِ دل' کے نام سے شائع ہوئی ہے جس میں ضمناً حضرت شاہ صاحب کے احوال بھی درج ہیں۔ مولانا سیّد سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ء) کے بڑے بھائی مولانا سید ابوحبیب دسنویؒ[1] (م ۱۹۲۷ء) نے جوکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے آپ کے حالات پر مشتمل ایک مجموعہ 'معارفِ مجددیہ' کے نام سے مرتب کیا تھا مگر وائے افسوس کہ وہ مرتب کی حیات میں ہی کہیں ضائع ہوگیا اور شائع نہیں ہوسکا۔

مرض الموت اور وفات

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض محبوب بندے جن پر فنائیت اور اخفاءِ حال کا غلبہ زندگی میں رہتا ہے ان کا جب اس دارِ فانی سے رخصت ہونے کا وقت موعود آتا ہے تو اضطراری طور پر ان کے کچھ کمالات و مقامات کا اظہار ہوجاتا ہے جو دوسروں کے لیے سرمایۂ عبرت بن جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے سلسلہ میں بھی کچھ ایسے ہی حالات پیش آئے تھے جو تحریر کیے جاتے ہیں۔

جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں جب مرض الموت کا غلبہ ہوا اور علالت نے کافی شدت اختیار کرلی تو بار بار دن اور وقت کے بارے میں پوچھتے، ایک دن اچانک فرمایا السلام علیکم، پھر کچھ گردن سے اشارہ کرتے ہوئے آبدیدہ ہوکر فرمایا:

'کہاں میرا یہ کثیف سینہ و جسم اور کہاں یہ قدم مبارک!'

پھر مسواک طلب فرمائی، طشت میں پانی منگوایا اور بار بار دہن مبارک اور پیشانی کو تر کیا۔ اس پر مولانا محمد یحییٰ قاضی ریاست نے فرما کہ یہ سنت بھی ادا ہوگئی، پیاس کی بڑی شدت تھی، زمزم

---

[1] مولانا سیّد ابوحبیب صاحب دسنویؒ مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے بڑے بھائی تھے اور ان سے عمر میں اٹھارہ سال بڑے تھے۔ دسنہ ضلع پٹنہ میں طبابت کرتے تھے، بدعات سے سخت نفرت تھی اور سنت سے اس قدر شغف تھا کہ حضرت شاہ ابواحمد صاحب بھوپالیؒ کو جب تک اس نقطۂ نظر سے خوب دیکھ اور پرکھ نہ لیا اس وقت تک اپنی ارادت کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ آپ نے اپنے سلسلۂ نسب کے افراد کی پوری تاریخ فارسی زبان میں لکھی تھی مگر وہ شائع نہ ہوسکی۔ مولانا نے دسنہ کی مسلمان خواتین کی دینی اصلاح کی خاطر ہفتہ وار مجلس وعظ کا سلسلہ قائم کیا تھا جس میں تقویۃ الایمان کے اسباق پڑھاتے تھے۔ مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے ابتدائی اور بنیادی تربیت اپنے انہی بزرگ بھائی سے حاصل کی تھی، ۱۹۲۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ مولوی سیّد ابوظفر ندوی آپ کے صاحبزادے تھے۔ (مکتوب جناب سیّد شہاب الدین دسنوی بنام راقم)

شریف نوش فرمایا پھر دو چار جھٹکے سے لگے جس سے آپ کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی، پھر فرمایا، ابھی بعض اخوان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔اور پھر سکوت ہو گیا۔

وفات سے چند روز پہلے تک تمام معمولات جاری رہے، نماز کا اسی طرح کھڑے ہو کر طول قرأت کے ساتھ پڑھنا، قرآن مجید کی دونوں وقت تلاوت کرنا، ختم خواجگان کی پابندی، ہفتہ میں دو دن کے روزے غرض سب کام اسی شان پر جاری تھے، جب بالکل معذور ہو گئے تو بیٹھ کر اور پھر بعد میں لیٹ کر نماز پڑھنے لگے آخیر وقت تک کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔ اتباع سنت کی حرص تو گویا خمیر میں داخل ہو چکی تھی۔ آخر وقت میں جب بار بار پانی میں ہاتھ تر کر کے چہرہ مبارک پر پھیرتے جاتے تھے تو اس وقت یہ دُعا ورد زبان تھی اللھم اغفرلی وارحمنی والحقنی بالرفیق الاعلیٰ اسی حالت میں یہ کلمات بھی زبان سے ادا ہوتے سنے گئے۔ ''یا اللہ میرے گناہوں پر پردہ ڈال دے اور اپنی مغفرت میں چھپا لے۔'' قاضی محمد یحییٰؒ سے فرمایا کہ قاضی صاحب! اگر کوئی سنت اس وقت کی رہ جائے تو مجھے بتلا دیجئے گا، وفات سے پہلے ہر شخص سے بار بار یہ پوچھتے تھے کہ کہ پنجشنبہ کا دن کب ہے، مخصوص خدام کو یہ سوال سن کر ہی کھٹکا ہو گیا تھا اور سمجھ گئے تھے کہ شاید حضرت کا وصال پنجشنبہ ہی کے دن ہو گا کیونکہ اس قسم کے امور بعض اولیاء اللہ کو الہام کر دیئے جاتے ہیں۔[1]

۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ پنجشنبہ کے دن صبح کو وصیّت نامہ کی تکمیل کا حکم دیا چنانچہ حسب ہدایت وصیت نامہ مرتب کیا گیا، ظہر کی نماز ادا فرمائی، دو بجے دن کو دہلی سے حاذق الملک حکیم اجمل خاں (م ۱۹۲۷ء) حسب الطلب تشریف لائے، مزاج کا حال دریافت کیا تو فرمایا۔ اب مزاج کہاں ہے۔ پھر حکیم صاحب نے دوا دینے کی اجازت چاہی تو فرمایا اب دوا کی ضرورت نہیں۔ نماز عصر کی تیاری کا وقت تھا کہ ایک دم کچھ حرکت فرمائی اور نہایت آہستگی سے کچھ فرماتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ واقعہ ۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۷ر دسمبر ۱۹۲۳ء روز پنجشنبہ ساڑھے چار بجے دن کا ہے۔ سن ولادت ۱۲۶۰ھ کے مطابق آپ کا تاریخی نام ''مروج الشریعہ'' ہے اور مدت عمر لفظ ''امام'' سے ظاہر ہوتی ہے یعنی بیاسی سال اور ''امام مروج الشریعہ'' سے سن وفات نکلتا ہے۔

---

[1] ماہنامہ النجم (دور جدید) محرم، ۱۳۴۳ھ

وصیّت

اخیر وقت میں جو وصیت نامہ آپ نے مرتب کروایا تھا اس میں مہتم بالشان وصیّت یہ تھی کہ میرا جنازہ بالکل سادہ رہے، تزک و احتشام بالکل نہ ہو قبر بالکل خام ہو اور اونچی نہ ہو، جگہ بھی خود ہی وہ تجویز فرمائی کہ تواضع و خاکساری اس پر برس رہی ہے، یہ بھی وصیّت فرمائی کہ قبر پر روشنی اور آرائش بالکل نہ ہو، تیجہ، دسواں، بیسواں، اور چالیسواں نہ کیا جائے عرس اور میلہ نہ ہو، فرمایا کہ جب تم لوگوں کا دل ایصالِ ثواب کو چاہے تو کھانا پکوا کر طلباء اور مساکین کو کھلا دینا اور قرآن شریف پڑھ کر ثواب پہنچا دینا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور دوسرے مقامات پر بھی آپ کے خدا نے آپ کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔[1]

خلفاء و مسترشدین

حضرت شاہ صاحبؒ کے خدام و مسترشدین کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں شافعی المسلک حضرات بھی تھے لیکن آپ نے خلافت بہت کم اور مخصوص ہی حضرات کو عطا فرمائی تھی جن میں صاحب تذکرہ ہٰذا امام اہلسنّت حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ کے علاوہ مولانا قاضی محمد یحییٰؒ (م ۱۹۳۱ء) قاضی ریاست بھوپال، مولانا حکیم سیّد ابو حبیب دسنویؒ (م ۱۹۲۷ء) شمس العلماء قاضی عبید اللہ مدراسی[2] مولانا قاضی محمود محی الدین ابن قاضی بدر الدولہ مدراسیؒ، مولوی مشتاق احمد[3] اور صاحبزادہ و جانشین محترم حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی نقشبندیؒ (م ۱۹۷۰ء) کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔

---

۱ ماہنامہ النجم (دورِ جدید) لکھنؤ، محرم ۱۳۴۳ء

۲ قاضی عبید اللہ بن مولانا صبغۃ اللہ مدراسی ۱۸۵۳ء میں مدارس میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی، آپ کے اساتذہ میں مدار العلماء شیخ عبد الوہابؒ، شیخ علی رضاؒ اور شمس العلماء مولانا سیّد محمد اسحٰقؒ تھے، اپنے وطن میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام مدرسہ محمدیہ تھا، تمام عمر اسی میں درس کا سلسلہ قائم رکھا، فقہ اور علم حدیث میں آپ کو خصوصی مہارت و ذوق تھا۔ آخر عمر میں اسی علاقہ کے قاضی مقرر کیے گئے۔ ان اطراف میں آپ کے فتاویٰ کو بڑی قبولیت حاصل تھی، حکومت وقت نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب بھی انہی خدمات کے صلہ میں دیا تھا۔ تقریباً بائیس کتابوں کی تصنیف آپ کی طرف منسوب ہے جن میں رسالہ النحو رسالہ فقہ شافعی، رسالہ سیرت النبیؐ، رسالہ تکفیر منکرین معراج جسمانی و منکرین نزول عیسیٰ، تحفۃ الزائرین اور مجموعہ فتاویٰ شافعیہ مشہور ہیں۔ ربیع الاوّل ۱۳۴۶ھ (۱۹۲۷ء) میں بمقام مدراس وفات پائی اور مقبرہ والاجاہی میں دفن ہوئے۔ (نزہۃ الخواطر، جلد ۸، ص ۳۰۰-۳۰۱

۳ نشانِ منزل (پندرہ روزہ) بھوپال، ۱۵ اگست ۱۹۷۰ء

نواں باب

بیعت وارشاد، تعلیمات اور اصلاح باطن

حسن اتفاق سے حضرت لکھنویؒ اوائل عمر ہی سے نقشبندی سلسلہ کے مختلف بزرگوں سے کسی نہ کسی طرح منسلک اور متعلق رہے تھے، گھر اور باہر ہر طرف سے یہی سلسلہ آپ کا احاطہ کیے ہوئے تھا جبکہ باضابطہ بیعت کا تعلق بہت بعد میں ہوا، سب سے پہلے جس سایۂ عاطفت میں آپ نے آنکھ کھولی وہ آپ کے والد ماجد مولوی حافظ ناظر علیؒ تھے جو نقشبندی سلسلہ میں حضرت مولانا عبد السّلام صاحب ہنسویؒ سے بیعت و مجاز تھے۔ اسی تعلق کی بنا پر شاہ عبد السّلام صاحبؒ نے مولاناؒ پر توجہ بھی فرمائی تھی اور فرمایا تھا کہ ''بیج ڈال دیا گیا ہے انشاء اللہ بارآور ہوگا۔'' دوسری طرف آپ کے سب سے زیادہ مشفق استاذ حضرت مولانا سیّد عین القضاۃؒ تھے جو اسی سلسلۂ نقشبندیہ میں شیخ موسیٰ جی ترکیسریؒ کے خلیفہ و مجاز تھے۔ یہ بھی حُسن اِتفاق ہی ہے کہ جس زمانے میں آپ کا قیام دہلی میں تھا اُس زمانے میں مولانا شاہ ابوالخیر صاحب دہلویؒ کی خدمت میں بھی آپ کی آمد و رفت بہت تھی، اِسی وجہ سے آپ نے اپنی اہلیہ صاحبہؒ کو شاہ ابوالخیر صاحب قدس سرہٗ سے بیعت بھی کرایا تھا، شاہ صاحبؒ بھی اسی سلسلہ کے ایک جلیل القدر شیخ تھے۔ اس طرح شروع ہی سے کچھ ایسا ماحول بنتا چلا آرہا تھا کہ جس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ قدرت کا منشاء اور اکابرین نقشبندیہ کا روحانی مطالبہ یہی ہے کہ آپ بھی اسی سلسلہ سے باضابطہ طور پر منسلک ہو جائیں، اسی لیے جب آپ کے بیعت ہونے کا وقت آیا تو قدرتِ کاملہ نے محض اپنے فضل و کرم سے آپ کو امام مروج الشریعہ حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب بھوپالی نور اللہ مرقدہ کے دامن عاطفت سے وابستہ کر دیا۔ اس بات کو خود ایک موقع پر لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے حضرات نقشبندیہ مجددیہ کے تین بلند پایہ بزرگوں کی صحبت عطا فرمائی اور تینوں کا سلسلہ حضرت مولانا شاہ غلام علی صاحب قدس سرہ سے ہے۔ اول حضرت

والدی الماجد رحمۃ اللہ علیہ، دوم حضرت مولانا سید محمد عین القضاۃ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور سوم حضرت ولی مرشد وسیلتنا الی اللہ الصمد حضرت مولانا شاہ عبداللہ ابواحمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیعت صرف انہیں سے تھی[1]۔"

اسی مضمون کو ذرا مختلف انداز سے ایک دوسرے مقام پر اس طرح تحریر فرماتے ہیں:-

"میرے عقائد وہی ہیں جو مولانا سید عبدالسلام صاحب نقشبندی مجددیؒ نے حضرت والد مرحوم کو تعلیم فرمائے تھے اور والد مرحوم نے بچپن سے مجھے سکھائے تھے، وہی مجھے امام ربانیؒ کے مکاتیب سنا کر عبارتیں اور مفہوم یاد کرایا کرتے تھے، ان میں سے بعض اب تک دل پر نقش ہیں۔ پھر میں نے اپنے ان استاذ کے بھی وہی عقائد پائے جن سے میں نے فقہ، اصول فقہ اور تفسیر جلالین وغیرہ پڑھی تھی اور وہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد تھے، پھر جب میں لکھنؤ میں حاضر ہوا اور توفیق الٰہی نے مولانا (مولانا سید محمد عین القضاۃؒ) کے آستانہ فیض کاشانہ پر پہونچایا تو انھیں بھی ان ہی باتوں کا مؤید و معتقد پایا[2]۔"

بیعت

ان تمام شواہد سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مولاناؒ پر شروع ہی سے مشائخ نقشبندیہ کے الطاف وکرم تھے اور مشیت نے یہ طے کر دیا تھا کہ آپ بھی اسی سلسلہ سے منسلک ہو جائیں۔ شیخ کامل کی تلاش وجستجو ہمیشہ رہی، اس دور کے جو بھی مشائخ اور اہل اللہ تھے ان میں سے ہر ایک کی خدمت میں باریابی حاصل تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ ان حضرات کی بے پناہ محبت وشفقت بھی شریک حال رہی، بعض بزرگوں سے بیعت ہونے کے لیے کچھ دل میں آیا بھی مگر اس کی نوبت نہ آسکی۔ مثلاً ایک زمانے میں حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ (م ۱۹۲۷ء) کی جانب کچھ طبیعت مائل ہوئی مگر پھر کچھ مصروفیات ایسی حائل ہوئیں کہ اس داعیہ کا تکملہ نہیں ہو سکا، ایک دور وہ بھی آیا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ (م ۱۹۲۷ء) کی طرف میلانِ طبع ہوا۔ حضرت سہارنپوریؒ سے تو بڑے ہی مخلصانہ اور گہرے تعلقات تھے، وہ بھی آپ کا بے حد خیال رکھتے تھے اور بڑی محبت کا برتاؤ کرتے تھے اور آپ کی جلالت علمی کے بھی بہت معترف تھے چنانچہ امروہہ ضلع مرادآباد

---

[1] شجرۂ طیبہ، ص ۳۳ [2] ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ، اہل سنت نمبر، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

کے معرکۃ الآرا مناظرہ میں حضرت سہارنپوریؒ بہ نفس نفیس خود آپ کی معیت میں شریک ہوئے تھے اور آپ کی معاونت فرمائی تھی۔ اس موقع پر یہاں تک فرمایا تھا کہ "ان کی جیت میری جیت اور ان کی ہار میری ہار ہے[1]۔"

یہ سب کچھ سہی مگر قضا و قدر نے یہ دولت تو کہیں اور سے مقدر کر رکھی تھی لہٰذا ایک اتفاقی ضرورت سے ۱۹۲۱ء میں بھوپال جانا ہوا اور خانقاہ عالی جاہ مجددیہ میں پہنچنا ہوا اور اسی سفر میں حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب مجددی نقشبندی قدس سرہٗ العزیز سے بیعت کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے ارادت کا تعلق تو عرصہ سے تھا اور جب بھی بھوپال جانا ہوتا تو قیام خانقاہ شریف ہی میں ہوتا تھا مگر بیعت کا تعلق اس سفر سے پہلے نہ تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے بیعت ہونے کا واقعہ بھی خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"اس خاکسار کے داخل سلسلہ ہونے کا واقعہ بھی عجیب و غریب ہے، ایک غیبی سامان پیش آیا کہ چار و ناچار حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھتے ہی بڑے لطف و کرم سے فرمایا کہ آپ کے آنے کے لیے میں دعائیں مانگا کرتا تھا پھر نہایت لطف و کرم کے ساتھ یہ شعر زبانِ مبارک سے ادا فرمایا:

وصل کی مانی تھیں کیا کیا منتیں — چھلّے درگاہوں میں بندھواتے تھے ہم

شب کو بعد نماز عشاء اپنے پاس اس گنہگار کا بستر بچھوایا اور اس وقت اس ناچیز کو سنا کر مگر دوسروں سے مخاطب ہو کر کئی بار یہ شعر پڑھا:

ہم نہ ہوں گے تو پھر پچھتائے گا — مفت تیرے ہاتھ سے جاتے ہیں ہم

اس ناچیز نے سمجھ لیا کہ مقصود میں ہی ہوں، زہے قسمت، مگر پھر بھی بمقتضائے احتیاط نماز استخارہ پڑھی، دل کو حضرت ممدوح کی طرف مائل پاکر نماز فجر سے پہلے عرض کیا کہ حضرت مجھے بھی داخل سلسلہ کر لیجیے، اس پر بڑی عنایت اور دل رُبا تبسم کے ساتھ فرمایا کہ بہت اچھا، نماز فجر پڑھ لیجیے:

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس مکتبِ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی[2]"

خوش نصیبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی کہ خود مطلوب کی نظر کرم طالب پر ہو جائے،

---

[1] حیاتِ خلیل، حصہ دوم، ص ۵۳۸ [2] ماہنامہ النجم (دورِ جدید) لکھنؤ، محرم ۱۳۴۳ھ

درحقیقت بعض مخصوص بندوں کو رحمتِ حق خود تلاش کرتی ہے اور بعض خود تلاش و جستجو کر کے رحمت حق کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح طریقت کی دنیا میں بعض سعید روحیں مرید ہوتی ہیں اور بعض مراد ہوتی ہیں۔ مرید تو اپنی طلب و جستجو کے مطابق شیخ کامل کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور پھر جب کوئی نظر میں آجاتا ہے تو اپنا مدعا پیش کرتا ہے شیخ اگر اس میں طلب صادق دیکھتا ہے تو قبول کر لیتا ہے ورنہ کسی لطیف انداز سے آئندہ کے لیے مؤخر کر دیتا ہے۔ مراد کے مصداق وہ حضرات ہوتے ہیں جن کو اپنے دامن میں ڈھانک لینے کے لیے شیخ خود متمنی اور آرزومند ہو۔ بڑا عظیم فرق ہے ان دونوں حیثیتوں میں۔ مرید اور مراد کی نہایت عمدہ مثال حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خواجہ باقی باللہؒ کو مشیت الٰہی نے ہندوستان اسی غرض سے بھیجا تھا کہ وہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کو نقشبندی سلسلہ میں داخل کریں اور پھر ان کے ذریعہ ہندوستان میں اصلاحی کارنامے انجام پائیں۔

۱۹۲۱ء میں حضرت لکھنویؒ نے حضرت شاہ ابو احمد صاحب قدس سرہ سے بیعت فرمائی اور ۱۹۲۳ء میں حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات ہوگئی اس طرح کل ڈیڑھ پونے دو سال کا وقت ملا جس میں سلوک کی ساری منازل طے ہوئیں، وفات سے کچھ عرصہ قبل حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھنؤ کا سفر فرمایا تھا اور محلّہ ٹکیٹ گنج کی بڑی مسجد کے ایک کشادہ کمرے میں قیام فرمایا تھا، اسی سفر میں آپ کاکوری بھی تشریف لے گئے تھے اور اسی سفر میں آپ نے حضرت لکھنویؒ کو خلافت و اجازت بھی عطا فرمائی تھی اس طرح آپ نے اپنے سلسلہ کے پیرانِ عظام کی نسبتِ عالیہ کی امانتِ صادقہ ان کے سپرد فرمائی۔ لکھنؤ کے اس سفر کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ زیادہ دنوں حیات نہیں رہے اور ۱۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۳ء میں ان کی وفات ہوگئی۔

پیر سے محبّت اور تعلق

حضرت لکھنویؒ کو اپنے شیخ اور خانوادۂ شیخ سے بے حد لگاؤ تھا، ادب و احترام کی وجہ سے کبھی اپنے شیخ کا نام نہیں لیتے تھے، جب کبھی ذکر فرماتے تو ہمارے حضرت صاحب کہہ کر تذکرہ کرتے تھے، محبت و احترام کا یہی جذبہ شیخ کی اولاد کے ساتھ بھی تھا چنانچہ حضرت پیر ننھے میاں صاحب یعنی حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ (م ۱۹۷۰) کو جن کی عرفیت ننھے میاں تھی ہمیشہ

صاحبزادے صاحب، کہا کرتے تھے کبھی نام نہیں لیتے تھے۔ محبت کا عالم یہ تھا کہ آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالمومن فاروقی صاحبؒ ایک بار سخت بیمار ہوئے بیماری نے بڑا طول پکڑا اور ایک وقت ایسا آ گیا کہ ان کی زندگی کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی، اسی عرصہ میں حضرت شاہ محمد یعقوب صاحبؒ کی علالت کی خبر بھی بھوپال سے آئی، آپ سخت بے چین ہو گئے، اپنی اس بے چینی کا اظہار اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کیا ہے:

''اس درمیان میں حضرت صاحبزادے صاحب دامت برکاتہم کی سخت علالت کی خبر نے عبدالمومن کی علالت کو گویا فراموش کرا دیا۔ اگر چہ تار اور خطوط میں فی الجملہ افاقہ کی خبر ہے مگر طبیعت میری بہت پریشان ہے۔ آج مشتاق علی خاں[1] کو بھوپال بھیجا ہے، میں خود جاتا مگر یہاں کے بعض جدید حالات کی وجہ سے نہ جاسکا۔ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس مبارک سایہ کو ہم خدام کے سروں پر قائم رکھے، بڑا سہارا ہے، ارحم الراحمین رحم فرمائے[2]۔''

حضرت ننھے میں صاحبؒ جب کبھی لکھنؤ تشریف لاتے تو حضرت سے ملنے کے لیے دارالمبلغین ضرور آتے، اس موقع پر ادب و تعظیم کا منظر قابل دید ہوتا تھا، مولاناؒ کو ادباً ان کے سامنے بیٹھنے میں بھی تامل ہوتا تھا، نہایت انکساری کے ساتھ گفتگو فرماتے اور گھر کے سارے افراد کے لیے ان سے دعا کی درخواست کرتے۔ مولاناؒ کا معمول تھا کہ جب کبھی بمبئی کا سفر ہوتا بالخصوص حج کے سلسلہ میں تو جاتے ہوئے بھوپال ضرور اترتے تھے، خانقاہ شریف میں قیام ہوتا اور اپنے شیخ قدس سرہ کے مزار پر حاضری دے کر فاتحہ پڑھتے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں جب یہ راقم الحروف بھی حضرت لکھنویؒ کے ساتھ سفر حج کے لیے روانہ ہوا تو اسے بھی خانقاہ شریف اور مزار شریف کی

---

[1] مولوی مشتاق علی خاں صاحب تحصیل شاہ آباد ضلع ہردوئی یوپی کے رہنے والے تھے، فوج کے محکمہ میں اکاؤنٹینٹ تھے۔ تمام عمر شادی نہیں کی اسی لیے ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب مجددی نقشبندی بھوپالیؒ سے شرف بیعت حاصل تھا۔ چودھری جلیل الرحمان صاحب تعلقہ دار علی آباد ضلع بارہ بنکیؒ سے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد چودھری صاحب نے انھیں مستقل قیام کے لیے علی آباد ہی بلا لیا تھا۔ وہاں انھوں نے آبادی سے دور ایک مسجد اور ایک خانقاہ بنالی تھی جس کا نام ''خانقاہ شاہ ابواحمدیہ'' رکھا تھا۔ قرب و جوار کے مواضعات میں آپ کی وجہ سے لوگوں میں بڑی دینداری پیدا ہو گئی تھی۔ اسی خانقاہ میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ حضرت لکھنوی کو سال میں کئی بار وہاں بڑے اہتمام سے بلاتے تھے اور حضرت کو بھی وہاں جاکر بڑا سکون ملتا تھا۔ مولوی مشتاق علی خاں صاحب کا ۱۳؍مارچ ۱۹۶۳ء کو بوقت صبح چار بجے بعد نماز تہجد اپنے مصلے پر ہی انتقال ہو گیا اور اسی دن صبح کو خانقاہ شریف ہی میں ہزاروں آدمیوں کے ہاتھوں تدفین عمل میں آئی۔

[2] مکتوب بنام مولی مغیث الدین صاحب، سلطان پور، یوپی، مورخہ ۱۶؍ربیع الاوّل ۱۳۶۳ھ

زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اسی موقع پر حضرت نے راقم الحروف کو بھی حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ سے بیعت کرایا تھا۔

شجرۂ طریقت

حضرت لکھنویؒ نے شجرۂ طیبہ میں اپنے پیرانِ طریقت کی ترتیب حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تک اس طرح درج کی ہے:

نمبر شمار	اسمائے گرامی	وفات و مدفن
۱	نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	۱۲ربیع الاوّل ۱۱ھ میں وفات پائی اور مدینہ منورہ میں تدفین ہوئی۔
۲	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	۲۲/ جمادی الاخریٰ ۱۳ ھ میں وفات پائی اور روضۂ نبوی میں تدفین ہوئی۔
۳	حضرت سلمان فارسیؓ	۱۰/رجب ۳۵ھ میں وفات پائی اور مدائن (عراق) میں تدفین ہوئی۔
۴	حضرت امام قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ	۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۰۷ھ یا ۱۰۸ھ میں (بقول بعض) وفات پائی اور مدینہ منورہ میں تدفین ہوئی۔
۵	حضرت امام جعفر صادقؒ	۱۵/رجب اور بقول بعض ۱۶/شوال ۱۴۸ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔
۶	حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ	۱۴/شعبان ۲۶۱ھ میں وفات پائی اور بسطام (خراسان) میں تدفین ہوئی۔
۷	حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ	۱۵/رمضان ۴۲۵ھ یا ۱۰/محرم ۴۲۴ھ میں وفات پائی اور خرقان (نزد بسطام) تدفین ہوئی۔
۸	حضرت خواجہ ابوعلی فارمدیؒ	۴/ربیع الاول ۴۷۷ھ میں وفات پائی اور طوس میں تدفین ہوئی۔
۹	حضرت خواجہ ابویوسف ہمدانیؒ	۲۷/رجب یا صفر ۵۳۵ھ میں وفات پائی اور مرو میں تدفین ہوئی۔
۱۰	حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ	۱۲/ربیع الاول ۵۷۵ھ میں وفات پائی اور غجدوان (نزد بخارا) میں تدفین ہوئی۔
۱۱	حضرت خواجہ عارف ریوگریؒ	شوال ۶۱۶ھ میں وفات پائی اور ریوگر (نزد بخارا) میں تدفین ہوئی
۱۲	حضرت خواجہ محمود انجیر فغنویؒ	۱۷/ربیع الاول ۷۱۵ھ میں وفات پائی اور وابکنی (انجیر فغنہ) میں تدفین ہوئی۔

۱۳ حضرت خواجہ عزیزان علی رامیتنیؒ	۲۷/رمضان ۷۱۸ھ یا ۲۸/ذیقعدہ ۷۱۵ھ میں وفات پائی اور خوارزم میں تدفین ہوئی۔
۱۴ حضرت خواجہ محمد بابا سماسیؒ	۱۰ جمادی الاخریٰ ۷۵۵ھ میں وفات پائی اور قریہ سماسی میں تدفین ہوئی۔
۱۵ حضرت خواجہ سید امیر کلالؒ	۸/۱۵ جمادی الاخریٰ ۷۷۲ھ میں وفات پائی اور سوخار میں تدفین ہوئی۔
۱۶ حضرت خواجہ بہاؤالدین محمد نقشبندؒ	۳/ربیع الاول ۷۹۱ھ میں وفات پائی اور بخارا میں تدفین ہوئی۔
۱۷ حضرت خواجہ علاؤالدین عطارؒ	۲۰/رجب ۸۰۲ھ میں وفات پائی اور جغانیان میں تدفین ہوئی۔
۱۸ حضرت خواجہ یعقوب چرخیؒ	۵/صفر ۸۵۱ھ میں وفات پائی اور ہلغتون میں تدفین ہوئی۔
۱۹ حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ	۲۹/ربیع الاوّل ۸۹۵ھ میں وفات پائی اور سمرقند میں تدفین ہوئی۔
۲۰ حضرت خواجہ محمد زاہد ولیؒ	ربیع الاول ۹۲۲ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔
۲۱ حضرت خواجہ درویش محمدؒ	۱۹/محرم الحرام ۹۷۰ھ میں ماوراءالنہر میں وفات پائی۔
۲۲ حضرت خواجہ محمد امکنگیؒ	۲۲ شعبان ۱۰۰۸ھ میں وفات پائی اور مکہ معظمہ میں تدفین ہوئی
۲۳ حضرت خواجہ عبدالباقی باقی باللہؒ	۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ میں وفات پائی اور دہلی میں تدفین ہوئی۔
۲۴ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ	۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی اور سرہند میں تدفین ہوئی
۲۵ حضرت خواجہ محمد معصوم ملقب بہ عروۃ الوثقیٰؒ	۹ ربیع الاوّل ۱۰۷۹ھ میں وفات پائی اور سرہند میں تدفین ہوئی۔
۲۶ حضرت خواجہ سیف الدینؒ	۱۹ جمادی الاولیٰ ۱۰۹۸ھ میں وفات پائی اور سرہند میں تدفین ہوئی
۲۷ حضرت خواجہ سید نور محمد بدایونیؒ	۱۱ ذیقعدہ ۱۱۳۵ھ میں وفات پائی اور دہلی میں تدفین ہوئی۔
۲۸ حضرت میرزا مظہر جان جاناںؒ	۱۰ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ میں شہادت پائی اور دہلی میں تدفین ہوئی۔
۲۹ حضرت مولانا شاہ غلام علی مجددیؒ	۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی اور دہلی میں تدفین ہوئی۔
۳۰ حضرت مولانا شاہ ابوسعید مجددیؒ	یکم شوال ۱۲۵۰ھ میں وفات پائی اور دہلی میں تدفین ہوئی۔
۳۱ حضرت مولانا عبدالغنی محدث دہلوی مہاجر مدنیؒ	۷ محرم ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔
۳۲ حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحبؒ	۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ میں وفات پائی اور بھوپال میں تدفین ہوئی۔[1]
۳۳ حضرت مولانا شاہ محمد عبدالشکور فاروقیؒ	۱۷ ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں وفات پائی اور لکھنؤ میں تدفین ہوئی۔

---

[1] شجرۂ طیبہ اور دوسری کتابوں میں پیرانِ طریقت کے سنین وفات میں بہت اختلاف ہے۔ ہم نے حتی الامکان ان میں مطابقت کی کوشش کی ہے۔

طریقِ اصلاح

مولانا گنگوہیؒ نے اپنے شیخؒ کی حیات میں کسی کو اپنی بیعت میں نہیں لیا البتہ شیخؒ کی وفات کے بعد بیعت لینے کا سلسلہ شروع ہوا، جب کوئی بیعت کی خواہش کرتا تو آپ بہت عذر و تامل فرماتے اور متعدد بار نمازِ استخارہ کی تاکید کرتے اس کے بعد بھی اگر طالب کی طرف سے اصرار ہوتا تو اس کو مرید کر لیتے اس احتیاط و اجتناب کے بعد بھی آپ کے متوسلین کی تعداد ایک اندازے کے مطابق دس ہزار سے اوپر تھی، جو لوگ خود آ کر اپنے احوال بیان کرتے ان کے لیے روزانہ صبح ناشتہ کے بعد کے اوقات متعین تھے اور جو لوگ خطوط کے ذریعہ اپنے احوال لکھتے ان کے جوابات آپ خود ہی تحریر فرماتے تھے، مخصوص حاجت مندوں کو تعویذ بھی لکھ کر دیتے تھے ورنہ پھر کوئی دعا یا عمل کی تعلیم دیتے تھے۔ اصلاح اور تزکیہ نفس کا طریقہ بھی بہت سادہ اور آسان تھا، پہلے عقائد کی درستگی اور پھر نماز کی پابندی کی نصیحت فرماتے اور اسی کی بار بار تاکید ہوتی، فرماتے تھے کہ ہر عمل تابع ہے نماز کا اگر نماز درست ہوگئی تو اس کی برکت سے دوسرے اعمال حسنہ کی بھی توفیق مل جاتی ہے اور اگر خدانخواستہ اس میں کوئی کوتاہی یا کمی رہ گئی تو ہر عمل ادھورا اور نامکمل رہ جاتا ہے اس لیے جب کوئی بیعت ہونے کے لیے آتا تو اس کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تاکید نماز کی ہوتی، شکل و صورت، وضع قطع اور لباس کے بارے میں ابتداءً نکیر نہ فرماتے تھے بلکہ پابندی نماز کا ہی حکم ہوتا اور فرماتے کہ اگر اس پر استقامت نصیب ہوگئی تو شکل و صورت اور لباس وغیرہ سب ہی کچھ اسلامی رنگ میں رنگ جائے گا۔ نماز کے بعد پھر زندگی کے ہر گوشے میں سنت پر عمل کرنے کی تلقین کی جاتی تھی، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، غرض ہر ایک موقع پر سنت کے موافق زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہوتی تھی۔ یہ تین چیزیں آپ کی تعلیمات کی بنیاد تھیں، اولاً عقائد کی درستگی، دوم نماز اور سوم سنتِ نبوی کے مطابق زندگی گذارنا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو واقعی یہی تینوں چیزیں انسان کو مومن کامل بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔

تصوف کا مقصد

قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کی تخلیق محض عبادت الٰہی کے لیے ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے دنیاوی تعلقات کو برتنے اور نباہنے کے لیے بھی

مکلف کیا گیا ہے۔ بظاہر ان دونوں میں تضاد ہے، اسی تضاد کو کتاب وسنت کی روشنی میں دور کرنیکی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے لیے کچھ اصول اور معمولات مقرر کیے جاتے ہیں جس کو تصوف یا طریقت کہتے ہیں۔

تصوف کا مقصد اصلی یہی ہے کہ شریعت مقدسہ کے احکامات دل میں اس طرح راسخ ہو جائیں کہ جیسے وہ نظر سے دیکھ لیے گئے ہیں اور ان کے ثمرات مشاہدے میں آچکے ہیں۔ ہر دور کے مشائخ اور صوفیا نے اپنے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر تصوف کے مقاصد بیان کیے ہیں۔ حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب مجددیؒ فرماتے تھے کہ ''فقیری کا ماحصل ہم نے اخلاص کو پایا۔''[1]

اسی طرح مولانا لکھنویؒ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میں نے حضرت امام ربانی کے کلام سے حضرت مرزا صاحب شہیدؒ کے کلام سے حکمائے امت میں مولانا فریدالدین عطارؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ اور شیخ مصلح الدین شیرازیؒ کے کلام سے یہی سمجھا ہے کہ مقصد تصوف کا یہ ہے کہ اعمال شرعیہ کا ملکہ پیدا ہو جائے۔ اس کی مثال مرزا صاحبؒ کے کلام میں یہ ہے کہ (گویا) بادشاہ نے ایک وزنی پتھر اٹھانے کا حکم دیا ہے، جو لوگ ورزش نہیں کرتے وہ بھی اس کو اٹھالیں گے کیونکہ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی ہے مگر (وہ) ذرا تکلف سے اٹھائیں گے (اور) اٹھانے کے بعد ہاتھ پیروں میں درد بھی ہوگا لیکن جو لوگ ورزشی ہیں وہ سہولت سے اٹھالیں گے اور کچھ درد بھی اِن کے نہ ہوگا۔ مولانا رومؒ کے کلام میں اس کی مثال یہ ہے کہ محدثین کی مثال مانند عطار کے ہے، فقہاء کی مثال مانند طبیب کے ہے اور صوفیہ کی مثال مانند استعمال ادویہ کے ہے...... ان بزرگوں کے فیض سے ایک مثال میری سمجھ میں آئی ہے جو شاید بہت عمدہ اور منطبق ہے وہ یہ کہ شریعت مقدسہ طب روحانی ہے، طب روحانی میں دو جز ہیں ایک نظری یا علمی (اور) دوسرا عملی، اسی طرح شریعت الٰہیہ میں بھی یہی دو جز ہیں، ایک نظری جس کو عقائد سے تعبیر کرتے ہیں (اور) دوسرا عملی جس کو عبادات و معاملات سے تعبیر کرتے ہیں، پھر طب جسمانی میں ایک چیز اور ہے جس کو مطب کرنا کہتے ہیں یعنی کسی استاد کی خدمت میں رہ کر اس آموختہ کو مشق و مزاولت سے منجلی کرنا۔ اسی طرح شریعت ربانیہ میں بھی صالح و ماہر استاد کی خدمت میں رہ کر معلومات شرعیہ کی مشق کرنا (بھی) ایک چیز

---

[1] شجرۂ طیبہ، ص ۲۹

ہے، یہی چیز معبر بہ تصوّف ہے (یعنی اسی دوسری چیز کو تصوف کہتے ہیں) یہ میرا خیال صحیح ہو یا غلط مگر پختہ ہو گیا ہے، گویا خون کے ہر قطرہ کے ساتھ مل کر رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور میں اپنے نزدیک اس کو ائمہ فن کے کلمات طیبات سے ماخوذ سمجھتا ہوں اور اگر کسی نے اس کے خلاف کوئی دوسرا مقصد تصوف کا بیان کیا ہو گا تو اس تصوف کو میں مسلمانوں کا مطلوب بننے کے قابل نہیں خیال کر سکتا کیونکہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام دین کامل ہے، کوئی چیز مقرب بارگاہ رحمانی و مفید کمال انسانی ایسی نہیں ہو سکتی جس کی تاسیس شریعت قدسیہ نے نہ کی ہو، اگر کسی شخص نے اس کے خلاف کچھ کہا ہو تو اس کے کلام کو سکر پر واجب الحمل جانتا ہوں[1]۔"

ایک دوسرے موقع پر اس بات کو اس طرح سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تصوف کا مقصود یہ بھی نہیں کہ غیب کی باتیں معلوم ہونے لگیں جس کو کشف کہتے ہیں، تصوف کا مقصود کرامات کا ظہور بھی نہیں ہے، کشف و کرامات کا ظہور بعض حضرات سے ہوتا ہے اور بعض سے نہیں، جن سے نہیں ہوتا ان کے مرتبہ میں کچھ نقصان نہیں آتا اور جن سے ہوتا ہے ان کے مرتبہ میں کچھ زیادتی نہیں ہوتی ہے۔ نیز تصوف کا مقصود حق تعالیٰ کا دیدار بھی نہیں۔ دیدار کا وعدہ تو ایمان والوں سے عالم آخرت میں ہے، اس دُنیا میں ان آنکھوں سے دیدار الٰہی ہرگز نہیں ہوتا۔

خوب سمجھ لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ تصوف کا مقصود سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ جن عقائد کی شریعت نے تعلیم دی ہے ان کا یقین پختہ ہو جائے اور وہ چیزیں معلومات کے درجہ سے ترقی کر کے مشہودات کے درجہ میں آجائیں اور جب یہ عقائد اس درجہ پختہ ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ اعمال شرعیہ کی پابندی سہل ہو جائے گی اور تمام کاموں میں اخلاص پیدا ہو جائے گا یعنی سوا رضائے الٰہی کے کسی کام کا اور کچھ مقصود نہ ہوگا[2]۔"

طریقۂ نقشبندیہ کی افضلیت

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ (م ۱۳۸۹ء) طریقۂ نقشبندیہ کے امام ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے کہ الف ثانی کا جو مجدد اس امت کے لیے پیدا کیا گیا وہ بھی اسی طریقہ کا متبع ہوا۔ اسی وجہ سے اب اس طریقہ کو مجددیہ کہتے ہیں۔ اس طریقہ کے سب سے افضل ہونے کے

---

۱ مختصر حالات و تعلیمات بزرگانِ دین، ص ۱۱، ۱۴ ۲ شجرۂ طیبہ، ص ۳۶

جو جو حضرت مولانا لکھنویؒ نے تحریر فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ یہ طریقہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اخذ کیا گیا ہے اور وہ باجماع امت تمام صحابہؓ سے افضل ہیں لہٰذا ان کا طریقہ بھی یقیناً سب طریقوں سے افضل ہوگا۔

۲۔ طریقۂ نقشبندیہ کی بنیاد پابندئ شریعت اور اتباع سنت پر ہے۔

۳۔ یہ طریقہ سب طریقوں سے زیادہ سہل اور آسان ہے، بڑی بڑی ریاضات، مجاہدات اور چلّہ کشی کی تعلیمات یہاں نہیں ہیں، یہاں صحابۂ کرامؓ کی روش کے مطابق صرف اتباع سنّت، شیخ کی صحبت اور توجّہ سے کام بنتا ہے۔

۴۔ اس طریقہ میں وصول الی اللہ جلد ہوتا ہے، جو بات دوسرے طریقوں میں سب سے آخر میں حاصل ہوتی ہے وہ اس طریقہ میں ابتدا ہی میں مل جاتی ہے۔[1]

۵۔ طریقۂ نقشبندیہ کی نسبت دوسرے طرق نسبت سے مافوق ہے کیونکہ اس طریقہ کی نسبت دوام حضور و آگاہی ہے۔

۶۔ یہ طریقہ اشبہ بالسّنۃ ہے اس لیے مواجید و خوارق کا یہاں چنداں اعتبار نہیں۔

۷۔ اس طریقہ میں حرمان و مایوسی نہیں ہے۔

۸۔ اس طریقہ کی بنیاد تعلیم و تعلّم پر ہے، بیعت و خرقہ پر نہیں۔

۹۔ طریقۂ نقشبندیہ کی سند میں کسی مقام پر ارسال و انقطاع کا شبہ نہیں ہے، بخلاف اور طرق کے کہ ان میں کہیں کہیں ارسال کا شبہ دامن گیر ہوتا ہے جیسے بعض محدّثین کے نزدیک حضرت حسن بصریؒ (م ۷۲۸ء) کا سماع حضرت علی مرتضیٰؓ سے ثابت نہیں ہے۔[2]

ایک خاص بات طریقۂ نقشبندیہ میں یہ بھی ہے کہ یہ طریقہ بالکل فقہ حنفی کے مطابق ہے چنانچہ اس طریقہ کے لوگوں کو فقہ حنفی کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا پڑتا جیسے ذکر جہر وغیرہ۔ اس مطابقت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس طریقہ کے اکابر سب کے سب حنفی تھے بلکہ ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے۔ لطف بالائے لطف یہ ہے کہ دوسرے ائمہ کے مقلّدین یعنی شافعی، مالکی اور حنبلی حضرات کو بھی اس طریقہ میں داخل ہونے کے بعد اپنی اپنی فقہ کے خلاف کسی عمل کے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔[3]

---

[1] شجرۂ طیبہ، ص ۴۱ [2] کرامات موسویہ، ص ۱۱۱ [3] شجرۂ طیبہ، ص ۴۴

اتباعِ سنت

طریقۂ نقشبندیہ میں اتباع سنت کی جس قدر تاکید پائی جاتی ہے اتنی اور کسی چیز کو نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۶۲۴ء) اور مولانا شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ (م ۱۸۲۴ء) کے مکاتیب عالیہ میں سب سے زیادہ زور جس بات پر دیا گیا ہے وہ اتباعِ سنت اور پیروی رسولؐ ہی ہے اور اسی کو نجاتِ اخروی کا دارومدار بتایا گیا ہے، حضرتؒ نے بھی اپنے متوسلین کو اسی بات کو تلقین کی ہے، فرماتے ہیں:

''اتباع سنت کا حرص اپنے دل میں پیدا کرنا چاہیے نہ صرف عبادات میں بلکہ عادات میں بھی، کھانے میں، پینے میں، سونے میں، جاگنے میں، بولنے میں، چپ رہنے میں، استنجاء میں اور طہارت میں، غرض ہر حالت میں یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس کام کو ہم اس طرح کریں جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا...... اتباع سنت کا حرص جب کسی کے دل میں گھر کر لیتا ہے تو اس کو ایک خاص تعلق رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہو جاتا ہے اور یہی تعلق اصل چیز اور تمام فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے، ایسے شخص پر خاص رحمتِ خداوندی یہ ہوتی ہے کہ افعالِ اضطراریہ میں بھی منجانب اللہ خلافِ سنت حرکات سے اس کی حفاظت ہوتی ہے۔''[1]

وصول الی اللہ

ہر قسم کی عبادت اور ہر کام میں اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی نیت ہونی چاہیے، اس صفت کے بغیر تعلق مع اللہ اور شانِ عبدیت پیدا نہیں ہو سکتی ہے، اسی صفت کو حاصل کرنے کے لیے سلسلۂ تصوف کی ضرورت پڑتی ہے، بزرگان دین کی تعلیمات اور فرمودات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اخلاص کے بغیر کوئی کام نہیں بنتا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز سے قطع تعلق نہ ہو جائے اس وقت تک اخلاص کی صفت پیدا نہیں ہو سکتی اور ماسویٰ سے انقطاع کے بغیر وصول الی اللہ ممکن نہیں ہے، اسی انقطاع کو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ ''گسستن'' کے لفظ سے اور وصول الی اللہ کو ''پیوستن'' کے لفظ سے تعبیر فرماتے ہیں،

---

[1] شجرۂ طیبہ، ص ۴۷، ۴۸

ان کی رائے کے مطابق سالک میں گسستن اور پیوستن دونوں ایک ساتھ ہی وارد ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی کو تقدّم زمانی حاصل نہیں ہوتا البتہ تقدّم ذاتی یقیناً پیوستن کو حاصل ہے چنانچہ حق تعالیٰ کی رحمت و عنایت جب کسی بندے کو اپنی طرف کھینچتی ہے تو اس کو وصول الی اللہ کی دولت حاصل ہو جاتی ہے اور اسی دولت کی وجہ سے آن کی آن میں حق تعالیٰ کے ماسوا تمام تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ وصول الیٰ اللہ کی نعمت حاصل کرنے کے لیے مولاناؒ فرماتے ہیں:

''وصول الی اللہ کے تین طریقے ہیں۔ اوّل ذکر، دوم مراقبہ، اور سوم رابطہ، ذکر کی دو قسمیں ہیں (اوّل) ذکر اسم ذات یعنی اللہ اللہ کا ورد کرنا (دوم) ذکر نفی و اثبات یعنی کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرنا۔ (اسی طرح) مراقبہ کی (بھی) کئی قسمیں ہیں مثلاً مراقبۂ احدیت، مراقبۂ معیت، اور مراقبۂ اقربیت وغیرہ...... اللہ تعالیٰ کی یاد سے کسی وقت غافل نہ رہنا چاہیے، اللہ کی یاد جب کسی دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ دل پاک ہو جاتا ہے اور پھر اس میں سوا اللہ کی محبت کے کسی دوسری چیز کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور باطن سے تمام نجاسات خود بخود دور ہو جاتی ہیں[1]۔''

رابطہ یا تصوّرِ شیخ

سلسلۂ نقشبندیہ میں 'رابطہ' یا 'تصور شیخ' کی بہت اہمیت ہے، جتنا زیادہ تعلق مرید کو اپنے شیخ سے ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ اخذ فیض کر سکے گا۔ شیخ کے ساتھ محبت کرنے کو 'رابطہ' کہتے ہیں، جب انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو ہر وقت دل میں اس کا خیال بسا رہتا ہے اور اس کی صورت آنکھوں میں پھرا کرتی ہے لہٰذا جب کوئی مرید اپنے شیخ سے ایسی محبت کرے گا تو اس کی بھی یہی حالت ہوگی اور شیخ کی صورت دل میں اور آنکھوں میں رچ بس جائے گی، یہی چیز رابطہ ہے، بعض اوقات یہ کیفیت اتنی شدت اختیار کر جاتی ہے کہ جب مرید آئینہ دیکھتا ہے تو اس میں بجائے اپنی شکل کے شیخ کی صورت نظر آتی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری صورت بدل گئی ہے۔ جیسا کہ حضرت میرزا مظہر جانجاناں شہیدؒ (م۱۷۸۱ء) کو پیش آیا تھا کہ آئینہ میں ان کو اپنی شکل کے بجائے حضرت سیّد نور محمد بدایونیؒ (م۱۷۲۲ء) کی شکل نظر آئی تھی[2]۔

رابطہ کے بارے میں حضرت مولاناؒ فرماتے ہیں:

---

[1] شجرۂ طیبہ، ص ۵۵-۶۰ [2] شجرۂ طیبہ، ص ۵۶

''ان تینوں طریقوں (ذکر، مراقبہ اور رابطہ) میں سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ سریع التاثیر رابطہ ہے، رابطہ بغیر ذکر اور بغیر مراقبہ کے بھی وصول الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے لیکن ذکر و مراقبہ بغیر رابطہ کے کچھ مفید نہیں[1]''

اسی بات کو اپنے ایک مکتوب میں آپ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

''طریقۂ نقشبندیہ میں پیر کی محبت و صحبت بہت ضروری ہے، اپنے پیر سے جتنی زیادہ محبت ہوگی اتنی ہی جلد کام بنے گا، جب پیر سے محبت ہوگی تو پیر کی صورت بھی ہر وقت دل میں رہے گی، اسی کو تصور شیخ کہتے ہیں۔ ذکر کے وقت تصور شیخ اکسیر اعظم ہے[2]''

لطائف

صوفیہ کے نزدیک لطائف کی تعریف اور تفصیل بیان کرتے ہوئے مولاناؒ تحریر فرماتے ہیں:

''واضح رہے کہ ان بزرگان دین کی تحقیق میں انسان دس چیزوں سے مرکب ہے اور چونکہ یہ دس چیزیں محض اللہ تعالیٰ کے لطف سے وجود میں آئیں اور اشرف المخلوقات یعنی انسان کا جزء بنی ہیں اس وجہ سے ان چیزوں کو لطائف کہا جاتا ہے۔ ان دس لطیفوں میں پانچ لطیفوں کا اصلی مقام عرش اعظم سے اوپر ہے اور پانچ کا عرش کے نیچے۔ بالائے عرش کے پانچ لطائف یہ ہیں: قلب، روح، سر، خفی، اور اخفیٰ، اور تحت عرش کے پانچ لطائف یہ ہیں: نفس، آگ، ہوا، پانی اور مٹی۔ ان دس لطیفوں میں آخری چار لطیفوں سے انسان کا جسم بنا ہے اور اوّل کے چھ لطیفوں کو جسم انسانی کے خاص خاص مقامات سے خالق جل شانہٗ نے تعلق عطا فرمایا ہے[3]''

طریقہ مجدّدیہ میں سب سے پہلے لطیفہ قلب سے اسمِ ذات کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ذکر کا طریقہ

مولانا لکھنویؒ نے اپنے ایک مکتوب میں ذکر اسم ذات کا طریقہ بڑی وضاحت سے تحریر کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

۱۔ شجرۂ طیبہ، ص ۵۶

۲۔ دنیائے تصوف، مکتوب حضرت مولانا لکھنویؒ بنام مولوی حکیم عبدالغنی فاروقی صاحب، ص ۲

۳۔ شجرۂ طیبہ، ص ۶۳، ۶۴

"طریقہ نقشبندیہ مجددیہ میں ذکر قلبی اسم ذات (جو پہلا سبق اس طریقہ کا ہے) یہ ہے کہ پہلے پچیس مرتبہ استغفار پڑھیں، اس طرح کہ چوبیس مرتبہ استغفر اللہ اور پچیسویں مرتبہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ پڑھیں، پھر ایک مرتبہ سورہ فاتحہ اعوذ باللہ بسم اللہ کے ساتھ اور تین مرتبہ قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَد ہر مرتبہ بسم اللہ کے ساتھ پڑھ کر اپنے پیر سے لے کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیرانِ طریقت کو ایصال ثواب کرے اور اللہ تعالیٰ سے بڑی عاجزی کے ساتھ دُعا مانگے کہ یا اللہ جو انوار و برکات آپ نے اپنے نبی کریمؐ کو عطا فرمائے ہیں اور جو میرے پیرانِ طریقت میں چلے آرہے ہیں (ان کو) میرے قلب پر بھی نازل فرما، اس کے علاوہ اپنے اوپر پیش آنے والے تین وقتوں کے لیے دُعا مانگے یعنی موت، قبر اور حشر کے لیے یہ استغفار اور فاتحہ اور دُعا ہر روز پہلی مرتبہ جب ذکر شروع کرے تو ہونا چاہیے اُس کے بعد اُس دن یا اُس شب میں جتنی مرتبہ ذکر کا آغاز کرے تو ہر مرتبہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ استغفار، فاتحہ اور دُعا کے بعد قلب کے مقام پر (یعنی سینے میں بائیں جانب پستان سے دو انگل نیچے قدرے مائل بہ پہلو) یہ خیال کرے کہ قلب اللہ اللہ کہہ رہا ہے، (اس حالت میں) حسب ذیل امور کا لحاظ رکھے:

۱۔ زبان تالو سے چسپاں کرے، نہ زبان کو جنبش ہو نہ سر کو اور نہ کسی عضو کو۔

۲۔ سانس کی آمد و رفت بطور خود جاری رہے، سانس کو ذکر میں ذرا دخل نہ ہو، یہ ذکر محض خیال سے ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ:

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

حتیٰ کہ کوئی شخص پاس بیٹھا ہو تو وہ بھی ہرگز نہ سمجھ سکے کہ ذکر ہو رہا ہے۔

۳۔ ذکر کرتے وقت اس نام مبارک کے معنی کا بھی خیال رہے کہ یہ نام مبارک اس ذات پاک کا ہے جو تمام خوبیوں کی جامع اور ہر قسم کے عیب و نقص سے بَری ہے (اور) جس پر ہم ایمان لائے ہیں۔

۴۔ تسبیح ہاتھ میں رہے تاکہ ذکر کا شمار ہوتا رہے۔

۵۔ کم از کم ہر تسبیح کے ختم پر ایک مرتبہ یہ دُعا مانگے — خداوندا میرا مقصود تُو ہے اور تیری رضا۔ اپنی محبت دے اور اپنی پہچان دے۔ اگر تسبیح کے درمیان میں دو ایک مرتبہ یہ دُعا مانگی

جائے تو اور اچھا ہے، یہ دُعا بھی خیال سے ہو نہ کہ زبان سے، اس دُعا کو ان حضرات کی اصطلاح میں 'بازگشت' کہتے ہیں۔

۶۔ ابتداء میں چاہیے کہ ہر وقت یا جس قدر ہو سکے اس ذکر میں مشغول رہے، وضو بے وضو ہر حالت میں، لیٹے بیٹھے حتیٰ کہ پاخانہ و پیشاب کی حالت میں بھی ذکر کا سلسلہ قائم رہے، یعنی یہ خیال لگا رہے کہ دل اللہ اللہ کہہ رہا ہے۔

۷۔ مبتدی کو دو چار روز کچھ الجھن ہوتی ہے اور ذکر کی تعداد کم رہتی ہے لیکن شیخ کی توجہ اور برکت سے یہ الجھن رفع ہو جاتی ہے اور ذکر ہونے لگتا ہے، جب ذکر ہونے لگے تو شمار کے ساتھ پچیس ہزار روزانہ سے کم نہ ہو اور (اگر) یہ نہ ہو سکے تو پندرہ ہزار سے کم کی تو اجازت نہیں۔

شروع میں اپنے ارادہ اور کوشش سے ذکر ہوتا ہے، اس حالت کو (اصطلاح میں) 'یادکرد' کہتے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دل جاری ہو جاتا ہے تو بے ارادہ و بے اختیار ہر وقت دل اس نام پاک کو لیتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ شخص دل کو ذرا دیر کے لیے بھی خاموش کرنا چاہے (بھی) تو نہیں کر سکتا۔ اس حالت کو (اصطلاحاً) 'یادداشت' کہتے ہیں[۱]۔"

ختم خواجگان

سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے بزرگوں کا دستور ہے کہ جب کوئی حاجت یا مہم درپیش ہوتی ہے تو وہ اپنے بزرگوں کا ختم پڑھتے ہیں اور اس کے وسیلہ سے مجیب الدعوات کی بارگاہ میں مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر قسم کی ضرورتوں اور حاجتوں کے سلسلہ میں ان ختموں کا پڑھنا تریاق مجرب ہے۔ خانقاہ عالی جاہ مجددیہ رؤفیہ بھوپال میں روزانہ سات ختموں کے پڑھنے کا معمول تھا اور آٹھواں ختم یعنی ختم خواجگان جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ پڑھا جاتا تھا۔ یہ سات ختم جن بزرگوں کی طرف منسوب ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (م ۱۱۶۶ء-۵۶۱ھ)

۲۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ (م ۱۳۸۹ء-۷۹۱ھ)

۳۔ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ (م ۱۶۰۳ء-۱۰۱۲ھ)

---

[۱] دنیائے تصوف، ص ۱-۲

۴۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۶۲۴ء-۱۰۳۴ھ)

۵۔ حضرت خواجہ محمد معصوم المعروف بہ عروۃ الوثقٰی (م ۱۶۶۸ء-۱۰۷۹ھ)

۶۔ حضرت میرزا مظہر جانجاناں شہید دہلویؒ (م ۱۷۸۱ء-۱۲۹۵ھ)

۷۔ حضرت مولانا شاہ غلام علی دہلویؒ (م ۱۸۲۴ء-۱۲۴۰ھ)

ختم خواجگان میں ان سات بزرگوں کے علاوہ اور بھی متعدد بزرگوں کے ختم شامل ہیں مگر ان کے ناموں میں کچھ اختلاف ہے اس لیے ان کے ختم ناموں کے ساتھ نہیں پڑھے جاتے ہیں بلکہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ۔ یااللہ، جن بزرگوں کی طرف یہ ختم منسوب ہیں اُن کو اس کا ثواب پہنچا دے[1]۔ ان سب ختموں کے پڑھتے وقت کسی ظرف میں تھوڑا سا پانی رکھ لیا جاتا ہے اور ختم کے بعد تمام شرکاء اس پر دم کرتے ہیں، یہ پانی شفائے امراض کے لیے عجیب چیز ہے۔

حضرت مولاناؒ کا اپنا ختم

اپنے بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے اور اپنے بعض مخلصین کے اصرار پر حضرتؒ نے خود اپنا بھی ختم تجویز کیا ہے جس کو پڑھ کر انھیں ایصال ثواب اور ان کی روحانیت سے اکتساب فیض کیا جاسکتا ہے۔ آپ نے اپنا ختم ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

> ''حسبِ دستور اوّل سورۂ فاتحہ ایک بار، پھر درود شریف سو بار، پڑھ کر آیۂ کریمہ سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن پانچ سو بار، پھر رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْن پانچ سو بار، پھر درود شریف سو بار، پھر سورۂ فاتحہ ایک بار پڑھ کر بطریقِ مذکور دُعا مانگیں[2]۔''

مولانا قدس سرہ نے اپنے متوسّلین میں کسی کو بھی اپنے سلسلہ کی اجازت وخلافت نہیں دی، نہ کسی کو اپنا جانشین نامزد کیا اور نہ ہی کوئی خانقاہی نظام قائم کیا لہٰذا یہ سلسلہ آپ کی ذات کے بعد ختم ہوگیا۔ البتہ دارالمبلّغین لکھنؤ میں آپ جس کمرے میں رہا کرتے تھے اس میں تبرکاً روزانہ ختم شریف پڑھنے کا معمول بہت عرصہ تک رہا ہے۔

دراصل ان بزرگوں کا مقصد اصلی اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس تھا اس لیے ان کی توجہ بس اسی

---

[1] ان تمام ختموں کی تفصیل جاننے کے لیے شجرۂ طیبہ ص ۷۳-۷۵ دیکھیں [2] شجرۂ طیبہ، ص ۷۷

کام کی طرف لگی رہتی تھی، انہیں کسی قسم کی گدی نشینی یا خانقاہیت کے نظام سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ خود آپ کے پیر حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب قدس سرہٗ نے اپنی تمام عمر میں صرف چار پانچ حضرات کو ہی خلافت واجازت کے شرف سے سرفراز فرمایا تھا۔

تعلیمات وہدایات

حضرت لکھنویؒ نے اپنے متوسلین ومسترشدین کو وقتاً فوقتاً تزکیہ وتصفیۂ نفس اور ذکر اللہ سے متعلق جو تعلیمات وہدایات دی ہیں ان میں سے کچھ کو یہاں مختلف عنوانات کے تحت ذکر کیا جارہا ہے انشاء اللہ ان سے ہر ایک کو فیض پہنچے گا۔

ذکر الٰہی کی حلاوت

ذکر الٰہی کی حلاوت تو ہر مومن کے لیے ایک طبعی چیز ہے کیونکہ جس سے جس کو محبت ہوتی ہے اس کو اپنے محبوب کے ذکر میں حلاوت کا ملنا لازمی ہے۔ ایمان والوں کا محبوب اللہ تعالیٰ ہے اور قرآن مجید اس کا گواہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ لہٰذا ذکر الٰہی میں حلاوت کا ہونا ایک ضروری چیز ہے۔

ذکر کی پابندی

آپ نے اپنا حال جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں اگر التزام کے ساتھ کم سے کم چالیس روز تک ذکر معلومہ کی آپ پابندی کرلیں تو انشاء اللہ قلب جاری ہو جائے گا اور اس وقت آپ کو خود بھی احساس ہو جائے گا کہ ذکر سے کیسا اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ.

/ غیر اللہ کے تعلقات سے نجات دلانے والی چیز کثرتِ ذکر ہے۔ حضرت امام ربانیؒ اپنے مکتوب قدسیہ میں لکھتے ہیں کہ بغیر کثرتِ ذکر کے کام نہیں بنتا۔ اللہ تعالیٰ یہ دولت مجھے بھی عطا فرمائے اور آپ کو بھی۔ مایوس نہیں ہونا چاہیے، اس کی رحمت بہت بڑی اور بہت وسیع ہے۔

/ خیریت معلوم کر کے اطمینان ہوا، میں دعا اور توجہ سے غافل نہیں ہوں اور اس کا اثر بھی آپ کے اندر ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ سوا اللہ تعالیٰ کے کوئی چیز مقصود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو شرک سے بہت نفرت ہے لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ کا مطلب یہی ہے کہ لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہ۔ کام وہی کرتے

رہیں جو اَب کرتے ہیں مگر ان سب کاموں کو غیر مقصود سمجھ کر جس طرح بیت الخلاء میں بیٹھتے ہیں اور اس بیٹھنے کو کوئی شخص بخوشی اور بلاضرورت گوارا نہیں کرسکتا ٹھیک اسی طرح دنیا کا سب کام کریں مگر مقصودِ حیات صرف یادِ الٰہی ہو اور بس۔ دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بہ طفیل پیرانِ عظام یہ حالت اس فقیر کو بھی عطا فرمائے۔

/ سب سے کہہ دیں کہ وظیفہ میں کمی نہ ہونے پائے اور ناغہ ہونا تو بہت ہی بُرا ہے، اس کے لیے کسی صحبت کی ضرورت نہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ محرومی نہ ہوگی۔

/ حالت موجب صد ہزار شکر ہے، انشاء اللہ ذکر غالب آئے گا، قرآن مجید میں فرمادیا گیا ہے کہ کَلِمَۃُ اللّٰہِ هِیَ الْعُلْیَا۔ کام میں غفلت نہ ہو، نتیجہ انشاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ اس میں محرومی ناممکن ہے۔

/ ابتداء میں ضرورت کثرت ذکر کی ہے، کسی اور کی صحبت میں بیٹھنا مفید نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں یہ بیٹھنا مضر ہے۔

/ آپ نے اپنی جو حالت لکھی ہے غالبًا یکسوئی نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ افکار لاحق ہوگئے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں دور فرمائے، آپ ان خیالات میں نہ پڑیئے، کام میں لگے رہیے، انشاء اللہ نتیجہ ضرور نکلے گا:

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند

آپ ان خیالات کو قریب بھی آنے نہ دیجیے کہ قلب ذاکر نہیں ہے، تسبیح ہاتھ سے چھوڑنے کے بعد پھر کچھ نہیں ملتا۔

ذکر پر شکر

جو حالت آپ نے لکھی ہے اس پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کریں، انشاء اللہ ترقی ضرور بالضرور ہوگی، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ۔ حضرت شاہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ درطریقۂ ما محرومی نیست۔

ذکر کی کیفیت

ذکر میں کبھی کبھی بے اطمینانی ہوجاتی ہے، اس کا خیال نہ کریں، انشاء اللہ تھوڑے دنوں کے

بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ختم شریف کا پانی اگر سچے اعتقاد کے ساتھ پلایا جائے تو اکسیر ہے۔

ذکر کی خوبی

آپ نے اپنا جو حال لکھا ہے بہت مسرّت اور شکر کے لائق ہے، یہ سب فیض اوپر کے بزرگوں کا ہے، ذکر کی کثرت اور پیرانِ طریقت کی محبت اصل چیز ہے، صحبت کی تاثیرات بیشک ہیں اور طریقۂ نقشبندیہ میں مدارِ ترقی بھی محبت پر ہے مگر یہ نااہل کُجا اور یہ تاثیرات کُجا۔ یہ سب اوپر کے بزرگوں کے فیوض ہیں۔ دیکھئے اب ذکر کی مداومت کیجیے اور اوقات کو منضبط کیجیے۔

ذکر سے راحت

الحمدللہ جو حالت آپ نے لکھی ہے وہ بہت اُمید افزا ہے، ابھی تمام جسم سے ذکر کے جاری ہونے کا خیال نہ کریں، صرف قلب کی طرف خیال رکھیں، انشاء اللہ تعالیٰ اب کی ملاقات میں قلب کے بعد کا سبق ہوگا، اپنی صحت کی حفاظت بھی ضروری ہے، ذکر کرنے سے قلب پر کوئی صدمہ نہیں پہنچتا بلکہ قلب کو راحت ملتی ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب نص قرآنی ہے۔

ذکر کے لیے وضو شرط نہیں

آپ نے اوقات کے انضباط اور حفظ قرآن کی مشق اور وظیفہ کو پندرہ ہزار بالالتزام جاری رکھنے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ موجبِ مسرّت ہے بشرطیکہ اس پر مداومت ہو۔ ذکر کے لیے وضو شرط نہیں ہے مگر اولیٰ یہی ہے کہ مسلمان بلا عذر بے وضو نہ رہے۔ اگر اس پر مداومت ہوئی تو انشاء اللہ بہت جلد قلب جاری ہو جائے گا۔

ختم کا پانی

ختم کا پانی تو بلاشبہ اکسیرِ اعظم ہے، انشاء اللہ شفا ہوگی۔ ان چیزوں کی تاثیر اعتقاد یا تصورِ شیخ کے ساتھ فی الاکثر وابستہ ہے۔

تاکید ختم خواجگان

جب اس قسم کی کوئی پریشانی آئے تو ختم خواجگان یا ختم حضرت مجدد صاحبؒ پڑھ کر دُعا مانگنی چاہیے اور پانی پر دم کر کے پلانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی غلامی کا طوق ہماری گردنوں میں

رکھے آمین ثم آمین۔ بہتر یہ ہے کہ بعد نماز فجر ختم کا سلسلہ قائم کریں اور ختم سے پہلے قرآن مجید کی دو تین آیتوں کا ترجمہ ہو جایا کرے تو بہت بہتر ہے۔ ختم سے پہلے جو دعائیں مانگتا ہوں وہ یہ ہیں۔ یا اللہ یہ ختم فلاں بزرگ کا ہے، اس کو قبول فرما اور اس کا ثواب ان کو پہنچا دے اور ان کی برکات سے ہم کو محروم نہ رکھنا۔ ختم کے بعد یہ دعا مانگتا ہوں۔ یا اللہ اس ختم کا ثواب فلاں بزرگ کو اور ان کے پیرانِ طریقت کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک اور ان کے خلفاء و خدام تک پہنچا دے۔ اس کے بعد اپنے لیے نیز تمام ان لوگوں کے لیے جنھوں نے خواہش کی ہو دعا مانگتا ہوں۔

اگر ختم خواجگان اور ختم حضرت مجددؒ رحمۃ اللہ علیہ کا کم از کم رمضان بھر اہتمام رہے اور ختم کے بعد پانی دم کر کے مریضوں کو دیا جائے تو انشاء اللہ اکسیر ہوگا، اللہ تعالیٰ سب کو اپنی یاد کی توفیق دے اور سب کے طفیل میں اس ناچیز کو بھی۔

/ اگر آپ وہاں بعد نماز فجر ختم پڑھنے کا سلسلہ قائم کریں اور حسب دستور پانی دم کر کے پلائیں تو اُمید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ بیماری کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

/ ذکر کی پابندی میں بڑی برکت ہے، تھوڑا کام پابندی سے کیا جائے تو اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ بہت سا کام بغیر پابندی کے کیا جائے۔

نظام الاوقات میں برکت

خدا کے لیے اب اپنے اوقات کا مضبوط نظام قائم کریں، اسی وقت میں آدمی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ روزانہ اپنا حساب لیا کریں کہ آج نظام کے خلاف تو نہیں ہوا اور اگر ہوا تو کیوں؟ انشاء اللہ اگر اوقات تقسیم کر کے نظام قائم کر لیا تو نمایاں ترقی ہر چیز میں خصوصاً حالتِ باطنی میں آپ محسوس کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ وہ کسی کے اوقات میں نظم اور برکت عطا کرے۔ حضرت صاحبؒ (یعنی حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب بھوپالیؒ) سے بارہا سنا کہ وہ حضرت مولانا شاہ غلام علی صاحب قدس سرہٗ الاقدس کی تعریف میں سب سے بڑی بات یہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوقات میں بڑی برکت دی تھی۔

توجّہ

آپ کے دونوں خطوط پہنچے، حالات کا علم ہوا، مبارک ہو۔ اگر اسی طرح مشغولی رہی تو کام بن جائے گا۔ یہ حقیر کیا اور اس کی توجّہ کیا، جو کچھ ہوگا وہ اوپر کے پیران طریقت کی برکت

سے اور ان کے ساتھ محبت کرنے سے ہوگا۔ قرآن شریف کا ورد اگر اس وقت نہیں ہوسکتا تو تھوڑے دنوں کے بعد ہی سہی مگر حفظ قرآن مجید بہت بڑی چیز ہے اگر یہ نعمت زائل ہو جائے تو بڑی معصیت ہے۔

بزرگوں کے حالات

بزرگوں کے حالات پڑھنے سے ضرور انشاء اللہ ان کی محبت اور ان کے ساتھ روحانی نسبت پیدا ہوگی اور یہی مقصود بھی ہے مگر اس کے ساتھ ذکر بھی بطریق معلوم روزانہ ہو جائے تو انشاء اللہ پورا فائدہ ہوگا۔

صبر کی تلقین

بچی کے انتقال پر آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بڑا صدمہ ہوا اور صدمہ کا واقعہ بھی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صدمہ میں بھی اللہ کی مرضی کا خیال قائم رہا۔ یہ انعام خداوندی ہے۔ دنیا انھیں مکارہ ومصائب میں ہر طرف سے گھری ہوئی ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اللہ کی یاد میں رہ کر اور ان مکارہ ومصائب کے احساس میں رہ کر بھی کسی حد تک دوسری فکروں سے خالی ہوگئے ہیں۔ جب میرے سب سے پہلے لڑکے میاں عبدالرؤف کا انتقال ہوا جس کی عمر پانچ سال کی تھی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ اس صدمہ کی کیفیات کا اندازہ بھی میں نہیں کرسکتا تھا، اسی صدمہ کی حالت میں بوستاں کی ایک حکایت نظر سے گذری کہ حضرت سعدیؒ کے ایک کم عمر صاحبزادہ کا انتقال ہوگیا تھا جس کو اس نظم میں بیان کیا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

به صنعا ورم طفلی اندر گزشت
چہ گویم کزاں حال برمن چہ گشت

اسی رنج وصدمہ میں بے خود ہو کر فرماتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ قبر کھود کر اس بچہ کو پھر ایک بار دیکھ لوں تو اس بچہ کی آواز آئی۔ اے باپ تم میرے لیے کیوں اس قدر روتے ہو، میں تو پاک آیا تھا اور پاک چلا گیا، اپنی فکر کرو کہ پاک تم بھی آئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ناپاک ہو کر جاؤ، اس حکایت کو پڑھ کر اس وقت بہت تسکین ہوگئی تھی۔ حالات غم میں بھی اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں مخفی ہوتی ہیں، ہم بندوں کا کام صبر کرنا اور ہر حال میں مرضی الٰہی پر خوش رہنا ہے۔

موت سے رغبت

دنیا سے جانا تو سب کو ہے مگر موت سے ڈرنا نہ چاہیے، ہاں اپنے گناہوں کا خوف ضرور ہو لیکن اس کے ساتھ اللہ کی رحمت کی وسعت اور بزرگانِ دین کے توسّل سے قوی امیّد ہے کہ مشکل آسان ہو جائے گی۔ موت کی یاد تو بڑی عمدہ چیز ہے۔ حضرت فاروقِ اعظم کی مہر ہے کفٰی بالموتِ واعظاً یا عمر۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ آخرت کے کاموں میں توجّہ زیادہ دیں۔

مایوسی کی ممانعت

آپ نے اپنے متعلق جو کلمات لکھے ہیں ان سے ایک قسم کی مایوسی مترشح ہوتی ہے حالانکہ مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو بھی اس حقیر کے ساتھ محبت ہے اور اتنی محبت ہے کہ میں اس کا مستحق نہیں، امیّد ہے کہ انشاء اللہ یہ محبت پیران عظام کی محبت تک پہنچا دے گی۔

خود اپنا حال

میرا حال وہی ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دنیا کی زندگی بہت آرام سے گذری کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی، اب خداوند کریم آخرت کے معاملہ کو بھی اپنے فضل وکرم سے بخیر کر دے۔ آمین۔

اختلاج قلب

اختلاج قلب کے لیے سورہ اَلَمْ نَشْرَحْ گیارہ بار پڑھ کر پانی پر دم کر کے پئیں۔ گھر میں جو بدبو آتی ہے اس کے سلسلے میں یہ کریں کہ دو کاغذوں پر آیۃ الکرسی لکھ کر ایک کاغذ صدر دروازہ پر اور ایک کاغذ خاص اس مقام کے قریب چسپاں کر دیں اور روزانہ صبح وشام آیۃ الکرسی پڑھ کر چاروں طرف دم کر کے تین مرتبہ دستک دے دیا کریں۔ جس کوٹھری میں یہ شکایت ہے اس میں تین روز بوقت مغرب اذان دے کر چاروں طرف پھونک کر تین مرتبہ دستک دے دیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر کریں یعنی الحمد للہ کا ورد کیا کریں، بے گنتی، بے شمار چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، وضو بے وضو جس طرح بھی ممکن ہو ایسا کریں۔ قرآن مجید میں تاکید کے ساتھ وعدہ ہے کہ جس نعمت کا شکر کیا جائے گا وہ نعمت ضرور زیادہ کر دی جائے گی۔

دُعاء ایوبی

دُعائے ایوبی یہ ہے رَبِّ اَنِّی مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ یعنی اے میرے

پروردگار! مجھے تکلیف پہنچ گئی ہے اور تو سب مہربانی کرنے والوں سے زیادہ مہربان ہے۔ دوسری دُعا یہ ہے وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ یعنی جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔ یہ قول خدا کے خلیل کا ہے جو ہم کو سنایا گیا ہے۔

مدینہ طیبہ کی مٹی

مدینہ طیبہ کی مٹی تو آپ کے پاس موجود ہے اس میں سے ایک یا دو رتی لے کر روزانہ پاؤں پر لگائیں اور اس پر ذرا سا لعاب دہن بھی ڈال لیا کریں۔ یہ اکسیر اعظم ہے۔

آیاتِ شفا

مریض کی صحت کے لیے ایک چینی کی سفید رکابی میں آیاتِ شفا لکھ کر پلائیں اور روزانہ سوتے وقت معوذتین پڑھ کر ہاتھ پر دم کر کے سارے جسم پر پھیریں، انشاء اللہ شفا ہوگی۔

امتحان میں کامیابی

جب امتحان اور انٹرویو دینے جائیں تو جاتے وقت راستہ بھر یہ دُعا پڑھتے ہوئے جائیں، انشاء اللہ کامیابی ہوگی، دعا یہ ہے رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَ يَسِّرْلِيْ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ[1]۔

دارالمبلّغین کے اساتذہ کو نصیحت

نماز و جماعت تو بڑی چیز ہے آپ حضرات کو تو صورت، سیرت، لباس اور ہر بات میں ایک نمونہ بننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے داڑھی کے متعلق کئی بار توجہ دلائی گئی ہے۔ نماز و جماعت میں تو آپ سب کا اہتمام ایسا ہونا چاہیے کہ غیر مسلم بھی یہ دیکھ کر سمجھ لیں کہ اس قوم کا مقصد زندگی محض عبادت الٰہی ہے۔

---

[1] مذکورہ بالا تعلیمات میں سے اکثر مکتوبات بنام مولانا مغیث الدین صاحب الہ آبادیؒ سے مقتبس ہیں اور آخری نصیحت دارالمبلّغین کے دستور العمل سے لی گئی ہے۔

دسواں باب

اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کا دینی و سماجی پس منظر

تاج دار دو عالم محبوب رب کائنات جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مقدسہ کے آخری دنوں میں جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا جانشین بناتے ہوئے نماز کی امامت تفویض فرمائی تو گویا آپ نے اپنے اس عمل سے یہ اعلان کر دیا کہ میرے بعد ملت کی قیادت عامہ و تامہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سپرد کی جائے گی۔ چنانچہ آپؐ کے رحلت فرمانے کے بعد مسند خلافت پر حضرت ابوبکرؓ متمکن ہوئے اور پھر ان کے بعد عالم اسلام کی زمام قیادت فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطابؓ کے باطل شکن ہاتھوں میں آئی۔ ان دونوں جانشینان رسولؐ نے اس پودے کی سرسبزی و شادابی اور اس کی آبیاری و نگہداشت میں پوری قوت صرف کر دی جس کو ہمارے آقا و مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ریگستان میں اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ مشیت ایزدی یہی تھی کہ پرچم اسلام انہی وفا شعاروں اور اطاعت گذاروں کے ذریعہ سر بلند و سرفراز ہو اور ان کی خدماتِ جلیلہ چمکتے ہوئے سورج کی طرح دنیا میں روشن ہو جائیں لہٰذا ایسا ہی ہوا کہ انہی خلفاءؓ کے عہد میں اسلام کا غلغلہ اطرافِ عالم میں ایسا پھیلا کہ مشرق و مغرب میں جبل الطارق سے لے کر دریائے سندھ تک اور شمال و جنوب میں سائبیریا کے کناروں سے لے کر براعظم افریقہ کے صحراؤں تک سارا علاقہ اسلام کی ضوفشانیوں سے منور ہو گیا۔

خلفاء ثلاثہؓ کے مبارک عہد خلافت کا گذرنا تھا کہ عالم اسلام پر فتنوں کے دروازے کھل گئے اور وہ ناپاک و خونخوار تلوار جو دامادِ رسول اور امام مظلوم سیدنا عثمان غنی ذی النورینؓ کے مقدس خون میں آلودہ ہوئی تھی پھر کبھی نیام کے اندر نہ گئی اور برابر اپنوں ہی میں سرگرم پیکار رہی۔ ٹھیک انہی ایام میں ایک یہودی مذہب اور مسلمان صورت شخصیت ابن سبا کی شکل میں نمودار ہوئی، جس نے پہلی مرتبہ وراثت اور امامت کا ایک پرکشش تصور دے کر اسلامی اتحاد و اتفاق کی مضبوط

دیوار میں جا بجا اختلاف وانتشار کے رخنے ڈال دیئے اور اس طرح ملّت بیضاء کا شیرازہ منتشر ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ابن سبا نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت نہایت شاطرانہ انداز سے یہ بات لوگوں کے دماغوں میں بٹھانی شروع کر دی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلفاء ثلاثہؓ سے افضل ہیں۔ یہ تصّور ابن سبا کی فتنہ پرور ذہنیت کی خلاّقی کا نتیجہ تھا جو ایک جرثومہ کی طرح بعض کند و تاریک دماغوں میں آہستہ آہستہ پرورش پانے لگا اور پھر ایک وہ زمانہ آیا کہ اس تصور نے ایک مستقل فرقہ کی شکل اختیار کر لی جو آگے چل کر ایک ایسے مذہب کی صورت میں نمودار ہوا جس کا خدا بھی دوسرا مقرر ہوا، ایک درجن کے قریب رسول بھی دوسرے قرار پائے، قرآن کو بھی جداگانہ تسلیم کر کے اسے نامعلوم غاروں میں کنز مخفی بنایا گیا اور فرضی احادیث کا ایک وافر ذخیرہ وضع کر لیا گیا، اس طرح خاتم النبیین حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کے متوازی ایک عظیم الشان سبائی قلعہ تعمیر کر دیا گیا اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ایسی ذہنیت رکھنے والے اپنی قوت تجدید واجتہاد سے اس میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہے یہاں تک کہ آج کا زمانہ آ گیا۔

ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ لکھنے والے مؤرخ کی نظر جب مذکورہ بالا پہلو پر پڑتی ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرتا ہے، سوچتا ہے اور غور کرتا ہے کہ آخر اسلام کے نام لیواؤں میں یہ کون سا گروہ ہے جو بظاہر اپنے کو مسلمان بھی کہتا ہے مگر اس کی ہر بات اسلام سے مختلف ہی نہیں بلکہ اس کے بنیادی اصولوں سے بھی متعارض ہے۔ کہنے کو تو اس کے یہاں بھی خدا، رسول، قرآن، جنت اور دوزخ جیسے سب ہی الفاظ موجود ہیں مگر ہر لفظ کے لیے اسلام کے متفقہ معتقدات سے بالکل مختلف تعبیر و تعریف ہے، اسی لیے خود اسی گروہ کے قول کے مطابق اس کا خدا الگ، رسول الگ، قرآن الگ، فقہ، حدیث و تفسیر الگ، مرنے جینے اور شادی بیاہ کے قوانین الگ حتیٰ کہ مسجدیں تک علیحدہ ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کے لیے کسی قسم کے دلائل و شواہد کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اس قسم کے عناصر ہندوستان کی سرزمین پر اُسی وقت سے آنے لگے تھے جب اسلام کی درخشاں کرنوں نے یہاں کی فضاؤں کو منور کرنا شروع کر دیا تھا، ان کے داعی اور مبلغ، پیروں، درویشوں، عالموں، واعظوں اور اکثر تاجروں کے بھیس میں یہاں آتے اور درپردہ اپنے مخصوص

عقائد کی تبلیغ کرتے اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتے تھے لیکن جب کبھی وہ علماء حق کی گرفت میں آجاتے تو اس کا تدارک ہوجاتا ورنہ خاموشی کے ساتھ وہ اپنے مشن میں مصروف رہتے اور بھولے بھالے لوگوں کے دین و ایمان کو پراگندہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) نے اپنی خودنوشت کتاب 'فتوحات فیروز شاہی' میں لکھا ہے:

> ''شیعوں کے فرقہ نے جسے روافض بھی کہا جاتا ہے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی، انھوں نے کتابیں اور رسالے لکھے اور ہمارے مذہب کے پہلے سرداروں (خلفاء راشدینؓ) کی بے حرمتی کی...... میں نے ان سب کو گرفتار کیا اور سزا دی...... ان کی کتابیں جلادیں اور اس طرح اللہ کے فضل سے اس فرقہ کا بالکل قلع قمع ہوگیا[1]۔''

مذکورہ بالا بیان اور دیگر تاریخی حقائق کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے اس دَور میں جس کو 'عہد سلطنت' کہا جاتا ہے شمالی ہند میں شیعیت کو کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوسکا بالخصوص جونپور کے سلاطین شرقیہ کے عہد میں خطۂ اودھ اور پورب کے علاقے ان اثرات سے بڑی حد تک پاک و صاف رہے، یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر بڑی چھوٹی بستی مدارس اور خانقاہوں سے آباد تھی، اور علماء اور مشائخ کے لیے جاگیریں اور وظائف حکومت وقت کی طرف مقرر تھیں اور وہ پورے انہماک کے ساتھ ترویج علم اور تبلیغ دین میں مصروف رہتے تھے چنانچہ لکھنؤ کے قرب و جوار کی بستیاں مثلاً کاکوری، سندیلہ، گوپامئو، بلگرام، صفی پور، خیرآباد، سترکھ، دیوہ، ردولی اور لاہرپور وغیرہ مراکز علم ہونے کے ساتھ خانقاہوں کے فیوض و برکات سے بھی معمور تھیں، یہی حال جونپور، الٰہ آباد، سلطانپور، رائے بریلی اور فیض آباد کے اضلاع کا بھی تھا۔

آٹھویں صدی ہجری کا آخری حصّہ ہندوستان کی علمی و دینی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے یہی وہ دور ہے جس میں تیموری شورش نے ایک ایسے سیلاب کی شکل اختیار کرلی جو وسط ایشیائی حکومتوں کو زیروزبر کرتے ہوئے سلطنت دہلی کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے بے قرار تھا۔ دہلی ہر وقت ان خطرات کی زد میں تھی اور یہاں کی تمام آبادی ایک غیریقینی اور بے اطمینانی کی فضا میں سانس لے رہی تھی چنانچہ وہاں کے علماء و مشائخ مستقبل کی تاریکی کو محسوس کرکے ہندوستان کے دوسرے ایسے مقامات پر نظر دوڑا رہے تھے جو نسبتاً مامون اور محفوظ دکھائی دے رہے تھے جس

---

[1] ایلیٹ اینڈ ڈاوسن، جلد ۳، ص ۳۷۷-۳۷۸

کے نتیجہ میں دہلی کی بساط علم الٹنے لگی اور علم و عمل کے قافلے وہاں سے روانہ ہونے لگے، سلاطین شرقیہ کی علم دوستی اور علماء و مشائخ کی قدر دانیوں کی وجہ سے جون پور واس کے اطراف اور سرزمین اودھ کے قصبات ان قافلوں کے میزبان بنے جس کے اثر سے یہاں کے قریات وقصبات علم و فضل کے گہوارے بن گئے، اہلِ علم اور ارباب دین کے یہ قافلے برابر یہاں پہنچتے رہے اور یہاں بڑی وسعت قلبی کے ساتھ ان کی پذیرائی ہوتی رہی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کا چپہ چپہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے معمور اور بزرگوں کے انفاس قدرسیہ سے روشن ہوگیا لیکن یہ فضا اور ہوا زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ یہاں ایک ایسے طبقہ کی حکومت آنے والی تھی جو اپنے دینی مسلک وعقائد اور افکار وخیالات کے لحاظ سے بالکل مختلف تھی۔

سرزمین اَودھ پر شیعی حکومت اور یہاں کی سیاسی صورت حال

ایران کے بادشاہ طہماسپ صفوی (۱۵۱۴ء- ۱۵۷۶ء) کی مدد سے جب ہمایوں (۱۵۰۸ء-۱۵۵۶ء) قندھار اور کابل فتح کرتا ہوا ۱۵۵۵ء میں دوبارہ ہندوستان آیا تو اس کے ساتھ بے شمار ایرانی سپاہی، امراء اور علماء بھی یہاں پہنچے، اسی وقت سے ایران اور ہندوستان کے درمیان قریبی تعلقات کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں شمالی ہندوستان میں شیعہ عمّال کا عمل دخل بڑھنے لگا اور انھیں اپنے مذہبی معاملات میں کافی آزادی مل گئی۔ ہمایوں کے بعد ایران سے شیعہ علماء، ادباء، شعراء، اطباء، ماہرین سیاست اور انتظامی امور اور فوجی معاملات میں انتہائی دَرک رکھنے والے افراد کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا جس کی وجہ سے یہاں شیعوں کی اور بھی معقول تعداد ہوگئی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں شمالی ہند میں شیعہ مذہب نے بڑا فروغ حاصل کیا، یہاں تک کہ اورنگ زیب (۱۶۱۸ء-۱۷۰۷ء) جیسے مذہبی اور پختہ سنی بادشاہ کے امراء میں بھی اس فرقہ کی اکثریت ہوگئی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے جانشین کے عہد میں تو شیعیت کھل کر سامنے آگئی اور سخت ٹکراؤ کی نوبت آ پہنچی تھی۔[1]

شمالی ہند میں شیعیت کا سب سے اہم مرکز لکھنؤ بنا کیونکہ اودھ پر شیعوں کی حکومت قائم

---

[1] رود کوثر، ص ۶۱۷

ہوچکی تھی۔ یہ حکومت مندرجہ ذیل نوابین پر مشتمل تھی جو مذہباً شیعہ اثنا عشری تھے اور اپنے مخصوص مذہبی عقائد کے بارے میں بہت حسّاس اور پُر جوش تھے اسی لیے ان کی تبلیغ و ترویج کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کیا کرتے تھے۔

۱۔ نواب سعادت خاں برہان الملک میرزا محمد امین نیشاپوری ۱۷۱۹ء تا ۱۷۳۷ء

۲۔ نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ ۱۷۳۷ء تا ۱۷۵۳ء

۳۔ نواب شجاع الدولہ ۱۷۵۳ء تا ۱۷۷۵ء

۴۔ نواب آصف الدولہ ۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۸ء

۵۔ نواب میرزا وزیر علی خاں ۱۷۹۸ء وزارت صرف چار ماہ

۶۔ نواب سعادت علی خاں ۱۷۹۸ء ۱۸۱۴ء

۷ نواب غازی الدین حیدر ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء

۸۔ نواب نصیر الدین حیدر ۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء

۹۔ نواب مرزا فریدوں بخت ۱۸۳۷ء تخت نشینی بہت تھوڑی مدّت کے لیے

۱۰۔ نواب محمد علی شاہ ۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء

۱۱۔ نواب امجد علی شاہ ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء

۱۲۔ نواب واجد علی شاہ ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء[۱]

مذکورہ بالا نوابین ابتداء میں اودھ اور اس کے اطراف میں بادشاہ دہلی کے جانب سے وزیر الممالک یا ایک صوبہ دار کی حیثیت سے متعین کیے گئے تھے مگر رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی طاقت بڑھانا شروع کر دی اور دہلی کی مرکزی حکومت کی روز بروز تنزلی وانحطاط سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان علاقوں میں اپنی گرفت مضبوط کر لی چنانچہ ایک وقت وہ آ گیا کہ نواب غازی الدین حیدر (م ۱۸۲۷ء) نے اودھ میں اپنی مطلق العنان بادشاہت کا اعلان کر دیا اس طرح اب تک ان کا دہلی کے مرکز سے جو نام چار کا رشتہ رہ گیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

---

[۱] نوابین اودھ کے سنین وفات میں اکثر کتابوں میں کچھ اختلافات ہیں، لہٰذا ہم نے یہاں تواریخ اودھ جلد اوّل مؤلفہ سیّد کمال الدین حیدر المخاطب بہ زائر، مطبوعہ نول کشور لکھنؤ کو بنیاد بنایا ہے۔

حکومت وقت کی جانب سے مسلمانوں پر مظالم

نوابین اودھ میں مذہبی غلو بہت تھا، ان کی عام پالیسی یہ تھی کہ ان کی مملکت میں تمام کلیدی عہدے شیعوں کو ہی دیئے جائیں اور عام مسلمانوں کو انتظامی ذمہ داریوں سے دور رکھا جائے تاکہ معاشی اعتبار سے وہ پسماندہ ہو جائیں اور ایک ادنیٰ رعیت کی حیثیت سے زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے بڑے بڑے مسلم خانوادوں اور اہل علم خاندانوں کی جاگیریں اور وظائف مختلف حیلوں اور بہانوں سے ضبط اور موقوف کرنا شروع کر دیں، اسی طرح دینی مدارس اور خانقاہوں کی امدادیں بھی جو سابقہ حکومت کی جانب سے ملا کرتی تھیں یک قلم موقوف کر دی گئیں۔ ان اقدامات سے دینی حلقوں میں تنگ دستی اور مفلوک الحالی پھیلنے لگی لیکن جو لوگ جاگیروں کی ضبطی اور وظائف کی بندش کے خوف سے شیعہ مذہب اختیار کر لیتے تھے ان کی جاگیریں اور وظائف واگذار کر دیئے جاتے تھے، اس طرح سینکڑوں خاندانوں نے جائیدادوں اور امدادوں کے بچانے کی لالچ میں شیعہ مذہب اختیار کر لیا لیکن وہ سخت جاں اور ثابت قدم افراد جو اپنے مذہب و مسلک پر بدستور قائم رہے وہ ہمیشہ کے لیے اپنی جائیدادوں اور روزینوں سے محروم کر دیئے گئے چنانچہ اس دار و گیر کے عالم میں اکثر و بیشتر علماء و مشائخ اپنے مدارس اور اپنی خانقاہوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور علم و عرفان کے وہ سرچشمے جو صدیوں سے رشد و ہدایت کے مرکز بنے ہوئے تھے آہستہ آہستہ ویران ہونے لگے اور وہ طبقہ جو اب تک پوری دلجمعی اور فراغت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ہمہ تن مصروف تھا وہ زبانوں پر تالے لگا کر گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو گیا۔ اس قسم کی ابتلاء و آزمائش کا سلسلہ جو نواب برہان الملک کے دور سے شروع ہوا تھا وہ نواب صفدر جنگ اور نواب شجاع الدولہ کے زمانے تک نہایت شد و مد کے ساتھ جاری رہا۔ ان مظالم کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت کے نام پر شیعی افکار و خیالات کو بھی فروغ دینے کی نت نئی تدبیریں کی جانے لگیں۔ اس مقصد سے شیعی رسومات کی ادائیگی کے لیے حکومت کی سرپرستی میں فراخدلی سے مالی امدادیں جاری کی گئیں، بڑے بڑے اوقاف قائم کیے گئے اور ان لوگوں کو بڑے بڑے منصب عطا کیے گئے جو اسلام کو ترک کر کے مذہب شیعہ اختیار کر لیتے تھے، اس طرح نہ جانے کتنی مسلم آبادیاں شیعہ آبادیوں

میں تبدیل ہوگئیں، اس موقع پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق جیسے معروف اور محتاط محقق کی وہ تحریر لائق ذکر ہے جو انھوں نے بلگرام کی تاریخ، وہاں کے شعراء فضلاء، اور اولیاء کے تذکرہ پر مشتمل کتاب 'ماثر الکرام' کے دفتر اوّل کے مقدمہ میں درج کی ہے، بلگرام وہی قصبہ ہے جہاں سے آج سنیّوں کے علاوہ بہت سے نامور شیعہ خاندان بھی وابستہ ہیں، چنانچہ اسی سلسلہ میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> ''ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ ان علماء و فضلائے بلگرام میں سے جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہل تشیع میں سے نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے وہاں بعد کے زمانہ میں رواج پایا اور اگر ان علماء میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہے اور وہ مذہبِ شیعہ پر ہے یا اُن کے نسب ناموں میں ان علماء کے نام نکلیں تو ہمارا یہ خیال اور بھی قوی ہو جائے گا۔ یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع و قصبات پر اور بعض اوقات دُور دراز کے مقامات پر بھی مذہبی لحاظ سے خاص اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ جون پور و دیگر مضافاتِ لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایہ تیقن کو پہنچ جاتا ہے۔ جب مذہب کی پشتی پر حکومت ہوتی ہے تو حالت اور اندیشہ ناک ہو جاتی ہے۔''[1]

مولوی عبدالحق کی مذکورہ بالا عبارت بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ پورے اودھ میں یہی ہوا ہے، ہر جگہ بیشتر خاندانوں نے اپنی جائیدادوں کو بچانے کے لیے یا حکومت وقت سے انعام و اکرام پانے کے لالچ میں اپنے آبائی مذہب کو ترک کر کے مذہب شیعہ اختیار کر لیا تھا۔ یہاں یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے مشائخ و صوفیہ نے حکومتِ وقت کی نگاہوں میں اعتبار پانے کے لیے شیعہ و سنی مسلک کے درمیان 'تفضیلیت' کا مسلک بھی اختیار کیا تا کہ وہ بزعم خود سنیّوں میں سنی بھی رہیں اور شیعوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیں کہ دیکھیے ہم تو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کو سب پر فوقیت و فضیلت دیتے ہیں۔ اس طرح اُس دَور میں خانقاہوں کے ذریعہ تفضیلیت کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامیؒ (م ۱۷۸۵ء) ان حالات کے چشم دید گواہ تھے، انھوں نے بڑے دلدوز انداز میں اس دور کی منظر کشی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

---

[1] ماثر الکرام، دفتر اوّل، حسان الہند مولانا میر غلام علی آزاد بلگرامیؒ، ص ۱۴

وتا حدود ۱۱۳۰ھ ثلاثین ماۃ والف ہنگامۂ علم و علماء دریں گل زمیں گرمی داشت تا آنکہ برہان الملک سعادت خان نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبہ اُودھ شد و اکثر بلاد عمدۂ صوبہ الہ آباد نیز مثل دار الخیور جونپور و بنارس و غازی پور کٹرہ و مانک پور کوڑہ جہان آباد وغیر ہا ضمیمۂ حکومت گردید و وظائف وسیور غالات خانوادہائے قدیم و جدید یک قلم ضبط شد و کار شرفا و نجبا بہ پریشانی کشید و اضطرار معاش مردم آں جا را از کسب علم باز داشتہ در پیشہ سپاہگری انداخت و رواج تدریس و تحصیل باآں درجہ نماند و مدارسی کہ از عہد قدیم معدن علم و فضل بود یک قلم خراب افتاد وانجمن ہائے ارباب کمال پیشتر برہم خورد اِنَّا لِلّٰہ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن وبعد ارتحال برہان الملک نوبت حکومت بہ خواہر زادۂ اُو ابوالمنصور خاں صفدر جنگ رسید و وظائف واقطاعات بدستور زیر ضبط ماند و در اواخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۹ھ تسع و خمسین وماۃ والف صوبہ داری الہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد و تتمۂ وظائف آں صوبہ کہ تا حال از آفت ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط درآمد و درعہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعود نمود و نائب صوبیدار کار برارباب وظائف تنگ تر گرفت وتا حین تحریر ایں دیار پامال حوادث روزگار است لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔[1]

۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین کی مٹی میں علم وعلماء کی گرمی باقی رہی یہاں تک کہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری محمد شاہ کے عہد آغاز میں صوبہ اودھ کا حاکم مقرر ہوا تو اس نے الہ آباد کے اکثر بڑے بڑے شہر مثلاً جون پور، بنارس، غازی پور، کٹرہ، مانک پور اور کوڑہ جہان آباد وغیرہ کو اپنی حکومت میں شامل کر کے قدیم وجدید خاندانوں کے وظائف اور جاگیریں اور معافیاں یک قلم ضبط کرلیں جس کی وجہ سے شریفوں اور عزت داروں کو بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں، مختلف مشکلات اور معاشی دشواریوں کی وجہ سے اس علاقے کے لوگوں کو علم حاصل کرنے کے بجائے سپہ گری کا پیشہ اختیار کرنا پڑا، درس وتدریس کا رواج اس لیے ختم ہوگیا کہ قدیم زمانے سے جو مدرسے علم وفضل کے سرچشمہ تھے وہ بالکل ویران ہوگئے اور اکثر باکمال لوگوں کی محفلیں سنسان ہوگئیں اناللہ وانا الیہ راجعون۔ برہان الملک کے مرنے کے بعد اس کا بھانجہ ابوالمنصور صفدر جنگ حکومت پر قابض ہوا، اس کے دور میں بھی وظائف اور جاگیریں بدستور سابق ضبط رہیں، ۱۱۵۹ھ محمد شاہ کے آخری دور میں الہ آباد کی صوبیداری بھی صفدر جنگ کے سپرد ہوگئی چنانچہ جو وظائف اب تک کسی طرح باقی بچ گئے تھے وہ بھی ضبط ہوگئے، احمد شاہ کے دور میں جب صفدر جنگ وزیر اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہوا تو نائب صوبیدار نے وظیفہ پانے والے خاندانوں پر مزید سختی کی اور اس کتاب (مآثر الکرام) کی تصنیف کے وقت تک یہ علاقہ برباد اور تباہ حال ہے، شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی (بہتر) صورت پیدا فرمادے۔

۱؎ مآثر الکرام، دفتر اوّل، ص ۲۲۲-۲۲۳

ان شدائد اور مصائب کے نتیجہ میں اودھ میں جو دینی افراتفری پیدا ہوئی تھی اس کی کچھ تفصیل مولانا قاضی اطہر مبارک پوری صاحب مرحوم ومغفور نے اپنے کتاب 'دیار پورب میں علم وعلماء' میں بھی بیان کی ہے جس میں انھوں نے صوبہ اودھ کے بعض ممتاز مسلم خاندانوں کے شیعہ مذہب اختیار کرلینے والوں کی ناموں کے ساتھ تفصیل بھی دی ہے[1]۔ شاہانِ اودھ کے اندر تقریباً ہر ایک کے اندر مذہبی تعصب بہت تھا اور اس تعصب کا شکار زیادہ تر سنی ہی ہوا کرتے تھے۔ مولوی نجم الغنی خاں صاحب نے تو ایک عجیب وغریب روایت نواب امجد علی شاہ (م ۱۸۴۷ء) کے دور کی بیان کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورے معاشرے میں سُنیوں کے ساتھ کس طرح کا معاملہ ہوتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"مذہبِ شیعہ نے (اُس دور میں) بہت رونق پائی، اہل سنّت و جماعت کا شمار ہندوؤں کے ساتھ ہوتا تھا۔ سیّد العلماء مجتہد العصر مولوی سیّد حسن بن سیّد دلدار علی کو بادشاہ بہت مانتا تھا، ان کے دور میں بے شمار سنّی مسلمان شیعہ ہو گئے، اکثر و بیشتر سنّیوں کو نکال کر ان کی جگہ شیعہ مومنین کو ملازمت دی گئی اور سنّیوں کا سامان و جائیداد ضبط کرلی گئی۔

ایک حکم یہ بھی جاری ہوا کہ کوئی ہندو یا سنّی کسی سرکاری دفتر میں اللہ کے نام، پنجتن کے نام اور ائمہ اطہار کے نام اپنے ہاتھ سے نہ لکھے[2]۔"

اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ (معزول ۱۸۵۶ء) جو اپنی عیاشیوں، زنانہ مزاجیوں اور بے راہ رویوں کی وجہ سے کافی معروف ہیں اور اکثر مورخین ان کی رواداری اور بے تعصبی کا بھی چرچا کرتے ہیں۔ ان کی ادب نوازی، داد و دہش اور فیاضی اپنی جگہ پر مسلم ہے مگر مذہبی عقائد میں وہ بھی کسی سے کم متعصب نہیں تھے۔ مولوی نجم الغنی خاں نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھیں اپنے مذہب میں بڑا غلو تھا چنانچہ انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام 'مجموعہ واجدیہ' رکھا تھا، یہ کتاب چھپ چکی ہے، اس میں ایک مضمون کی سرخی یہ تھی۔ اسامی ملعونان وملعونات کہ برآنہا تا ابد لعنت باید کرد۔ اس عبارت کے نیچے کئی صفحوں میں صحابہؓ وغیرہ کے نام لکھے تھے جن میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عائشہؓ اور عشرہ مبشرہ کے نام شامل تھے[3]۔

ایسی صورتِ حال میں جب کہ مطلق العنان حکمرانوں کے مذہبی تعصب کا یہ حال ہو تو ان

---

[1] دیار پورب میں علم اور علماء، ص ۱۱۰-۱۱۲ [2] تاریخ اَودھ، جلد پنجم، ص ۲۳ [3] تاریخ اَودھ، جلد پنجم، ص ۱۰۰

کے زیرِ اثر دوسرے اراکین سلطنت اور امراء ریاست کا اپنے سے غیر مذہب والوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اس پر مزید کچھ کہنا بے کار ہے۔ کسی حکومت کی جب متعینہ پالیسی ہی یہ ہو جائے کہ کسی ایک مخصوص طبقہ کو سیاسی اور معاشی حیثیت سے کچل کر رکھنا ہے اور اس کو علمی و دینی طور پر بالکل تہی دامن کر دینا ہے تو اس سے کوئی دوسری توقع رکھنا حقیقت سے روگردانی کرنا ہے۔ شاہان اودھ کے دور میں اگر کسی سنی خانوادے کو یا کسی فرد کو کوئی نمایاں مقام حاصل ہوا ہے تو اس کا سبب کوئی وقتی مصلحت، سیاسی مجبوری یا ان میں ملّی غیرت وحمیت کا فقدان ہی ہو سکتا ہے۔

معاشرے میں تعیش اور توہم پرستی

جب سیاسی طور پر کوئی طبقہ جبر واستبداد کے ذریعہ بالادستی حاصل کر لیتا ہے اور دولت کی فراوانی اس کے قدم لیتی ہے تو مذہب کی حقیقی روح اور اخلاق کی ساری قدریں پادر ہوا ہو جاتی ہیں فرماں رواؤں کے مزاج میں تعیش اور توہم پرستی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اخلاقِ حمیدہ کو خیر باد کہہ کے خصائل رذیلہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فرماں رواؤں کی ان مزاجی کیفیتوں سے ان کے امراء اور عمائدین سلطنت بھی متاثر ہوتے ہیں اور پھر ان کے ماتحت دوسرے عہدہ دار اور منصب دار بھی اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ اثر پذیری کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ عیش پرستی اور لہو ولعب کا یہ میلان خواص سے منتقل ہوتا ہوا عوام تک پہونچ جاتا ہے اور وہ بھی اپنے سے اوپر والے طبقہ کی پیروی میں وہی سب کچھ کرنے لگتے ہیں جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے چلے آرہے ہیں۔ کچھ ایسی ہی حالت اودھ میں عموماً اور لکھنؤ میں خصوصاً پیدا ہو گئی تھی۔ دینداری کم سے کم اور بے دینی اور لہو ولعب میں انہماک زیادہ سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ ان حالات کے پیدا ہونے کی ساری ذمّہ داری اودھ کے نوابین پر ہے، انھوں نے اپنی عادات واطوار سے جس معاشرے کی داغ بیل ڈالی تھی اسی کو عوام نے اختیار کیا۔

نواب آصف الدولہ کی رکاکتِ طبع

نواب آصف الدولہ (م ۱۷۹۸ء) کے اخلاق و عادات کے بارے میں مولوی نجم الغنی خاں صاحب نے لکھا ہے کہ:

"نواب آصف الدولہ کی طبیعت لہو ولعب کی طرف مائل تھی، رذیل اور بدقماش لوگوں کی صحبت

اور ہم نشینی بہت پسند تھی، بے محل ہنسنا، گالی دینا اور پھر فحش کلام کے جواب کا تر کی بہ تر کی طالب رہنا، لایعنی کھیلوں کی طرف رغبت رکھنا، دوسرے اشخاص کی فحش کلامی سے نہایت محظوظ ہونا، بھری محفل میں کلمات فسق و فجور کو ادا کرنا اور سننا بہت پسند خاطر تھا[1]۔"

غور کا مقام ہے کہ جب حاکم وقت کے اخلاق کا یہ حال ہو تو پھر اس کے مصاحبین اور وہاں کے عوام کا کیا حال ہوگا؟ پھر دولت کی فراوانی اور اخلاق و کردار کی حد درجہ گراوٹ کے ساتھ جب سلطنت کی باگ ڈور عورتوں کے ہاتھ میں چلی جائے اور انھیں سیاہ و سفید کرنے کا حق حاصل ہو جائے تو جو کسر باقی رہ گئی ہو وہ بھی پوری ہو جاتی ہے اور اگر کوئی خرابی مذہب کے نام پر رائج ہو جاتی ہے تو پھر اس کے تباہ کن اثرات کا تو کوئی ٹھکانا نہیں رہتا ہے۔ شاہان اودھ کے دور میں کچھ اسی قسم کے حالات تھے۔ ہر نواب کے زمانہ میں کچھ نہ کچھ بے ہودہ رسموں کا اجراء ہوتا تھا اور انھیں مذہب کا لباس پہنا کر جاذب توجہ بنایا جاتا تھا جس کا نتیجہ بدترین بے حیائی اور بدکرداری پر منتج ہوتا تھا۔

نواب غازی الدین حیدر اور ان کی بیگم کی اختراعات

اودھ کے مشہور انشا پرداز و ادیب اور صحافی مولانا عبد الحلیم شررؔ مرحوم اودھ کے شاہی خاندان کے بہت قریب تھے، یہاں کے اکثر و بیشتر حالات و واقعات کے وہ چشم دید گواہ تھے، انہوں نے نواب غازی الدین حیدر (م ۱۸۲۷ء) کے دور میں لکھنؤ کا حال اس طرح لکھا ہے:

"اس کے (غازی الدین حیدر کے) زمانے تک لکھنؤ میں حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغاز سلطنتِ اسلام میں دیگر بلاد ہند اور سارے ملک کا تھا مگر اس وقت سے بادشاہ اور ان کے خاص محل کے انہماک مذہبی کی وجہ سے شیعیت حکومت لکھنؤ کا ایک نمایاں عنصر بن گئی۔ فرنگی محل کے علماء کی طرف سے حکمرانوں کی توجہ ہٹ گئی اور خاندان اجتہاد و عروج پا کے سلطنت کا اصلی مقنن قرار پایا۔ لیکن مذہب شیعہ اگر اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا، خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کیں جن کی وجہ سے صرف اسی قدر نہیں ہوا کہ بادشاہوں اور امیروں میں طرح طرح کی طفلانہ مزاجیاں پیدا ہوئیں بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نئی نرالی اور عجیب ہو

---

[1] تاریخ اودھ، جلد سوم، ص ۲

گئی ـــــ سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس میں اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل میں امام ممدوح کے حالات بیان کر کے ثواب حاصل کر لیا جائے تو مضائقہ نہ تھا، مگر نہیں، یہاں ہندوؤں کے جنم اشٹمی کے رسوم کے موافق پورا زچہ خانہ مرتب کیا جاتا، اس کے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیدوں کی خوبصورت لڑکیاں لے کے ائمۂ عشر کی بی بیاں قرار دی گئیں تو پھر ان کے وہاں اماموں کی ولادت بھی ہوتی۔ اور بارہوں اماموں کی ولادت کی تقریبیں بڑے کروفر کے ساتھ منائی جانے لگیں[1]۔"

نواب نصیر الدین حیدر کی زنانہ مزاجیاں

اودھ کے ایک دوسرے نواب نصیر الدین حیدر (م ۱۸۳۷ء) نے تو کمال ہی کر دیا تھا، جس کو سن کر اور پڑھ کے تہذیب سر دھنتی رہ جائے گی۔ موصوف کے بارے میں مولانا شرر ہی کا بیان ملاحظہ ہو:

"نصیر الدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا لباس پہنتے، زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمہ اثنا عشر کی فرضی بی بیاں (اچھوتیاں) اور ان کی ولادت کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کر زچہ خانے میں بیٹھتے، چہرہ اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے، جس کے لیے ولادت چھٹی اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے، یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو ان ہی سے فرصت نہ ملتی (لہٰذا) سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔ اس زنانہ مزاجی اور طفلانہ حرکتوں کے ساتھ (وہ) نہایت ظالم بھی تھے لیکن چونکہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوئی تھی اس لیے ان مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتیں ہی ہوتی تھیں بیبیوں عورتوں کو ادنیٰ قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چنوا دیا[2] غالباً انھیں حرکتوں کے چلتے ۱۸۳۷ء میں ان کو زہر دے دیا گیا[3]۔"

اودھ کے ان ناگفتہ بہ حالات پر ایک ہم ہی نوحہ کناں نہیں ہیں بلکہ ہر دور میں دینی و ملّی غیرت رکھنے والے علماء و ادباء نے اس دور کی مذہبی اور اخلاقی سیہ بختی پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور ان کی متعصبانہ روش اور ان کی غفلت شعاریوں کی نشاں دہی کی ہے۔ ہمارے دور کے ایک ذی

---

[1] گذشتہ لکھنؤ، ص ۵۲-۵۳ [2] گذشتہ لکھنؤ، ص ۵۷-۵۸ [3] گذشتہ لکھنؤ، ص ۵۰

علم اور معتبر عالم دین کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''نوابانِ اودھ کا دور سیاسی اور ملکی حوادث وفتن سے پر تھا، انگریزوں کے ایسے ہوشیار حریف کی ریشہ دوانیوں کے باوجود یہ عیش وعشرت میں مدہوش تھے۔ کبھی خوابِ غفلت سے بیدار ہوتے تو شراب وکباب کے داغ مذہبی دلچسپیوں سے دھونے کی کوشش کرتے مگر مذہب کی حقیقی تعلیمات پر عمل کے بجائے مذہبی مراسم کی نمائش سے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے، طاقتور حریف سر پر تھا مگر اس ملت کو متحد رکھنے کے بجائے شیعیت کی تبلیغ سے سنّیوں کو بیزار کر رہے تھے اور اس میں حکیمانہ طرز پر دعوت کے بجائے ترغیب وترہیب سے کام لیتے تھے، ان کی روش نے اودھ کی علمی زندگی کو تہس نہس کر دیا اور علماء ومشائخ کے پرانے خاندان تباہ ہوگئے''۔[1]

اودھ کا پورا معاشرہ اور خصوصاً لکھنؤ کی پوری فضا پر اسی طرح کی تباہی وبربادی اور اخلاقی گراوٹ کے بادل چھائے ہوئے تھے، ہم یہ نہیں کہتے کہ زندگی کی ہر ڈگر پر یہی حال تھا، اُردو زبان وادب کی سرپرستی یہاں خوب کی گئی، بڑے بڑے شعراء اور مصنّفین یہاں پیدا ہوئے، ادب کی کوئی صنف ایسی نہ تھی جس میں یہاں کے باکمال لوگوں نے گرانقدر اضافے نہ کیے ہوں، شعروسخن کے میدان میں تو لکھنؤ کی انفرادیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے یہاں تک کہ دہلی اسکول کی طرح لکھنؤ اسکول بھی شعروادب کی دنیا میں ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، اسی طرح فن تعمیر اور مختلف صنعت و حرفت مثلاً چکن اور کامدانی، کارچوبی اور سلمے ستارے کا کام، طلائی ونقرئی زیورات، پیتل اور تانبے کے ظروف، مٹی کے برتن اور کھلونے اور دیگر ایجادات واختراعات وغیرہ بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ متمول اور علمی حلقوں میں تہذیب وشائستگی اور رکھ رکھاؤ بھی تھا اور اس کے اثرات عوام میں بھی ایک حد تک پائے جاتے تھے۔ یہ سب کچھ دُرست اور تسلیم ہے لیکن یہاں تو ذکر دینی ماحول اور اخلاقی پاکیزگی کا ہے، دین واخلاق کی قدریں جتنی یہاں پامال کی گئی ہیں اس کی مثالیں ملک کے دوسرے حصوں میں کم ہی ملیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہانِ اودھ کے دور میں لکھنؤ شہر میں کسی بھی سلسلہ کے بزرگوں نے اپنی خانقاہی بساط نہیں بچھائی حالانکہ لکھنؤ کے قرب و جوار میں اکثر مقامات پر صوفیہ ومشائخ نے اپنی خانقاہیں قائم کیں، مدارس قائم ہوئے اور ذکر الٰہی کی مجلسیں آراستہ کی گئیں، مگر لکھنؤ شہر ان انوار وبرکات سے تقریباً محروم رہا، گنتی کے چند بزرگوں میں ایک حضرت شاہ مینا لکھنویؒ (م ۱۴۷۰ء) کی درگاہ آج بھی یہاں موجود ہے مگر اس کو بھی

---

[1] دیار پورب میں علم اور علماء، ص ۱۰۵

یہاں کے عیاش طبیعت لوگوں نے حسن کا بازار بنا کے رکھ دیا ہے، آج کے دور کے ایک لکھنوی مصنف نے جو اس درگاہ کا نقشہ کھینچا ہے اسے پڑھ کر خود نتیجہ نکالا جا سکتا ہے، وہ لکھتا ہے:

''قوالی کا سلسلہ رات کو دیر تک جاری رہا کرتا تھا، شہر کی قریب قریب ہر طوائف شام کو اس دربار میں حاضر ہو کر سرِ نیاز خم کرتی تھی اور ان میں کی ہر فنکارہ تھوڑی دیر کے لیے سہی لیکن قوالی گا کر بزم سماع کو ضرور گرم کر جاتی تھی۔''[1]

واجد علی شاہی دور۔ ایک مرقع عبرت

اودھ کے آخری شیعہ حکمراں نواب واجد علی شاہ عرف جانِ عالم اختر پیا (معزول ۱۸۵۶ء) تھے۔ بدقسمتی سے ان ہی کے دور میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا آفتاب غروب ہوا، ان کا دور مسلمانوں کی نکبت وادبار کا آخری نمونہ تھا۔ انھوں نے نفسانی خواہشات اوڑ اپنے عیش ونشاط کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ نواب برہان الملک کے زمانے سے لے کر اس دور تک جو کسر رہ گئی تھی وہ سب پوری ہو کر رہی۔ موجودہ زمانے کے ایک ادیب وصحافی نے واجد علی شاہی دور کی جو درد انگیز تصویر کھینچی ہے وہ بڑی اندوہناک ہے، اس کا ایک ایک لفظ اور ہر ایک جملہ دینی غیرت اور ملی حمیت رکھنے والوں کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے، ان کی تحریر میں ہندوستان کی معاشی پسماندگی، واجد علی شاہ کی عیاشانہ طرزِ حکومت اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی بڑی دلدوز داستان ہے، اس کے ذریعہ لکھنؤ اور اودھ کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی ماحول کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ نہیں تھی کہ انگریز نے مسلمان بادشاہوں کا استحصال کیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ہاتھ میں تلوار تھی اور یورپ کے ہاتھ میں بندوق آچکی تھی۔ ہندوستان دستکاری کے عہد میں تھا اور یورپ میں مشین رائج ہو چکی تھی، ہندوستان کنکوے اڑا رہا تھا اور یورپ غبارے کی مدد سے ہوا میں اڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب آخری تاجدارِ اودھ واجد علی شاہ تخت نشیں ہوئے تو بدلتے ہوئے وقت کے باوجود ان کے ذہن میں چکن کی صنعت کو ترقی دینے یا زری کے کام کو ایک فیکٹری میں بدل دینے کا خیال کبھی نہیں آیا بلکہ قیصر باغ کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا دیوانِ دل کشا، بارہ دری، سنگ مرمر کے پل اور امام باڑے بنوائے گئے، قیصر باغ کی عمارتوں کا سلسلہ تین سو ساٹھ محلوں تک وسیع کر دیا گیا جو دراصل تین سو ساٹھ منکوحہ وغیر منکوحہ بیگمات کے لیے تھا۔ اس

---

[1] قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، ص ۲۷۶

زمانے میں جبکہ روپے کا ۲۴ سیر گیہوں ملتا تھا قیصر باغ کی تعمیر پر نواب صاحب نے دو کروڑ روپے ضائع کیے۔

ہندوستانی مورخ نواب واجد علی شاہ کی طرفداری میں لکھتے ہیں کہ نالائق مصاحبوں اور بدخواہ ہم نشینوں نے نواب کے مزاج کو بدل دیا تھا اور عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا تھا، مگر نہیں، انسان خود اپنے مزاج و عقل کے مطابق اپنے احباب کا انتخاب کرتا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے کہ:

پر تو نیکاں نہ گیرد ہر کہ بنیادش بدست
تربیت نا اہل را چوں گردگان بر گنبدست

(یعنی جن کی بنیاد بُری ہے وہ نیکوں کی عادت قبول نہیں کرتا، نا اہل کو تعلیم دینا ایسا ہے جیسے گنبد پر اخروٹ لڑھکا دیا جائے۔)

بہر نوع کوئی مشغلہ اور کوئی بازی ایسی نہ تھی جو واجد علی شاہ عرف اختر پیا نے اختیار نہ کی ہو۔ نواب کے اعصاب پر عورت اس حد تک سوار تھی کہ نواب نے فوج ہی کا حلیہ بدل دیا تھا، عورتوں کی فوج بنائی گئی، زنانہ فوج کی کمان خواجہ سراؤں کے سپرد کی گئی، فوجی رسالوں کے نام 'بانکا'، 'ترچھا'، 'گھنگھور' اور پلٹنوں کے نام 'اختری'، 'مشتری' اور 'زہرہ' (اس وقت کی مشہور طوائفوں کے نام پر) رکھے گئے۔ جو عورت نواب کی ہوس پر قربان ہو جاتی وہ خطاب سے نوازی جاتی، اور باعزّت ہو جاتی جیسے نواب صاحب ایک بار ایک مہترانی پر فریفتہ ہو گئے تو متعہ کیا اور پھر اس مہترانی کو نواب مصفا بیگم کا نام دے دیا گیا، اسی طرح ایک بہشتن نظر پر چڑھ گئی تو اگلی ہی صبح کو اسے نواب آب رساں بیگم کے لقب سے نوازا گیا۔ کمسن لڑکیاں نواب صاحب کے لیے پالی جاتی تھیں، بالغ ہوتیں تو نواب ان سے متعہ کرتے اور انھیں متوعہ قرار دے دیا جاتا اور جب ایسی لڑکیوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو جاتی تو اس کو ناچنے گانے والیوں کے طائفے میں بدل دیا جاتا اور ہر طائفے کا ایک نام ہوتا جیسے رادھا منزل والیاں، جھومر والیاں، نتھ والیاں اور گھونگھٹ والیاں۔ بارہ کنواری لڑکیاں جو بارہ اماموں سے منسوب کر دی جاتی تھیں وہ زندگی بھر کنواری ہی رہتی تھیں اور انھیں اچھوتیاں کہا جاتا تھا۔

غرض کوئی ایسی نادانی نہ تھی جو واجد علی شاہ نہ فرماتے ہوں۔ چونچلوں اور چہلوں میں ان کا جواب نہیں تھا۔ کبھی وہ اپنے اوپر زچگی کی کیفیت طاری کر لیتے تھے، پوتڑے دُھلتے تھے اور درباری مبارکباد دیتے تھے، شیرینی بٹتی تھی، مجرے ہوتے تھے، کبھی نواب صاحب زنانہ میک اَپ کر کے ناٹک میں زنانے رول کرتے تھے، ناچتے تھے، گاتے تھے، کتھک و ناچ اور ٹھمری ان

کے پسندیدہ ناچ گانے تھے۔ بس عیش وعشرت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور ان کا وجود عیاشیوں کا سراپا تھا اور انھوں نے جس لکھنؤ کو جنم دیا تھا وہ ایک طوائف خانے سے کم نہ تھا، بٹیر بازی، مرغ بازی، کنکوے بازی اور لفاظی کی صورت میں وہ آثار خطۂ اودھ میں آج تک پائے جاتے ہیں۔
جب راجا کا یہ حال ہو تو پھر پرجا کا بدحال ہونا لازمی چیز ہے، چنانچہ جب اودھ میں انتہا درجہ کی بدنظمی پھیل گئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت نے نواب کو تنبیہ کی مگر نواب صاحب نے کوئی نوٹس نہیں لیا آخر کار کمپنی حکمرانوں نے ۳۱ر جنوری ۱۸۵۶ء کو سلطنت اودھ کو ختم کر دینے کا فرمان جاری کر دیا لیکن اختر پیا کی زنانہ فوج نے اختر پیا کو یہ کہہ کر تسلی دے دی کہ ''تالیاں بجاؤ موئے بھاگ جائیں گے۔'' لیکن اٹاری پر بیٹھے ہوئے کالے کوّے کو تو تالی بجا کر بھگایا جاسکتا ہے مگر گورے فرنگی کو نہیں۔
دو کروڑ روپے سالانہ آمدنی والی مملکت اودھ آخر انگریزی حکومت کے تحت آ گئی اور نواب واجد علی ایک قیدی کی حیثیت سے کلکتے کے لیے روانہ ہوئے تو اپنا یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

درو دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

کہتے ہیں کہ بھلے گھوڑے کو ایک چابک اور بھلے آدمی کو ایک بات کافی ہوتی ہے لیکن واجد علی شاہ ان دونوں مخلوق سے کچھ زیادہ ہی اونچے تھے، ان کے لیے اتنی بڑی ٹھوکر بھی ناکافی رہی۔ فورٹ ولیم اور مٹیا برج کی نظر بندی ہی کے دنوں میں واجد علی شاہ ایک چڑیا گھر بنانے میں لگ گئے، کوٹھیاں بنوائیں اور باغات بھی لگوائے اور جب ان کی رگ عیش ونشاط پھر پھڑکنے لگی تو قید خانے ہی سے اپنی لکھنوی محبوباؤں کو محبت بھرے خطوط لکھنے شروع کر دیے۔ کلکتہ سے لکھنؤ تک تحفوں اور محبت کی نشانیوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا۔ ایک بار اختر پیا نے دلدار محل سے مِسّی منگائی، اختر محل سے ان کی زلفوں کے بال اور جعفری بیگم سے ان کے دوپٹے کی فرمائش کی۔ زلفوں کے بال اختر پیا اپنے سرہانے رکھ کر سوتے، بالوں کو بار بار سونگھتے اور دوپٹے سے لپٹ لپٹ کر روتے تھے۔
واجد علی شاہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بدبختی کا آخری مرقع تھے، اس سلسلہ میں مؤرخوں نے دروغ گوئی سے قطعی کام نہیں لیا۔ ۱۹۴۷ء میں کلکتہ سے لکھنؤ تک واجد علی شاہ کے پوتے کی آمد کو جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ کس طرح قیصر باغ کی بارہ دری میں ان کی تاج پوشی کی رسم انجام دی گئی۔ تین رات رقص وسرور کی محفلیں منعقد ہوئیں، ایک شام گومتی کے کنارے پتنگ بازی کا میچ ہوا، ایک شام بٹیر بازی کا مقابلہ اور اور تیسری شام وہ

مرغوں کی جنگ دیکھنے کے بعد کلکتہ واپس چلے گئے[1]"

مذکورہ بالا اقتباسات سے اودھ کی سیاسی، معاشی اور اخلاقی صورتِ حال کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے، جب مطلق العنان شاہانِ وقت، ان کے ورزاء، امراء اور اعیانِ حکومت ہی جبر واستبداد اور اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہوں تو اس کا عوام پر برا اثر پڑنا لازمی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہاں کے پورے معاشرے میں دین سے غفلت ولاپرواہی، کھیل کود اور میلوں ٹھیلوں میں انہماک کے علاوہ گانے بجانے کی ان محفلوں کے آرستہ کرنے کا رواج حد سے زیادہ ہو گیا جس کو آج کی نام نہاد مہذب دنیا میں تہذیب وثقافت اور آرٹ کا نام دیا جاتا ہے۔

اودھ کے ماحول میں شیعی اثرات

لکھنؤ صوبۂ اودھ کا دارالسلطنت تھا اور اودھ پر شیعوں کی حکومت تھی اس لیے لکھنؤ کو شیعی دنیا میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہاں کے رہن سہن طور وطریق اور پورے تہذیب وتمدن پر شیعی رنگ غالب تھا۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ کے مقولہ کے مطابق یہاں کی رعایا اپنے آقاؤں کے نقش قدم پر چلنا اپنے لیے باعثِ فخر خیال کرتی تھی، عوام تو عوام تھے خواص اہل سنت کا بھی یہی عالم تھا کہ وہ اپنے دین ومسلک کے مقابلہ میں حکومت وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ شیعی مجلسوں، محفلوں اور مذہبی رسوم میں رونق بڑھانے کا ذریعہ اور وسیلہ یہی سنی عوام تھے جو اپنی غربت اور جہالت کی وجہ سے اپنی دینی شناخت کھو چکے تھے۔ اس دور میں سنیّوں میں تعزیہ داری عام تھی حتیٰ کہ خود لکھنؤ میں تعزیہ بنانے اور ان کو فروخت کرنے کا کاروبار زیادہ تر سنی ہی کیا کرتے تھے۔ آئے دن یہاں تعزیے دُلدُل، مہندی اور جلوسہائے عزا نکلا کرتے تھے جن میں بھیڑ بھاڑ اور شان بڑھانے کا ذریعہ یہی سنی عوام ہوتے تھے۔

ان اثرات سے اردو زبان بھی متاثر ہونے سے نہ بچ سکی، اس کے اکثر محاورے شیعی سیاق وسباق میں رائج ہو گئے جیسے پانی نہ ملنے پر کربلا کی یاد آنا، یا کربلا بنا دینا، صفِ ماتم بچھنا، تبن کانے ہونا (یہ ناکامی اور نامرادی کے لیے بولتے ہیں اور بطور تبرا خلفائے ثلاثہؓ مراد ہوتے ہیں)

---

[1] دریچے، مرتبہ شمس کنول، روزنامہ "قومی آواز" نئی دہلی، ۱۶؍اگست ۱۹۸۷ء

پو بارہ ہونا (کسی بازی میں جیت جانا اور کنایۃً ائمہ اثنا عشر مراد ہیں) چوڑیاں ٹھنڈی کرنا، یارِ غار ہونا (غیر محمود معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور کنایۃً غارِ ثور میں حضرت صدیق اکبرؓ کی ہم رکابی پر طنز ہے) اور ثقیفہ بستن (سازش کرنے کے لیے جمع ہونے کے معنی میں اس کو استعمال کرتے ہیں اور کنایۃً ثقیفہ بنی ساعدہ مراد ہے جہاں حضرت صدیقؓ کی خلافت کا انعقاد ہوا تھا) اسی طرح بہت سے ایسے الفاظ عام طور پر لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے اور اب بھی رائج ہیں جن سے صحابۂ کرامؓ کی در پردہ توہین مقصود ہے مثلاً زید، عمر اور بکر پر ضرب کے لفظ کی تکرار، سارے عربی مدارس میں برسہا برس سے افعال کی گردان میں اس کی رٹ لگائی جاتی ہے۔ یہ ایک خالص تبرائی انداز ہے جس سے برگزیدہ اصحابِ رسولؐ حضرت زیدؓ بن ثابتؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ناموں کے ساتھ ضرب کی تکرار سے توہین کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ہمارے مدارس کے طلباء اور اساتذہ بے سوچے سمجھے آج بھی اسی روش کو اپنائے ہوئے ہیں۔ مدارس کے دارالافتاء میں عام طور پر فتاوے آتے ہیں ان میں عورت کے لیے ہندہ اور مرد کے لیے زید کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے، یہ دونوں نام بھی توہین اصحاب کی نیت سے ہی رائج کیے گئے ہیں یہاں ہندہ سے زوجہ ابوسفیانؓ اور زید سے حضرت زید بن ثابتؓ مراد ہوتے ہیں۔ اکثر مقامات پر مساجد کے امام کو پیش نماز کہا جاتا ہے۔ یہ شیعوں کی ایجاد ہے کیونکہ ان کے یہاں امام ایک خاص صفات کے مالک کو کہتے ہیں جو کم سے کم نبوت کے ہم رتبہ تو ہوتا ہی ہے ورنہ بہتوں کے نزدیک تو وہ نبوّت سے بھی زیادہ بلند مرتبہ کا مالک ہوتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں بہت سی رسمیں شیعی اثرات کی وجہ سے رائج ہو گئی ہیں مثلاً جب کوئی شخص سفر پر نکلتا ہے تو عورتیں اس کے بازو پر ایک کالی پٹی باندھ دیتی ہیں جس کو امام ضامن باندھنا کہتے ہیں، یعنی بغرض حفاظت اس شخص کو امام کی ضمانت میں دے دیا جاتا ہے جو قضا و قدر میں اتنا دخل رکھتے ہیں کہ جس کو چاہیں مصیبت و ناگہانی سے بچالیں۔ عام طور سے حجام یا باربر کے لیے خلیفہ کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے جس سے منصب خلافت کی حقارت اور تذلیل کرنا مقصود ہوتی ہے۔ شبِ برات میں آتش بازیاں کرنا عام طور سے سنّی گھرانوں میں رائج ہے حالانکہ اس موقع پر اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ شیعوں کی ایجاد ہے کیونکہ شعبان کی چودھویں شب میں ان کے نزدیک امام آخرالزماں کی پیدائش کا وقت ہے اس لیے اس کی خوشی میں وہ پٹاخے چھڑاتے ہیں،

اسی طرح رجب کے کونڈے کی بھی رسم ہے، اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی اسلامی تقریب نہیں ہے۔ یہ بھی شیعوں کی ایک تبرائی رسم ہے جس کو بے سوچے سمجھے آج کچھ سنی گھرانے بھی کرتے ہیں۔ مصیبت کے وقت یا علی کا نعرہ لگانا، بہادری اور شجاعت کے اظہار کے لیے یا علی حیدر کی صدا بلند کرنا، محرم کے مہینے میں کوئی خوشی کی تقریب نہ منانا اور گھروں میں فرضی روایتوں سے مملو شہادت نامے اور نوحے وغیرہ پڑھنا عام طور سے مشاہدہ میں آتا ہے۔ سیاہ رنگ کو عزاداری کی علامت جان کر مقدس سمجھنا اور اسی وجہ سے سیاہ رنگ کی ٹوپیوں کو رغبت سے پہننا اور سیاہ جوتوں کے استعمال کو برا سمجھنا وغیرہ بھی شیعی تہذیب کی علامت ہے، ان ہی تصورات کی وجہ سے بارہ اور چالیس کا عدد مقدس خیال کیا جاتا ہے اور تین کے عدد کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ بارہ سے بارہ امام اور تین سے خلفائے ثلاثہ مراد لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح پانچ کا عدد بھی متبرک خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس سے پنجتن مراد ہوتے ہیں جن میں پانچ حضرات شامل ہوتے ہیں یعنی محمدؐ، علیؓ، حسنؓ، حسینؓ اور فاطمہؓ۔ عام طور پر پڑھے لکھے لوگ حضرات اہل بیت کے ناموں کے ساتھ امام اور علیہ السلام کا لفظ استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کی نبوت سے مشابہت ہو جائے۔ نام نہاد مہذب سوسائٹی میں السلام علیکم کی جگہ آداب یا تسلیمات کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا تاکہ اسلامی تشخص نہ ہو سکے۔

اب سے کچھ دن پہلے اکثر لوگ صرف ائمہ اہل بیت کے ناموں پر ہی اپنے بچوں کے نام رکھتے تھے مثلاً حیدر علی، حسن علی، کلب عباس، عاشق حسین اور جعفر رضا وغیرہ، انبیاء یا صحابہؓ کے ناموں پر بہت کم نام رکھے جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں خاص طور سے امام باڑے اور عزاخانے بکثرت تھے اودھ کے دوسرے شہروں میں مسلم محلّوں کے اندر سرِ راہ چوکور چبوترے بنا دیئے جاتے تھے جو محرم میں تعزیوں کے رکھنے کے کام آتے تھے۔ لکھنؤ میں مساجد بہت کم تھیں اور جو تھیں بھی تو وہ بہت نمایاں نہ تھیں یہاں تک کہ آج بھی لکھنؤ میں کوئی سنیّوں کی جامع مسجد نہیں ہے۔

علماء کی عدم توجہی

افسوس کی بات یہ ہے کہ جس طبقہ سے کچھ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے اثرات اور وسائل سے اصلاح و تبلیغ کے فرائض انجام دے گا وہ بھی مصلحت وقت کی چادر تانے گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہوئے منطق و فلسفہ کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ میری مراد اس طبقہ سے علمائے وقت کا طبقہ ہے۔

اگر یہ حضرات حقیقی طور پر وقت کی نزاکتوں کا احساس کر کے عوام کی اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دیتے تو شاید آج حالات کا رُخ یہ نہ ہوتا۔ لکھنؤ میں اہل سنت و جماعت کے لیے مدرسۂ فرنگی محل کو چھوڑ کر کوئی قابل ذکر علمی درسگاہ نہیں تھی۔ اگر چہ اس علمی مرکز پر بھی حکومتِ وقت کی نظر عتاب اکثر پڑتی رہی مگر وہاں کے ارباب حل وعقد نے حالات سے کچھ سمجھوتہ کرلیا تھا اور انھوں نے کسی مذہبی یا اختلافی معاملات سے اپنے کو الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی اختیار کرلی تھی اس لیے کسی حد تک وہ ہر قسم کی دارو گیر سے مامون رہے۔

اگر خطۂ اودھ کے کسی بھی عالم نے کبھی اور کسی طرح سے بھی حکمراں طبقہ کے دین و مذہب کے خلاف کچھ زبان کھولی یا خامہ فرسائی کی تو اس کے لیے لکھنؤ اور اودھ کی سرزمین دوبھر کردی گئی جس کی نمایاں مثال مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ (م ۱۸۸۱ء)، علامہ بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلیؒ (م ۱۸۱۰ء) اور استادوقت ملاّ حسن فرنگی محلیؒ (م ۱۷۹۴ء) کے اسمائے گرامی لائق ذکر ہیں جنھیں دینی جرأت اور حق گوئی کی پاداش میں وطن سے بے وطن ہونا پڑا۔

خواص علماء کا حال تو پھر بھی بدرجہا غنیمت تھا مگر عوام اپنی بے دینی، جہالت اور ملّی بے حسی کی بنا پر بالکل ہی اپنے اسلاف کے راستے سے ہٹ چکے تھے اور اقتدار وقت کے رنگ میں رنگ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنّت و جماعت کا اپنا کوئی امتیاز باقی نہ تھا۔ اپنے مسلک اور طریقہ سے ہٹ کر وہ دوسروں کی دیکھا دیکھی تعزیہ داری، نوحہ خوانی اور دوسری خرافات و بدعات میں برابر کے شریک تھے۔

اس طرح اودھ کے مختلف شہروں بالخصوص لکھنؤ میں برسر اقتدار طبقہ کی تعیش پسندیوں، بے راہ رویوں اور مذہبی احساس برتری کے جذبے نے یہاں کے دینی اور سماجی ماحول کو اس قدر پراگندہ کردیا تھا کہ اہل سنت و جماعت کا مذہبی تشخص اور ان کا دینی شعور بے حسی، بے علمی اور غربت وافلاس کی تہہ در تہہ پرتوں میں دب گیا تھا۔ جب علماء اور خواص ہی اپنے فرائض سے چشم پوشی کر رہے ہوں اور حکومتِ وقت کی طرف سے حالات بھی ایسے ہی پیدا کیے جارہے ہوں تو پھر اصلاح کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ یہی وہ حالات تھے کہ جس نے لکھنؤ کے ماحول کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور اب ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھے جو حالات کے سدھارنے کا بیڑا اٹھائے۔

گیارہواں باب

شیعہ سنی اختلافات اور تحریک مدحِ صحابہؓ کا آغاز

گذشتہ صفحات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ لکھنؤ کا دینی ماحول انتہائی گراوٹ کی طرف مائل تھا۔ تعیش، لہو ولعب اور بے دینی عام ہوگئی تھی اور کیوں نہ ہوتی جبکہ اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی، جب حکومتی سطح پر فحاشی، بداخلاقی اور گمراہی کو فروغ دیا جائے تو پھر اس سے عوام کا متاثر ہونا بہت ضروری ہے۔ اس دور کے لکھنوی ادب پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شعر وسخن کی دو اصناف کی وہاں بڑی آبیاری ہوئی، ایک مرثیہ اور دوسری غزل۔ مرثیوں میں جو مبالغہ اور فرضی داستانوں کا سہارا لیا گیا ہے وہ اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ہمارے نزدیک ان مرثیوں سے اہلِ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ بجائے بڑھنے کے گھٹا ہے، ان کی حقیقی مظلومیت کو اس انداز سے بیان کیا گیا کہ بجائے بہادری اور جذبۂ سرفروشی کے بزدلی اور کم ہمتی کا اظہار ہوتا ہے۔ ماحول اور کردار ایسے پیش کیے گئے ہیں جو عرب سے تو نہیں مگر اودھ کے ماحول سے زیادہ میل کھاتے ہیں۔ یہی حال غزل اور مثنوی کا تھا، عریانیت اور ابتذال عام تھا۔ ایسے ماحول میں دین اور دینداری کا گذر کہاں ہوسکتا ہے، عوام اور خواص سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ مستثنیات سے قطع نظر کرتے ہوئے عام طور پر اہل سنت وجماعت کا اپنا کوئی تشخص یہاں باقی نہ بچا تھا۔ وہ دوسروں کے رنگ میں رنگے ہوئے اور دوسروں کے ہی رسم ورواج کو اپنائے ہوئے تھے، ان کی اس حالت میں ان کی معاشی پسماندگی کا بھی خاصا دخل تھا، انھیں جان بوجھ کر معاشی طور پر پسماندہ اور علم وفضل سے دور رکھنے کی منظم کوشش کی گئی تھی تاکہ ان کا ملّی شعور بیدار نہ ہوسکے۔ اور وہ اپنے مسلک پر کاربند نہ ہوسکیں چنانچہ لکھنؤ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۰۴ء تک یہاں شیعہ سنی تعلقات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ محرم کے مہینہ میں جہاں شیعہ عزاداری کرتے تھے وہیں اکثر ہندو اور مسلم باشندے بھی اپنی مذہبی ناواقفیت کی وجہ

سے ان کے دوش بدوش اور قدم بہ قدم جملہ رواسم میں شریک ہوتے تھے۔ ان رسوم میں اہل سنت کی شرکت کے دو اسباب تھے۔ ایک تو ان کے ساتھ ظاہر بظاہر کوئی چھیڑ خانی اور دل آزاری نہیں کی جاتی تھی اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی معاشی پسماندگی اور مذہبی ناواقفیت کی بنا پر اپنے دینی عقائد سے بے خبر اور لاعلم تھے چنانچہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ابتداءً لکھنؤ کے شیعہ سنّی تعلقات میں کوئی علیحدگی کے رجحانات نہیں تھے۔

مولوی مقبول احمد شیعی کی لکھنؤ آمد

مگر یہ حالات زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکے، معلوم نہیں وہ منحوس گھڑی کون سی تھی کہ جب دہلی کے ایک شیعہ واعظ مولوی مقبول احمد اودھ کا دورہ کرتے ہوئے لکھنؤ وارد ہوئے، انھیں یہاں کا شیعہ سنی اتحاد ایک آنکھ نہ بھایا، لہٰذا انھوں نے یہاں کے محلّہ محلّہ اور گلی گلی میں اپنی آتش فشاں اور شعلہ افگن تقریروں سے ایک آگ لگا دی۔ ایک طرف تو انھوں نے شیعوں میں علیحدگی کے رجحانات پیدا کیے اور دوسری طرف ہر مجلس میں علماء اہل سنت کو علی الاعلان دعوتِ مناظرہ دینے لگے۔ لکھنؤ میں سب سے پہلے انھوں نے ہی مجالس عزاء کے اندر علانیہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں گستاخیاں کرنا اور ان پر سبّ وشتم کرنا شروع کیا، چنانچہ اس قسم کی حرکتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف شیعوں میں سنّیوں کے خلاف عصبیت اور نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے اور دوسری طرف سنّیوں میں ایک ہیجان اور بے چینی کا ردعمل شروع ہوا۔ ہمارا یہ دعویٰ محض ظنی یا تخمینی نہیں ہے بلکہ خود ایک شیعہ رہنما اور مجلس احرار کے پہلے جنرل سکریٹری مولوی مظہر علی اظہر[1] کی یہ تحریر گواہ ہے:

[1] مولوی مظہر علی اظہر بٹالہ ضلع گرداسپور پنجاب میں ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے، ہائی اسکول بٹالہ سے میٹرک اور ۱۹۱۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور پھر ۱۹۱۷ء میں لا کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں لاہور میں وکالت شروع کی، ۱۹۲۸ء میں لاہور ہائی کورٹ اور ۱۹۵۴ء میں سپریم کورٹ کے مقدمات کی پیروی کرنے کے لیے اجازت نامہ ملا۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں جب مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے پہلے سکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں "تحریک مدحِ صحابہ"، "مسٹر جناح اور مسجد شہید گنج" اور "عصمتِ آدم" جیسی کتابیں مشہور ہیں۔ کچھ کتابیں انگریزی میں بھی لکھیں، آپ مذہباً شیعہ تھے۔ ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں وفات ہوئی۔

(انسائیکلوپیڈیا قائداعظم، مرتبہ زاہد حسین انجم، ۷۰۹، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۱ء)

''۱۹۰۵ء سے قبل لکھنؤ میں شیعہ سنّی اور ہندو اکٹھے مراسم تعزیہ داری ادا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی مجالس اور جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں باہر سے کچھ واعظ آئے جن میں ایک شیعہ عالم کے متعلق سنّیوں کو ہمیشہ شکایت رہی کہ انھوں نے اختلافات کی بنیاد ڈالی[1]۔''

مولوی مقبول احمد شیعی کی اشتعال انگیز تقریروں سے شیعوں میں مذہبی بیداری پیدا ہوئی، چنانچہ اسی عرصہ میں انھوں نے ایک مرتبہ اکبری گیٹ لکھنؤ کے قریب حیدری جان کے امامباڑے میں شیعوں کو برانگیختہ کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ہماری کربلا میں بہت سی خراب رسمیں فریقِ ثانی (سنیوں) کی وجہ سے اور کچھ اپنی جانب سے رائج ہوگئی ہیں، سنّی تو کھیل تماشہ سمجھ کر ایسا کرتے ہیں مگر شیعہ ایسا کیوں ہونے دیتے ہیں، میرے نزدیک شیعوں کو اپنے طریقے پر کربلا کی 'اصلاح کرنا چاہیے' آئندہ سے جو شیعہ اس کے خلاف کرے گا اس کا حشر یزید کے ساتھ ہوگا[2]۔

مقبول احمد شیعی کو شیعوں میں بڑا السّان مانا جاتا تھا۔ وہ روزانہ چار پانچ جگہ مجلسیں پڑھا کرتے تھے جس میں صحابۂ کرامؓ اور ازواجِ مطہرات پر خوب خوب تہمتیں تراشتے تھے اور اپنی شوخیِ طبع اور شرارت آمیز اشاروں، کنایوں سے اسلام کی برگزیدہ ہستیوں پر تبرائی فقرے اور پھبتیاں کسا کرتے تھے جن کو سن کر شیعہ امراء و نوابین خوب لطف لیتے تھے اور بے چارے سنی ملول و رنجیدہ ہوکر مجلسوں سے اٹھ آیا کرتے تھے۔ اسی قسم کی تقریروں کی وجہ سے لکھنؤ کے سٹی مجسٹریٹ نے ایک بار اپنے ایک مقدمہ کے فیصلہ میں مولوی مقبول احمد کو 'فتنہ انگیز' کے لفظ سے یاد کیا تھا اور انھیں لکھنؤ چھوڑ دینے کا حکم دے دیا تھا جس کے غصّہ میں انھوں نے جون پور، جلال پور اور فیض آباد وغیرہ میں جا کر آتش فساد بھڑکائی اور مختلف مجالس میں بالاعلان تبرا کیا لیکن جتنی کامیابی اپنے اس مقصد میں ان کو لکھنؤ میں ہوئی اتنی کسی دوسری جگہ نہیں ہوسکی۔ جون پور میں جب ضلع حکام نے ان کی خبر لی تو بڑی منّت سماجت اور عہد و پیمان کرکے انھوں نے اپنے کو بچالیا مگر جب فیض آباد میں انھوں نے اشتعال انگیزی کی تو وہاں حکومت کی گرفت میں آگئے اور ایک طویل مقدمہ بازی کے بعد سزایاب ہوئے[3]۔

مقبول احمد کے علاوہ اور بھی کچھ معروف شیعہ معززین و علماء بھی لکھنؤ میں شیعہ سنی منافرت

---

[1] تحریک مدحِ صحابہ، ص ۲۳ [2] النجم پندرہ روزہ لکھنؤ، ۲۱ رمضان ۱۳۲۵ھ [3] النجم لکھنؤ، ۲۱ رمضان ۱۳۲۲ھ

پھیلانے میں پیش پیش رہے جن میں مولوی ناصر حسین مجتہد (م ۱۹۴۳ء)، مولوی نجم الحسن مجتہد (م ۱۹۳۸ء)، مولوی مہدی حسین، ڈپٹی راحت علی، مرزا محمد عباس، حکیم نذیر حسن خاں، شہنشاہ حسین وکیل (م ۱۹۲۶ء)، یوسف حسین بیرسٹر اور راجہ علی محمد خاں آف محمود آباد وغیرہم قابل ذکر ہیں جو شیعوں کی اس نئی مذہبی زندگی کے محرک تھے۔[1]

حضرت لکھنویؒ کی لکھنؤ آمد اور ''امام اہل سنت'' کا خطاب

ابتداءً یہ اختلافات دو تعزیہ دار طبقوں کے درمیان تھے، یہ اور بات ہے کہ ان میں ایک طبقہ سنی تعزیہ داروں کا تھا جبکہ اسلام میں تعزیہ داری کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔ چونکہ یہ ایک عوامی جہالت اور ایک قسم کی دینی پسماندگی کی علامت تھی اس لیے شروع میں علماء اہل سنت نے ان اختلافات پر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ کوئی عملی حصّہ لیا، ان کا خیال تھا کہ یہ اختلافات ایک لایعنی اور غیر اسلامی رسم کے ادا کرنے پر ہو رہے ہیں، کربلاؤں اور تعزیہ داری کا تصّور اسلامی روح اور جذبۂ توحید کے سراسر منافی ہے اور اس کے جواز کی کوئی شرعی توجیہہ اور تاویل نہیں کی جا سکتی ہے لیکن مولوی مقبول احمد شیعی کی تبرائی تقریروں اور اہل سنت کے معتقدات پر ان کے براہِ راست حملوں سے علماء کو بھی تشویش ہونے لگی۔ اور وہ بھی ان سے مدافعت اور ان کے تدارک کی تدبیروں پر غور و خوض کرنے لگے۔ اُس وقت ان علماء کے سرخیل استاذِ وقت حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب حیدر آبادی ثم لکھنویؒ (م ۱۹۲۵ء) تھے جو علاّمہ ابو الحسنات مولانا عبدالحئیؒ، صاحب فرنگی محلیؒ (م ۱۸۸۶ء) کے ایک جلیل القدر شاگرد اور جانشین تھے۔ آپ نے جب یہ محسوس کیا کہ اب یہ اختلافات دو تعزیہ دار طبقوں ہی میں محدود نہیں رہے بلکہ اب یہ شیعہ و سنی دو مختلف مسلکوں کے درمیان ہو گئے ہیں تو انھوں نے اہل سنت کی طرف سے مدافعت اور محافظت کا بیڑا اٹھایا، انھوں نے علماء وقت کو اس نازک مسئلہ کی طرف متوجہ کیا اور ہر طرح سے اہل سنت کے معتقدات و مفادات کی حفاظت پر کمر بستہ ہو گئے، آپ کو معلوم تھا کہ اُس دَور میں شیعہ فرقہ سنیوں کے مقابلہ میں زیادہ خوشحال اور تعلیم یافتہ تھا اور حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز بھی تھا اس لیے اگر اس وقت خاموشی اور صرف نظر سے کام لیا گیا تو آئندہ سنیوں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے میں

---

[1] النجم، لکھنؤ، ۷ر مئی ۱۹۳۷ء

بڑی دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آئیں گی، لہٰذا آپ نے صحابۂ کرامؓ کی عزّت وناموس کی حفاظت میں قانون کا بھی سہارا لیا، اپنی جیب خاص سے مالی تعاون بھی پیش کیا اور شریعت اسلامیہ کی سچی تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کے حل کے لیے علماء وخواص کو بھی آمادہ کیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ یہ معاملات مزید پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں، فریق مخالف کی طرف سے برابر مناظروں کا چیلنج دیا جانے لگا ہے اور حکومت کے ساتھ مل کر سنّیوں پر طرح طرح سے مذہبی پابندیاں عاید کرائی جارہی ہیں تو آپ نے اپنے عزیز ترین شاگردوں پر نظر دوڑائی اور یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کو دہلی سے لکھنؤ بلایا جائے اور ان کو سنّیوں کی طرف سے مناظروں کی جواب دہی کے لیے آمادہ کیا جائے۔ حضرت مولانا لکھنویؒ اس وقت دہلی میں مرزا حیرت دہلوی کے مطبع میں بحیثیت مصنّف ومؤلّف کام کررہے تھے۔ استاذِ محترم نے آپ کو لکھنؤ طلب کیا اور یہاں کے معاملات آپ کے سپرد فرمائے اور فرمایا کہ آپ کے علاوہ یہاں کوئی دوسرا ان حالات پر کنٹرول نہیں کرسکتا۔ اسی موقع پر مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کی مدرسی بھی آپ کو پیش کی لہٰذا تعمیلِ حکم میں آپ لکھنؤ تشریف لے آئے اور یہاں کے مسائل میں حصّہ لینا شروع کردیا۔ اس سلسلہ میں آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

''استاذی المرحوم مولانا سیّد محمد عین القضاۃ صاحبؒ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اس فتنہ کا علاج بہت ضروری ہے، اُدھر مولوی عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کا بھی اصرار ہوا اور چونکہ بعض آخری کتابوں میں وہ میرے ہم سبق تھے لہٰذا ان کا اصرار بہت زیادہ ہوا۔ میں نے اس وقت مقبول احمد صاحب کو ایک خط لکھا کہ سُنا گیا ہے کہ آپ اپنی مجالس میں مذہب اہل سنت پر اعتراض کیا کرتے ہیں، اگر یہ سچ ہے تو میں چاہتا ہوں کہ ان اعتراضات کو آپ میرے سامنے بیان کرنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں، اس خط کے پہنچتے ہی تمام مجلس میں ایک ہلچل پڑگئی اور کئی دن کے بعد اس خط کا یہ جواب ملا کہ میں اس وقت فیض آباد نواب شفاء الدولہ کے خاندان کا طلبیدہ جارہا ہوں چنانچہ وہ تشریف لے گئے اور مناظرہ پر کسی طرح راضی نہ ہوئے، مگر تبرا بازی بھی ترک نہ کی جس کی سزا ان کو ملی یعنی ایک ہزار روپیہ ان پر جرمانہ ہوا[1]''

حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ کے شاگردوں میں بہت سے دوسرے بلند پایہ حضرات

---

[1] النجم لکھنؤ، ۷-۲۱ رذی قعدہ ۱۳۴۴ھ

بھی تھے اور اُس وقت فرنگی محل میں جتنے بھی نوجوان علماء تھے وہ تقریباً سب ہی ان کے شاگرد تھے۔ ان میں معاصرانہ جذبات کا پیدا ہونا بھی فطری بات تھی لہذا کچھ حضرات نے استاذ محترم سے دبے الفاظ میں کہا کہ ہم خدام تو ہر حکم کی تعمیل کے لیے حاضر ہیں لہٰذا دہلی سے مولانا عبدالشکور صاحب کو بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ مولانا اس پر سخت چیں بہ جبیں ہوئے اور فرمایا ''ہاں میں نے اسی کام کے لیے انھیں بلایا ہے، وہ اس معاملہ میں ہم اہل سنت کے امام ہیں۔'' مولاناؒ کا یہی جملہ مستقبل میں ایک تاریخی حقیقت بن گیا اور برصغیر کے تمام علماء وخواص نے آپ کو امام اہل سنت، کا لقب دے دیا اور یہی لقب اتنا مشہور ومقبول ہوا کہ آپ کے نام کا ایک جزو ہوگیا اور آج آپ کو اسی لقب کے ساتھ لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

چھیڑ چھاڑ کے طریقے

مولوی مقبول شیعی اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے شیعہ واعظین کی مسلسل اشتعال انگیزیوں کی وجہ سے لکھنؤ کے شیعوں میں سنّیوں کے خلاف نفرت اور علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہوچکا تھا اور دونوں فرقوں میں جو یگانگت کی فضا اس شہر میں قائم تھی اس کا شیرازہ منتشر ہونے جارہا تھا چنانچہ اسی منافرت کے جذبہ کے تحت شیعوں کی طرف سے کچھ نئی قسم کی چھیڑ چھاڑ کا آغاز ہونے لگا جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح یہ کام ایک منظم اور طے شدہ منصوبہ کے تحت عمل میں لایا جارہا تھا۔ اس کی چند مثالیں لائق ذکر ہیں:

۱۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب سُنیوں کی طرف سے کہیں محفل میلاد کے انعقاد کا اعلان کیا جاتا تو فوراً اُسی دن یا اس کے دوسرے ہی دن شیعوں کی طرف سے 'صحبت قدیمانہ' کے عنوان سے شہر میں اشتہار واعلان کر کے مجلس منعقد کی جاتی تھی جس میں سوائے تبرا کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ 'صحبت' شیعوں کے یہاں اس تبرائی مجلس کو کہتے ہیں جہاں خلفاء ثلاثہ اور بعض ازواج مطہرات کی شان میں ناشائستہ اور غیر مہذب الفاظ میں اشعار پڑھے جاتے ہیں، اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں کی نقلیں اتاری جاتی ہیں، ان کے پتلے بنا کر توہین کی جاتی ہے اور اس قسم کی ناشائستہ حرکات کی تعریف وتوصیف میں طبلہ وسارنگی اور نوبت بھی بجائی جاتی ہے۔ تاکہ یہاں کے تبرائی الفاظ دور والوں کو کم سے کم سنائی دے سکیں چونکہ تبرا یا کسی مذہب کے بزرگوں کی علانیہ توہین کرنا قانوناً جرم

ہے اس لیے اس مجلس کو قدرے چھپا کر کیا جاتا تھا اور دریافت کرنے پر یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ امیرالمومنین (حضرت علی مرتضیٰ) کی شان میں محفل مدح منعقد کی جارہی تھی اور شور وغل کے بارے میں یہ کہہ دیتے تھے کہ ہم تلاوتِ درود شریف کررہے تھے[1]۔ ان دل خراش باتوں سے یقیناً ہر صاحبِ ایمان کا دل کڑھے گا اور اذیت پہنچے گی۔

۲۔ مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے بذریعہ اشتہار 'بزم فیروزی' کے انعقاد کا اعلان کیا جانے لگا جس میں ابولو ٔلوٗ فیروز کے فضائل ومناقب نثر ونظم میں بیان کیے جاتے۔ ابولو ٔلوٗ فیروز ایک مجوسی تھا اور صحابی رسول حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا غلام تھا اور اپنی شامت اعمال سے خلیفہ ثانی حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطابؓ کو اس نے اس حالت میں شہید کیا تھا کہ جب آپ ایک کثیر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا رہے تھے، بس اس خوبی اور خصوصیت کی بنا پر اس مردود خلائق کو شیعی دنیا میں 'بابا شجاع' کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ چنانچہ 'بزمِ فیروزی' یا عید بابا شجاع، آج بھی اسی واقعہ کی یاد تازہ کرنے، ابولو ٔلوٗ کی مدح وثنا کرنے اور جاں نثاران نبیؐ کی شان میں گستاخیاں کرنے کے لیے منعقد کی جاتی ہے۔

۳۔ مزید دل دکھانے اور سنیّوں کو اشتعال دلانے کے لیے شیعوں نے اپنی اذانوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام نامی کے ساتھ 'خلیفة بلافصل' کا جملہ بھی اضافہ کر کے پڑھنا شروع کر دیا اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ بلافصل کہنا پہلے تین خلفاء کی نفی کرنا ہے جس سے بڑھ کر سنیّوں کے لیے کوئی اور دل آزاری کی بات نہیں ہوسکتی۔ مجتہدین شیعہ کے مطبوعہ فتاوے موجود ہیں جن کی رو سے 'بلافصل' جزو اذان نہیں ہے۔ شیعوں کی مستند کتابوں میں یہ بھی تصریح آئی ہے کہ غیر جزو اذان الفاظ کو جو شخص اذان میں داخل کرے وہ ملعون[2] ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنی اذانوں میں برابر اس کلمہ کو اعلان کے ساتھ پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ اذان میں ان الفاظ کے اضافہ سے سنیّوں میں ناگواری اور ہیجان پیدا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ محض سنیّوں کے ستانے اور خلفاء ثلاثہ پر تبرا کرنے کے لیے ہی یہ الفاظ بڑھائے گئے تھے چنانچہ محض اسی سلسلہ سے لکھنؤ میں کئی بار دونوں فرقوں میں تصادم بھی ہو چکا ہے۔

۴۔ مذکورہ بالا دل آزاریوں کے علاوہ ایک طریقہ اور ایجاد کیا گیا کہ بعض شر پسندوں نے

1۔ النجم لکھنؤ، ۲۱ر رمضان ۱۳۲۲ھ 2۔ من لا یحضرہ الفقیہ، مرتبہ شیخ صدوق، ج ۱، باب الاذان والاقامہ، ص ۹۳

۹ ربیع الاول کو عید غدیر کو جو پہلے پوشیدہ اور مخفی طریقہ سے منائی جاتی تھی اب بڑے جوش و خروش سے منانا شروع کر دیا اور اس سلسلہ میں ایک میلہ کی بنیاد ڈالی گئی جس کو "گلابی میلہ" کے نام سے یاد کیا جانے لگا، اس میلہ کو شہرت دینے کے لیے سارے شہر میں شیعہ بالعموم گلابی رنگ کا کرتہ بھی پہننے لگے تاکہ لوگ اس کو دیکھ کر معاملہ کی تہہ تک پہنچ جائیں۔

۵۔ ان حالات میں اُردو شعر و ادب کو بھی نہیں بخشا گیا اور اس کو بھی نفرتوں کے پھیلانے کا ذریعہ بنایا گیا چنانچہ جس طرح مرثیہ میں واقعات کربلا اور لشکر حسینی کے جانباز سپاہیوں کے برعکس ایک نئی صنفِ شاعری ایجاد کی گئی جس کا نام 'ہرثیہ' رکھا گیا۔ اس میں اکابر اہلِ سنت و جماعت اور بزرگانِ دین کا اشعار میں مضحکہ اڑایا جاتا تھا اور ان مقدس حضرات کی شان میں نہایت فحش الفاظ استعمال کیے جاتے تھے، حاضرین محفل ان تہذیب سے گرے ہوئے رکیک اور خلاف ادب اشعار کو سن کر خوب خوب لطف لیتے تھے، ہرثیہ ہجو کی ایک بدترین قسم تھی جس کو مرثیہ نگار 'ذائقہ بدلنے' کے لیے بطور تبرا محفل میں سناتے تھے، شاہی دور میں یہ صنف شیعہ مجالس میں بہت مقبول ہوئی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور شیعہ شاعر میاں مشیر لکھنوی (م ۱۸۷۶ء) تھے، ان کے بعد دوسرے مرثیہ نگاروں نے بھی ان کی پیروی شروع کر دی۔[۱]

اسی طرح کی اور بہت سی قبیح رسمیں علی الاعلان ادا کی جانے لگیں جن سے دونوں فرقوں کے دلوں میں نفرت اور کدورت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ان حالات نے لکھنؤ کے سنیوں کی آنکھیں کھول دیں اور اب تک وہ جس بے خبری اور غفلت کا شکار تھے اس سے بیدار ہونے لگے۔

علیحدگی کی شروعات

زمانۂ قدیم سے لکھنؤ میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ سنّی اور شیعہ دونوں کے تعزیے ایک ہی کربلا میں اور ایک ہی وقت میں دفن ہوا کرتے تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ شیعہ تعزیوں کے ساتھ مرثیہ، نوحہ اور ماتم ہوتا تھا اور سنّی تعزیوں میں مرثیوں کے ساتھ 'چار یاری نظمیں' بھی پڑھی جاتی تھیں جن میں صحابہ کرامؓ اور بالخصوص خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی تعریف و توصیف ہوتی تھی۔ یہ دستور نہ صرف دونوں فرقوں کو گوارہ تھا بلکہ وہ ایک دوسرے کی مجلسوں اور محفلوں میں

---

۱ دبستانِ دبیر، ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی (شیعی)، ص ۳۱۸-۳۲۰

شریک بھی ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں مولوی مقبول احمد کی پیدا کی ہوئی فضا میں اور ان کے بتائے ہوئے نسخہ پر عمل کرتے ہوئے چند سربرآوردہ شیعہ لیڈروں نے مراسم عزاداری میں 'اصلاح وسدھار' کے نام پر کچھ ایسے اقدامات کیے جنھوں نے صدیوں کی رواداری اور رکھ رکھاؤ کی فضا کو درہم برہم کر کے رکھ دیا جس کے نتیجہ میں آج تک لکھنؤ کے شیعہ وسُنّی فرقوں میں اتحاد ویگانگت کی فضا پیدا نہ ہوسکی اور نہ جانے کتنی بے گناہ اور معصوم جانیں ضائع ہوگئیں اور بے اندازہ قیمتی املاک وسرمایہ تباہ وبرباد ہو کے رہ گیا۔

لکھنؤ کے شیعوں کی طرف سے پہلا اختلافی قدم یہ اٹھایا گیا کہ 'انجمن امامیہ' کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل کی گئی، اسی انجمن نے اس مشترکہ اور قدیم کربلا میں جو لکھنؤ شہر کے شمالی حصہ میں 'کربلائے تال کٹورہ' کے نام سے موسوم تھی، اصلاحات کی آڑ لے کر ڈپٹی کمشنر لکھنؤ مسٹر سانڈرس (Mr. Saunders) کے ذریعہ کچھ نئی قیود و پابندیاں نافذ کرادیں جو سُنّی اور ہندو تعزیہ داروں کے لیے ناپسندیدہ تھیں۔ یہ پابندیاں یک طرفہ طور پر مسٹر سانڈرس نے محض شیعوں کے کہنے پر نافذ کی تھیں اور پھر آئندہ بھی انھوں نے شیعوں کی دل دہی ودلداری کی خاطر ان جدید پابندیوں پر کوئی نکیر نہیں کی۔ ان پابندیوں پر عمل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اب ان تقریبات پر خالص شیعہ رنگ غالب رہا کرے گا اور سُنّی و ہندو تعزیہ داروں کی کوئی رعایت نہیں رکھی جائے گی۔

اصلاحاتِ کربلا

انجمن امامیہ کے ممبروں نے جن میں مذہبی غلو زیادہ تھا بغیر سنی شہریوں کی صلاح واطلاع کے یکطرفہ کارروائی کر کے کربلائے تالکٹورہ کی حدود میں ان چھ باتوں کی قید لگادی:

۱۔ سنی اور ہندو حضرات احاطۂ درگاہ میں ٹوپی اتار کر جایا کریں، شیعہ تو پہلے ہی سے اس پر عمل درآمد کیا کرتے تھے البتہ سُنیوں اور ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد ٹوپی اور جوتے سمیت درگاہ میں داخل ہوتی تھی۔

۲۔ احاطہ درگاہ میں کوئی پان کھاتا ہوا نہ نکلے، اس کا اثر بھی خاص طور سے سنّیوں پر پڑتا تھا کیونکہ شیعہ پہلے سے ہی اس کے پابند تھے۔

۳۔ کسی قسم کے کھانے پینے اور خرید وفروخت کی دکانیں احاطہ درگاہ میں نہ لگائی جائیں اور اگر

لگیں بھی تو علیحدہ فاصلہ پر اور گوشہ میں ہوں۔

۴۔ تعزیوں کے ساتھ پٹہ بازی وغیرہ نہ ہو۔ اس قسم کی چیزیں سنّیوں اور ہندوؤں کے تعزیہ کے جلوس میں ہوا کرتی تھیں، اگرچہ شیعی تعزیوں کے ساتھ بھی ہاتھی گھوڑے، اونٹ، باجہ، رنگ برنگے جھنڈے اور دیگر سامان لہوولعب ہوا کرتے تھے مگر ان پر کوئی پابندی نہ تھی۔

۵۔ طوائف اور آوارہ عورتوں پر تو بظاہر پابندی لگائی گئی تھی مگر عزادار طوائفوں کو کوئی ممانعت نہ تھی جن کے ساتھ ان کے سیکڑوں شیدائی اور پرستا بھی ہمراہ ہوتے تھے حالانکہ ضروری یہ تھا کہ ایسی بازاری عورتوں پر بھی حدود کربلا میں داخل ہونے پر پابندی عائد ہونی چاہیے تھی[۱]

مذکورہ بالا قیود کو انجمن امامیہ نے بغیر عام اطلاع اور مشورہ کے نافذ کرایا تھا اور مقامی حکام کو یہ باور کرادیا تھا کہ یہ ''اصلاحات'' عام پبلک کے مشورہ سے طے پائی ہیں اس لیے مقامی حکام نے انتظاماً انھیں نافذ کرنے کا نوٹس جاری کردیا جس سے سنّیوں کو بہت دکھ پہونچا اور انھیں یہ یقین ہوگیا کہ انجمن امامیہ نے اپنی خودغرضی اور ہماری دل آزاری کے لیے یہ نوٹس جاری کرایا ہے، ان کا یہ خیال صحیح بھی تھا چنانچہ انجمن امامیہ نے ایک خفیہ کارروائی یہ بھی کی کہ وکٹوریہ گنج لکھنؤ سے کربلائے تالکٹورہ تک سڑک کے دونوں جانب جن لوگوں کی زمینیں تھیں انھیں کچھ روپیہ دے کر اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ کسی دوکان دار اور سودہ والے کو اپنی زمین پر کوئی کاروبار نہیں کرنے دیں گے۔[۲]

سنّیوں کا پہلا احتجاج اور کربلا کی علیٰحدگی

۱۹۰۵ء میں جب یہ احکام نافذ ہوئے تو اس وقت تک سنّیوں نے علیحدہ کربلا بنانے کا کوئی مطالبہ حکومت سے نہیں کیا تھا۔ ۱۹۰۵ء کا محرم جیسے بھی گذرا گذر گیا البتہ ۱۹۰۶ء کے محرم آنے سے پہلے ان سنی حضرات نے جو اِن احکام سے ناراض تھے ان کی منسوخی کے لیے افسران ضلع سے سلسلہ جنبانی کی۔ اس موقع پر مولوی محمد احمد کاظمی سابق ایم۔ ایل۔ اے یوپی تحریر کرتے ہیں:

''جس چیز پر سنّیوں کو اعتراض تھا وہ یہ تھی کہ کربلا میں ننگے سر اور ننگے پیر جایا جائے۔ فاقہ کی سی صورت بنانا سب کے لیے ضروری تھا اور یہ کہ جلوس میں سوائے ماتم کے اور کچھ نہیں ہونا چاہیے

---

[۱] النجم لکھنؤ، ۲۱ رمضان ۱۳۲۶ھ [۲] النجم لکھنؤ، ۲۱ رمضان ۱۳۲۶ھ

تھا، غرضکہ ایسی چیزیں جن سے جلوس میں خالص شیعہ رنگ کا غلبہ ہوان پر سنی رضامند نہ تھے۔
چنانچہ سنیوں کا ایک وفد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کرنے
گیا۔ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ان پابندیوں (کے دور کرنے) کے بارے میں معذوری کا اظہار
کیااور کہا کہ اگر سنّی اپنی علیحدہ کربلا کا انتظام کرلیں توان کے جداگانہ جلوس کا انتظام کردیا جائے
گالہٰذا سنیّوں نے لکھنؤ سے چندمیل کے فاصلہ پرایک آراضی کا بطور کربلا کے انتظام کرلیااور
اس کی اطلاع ڈی۔ایم کودے دی جس کے مطابق انھوں نے وہاں تعزیہ وغیرہ لے جانے کا
انتظام کرادیا۔سابقہ کربلا کا نام تالکٹورہ، تھااور اب نئی کربلا کا نام پھول کٹورہ، رکھا گیا۔سنی و
شیعوں کے دونوں جلوسوں کے لیے ڈی۔ایم نے مختلف راستے اور مختلف اوقات مقرر کردیے
تاکہ باہم تصادم نہ ہوسکے۔چنانچہ ۱۹۰۶ء میں ہر دو جلوس اسی طرح علیحدہ علیحدہ نکالے گئے۔[۱]
ایسی صورت میں جبکہ دو فرقوں کے درمیان اختلافات ہو گئے ہوں حکومت کا فرض تھا کہ
دونوں فرقوں کی مٹینگ بلاکر کوئی باہمی سمجھوتے کا راستہ نکالتی مگراس نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ راستہ
اختیار کیا جس سے اختلافات کی خلیج اور زیادہ وسیع ہو یعنی کربلائیں الگ کردینے کا مشورہ دیا گیا
اس طرح دونوں فرقے جواب تک کسی ایک مقام پر اکٹھا ہوجاتے تھے اب بالکلیہ ایک دوسرے
سے علیحدہ ہوگئے اور کشیدگی بڑھنے لگی۔اب اسی ۱۹۰۶ء کے محرم کا حال مجلس احرار کے سابق
جنرل سکریٹری مولوی مظہر علی اظہر ایم۔ایل۔اے (شیعی) کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''۱۹۰۶ء کا محرم آخرکار آیااور یہ پہلا سال تھا کہ صدیوں تک اکٹھا محرم منانے کے بعد ڈسٹرکٹ
مجسٹریٹ لکھنؤ کے مشورہ سے سنیّوں نے علیحدہ جلوس نکالا اور تال کٹورہ کی کربلا کے مقابلہ میں
پھول کٹورہ کی کربلا قائم ہوئی۔[۲] یہی وہ سال ہے جب پہلی مرتبہ لکھنؤ کے شیعہ اور سنی صدیوں
کے اتحاد کے بعد علیحدہ جماعتوں میں تقسیم ہوگئے...... دو جلوس ہوجانے کے باعث خواہ اس
رنجش کی بنیاد کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو شیعہ جلوس پر شیعہ رنگ غالب آیااور سنی جلوس پر سنی رنگ
غالب آیا سنی جلوس میں چاریاری جھنڈے نکلے اور مصائب حسین مظلوم کے نوحوں کے ساتھ

۱۔ اخبار مدینہ، بجنور، ۱۳؍جون ۱۹۳۹ء

۲۔ پھول کٹورہ کی کربلا لکھنؤ اور کاکوری کے درمیان موضع بردرا میں واقع تھی، یہ زمین منشی احتشام علی صاحب کاکوروی (م ۱۹۴۳ء) کی تھی۔انھوں نے سنیّوں کو یہ زمین بلاقیمت دے دی تھی۔(سخنوران کاکوری، حکیم نثار احمد علوی، ص ۵۵۹-۵۶۰)

مدحِ صحابہ بھی بیان ہونے لگی اور شیعہ جلوس کے متعلق یہ شکایت کی جاتی ہے کہ اس میں قدح صحابہ ہوئی، گرم مزاج طبیعتوں کو علیحدگی کے باعث کھل کر کھیلنے کا موقع ملا، حالات بد سے بدتر ہوئے اور ہر خبر پر مبالغہ کا تیل چھڑکا گیا۔[1]

پہلا تصادم

اس طرح تعزیوں کے جلوس کا جو نیا نظام لکھنؤ میں نافذ کیا گیا اس نے کشیدگی کو اور بڑھا دیا اور اب شیعوں کی طرف سے وہ تمام طریقے استعمال کئے جانے لگے جن سے سنّیوں کی دل آزاری ہو اور ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوں۔ اب ان کی ہر مجلس عزاء اور تعزیوں کے جلوس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان اقدس میں تبرا بازی عام ہوگئی اس سے سنّیوں میں اس قدر اشتعال پھیلا کہ ان کے ایک طبقہ نے چار یاری نظموں کے ان اشعار میں جو چاروں خلفاء کی شان میں پڑھے جاتے تھے علانیہ ایسے اشعار بھی پڑھنا شروع کر دیئے جن میں خلفاء سے عداوت رکھنے والوں کو برا بھلا کہا گیا تھا۔ شیعہ اور سنی دونوں کے سنجیدہ طبقہ کے لوگ اس باہمی علانیہ لعن وطعن کو ناپسند کرتے تھے اور اس کے روکنے پر متفق تھے لیکن اس کے باوجود حالات کی اصلاح نہ ہوسکی۔ اور کشیدگی اس قدر بڑھی کہ ۱۳ر فروری ۱۹۰۸ء کو جو عشرۂ محرم آیا اس میں صبح عاشور کو شیعوں نے امام باڑہ آغا باقر لکھنؤ سے بالاعلان ایک تبرائی جلوس نکالا، جب یہ جلوس وکٹوریہ اسٹریٹ سے پارچہ والی گلی سے ہوتا ہوا چوک میں داخل ہوا جہاں پہلے سے سنّیوں کے جلوس نکل رہے تھے تو سخت تصادم ہوگیا جس کے نتیجہ میں بے شمار افراد دونوں طرف سے زخمی ہو گئے، پولیس اور حکام شہر نے فوراً مداخلت کی اور جلوس کے تبرائی شیعوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ان پر مقدمات چلائے گئے جس میں تقریباً بیس بائیس شیعوں کو عدالت سے سزا ہوئی۔[2]

اس تصادم اور سزا یابی سے شیعوں کو سخت خجالت اور خسارہ کا سامنا کرنا پڑا اور یہ بات حکومت اور عوام کے سامنے کھل کر آگئی کہ صرف شیعوں ہی کی وجہ سے نقض امن ہوا اور خونریز تصادم کی نوبت آئی۔ ان حالات کے پیشِ نظر شیعوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ آنے والے مارچ ۱۹۰۸ء کے چہلم میں وہ احتجاجاً اپنے تعزیے نہیں اٹھائیں گے۔ چنانچہ النجم کے صفحات سے پتہ

---

[1] اخبار مدینہ، بجنور، ۱۳ر جون ۱۹۳۹ء [2] النجم لکھنؤ، ۲۱ر جمادی الاوّل ۱۳۲۶ھ

چلتا ہے کہ بہت پہلے سے شیعی علماء کی طرف سے ایک اشتہار تمام شہر میں چسپاں و تقسیم کیا گیا جس میں یہ لکھا تھا کہ جب تک حکومت کی طرف سے کوئی انتظام دل آزار نظموں (یعنی مناقبِ صحابہؓ) کی ممانعت کا نہ ہو جائے شیعوں کو تعزیہ نہ اٹھانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں حکام پر مزید دباؤ ڈالا گیا اور سخت کوشش کی گئی کہ کسی طرح اہل سنت کو قطعی ممانعت کر دی جائے کہ وہ مناقبِ صحابہؓ شارع عام پر نہ پڑھ سکیں۔ لکھنؤ کے بیدار مغز ڈپٹی کمشنر مسٹر جاپلنگ (Mr. Japling) نے طرفین سے آٹھ آٹھ اہل الرائے اور معزز اصحاب کو طلب کر کے مشورہ کیا کہ انتظام کس طرح ہونا چاہیے مگر کوئی قطعی بات طے نہ ہو سکی۔ بالآخر چہلم سے دو روز پہلے ڈپٹی کمشنر کی طرف سے انتظام چہلم کے سلسلہ میں ایک اعلان شائع ہوا جس میں ازراہِ دور اندیشی موصوف نے عشرۂ محرم کی طرح اس مرتبہ بھی فریقین کے لیے اوقات تقسیم کر دیئے، سنّیوں کے جلوس کے لیے صبح سے بارہ بجے تک اور شیعوں کے لیے بارہ بجے دن کے بعد سے شام تک کا وقت مقرر کیا گیا۔ اس اعلان میں ایک دفعہ یہ بھی بڑھائی گئی کہ:

> ''تبرا یا ایسے الفاظ جن سے کسی مذہب کی تحقیر و تذلیل ہوتی ہو قطعاً ممنوع ہیں، جو شخص اس کے خلاف کرے گا اس کا فوراً چالان کیا جائے گا اور وہ زیر دفعہ ۲۹۸ سزایاب ہوگا۔''[1]

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی شیعوں کی طرف سے مخفی طور پر ایک اشتہار شائع ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ جب تک مدحِ صحابہ قطعاً موقوف نہ ہو جائے شیعوں کو تعزیہ ہرگز نہ اٹھانا چاہیے اس طرح شیعوں نے چہلم کے موقع پر اپنے تعزیے نہیں اٹھائے لیکن سنّیوں نے حسب روایات بڑے زور شور کے ساتھ اپنے مراسم ادا کیے اور اس میں دستور کے مطابق مناقبِ صحابہؓ پر مبنی دلکش نظمیں اور اشعار پڑھے گئے۔ اس موقع پر کئی مقامات پر شیعوں نے کثیر مجمع کے ساتھ متصادم ہونے کی کوشش بھی کی مگر حکام کے حسن انتظام سے کسی سخت ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

شیعوں کی ایک درخواست

۱۹۰۸ء کے چہلم میں اپنے تعزیے نہ اٹھانے کے فیصلہ کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے شیعوں نے ۸ر اپریل ۱۹۰۸ء کو سر جان فرسکاٹ ہیوٹ (Sir John Frescott Hewett) گورنر صوبجات متحدہ

---

[1] النجم، لکھنؤ، ۲۱ر صفر ۱۳۲۶ھ

(یوپی) کو ایک درخواست بھی پیش کی جس میں علاوہ اور باتوں کے حسب ذیل امور بھی درج تھے:

۱۔ شیعوں کی تعزیہ داری (عزاداری) لکھنؤ میں ہر سال ۲۸ ذی الحجہ سے ۸ ربیع الاول تک مسلسل دو مہینے دس دن رہتی ہے اور اس تعزیہ داری کے دوران وہ اپنے اماموں اور دیگر اراکین خاندان رسالت کی شہادت علی الخصوص شہادت امام حسین کی یادگار مناتے ہیں۔

۲۔ تعزیہ داری سنی مذہب کے خلاف ہے اور سنی اپنی تعزیہ داری شیعوں کی طرح نہیں کرتے بلکہ صرف تھوڑے سے سنی امام حسین کی شہادت کربلا کو بطور ایک حادثۂ غم کے عشرہ (دسویں محرم) کے روز مناتے ہیں۔

۳۔ شیعہ تعزیہ داری کے موقع پر سنیوں کا خلفاء ثلاثہ کی شان میں چار یاری نظمیں پڑھنا ان کے جذبات کو مجروح کرتا ہے اور ان کے مذہبی احساسات کے لیے توہین آمیز ہونے کی بنا پر ان کو ناگوار ہوتا ہے۔

۴۔ عام جلوسوں میں چار یاری نظموں کا پڑھنا ایک جدت ہے جو قابل اعتراض ہے۔

۵۔ امر مذکور (یعنی چار یاری نظمیں پڑھنا) بھی مذہب اہل سنت کے خلاف ہے۔

۶۔ اس بنا پر امر مذکور (چار یاری نظمیں پڑھنے) کی غرض اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ اس سے شیعوں کے مذہبی حسیات کی توہین کی جائے اور ان کو مجروح کیا جائے۔[1]

مذکورہ بالا درخواست پیش کرنیوالوں کا منشاء یہ تھی کہ سنی چار یاری علم اٹھانے اور خلفاء ثلاثہ کی مدح میں نظمیں پڑھنے سے حکماً روک دیئے جائیں تاکہ درخواست دہندگان بغیر روک ٹوک کے آزادی کے ساتھ اپنے مراسم عزاداری ادا کرسکیں اور تعزیے نکال سکیں۔

حضرت علیؓ اور مدح خلفاء ثلاثہؓ

شیعوں کی اس درخواست میں جو چھ باتیں پیش کی گئی تھیں ان سب کا خلاصہ یہ تھا کہ خلفاء ثلاثہؓ کی تعریف میں پڑھے جانے والے اشعار سے ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور ان نظموں کا پڑھنا ایک قسم کی جدت ہے اس لیے اس کو ممنوع قرار دیا جائے — جہاں تک ان چھ باتوں کا سوال ہے ان میں سے پہلی اور دوسری دفعہ کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے البتہ تیسری دفعہ کے بارے میں اتنا عرض کرنا ہے کہ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ جن کی تقلید اور پیروی کا شیعہ دعویٰ کرتے ہیں وہ خود تو خلفاء ثلاثہؓ کی تعریف و توصیف کریں اور آج کے

---

[1] عرضداشت بخدمت سرہنری ہیگ گورنر صوبجات متحدہ لکھنؤ، منجانب اہل سنت والجماعت، ۱۴ ر نومبر ۱۹۳۶ء

شیعہ انھیں برگزیدہ ہستیوں پر تبرا کریں اور ان کی مدح وستائش کو اپنی دل آزاری متصوّر کریں۔

ایں چہ بوالعجبی ست؟ —— نہج البلاغۃ شیعوں کے نزدیک نہایت معتبر کتاب ہے اور اس کی نسبت انھیں یقین ہے کہ اس میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے مکتوبات، خطبات اور مواعظ درج ہیں، اسی کتاب کی شرح میں حضرت علیؓ کا یہ قول بھی ملتا ہے:

و کان افضلھم فی الاسلام کما زعمت و انصحھم للّٰہ و لرسولہ الخلیفۃ الصدیق و خلیفۃ الخلیفۃ الفاروق و لعمری ان مکانھما فی الاسلام لعظیم و ان المصاب بھما لجرح فی الاسلام شدید یرحمھما اللّٰہ و جزا ھما باحسن ما عملا۔[1]

اور اسلام میں سب سے زیادہ فضلیت والے اور خدا اور رسول کے ساتھ اخلاص رکھنے والے جیسا کہ تم نے بیان کیا خلیفہ (ابوبکر) الصدیقؓ تھے اور خلیفہ کے خلیفہ (عمر) الفاروق تھے اور میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یقیناً ان دونوں کا مرتبہ اسلام میں بڑا عظیم الشان ہے اور ان دونوں کی موت نے اسلام کو سخت زخم پہونچایا، اللہ تعالیٰ ان دونوں کے اعمال حسنہ کے صلہ میں ان پر اپنی برکتیں نازل کرے اور انھیں بہترین انعام عطا فرمائے۔

اسی طرح اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اس وقت جب کہ وہ باغیوں کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے یوں خطاب فرمایا تھا:

واللّٰہ ما ادری ما اقول لک ما اعرف شیئاً تجھلہ و لا اَدُلّک علیٰ امر لا تعرفہ انک لتعلم ما نعلم، ما سبقناک الی شیءٍ فنخبرک عنہ و لاخلونا بشیئٍ فنبلغکہ و قد رایتَ کما رأینا، وسمعتَ کما سمعنا وصحبتَ رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ کما صحبنا و ما ابن ابی قحافۃ و لا ابن خطاب اولٰی بعمل الحق منک

خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ آپ کو کیا صلاح دوں مجھے کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہے جس کا علم آپ کو نہ ہو، جن باتوں کو ہم جانتے ہیں آپ بھی انہیں جانتے ہیں میں آپ سے کسی چیز میں فائق نہیں ہوں کہ جسے آپ کو بتلانے کی ضرورت ہو، ہم نے کوئی چیز (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایسی نہیں حاصل کی کہ جو ہم آپ کو بتا سکیں، حقیقتاً آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح دیکھا ہے جیسا کہ میں نے اور اسی طرح گفتگو فرماتے سنا ہے جیسا کہ میں نے اور آپ نے ان کی صحبت اسی طرح پائی ہے

---

[1] ابوالائمہ کی تعلیم، ص ۱۲ بحوالہ شرح نہج البلاغہ، ابن میثم بحرانی، مطبوعہ طہران، ص ۳۱

و انت اقرب الی رسول الله صلی اللّٰہ علیه و آله وسلم و شیجة رحم منهما و قد نلت من صهره مالم ینالا۔[1]

جیسا کہ میں نے، ابوبکرؓ وعمرؓ اعمال خیر میں آپ سے بہتر نہ تھے، آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (رشتہ میں) ان دونوں کی بہ نسبت زیادہ قریب تھے اور آپ کو ان کی دامادی کی عزت بھی حاصل ہوئی جو ان دونوں کو حاصل نہ تھی۔

مندرجہ بالا اقتباسات کو دیکھ کر کوئی شخص اس بات کو مشکل ہی سے باور کر سکے گا کہ کل تک حضرت علی مرتضیٰؓ جن اشخاص (خلفاء ثلاثہ کی مدح وثنا فرماتے تھے آج انہیں کو شیعہ خاص طور سے نفرت کا مستحق قرار دیں گے اور ان ہی کی تعریف وتوصیف سے ان کی دل آزاری ہوگی لہٰذا اتباع اور پیروی مرتضوی کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے اور اعتقاد وعمل کا یہ تضاد نہ جانے کن کن باتوں کی غمازی کرتا ہے شیعوں کا دوسرا یہ الزام کہ خلفاء ثلاثہ کی تعریف میں اشعار پڑھنا ایک جدید امر ہے جو حقائق کے بالکل برخلاف ہے۔ یہ نظمیں ۱۹۰۴ء کے شیعہ سنی اختلافات سے بہت پہلے بھی لکھی اور پڑھی جاتی تھیں اور اسی زمانے میں یہ چھپ بھی چکی تھیں، محرم کے مراسم میں سنیّوں کا اپنی محافل ومجالس میں چاریاری نظمیں پڑھنا ان کا ایک امتیازی نشان تھا اور یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا تھا اور کسی بھی فریق کو اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ النجم کے صفحات میں نظر سے گذرا ہے جو قابل ذکر ہے۔

ایک لطیفہ

۱۹۰۸ء کے عشرۂ محرم کے موقع پر جو شیعہ سنی فساد ہوا تھا اس کی پیشیاں عدالت میں ہو رہی تھیں اور فریقین کے گواہوں سے جرح ہو رہی تھی، ۳۰ر مارچ ۱۹۰۸ء کی پیشی پر ایک سُنّی گواہ تاج علی ساکن پل فرنگی محل لکھنؤ سے جرح ہو رہی تھی، اثنائے جرح ایک شیعی بیرسٹر یوسف حسین نے گواہ سے پوچھا کہ مناقب صحابہ میں جو نظمیں پڑھی جاتی ہیں اس کا رواج کب سے ہوا؟ گواہ نے جواب دیا کہ بہت دنوں سے یہ رواج ہے۔ کربلائے قدیم (تالکٹورہ) میں بھی ایک فقیر باآواز بلند مناقبِ صحابہ میں نظمیں پڑھا کرتا تھا۔ اور اس فقیر کو شیعہ وسنی دونوں پیسے دیا کرتے تھے۔ بیرسٹر صاحب نے سوال کیا کہ کیا پہلے آہستگی کے ساتھ مناقب صحابہؓ بیان کیے جاتے تھے اور اب کچھ زور وشور کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں؟ گواہ نے جواب دیا کہ جی نہیں! جس طرح پہلے پڑھے

---

[1] نہج البلاغہ مع اُردو ترجمہ، ص۲۲-۵۲۳

اور بیان کیے جاتے تھے اسی طرح اب بھی پڑھے اور بیان کیے جاتے ہیں۔ اس پر بیرسٹر صاحب کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے مجسٹریٹ سے مخاطب ہو کر کہا کہ حضور! یہ بالکل غلط ہے، اگر گواہ بیس پچیس برس پہلے کی کوئی نظم اس سلسلہ کی چھپی ہوئی دکھلا دے تو میں پچیس روپیہ نقد انعام دوں گا۔ مجسٹریٹ نے تاج علی سے پوچھا کہ کیا تم کوئی ایسی پرانی چھپی ہوئی نظم دکھلا سکتے ہو؟ انھوں نے اقرار کیا کہ ہاں دکھلا سکتا ہوں۔ مجسٹریٹ نے بیرسٹر صاحب سے کہا کہ اچھا انعام کی رقم یہاں داخل کرو، انھوں نے پچیس روپے عدالت کی میز پر رکھ دیئے۔ ادھر تاج علی کو حکم ہوا کہ جاؤ اگلی پیشی پر بیس پچیس برس پہلے کی چھپی ہوئی کچھ ایسی نظمیں لاکر دکھلاؤ۔ تاج علی جب چلنے لگے تو ایک وکیل صاحب بھی شیعوں کی طرف سے ان کے ساتھ ہوئے تاج علی نے گھر پہنچتے ہی مطبوعہ نظمیں تلاش کرنی شروع کر دیں، ایک صاحب کے یہاں سے ۱۸۸۷ء/۱۳۰۵ھ کی مطبوعہ ایسی نظمیں حاصل ہو گئیں۔ متعینہ پیشی پر وہ ان کو لے کر عدالت میں حاضر ہو گئے۔ اور مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ بیرسٹر یوسف حسین یہ دیکھ کر گھبرا گئے اور بولے کہ حضور اس پر جس مطبع کا نام لکھا ہوا ہے یعنی مطبع نظامی اس نام کا کوئی مطبع ہی نہیں ہے۔ اس پر جواب دیا گیا کہ یہ بالکل غلط ہے، مطبع نظامی کانپور کا بہت مشہور و معروف مطبع ہے اور بہت قدیم ہے۔ پھر شیعوں کی جانب سے یہ اعتراض ہوا کہ اس پر تو "چار یاری ڈنکا" لکھا ہوا ہے، ہم نے تو چار یاری نظموں کی بابت بات کہی تھی، مجسٹریٹ نے کہا کہ آخر چار یاری ہے کہ نہیں؟ جواب ملا کہ ہے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ بس پھر تو یہ انعام کی رقم ہم تاج علی کو دیتے ہیں تم کو اگر کچھ عذر ہے تو ہمارے اوپر دیوانی میں جا کر نالش کر دو، یہ کہہ کر موصوف نے وہ روپیہ تاج علی کو دیدیا۔[1]

اس واقعہ نے مجسٹریٹ کو مناقب صحابہ کی قدامت کا پورا یقین دلا دیا اور ساتھ ہی ساتھ فریق مخالف کی راست بیانی کا بھی کافی علم ہو گیا۔ چنانچہ ۸/اپریل ۱۹۰۸ء کی وہ درخواست جو شیعوں نے لیفٹیننٹ گورنر کو پیش کی تھی فی الحال بے اثر ثابت ہو گئی۔ اس طرح فریق مخالف کی معاندانہ روش سے اختلافات کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی اور باوجود ہر ممکن کوشش کرنے کے حالات میں سدھار کی امیدیں مفقود ہو گئیں اور سنّیوں کو یہ یقین ہو گیا کہ ان کے مذہبی حق کی ادائیگی میں بیجا دخل اندازی کی جا رہی ہے چنانچہ انھوں نے اپنے حقوق کے دفاع میں سوچنا شروع کر دیا اور اس طرح انتہائی مجبوری و اضطراری حالات میں تحریک مدحِ صحابہؓ کا آغاز ہوا۔

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۸/صفر ۱۳۲۶ھ

بارہواں باب

پگٹ کمیشن کا قیام

لکھنؤ میں شیعہ وسنی فرقوں کے درمیان ۱۹۰۴ء کے بعد سے جو اختلافات رونما ہوئے تھے ان کا سلسلہ نہ صرف یہ کہ بدستور جاری رہا بلکہ روز بروز آپسی تعلقات خراب تر ہوتے گئے، اسی عرصہ میں دونوں فرقوں کے درمیان متعدّد فسادات بھی ہوئے، مقدمات چلے، سزائیں ہوئیں اور دونوں طرف بکثرت جانی و مالی نقصانات بھی ہوئے۔ شیعوں کو اس بات کا اطمینان تھا کہ مقامی حکام شیعہ سنی معاملات میں بالکل ان کے ہم زبان ہیں لہٰذا ان کی ہمتیں اتنی بڑھیں کہ خلفائے ثلاثہؓ کی مدح وثنا کو ایک جدید رسم اور دل آزار فعل کہنے لگے اور حکومت سے مانگ کرنے لگے کہ وہ اس فعل کو قانوناً روک دے۔ اس سلسلہ میں بہت سے معززین شیعہ نے ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر جاکر اپنے غم وغصہ کا اظہار بھی کیا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب مسٹر جاپلنگ لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر تھے، ان کی طرف سے انھیں جواب ملا کہ اگر مدح خلفاء جدید امر اور دل آزار ہے تو تعزیراتِ ہند کے بموجب اس کے انسداد کے لیے عدالت کھلی ہوئی ہے، وہاں جاکر چارہ جائی کرو۔ چونکہ مدحِ خلفاء کے جدید اور دل آزار ہونے کا ثبوت ممکن نہ تھا اور ڈپٹی کمشنر اور سٹی مجسٹریٹ اس مسئلہ میں ان کے مؤید نہ تھے اس لیے شیعوں نے مسٹر جاپلنگ کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور عدالت مجاز کی طرف نہ گئے بلکہ مسٹر سانڈرس (Mr. Saunders) کمشنر کے پاس پہنچے وہ ان کے طرفدار تھے اس لیے انھوں نے عدالت مجاز میں جانے کی صلاح نہ دی بلکہ شیعوں کے حسب منشاء لیفٹیننٹ گورنر سر جان ہیوٹ کے حکم سے فریقین کے اختلافات ختم کرانے کے لیے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرانے میں کامیابی حاصل کر لی جو پگٹ کمیشن (Piggott Commission) کے نام سے مشہور ہوا۔

کمیشن کے مقرر ہو جانے کے بعد شیعہ سنی اختلافات کا مسئلہ ایک لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ بن

گیا لہٰذا اب سرکاری سطح پر بھی یہ مرکز توجہ بن گیا، بالآخر حکومت یو پی نے ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ایک ریزولیوشن شائع کیا جس میں اعلان کیا گیا کہ شیعہ سنی فسادات کی تحقیقات کرنے کے لیے حکومت ایک کمیشن قائم کرنا چاہتی ہے جو مندرجہ ذیل امور پر غور کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے گا:

۱۔ سالہائے گذشتہ میں شیعہ سنی فرقوں کو کن کن امور کی اجازت دی جاتی تھی؟

۲۔ ہر دو فرقوں کے طرزِ عمل میں اب کس قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی ہے؟

۳۔ کیا کوئی تبدیلی ایسی بھی آئی ہے جس سے دوسرے فرقہ کی دل آزاری ہوتی ہے؟

۴۔ ایسی سفارشات کی تجویز جو آئندہ حالات میں سدھار کرنے کے لیے ضروری ہوں۔

مذکورہ کمیشن مسٹر ٹی۔ سی پگٹ (T.C. Piggott) کی صدارت میں قائم ہوا تھا اس لیے یہ پگٹ کمیشن کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کمیشن میں حسب ذیل دو عیسائی، دو ہندو، دو شیعہ اور دو سنی ممبران نامزد کیے گئے تھے۔

۱۔	مسٹر ٹی۔ سی پگٹ (T.C. Piggott)		صدر کمیشن و عیسائی ممبر
۲۔	مسٹر سی۔ اے۔ بی اولیور (C.A.B. Oliver)		عیسائی ممبر
۳۔	مولوی عبد المجید فرنگی محلیؒ	(م ۱۹۲۲ء)	سنّی ممبر
۴۔	منشی احتشام علی کاکورویؒ	(م ۱۹۴۳ء)	سنّی ممبر
۵۔	مولوی ناصر حسین مجتہد شیعہ	(م ۱۹۴۱ء)	شیعہ ممبر
۶۔	سید شہنشاہ حسین وکیل		شیعہ ممبر
۷۔	آنریبل رائے سری رام		ہندو ممبر
۸۔	بابو گنگا پرشاد ورما[1]		ہندو ممبر

ان ناموں کے اعلان کے کچھ ہی روز کے بعد مولوی عبد المجید فرنگی محلیؒ نے یہ کہہ کر کمیشن کی رکنیت سے استعفا دے دیا کہ میں ضعیف الرائے اور قوانین عدالت سے ناواقف ہوں لہٰذا مجھے اس کی رکنیت سے معاف کیا جائے، اسی طرح منشی احتشام علی کاکورویؒ نے بھی اپنی بعض خانگی مصروفیات کو ظاہر کر کے معذرت کر لی[2] ان دونوں حضرات کا استعفا پہنچتے ہی حکام نے ہر دو صاحبان سے دریافت کیا کہ پھر کن لوگوں کو آپ کی جگہ ممبر مقرر کیا جائے، مولوی عبد المجید فرنگی

---

[1] ہفت روزہ النجم، لکھنؤ، ۲۱؍ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ [2] ہفت روزہ النجم، لکھنؤ، ۱۴؍ شوال ۱۳۲۶ھ

ثانیؒ نے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کے نام کی تجویز کی اور بعض دوسرے حلقوں سے چودھری نبی اللہ بیرسٹر (م ۱۹۲۵ء) کا نام پیش کیا گیا لہٰذا یہ دونوں حضرات باتفاق رائے کمیشن میں سنّیوں کے نمائندے نامزد کر دیئے گئے۔ کمیشن میں قانونی طور پر شیعوں کی طرف سے سیّد عابد حسین بیرسٹر اور سنّیوں کی طرف سے آر۔ الیف بہادر جی بیرسٹر (پارسی مذہب) نمائندگی کرنے کے لیے مقرر کیے گئے۔ چودھری نبی اللہ بیرسٹر بھی سوائے پہلے اجلاس کے اور کسی میں شرکت نہ کر سکے لہٰذا حضرت مولانا لکھنویؒ کو ہی شروع سے لے کر آخر تک تنہا کمیشن میں سنّیوں کی نمائندگی کرنی پڑی۔

مدحِ صحابہؓ کے مسئلہ پر حضرت لکھنویؒ کا بیان

کمیشن کا پہلا اجلاس ۱۲ر نومبر ۱۹۰۸ء کو کونسل ہاؤس لکھنؤ میں منعقد ہوا پھر ہر پانچ چھ دن کے وقفہ سے تقریباً پندرہ اجلاس ہوئے جن میں شیعہ سنی اختلافات پر متعدد امور زیر بحث آئے۔ ۲۷ر نومبر ۱۹۰۸ء کے اجلاس میں سب سے اہم مسئلہ ''مدحِ صحابہ'' اور ''چار یاری نظموں'' کے پڑھنے کا اٹھایا گیا اور وہ اشعار کمیشن کے سامنے پڑھ کر سنائے گئے جن پر شیعوں کو ہمیشہ یہ اعتراض ہوا کرتا تھا کہ ان سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے۔ اس موقع پر حضرت مولاناؒ نے مدحِ صحابہؓ اور بالخصوص خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں منقبت کے اشعار پڑھنے کے جواز میں کمیشن کے سامنے جو برجستہ بیان دیا تھا وہ انھیں کے الفاظ میں پڑھنے کے لائق ہے:

> ''ان اشعار کی نسبت میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ شیعوں کے کسی فعل کے جواب میں نہیں ہیں بلکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ اپنے مذہبی احکام کی تعمیل میں کرتے ہیں۔ کیفیت یہ ہے کہ شریعت کی طرف سے ہم کو کچھ ایسے احکام ملتے ہیں جن کی تعمیل کا کوئی خاص طریقہ نہیں بتایا جاتا۔ دنیاوی حکام کی طرف سے بھی کبھی ایسے ہی احکامات ملا کرتے ہیں جن کی تعمیل کا طریقہ نہیں بتایا جاتا، وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ ان احکام کی تعمیل کے طریقے تبدّل زمانہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا کوئی خاص طریقہ اگر اس کے متعلق شارع کی طرف سے یا حکام دنیا کی طرف سے متعین کر دیا جاتا تو بالکل خلافِ مصلحت وفطرت ہوتا۔ مثلاً ہماری شریعت کی طرف سے ہم کو ایک حکم یہ ملا کہ علم حاصل کرو، اب دیکھئے اس حکم کی تعمیل کے طریقے تبدّل زمانہ سے کس قدر بدلتے رہے

ہیں۔ایک وہ زمانہ تھا کہ اس حکم کی تعمیل کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے سینوں میں علوم محفوظ تھے، دور دراز کے مقامات سے طالبین آتے اور ان سینوں سے علوم لے کر اپنے سینوں میں رکھ کر اپنے اپنے وطن واپس چلے جاتے تھے، چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ یہ طریقہ ناکافی ہے، اب علوم کو سینوں سے نکل کر سفینوں میں آنا چاہیے چنانچہ کتابیں مدوّن ہونا شروع ہوئیں اور تقریباً ۱۴۰ھ میں کتابوں کا کام شروع کر دیا گیا، اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ مثلاً امام مالکؒ مدینے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ان کی کتاب مؤطا ہے جس کو پڑھنے کے لیے حلب، دمشق، اسکندریہ اور آذربائیجان جیسے مقامات سے طالبین آرہے ہیں اور ان سے وہ کتاب پڑھ رہے ہیں، کوئی اس کو زبانی یاد کر لیتا ہے اور کوئی اس کی نقل لے لیتا ہے اور اس کے بعد سب اپنے اپنے وطن واپس چلے جاتے ہیں۔چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ یہ طریقہ بھی اب ناکافی ہو گیا ہے لہٰذا اب یہ ہونا چاہیے کہ مدارس قائم کیے جائیں اور ان میں مدرسین کو متعین کیا جائے اور طلباء کے وظائف مقرر کیے جائیں چنانچہ یہ انتظام ایک بڑے پیمانے پر ہونے لگا، چند روز کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اب یہ طریقہ بھی ناکافی ہو چکا ہے، قلمی کتابوں سے اب کام نہ چلے گا بلکہ اب پریس کا ہونا ضروری ہے جس کی مدد سے دینی کتابیں چھاپی جائیں اور علوم دینیہ کی اشاعت کتب و رسائل کے ذریعہ عمل میں آئے، چنانچہ یہ انتظام بھی ہونے لگا۔

ٹھیک اسی طرح سے شریعت کی طرف سے ہم کو ایک حکم یہ ملا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کی جائے، ان کی یادگار قائم کی جائے، ان کی پیروی کی جائے اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی جایا کرے۔یہ احکام قرآن کریم اور احادیث میں بصراحت اور بتاکید تمام مذکور ہیں اب دیکھیے کہ اس حکم کی تعمیل کے طریقے تبدلِ زمانہ سے کس قدر بدلتے رہے۔ایک زمانہ وہ تھا کہ اس حکم کی تعمیل کے لیے ہم کو کسی انتظام کی ضرورت نہ تھی، خود ان مقدس حضرات کے کارنامے تمام دنیا کے پیش نظر تھے مگر چند روز کے بعد جب زمانہ میں کچھ دوری ہو گئی تو اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب ہم کو اس حکم شرعی کی تعمیل کے لیے کوئی نیا انتظام کرنا چاہیے چنانچہ جمعہ و عیدین کے خطبوں میں عشرہ مبشرہ اور بالخصوص خلفائے راشدینؓ کے نام نامی داخل کیے گئے۔چند روز کے بعد جب ہم ان مقدس قرون سے اور زیادہ بعید ہو گئے تو ہم کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اب کچھ اور انتظام کرنا چاہیے کیونکہ یہ انتظامِ سابق اب ناکافی ہو چکا ہے لہٰذا تمام

مصنفین اسلام نے یہ التزام کرلیا کہ جو کتاب تصنیف وتالیف کی جائے خواہ وہ کسی فن میں بھی ہو اس کے دیباچہ میں حمد ونعت کے بعد صحابۂ کرام اور خصوصاً خلفائے راشدینؓ کے فضائل اوران کے لیے دعائے مغفرت ضرور ہو، اکثروں نے نام بنام خلفائے راشدینؓ کا تذکرہ کیا اور بعض نے اجمال سے کام لیا۔ چنانچہ اس وقت بے شمار کتابیں متقدمین اور متاخرین کی اس التزام کی شہادت دے رہی ہیں حتیٰ کہ وہ درسی کتابیں جن کو شیعہ وسنی دونوں پڑھتے ہیں اس التزام سے خالی نہیں ہیں، مثلاً گلستاں، بوستاں اور سکندرنامہ وغیرہ جن کو ہر خواندہ شیعہ نے پڑھا ہوگا ان میں نام بنام فضائل خلفائے راشدینؓ لکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح عربی درسیات کو دیکھئے منطق، فلسفہ، طب اور ہر فن کی کتابیں اس التزام سے معمور ہیں۔ چندروز کے بعد جب ہم ان قرونِ مقدسہ سے اور دور ہوگئے تو معلوم ہوا کہ اب یہ انتظام بھی ناکافی ہو چکا ہے لہٰذا کسی اور جدید انتظام کا اضافہ ہونا چاہیے، چنانچہ یہ انتظام کیا گیا کہ تمام مسلمانوں نے مختلف اوقات میں محافل منعقد کرنا شروع کیں جس میں آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات، آپؐ کے معجزات اور اس کے بعد خلفائے راشدینؓ کے حالات اوران کے فضائل بیان کیے جانے لگے، اب انہی محافل کا نام محافل میلاد ہوگیا ہے۔ یہ محافل ہندوستان کے ہر گوشہ میں بلکہ تمام دنیا میں جہاں جہاں مسلمان رہتے ہیں اس کثرت اور شغف کے ساتھ ہوتی ہیں کہ ان کا احاطہ ناممکن ہے۔ الغرض ہم جیسے جیسے ان قرونِ مقدسہ سے دور ہوتے گئے جدید مذاکرات (یعنی ان مقدس حضرات کی یادتازہ کرنے والی چیزوں) کی ضرورت محسوس ہوتی گئی اور ہم ان کو نہایت آزادی کے ساتھ مختلف سلطنتوں میں انجام دیتے رہے۔

اب اگر یہ حکم دیا جائے کہ کسی حکم شرعی کی تعمیل کے جو طریقے اس وقت ہم میں موجود ہیں یا کچھ پہلے موجود تھے بس انھیں پر قناعت کریں اور کوئی جدید طریقہ نہ برتیں تو ہمیں اندیشہ ہے کہ چندروز کے بعد ہم اپنے اصل احکام شرعی کی تعمیل سے بالکل معذور ہو جائیں گے کیونکہ جو طریقے اس وقت رائج ہیں وہ چندروز کے بعد ناکافی ثابت ہوں گے لہٰذا اس طرح کی کوئی پابندی لگانا ہماری مذہبی آزادی پر ایک حملہ متصور ہوگا۔"[1]

یہ تقریر کمیشن کے تمام اراکین کی موجودگی میں ہوئی، مسٹر ٹی۔ سی پگٹ جو کمیشن کے چیرمین

---

[1] ہفت روزہ النجم لکھنؤ، ۷ر ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ

تھے بڑی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے اور نوٹ کرتے رہے۔ اس تقریر کے بعد کمیشن کی کارروائی ختم ہوئی اور اگلے اجلاس کے لیے ۲۸ر نومبر ۱۹۰۸ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔

شیعوں کا مطالبہ

۲۸ر نومبر ۱۹۰۸ء کے اجلاس میں پہلے پولیس کی خفیہ رپورٹیں جو شیعہ سنّی تعلقات سے متعلق تھیں پڑھ کر سنائی گئیں، اسی اثنا میں مسٹر سانڈرس کمشنر لکھنؤ ریجن جن کے عہد ڈپٹی کمشنری میں کربلائے تالکٹورہ کی جدید اصلاحات عمل میں آئی تھیں کمیشن میں پیش ہوئے اور ان کی شہادت لی گئی جو تقریباً دو گھنٹہ تک جاری رہی۔

آخر میں مولوی ناصر حسین مجتہد شیعہ[۱] سے دریافت کیا گیا کہ کیا وہ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ موصوف نے اپنے فرقہ کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے درج ذیل دو باتوں کی مانگ کی:

۱۔ سنّیوں کو کسی قسم کا علم یا جھنڈا اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے، نہ تعزیے کے ساتھ نہ تعزیے کے بغیر اور نہ محرم میں اور نہ غیر محرم میں کیونکہ اس سے (خلفاء) ثلاثہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

۲۔ چار یاری نظموں کے پڑھنے کی اجازت سنّیوں کو کسی حالت اور کسی وقت میں بھی نہ دی جائے، نہ تعزیے کے ساتھ نہ بغیر تعزیے کے اور نہ محرم میں اور نہ غیر محرم میں۔

---

[۱] مولوی سیّد ناصر حسین مجتہد کی ولادت اکتوبر ۱۸۶۷ء کو بمقام لکھنؤ ہوئی۔ ان کے والد مولوی سیّد حامد حسین مجتہد نے ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی تعلیم کو مکمل کرایا، اس کے بعد مفتی محمد عباس کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ مولوی حامد حسین نے اپنے بیٹے کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا، چنانچہ اپنی تصنیف عبقات الانوار میں ان کو شریک کر لیا اور انھوں نے ہی ان کو "صدر المحققین" کا خطاب دیا۔ ۱۹۱۵ء میں "شمس العلماء" کا خطاب حکومت سے ملا۔ مختلف شیعہ علماء کے تعاون سے "انجمن صدر الصدور" قائم کی جو بعد میں "شیعہ کانفرنس" کے نام سے موسوم ہوئی، شیعہ کالج اور شیعہ یتیم خانہ کا قیام اور انجمن محاذ حسینی کے نام سے لکھنؤ میں تحریک تبرا ایجی ٹیشن بھی آپ ہی کے دَم خم سے وجود میں آئی، اپنے والد کے کتب خانہ کو جو "کتب خانہ ناصریہ" کے نام سے مشہور ہے خوب ترقی دی۔ ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ میں وفات ہوئی اور پھر تدفین آگرہ میں قاضی نور اللہ شوستری کے مقبرہ کے پاس ہوئی۔ ان کا بنیادی کام عبقات الانوار کی تکمیل ہے۔ دوسری کتابوں میں نفحات الاظہار فی فضائل الائمۃ الاطہار ۱۶ جلدوں میں 'کتاب الاثمار الشہیہ فی المنشآت العربیہ' اسباغ النائل بتحقیق المسائل اور ان کے علاوہ دوسرے رسائل وخطبات اور دیوان عربی شاعری وغیرہ لائق تذکرہ ہیں۔

اس درمیان میں چیرمین نے پوچھا کہ آپ کی رائے ان اشعار کے بارے میں کیا ہے جن پر اختلاف ہے تو مولوی ناصر حسین مجتہد نے جواب دیا، جن اشعار میں ہم کو برا کہا گیا ہے وہ ہمارے لیے اس قدر دل آزار نہیں ہیں جس قدر وہ اشعار دل آزار ہیں جن میں (خلفاء) ثلاثہ کی تعریف کی جاتی ہے۔

چیرمین نے پوچھا کہ حضرت علیؓ کے ان صاحبزادوں کے مرثیہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جن کا نام ابوبکر، عمر اور عثمان تھا؟

مجتہد موصوف نے جواباً کہا، ان کے مرثیے بھی سنّی نہ پڑھنے پائیں کیونکہ ان سے بھی (خلفاء) ثلاثہ کی یادگاری ہوتی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ (خلفاء) ثلاثہ نے ہمارے ائمہ پر بہت ظلم وستم کیے ہیں اور وہی ہمارے ائمہ کے قاتل ہیں۔

اس موقع پر مولانا لکھنویؒ نے مداخلت کرتے ہوئے فرمایا کہ مولوی ناصر حسین صاحب یہ باتیں اپنی زبان سے تو فرمارہے ہیں لیکن میرے سامنے ثابت نہیں کرسکتے نہ کسی تاریخ سے اور نہ کسی حدیث سے اور معاف کیجئے گا قرآن کریم کے سامنے تو تمام شیعہ بالکل لاجواب ہیں۔

چیرمین نے ٹوکتے ہوئے کہا کہ کمیٹی اس لیے نہیں ہورہی ہے کہ مذہبی امور کا فیصلہ کرے، اس کے جواب میں مولاناؒ نے فرمایا:

"یہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ کمیٹی کسی مذہب کی حقیت یا بطلان کے فیصلے کے لیے نہیں ہورہی ہے مگر یا تو مولوی ناصر حسین کو یہ بات ہمارے سامنے کہنا نہیں چاہیے تھی اور اگر انھوں نے کہا ہے تو وہ اس کو ثابت کریں۔"

مولوی ناصر حسین بولے، یہ ہمارا عقیدہ ہے (یعنی اگرچہ ہم اس کو ثابت نہیں کرسکتے مگر پھر بھی ہمارا عقیدہ یہی ہے)، اس پر مولاناؒ نے فرمایا، اگر ایسے عقائد کا لحاظ کیا جائے گا تو عالم کا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔[1]

بقیہ دوسرے اجلاسوں کی مختصر کارروائی یہ ہوئی کہ تنقیح مدحِ صحابہؓ کے سلسلہ میں مولوی عبدالمجید فرنگی محلیؒ، منشی احتشام علی کاکورویؒ، منشی سخاوت علیؒ میونسپل کمشنر، منشی محمد شفیع پلیڈر اور خواجہ محمد یوسف پیش ہوئے اور شیعوں کی طرف سے حکیم نذیر حسن آنریری مجسٹریٹ، نواب راحت علی خاں ڈپٹی

---

[1] ہفت روزہ النجم لکھنؤ، ۷/ذی تعدہ ۱۳۲۶ھ

کلکٹر پنشنز اور مرزا محمد عباس کی شہادتیں ہوئیں اس کے بعد بیرسٹروں کی بحث شروع ہوئی پھر چیرمین اور ممبران کمیشن کی خفیہ میٹنگ ہوئی جس میں فائنل رپورٹ تیار کرنے کے لیے ایک دن کی مہلت طلب کی گئی۔

احوال واقعی

برطانوی حکومت کی پالیسی ہندوستان میں ہمیشہ یہی رہی تھی کہ یہاں کے عوام اور مختلف مذہبی فرقے آپس میں برابر متصادم رہیں تاکہ انھیں غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی سوچنے کا موقع نہ مل سکے اور اپنا اقتدارِ اعلیٰ بدستور قائم رہے، اسی مقصد کے پیشِ نظر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت وعناد کا بیج بویا گیا، مسجدوں میں سور کا گوشت اور مندروں میں گائے کا گوشت رکھوا کر فرقہ وارانہ فسادات کرائے گئے جس میں بیشمار جانی اور مالی نقصانات ہوئے یہی کھیل شیعہ وسنی معاملات میں لکھنؤ میں بھی کھیلا گیا۔ ان دونوں فرقوں کی دُکھتی رگوں پر انگلیاں رکھی گئیں اور اختلافات کی خلیج کو بجائے کم سے کم کرانے کے اور وسیع تر بنانے میں کسر نہیں چھوڑی گئی۔ جب جب ان دونوں فرقوں میں یہ اختلافات ابھر کر سامنے آئے انھیں اور ہوا دی گئی اور جب کبھی سمجھوتے اور مفاہمت کے لیے ان شاطروں اور موقع پرستوں کو ثالث بنایا گیا تو انھوں نے وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک فریق کو بیجا دباؤ اور دوسرے کو شہ دے کر تلخیوں کو مزید بڑھانے کی کوشش کی، ٹھیک انھی حالات سے لکھنؤ کے مسلم عوام بھی دوچار تھے۔ اہلِ سنت وجماعت باوجود اپنی مذہبی غفلت اور بے حسی کے برطانوی حکومت کے اس دام تزویر میں نہیں آئے اور وہ ہر تلخ گھونٹ کو خاموشی سے حلق کے نیچے اتارتے رہے اور امن وقانون کے لیے کوئی خطرہ نہیں بنے مگر بدقسمتی سے شیعوں نے اس نزاکت کو نہیں محسوس کیا اور وہ اس سازش کے اچھی طرح شکار ہوئے، انھوں نے اپنے مذہبی تعصب کی ترنگ میں آکر برطانوی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جو انھیں نہیں کرنا چاہیے تھا، حکومت وقت کی کاسہ لیسی اور حکام کے دروازوں پر جبیں سائی یہ وہ چیزیں ہیں جن سے حسبِ منشاء ہر قسم کا ناجائز مفاد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اپنی سابقہ حکومتوں کے اثرات اور معاشی بے فکری کی وجہ سے شیعوں میں احساس برتری کا جذبہ بھی کارفرما تھا، سنّیوں کے مقابلہ میں حکام رسی ان میں زائد تھی یہی وجہ ہے

کہ مذکورہ کمیشن میں سنّیوں کی طرف سے کوئی سنی بیرسٹر نمائندگی کے لیے نہیں مل سکا اور مجبوراً مسٹر ایف۔سی بہادر جی پارسی بیرسٹر کی خدمات حاصل کرنا پڑیں، اسی طرح علماء اور معززین شہر میں سوائے حضرت مولانا لکھنوی کے کوئی بھی دوسرا عالم کمیشن کا ممبر نہیں رہ سکا۔ جن حضرات کو بھی نامزد کیا گیا انھوں نے کسی نہ کسی بنیاد پر معذرت کر لی چنانچہ ان سب باتوں کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہو کے رہا۔

شہر میں بے چینی اور عیدگاہ پر اجتماع

کمیشن کی کارروائی ۷/دسمبر ۱۹۰۸ء کو ختم ہوگئی مگر اس کی رپورٹ فوراً شائع نہیں ہوئی، اس درمیان تمام شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ سنّیوں کے لیے مدحِ صحابہ، موقوف کر دی گئی ہے۔ اس افواہ سے سارے شہر میں اضطراب اور بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور ہر شخص حیران و پریشان ہو گیا، اسی موقع پر یہ بات بھی سننے میں آئی کہ کمیشن کے ارکان میں سے مسٹر اولیور، رائے بہادر سری رام وکیل اور بابو گنگا پرشاد ورما چیرمین کی رائے سے متفق ہو گئے ہیں لیکن شیعہ وسنّی ممبروں نے اس رپورٹ پر دستخط نہیں کیے ہیں اور وہ اپنی رائے علیحدہ سے پیش کرنے کی اجازت حاصل کر رہے ہیں۔ بہرکیف سنّی حلقوں میں ان خبروں سے بڑی بے چینی پیدا ہوگئی اور اس قسم کی خبروں کے قبل از وقت پھیل جانے سے عوام میں دل شکستگی اور انتشار کا پیدا ہونا ضروری بھی تھا اور اس سازش کا مقصد بھی یہی تھا چنانچہ ہر طرف سے یہی صدا بلند ہونے لگی کہ ہم نے صحابۂ کرام کی تعریف و توصیف بیان کرنے پر پابندی لگوادی ہے اور اب آئندہ 'چار یار' کا کوئی نام نہیں لے سکے گا۔ خواص اہل سنت نے اس قسم کی خبروں کی روک تھام کی بہت کوشش کی مگر عوام غم وغصہ اور شکستہ دلی کے جذبات کے ساتھ ۱۸/دسمبر ۱۹۰۸ء بروز جمعہ صبح دس بجے عیدگاہ عیش باغ لکھنؤ کے وسیع میدان میں بغیر کسی خاص اعلان واہتمام کے جمع ہونا شروع ہو گئے، اس اجتماع میں عوام وخواص دونوں شامل تھے جن کی تعداد دس ہزار سے زائد تھی۔ اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ لیفٹیننٹ گورنر یو پی کی خدمت میں اہلِ سنت و جماعت کی طرف سے ایک ایسا میمورنڈم پیش کیا جائے جس میں اپنے جائز مطالبات وشکایات کا مکمل اظہار ہو اور حکومت سے انصاف کی مانگ کی جائے چنانچہ بعد نماز جمعہ جلسہ کی کاروائی شروع ہوئی شیخ محمد کامل نے جلسہ کی صدارت کے لیے شمس العلماء مولانا

عبدالحمید فرنگی محلی کا نام پیش کیا جو باتفاق رائے منظور کیا گیا۔ اجتماع میں اس میمورنڈم کا مسودہ بھی پڑھ کر سنایا گیا اور اس کی تائید و توثیق کرائی گئی جس کو لیفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کرنا تھا پھر اور متعدد تجاویز منظور کی گئیں اور اس کے آخر میں مولانا عبدالحمید فرنگی محلیؒ نے ایک بسیط جامع اور پر اثر تقریر فرمائی جس میں خلفاء راشدینؓ کی مدح وثنا کو قرآن و حدیث کی روشنی میں ضروری قرار دیتے ہوئے عوام کو تسلی و تشفی دی اور صبر و تحمل سے کام لینے کی نصیحت کی، اس طرح بعد نماز عصر جلسہ برخاست ہوا۔

پگٹ کمیشن کی رپورٹ اور حکومت یوپی کا ریزولیوشن

پگٹ کمیشن نے تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ حکومت یوپی کے سامنے پیش کر دی اور پھر حکومت نے اس سلسلہ میں اپنا ایک ریزولیوشن ۷/جنوری ۱۹۰۹ء کو شائع کر دیا۔ حکومت یوپی نے جلوس کی تفریق اور دو کربلاؤں کے وجود پر اظہارِ افسوس کیا لیکن فی الوقت ان دونوں جلوسوں کو یکجا کرنا یا پھول کٹورہ کی کربلا کو ختم کرنا خلافِ مصلحت قرار دیا۔ حکومت یوپی نے محرم کے دو جلوس ہو جانے کی وجہ سے پولیس کو جو انتظامی دشواریاں پیش آتی تھیں ان کا تذکرہ کرنے کے بعد جلوس کی علیحدگی کے خلاف حسب ذیل الفاظ میں نکتہ چینی کی:

> ''محرم کے دو ایسے علیحدہ جلوسوں کو تسلیم کرنا جن میں سے ایک سنیّوں کے طرز کا اور دوسرا شیعوں کے طرز کا ہو گویا ان کے موجودہ اختلافات کو برقرار و قائم رکھنا ہوگا اور اس کا ضرور یہ نتیجہ ہوگا کہ دونوں فرقوں کے درمیان یہ نامبارک جھگڑا روز بروز بڑھتا جائے گا۔ اس اعتراض کے رفع کرنے کے لیے کمیٹی کی تجویز یہ ہے کہ قواعد پولیس میں شیعوں اور سنیّوں کے تعزیوں کے درمیان کچھ فرق نہ کیا جائے بلکہ پولیس کے قواعد میں محض یہ تحریر کیا جائے کہ ''وہ تعزیے جو پھول کٹورہ جانے والے ہوں اور وہ تعزیے جو تال کٹورہ جانے والے ہوں۔'' ہر تعزیہ دار کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ دونوں جگہوں میں سے جس جگہ چاہے اپنے تعزیے لے جائے۔ اگر مقصد صرف یہی ہوتا کہ آئندہ عشرۂ محرم پر باہم فریقین میں تصادم نہ ہو تو خیال یہ ہے کہ ۱۹۰۸ء کے چہلم کے موقع پر جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا یعنی شیعہ و سنّی جلوس کے لیے جو مختلف راستے اور اوقات مقرر کر دیے گئے تھے وہ کافی ہو جاتا لیکن لیفٹیننٹ گورنر کمیٹی کی اس رائے سے متفق ہیں کہ اس معاملہ میں ہمیں اور کچھ آگے بڑھنا چاہیے اور آئندہ بھی باہمی گفتگو اور آخری مصالحت کے لیے

دروازہ کھلا چھوڑ دینا چاہیے[1]"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مصلحت وقت کے پیشِ نظر انگریز ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مختلف فرقے باہم متحد نہ رہ سکیں اور آپس میں متصادم ہی رہیں بالخصوص مسلمانوں کا اتحاد انھیں بری طرح کھٹکتا تھا، اسی لیے وہ شیعہ سنی اختلافات کو ہوا دینے کی تاک میں رہتے تھے چنانچہ ممتاز شیعہ رہنما مولوی مظہر علی اظہر کا بیان ہے:

"پگٹ کمیشن کی رپورٹ اور حکومت یوپی کا ریزولیشن دونوں بناء فساد کو اور زیادہ مضبوط کرنے والے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ایک جلوس تھا جس میں حکومت کے بعض افسران کے احکام نے اختلافات کی صورت پیدا کی۔ ۱۹۰۶ء میں سنیوں کو دوسری کربلا قائم کرنے کے لیے کہا گیا۔ ۱۹۰۷ء کے فساد کے باوجود ۱۹۰۸ء میں چہلم کے موقع پر دونوں جلوسوں کو علیحدہ رکھنے اور راستوں و تعزیوں کے علیحدہ ہونے کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا اور کوئی فساد نہ ہوا۔ اب ۱۹۰۹ء میں پھر ایک نیا راستہ سوجھا جس میں ہر طرح سے فساد ہی فساد نظر آتا ہے یعنی اب یہ حکم دیا گیا کہ کربلائیں بھی دو ہی رہیں اور تعزیوں کے جلوس بھی دو ہی رہیں لیکن شیعہ و سنی جلوس علیحدہ علیحدہ نہ رہیں بلکہ جو شیعہ چاہے وہ اپنا تعزیہ سنی جلوس کے ساتھ پھول کٹورہ کی کربلا میں لے جائے اور جو سنی چاہے اپنا تعزیہ تال کٹورہ کی کربلا میں شیعہ جلوس کے ساتھ لے جائے گویا دونوں جلوس باہمی فساد کے بعد علیحدہ بھی ہوں اور مخلوط بھی اور دونوں طرف تصادم اور فساد کا موقع برقرار رہے۔[2]"

اس تجزیہ سے پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں فرقوں کے سنجیدہ لوگ کمیشن اور حکومت کے طریق کار سے مطمئن اور خوش نہیں تھے اور وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ حکومت دونوں فرقوں میں کشیدگی برقرار رکھنا چاہتی ہے اور اس کے لیے ہر ممکن نامناسب طریقے استعمال کر رہی ہے۔

پگٹ کمیشن اور مدحِ صحابہ پر جزوی پابندی

کمیشن قائم کرنے میں حکومت کی نیت صاف نہیں تھی اور وہ شیعوں کو خوش کر کے سنیوں کی مذہبی آزادی کو غصب کرنا چاہتی تھی، چنانچہ نتیجہ وہی ہوا جس کا پہلے ہی سے اندازہ ہو رہا تھا یعنی یہ کہ عشرۂ محرم، چہلم اور ۲۱ رمضان کی تاریخوں میں مدحِ صحابہ پر جبراً پابندی لگا دی گئی، اس طرح

---

[1] گورنمنٹ یوپی ریزولیشن، جنرل ایڈمنسٹریشن نمبر ۳-۵۶۱/۱۴، ۱۹۰۹ء منقول از النجم لکھنؤ ۷ محرم ۱۳۲۷ھ

[2] تحریک مدحِ صحابہ، مظہر علی اظہر، ص ۳۲-۳۳

سرکاری ریزولیوشن کے ضمیمہ کی دفعہ ۹ میں حسب ذیل الفاظ میں اس ممانعت کا اعلان کر دیا گیا:

''کسی شخص کو اس راستہ پر جہاں سے کوئی تعزیہ یا مسلمانوں کا کوئی اور جلوس نکلتا ہو یا اس طرح سے کہ جلوس کے لوگ اس کو سن سکیں کوئی نظم یا اشعار یا اور اسی قسم کے الفاظ جو خلفاء (ثلاثہ) ابوبکر و عمر و عثمان کی علانیہ تعریف میں ہوں یا جن سے ان کی تعریف مراد ہو اسے لحن کے ساتھ یا معمولی طور پر بھی پڑھنا نہیں چاہیے اور ایسی نظموں، اشعار یا الفاظ کو کسی عام مقام پر مجمع کے اندر بھی گانا یا لحن کے ساتھ نہ پڑھنا چاہیے۔ جو شخص احکام مذکورہ بالا کی تعمیل نہیں کرے گا وہ فوراً گرفتار کر لیا جائے گا اور اس پر تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۲۹۸ کے تحت مقدمہ قائم کیا جائے گا۔''[۱]

اس طرح کمیشن اور حکومت یوپی نے محض تین ایام یعنی عشرۂ محرم، چہلم اور ۲۱ رمضان کے دن مدحِ صحابہ پر پابندی عائد کر دی اور باقی ایام کے لیے کوئی ممانعت نہ تھی۔

کمیشن کی بعض تصریحات

پگٹ کمیشن نے مدحِ صحابہ کے اشعار کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا ایک تو وہ اشعار جن میں محض چاروں خلفاء کی تعریف کی جائے اور دوسرے وہ اشعار جن میں چاروں خلفاء کی تعریف کے ساتھ ایسے الفاظ بھی درج ہوں جن میں پہلے تین خلفاء کے نہ ماننے والوں کے خلاف بھی کچھ باتیں کہی گئی ہوں، کمیشن نے ایسی مدح کو جن میں دوسروں کو برا بھلا کہا گیا ہو۔ ''تبرا'' کا مترادف قرار دیا تھا۔ حکومت یوپی نے اس بات کی تصریح ان الفاظ میں کی تھی:

''شیعہ ممبروں کی خواہش جو ان کی یادداشت پڑھنے سے پوری طرح ظاہر ہوتی ہے یہ ہے کہ گورنمنٹ سے اس کا اقرار کرا لیں کہ پہلے تین خلفاء کی تعریف کا برسر عام پڑھا جانا ہر وقت باعثِ اشتعال اور امن عامہ کے پیشِ نظر جرم ہے لیکن گورنمنٹ کے لیے ایسے امر کا اظہار کرنا ناممکن ہے۔ سنیوں کو اپنے مذہب کے خاص عقائد رکھنے کا اور دفعہ ۲۹۸ تعزیرات ہند کے احکامات کے مطابق مناسب وقت اور طریقے پر ان عقائد کے اظہار کرنے کا اسی قدر حق ہے جس قدر شیعوں کو ہے۔ شیعوں کو جس وجہ سے برسر عام تبرا کہنے سے روکا گیا ہے وہ یہی ہے کہ ان کے اس طرز عمل سے صرف یہی اظہار نہیں ہوتا کہ حضرت علی رسول کریم کے فوراً بعد خلیفہ ہوئے بلکہ اس کے ساتھ ہی پہلے تین خلفاء پر سب و شتم بھی کیا جاتا ہے جسے پبلک مقامات پر محض ان لوگوں (اہل سنت) کے جذبات کو صدمہ پہنچانے کے لیے کیا جاتا ہے جو ان تین خلفاء کو مانتے ہیں۔ مدحِ

---

[۱] النجم لکھنؤ، ۷ر محرم ۱۳۲۷ھ بحوالہ گورنمنٹ ریزولیوشن

صحابہ سے ملتی ہوئی تمثیل شیعوں کے اس اصول میں ملتی ہے جس کی رو سے وہ حضرت علی کو خلیفہ بلا فصل کہتے ہیں اور اس طرح پر اس بات کا اعلان کرتے کہ نبی کے بعد وہی خلیفہ ہوئے۔ شیعہ اس بات کے سخت مخالف ہیں کہ انھیں خلیفہ بلا فصل کے الفاظ کو علانیہ کہنے سے روکا جائے[1]۔"

شیعانِ لکھنؤ نے ایک کوشش یہ بھی کی تھی کہ ۲۸ر ذی الحجہ سے لے کر ۸ر ربیع الاول تک چونکہ وہ مراسم عزاداری ادا کرتے ہیں اس لیے ان ایام میں مدحِ صحابہ پر بندش عائد کر دی جائے لیکن حکومت یو پی نے اس مطالبہ کو نہیں مانا اور اپنے ریزولیشن میں اس کے متعلق ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا:

"اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ آیا کمیٹی کے شیعہ ممبروں کی یہ خواہش مبنی بر انصاف ہے کہ اس ممانعت کی توسیع پورے دو مہینے دس دن تک کر دی جائے؟ لیفٹیننٹ گورنر اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ شیعہ قوم نے جو میموریل ان کی خدمت میں پیش کیا تھا اس میں یہ شکایت تھی کہ چہلم سے قبل اور چہلم کے دن سنی اپنے جلوسوں کے ساتھ جھنڈے نکالتے ہیں اور ان کے ساتھ چار یاری اشعار پڑھتے ہیں۔ کمیٹی کے سامنے دورانِ تحقیق جو لوگ شیعوں کے مطالبات پیش کر رہے تھے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی پوری توجہ ہر قسم کے چار یاری اشعار پڑھے جانے کو ممنوع قرار دیے جانے پر مرکوز کر رکھی تھی، انھوں نے اس شکایت کو ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ علاوہ عشرہ اور چہلم کے دیگر ایام میں بھی چار یاری جلوس نکالے جاتے ہیں، لیفٹیننٹ گورنر کے خیال میں کمیٹی نے اس خاص شکایت کے متعلق کوئی قاعدہ اس وجہ سے نہیں تجویز کیا کہ یہ شکایت ان کے سامنے پیش ہی نہیں کی گئی لیکن اگر پہلے سے کوئی ایسی کارروائی کی گئی ہو یا آئندہ کی جائے تو ظاہر بات ہے کہ یہ ایک قابلِ اعتراض امر ہے اور اس کے متعلق حکام کو کارروائی کرنی چاہیے۔ جو قواعد لکھنؤ میں نافذ ہیں ان کی رو سے شارع عام کے اوپر ڈپٹی کمشنر کی اجازت سے جلوس نکالے جا سکتے ہیں اور ان کا انتظام بھی ڈپٹی کمشنر ہی کرتے ہیں۔ گورنمنٹ اس بات کے لیے تیار نہیں کہ کوئی ایسا عام اعلان کرے جس کی رو سے اس بات کی عام ممانعت کر دی جائے کہ کوئی شخص کسی پبلک مقام پر اور کسی حالت میں بھی بلند آواز سے ایسے اشعار نہ پڑھے جو خلفائے ثلاثہ کی تعریف میں ہوں، دفعہ ۲۹۸ تعزیراتِ ہند شہر لکھنؤ سے منسوخ نہیں ہو گئی ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے کی سماعت میں ایسے الفاظ لائے جن سے وہ قصداً اس کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچانا چاہتا ہو تو ایسا شخص مستوجب سزا ہوگا جب تک کہ وہ یہ ثابت نہ کر دے کہ وہ

---

[1] النجم لکھنؤ، ۷ر محرم ۱۳۲۷ھ بحوالہ گورنمنٹ ریزولیشن۔

تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی رو سے اس سزا سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے[1]۔“

حاصل کلام

ان تمام حقائق سے اور پگٹ کمیشن و نیز حکومت یو پی کے ریزولیوشن کی مختلف دفعات سے جو نتیجہ نکلا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف ان تین ایام (یعنی دسویں محرم، چہلم اور ۲۱ رمضان) کے علاوہ باقی کسی دن بھی مدحِ صحابہؓ پڑھنے کی ممانعت کبھی نہیں ہوئی بشرطیکہ اس میں کسی پر سب وشتم نہ ہو۔ ان تین دنوں میں بھی ممانعت صرف اس قدر رہوئی کہ کوئی شخص تعزیہ کے جلوس کے راستہ پر یا جلوس کی سماعت میں مدحِ صحابہؓ نہ پڑھے، گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر شخص کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی بھی پبلک مقام پر جو جلوس کی گذرگاہ نہ ہو ان تین ایام میں بھی مدحِ صحابہ پڑھ سکتا ہے اور نجی مقامات میں تو مدحِ صحابہ کے جلسے ہر موقع پر ہو سکتے ہیں لہٰذا اس کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ چار یاری جھنڈے کے جلوس اور اشعار جن میں دوسرے فریق پر سب وشتم کیا جاتا تھا اس کے متعلق حکومت نے کوئی عام ممانعت نہیں کی۔ البتہ مقامی حکام کی توجہ دفعہ ۲۹۸ تعزیراتِ ہند کی طرف دلائی اور یہ کہا کہ جو جلوس دوسروں کی دل آزاری کے لیے نکالے جائیں ان کے خلاف مناسب کارروائی کی جا سکتی ہے۔

کمیشن کی جانبدارانہ پالیسی

شیعہ معززین کی انتھک کوششوں کی بدولت حکومت کی جانب سے یہ تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا تھا اس کمیشن کی بنیاد جن حالات کے ماتحت استوار کی گئی تھی اور جن خوبصورت امیدوں کا منصوبہ باندھا گیا تھا وہ حرف بہ حرف پورا ہوا۔ یہ کہنے میں ہمیں بالکل تائل نہیں کہ اس کمیشن میں شیعوں کی دوڑ دھوپ اور بے جا خوشامد بہت کچھ اثر انداز ہوئی اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس معاملہ خصوصی میں حکومت کی نیت بھی صاف نہ تھی اور اس کا رویّہ بھی جانبدارانہ تھا، وہ ہر طرح سے شیعوں کی منہ بھرائی چاہتی تھی جبکہ سنیوں کے حقوق قانونی اور اخلاقی طور پر بالکل جائز تھے اور انھیں نظر انداز کرنا سراسر ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ہمارے اس دعوے کے شواہد حسب ذیل ہیں:

۱۔ جس ریزولیوشن کے تحت یہ کمیشن قائم ہوا تھا اس میں کمیشن کو یہ تحقیقات کرنے کی ہدایت کی

---

[1] النجم لکھنؤ، ۷ محرم ۱۳۲۷ھ بحوالہ گورنمنٹ ریزولیوشن

گئی تھی کہ ''محرم کے مراسم میں کون کون سی باتیں دل آزار ہیں، چاہے وہ قدیم ہی کیوں نہ ہوں۔'' ہدایتِ مذکورہ کی اس تصریح سے کہ ''چاہے وہ قدیم ہی کیوں نہ ہوں'' یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو یہ معلوم تھا کہ سنی محرم کی رسوم میں مدحِ خلفاء بھی قدیمی طور پر کرتے ہیں لیکن اب اس کو موقوف کرانا ہے۔ اس قدیم رسم کو موقوف کرانے کی نیت سے کسی کمیشن کا قائم ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت کو سنیّوں کی حق تلفی اور شیعوں کی بیجا طرفداری ہی منظور تھی۔

۲۔ اسی پالیسی کے تحت کمیشن نے سنیّوں کو اپنے معاملہ میں کوئی مفید بات ثابت کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

۳۔ کمیشن میں سنیّوں کی طرف سے شیعوں کا ایک مطبوعہ اشتہار بھی پیش کیا گیا تھا جس میں کسی مجلس کے انعقاد کا اعلان تھا اور اس کو سارے شہر میں چسپاں بھی کرایا گیا تھا اس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا تھا کہ ''مجلس میں فلاں فلاں اور فلاں کے نکات بیان کیے جائیں گے۔'' اس اشتہار کو کمیشن میں پیش کر کے سنیّوں کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا لکھنویؒ نے فرمایا تھا کہ یہ تینوں لفظ 'فلاں' سے حضراتِ خلفاء ثلاثہؓ کے سوا اور کوئی دوسرا مراد نہیں ہوسکتا ہے۔ اس پر شیعہ نمائندوں نے بالکل سکوت اختیار کیا۔ مجسٹریٹ نے بھی اس حرکت کو 'شرارت آمیز' قرار دیا تھا، اس واقعہ کا ریکارڈ ہونا سنیّوں کے لیے مفید اور شیعوں کے لیے مضر تھا اس لیے کمیشن کی رپورٹ میں اس کا کہیں کوئی ذکر نہ تھا۔

۴۔ کمیشن میں جو ممبران نامزد کیے گئے تھے ان کا رجحان خاص طور پر شیعوں کی طرف زیادہ تھا چنانچہ شری گنگا پرشاد ورما ایڈیٹر اخبار 'ہندوستانی' مسٹر اولیور اور رائے بہادر سری رام وکیل وغیرہ ایسے ہی ممبر تھے جو شیعوں کے طرفدار تھے۔ شری گنگا پرشاد ورما کی طرفداری ان کے اخبار 'ہندوستانی' سے اچھی طرح ظاہر تھی، مسٹر اولیور نواب محسن الدولہ (شیعہ) کے متبنّیٰ اور شیعوں کی گود کے پلے ہوئے تھے، تمام رؤسا شیعہ سے ان کے گہرے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تھے۔ رائے بہادر سری رام وکیل نے تو سنیّوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کمیشن میں اگر سنیّوں کے دو ممبر ہوتے تو میں ہرگز چیئرمین کی رائے سے اتفاق نہ کرتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی تنہا اپنی کوئی رائے نہ تھی جدھر کا پلّہ بھاری دیکھا اُدھر جھک گئے۔

۵۔ ریزولیوشن مذکور کے اکثر فقرات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدحِ خلفاء کی ممانعت اس لیے

رکھی گئی تھی کہ یہ سنّیوں کی 'بیجا زیادتی' ہے اور اس میں شیعوں کا کوئی قصور نہیں ہے حالانکہ ایسا کہنا زبردستی سے دن کو رات کہنا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہرگز یہ سنّیوں کی زیادتی نہ تھی بلکہ ساری زیادتی فریق ثانی کی طرف سے تھی مثلاً:

(الف) شیعوں کا اپنی اذانوں میں حضرت 'علی کرم اللہ وجہہ' کو خلیفہ بلا فصل' کہنا سوائے سنّیوں کی دل آزاری کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ اذان میں اس قسم کے الفاظ کا اضافہ خود شیعہ فقہ کے بھی خلاف ہے۔

(ب) شیعہ کبھی یزید کی موت پر عید نہیں مناتے، ابن زیاد کے مرنے پر عید نہیں مناتے، ابن سعد اور شمر کی موت پر عید نہیں مناتے اور حضرت علی مرتضیٰؓ کے شہید کرنے والے ابن ملجم لعین کے فناقی السقر ہونے پر عید نہیں مناتے لیکن جانشین پیغمبر حضرت فاروق اعظمؓ کے شہید ہونے پر اس قدر دھوم دھام سے عید مناتے ہیں کہ عید رمضان بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، خاص طور سے سنّیوں کو دِکھا دِکھا کر چار چار بار عید ملتے ہیں۔ اس عید کا اشتہار سارے شہر کی دیواروں پر چسپاں کیا جاتا ہے جس کی پیشانی پر جلی قلم سے 'عید بابا شجاع' کی سرخی لگی ہوتی ہے، یہ حرکت ایسی انسانیت سوز حرکت ہے کہ ایران میں شیعوں کی بادشاہت کے دوران بھی کبھی اس کی اجازت نہ تھی۔[۱]

(ج) کسی ذی رُوح کی شکل بنانا جس طرح اہل سنّت کے یہاں بالاتفاق حرام ہے اسی طرح شیعوں کے مذہب میں بھی حرام ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک فرضی انسانی شکل بناتے ہیں اور اس کی پیشانی پر جانشین پیغمبر حضرت عمر فاروقؓ کا نام لکھتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ گستاخیاں کرتے ہیں اور یہ کام اس طور سے کرتے ہیں کہ سنّیوں کو اس کا علم اچھی طرح ہوجائے اور انھیں دُکھ پہنچے۔

سنّیوں کے حقوق اتنے جائز اور حق بجانب تھے کہ کوئی بھی صحیح العقل اور انصاف پسند انسان ان سے انکار نہیں کرسکتا، خود فریق مخالف بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا مگر تعصب اور ہٹ دھرمی اور اپنی بالادستی کو قائم رکھنے کی ہوس اس راہ میں حائل تھی کہ کوئی باعزت سمجھوتہ ہوسکے۔ فریق مخالف کی بے چارگی اور اس کے کمزور دلائل کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ محرم ۱۹۰۷ء کے بعد جب شیعوں نے مدحِ خلفاء پر اعتراضات کرنے شروع کیے تو واقعات

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب المآثر، مصنفہ وزیر انطباعات ایران۔

کی تحقیقات کے لیے لیفٹیننٹ گورنر سر جان ہیوٹ الٰہ آباد سے لکھنؤ آئے اس موقع پر شیعوں کی طرف سے ڈپٹی کمشنر مسٹر جاپلنگ کو یہ عرضداشت بھیجی گئی کہ مدحِ خلفاء جدید چیز ہے اور ہمارے لیے دل آزار ہے اس لیے اس کو روکا جائے، اس پر گورنر نے جواب دیا کہ مجموعہ تعزیراتِ ہند موجود ہے اور عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے وہاں اس کے خلاف چارہ جوئی کرو۔ اس کہنے کے باوجود شیعوں کو عدالت میں جانے کی جرأت نہیں ہوسکی۔ ظاہر ہے کہ مدح خلفاء سنّیوں کا ایک ایسا قانونی حق ہے جس کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ شیعوں نے لیفٹیننٹ گورنر کو یہ میمورنڈم بھی دیا تھا کہ مدحِ صحابہ کی ممانعت فوری طور سے ہونا چاہیے اور اس کو قانونِ عدالت کے جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہیے، یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ مدح خلفاء سنّیوں کا ایک ایسا قانونی حق تھا جس کو عدالت کے ذریعہ چھیننا ممکن نہ تھا۔

۳۔ کمیشن میں گواہوں کے بیانات اور وکلاء کی بحث سننے کے بعد چیئر مین نے شیعہ وکیل سے پوچھا کہ تعزیراتِ ہند کی کس دفعہ کے تحت خلفاء کی تعریف ممنوع قرار دی جاسکتی ہے؟ شیعہ وکیل نے عاجز ہوکر کہا کہ ہماری شکایات دفع کرنے کے لیے کوئی نیا قانون بنانا چاہیے، اس پر سنّیوں کے وکیل نے کہا کہ اگر ایسا ہے تو پھر ہماری شکایات پر بھی نیا قانون کیوں نہ بنایا جائے۔ اس کا جواب دوسری طرف سے کچھ نہیں دیا جاسکا۔

۴۔ کمیشن کے عیسائی اور ہندو ممبران نے اگرچہ صرف تین دن کے واسطے مدحِ خلفاء کی ممانعت کی رائے دی تھی مگر یہ بھی ظاہر کردیا تھا کہ معزز اور بااثر سنّیوں سے ہم کو توقع ہے کہ وہ اپنے فرقے کو اس قانونی حق کو برتنے سے باز رکھیں گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سنّیوں کے قانونی حقوق تلف کرنے ہی کی نیت سے یہ کمیشن قائم ہوا تھا۔

۵۔ دورانِ کمیشن ایک روز شیعہ ممبر مولوی ناصر حسین مجتہد نے کہا کہ یادگار خلفاء سے شیعوں کی دل آزاری ہوتی ہے لہٰذا جو امور یادگار خلفاء ہوں وہ موقوف کردیئے جائیں۔ یہ سن کر مولانا لکھنویؒ اسی وقت کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ سنّیوں کا وجود ہی سب سے بڑھ کر یادگار خلفاء ہے اس لیے لکھنؤ سے سنّیوں کا وجود بالکل نابود کردیا جائے، بغیر اس کے شیعوں کی دل آزاری کا علاج ممکن نہیں۔ اس پر چیئر مین نے کہا کہ نہیں نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، جانشینانِ پیغمبرؐ کی تعریف کبھی موقوف نہیں ہوسکتی۔

۶۔ مولوی ناصر حسین مجتہد کے جواب میں مولاناؒ نے اپنے دلائل بیان کرتے ہوئے کہا کہ

بوستاں، گلستاں اور سکندر نامہ وغیرہ جیسی کتابوں میں بھی تعریف خلفاء درج ہے ان کو شیعہ پڑھتے اور اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں پھر جن لوگوں کی تعریف قرآن پاک میں آئی ہے کیا ان لوگوں کی تعریف سے شیعوں کی دل آزاری ہوتی ہے؟ اس پر چیئرمین نے شیعوں سے پوچھا کہ جب تعریفِ خلفاء سے تمھاری دل آزاری ہوتی ہے تو تم کیوں ان کتابوں کو پڑھتے اور پڑھاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب فریقِ مخالف سے نہ بن پڑا۔

کمیشن کی رپورٹ پر سنّیوں کا ردِّ عمل

کمیشن کی کارروائی ختم ہونے کے بعد ہی سے مسلم عوام میں شک وشبہ اور بے اعتمادی کی فضا پیدا ہوگئی تھی اور یہ یقین ہو گیا تھا کہ کمیشن کا فیصلہ عامۃ المسلمین کے جذبات کے مطابق نہیں ہوگا کیونکہ اس میں جانبداری سے کام لیا گیا ہے۔ اسی خیال کے ماتحت کچھ روز پہلے لکھنؤ کی عیدگاہ عیش باغ میں دس ہزار کے قریب مسلمانوں کا احتجاجی جلسہ ہو چکا تھا جس میں ایک متفقہ میمورنڈم حکومت کو پیش کیا گیا تھا۔ کمیشن کی رپورٹ اور گورنمنٹ ریزولیوشن کے شائع ہو جانے کے بعد ان تمام خدشات کی بالکلیہ تصدیق ہوگئی اور پورے لکھنؤ میں خاص طور پر اور تمام اَودھ میں عموماً غم وغصّہ اور مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور یہ یقین ہو گیا کہ ہماری مذہبی آزادی میں دست اندازی کی گئی ہے۔ فضا میں اس قسم کی کشیدگی اور مایوسی پیدا کرنے میں ان افواہوں کا بھی بڑا دخل تھا جنھیں دوسرے فریق نے بڑی ہوشیاری اور مہارت سے پھیلایا تھا اور یہ مشہور کر دیا تھا کہ ہم نے مدحِ صحابہ پر تقریریں اور خلفاء راشدین کی تعریف میں پڑھی جانے والی تمام چاریاری نظمیں ممنوع قرار دلا دی ہیں اور اب کوئی ان کا نام بھی نہیں لے سکتا وغیرہ وغیرہ۔ شیعی حلقوں میں اس فیصلہ کو اپنی بڑی کامیابی تصور کیا جانے لگا اور ہر طرف خوشی اور مسرت کا اظہار نت نئے طریقوں اور عجیب وغریب انداز سے ہونے لگا جس سے مسلمانوں میں اشتعال اور مایوسی کا پھیلنا ناگزیر تھا۔

اسی زمانہ میں النجم میں ایک اداریہ شائع ہوا تھا جس میں لکھا تھا:

''یوں تو ہر سال محرم میں شیعوں کی عید قابل دید ہوتی ہے مگر اس سال سب سے مزید ہے۔ ہر وقت اور ہر لحظہ اظہار مسرت کے لیے شیعہ صاحبان کی طرف سے نت نئے طریقے جو سمجھ میں آتے ہیں وہ کیے جا رہے ہیں۔ دو تین روز ہوئے ایک دستی اشتہار تقسیم کیا گیا ہے، مضمون اس اشتہار کا عجیب حیرت انگیز ہے، لکھا گیا ہے کہ امام حسین ایام محرم میں کربلا سے لکھنؤ چلے آتے ہیں

معلوم نہیں کہ اسی سال کی تخصیص ہے یا ہر سال ایسا ہی ہوتا ہے، اگر ہر سال ایسا ہوتا ہے تو یہ اشتہار صرف اب کی مرتبہ کیوں دیا گیا۔ اس اشتہار میں ترقی عزاداری پر بھی اہل لکھنؤ کو مبارکباد دی گئی ہے......ان تمام مسرتوں کا منشاء یہ ہے کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر کا حکم ان کے موافق ہے۔[1]''

اس قسم کی طفلانہ مسرتوں میں اُس دور کے تمام شیعی اخبار اور رسائل نے بھرپور حصہ لیا تھا اور نہ صرف یہ کہ انھوں نے کمیشن کے فیصلہ کی ہمنوائی کی بلکہ سنیّوں کے دل دکھانے کے لیے ہر ممکن طریقے استعمال کیے اور علمائے اہلِ سنّت پر کیچڑ اچھالی تھی۔ حضرت مولانا لکھنویؒ کو خاص طور پر ہدف بنایا گیا اور جی بھر کر گستاخیاں کی گئیں مگر اللہ رے وہ کوہِ باوقار! ہر تلخ سے تلخ ـــــ بات کو بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے اور کبھی جبیں پر بل تک نہ آیا۔ انہی شیعی رسائل میں دہلی سے شائع ہونے والا ایک رسالہ ''اثنا عشری'' بھی تھا جس نے اپنی ایک اشاعت میں 'چار یاری جھنڈا' کے عنوان پر کئی کالم سیاہ کیے تھے جن میں خاص طور سے مولانا لکھنویؒ کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس مضمون کو خود انھوں نے النجم میں نقل کیا تھا اس کی چند سطریں قابلِ دید ہیں جس سے خبث باطن اور نفرت وعناد کا اندازہ ہوتا ہے۔ کمیشن کے اس فیصلہ پر کہ سال میں تین دن مدحِ صحابہ ممنوع کر دی گئی ہے وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''۹ر دسمبر کو یہ حکم صادر فرما دیا گیا کہ چار یاری جھنڈا جو ایک بدعت اور عجیب بدعت ہے قطعاً بند کر دیا جائے۔ کلیجوں پر سانپ ہی تو لوٹ گئے، ماں ہی تو مر گئی، چھریاں چل گئیں چھریاں، کوئی عبدالشکور ایڈیٹر النجم کے دل سے پوچھے کہ کیا گذری اور کیسی گذری، آپ نے کمیشن کے قیام پر بہت کچھ بانگ بے ہنگام بلند کی تھی۔ منشی احتشام علی اور مولوی عبدالمجید کی تقریر پر (جو سنیّوں کی طرف سے پہلے کمیشن کے ممبر منتخب ہوئے تھے) بہت کچھ چیں بہ جبیں ہوئے تھے سنیّوں کی مظلومیت پر (اے تیری شان! سنی اور مظلوم؟ کس قدر بے جوڑ نسبت ہے) بہت کچھ توجہ دلائی تھی۔ مولوی صاحب موصوف (مولوی عبدالمجید صاحب) تھے جہاں دیدہ وہ بھانپ گئے کہ کمیشن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھائیگی، سچ کا بول بالا ضرور ہوگا، کاغذ کی ناؤ کبھی نہیں بہتی، جھٹ الگ ہوئے اور فاضل لاثانی (جو فضول سے مشتق ہے) یعنی عبدالشکور صاحب کو آگے دھر دیا کہ آیئے آپ کرسی وکالت پر جلوہ فرمایئے۔ عبدالشکور صاحب اس عہدہ سے خوش تو بہت ہوئے ہوں گے اور یہ خیال بھی کر لیا ہوگا کہ ہوگا تو وہی جو ہونے والا ہے مگر ایک لیڈر کی حیثیت سے روشناس حکام ہونے کا تو موقع ملا۔ آہ افسوس ہمارے نادان دوست نے یہ نہ سمجھا

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۸ر ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ

کہ کسی مسجد کے حجرے میں بیٹھ کر فاتے پر فاتے اٹھا کر حاصل کیے ہوئے تفقہ حنفی کی بدولت چند جہال اور ارذل کو اپنا مرید، معتقد اور مقتدی بنالینا اور چیز ہے اور اہل نظر کی مجلس میں بیٹھ کر معاملات کے ہر پہلو پر نظر کرنا اور چیز ہے، کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں نشست کر کے چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش شاید کچھ پھل دے سکے لیکن منظرِ عام میں آکر اس فعل کا ارتکاب تو ایک صریحاً دیوانہ سری اور حد سے گذرا ہوا جنون ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جھنڈ برداروں کے لیے آپ کی وکالت نہایت نامبارک اور منحوس ثابت ہوئی۔"[1]

اخبار اثنا عشری دہلی کی اس تحریر کو نقل کرنے کے بعد خود حضرت مدیر النجمؒ نے اس پر جو نوٹ لکھا تھا وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"اس ناچیز کی نسبت جو گوہر افشانی آپ نے فرمائی ہے اس کا جواب صرف اس قدر دینا چاہتا ہوں کہ صفت حیا و غیرت آپ میں بہ نسبت آپ کے اخوان کے شاید کچھ زیادہ ہے۔ کمیشن میں جانے سے آپ کے قبلہ و کعبہ مولوی ناصر حسین صاحب کو جس قدر گریز تھا اس کو سب لوگ جانتے ہیں، اس گریز کی کوئی وجہ سوا اس کے اور کچھ نہ تھی کہ ان کو اس ناچیز کا خوف غالب تھا مگر بدقسمتی سے جس امر کا انھیں خوف تھا وہی پیش آیا۔

اوّل تو علمی مباحث کا کمیشن میں موقع ہی نہیں ملا، غالباً بلکہ یقیناً آپ لوگوں نے اس کے لیے کوشش بھی کی ہوگی لیکن میری شرکت کا جو نتیجہ ہونا چاہیے وہ بحمد اللہ حاصل ہو گیا۔ ایک جملہ مولوی ناصر حسین کی زبان مبارک سے یہ نکلا کہ "خلفاء ثلاثہ ہمارے ائمہ کے قاتل ہیں" بجواب اس کے میں نے جب کہا کہ اس بات کا آپ نہ کسی تاریخ سے ثبوت دے سکتے ہیں اور نہ حدیث سے اور قرآن کے سامنے تو تمام دنیا کے شیعہ بالکل لاجواب ہیں تو مولوی صاحب موصوف کچھ اس کا جواب نہ دے سکے۔ کیا کسی شیعہ مجتہد میں یہ دم ہے کہ کسی سنی عالم کے سامنے ایسا کلمہ منہ سے نکال سکے کہ قرآن کے سامنے سنی لاجواب ہیں؟ استغفر اللہ! اگر ایسا کلمہ کسی سنی عالم سے کہا جاتا تو حقیقتِ حال معلوم ہو جاتی۔

اس کے بعد ایک موقع پر میں نے احادیث شیعہ سے مناقب حضرت ابو بکر صدیق کا ثبوت دیا اور یہ بھی بیان کیا کہ قرآن پاک میں حضرات خلفاء ثلاثہ کے مناقب اس وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں کہ جو شخص عربی جانتا ہو وہ ان آیتوں کو دیکھ کر یقین کرلے گا کہ ان میں انہی حضرات کے مناقب بیان ہو رہے ہیں، اس کے جواب میں مولوی صاحب موصوف سے کچھ نہ

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۱ محرم ۱۳۲۷ھ بحوالہ اخبار "اثنا عشری" دہلی

بن پڑا۔ کیا کسی شیعی عالم میں یہ ہمت ہے کہ کسی سنی عالم کے سامنے ایسا کلمہ منہ سے نکالتا اور اپنے کسی مخصوص عقیدے کی نسبت یہ کہتا کہ یہ قرآن سے ثابت ہے؟ اگر ایسا کلمہ کہا جاتا تو اسی وقت سبائیہ مذہب کا بنا بنایا گھروندا بگاڑ دیا جاتا؟"[1]

۱۹۰۹ء کے چہلم میں مدحِ صحابہ اور سنیّوں کی گرفتاری

کمیشن کے فیصلہ اور سال کے تین دِنوں میں مدحِ صحابہ پر بندش کی وجہ سے لکھنؤ میں روز بروز کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی اور حالات برابر خراب ہوتے جا رہے تھے، اسی حالت میں ۱۹۰۹ء کا چہلم آ گیا جس کے انتظام کے لیے حسبِ معمول حکام کی طرف سے دن کا پہلا وقت سنیّوں کو اور دوسرا وقت شیعوں کو جلوس تعزیہ نکالنے کے لیے دیا گیا تھا۔ علی الصباح سنیّوں کا کچھ مجمع عید گاہ میں جمع ہونا شروع ہوا اور وہاں سے وہ ایک تعزیہ لے کر شہر کی طرف روانہ ہوا، چوک تک پہنچتے پہنچتے یہ مجمع کئی ہزار تک پہنچ گیا، حسبِ دستور قدیم اس تعزیہ کے ساتھ مدحِ صحابہ بھی ہوتی جا رہی تھی، ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت مجمع دس ہزار سے کم نہ تھا۔ کوتوالی چوک میں ڈپٹی کمشنر اور ایس۔ پی وغیرہ موجود تھے، جب ان کو خبر ملی تو وہ مجمع کی طرف گئے اور جا کر منع کیا کہ آپ لوگ سرکاری حکم کے خلاف مدحِ صحابہ نہ پڑھیں مگر سب لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ "ہم اپنے بزرگانِ دین اور خلفائے راشدینؓ کی مدح کر رہے ہیں اس لیے اس میں آپ لوگوں کو دست اندازی کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہم اس سے باز آ سکتے ہیں" حکّام نے اس جواب کے بعد کوئی مزاحمت نہیں کی اور مجمع پورے اطمینان کے ساتھ مدحِ صحابہؓ پڑھتا ہوا کوتوالی چوک کے قریب پہنچ گیا جہاں ایک مسلح پولیس کے دستہ نے اس کا محاصرہ کر لیا لیکن اس سے مسلمانوں میں کوئی خوف و ہراس نہیں پیدا ہوا اور وہ اسی طرح پورے اطمینان کے ساتھ مدحِ صحابہ پڑھتے رہے۔ پولیس نے جن لوگوں کو محاصرہ میں لے کر گرفتار کیا تھا ان کی تعداد ۸۴۸ تھی ان سب سے ضمانتیں طلب کی گئیں لیکن اس سے انکار کرنے پر انھیں حوالات بھیج دیا گیا اس طرح اس واقعہ سے سارے شہر میں اور بھی جوش و خروش پیدا ہو گیا۔

عدالت میں پیشیاں

۱۶؍ مارچ ۱۹۰۹ء کو سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ کے اجلاس میں ان گرفتار شدہ سنیّوں کے مقدمہ کی

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۱؍ محرم ۱۳۲۷ھ

سماعت شروع ہوئی جس کی شہرت اس قدر تھی کہ تقریباً پانچ ہزار افراد محض اس کی کاروائی دیکھنے کے لیے آ گئے تھے، سنیّوں کی جانب سے جناب شاہد حسین جناب مشیر حسین، ایف۔ سی بہادر جی اور بابو راج نرائین وکیل پیروکار تھے۔ فرداً فرداً تمام اسیروں نے اقراری بیان دیا کہ ''یقیناً ہم مدحِ صحابہ پڑھ رہے تھے اور ہمیشہ پڑھتے رہیں گے کیونکہ یہ ہمارا مذہبی حق ہے۔'' یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس مقدمہ کی ساری کاروائی میں سنیّوں کی طرف سے دوسرے وکلاء کے علاوہ شیخ شوکت علی مرحوم[1] بھی شروع سے اخیر تک پیش پیش رہے۔ تیسری پیشی میں سنیّوں کی طرف سے گواہوں سے جرح ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ''ہم خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے مدحِ صحابہ پڑھی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم ہمیشہ پڑھتے رہیں گے ہم کو صفائی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہاں اس بات کی صفائی دے سکتے ہیں کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ہم نے اپنا ایک مذہبی فریضہ ادا کیا ہے، اس صفائی کے لیے ہم مولانا عبدالحمید فرنگی محلیؒ اور مولانا عبدالشکور صاحبؒ مدیر النجم کو طلب کرنا چاہتے ہیں۔'' چنانچہ ان حضرات کے نام عدالت سے سمن جاری ہو گئے۔

۲۴ / مارچ ۱۹۰۹ء کو مذکورہ بالا دونوں حضرات شہادت کے لیے تشریف لے گئے، پہلے مولانا عبدالحمید فرنگی محلیؒ کی شہادت ہوئی انھوں نے بیان دیا کہ مدحِ صحابہؓ ہماری مذہبی عبادت ہے اور ذکرِ شہادت حسینؓ بغیر ذکرِ خلفائے راشدین ہمارے یہاں ممنوع ہے، بہت دیر تک ان سے جرح کے سوالات ہوتے رہے مگر شہادت بہت عمدہ رہی، لہٰذا مجسٹریٹ نے اعلان کیا کہ اب مزید شہادت کی ضرورت نہیں ہے۔ ۲۹ / مارچ کو فیصلہ سنانے کی تاریخ مقرر کر کے عدالت برخاست ہو گئی۔ ۲۹ / مارچ ۱۹۰۹ء کی پیشی پر تین تین ماہ کی قید کا حکم سنا دیا گیا۔ کچھ اور جتھوں کو

---

[1] شیخ شوکت علی صاحبؒ لکھنو کے سینئر اور مشہور وکیل تھے، محلہ رکاب گنج لکھنؤ میں اُن کی رہائش تھی۔ ان کی دینی و ملّی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں، انھوں نے سنیّوں کے تمام مقدمات میں ہمیشہ بلا معاوضہ پیروی کی، آج بھی آپ کے نام سے وہ مشہور احاطہ محلہ رکاب گنج میں موجود ہے جس میں تحریک مدحِ صحابہ اور مسلمانانِ لکھنؤ کے دیگر اہم اور تاریخی اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ ہر سال محرم میں پندرہ روز ''شہدائے اسلام'' کے جلسے اب تک وہیں منعقد ہوا کرتے ہیں۔ نہ جانے کتنی مشہور اور ذی علم شخصیتیں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آ کر یہاں مسلمانوں کو خطاب کر چکی ہیں، اب اس احاطہ کو دارالمبلغین کی جدید عمارت بنوانے کے لیے خرید لیا گیا ہے، ۱۹۸۲ء میں اس پر عمارت کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا تھا چنانچہ اب یہ عمارت بن کر تیار ہو گئی ہے، احاطہ کی جو زمین جلسہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی اس پر ایک مسقّف ہال بنا دیا گیا ہے جس کو 'مولانا عبدالشکور ہال' کہا جاتا ہے۔ اب تمام جلسے اسی ہال میں ہوتے ہیں۔ شیخ شوکت علی صاحب ۱۹۳۴ء میں انتقال فرما گئے اور اسی احاطہ کے ایک حصہ میں دفن کیے گئے۔

بھی اسی قسم کی سزائیں دی گئیں اور کچھ کو جرمانہ کر کے چھوڑ دیا گیا اور بچوں و بوڑھوں کو محض وارننگ دے کر رہا کر دیا گیا۔ ایک علیحدہ پیشی پر تقریباً دو سو آدمیوں کا ایک جتھہ عدالت میں پیش ہوا جس میں عبدالمغنی نامی ایک صاحب نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا:

''میں اس مجمع میں مدحِ صحابہ پڑھنے کے لیے قصداً شریک ہوا تھا اور مجھے لیفٹیننٹ گورنر کے حکم امتناع کی اطلاع بھی تھی مگر چونکہ صحابہ کرام کی تعریف کرنا ہمارے مذہب میں اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اس لیے میں نے اس ممانعت کا خیال نہیں کیا، ہمارے مذہب میں ضروری ہے کہ ذکر شہادت حسینؓ بغیر ذکر خلفاء راشدینؓ نہ کیا جائے۔''

سٹی مجسٹریٹ نے ان سے کہا۔ بہت سے مسلمان کہتے ہیں کہ مدحِ صحابہ کوئی مذہبی کام نہیں ہے۔

عبدالمغنی صاحب نے جواب دیا۔ وہ لوگ جاہل ہیں۔

پھر مجسٹریٹ نے پوچھا۔ اگر یہ مذہبی عبادت ہے تو لکھنؤ کے علاوہ اور دوسرے مقامات پر مدحِ صحابہ کیوں نہیں ہوتی؟

اس کا جواب عبدالمغنی صاحب نے دیا۔ بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھتے، اس سے یہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ نماز مذہبی عبادت نہیں ہے۔[۱]

ڈپٹی کمشنر کا اعلانِ خصوصی

مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے ہیجان اور غم و غصہ کو دیکھتے ہوئے حکومت کو بھی تنبہ ہوا اور اسے اندازہ ہوا کہ اب تک جو بھی اقدامات ہوئے ہیں وہ غیر دانشمندانہ اور یک طرفہ پالیسیوں پر مبنی ہیں اور ان طریقوں سے صورت حال بجائے سدھرنے کے اور بھی ابتر ہوتی جا رہی ہے چنانچہ وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر ۲۹ مارچ ۱۹۰۹ء کو مسٹر ریڈیچی ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کی طرف سے ایک اعلانیہ شائع ہوا جس کا مضمون یہ تھا:

''گورنمنٹ عالیہ کی طرف سے لکھنؤ میں جو احکام عشرۂ محرم، چہلم اور ۲۱ رمضان کے لیے جاری ہوئے ہیں ان سے اکثر عوام نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ مدحِ صحابہ پڑھنے کی بالکل ممانعت ہو گئی ہے، حالانکہ ان احکام کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے لہٰذا اب مکرر احکام ذیل جاری کیے جاتے ہیں:

اوّل: مدحِ صحابہ پڑھنا نہ کبھی پہلے ممنوع تھا اور نہ اب ہے۔

---

۱ النجم لکھنؤ، ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ

دوم: ہر خاص و عام کو اختیار ہے کہ مدحِ صحابہ جب اور جس مجمع میں خواہ اپنے مکان میں، مسجد میں، باغ میں یا دیگر محدودہ و مقبوضہ مقام میں جہاں چاہیں بلا روک ٹوک پڑھ سکتے ہیں۔

سوم: عام سڑکوں، گلیوں اور میدانوں میں عشرۂ محرم، چہلم اور ۲۱ ر رمضان کو مدحِ صحابہ نہیں پڑھنی چاہیے۔

چہارم: دیگر اوقات میں اگر لوگ سڑکوں، گلیوں اور میدانوں میں جلوس کے ساتھ مدحِ صحابہ پڑھنا چاہیں تو ان کے لیے اس سلسلہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس سے تین روز قبل اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔[1]"

مسلمانوں کی اصل غرض و غایت یہ تھی کہ بر سر عام شاہراہوں پر جلوس میں بغیر کسی کی تحقیر کیے ہوئے اپنے مذہبی پیشواؤں کی یادگار منانے کے شہری حق کا احساس لوگوں کو دلائیں اور چونکہ شیعوں نے اس کی مخالفت کی تھی اور اس کی تنسیخ کرائی تھی لہٰذا اپنے اس حق کو حکومت سے تسلیم کرائیں اس لیے جب مسٹر ریڈ یچی کے مذکورہ اعلان میں ایک بڑی حد تک ان کا یہ شہری حق تسلیم کر لیا گیا تو مسلمانوں کے بااثر طبقہ نے مزید احتجاجی کارروائیوں کو ملتوی کر دیا۔ اور یہ رائے ہوئی کہ کامل تصفیہ کرانے کے لیے دوسرے مناسب موقع کا انتظار کیا جائے۔ سر جان ہیوٹ نے اپنے سابقہ حکم نامہ میں یہ امید بھی ظاہر کی تھی کہ ان احکام کے نتیجہ میں لکھنؤ کے مسلمانوں اور شیعوں میں وہی رواداری اور خوش دلی پھر عود کر آئے گی جو پہلے کبھی پائی جاتی تھی، چنانچہ مسلمانوں کے بااثر رہنماؤں نے بھی اپنے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ صاحب موصوف کی اگر یہ متوقع آرزو بر نہ آئی تو پھر حکومت سے آئندہ اپنے حکم پر نظر ثانی کرانے کا بہتر موقع حاصل ہو جائے گا۔ بدقسمتی سے مسلم عوام کا اندیشہ صحیح نکلا اور سر جان ہیوٹ نے جو توقع وابستہ کی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور اختلافات کی شدت بڑھتی ہی رہی اور مسلمانوں کی مذہبی حق تلفی برابر ہوتی رہی۔

ایک خوشگوار اور مفید نتیجہ

۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۹ء تک لکھنؤ شہر میں جو شیعہ سنی خلفشار کی حالت رہی اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت پوشیدہ تھی، ان اختلافات کے پردے میں مسلمانوں کی اصلاح و خیر کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دیا۔ اگر ایک طرف یہ ہوا کہ مخالفین اہل سنت کی طرف سے ہر ممکن دلآزاری کی گئی،

---

[1] النجم لکھنؤ، ۷ ر ربیع الاوّل ۱۳۲۷ھ

بزرگانِ اسلام کی شان میں کوئی گستاخی کی کسر باقی نہیں رکھی گئی، حکومتِ وقت اور حکام کے ساتھ ساز باز کر کے شہری حقوق پائمال کرائے گئے اور مذہبی آزادی پر پہرے بٹھائے گئے تو دوسری طرف اللہ جل شانہٗ نے مسلمانوں کی دینی ہدایت کا دروازہ بھی کھول دیا وہ اس طرح کہ انھیں اس بات کا اچھی طرح احساس پیدا ہو گیا کہ فریق مخالف ہمارے ساتھ کبھی بھی امن وسکون کے ساتھ نہیں رہ سکتا اور یہ بات بھی روز روشن کی طرح کھل کر سامنے آ گئی کہ یہ ساری جنگ و جھگڑا تعزیہ داری جیسی خلافِ شریعت رسم کی وجہ سے ہوا ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۰۹ء کے عشرۂ محرم اور چہلم کے موقع پر لکھنؤ میں مسلمانوں کے یہاں تعزیہ داری کی رسم قبیح بالکل موقوف رہی۔ عام مسلمانوں نے اس وقت سے بالکل تہیہ کر لیا کہ اب وہ نہ تو محرم کی رنگ رلیوں میں رونق و چہل پہل کا ذریعہ بنیں گے اور نہ ہی خلافِ شریعت کسی رسم کی ادائیگی کریں گے۔ مسلمانوں میں بیداری اسی کشمکش کے بعد ہی سے پیدا ہوئی اور وہ قدیم رسم بد جو اُن کی غفلت اور بے دینی کی وجہ سے برسہا برس سے ان میں سرایت کیے ہوئے تھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ترک ہونے لگی۔ یہ صورت صرف لکھنؤ کے مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ اودھ کے دوسرے علاقوں میں مثلاً بارہ بنکی، فیض آباد، جونپور، رائے بریلی، سلطانپور، سیتاپور اور بہرائچ وغیرہ جیسے اضلاع میں بھی پیدا ہوئی اور اسی سال سے تعزیہ داری کم از کم مسلمانوں میں نوے فیصدی ختم ہو گئی:

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

تعزیہ داری اور محرمی بدعات سے تائب ہونا اور ان کو خلافِ شریعت سمجھنا ایک ایسی اصلاح پذیری تھی کہ جس کے لیے برصغیر کے ہر حصہ میں علماء وصلحاء امت ہر ممکن طریقہ سے ابلاغ حق کا فریضہ شروع ہی سے انجام دے رہے تھے لیکن ان اقدامات کے اثرات صرف خواص اور ذی علم طبقہ تک ہی زیادہ تر محدود تھے اور عوام اسی گمراہی و ضلالت میں مبتلا رہے مگر اب اس اختلافی فضا نے ایک تازیانہ کا کام دیا اور جو بات سالہا سال میں نہ ہو سکی تھی وہ چند برسوں میں ہو گئی۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ ہر اصلاحی تحریک خواص سے شروع ہو کر عوام تک پہنچتی ہے لیکن خوش قسمتی سے موجودہ اصلاحی تحریک عوام سے شروع ہوئی اور انہی میں سب سے پہلے بیداری اور غیرتِ دینی پیدا ہوئی جس کے خوشگوار اثرات روز بروز بڑھتے ہی گئے یہاں تک کہ آج کا یہ زمانہ آ گیا جس میں یہ سطور قلم بند کی جا رہی ہیں۔

تیرہواں باب

مدحِ صحابہ کمیٹی کا قیام اور سولِ نافرمانی کا آغاز

تاریخ ہر دور میں کروٹ بدلتی ہے۔ مظلوم کے اندر جب تک صبر و تحمل کی قوت ہوتی ہے وہ ہر ظلم کو طوعاً و کرہاً برداشت کرتا ہے لیکن جب جور و ظلم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے اور دنیا اس کی طرف متوجہ ہونے لگتی ہے۔ ۱۹۰۹ء کے بعد سے لکھنؤ کے مسلمان برابر مدحِ صحابہؓ پر عائد شدہ پابندیوں کے خلاف آئینی طور پر جدو جہد کرتے رہے مگر کوئی خاطر خواہ شنوائی نہ ہوئی یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء کا زمانہ آ گیا۔ مسلمانانِ لکھنؤ کا ایک قدیم دستور چلا آ رہا تھا کہ وہ ہر سال ۱۲ / ربیع الاول کے موقع پر ایک جلوس نکالتے تھے جس کو ''جلوس محمدی'' کہتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں جب ربیع الاوّل کا مہینہ آیا تو اس مرتبہ بھی جلوس محمدی نکالنے کی تیاریاں زور و شور کے ساتھ حسب دستور شروع ہوئیں۔ وقت مقررہ پر جب جلوس نکل رہا تھا بعض سنی نوجوانوں نے بلند آواز سے مدحِ صحابہ پڑھ کر اپنا مذہبی فریضہ انجام دیا۔ شیعہ تو موقع کی تلاش میں تھے ہی انھوں نے فوراً حکام کے دروں کی جبیں سائی شروع کر دی۔ سوءِ اتفاق سے اس وقت لکھنؤ میں مسٹر ابو طالب نقوی ایک متعصب شیعہ سٹی مجسٹریٹ تھے (جو بعد میں پاکستان چلے گئے اور وہیں کراچی میں ۱۹۹۱ء میں جان بحق ہوئے) انھوں نے اپنے ذاتی اثرات اور اپنے عہدہ کا ناجائز استعمال کر کے عین اس وقت جب کہ جلوس کوتوالی چوک کے قریب پہنچنے والا تھا دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کا اعلان کر دیا اور جرم یہ لگایا کہ اس میں مدحِ صحابہ پڑھی جا رہی تھی لہٰذا اس وقت تو اس جلوس میں مدحِ صحابہ نہیں پڑھی جا سکی مگر اسی دن سے سنّیوں میں پھر ایک زبردست اضطراری کیفیت پیدا ہو گئی اور یہ یقین کامل ہو گیا کہ حکومت شیعوں کے زیر اثر ہو کر اب پھر ہمارے مذہبی اور شہری حقوق میں مداخلت کر رہی ہے چنانچہ اسی سال دو افراد نے احتجاجاً قانون شکنی کر کے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر گرفتار کرا دیا۔ ان گرفتاریوں سے اور بھی کشیدگی پیدا ہو گئی مگر پھر بھی آئینی جدّ و جہد تک ہی

اپنے کو محدود رکھا گیا۔

۱۹۳۶ء عشرۂ محرم اور چہلم کے موقع پر بھی گرفتاریاں ہوئیں، پہلے موقع پر دو اور دوسرے موقع پر ۱۴ مسلمان گرفتار ہوئے۔ اب تک تو مسلمانوں کو صرف اسی بات کی شکایت تھی کہ ان پر سال میں تین دن مدحِ صحابہ پڑھنے پر پابندی لگائی گئی تھی مگر اب ابوطالب نقوی جیسے سٹی مجسٹریٹ کی کرم فرمائیوں کی بدولت حکومت کے افسروں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا وہ یہ کہ اب کوئی شخص کہیں بھی اور کسی وقت بھی اپنے بزرگوں کی تعریف وتوصیف (مدحِ صحابہؓ) میں کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکال سکتا تھا۔ اس زمانہ میں مسٹر نقوی نے یہاں تک آفت ڈھار کھی تھی کہ اگر کوئی شخص اپنے مکان کے اندر بھی مدحِ صحابہؓ پڑھتا تو فوراً گرفتار کرلیا جاتا تھا چنانچہ مسجد کے اندر بھی صحابہ کرامؓ کا نام لینا مسٹر نقوی نے جرم قرار دے دیا تھا۔[1]

مدحِ صحابہ کمیٹی کا قیام

حکام شہر کے ان اقدامات سے مسلمانوں کو یہ یقین ہوگیا کہ اب تک تو ہمارے اوپر سال میں صرف تین ہی دن کی پابندی تھی مگر اب تو سارے سال مدحِ صحابہ پڑھنے پر پابندی لگتی نظر آرہی ہے۔ یہ بات کسی طرح بھی قابل برداشت نہ تھی چنانچہ عوام کے اس ہیجان سے متاثر ہوکر لکھنؤ کے تعلیم یافتہ طبقہ نے ۱۶ر مئی ۱۹۳۶ء کو ایک جلسۂ عام طلب کیا تاکہ موجودہ فضا پر غور کیا جائے اور ان قیود کو منسوخ کرانے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس جلسہ میں عوام کے سامنے اعلان کیا گیا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے قانونی کاروائی کرنے کا تہیہ کیا گیا ہے چنانچہ ایک کمیٹی بنام مدحِ صحابہ کمیٹی تشکیل کردی گئی تاکہ وہ لوگوں کو خلافِ قانون اقدام سے روکے اور آئینی ذرائع سے حکومت کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے سابقہ حکم کو واپس لے اور ان قیود کو اٹھائے جو خلفاء ثلاثہؓ کی مدح پڑھنے پر عائد ہیں۔ سنی عوام کو اطمینان دلانے کے لیے اس کمیٹی کے قیام کی تجویز لکھنؤ کے اکتالیس سربرآوردہ مسلمانوں کے دستخطوں سے شائع کی گئی اور اس کے عملاً قائم ہوجانے کا اخباروں میں اعلان بھی کردیا گیا لیکن مقامی حکام کے رویہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ شیعوں کی رعایت میں سرکاری ریزولیشن کے واضح الفاظ اور ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کے صریحی اعلان مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۰۹ء کے باوجود نہ صرف ان تین ایام میں بلکہ سال کے بقیہ

---

[1] ماہنامہ الداعی، لکھنؤ، ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ

ایام میں بھی مدحِ صحابہ کے جلوس نکالنے اور مدحِ صحابہؓ پڑھنے کے بھی روادار نہ تھے—مدحِ صحابہ کمیٹی کے اراکین کے اسماء گرامی یہ تھے:[۱]

۱۔ الحاج مولوی محمد نسیم صاحبؒ ایڈووکیٹ	صدر
۲۔ مولوی سید ظہور احمدؒ ایڈووکیٹ	ممبر
۳۔ چودھری نعیم اللہؒ ایڈووکیٹ	ممبر
۴۔ منشی احترام علی کاکورویؒ آنریری مجسٹریٹ	ممبر
۵۔ بابو محمد نسیمؒ میونسپل کمشنر	ممبر
۶۔ شیخ محمد کاملؒ تاجر چکن	خازن
۷۔ مولانا ظفر الملک علویؒ[۲] ایڈیٹر الناظر لکھنؤ	سکریٹری

۱؎ عرضداشت بخدمت گورنر صوبہ جات متحدہ مطبوعہ ۱۳۵۵ھ

۲؎ مولانا ظفر الملک علوی کا اصلی نام مولوی اسحاق علی تھا مگر تاریخی نام ظفر الملک ہی سے مشہور ہوئے۔ ۱۸۸۴ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم کے بعد اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ انٹرنس تک پہنچ گئے تھے مگر بعض اسباب کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے اور تعلیم ترک کر دی۔ انگریزی ادب پر گہری نظر تھی، تجارت کو ذریعہ معاش بنایا چنانچہ اس سلسلہ میں کلکتہ، رنگون، ہانگ کانگ اور امریکہ وغیرہ کا سفر کیا۔ حکومت برما کے ایک مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے وہاں کے محکمہ ڈاک میں ملازم ہو گئے مگر اس میں دل نہ لگا اور لکھنؤ واپس آ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد حیدر آباد چلے گئے، وہاں مختلف علمی شخصیتوں کی صحبت ملی جن میں مولانا عبد الحلیم شررؔ، مولانا ظفر علی خاں، علامہ تمنا عمادی اور میر محفوظ علی بدایونی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد سے لکھنؤ واپس آ کر اپنا مشہور و معروف رسالہ ''الناظر'' جاری کیا جس نے بہت جلد علمی و ادبی دنیا میں اپنا مقام بنا لیا۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے، پھر تحریک خلافت میں شامل ہو گئے اور مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک میں شریک ہو کر علی برادران کے ہمراہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، پنڈت موتی لال نہرو سے بے تکلفانہ تعلقات تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب تحریک مدحِ صحابہؓ نے شدت اختیار کی تو آپ بھی اس میں تن من دھن سے لگ گئے اور ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں، وہ اس تحریک کے سربراہوں میں تھے اور کئی بار جیل گئے۔ ابتداءً انگریزی لباس زیب تن کرتے تھے مگر حضرت مولانا عین القضاۃؒ سے بیعت ہونے کے بعد خالص عالمانہ وضع اختیار کی اور ساری زندگی دین وملت کی خدمت میں بسر کی۔ لکھنؤ میں سنیوں کی عصری تعلیم کے لیے ''سنی انگلش اسکول'' قائم کیا جو آج سنی انٹر کالج کی شکل میں ترقی کر رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں مولانا لکھنویؒ کے ہمراہ جمعیۃ علماء ہند کے اکابر سے مسئلہ مدحِ صحابہؓ پر گفتگو کرنے کے لیے سلطان پور (یوپی) گئے جہاں اسی شب میں ڈھائی بجے بوقت تہجد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لاش لکھنؤ لائی گئی اور وہاں سے ان کے آبائی وطن کاکوری لے جائی گئی، جہاں مولانا لکھنویؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر لاکھوں کے مجمع نے ان کے خاندانی قبرستان میں دفن کیا۔

سٹی مجسٹریٹ کا اعلان

یکم جون ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ کے شیعہ سٹی مجسٹریٹ ابو طالب نقوی نے حسب دفعہ ۱۴۴ ایک اعلان شائع کیا کہ ۳ جون کے جلوس محمدی میں مدحِ صحابہ نہ پڑھی جائے، اس سلسلہ میں ان کے الفاظ درج ذیل ہیں:

''ہرگاہ ایک جلوس لکھنؤ میں تاریخ ۳ر جون ۳۶ء بروز بارہ وفات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اعزاز میں نکالا جانے والا ہے و ہرگاہ یہ جلوس چند سال ہوئے پہلے نکالا گیا تھا تو شیعہ اور سنی مسلمانان کا مشترکہ جلوس تھا اور اس وقت سے اب تک یہ مشترکہ جلوس رہا ہے۔ ہرگاہ امسال بھی جلوس کے سنی منتظموں نے شیعہ مسلمانوں کو جلوس میں شرکت کرنے کے لیے مدعو کیا ہے اور انھوں نے بھی اپنی شرکت کی منظوری دے دی ہے اور ہرگاہ کہ پولیس کی اطلاع و نیز دیگر ذرائع کی اطلاع پر یہ یقین کرنے کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں کہ کچھ غیر ذمہ دار لوگ ایسی نظمیں جو مختلف فیہ ہیں اس جلوس میں پڑھیں گے جن کی معقول گنجائش نہیں ہے اور ہرگاہ ایسی نظموں کے پڑھنے سے اندیشہ نقضِ امن عام کا ہے۔ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ.........حسب ذیل حکم زیر دفعہ ۱۴۴ ضابطۂ فوجداری نافذ کرتا ہوں کہ:

۱۔ کوئی شخص جلوس میں یا جلوس کے لوگوں کی سماعت کے اندر یا کسی شارع عام پر یا مجمع میں مدحِ صحابہ نہیں پڑھے گا۔

۲۔ کوئی شخص دشنام آمیز الفاظ یا کوئی اور الفاظ یا اشعار جن سے کسی دوسرے فرقہ کے پیروؤں کی ذلت یا ہتک ہوتی ہو اس جلوس کے راستے میں یا جلوس کے لوگوں کی سماعت کے اندر یا کسی شارع عام پر یا کسی مجمع میں نہ پڑھے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔[1]

اس حکم سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں قابل اعتراض یا اشتعال انگیز الفاظ سے باز رکھنے کا حکم تھا وہاں مدحِ صحابہ کے وہ جملے بھی امتناع کی زد میں آ گئے جن میں کوئی قابلِ اعتراض یا اشتعال انگیز پہلو نہ تھا گویا مدحِ صحابہ کا معمولی سے معمولی اور سادہ سے سادہ جملہ بھی زبان پر لانا قانوناً جرم ہو

[1] اخبار مدینہ بجنور، ۱۳ر جون ۱۹۳۶ تحریر مولوی محمد احمد کاظمی، سابق ایم ایل اے

گیا چاہے اس کا تعلق ایام محرم سے ہو یا نہ ہو۔ بہانہ یہ بنایا گیا تھا کہ اس جلوس کے منتظمین ایسی نظموں کو پسند نہیں کرتے لیکن منتظمین نے جلوس کو ملتوی کر کے دکھا دیا کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے متفق نہ تھے اور جو فیصلہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے کیا تھا وہ صحیح نہ تھا۔ دوسرا بہانہ یہ تھا کہ اس جلوس میں شیعہ بھی مدعو ہیں لیکن اگر شیعوں کی حاضری کے سبب سے یہ حکم دیا گیا تھا تو مناسب یہ تھا کہ سنی منتظمین کو بلا کر کہہ دیا جاتا کہ اگر تمہارا مدحِ صحابہ پڑھنے کا ارادہ ہے تو شیعوں کو مدعو نہ کرو ورنہ مشترکہ جلوس میں مدحِ صحابہ نہ ہوگی۔[1]

شیعہ مجسٹریٹ کی 'مہربانیاں'

مولوی محمد احمد کاظمی سابق ایم۔ ایل۔ اے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کے حکام کی طرف سے مدحِ صحابہ پر پابندی عائد کرنے کا سبب یہ بتایا گیا تھا کہ اس جلوس میں شیعہ بھی مدعو ہیں۔ سنیوں نے حکومت کے اس حکم کو جس نظر سے دیکھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بطور احتجاج اس جلوس کو منسوخ کر دیا اور ان کا ایک وفد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پاس گیا اور ۱۲ر جون کو دوبارہ عید میلاد النبی کے سلسلہ میں جلوس نکالنے اور مدحِ صحابہ پڑھنے کی اجازت چاہی اور ساتھ ہی ساتھ ایک باضابطہ درخواست بھی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے یہاں پیش کی۔ چنانچہ اس درخواست پر بھی ۹ر جون کو ایس۔ پی نے مدحِ صحابہ کی مخالفت کرتے ہوئے یہ حکم لکھا تھا کہ ''کوئی ایسی نظم یا شعر یا دوسرے قسم کے الفاظ جو خلیفہ ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی تعریف میں یا ان کی شان میں ہوں اس جلوس کے ساتھ یا اس کی ساعت میں یا کسی عام مقام پر مجمع کے اندر کوئی شخص نہ پڑھے۔'' اس کے بعد ایک دوسری درخواست ۲۸ جون ۳۶ء کو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی یاد منانے کے لیے پیش کی گئی اس درخواست کو بھی ایس۔ پی نے ابو طالب نقوی سٹی مجسٹریٹ کے پاس اس ریمارک کے ساتھ بھیج دیا کہ چونکہ یہ جلوس جدید ہے اس لیے اس کی اجازت نہ دی جائے، چنانچہ نقوی صاحب نے اجازت نہیں دی اور ایس۔ پی کو یہ حکم لکھ کر بھیجا کہ ــــ ''میں اتفاق کرتا ہوں کہ یہ جلوس کلیتاً ایک جدت ہے اور شہر کے شیعہ سنی تعلقات کی کشیدگی

---

[1] تحریک مدح صحابہ، مظہر علی اظہر (شیعی) ص ۳۳-۳۴

پر نظر کر کے اس جلوس کو نکالنے کی اجازت میں ہرگز نہ دوں گا اگر درخواست دہندگان اس کے نکالنے پر اصرار کریں تو ایس۔ پی مہربانی کر کے مجھے اطلاع کر دیں تاکہ میں جلوس روکنے کا حکم حسب دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری جاری کر دوں—" اس وجہ سے یہ جلوس ترک کر دینا پڑا اور لکھنؤ کے حکّام نے اپنے رویّہ سے اس امر کا پورا ثبوت دے دیا کہ ان کے نزدیک لکھنؤ میں مدحِ صحابہ پڑھنے کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔[1]

سِول نافرمانی کا فیصلہ

مدحِ صحابہ کمیٹی کی پالیسی یہ نہ تھی کہ وہ اس اہم مسئلہ کو سول نافرمانی کر کے حل کرنے کی کوشش کرے اور اس طرح قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے جرم کی مرتکب ہو بلکہ وہ پُر امن طریقہ سے اور خالص آئینی طور پر حکومت سے گفت و شنید کر کے کوئی مصالحت کا راستہ نکالے مگر سنّیوں کے ایک طبقہ نے جس کے مذہبی جذبات مقامی حکّام کے رویّہ سے مشتعل تھے وہ اس بات پر مصر تھا کہ مدحِ صحابہ بر سرِ عام جلسوں اور جلوسوں میں ضرور پڑھی جائے گی۔ سنّیوں کے اس طبقہ کی رہنمائی مجلس اِحرار اسلام کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ مجلسِ احرار ہی تھی جس نے اس مسئلہ کو سول نافرمانی کے ذریعہ حل کرانے کی پہل کی۔ احراری حضرات نے مدحِ صحابہ کمیٹی کے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا جس میں عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ قانون شکنی سے پرہیز کریں اور مدحِ صحابہ پر تین دن کی بندش کو منسوخ کرانے کے لیے آئینی جدوجہد کریں اور پھر وقت کا انتظار کریں۔ مجلس احرار کے ان پُرجوش اقدامات سے حکومت پوری طرح باخبر تھی چنانچہ مقامی حکّام نے ۷ر جولائی ۱۹۳۶ء کو مجلس احرار کے تین سرکردہ کارکنوں کو دفعہ ۱۰۷ کے تحت گرفتار کر لیا جن کے متعلق ان کو شبہ تھا کہ وہ قانون شکنی کر کے مدحِ صحابہ پڑھنے کو ترجیح دیں گے۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۳۶ء کو بعد نماز جمعہ مجلسِ احرار کے رضا کار مدحِ صحابہ پڑھ کر گرفتاریاں پیش کریں گے۔ اس جلسہ میں یہ بات بھی طے پائی کہ رضا کارانہ گرفتاریاں پیش کرنے کا یہ سلسلہ برابر ہر جمعہ کو جاری رہے گا جب تک کہ حکومت کوئی منصفانہ فیصلہ کا اعلان نہ کر دے چنانچہ ۱۷ر جولائی ۱۹۳۶ء سے سول نافرمانی کی تحریک کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا۔ اس کی صورت یہ اختیار کی گئی کہ دریائے گومتی

---

[1] اخبار مدینہ بجنور، ۱۳ر جون ۱۹۳۹ء

کے کنارے ٹیلہ شاہ پیر محمد[1] پر واقع جامع مسجد میں تمام شہریوں سے جمعہ کی نماز پڑھنے کی اپیل کی گئی اور بعد نماز جمعہ وہیں سے گرفتاریاں پیش کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس اعلان کی روشنی میں جمعہ کے دن تقریباً پانچ ہزار مسلمان ٹیلہ شاہ پیر محمد کی مسجد میں جمع ہو گئے، نماز جمعہ حسبِ دستور مسجد کے اندر ہوئی، نماز کے بعد لوگ مسجد سے نکل کر ٹیلہ پر جمع ہو گئے اور ان میں سے پندرہ مسلمانوں پر مشتمل ایک جتھ مدحِ صحابہ پڑھتا ہوا نکلا۔ مقامی حکّام نے اس کا مقابلہ یوں کیا کہ ٹیلہ کے اِردگرد دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے پولیس کی بھاری جمعیت متعین کر دی لہٰذا پندرہ افراد کا جو جتھ مدحِ صحابہ پڑھتا ہوا نکلا تھا اس کو ڈی ایس پی سٹی اور دوسرے پولیس افسران نے سٹی مجسٹریٹ مسٹر نقوی کی موجودگی میں گرفتار کر لیا اور کوتوالی بھیج دیا۔ اس موقع پر پولیس نے بڑے تشدّد اور ظلم سے کام لیا اور مسلمانوں کے مجمع پر لاٹھیاں برسائیں۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۳۶ء سے ہر جمعہ کو اسی طرح سول نافرمانی کر کے گرفتاریاں دی جاتی رہیں جس کا سلسلہ نومبر ۱۹۳۶ء تک جاری رہا۔ اس درمیان میں کوئی جمعہ ایسا خالی نہیں گیا جس میں اس طرح کا مظاہرہ نہ کیا گیا ہو اور اس کے شرکاء گرفتار اور قید نہ ہوئے ہوں۔ قیدیوں کو کم از کم تین مہینہ یا پھر چھ مہینہ کی قید اور پچاس روپیہ جرمانے کی سزا دی جاتی تھی اور عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں گھروں کا ساز و سامان قرق کر لیا جاتا تھا۔

حکومت کے طرزِ عمل کی شدید مذمّت

۲۴ر جولائی ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں گنگا پرشاد میموریل ہال میں فلسطین کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد مولانا ظفر الملک علویؒ ایڈیٹر 'الناظر' لکھنؤ کی زیرِ صدارت ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں

---

[1] حضرت شاہ پیر محمد صاحبؒ مضافات منڈیاہوں ضلع جونپور میں ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوئے، آپ علوم ظاہری و باطنی کے فاضل اور اعلیٰ تصنیفات کے مالک تھے، کتب درسیہ کی تحصیل جونپور، مانک پور، دہلی، اجمیر، قنوج اور حرمین شریفین میں کی۔ اس کے بعد لکھنؤ پہنچ کر مولوی عبدالقادر عمری لکھنویؒ کی خدمت میں فاتحہ فراغ پڑھا۔ اور وہیں حضرت شاہ مینا صاحب قدس سرہٗ کے مزار پر رہ کر ریاضت و مجاہدہ کیا اور باطنی تربیت بھی انھیں کی روح پرفتوح سے حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ عبداللہ سیاحی چشتی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے خلافت حاصل کی، اور پھر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی، پیر کی وصیت کے مطابق ہمیشہ افادۂ علم میں مشغول رہے، اکثر علماء نامدار آپ کے شاگرد تھے، ۱۶۷۴ء میں آپ کی وفات ہوئی اور دریائے گومتی کے کنارے ایک ٹیلہ پر دفن ہوئے جو آج ٹیلہ شاہ پیر محمد کے نام سے لکھنؤ میں مشہور ہے۔ (نزہۃ الخواطر، جلد پنجم، ص ۹۷-۹۶، اُردو ترجمہ تذکرہ علماء ہند، ص ۱۳۵)

لگ بھگ دو ہزار مسلمان شریک ہوئے، اس جلسہ میں مشہور ملّی رہنما چودھری خلیق الزماں[1] نے مدحِ صحابہؓ سے متعلق حکام کے طرزِ عمل کی سخت مذمت کی اور کہا کہ اگرچہ مسلمانوں نے احتجاج کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ غلط ہے، شہید گنج کی مسجد کے متعلق بھی مسلمانوں نے ایسا ہی طریقہ اختیار کیا تھا جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا لہٰذا مسلمان لیڈروں کو چاہیے کہ وہ سول نافرمانی نہ کریں بلکہ آئینی جدوجہد کریں۔ پولیس کی زیادتیوں اور بے جا گرفتاریوں کے خلاف اس جلسہ میں ایک متفقہ ریزولیوشن بھی پاس کیا گیا جس کے محرک چودھری خلیق الزماں اور موئیدین میں مولانا قطب الدین عبدالوالی فرنگی محلیؒ اور حکیم سیّد وزیر حسنؒ تھے۔[2]

عوام کا جوش و خروش

سول نافرمانی کی تحریک سے عوام میں بہت جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا اور لوگ ہر جمعہ کو ٹیلہ کی مسجد پر جوق در جوق پہنچتے اور بعد نماز جمعہ رضا کارانہ طور پر اپنی گرفتاریاں پیش کرتے تھے، بڑوں کے ساتھ بچوں میں بھی جذبۂ اسیری پایا جاتا تھا چنانچہ وزیر گنج تھانے کے ایک کمسن بچے محمد صدیق کو دو ہفتہ قید رکھا گیا اسی طرح ایک عرب مہمان جو اُن دنوں لکھنؤ آئے ہوئے تھے عشقِ صحابہ اور ذوقِ اسیری کے تحت انھوں نے بھی اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ اس وقت کا منظر عجیب و غریب تھا اور مسلمان بیحد متاثر ہو رہے تھے۔ عوام میں اس قدر جذبہ و ولولہ تھا کہ تحریک کے دوران ایک جمعہ کو جب مسلمانوں کا ایک جتھہ گرفتار ہو کر چوک کوتوالی میں لایا گیا تو مقدمہ کی سماعت کے دوران اُن سے جب پوچھا گیا کہ تمھارا نام کیا ہے تو سب نے جواب دیا 'احراری' باپ کا نام پوچھا گیا تو کہا 'چار یاری' پیشہ پوچھا گیا تو جواب دیا 'مدحِ صحابہ' اور سکونت دریافت

1۔ چودھری خلیق الزماں صاحب مضافات لکھنؤ میں ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ میں حاصل کر کے لکھنؤ آئے، یہاں چند سال رہ کر علی گڑھ آ گئے اور پھر ساری تعلیم یہاں مکمل کی۔ اس کے بعد لکھنؤ واپس آ کر وکالت کو بطور پیشہ اختیار کیا۔ قومی اور اسلامی تحریکوں میں ہمیشہ سرگرم رہے، ۱۹۱۶ء میں انھیں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جوائنٹ سکریٹری منتخب کیا گیا، لکھنؤ میونسپل بورڈ کے چیئرمین بھی رہے اور مسلم لیگ کے پہلے صدر بنے۔ ۱۹۵۳ء میں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے گورنر مقرر ہوئے پھر انڈونیشیا اور فلپائن میں پاکستان کے سفیر ہوئے۔ انگریزی میں ایک کتاب Path Way to Pakistan مرتب کی۔ ۱۸ر مئی ۱۹۷۳ء میں پاکستان میں انتقال ہوا۔ (انسائیکلوپیڈیا قائداعظم، مرتبہ زاہد حسین انجم، ص ۱۰۳)

2۔ النجم لکھنؤ، مدح صحابہ نمبر، ۷ر اگست ۱۹۳۶ء۔

کی گئی تو سب نے کہا مدحِ صحابہ اس طرح کے جوابات سے عدالت کو بڑی دشواری پیش آئی۔[1]

سول نافرمانی کی اس تحریک میں صرف لکھنؤ کے مسلمانوں نے ہی حصہ نہیں لیا بلکہ صوبہ کے دوسرے شہروں سے بھی مسلمانوں کے جتھے لکھنؤ آتے اور اپنی گرفتاریاں پیش کرتے تھے، اس قسم کے جتھوں میں دہرہ دون، جون پور، شاہجہاں پور، بارہ بنکی، فیض آباد، بریلی اور دیوبند کے جتھے قابلِ ذکر ہیں۔

امتناعِ مدحِ صحابہ کے خلاف ملک گیر احتجاجات

مدحِ صحابہ ایجی ٹیشن کی موافقت میں اور حکومت کی جانب سے امتناعِ مدحِ صحابہ اور شیعوں کی طرف سے تبرا کے اصرار پر جس قدر احتجاجی جلسے و مظاہرے پورے ملک میں ہوئے ان کی تفصیلات النجم کے صفحات پر برابر شائع ہو رہی تھیں، ہمیں اُس دور کے النجم کی پوری فائل تو دستیاب نہیں ہو سکی البتہ اس زمانے کے جو بھی پرچے مل سکے اور ان میں جن مظاہروں کی خبریں شائع ہوئیں ہم انہی کو درج کر رہے ہیں، یقیناً ان کے علاوہ بھی بے شمار مقامات اور ہوں گے جہاں یہ جلسے اور مظاہرے ہوئے ہوں گے مگر مکمل ریکارڈ نہ ہونے سے ہم انھیں درج نہیں کر سکے۔ اس مسئلہ پر سارے ملک میں جہاں بھی یہ جلسے ہوئے وہاں متعدد تجاویز بھی پاس ہوئیں جن میں خاص طور پر مندرجہ ذیل دو تجاویز ضرور ہر جگہ پاس کی گئیں:

۱۔ حکومت امتناعِ مدحِ صحابہ کا قانون منسوخ کرے۔

۲۔ لکھنؤ کے سنیوں سے اس سلسلہ میں باز پرس بند کی جائے اور قیدیوں کو غیر مشروط طور پر فوراً رہا کیا جائے۔

جن مقامات پر یہ احتجاجی جلسے ہوئے تھے ان کی ایک مختصر فہرست حسبِ ذیل ہے:

صوبہ یوپی

الٰہ آباد:

مولانا نصیر الدین صاحب کی زیرِ صدارت ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں منشی نہال الدین، مولانا حبیب الرحمٰن مدرس مدرسہ سبحانیہ، جناب عبدالکریم صدیقی، تاجر صابن اور مولانا محمد میاں فاروقی الٰہ آبادی نے تقریریں کیں۔

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۵ر ستمبر ۱۹۳۶ء

امروہہ ضلع مراد آباد:

۱۸ر ستمبر ۱۹۳۶ء کو جامع مسجد امروہہ میں بعد نماز جمعہ مولوی سیّد معظم حسنین، مولوی سیّد رضا حسن، مولوی سیّد اعجاز حسنین اور مولوی اظہار الحق عباسی نے سیرت کمیٹی کے زیرِ اہتمام جلسہ کر کے احتجاجی تقریریں کیں۔

بسواں ضلع ستیاپور:

۲۸ر اگست ۱۹۳۶ء کو انجمن عالیہ نظام المسلمین کے زیر اہتمام مولانا خلیل احمد صاحب اور بعض دوسرے حضرات نے جلسہ میں تقریر کی۔

بنارس:

۱۱ر ستمبر ۱۹۳۶ء کو بمقام مظہر العلوم کچی باغ میں مولانا محمد عمر، مولوی محمد اسحاق اور مولوی عبدالحمید نے احتجاجی تقریر کی۔

جون پور:

۸ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو عام مسلمانوں نے اپنے قدیم الایام رجبی کے جلوس کو لکھنؤ میں مدحِ صحابہ پر پابندی کے خلاف احتجاجاً بند کر دیا۔

ڈبائی ضلع بلند شہر:

مولانا عبدالقیوم صاحب صدر انجمن شوکت اسلام علی گڈھ نے ایک جلسۂ عام میں احتجاجی تقریر کی۔

رائے بریلی:

۱۸ر ستمبر ۱۹۳۶ء کو مسجد دکھنی دروازہ میں ایک جلسۂ عام میں حکیم حسن اختر صاحب نے تقریر کی۔

سلون ضلع رائے بریلی:

۲۸ر اگست ۱۹۳۶ء کو ایک احتجاجی جلسہ میں مولانا محمد عمر صاحب نے تقریر کی۔

شاہ آباد ضلع ہردوئی:

۳ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کے احتجاجی اجتماع کو مولانا عزت حسین صاحب اور مولانا عبدالرحیم صاحب بھاگلپوری نے خطاب کیا۔

شاہجہاں پور:

مجلس احرار اسلام کے زیرِ اہتمام ایک عظیم اجتماع کو مولانا سیّد نعمت علی نے خطاب کیا اور حاضرین جلسہ نے مولانا محمد قاسم شاہجہانپوری کو مدحِ صحابہ کے سلسلہ میں گرفتار ہونے پر مبارکباد دی۔

علی گڈھ:

یہاں دو جلسے ہوئے، ۹راگست ۱۹۳۶ء کو ایک جلسہ میں جناب ابرار احمد صاحب نے مذکورہ بالا دونوں تجاویز پاس کرائیں۔ ۷رستمبر ۱۹۳۶ء کو مولانا ابوالعرفان صاحب، مولانا شبیر احمد اسرائیلی صاحب، مولانا قاری سلطان حسین صاحب (آگرہ) اور مولانا عارف حسین صاحب نے تقریریں کیں۔

غازی پور:

۱۸رستمبر ۱۹۳۶ء کو تمام سنی واہل حدیث حضرات نے اپنے کاروبار بند رکھے اور ایک جلسۂ عام میں حکیم عبدالمجید صاحب اور مولانا ابوالحسن صاحب صدر مدرس مدرسہ دینیہ غازی پور نے مدحِ صحابہ کی اہمیت پر ولولہ انگیز تقریریں کیں۔

کانپور:

یہاں دو جلسے ہوئے۔ ۲۸راگست ۱۹۳۶ء کو ایک جلسۂ عام میں مولانا محمد ہادی نے احتجاجی تقریر کی اور ۱۸رستمبر ۱۹۳۶ء کو مولانا غازی خضر محمد صاحب اور مولوی اشرف علی ملیح آبادی نے جلسۂ عام کو خطاب کیا۔

گورکھپور:

۱۶راکتوبر ۱۹۳۶ء کو تقریباً چار ہزار مسلمانوں کا احتجاجی اجتماع ہوا جس میں خصوصی مقرر مولانا بشیر احمد صاحب قریشی تھے۔

گونڈہ:

۱۸راگست ۱۹۳۶ء کو ایک عظیم مجمع میں جناب مولانا قاری عبدالوہاب صاحب نے تقریر کی اور تجاویز پاس کرائیں۔

مرزاپور:

۳۰راکتوبر ۱۹۳۶ء کو حافظ غلام محمد صاحب خطیب جامع مسجد نے تقریر کی۔

مظفر نگر:

۱۹؍رجب ۱۳۵۵ھ کو مولانا حکیم محمد عثمان صاحب اور جناب مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی نے ایک جلسۂ عام کو خطاب کیا۔

نانپارہ ضلع بہرائچ:

۲۸؍اگست ۱۹۳۶ء کو ایک جلسہ عام کر کے شیخ احمد حسین نے احتجاجی تقریر کی۔

نگرام ضلع لکھنؤ:

۲۸؍اگست ۱۹۳۶ء کو مولانا حافظ محمد انیس صاحب، مولانا عبدالغفار صاحب اور مولانا ظل الرحمٰن صاحب نے جلسۂ عام منعقد کر کے تقریریں کیں۔

نیوتنی ضلع اناؤ:

حکیم سیّد محفوظ علی رضوی نے بعد نماز جمعہ مسجد محلہ احاطہ میں ایک جلسۂ عام کے اندر تقریر کی اور تجاویز پاس کرائیں۔

ہردوئی:

۲۸؍اگست ۱۹۳۶ء کو جامع مسجد ہردوئی میں زیر صدارت مولانا سیّد اخلاص حسین امام جامع مسجد ایک عظیم جلسہ ہوا جس میں مولانا عبدالصمد صاحب نعمانی، مولانا احمد اللہ صاحب نعمانی، اور دوسرے حضرات نے عام اجتماع کو خطاب کیا۔

ہلدوانی:

۱۶؍ستمبر ۱۹۳۶ء کو انجمن فدائے اسلام کے زیر اہتمام جلسہ ہوا جس میں ابوطیب مولانا حکیم اللہ صاحب مقرر خصوصی تھے۔

ہنسور ضلع فیض آباد:

۱۸؍ستمبر ۱۹۳۶ء کو اہالیان بھولے پور کا ایک بڑا جلسہ حکیم عبدالرحمٰن مجددی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مولانا عبدالحق صاحب فاضل دیوبند نے تقریر کی۔

مذکورہ بالا مقامات کے علاوہ یوپی کے اور دوسرے شہروں میں بھی احتجاجی جلسے و مظاہرے ہوئے جن میں اٹاوہ، ایٹہ، پیلی بھیت، رانی کھیت، شاہ گنج، غازی آباد، فتح پور، فتح گڈھ فرخ آباد، قائم گنج، گڑھوال، نجیب آباد اور ہمیر پور قابل ذکر ہیں۔

صوبہ بہار

سیوان:

یکم اکتوبر ۱۹۳۶ء کو محلّہ نیا بازار میں حافظ محمد فاروق صاحب کی تحریک پر جلسہ ہوا جس میں مولانا زین العابدین صاحب نے تقریر کی۔

بھاگلپور:

۲۸/اگست ۱۹۳۶ء کو جامع مسجد ناتھ نگر میں حاجی لیاقت حسین رئیس اعظم کی زیر صدارت جلسہ ہوا جس میں مولانا ابوعبدالحق مدرسہ احیاء العلوم بھاگلپور نے پرجوش تقریر کی اور تجاویز پاس کرائیں۔ مذکورہ بالا مقامات کے علاوہ آسنسول اور چھپرہ میں بھی احتجاجی جلسے ہوئے۔

صوبجات پنجاب، سندھ اور سرحد

بٹالہ:

۱۸/ستمبر ۱۹۳۶ء کو انجمن اخوان المسلمین اہل حدیث بٹالہ کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام میں مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے خطاب کیا۔

پشاور:

۱۰/ستمبر ۱۹۳۶ء کو جامع مسجد گڑ منڈی میں ایک عظیم الشان جلسہ زیرِ صدارت حافظ عبداللہ شاہ منعقد ہوا جس میں قاری بُرہان الدین، آغا سیّد محبوب شاہ قادری، مبلّغ اسلام مولانا عبدالغفور صاحب، حکیم عبدالمنان صاحب، الحاج محمد فاروقی اور سعدیؔ سرحد منشی محمد سعید فارغ پشاوری نے پرجوش تقریریں کیں۔

جگراؤں:

۳/ستمبر ۱۹۳۶ء کو ایک زبردست اجتماع ہوا جس میں حافظ عقیل احمد اور پیرزادہ سیّد محمد سلیمان مقرر تھے۔

روہتک:

۴/ستمبر ۱۹۳۶ء کو جامع مسجد کلاں میں حاجی ابراہیم اور مولوی نظر الحق صاحب نے ایک جلسۂ عام کے اندر خطاب کیا اور تجاویز پاس کرائیں۔

سندھ:

۳۰؍اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ایک جلسۂ عام میں مجاہد اسلام مولانا عبدالکریم چشتی نے تقریر کی اور بکثرت لٹریچر تقسیم کیا۔

کوہاٹ:

۱۸؍ستمبر ۱۹۳۶ء کو جمعیۃ علماء کوہاٹ کا ایک جلسہ مسجد حاجی بہادر صاحب میں زیر صدارت قاضی معراج الدین صاحب ہوا جس میں مولانا احمد گل، مولوی عبدالکریم اور مولوی رحمٰن الدین وغیرہ نے خطاب کیا۔

کڑوریکا ضلع ملتان:

۳۰؍اکتوبر ۱۹۳۶ء کو صاحبزادہ میاں غلام دستگیر صاحب نے تقریر کی اور تجاویز پاس کرائیں۔

ملتان:

۱۱؍ستمبر ۱۹۳۶ء کو جامع مسجد محلہ اسلام آباد ملتان چھاؤنی میں انجمن حنفیہ کے زیرِ اہتمام مولانا سیّد علی حسن شاہ پرہاروی خطیب جامع مسجد نے ایک جلسۂ عام میں تقریر کی اور تجاویز پاس کرائیں۔

اس کے علاوہ ایبٹ آباد، تلہ گنگ، چکوال، لاہور، ہزارہ اور ہوشیار پور میں بھی احتجاجی جلسے ہوئے اور ان میں تجاویز پاس ہوئیں۔

دہلی

دہلی میں دو مقامات پر جلسے ہوئے۔ ۲۹؍اگست ۱۹۳۶ء کو انجمن ترقی اسلام کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں مولانا امداد صابری صاحب نے پر جوش تقریر کی پھر ۲؍ستمبر ۱۹۳۶ء کو حکیم سیّد غلام حسنین اور دوسرے حضرات نے بھی ایک جلسۂ عام کو خطاب کیا اور تجاویز پاس کرائیں۔

صوبہ بنگال

لوناواڑہ ضلع پنچ محل:

۳؍نومبر ۱۹۳۶ء کو انجمن فلاحِ دارین کے زیرِ اہتمام ایک جلسۂ عام میں احمد غلام رسول صاحب نے تقریر کی اور تجاویز پاس کرائیں۔ مزید برآں بردوان اور کلکتہ میں بھی اسی مقصد کے

تحت جلسے ہوئے۔

رنگون

۴؍اکتوبر ۱۹۳۶ء کو مغل اسٹریٹ پر انجمن حمایتِ اسلام کے زیر انتظام جلسہ ہوا جس میں مولانا اسعد اللہ صاحب اور جناب علی احمد صاحب بی۔اے نے تقریریں کیں[1]۔

اس طرح پورے ملک میں امتناع مدحِ صحابہ کے خلاف ایک لہر دوڑ گئی اور دینی شعور اور ملّی احساسات رکھنے والے ہر طبقہ میں بے چینی اور اضطراب کے بادل چھا گئے۔ تحریک صحابہ نے اب جو خطرناک صورت حال اختیار کر لی تھی اس کی حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی تھی، جوں جوں حکومت کے ذمہ دار افراد انجام وعواقب پر نظر ڈالے بغیر اپنی پالیسی میں سختیاں پیدا کرتے جاتے تھے اسی طرح تحریک میں عوام وخواص کے جوش وشوق اور احتجاجی کارروائیوں میں ضد اور ہٹ دھرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس تحریک کے آغاز سے ذمہ دار حضرات یہ کہتے چلے آ رہے تھے کہ یہ آندھی بہت خطرناک ہے اس کے جھونکے انقلاب کی بہت سی کروٹیں اپنے اندر پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں۔ تحریک شروع ہونے کے بعد ہی سے ذمہ دارانِ حکومت کو اس طرف توجہ دلائی جاتی رہی کہ کوئی باغیرت مسلمان اپنے مذہبی طریق کار میں اس مداخلت بے جا کو گوارا نہیں کر سکتا اور یوں بھی عقلاً وانصافاً اور روایتاً ودرایتاً ہر طریقہ سے اس مسئلہ کو بارہا پیش کر کے جہاں تک سمجھایا جا سکتا تھا سمجھایا گیا کہ قانوناً کسی بزرگِ قوم یا بزرگِ مذہب کی مدح وستائش نہ کسی کے لیے دل آزاری کا باعث ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا احتمال قائم کرنے کے بعد کوئی مذہب اپنی صحیح آزادی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے ساتھ کھیل کر ان کو اس درجہ مجبور بنا دیا گیا کہ اب وہ ہر طرح سے حکومت کے مقابلہ کے لیے بے اختیار تیار ہو گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ حکومت کے اس ناواجب قانون کو مسلمان کب تک مان سکتے تھے، آخر بہت سے نوجوانوں کے پیمانۂ صبر وضبط چھلک گئے اور وہ کئی بار اپنے عزم وارادہ کا اظہار کرنے کے بعد ہر اُس دار وگیر اور سختی وابتلا کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے جس کے لیے ان کا ارادہ کبھی نہ تھا۔

---

[1] النجم لکھنؤ، یکم دسمبر ۱۹۳۶ء

چودھواں باب

علماء کانفرنس

مدح صحابہ کی جزوی بندش پر جب عوام کا جوش وخروش اور حکومت کا غیظ وغضب اعتدال سے زیادہ بڑھا تو حضرت مولانا لکھنویؒ کے ایما اور خواہش پر ملک کے اکابر علماء امّت اور زعماء اسلام کو مسئلہ مدح صحابہ پر غور وخوض کرنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ ۷ار ستمبر ۱۹۳۶ء کو ایک علماء کانفرنس لکھنؤ میں طلب کی گئی جس نے اجتماعی طور پر مسائل حاضرہ پر غور وفکر کیا۔ علماء کانفرنس کی غرض وغایت صرف یہ تھی کہ مسئلہ مدح صحابہ پر خالص علمی اور شرعی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے اور پھر حکومت کے سامنے ان علماء اور دانشوروں کی آراء رکھی جائیں اور یہ بتلایا جائے کہ خواص اور ذی علم طبقہ اس مسئلہ خصوصی میں کیا نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ علماء کانفرنس کا ایک منشاء یہ بھی تھا کہ اس کے ذریعہ حکومت سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ مدح صحابہ پر عائد شدہ سیاہ قانون کو واپس لے اور فریقِ مخالف کی دلدہی ودلداری کی پالیسی کو ترک کرے اور اس سلسلہ میں اہل سنت وجماعت کے اُن افراد کو جو جیلوں کی آزمائش اور سختیاں برداشت کر رہے ہیں فوراً رہا کیا جائے۔ کانفرنس کو منعقد کرنے کے لیے مولانا لکھنویؒ نے اس وقت کے نمایاں اور مقتدر علماء کو ملک کے ہر گوشے سے مدعو کیا اور انھیں لکھنؤ آنے کی دعوت دی تاکہ اس مسئلہ پر متفقہ طور پر خالص اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر سے کوئی طریقۂ کار اور لائحۂ عمل طے کیا جا سکے۔ علماء کا یہ اجتماع اپنے قسم کا ایک منفرد اجتماع تھا جس میں ہر مکتبِ فکر کے اکابر کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اس کانفرنس میں علماء دین کے ساتھ ساتھ ملک کے نمایاں جرائد کے مدیر، ممتاز صحافی اور ماہرین قانون اور عوامی نمائندوں کو بھی دعوتِ فکر دی گئی تھی۔

کانفرنس کا آغاز

۷ار ستمبر ۱۹۳۶ء کو احاطۂ شیخ شوکت علیؒ لکھنؤ میں اس کانفرنس کی پہلی خصوصی نشست شروع

ہوئی جس میں مدح صحابہ کی قانونی نوعیت پر دیر تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا اس دوران حکومت کی جانب سے وہ جاری کردہ نوٹس بھی پیش کیے گئے جو وقتاً فوقتاً سنّیوں کی مذہبی آزادی پر بندش عائد کرنے کے لیے شائع ہوتے رہے تھے۔ اس نشست کے سرکردہ شرکاء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین[۱] احمد مدنیؒ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی، حضرت امام اہل سنّت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ قائد تحریک ہٰذا، علامہ سیّد سلیمان ندویؒ، مولوی سیّد علی حسنؒ قدوائی جونپوری، مولانا عبدالرحیم صاحب

۱۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ۱۹ر شوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) کو قصبہ بانگر مئو ضلع اُناؤ (یو پی) میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے والد ماجد مولوی سیّد حبیب اللہؒ (م ۱۳۴۴ھ) مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وطن اصلی ٹانڈہ ضلع فیض آباد (حال ضلع امبیڈکر نگر) تھا، آپ کی ابتدائی تعلیم پرائمری اسکول میں ہوئی۔ عربی تعلیم کے لیے ۱۳۰۹ھ میں دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور یہاں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اور دیگر ممتاز اور مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ ۱۳۱۶ھ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے۔ اسی زمانے میں آپ کے والد ماجد نے تمام خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں آپ بھی مدینہ منورہ ہجرت کر گئے اور وہاں مدینۃ الرسول میں مشہور ومعروف ادیب شیخ آفندی برادہ سے فن ادب کی کچھ کتابیں پڑھیں اور پھر مسجد نبویؐ میں قرآن وحدیث اور فقہ کا درس دینا شروع کر دیا جو کم وبیش ۱۸ برس تک جاری رہا۔ ۱۳۱۹ھ میں حضرت گنگوہیؒ سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی۔ مکہ معظمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی خدمت میں رہ کر بھی سلوک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۳۳۳ھ میں جبکہ حضرت شیخ الہندؒ نے حج وزیارت کے لیے حرمین شریفین کا سفر کیا تو شریف مکہ نے جو انگریزوں کا ہمنوا تھا آپ دونوں کو گرفتار کر کے حکومت برطانیہ کے حوالہ کر دیا جس نے ان حضرات کو تین سال سے زائد عرصہ کے لیے مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ ۱۳۴۶ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کی صدارت پر فائز کیا گیا جہاں آپ نے بخاری اور ترمذی جیسی احادیث کی کتابوں کا درس دینا شروع کیا جس کا سلسلہ ۱۳۷۷ھ تک جاری رہا۔ ۱۳۴۰ھ میں دوبارہ آپ کی گرفتاری عمل میں آئی جس میں دو سال تک آپ مقید رہے، اسی دوران کراچی کا مشہور مقدمہ پیش آیا تھا، اس طرح آپ نے متعدد بار قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اسی طرح آپ نے تحریک مدحِ صحابہؓ میں بھی قائدانہ رول ادا کیا تھا۔ ساری زندگی سیاسی، سماجی، علمی اور تدریسی سرگرمیوں سے معمور رہی۔ آپ کی ذات بے پناہ صلاحیتوں کا مجموعہ تھی۔ علم وفضل، زہد وتقویٰ عبادت وریاضت، فہم وفراست، تفکر وتدبر اور اتباع سنت میں آپ کی نظیر بہت کم ملے گی۔ ان تمام مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیفی سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ کی تالیفات میں خودنوشت سوانح حیات ''نقشِ حیات'' دو جلدوں میں ''اسیرِ مالٹا''، ''الشہاب الثاقب'' اور دیگر مختلف رسالے اور کتابچے زیادہ مشہور ومقبول ہوئے۔ ۱۳ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء کو یہ آفتاب علم ومعرفت دیوبند میں غروب ہوگیا اور قبرستان قاسمی میں تدفین عمل میں آئی۔

فاروقیؒ، مولانا ظفر الملک صاحب علویؒ ایڈیٹر الناظر لکھنؤ و سکریٹری مدح صحابہ آئینی کمیٹی، مولوی وحید الحسن صدیقی ایڈوکیٹ، مولوی محی الدین قائدؔ ایڈیٹر الجمعیۃ دہلی، جناب اعظم علیؒ رئیس لکھنؤ، مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ مدیر النجم لکھنؤ اور مولوی سیّد محمد محسن حسنیؒ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ دیر تک کی بحث و تمحیص کے بعد مولوی سیّد علی حسن قدوائی جونپوریؒ نے جونپور کے گذشتہ ایجی ٹیشن کی مفصل روداد بیان کرتے ہوئے مدحِ صحابہ کی قانونی حیثیت و اہمیت کو واضح کیا۔ مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے ان تمام نوٹسوں کی مزید وضاحت چاہی جو مختلف اوقات میں حکومت کی طرف سے مدحِ صحابہؓ کی مخالفت میں جاری ہوتے رہے تھے، چنانچہ سکریٹری آئینی کمیٹی نے ان تمام نوٹسوں کی اصل کاپیاں اور ان کے اردو تراجم پیش کیے جس میں مدحِ صحابہ کا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی دکھلایا گیا کہ انگریزی کے اصل نوٹسوں میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے اسمائے مبارک پر مدحِ صحابہؓ کے تناظر میں خاص طور سے حکومت نے زور دیا تھا، اس ضمن میں یہ مسئلہ بھی آیا کہ قانون کا مقصد علی الاطلاق ہے اور نوٹسوں کے تعینات غیر محدود ہیں۔ یہ نشست ساڑھے بارہ بجے ختم ہوئی۔

دوسری نشست

سہ پہر کو ایک خصوصی میٹنگ بند کمرے میں ہوئی جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ دارالعلوم دیوبند، سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند، امام اہلِ سنّت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ، ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ نائب امیر شریعت بہار، علامہ سیّد سلیمان ندویؒ، مولوی سیّد علی حسن قدوائی جونپوری، مولانا ظفر الملک علویؒ لکھنؤ، مولوی محمد احمد کاظمیؒ ایم۔ ایل۔ اے الٰہ آباد، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ، مولوی محی الدین قائدؔ ایڈیٹر الجمعیۃ دہلی، اور مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ لکھنؤ وغیرہم شریک تھے، یہ نشست مسلسل تین گھنٹے تک جاری رہی اور جنرل میٹنگ تک جو اس کے بعد ہونا تھی اس کی کارروائی چلتی رہی۔ اس میٹنگ میں لکھنؤ اور یوپی کی خصوصی صورت حال پر غور کیا گیا۔ مدحِ صحابہؓ پر جزوی بندش اور اس قسم کی بندش کی وجہ سے مداخلت فی الدین کے مسئلہ پر بھی کھل کر بحث ہوئی اور اہم مسائل پر علماء کے درمیان اتفاق رائے ہوگیا۔

جنرل میٹنگ کا آغاز

مذکورہ نشست کے فوراً بعد جنرل میٹنگ کا آغاز ہوا اور جناب احسان الرحمٰن صاحبؒ بیرسٹر کی تحریک پر ڈاکٹر سیّد عبدالعلی حسنیؒ ایم بی بی ایس سابق ناظم ندوۃ العلماء صدر جلسہ قرار پائے۔ اس میٹنگ میں خصوصی مشاہیر کے علاوہ تقریباً ڈھائی سو دیگر اہل الرائے حضرات بھی شریک تھے جس میں مذکورہ بالا اکابرین کے علاوہ حسب ذیل حضرات کے اسمائے گرامی لائقِ ذکر ہیں۔

مولانا قطب الدین عبدالوالی عرف قطب میاں فرنگی محلیؒ، مولوی محمد نسیم بیرسٹرؒ، چودھری نعیم اللہ بیرسٹرؒ، مولوی سیّد ظہور احمد ایڈوکیٹؒ، مولانا عنایت اللہ فرنگی محلیؒ، مولانا محمد شفیع فرنگی محلیؒ، مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری فرنگی محلیؒ، مولانا محمد عتیق فرنگی محلیؒ، مولانا عبدالمومن فاروقیؒ مدیر النجم لکھنؤ، مولانا عبدالسلام فاروقیؒ صدر تحفظ ملت کمیٹی لکھنؤ، مولانا محمد ناصر فرنگی محلیؒ مولانا امام الدین پشاوریؒ، علامہ انور صابریؒ مدیر استقلال دیوبند، خان بہادر سیّد احمد حسین رضویؒ لکھنؤ، حکیم خواجہ کمال الدینؒ لکھنؤ، حکیم عبدالمعید صاحبؒ لکھنؤ، حکیم عبدالحسیب صاحب لکھنؤ، ڈاکٹر عبدالحمید صاحبؒ سابق سول سرجن لکھنؤ میڈیکل کالج، چودھری خلیق الزماں صاحبؒ چیرمین میونسپل بورڈ لکھنؤ، انیس احمد عباسیؒ ایڈیٹر حقیقت لکھنؤ، مولوی عبدالرؤف عباسیؒ ایڈیٹر حق لکھنؤ، مولوی محمد اسماعیل صاحب اسلم لکھنویؒ ایڈیٹر نقارہ لکھنؤ، جناب امین سلونویؒ ایڈیٹر انڈیپنڈنٹ نیوز سروس لکھنؤ، مولوی حامد علی ندویؒ ایڈیٹر ناخدا لکھنؤ، جناب عبدالجلیل صاحبؒ مالک اخبار ہمدم لکھنؤ، جناب شیخ محمد مستنصر اللہ صاحبؒ گورنمنٹ کنٹریکٹر لکھنؤ، مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علویؒ استاد عربی لکھنؤ یونیورسٹی، جناب ضیاء الدین کرمانیؒ استاد لکھنؤ یونیورسٹی، شیخ مشرف حسینؒ بیرسٹر اور مولوی وحید الحسن صدیقی ایڈوکیٹ۔

کارروائی شروع کرتے ہوئے مولانا لکھنویؒ نے اس اجتماع کی وجہ انعقاد بیان کی اور اس دعوت پر آنے والے علماء و دانشوروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اور موجودہ تحریک کی مذہبی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم محض اس لیے یہاں مجتمع ہوئے ہیں کہ اس مسئلہ خصوصی کو شرعی اور سیاسی حیثیت سے سلجھا کر امت مسلمہ کے سامنے کوئی متفقہ پروگرام پیش کرسکیں۔ آپ نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ ہماری جماعت علماء تقریباً اس بات پر متفق ہو چکی ہے کہ مدحِ صحابہ

کے متعلق حکومت کا موجودہ رویہ صراحتاً مداخلت فی الدّین ہے اس لیے ہمیں فرض کفایہ کے طور پر اس قانون سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ حضرت مولانا اپنی بات ختم کر کے بیٹھنے ہی کو تھے کہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلیؒ اُٹھ کھڑے ہوئے اور تعریض کے طور پر کہا کہ پہلے تو ہم کو یہ بتلایا جائے کہ کیا ہمیں یہ جماعتِ علماء کا فیصلہ سُنایا گیا ہے یا ہم سے مشورہ لیا جارہا ہے؟ مولاناؒ نے پھر اپنے الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ خصوصی میٹنگ میں جو حضراتِ علماء شریک تھے ان کا یہ متفقہ فیصلہ ہے اور جو لوگ وہاں شریک نہیں ہو سکے تھے ان سے یہ دریافت طلب مشورہ ہے مگر مولوی عنایت اللہ نے پھر نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی سابقہ رائے دُہراتے ہوئے مداخلت فی الدین کے ہونے یا نہ ہونے پر کچھ گفتگو کرنا چاہی جس پر مولوی محمد نسیم بیرسٹرؒ نے سیاسی اور شرعی حیثیت سے اس مسئلہ پر غور و فکر کرنے کی حاضرین سے درخواست کی۔ مولوی عنایت اللہ صاحبؒ کے اس اختلاف سے مجمع میں کسی قدر برہمی پیدا ہوگئی تھی مگر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی صدر مجلسِ احرار کی تقریر سے مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ آپ نے پرزور الفاظ میں موجودہ تحریک مدحِ صحابہ کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ہم سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے کسی ایک دن کے کروڑویں حصہ سے بھی اپنا مذہبی حق یعنی مدحِ صحابہ کرنا ترک نہیں کر سکتے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ اگر حکومت ہمارے اس حق واجب کو تسلیم نہیں کرے گی تو ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔

مولوی امام الدین پشاوری کا اختلاف

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کی تقریر پر مولوی امام الدینؒ نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ پہلے تمام علماء خواہ وہ احراری ہوں یا وہابی، بدعتی ہوں یا کوئی اور، سب مل بیٹھ کر اس بات پر اتفاق کرلیں کہ آیا حکومت کی یہ ممانعت مداخلت فی الدین ہے بھی یا نہیں، اسی دوران مجمع نے آپ کو بیٹھ جانے کے لیے چیخنا شروع کیا تو آپ یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ میں اس مسئلہ میں کسی قسم کی سیاست کی آمیزش کو پسند نہیں کرتا لیکن مدحِ صحابہ ممنوع ہو جائے اسے کوئی بھی صاحبِ ایمان مسلمان گوارا نہیں کر سکتا۔ مولوی امام الدینؒ کے بعد مولانا احمد سعید صاحبؒ نے مداخلت فی الدین ہونے پر لفظی تصریحات پیش کیں اور کہا کہ اگرچہ آغاز کار میں اس تحریک کے خطرناک ہونے کا

اس قدر اندازہ نہ تھا، محض چند غیر ذمہ دار اور پُر جوش مسلمانوں کی گرفتاری سے اس مسئلہ کو جماعتی مسئلہ بنا دینے کے لیے کسی کو ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیے تھا مگر اب اس مجبوری کو کیا کیا جائے کہ اب یہ چیز جماعتی مسئلہ بن گئی ہے اور عوام میں جوش وخروش پیدا ہو جانے کی وجہ سے اب اسے بغیر جماعتی سوال بنائے ہمارے لیے کوئی چارۂ کار بھی نہیں ہے۔ آپ نے لکھنؤ کی دو جماعتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ ایک تو آئینی جماعت ہے جو حکومت سے مل کر نرم طریقہ سے اس قانون کو توڑنا چاہتی ہے اور دوسری جماعت پُر جوش نوجوانوں کی ہے جو قربانی اور احتجاج کر کے قانون کی خلاف ورزی کرنا چاہتی ہے۔ آپ نے ان دونوں جماعتوں کو متحد ہو کر کام کرنے کی تلقین کی اور کہا کہ اگر یہ بھی اپنا اصول باقی رکھیں اور وہ بھی اپنا طریق کار نہ بدلیں پھر بھی اتفاق و اتحاد کے ساتھ بغیر کسی مخالفت کے کام کرتے رہیں تو یہ سب سے زیادہ انسب بات ہوگی۔

اکابرینِ ملّت کی آراء

مشہور بیرسٹر چودھری نعیم اللہ صاحبؒ نے آئینی کمیٹی کی جدوجہد اور مختلف اوقات میں ڈپٹی کمشنر سے وفود کی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اب ہمیں ایک متفقہ مطالبہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ نے بتایا کہ حکومتِ وقت عوام کی قوت وعمل کو دیکھ کر ہی مطالبات تسلیم کیا کرتی ہے، مجھ سے خود ڈپٹی کمشنر نے بارہا سنیوں کے مطالبہ کی توضیح کرانی چاہی مگر میں آپسی اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے کوئی صحیح نقطۂ نظر نہیں پیش کر سکا۔ اس سلسلہ میں آپ نے آئینی جماعت کی پوزیشن کو بھی نہایت انسب طریقہ پر واضح کیا اور اس کی حمایت کی۔

یوپی کی مسلم سیاست میں ایک نمایاں مقام کی مالک شخصیت چودھری خلیق الزماں صاحب نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ایک متحدہ کمیٹی بنائی جائے تاکہ وہ اپنا ایک متفقہ میمورنڈم تیار کر کے حکومت کے سامنے پیش کرے لیکن اس کے مرتب کرنے میں یہ خیال رکھا جائے کہ اپنے ہاتھ سے کوئی ایسی چیز نہ نکلنے پائے جو آئندہ فریقِ ثانی کے لیے ہمارے خلاف ایک ہتھیار بن جائے۔

مولانا احمد سعید صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند نے فرمایا کہ مجلس احرار کی طرف سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے اپنا مطالبہ پیش کر دیا ہے اب آئینی جماعت کے حضرات بھی اپنا مطالبہ پیش کر دیں تاکہ متفقہ طور پر سارے مطالبات طے کر لیے جائیں، اس پر مولانا ظفر الملک

صاحب علویؒ نے سکریٹری مدح صحابہ آئینی کمیٹی کی حیثیت سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے طریقۂ کار سے اختلاف کیا اور بتایا کہ جن لوگوں کی گرفتاری سے یہ خطرناک صورت پیدا ہوئی ہے وہی لوگ خود اس کے ذمّہ دار ہیں ورنہ حکومت از خود اس قسم کی پیش قدمی کرنے کے لیے پہلے سے آمادہ نہ تھی اس کا اعلان صرف تین دن کی بندش پر ہی مشتمل تھا مگر بعض پُر جوش مسلمانوں کی قبل از وقت سخت گیری سے حکومت نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ آپ نے آئینی جماعت کی وکالت کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ ہمارے اور مجلس احرار کے مطالبہ میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے ہمارے سکوت کی وجہ صرف کاغذات اور گذشتہ احکام وفرامین کی تلاش تھی ورنہ جوان کا مقصد ہے وہی ہمارا مقصد ہے اور یہ بھی کہا کہ ہم لوگ اس نوجوان پارٹی کے ساتھ اب تک صرف اس وجہ سے متحد نہیں ہوئے تھے کہ اوّلاً ان کے یہ اقدامات ایک انفرادی جذبے کے ماتحت صادر ہوئے تھے اور ثانیاً یہ بھی سوچا گیا کہ سیاسی حیثیت سے جب تک کوئی متفقہ پروگرام طے نہ ہو جائے ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے مسئلہ اور بھی الجھ جائے لہٰذا ایسی صورت میں جب تک کہ ہم ان غریب قیدیوں اور تحریک میں شریک ہونے والے مسلمانوں کے گھر والوں کے اخراجات اور ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے کا سامان نہ کرلیں اس وقت تک کوئی قدم آگے نہ بڑھائیں کیونکہ ہماری غریبانہ زندگی اور فقیرانہ طرزِ معیشت ہرگز اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ شخصی قربانی ادا کرنے والوں کے گھریلو شیرازے کو منتشر اور پراگندہ کردیں۔

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا بیان

بار بار لوگوں کے اس سوال پر کہ حکومت کی جانب سے امتناعِ مدحِ صحابہ کا حکم مداخلت فی الدین ہے کہ نہیں اور اس میں مسلمانوں کو کس نوعیت سے کہاں تک قربانی پیش کرنی چاہیے؟ اس سوال پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ (م ۱۹۵۷ء) کھڑے ہوئے اور دینی نقطۂ نظر سے بہت پر زور الفاظ میں مسئلہ مدحِ صحابہ کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے بتایا:

> ”مدحِ صحابہ امر مستحب ہے اور ایک مستحسن عمل ہے۔ شرعی اصول ہے کہ جب کوئی ظالم جماعت، فرد یا جابر حکومت اور جفا کار داعی کسی امر مستحب کی بندش کرے اور مسلمانوں کو مجبور کرے تو شرعاً اس امر کا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور منع کرنے والی جماعت کا یہ فعل مداخلت فی الدین کہا جاتا

ہے جس طرح گائے کی قربانی مستحب ہے لیکن جب غیر مسلم افراد کی طرف سے اس پر امتناعی نوٹس جاری ہو تو اُس وقت مسلمانوں کے ذمہ یہ قربانی واجب ہو جاتی ہے اسی طرح صحابہؓ کی مدح کرنا بھی ایک امر مستحب تھا مگر حکومت کی دخل اندازی کی وجہ سے اب سارے مسلمانوں پر واجب ہو گیا ہے کہ وہ دامے درمے سخنے جس طرح بھی ممکن ہو اس قابل نفرت قانون سے گلو خلاصی حاصل کریں۔ اگر یہاں کے مقامی مسلمان اس سلسلہ میں قربانی دیتے دیتے اکتا جائیں یا ہمت ہار جائیں تو پھر قرب و جوار کی بستیوں کے رہنے والے مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔"[1]

اس تقریر کے بعد مولانا ظفر الملک علویؒ (م ۱۹۴۶ء) نے بڑے احترام و عقیدت اور اظہارِ ارادت کے ساتھ حضرت مدنیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ پہلے اس قربانی میں شریک ہونے والوں کے خرچ و اخراجات اور خاندانی ذمہ داریوں سے ان کے عہدہ برآ ہونے کا مکمل انتظام کیا جائے۔ اگر شرعی حیثیت سے مسئلہ مدحِ صحابہؓ انتہائی اہم ہے تو پھر سب سے پہلے علماء اور سیاسی لیڈروں کو اس میدان میں اترنا چاہیے، صرف غریبوں اور فلاکت زدہ مسلم عوام کو جیلوں میں ٹھونس دینے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد مولانا احمد سعید صاحب (م ۱۹۵۹ء) نے جلسہ کی نبض پہچان کر بڑے خوشگوار انداز میں اپنی تقریر میں کہا کہ اگرچہ اس کام کا آغاز ذمہ دار حضرات ہی نے کیا تھا مگر اب عام جوش و خروش کی بنا پر یہ کام جماعتی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے اس لیے اب کوئی قدم پیچھے نہیں ہٹایا جا سکتا ہے اور آئینی و غیر آئینی دونوں جماعتیں اپنے اصولِ کار کو باقی رکھتے ہوئے اتحاد و اتفاق کے ساتھ اس جنگ کو جیتنے کی کوشش کریں۔ مطالبہ دونوں جماعتوں کا ایک ہے اور طریقۂ کار بھی دونوں کے محمود ہیں اس لیے اختلافی داغ بیل ڈالے بغیر بھی جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے۔

اس تقریر کے بعد متفقہ طور پر ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا جس کے لیے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے اپنی جماعت مجلس احرار کی طرف سے مولوی محمد احمد کاظمیؒ، مولوی محمد اسماعیل ذبیح، مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوریؒ اور بابو محمد نسیم میونسپل کمشنر کا نام پیش کیا اور آئینی کمیٹی کی طرف سے مولوی محمد نسیم ایڈووکیٹ، سیّد ظہور احمد ایڈووکیٹ، چودھری نعیم اللہ ایڈووکیٹ، مولانا ظفر الملک علوی، خان بہادر سیّد احمد حسین رضوی اور چودھری خلیق الزماں کے نام پیش کیے گئے۔ ان حضرات پر مشتمل اس نئی کمیٹی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ دونوں جماعتوں کا متفقہ مطالبہ مرتب کر کے اور آئینی

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۵ ستمبر ۱۹۳۶ء

طریقۂ کار میں سہولت پیدا کر کے حکومت سے گفت وشنید کی جائے۔

آخری نشست

اسی دن نمازِ مغرب کے بعد حضرت مولانا لکھنویؒ گذشتہ نشستوں میں طے کیا ہوا علماء کا تفصیلی فیصلہ سنانے کے لیے کھڑے ہوئے خطبۂ مسنونہ کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ تلاوت کی۔ وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔[1]

یعنی اور جو لوگ مہاجرین وانصار کے بعد یہ کہتے ہوئے آئیں کہ اے ہمارے رب! بخش دے ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان میں ہم سے سابق تھے اور ہمارے دلوں میں ان ایمان والوں کی دشمنی نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! یقیناً تو نرمی کرنے والا مہربان ہے۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا:

> ’’آپ حضرات علمائے کرام کی زبان سے سن چکے ہیں کہ مدحِ صحابہ ایک ضروری امر اور شعار اہل سنت وجماعت ہے اور اس پر کسی قسم کی بندش کا عائد کرنا مداخلت فی الدین ہے، لہٰذا یہ آیت کریمہ میں نے اسی مناسبت سے تلاوت کی ہے کہ آپ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ درحقیقت قرآن مجید کی تعلیم بھی یہی ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ مہاجرین اور انصار کے بعد قیامت تک جتنے بھی مسلمان ہوں گے ان سب کا وظیفہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ مہاجرین وانصار کے لیے دُعائے مغفرت کرتے رہیں، ان کا ذکر جمیل قائم رکھیں اور ان کی عداوت سے خدا کی پناہ مانگتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ خلفائے راشدینؓ بھی مہاجرین وانصار میں ہی ہیں بلکہ مہاجرین و انصار کی جماعت میں وہ ایک بے مثال امتیازی شان رکھتے ہیں لہٰذا ان کا ذکر جمیل قائم رکھنا بدرجۂ اولیٰ ہمارا وظیفہ اور ہمارا شعار ہونا چاہیے۔
>
> ابھی آپ حضرات نے بعض علمائے کرام سے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے ایک قول کا حوالہ سُنا مگر اس مجمل حوالہ سے اصل واقعہ آپ کی سمجھ میں نہ آیا ہوگا لہٰذا میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حضرت امام ربانیؒ کے مکتوبات شریفہ مطبوعہ امرتسر، دفتر دوم کے حصۂ ششم میں ایک مکتوب سامانہ ضلع لدھیانہ کے رئیسوں اور قاضیوں کے نام ہے۔ مقام مذکور میں خطیب نے عیدالاضحیٰ کے خطبہ میں خلفائے راشدینؓ کا ذکر ترک کر دیا تھا اس کے متعلق حضرت ممدوحؒ نے یہ مکتوب سامانہ کے ذمہ دار حکام اور جلیل القدر باشندوں کے نام لکھا تھا جس کے ابتدائی الفاظ

---

[1] سورۂ حشر: ۱۰

یہ ہیں کہ:— بعد سلام مسنون! سنا گیا ہے کہ سامانہ کے خطیب نے عیدالاضحیٰ کے خطبہ میں حضرات خلفائے راشدینؓ کا تذکرہ (عمداً) ترک کردیا ہے اور ان کے مقدس نام تلاوت نہیں کیے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ جب مسلمانوں نے اُس کی اِس غلطی پر ٹوکا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے سہو ونسیان کی عذرخواہی کرتا سرکشی پر آمادہ ہوگیا اور کہنے لگا کہ اگر میں نے حضرات خلفاء راشدین کے نام نہیں لیے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ سامانہ کے اکابر وعمائد خطیب کی اس حرکت پر چشم پوشی سے کام لینے کا ارادہ کررہے ہیں اور خطیب سے انصاف کے ساتھ کسی قسم کی سختی اور درشتی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کا ذکر اگرچہ خطبہ کے شرائط میں سے نہیں ہے مگر اہل سنّت کے شعائر میں سے ہے، لہٰذا اس شعار کو قصداً سرکشی کے ساتھ کوئی شخص ترک نہیں کرسکتا مگر وہی کہ جس کا دل مریض ہو اور اس کا باطن خبیثؒ ہو۔ اس کے بعد حضرت مجدد قدس سرہٗ نے افضلیت شیخین کا متفق علیہ عقیدہ ہونے، صحابہ وتابعین کا اس پر اجماع کرنے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اسّی سندوں بلکہ اس سے بھی زائد اسانید کے ساتھ اس عقیدہ کے مروی ہونے کو ثابت فرما کر لکھا ہے کہ ایسا بدبودار پھول (یعنی خطبہ میں خلفائے راشدینؓ کا ذکر ترک کرنا) ابتدائے اسلام سے اس وقت تک ہندوستان میں معلوم نہیں کہ کبھی پہلے کِھلا ہو، اب وقت آ گیا ہے کہ اس ہنگامہ سے پورا شہر متاثر ہوجائے اور ہندوستان کا امن وامان خطرہ میں پڑ جائے۔ سلطان وقت نصر اللہ علیٰ اعداء الاسلام پکا سنّی حنفی ہے، اس کے زمانے میں اس قسم کی بدعت کا رائج کرنا حقیقت میں خود بادشاہِ وقت کے خلاف خروج ومعارضہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ موجودہ وقت کے علمائے عظام اور اعیان ملّت اس بدعت کو پھیلتے دیکھ کر کیوں سکوت اختیار کیے ہوئے اپنے کو بری الذمہ سمجھے ہوئے ہیں۔[1]"

آخر میں مولانا لکھنویؒ نے حکومت کے اعلان آزادیٔ مذہب پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ مدح صحابہ کرنا ہمارا مذہبی حق ہے، آپ نے مسلمانوں کو ان کے اکابر کے طریقۂ کار سے روشناس کراتے ہوئے موجودہ قانون امتناع مدحِ صحابہ کو مداخلت فی الدین قرار دیا۔[2]

دیگر علماء کی رائیں

علماء کانفرنس میں شرکت کرنے والے حضرات واکابر کے اسمائے گرامی اوپر مذکور ہوچکے

---

[1] اس مکتوب گرامی کی اصل عبارت مکتوبات امام ربانی حصہ ششم دفتر دوم مع حواشی وشرح مرتبہ مولانا نور احمد صاحب، نور کمپنی ۱۷۴، انارکلی لاہور کے صفحہ ۴۴ تا ۴۶ پر درج ہے۔ [2] النجم لکھنؤ، ۲۵ ستمبر ۱۹۳۶ء و ۱۹ ستمبر ۱۹۳۹ء

ہیں، ان اکابر کے علاوہ اور بھی متعدد علماء وزعماء ملت ایسے تھے جو اس کانفرنس میں اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر شرکت نہیں کر سکے تھے لیکن انھوں نے اپنی آراء تحریری طور پر داعیانِ کانفرنس کے پاس روانہ کردی تھیں، ہم ان تحریری آراء میں سے کچھ اہم حضرات کے خیالات پیش کر رہے ہیں جس سے تحریک مدحِ صحابہ پر مزید روشنی پڑے گی۔

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب[۱]

سابق صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی کا بیان

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ (م ۱۹۵۲ء) اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر علماء کانفرنس لکھنؤ میں شرکت نہیں فرما سکے تھے اس لیے آپ نے اس تحریک کی تائید میں ایک تحریری بیان بھیجا تھا جو حسب ذیل ہے:

"لکھنؤ میں امتناع مدح صحابہ کے سلسلہ میں جو قیامت خیز تلاطم برپا ہے اس کی ذمہ داری حکام کے ناعاقبت اندیشانہ رویہ پر ہے، صحابۂ کرامؓ کی مدح وثنا پر قانونی پابندی عائد کرنا اور اس کو جرم قرار دینا ایک ایسی کھلی ہوئی غلطی ہے جس کی کوئی صحیح توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اگر مسلمان اس کو ناقابلِ

---

[۱] مولانا مفتی کفایت اللہ بن عنایت اللہ صاحب ۱۸۷۵ء میں محلہ سن زئی شاہجہانپور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی طور پر مختلف مکاتب میں حاصل کر کے مدرسہ شاہی مراد آباد پہنچے، جہاں اس وقت کے مشہور اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا۔ دو سال کے بعد ۱۳۱۲ھ میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند پہنچے جہاں سے ۱۳۱۵ھ میں تعلیم مکمل کر کے فراغت حاصل کی۔ یہاں جن اکابر سے آپ نے پڑھا ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، حضرت مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھیؒ، مولانا غلام رسول بغویؒ اور جناب مولانا منفعت علی صاحب دیوبندیؒ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آپ اپنے وقت کے بلند پایہ فقیہ ومحدث اور ادیب وشاعر تھے۔ فقہ میں غیر معمولی مجتہدانہ بصیرت، جامعیت اور بے پایاں عبور حاصل تھا۔ اپنے حسن تدبر سے اختلافی معاملات میں مصالحتی روش، دُور اندیشی اور معاملہ فہمی میں یکتائے روزگار تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں سے تھے، مختلف مدارس میں بساطِ درس بچھائی جن میں مدرسہ عین العلم و مدرسہ اعزازیہ شاہجہانپور اور مدرسہ امینیہ دہلی لائق ذکر ہیں۔ آپ کو ہندوپاک کے علماء وعوام کی طرف سے متفقہ طور پر "مفتی اعظم ہند" کا خطاب ملا تھا۔ درس وتدریس کے ساتھ فتاویٰ نویسی اور تصنیف وتالیف کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ ردِ قادیانیت میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اُردو رسالہ تعلیم الاسلام کے چار حصے آپ کی مشہور زمانہ تالیف ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فتوؤں کو مرتب ومدون کر کے "کفایت المفتی" کے نام سے نو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو دہلی میں وفات ہوئی اور یکم جنوری ۱۹۵۳ء کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے جوار میں مدفون ہوئے۔

برداشت سمجھیں اور مداخلت فی الدین قرار دیں تو وہ حکومت کے موجودہ طرزِ عمل کی روشنی میں معذور ہیں، حکومت یوپی کو پوری احتیاط تدبر اور دانشمندی سے اس معاملہ پر غور کرنا چاہیے۔ کسی مجسٹریٹ کی غیر منصفانہ اقتدار پسندگی کی بے جا حمایت کر کے صوبہ کے امن کو برباد کر دینا ہمالیہ جیسی بڑی غلطی ہے جس کو جلد سے جلد دور کرنا لازم ہے۔

ابوالمحاسن مولانا محمد سجّاد صاحبؒ نائب امیر شریعت بہار کا بیان

نائب امیر شریعت حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ (م ۱۹۴۰ء) شروع ہی سے اس تحریک سے وابستہ تھے اور خود بھی اس علماء کانفرنس میں شریک تھے مگر آپ نے ایک تحریری بیان بھی داعیان کانفرنس کو بھیجا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

''صوبہ متحدہ کی حکومت نے لکھنؤ میں صحابۂ کرامؓ کی مدح وتوصیف کو ایک خاص حدود میں ممنوع قرار دے دیا ہے جس کے خلاف ایک عرصہ سے احتجاج جاری ہے۔ ممکن ہے کہ حکومت کو آج تک اس امر کا صحیح احساس نہ ہو کہ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح وتوصیف پر ادنیٰ سی بندش بھی مذہبِ اسلام کی جائز آزادی اور مسلمانوں کے ایک مذہبی حق پر ایسا ناروا حملہ ہے جس کو اسلامی غیرت وحمیت ایک ظلم عظیم تصور کرنے پر مجبور ہے اور انھیں وجوہ سے مدح صحابہؓ کی جائز آزادی میں ایک ادنیٰ سی رکاوٹ بھی بلاشبہ مداخلت فی الدین کے حکم میں ہے۔ اگر حکومت اور حکام نے اس حقیقت کو آج تک نہیں سمجھا تو اب اس کو اس فیصلہ سے جو ۱۷/ستمبر ۱۹۳۶ء کو مقامی اور بیرونی علماء ملّتِ اسلامیہ نے لکھنؤ میں جمع ہو کر غور وخوض کے بعد صادر فرمایا ہے متنبہ ہو جانا چاہیے کیونکہ اس جلسہ میں صرف وہی اکابر علماء شریک نہ تھے جو حکومت کے ساتھ ہمیشہ نبرد آزما رہے ہیں بلکہ ایسے علماء بھی شریک تھے جنھوں نے آج تک حکومت کے خلاف کسی تحریک میں عملاً کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس جلسہ میں ہر مکتبۂ فکر کے علماء اسلام نے تمام واقعات وحالات پر غور کر کے یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ مدح صحابہ کی ممانعت حکومت کی طرف سے مداخلت فی الدین ہے اور اس حیثیت سے مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ اس ناروا حکم کی منسوخی کے لیے ہر ممکن سعی کریں۔ ان واقعات اور حالات کے علاوہ ۱۷/ستمبر کے جلسہ سے مجھ کو اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ اگر حکومت نے حسبِ عادت اس معاملہ میں بھی لیت ولعل کر کے اپنے حکم کی

منسوخی میں زیادہ تاخیر کی تو تمام ہندوستان کے مسلمان مدح صحابہ کی بندش کو توڑنے کے لیے ہر جگہ دوسرے قوانین کی بھی خلاف ورزی شروع کردیں گے جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ مسلمان مبتلائے مصائب ہوں گے بلکہ ہر صوبے کی حکومت بھی مختلف مشکلات میں مبتلا ہو جائے گی۔

مولانا قاری محمد طیّب صاحب[1] سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند کا بیان

مولانا قاری محمد طیّب صاحب (م ۱۹۸۳ء) نے اپنے تحریری بیان میں فرمایا:

''حضرت خاتم الانبیاء جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکباز صحابہؓ کا طبقہ وہ مقدس طبقہ ہے جس کا مداح خود خداوند کریم ہے، جس کی مدح سرائی میں سلطانِ دو عالم جناب محمد رسول اللہ علیہ وسلم یوں رطب اللسان ہوئے کہ تمام انبیاء کے اصحاب میں میرے صحابہ خدا نے منتخب کیے ہیں جس کے ایک ایک مقدس فرد کو حضورؐ نے نجم ہدایت فرمایا ہو، رہروانِ راہِ ہدایت کو ان کی اقتدا کا حکم دیا ہو اور جس پاکباز طبقہ کی مدح سرائی میں امت کے اگلے و پچھلے سب ہی لوگ (بجز ایک فرقہ کے) متفق چلے آرہے ہوں اس مقدس گروہ کی مدح سرائی کے سلسلہ میں آج کس کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے خلاف کوئی آواز اٹھائے یا اس پر کوئی پابندی عائد کرائے اگر حکومتِ وقت اس جائز حق کو سلب کرنے کے لیے آج کوئی اقدام کر رہی ہے تو وہ اپنے تمام مواعید کے خلاف صریح مداخلت فی الدین کی مرتکب ہو رہی ہے، مسلمانانِ عالم کا دل دکھا رہی ہے اور ایک

---

[1] حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب جون ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے لیے داخل کردیے گئے، جب وہاں شعبۂ قرأت قائم ہوا تو آپ اس کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ ۱۹۱۸ء میں دارالعلوم ہی سے تعلیم سے فراغت حاصل کی اور پھر وہیں درس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۲۴ء میں دارالعلوم کے نائب مہتمم مقرر کیے گئے۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کے انتقال کے بعد آپ دارالعلوم کے مہتمم بنائے گئے جس کا سلسلہ زندگی کے آخری دور تک جاری رہا۔ آپ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے بہت ترقی کی۔ آپ بہترین انتظامی صلاحیتوں کے حامل تھے، خطابت کے میدان میں بھی بیحد مقبول اور مسلک دارالعلوم کے نہایت کامیاب ترجمان تھے۔ دُنیا کے بیشتر ممالک کا علمی سفر کیا، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے بیعت و اجازت حاصل تھی اور خود آپ کے بھی مریدین کا سلسلہ بہت وسیع تھا۔ بہت سی کتابوں کے مصنف و مولف تھے اور شعر و سخن سے بھی خاصا ذوق تھا۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو دیوبند میں وفات ہوئی اور قبرستان قاسمی میں مدفون ہوئے۔

غیر مآل اندیشانہ قدم اٹھا رہی ہے۔ ایسی حالت میں لکھنؤ کے حساس دل رکھنے والے مسلمان اپنے دین کے ایک جائز حق کی حمایت میں حکومت کے اس مستبدانہ قانون کے خلاف قولی و عملی احتجاج کر رہے ہیں جس کی رو سے ان کا یہ جائز اور اجتماعی حق غصب کرنے کی سعی کی جا رہی ہے تو وہ بلاشبہ حق بجانب ہیں لہٰذا مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ حتی الامکان حسبِ استطاعت ان کی نصرت و اعانت سے دریغ نہ کریں۔ یہ اعانت اس پاک طبقہ کی اعانت ہوگی جس کا حامی خود خداوند کریم ہے اور اس کے معترف خود رسولِ محترم بھی ہیں، خدا تعالیٰ مسلمانانِ لکھنؤ کی اعانت کرے اور انھیں کامیاب فرمائے۔ آمین[1]۔"

اس بیان پر تائید کرتے ہوئے مولانا مبارک علی صاحبؒ سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا عبدالخالق نافعؒ اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ جیسے اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے بھی دستخط تھے۔

طریقِ کار کا فرق

مدح صحابہ آئینی کمیٹی اور مجلس احرار کی سرکردگی میں کام کرنے والی جماعت دونوں کے مقاصد ایک اور منزلیں ایک تھیں لیکن حصولِ مقصد یعنی امتناعِ مدحِ صحابہ کے قانون کو ختم کرانے کے لیے طریق کار مختلف تھا۔ مجلس احرار اپنی بعض جماعتی مصلحتوں کی بنا پر اس مسئلہ کو ایجی ٹیشن اور قانون شکنی کر کے حاصل کرنا چاہتی تھی خواہ اس کی قیمت مسلمانوں کو کچھ بھی کیوں نہ ادا کرنی پڑے، یہی وجہ ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو عوام کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جس سے مسلمانوں کا نوجوان اور پُر جوش طبقہ میدان میں اتر آیا اور اس نے قانون شکنی اور سول نافرمانی کی شکل اختیار کر لی۔ آئینی کمیٹی اس مسئلہ کو ضابطہ اور قانون کے تحت حل کرانا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ حکومت سے گفت و شنید کر کے اور اپنے جائز حق کو دلائل و شواہد اور افہام و تفہیم کے ذریعہ حل کرائے تاکہ کوئی ٹکراؤ اور نقصان کا باعث نہ ہو۔ آئینی کمیٹی کو اودھ کے مشہور قانون دانوں معززین و عمائدینِ شہر کی ہمنوائی حاصل تھی، خود حضرت مولانا لکھنویؒ کا منشاء بھی یہی تھا وہ بھی قانون شکنی کو پسند نہیں فرماتے تھے اور گفت و شنید ہی کے ذریعہ مسئلہ کو حل کرانے کے حامی تھے۔

---

[1] اخبار النجم لکھنؤ، احتجاج نمبر، ۲۵ ستمبر ۱۹۳۶ء

مجلس احرار کے جماعتی حیثیت سے حصّہ لینے کی وجہ سے اس تحریک نے کچھ سیاسی رنگ اختیار کرلیا تھا، یہ اور بات ہے کہ اس وقت تک سیاست غالب نہ آسکی تھی مگر آئندہ کے لیے ایسے امکانات ضرور پیدا ہوگئے تھے۔

علماء کانفرنس سے جو توقعات وابستہ تھیں وہ خاطر خواہ پوری ہوگئی تھیں، ہندوستان کے ہر گوشہ سے مختلف الخیال علماء کرام جمع ہوئے اور انھوں نے مسئلہ مدحِ صحابہ پر دین و شریعت کی روشنی میں غور و خوض کیا اور متفقہ طور پر فیصلہ دے دیا کہ مدح صحابہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور اس میں کسی قسم کی بھی رکاوٹ ڈالنا یا ممانعت عائد کرنا مداخلت فی الدین ہے۔ علماء کانفرنس کا بس یہی ایک مقصد تھا جو بحمد اللہ پورا ہوگیا تھا۔ کانفرنس اس تحریک کو چلانے یا نہ چلانے کے لیے نہیں بلائی گئی تھی اور نہ اس تحریک کے چلانے کے لیے کسی طریقۂ کار کے تلاش کرنے کے لیے بلائی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں کانفرنس نے کوئی خاص موقف اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی اصولِ کار طے کیا۔ اس کا کام تو صرف یہ تھا کہ دینی حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے اور اس کی شرعی حیثیت متعین کی جائے۔ چنانچہ مدح صحابہ آئینی کمیٹی نے مدح صحابہ کے متعلق علماء کے فتوے فراہم کرکے شائع کیے اور حکومت کے سامنے علماء کی اس رائے کو پوری وضاحت کے ساتھ رکھا کہ اس فیصلہ کی روشنی میں مسلمان کسی بھی حالت میں امتناعِ مدح صحابہ کو برداشت نہیں کرسکتے۔

سول نافرمانی کی یہ تحریک تقریباً پانچ مہینے تک چلتی رہی اور ملک کے مسلم نوجوان، مسلم عوام اور پُرجوش طبقہ لکھنؤ میں اپنی گرفتاریاں پیش کرتا رہا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اس تحریک کی بازگشت پورے ملک میں سُنائی دینے لگی اور ملک کے ہر گوشہ میں حکومت یوپی کی اس ظالمانہ روش پر صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ اس دَور کے جتنے بھی نمایاں اخبارات ورسائل تھے انھوں نے اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا تھا، اسی اثناء میں آئینی کمیٹی کے ذمہ داروں نے ممبرانِ اسمبلی سے بھی گفت و شنید شروع کردی اور خاصی جدوجہد کے بعد ایسی فضا پیدا کردی کہ یوپی اسمبلی کے ممتاز اراکین اس مسئلہ کو ایوان میں اٹھائیں تاکہ وہاں اس مسئلہ پر بحث کی جاسکے چنانچہ ذمہ دار ممبران اسمبلی نے ایوان حکومت میں بھی صدائے احتجاج بلند کی۔

پندرھواں باب

تحریک مدح صحابہ کی یوپی اسمبلی میں گونج
آئینی کمیٹی اور انجم کی خاموش مساعی

۱۰؍نومبر ۱۹۳۶ء کو یوپی اسمبلی میں مدح صحابہ کے متعلق حکومت سے سوالات کیے جانے کی خبریں اخبارات میں مسلسل شائع ہو رہی تھیں اور مقامی مسلمانوں کے احتجاجی مظاہروں سے متاثر قلوب نہایت بے چینی سے اس بارے میں حکومت کا فیصلہ سننے کے لیے بیتاب تھے چنانچہ مذکورہ تاریخ پر جب اس کارروائی کا آغاز ہونے والا تھا کاؤنسل ہاؤس کے اِرد گرد سیکڑوں اور ہزاروں جانثارانِ اصحابِ حضرت سیّد الرسل جمع ہو چکے تھے۔ ہم اس وقت کا سماں پیش کرنے کے لیے اپنے الفاظ کو کوتاہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمان کس بے چینی کے ساتھ ایوان کے اندر بیٹھے ہوئے ممبران کے خیالات اور حکومت کے فیصلوں کا انتظار کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ مسرّت کی بات تو یہ تھی کہ آج مسلم ممبران اسمبلی متفقہ کوشش و کاوش کے بعد ایک نقطہ پر مجتمع نظر آ رہے تھے اور لکھنؤ کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات سے یکساں طور پر سب کے قلوب متاثر نظر آ رہے تھے۔

اعلان کے مطابق ۱۱ بجے دن کو جبکہ یوپی کا اسمبلی ہال مسلم و غیر مسلم ممبران سے بھرا ہوا تھا اور کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی نواب زادہ لیاقت علی خاں[1] نے تحریک مدح صحابہ کے متعلق

---

[1] مسٹر لیاقت علی خاں یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء میں نواب رستم علی خاں آف کرنال کے یہاں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے ۱۹۱۰ء میں علی گڑھ آئے۔ یہاں ۱۹۱۸ء میں امتیازی حیثیت سے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۱۹ء میں انگلستان گئے جہاں سے ۱۹۲۲ء میں قانون کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے یہاں ۱۹۲۶ء میں مسلم لیگ کے سکریٹری جنرل مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی عارضی حکومت میں وزارتِ خزانہ کا قلمدان سنبھالا اور پہلے ہندوستانی کی حیثیت سے ہندوستان کا بجٹ پیش کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہاں کے پہلے وزیر اعظم مقرر کیے گئے، اس کے علاوہ وزیر دفاع اور وزیر خارجہ کا عہدہ بھی سنبھالا۔ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۵۱ء میں انھیں راولپنڈی میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

۲۰/سوالات پر مشتمل ایک مسودہ ایوان میں پیش کیا، ان سوالات کے بعد ممبرانِ اسمبلی میں حاجی نثاراللہ، حافظ محمد ابراہیم، سیّد ظہور احمد ایڈوکیٹ، سیّد یوسف علی اور کنور جمشید علی خاں نے بھی حکومت سے متعدد سوالات کیے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُس روز ایوان میں سوائے مسئلہ مدح صحابہؓ کے اور کوئی دوسری کارروائی نہیں ہوسکی۔ پہلے ان ۲۰ سوالات کو درج کیا جاتا ہے، جس سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ اس روز کس شد و مد کے ساتھ ایوان میں تقریریں کی گئیں جس کے نتیجہ میں حکومت کو شکست ہوئی اور تحریک التواء منظور ہوگئی۔

حکومت سے پوچھے گئے سوالات

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے یوپی اسمبلی میں جو ۲۰ سوالات حکومت کے سامنے رکھے وہ یہ تھے:

۱۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ حکومت نے ۷/جنوری ۱۹۰۹ء کو ایسے احکام نافذ کیے تھے جن کے تحت لکھنؤ میں ۱۰/محرم، ۲۰ صفر اور ۲۱ رمضان[۱] کو اسلام کے پہلے تین خلفاء کی علی الاعلان تعریف ممنوع قرار دی گئی تھی؟

۲۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ حکومت نے اس حکم نامہ میں یہ ظاہر کردیا تھا کہ ان تین دِنوں کے علاوہ سال میں کسی بھی دن خلفاء ثلاثہؓ کی علی الاعلان تعریف کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا؟

۳۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ان پابندیوں پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنے آپ کو گرفتار کرایا تھا؟

۴۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ مسٹر ریڈ یچی ڈپٹی کمشنر لکھنؤ نے ۲۶/مارچ ۱۹۰۹ء کو جو اعلان شائع کیا تھا اس میں سال میں تین دن (۱۰ محرم، ۲۰ صفر اور ۲۱/رمضان) میں پبلک مقامات پر مدحِ صحابہ کرنے پر پابندی عائد کی تھی لیکن بقیہ دنوں میں پولیس سے اجازت لے کر پبلک مقامات پر بھی مدح صحابہ کی جاسکتی تھی؟

۵۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے یکم جون ۱۹۳۶ء کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کی تھی جبکہ

---

[۱] یہ تین تاریخیں تعزیہ داروں اور ان کے جلوس و علم نکالنے کی تاریخ ہونے کی رعایت میں متعین کی گئی تھیں۔ ۱۰ محرم کو عشرۂ محرم، ۲۰/صفر کو چہلم اور ۲۱/رمضان کو شہادت حضرت علیؓ سے نسبت ہے۔

۲/ جون ۳۶ء کو شہر میں میلاد النبی کا ایک جلوس نکلنے والا تھا، اگر ایسا ہوا تو کیوں ہوا؟

۶۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اس حکم کے خلاف احتجاجاً وہ جلوس نہیں نکالا گیا؟

۷۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں کا ایک وفد ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کے پاس گیا اور اُن سے ۱۲/ جون کو جلوس نکالنے کی اجازت مانگی؟

۸۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ اس جلوس کے نکالنے کے لیے پولیس ایکٹ کی دفعہ ۳۰ کے مطابق شہر کے مختلف محلّوں کی پانچ مسلم انجمنوں کی طرف سے ایس۔ پی کو باضابطہ درخواست دی گئی تھی؟

۹۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ۱۹/ جون ۱۹۳۶ء کو ایس پی نے جلوس کے متعلق یہ احکامات دیئے کہ شاہراہِ عام پر کوئی ایسا جلوس نہیں نکالا جا سکتا جس میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی تعریف بیان کی گئی ہو؟ اگر ایسا ہوا تو اس کے کیا اسباب تھے اور کیا اس حکم کے خلاف احتجاجاً یہ جلوس نہیں نکالا گیا؟

۱۰۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ بعض مسلمانوں نے دفعہ ۳۰ پولیس ایکٹ کے تحت ایس پی کو ایک دوسری درخواست دی تھی کہ ۲۸/ جون ۳۶ء کو یوم ابوبکرؓ کے سلسلے میں جلوس نکالنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ مدح خلفاء میں نظمیں پڑھ سکیں؟

۱۱۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ایس پی نے اس درخواست کو نامنظور کرنے کے لیے سٹی مجسٹریٹ سے سفارش کی تھی؟

۱۲۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ سٹی مجسٹریٹ نے جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر ایسا ہے تو اس کے کیا اسباب تھے؟

۱۳۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ مقامی حکام کی طرف سے شاہراہ عام پر علی الاعلان مدح صحابہ پڑھنا منع ہے؟

۱۴۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ گذشتہ جون سے اب تک لکھنؤ کے حکام کی طرف سے دفعہ ۱۴۴ کے تحت یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ٹیلہ کی مسجد[1] کے نصف میل کے رقبہ میں پانچ آدمیوں سے زیادہ لوگ جمع نہ ہوں؟

۱۵۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ان احکامات کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں پر زیر دفعہ ۱۰۷، ضابطہٗ

---

[1] یہ وہ مسجد ہے جو لکھنؤ میں ٹیلہ شاہ پیر محمد لکھنوئیؒ پر دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔

فوجداری مقدمہ چلایا گیا اور اس کی سرسری سماعت کر کے اُن سے بھاری رقمیں بطور ضمانت طلب کی گئیں اور عدم ادائیگی ضمانت میں طویل مدّت کی سزائیں مقرر ہوئیں؟

۱۶۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ لکھنؤ میں بہت سے مسلمانوں پر مدح صحابہ کے سلسلہ میں دفعہ ۱۸۸ کے تحت مقدمہ چلایا گیا اور انھیں قید کی سزائیں دی گئیں؟ اگر ایسا ہوا تو ان کی تعداد کیا تھی؟

۱۷۔ کیا حکومت کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں لکھنؤ کے مقامی حکام کے رویّہ کے خلاف جو انھوں نے مدحِ صحابہ کے سلسلہ میں اختیار کر رکھا ہے سخت ناراضگی پھیلی ہوئی ہے؟

۱۸۔ کیا حکومت اس بات سے واقف ہے کہ اس پابندی سے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کے نزدیک ان کے شہری اور مذہبی حقوق میں مداخلت ہو رہی ہے؟

۱۹۔ کیا حکومت لکھنؤ کے مقامی حکام کو علی الاعلان مدحِ صحابہ کرنے پر مزید روک تھام کرنے سے منع کرنے کو تیار ہے؟

۲۰۔ کیا حکومت اس کے لیے تیار ہے کہ تمام گرفتار شدگان کو رہا کر دے اور ان کے جُرمانہ کی رقموں کو واپس کر دے[۱]؟

ایوان میں ان سوالات کے بعد حاجی نثار اللہ، حافظ محمد ابراہیم، سیّد ظہور احمد ایڈوکیٹ، سیّد یوسف علی اور کنور جمشید علی خاں وغیرہ نے متعدد ضمنی سوالات کیے۔ حاجی رشید الدین نے تو ایوان میں یہاں تک کہہ دیا کہ حکومت شیعوں کی اذانوں پر بھی پابندی لگائے کیونکہ اس سے سنّیوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔

تحریک التوا کی منظوری

حکومت کی طرف سے گول مول، غیر مدلّل اور غیر تشفی بخش جوابات دیئے گئے، بعض سوالات کا جواب اثبات میں دیا گیا اور بعض کی تاویل و توضیح کی گئی لہٰذا مجبوراً نواب زادہ لیاقت علی خاں نے اس بنا پر تحریک التوا پیش کی کہ حکومت نے لکھنؤ کے مقامی حکام کو علی الاعلان مدحِ صحابہ پڑھنے کی ممانعت کر دینے کے احکام سے باز نہ رکھا اس وجہ سے اب ایک اہم اور ضروری

۱۔ النجم لکھنؤ، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۶ء

مسئلہ سامنے آ گیا ہے لہٰذا اس پر بحث کی جائے۔ سر سیتارام صدر کونسل نے اس پر دریافت کیا کہ کیا محرک محترم بیان کریں گے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ تحریک اہم قرار دی جا سکتی ہے۔ نواب زادہ اور حاجی نثار اللہ نے اس کے جواب میں کہا کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کو ان کے مذہبی اور شہری حق استعمال کرنے سے روکا جا رہا ہے اور برابر گرفتاریاں ہو رہی ہیں اس لیے یہ تحریک اہم ہے چنانچہ صدر کاؤنسل نے تحریک التواء کو جائز قرار دیتے ہوئے اس پر بحث کرنے کے لیے اسی دن ڈھائی بجے کا وقت مقرر کر دیا۔ سوالات چونکہ پورے ایک گھنٹہ تک ہوتے رہے اس لیے کوئی اور کام نہ ہو سکا۔ صدر نے تحریک پیش کرنے کے لیے ایوان کی رائے طلب کی تو تمام سنّی ممبران اور کئی دوسرے ہندو ممبر بھی موافقت ظاہر کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں کی تائیدی تقریر

لنچ کے بعد ٹھیک ڈھائی بجے نواب زادہ صاحب نے تحریک التواء پیش کی اور آپ نے اپنی تائیدی تقریر میں کہا:

''میں متعصب نہیں ہوں اور جب کبھی دو فرقوں میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے تو میرے دل کو سب سے زیادہ دُکھ ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حکومت کا موجودہ معاملہ میں کچھ ایسا رویّہ رہا ہے کہ کوئی انصاف پسند شخص خاموش نہیں رہ سکتا۔ مدحِ صحابہ کے سلسلہ میں حکومت رعایا کے جائز حقوق میں مداخلت کر رہی ہے اور جس کام کا ہر شخص کو حق حاصل ہے اسے کرنے سے روک رہی ہے۔ علی الاعلان مدحِ صحابہ پڑھنا سنّیوں کا مذہبی اور شہری حق ہے۔ مدحِ صحابہ پڑھنے کی عام اجازت دینے پر اعتراض یہ کیا جا رہا ہے کہ بعض لوگ خلفائے ثلاثہؓ کی عظمت کو نہیں مانتے اس لیے حکومت کو حق ہے کہ وہ ان اصحاب کے معتقدین کو اپنے بزرگوں کی تعریف کرنے سے روک دے جبکہ یہ دلیل سراسر غیر منطقی اور عقلِ سلیم کے بالکل خلاف ہے، میں ایوان کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اصحاب جن کی تعریف کرنا جرم قرار دیا گیا ہے اسلام کے زبردست محسنوں میں سے تھے اور انہی کی ذات سے ساری دنیا میں اسلام کی روشنی پھیلی۔ یہ حضرات نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص دوستوں اور جاں نثاروں میں تھے بلکہ ان کے قریبی اعزاء میں سے بھی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نبی اکرمؐ کے خسر تھے اور حضرت عثمانؓ و علیؓ آپؐ کے داماد تھے۔ مسلمان ان تمام حضرات کی عزت کرتے ہیں لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان اصحاب کے ماننے والوں کو ان کی تعریف سے روکے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سنّیوں

کو اپنے بزرگوں اور اسلام کے محسنوں کی تعریف سے روکا جائے وہ آخر کس وجہ سے ایسا کرنا چاہتے ہیں، سنّی کسی کو گالی نہیں دیتے تو پھر بگڑنے کی کیا وجہ ہے؟ اگر اس اصول پر دنیا کاربند ہونے لگے تو پھر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عیسائی حضرات جناب عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا تصور کرتے ہیں لیکن مسلمان ایسا نہیں مانتے اس لیے عیسائیوں کو اس کی اجازت نہیں ملنی چاہیے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے خیال کے مطابق تعریف کریں۔ حقیقت اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک میں کسی دوسرے پر سب وشتم نہ کروں مجھے اپنے بزرگوں کی تعریف کرنے کا حق حاصل ہے جس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہیے اور یہی آج سنّیوں کا مطالبہ ہے۔

حکومت نے اپنے آرڈر مجریہ ۱۹۰۹ء میں صاف صاف یہ لکھ دیا ہے کہ ان اصحاب کی علی الاعلان تعریف کو پورے سال نہیں روکا جاسکتا ہے[۱]۔"

ایک اعلان کی یاد

نواب زادہ صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید کہا:

"اس وقت کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ریڈ یچی نے بھی فساد ہونے کے بعد سنّیوں کو اطمینان دلانے کے لیے صاف صاف یہ اعلان کر دیا تھا کہ سنّیوں کو پورے سال مدح صحابہ پڑھنے سے نہیں روکا جاسکتا، مگر مقامی حکام نے نہ صرف تین دنوں کے لیے مدح صحابہ بند کی بلکہ وہ اپنی حد سے گذر کر حکم پر حکم دیتے چلے جارہے ہیں کہ اب مسلمان سال کے کسی دن میں بھی مدحِ صحابہ نہیں پڑھ سکتے۔ ہوم ممبر کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ، میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی حقیقت اور اصلیت سے وہ لاعلم ہیں جس پر مجھے افسوس ہے، بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کی طرف سے اس قسم کا کوئی تحریری حکم شائع نہیں ہوا ہے کہ لکھنؤ میں مدحِ صحابہ علی الاعلان پڑھنا ہمیشہ کے لیے ممنوع ہوگیا ہے۔ جو حکم ہر جمعہ کو دیا جاتا ہے وہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ٹیلہ کی مسجد لکھنؤ کے گرد نصف میل کے اندر پانچ آدمیوں سے زیادہ لوگ جمع نہ ہوں۔ اب اس حکم کی خلاف ورزی کوئی نہیں کرتا مگر جب ایک یا دو آدمی مسجد سے مدحِ صحابہ پڑھتے ہوئے نکلتے ہیں تو ان کو فوراً گرفتار کرلیا جاتا ہے لہٰذا بتایا جائے کہ اب یہ گرفتاری کس جرم اور کس قانون کی رُو سے ہوتی ہے؟ کیا انصاف اسی کو کہتے ہیں[۲]۔"

---

۱ النجم لکھنؤ، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۶ء ۲ النجم لکھنؤ، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۶ء

یو پی اسمبلی میں مدحِ صحابہ

انھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید کہا:

''میں ایوان کی آگاہی کے لیے وہ اشعار بھی پڑھ کر سُنائے دیتا ہوں جن کو لوگ عام طور سے پڑھتے ہیں تو گرفتار کرلیے جاتے ہیں۔ان اشعار میں ایک شعر یہ بھی خاص طور سے پڑھا جاتا ہے:

جن کا ڈنکا بج رہا ہے چار سو لیل و نہار
وہ ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ وحیدرؓ چار یار

میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان اشعار میں کوئی ایسی قابل اعتراض بات ہے جس کی کوئی شخص مخالفت کرے، یہ بات نہایت قابل افسوس ہے کہ حکومت تو یہ کہتی ہے کہ ہر فرقہ کو اپنے مذہبی پیشواؤں کی تعریف کا حق ہے اور مسلمان بھی اپنے بزرگوں کی علی الاعلان تعریف کرسکتے ہیں مگر پھر بھی دفعہ ۱۴۴ کی آڑ میں مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کیا جارہا ہے۔ یہ بات بھی قابل افسوس اور قابل مذمّت ہے کہ حکام دفعہ ۱۴۴ سے زیادہ کسی اور قانون کا غلط طریقہ سے استعمال نہیں کرتے۔ دفعہ ۱۴۴ کا منشا یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ لوگوں کو ان کے جائز حقوق کے استعمال سے روک دیا جائے بلکہ اس قانون کے سہارے عوام کے جائز حقوق کا نفاذ کرانا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ کو غلط استعمال کیا جارہا ہے اور لکھنؤ کے مسلمانوں کو ان کے جائز اور غیر دل آزار حقوق سے محروم کرکے ان کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے، حکومت کے لیے یہ افسر نوازی کی پالیسی نہایت نقصان دہ ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو اور بُرا ہوگا۔ اگر حکومت نے اس طرح اپنے آدمیوں کی حمایت کی تو کیا یہ انصاف کہا جائے گا۔ کیا یہ حکومت کا فرض نہیں ہے کہ وہ اپنے افسروں کو اس چیز سے روکے کہ وہ دوسروں کے جائز حقوق کو غصب نہ کریں۔ مجھے اُمید ہے کہ ایوان میری اس بات کی حمایت کرے گا کہ جب حکومت ہمارے شہری حقوق پر حملہ کرے تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی مخالفت کریں لہٰذا مجھے اُمید ہے کہ تمام ممبر میری اس تحریک سے متفق ہوں گے''[1]

حاجی نثار اللہ ممبر اسمبلی کی تائیدی تقریر

نواب زادہ صاحب کے بعد حاجی نثار اللہ ممبر اسمبلی نے اپنی تقریر کے دوران تحریک التواء کی موافقت کرتے ہوئے کہا:

---

[1] النجم لکھنؤ، ۱۳؍نومبر ۱۹۳۶ء

''آج لکھنؤ میں جوصورتِ حال پیدا ہوگئی ہے اس کی ساری ذمہ داری حکومت پر ہے۔ ۱۹۰۹ء میں جو حکم نامہ حکومت نے تیار کیا تھا اس میں سنیّوں کی نمائندگی اچھی طرح نہیں ہوسکی تھی، دوسرے یہ کہ یہ حکم نامہ ہمیشہ کے لیے کوئی قانون نہیں ہے اور خود اس میں بھی سال بھر کے لیے مدحِ صحابہ کو بند نہیں کیا گیا ہے۔ حکومت کا فرض تھا کہ جب یہ مسئلہ لکھنؤ میں چھڑا تھا تو فوراً ہی اس کا معقول تصفیہ کردیتی مگر ایسا نہیں کیا گیا یہاں تک کہ آج یہ صورت پیدا ہوگئی ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں کے مسلمان کیا جرم کررہے ہیں کہ ان پر اس قسم کی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں۔ اپنے بزرگوں کی تعریف کرنا کوئی جرم نہیں ہوسکتا، ہر فرقہ کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اکابر کی تعریف کرے، کوئی شخص اس پر اعتراض نہیں کرسکتا مثلاً ہندو کرشن جی کی تعریف کریں یا عیسائی حضرت عیسیٰ کی تعریف کریں تو یہ حق کسی کو نہ ہوگا کہ ان کو اپنے بزرگوں کی تعریف کرنے سے روکے۔ اپنے بزرگوں کی تعریف کرنا ہر شخص کا مذہبی اور شہری حق ہے اگر اس حق کے استعمال کو حکومت روکتی ہے تو اس کا رویّہ قابلِ نفریں ہے۔ یہ چیز بڑی افسوسناک ہے کہ موجودہ کشیدگی حکومت کی بدولت ہی پھیلی ہے، حکومت کا رویّہ ہمیشہ یہی رہتا ہے، کہ ایک فرقہ کی طرفداری کرکے دوسرے فرقہ کی ہمدردی کھودیتی ہے، اسی طرح مقامی حکّام بھی بے گناہوں کو گرفتار کررہے ہیں، اور عوام کو پریشان کررہے ہیں۔ لہٰذا میں حکومت سے مطالبہ کروں گا کہ وہ علی الاعلان مدحِ صحابہ پڑھنے کی اجازت دے اور گرفتار شدگان کو فوراً رہا کردے[1]۔''

مولوی فصیح الدین ممبر اسمبلی کا بیان

حاجی نثار اللہ ایم۔ اے کی تقریر کے بعد خان بہادر مولوی فصیح الدین ایم۔ اے نے تحریک کی تائید کرتے ہوئے حکومت کے رویّہ کو سخت قابلِ مذمت بتاتے ہوئے کہا:

''میں جب جون پور (یوپی) میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا تو وہاں بھی شیعہ سُنّی سوال پیدا ہوگیا تھا مگر میں نے کوشش کرکے دونوں فرقوں میں سمجھوتہ کرادیا تھا۔ جب کسی جگہ دو فرقوں میں کشیدگی ہوجائے تو مجھے معلوم ہے کہ حکومت کا کیا فرض ہوتا ہے مگر حکومت یوپی کی موجودہ پالیسی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنیّوں کے مذہب میں صریح مداخلت کررہی ہے۔ لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ

---

[1] النجم لکھنؤ، ۱۳؍ نومبر ۱۹۳۶ء

مجسٹریٹ کو اس قسم کے احکامات نافذ کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ خوب ہے کہ آرڈر میں تو صرف تین دن کے لیے مدحِ صحابہ بند ہے مگر ڈپٹی کمشنر نے پورے سال کے لیے مدحِ صحابہ بند کرادی۔ سنیوں کو یقیناً ان احکامات سے مشتعل ہونا چاہیے اور جو خیالات لکھنؤ کے سنیوں کے ہیں وہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ تمام صوبہ اور تمام ہندوستان کے مسلمان ان احکامات کو ناجائز اور حکومت کی زیادتی سمجھ رہے ہیں، اگر یہ پالیسی جاری رہی تو اس کے نتائج برے نکلیں گے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کل مسلمان آئیں اور اس کا مطالبہ کریں کہ ہم ہندوؤں کے دیوتاؤں کو نہیں مانتے اس لیے دفعہ ۱۴۴ کے ذریعہ ان کو روک دیا جائے کہ وہ ان کی تعریف نہ کریں اور ان کی شان میں کوئی جلوس نہ نکالیں، تب کیا ہوگا؟ لہٰذا حکومت یوپی کا یہ فرض ہے کہ وہ لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر کی موجودہ پالیسی کی مذمت کرے۔ ڈپٹی کمشنر مسلمانوں کے مقتدر اصحاب کو محض مدحِ صحابہ کرنے کے جرم میں جیل بھیج رہے ہیں مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ حکومت خاموش ہے۔ آخر اس بات کی کیا ضرورت پیش آئی کہ ۲۷ برس کے بعد سرکاری احکامات کو اس طرح توڑ موڑ کر اس کی اصل منشاء کے خلاف نافذ کیا جائے۔ صوبہ بھر میں تو ہر جگہ مدحِ صحابہ ہوتی ہے اور کہیں کوئی اندیشہ پیدا نہیں ہوتا پھر آخر یہاں کیسے جھگڑا پیدا ہوسکتا ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر حکومت ایمانداری سے کام کرے اور اپنی موجودہ پالیسی کو ترک کردے تو کوئی تشویشناک صورت پیدا نہ ہوگی اور نہ ہی کوئی کشیدگی پھیلے گی۔"[1]

اس کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے سید علی ظہیر بیرسٹر شیعہ کی وہ تقریر نقل کردی جائے جو انھوں نے ایوان میں نواب زادہ لیاقت علی خاں، حاجی نثار اللہ اور مولوی فصیح الدین ممبران اسمبلی کی تائیدی تقریروں کے بعد مخالفت میں کی تھی جس سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ مدحِ صحابہ کا علی الاعلان پڑھنا شیعوں کے لیے ہرگز کوئی دل آزاری کی بات نہیں ہے بلکہ وہ محض ضد میں اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

سیّد علی ظہیر کی مخالفانہ تقریر اور شیعی نقطۂ نظر

خان بہادر مولوی فصیح الدین کے بعد سیّد علی ظہیر بیرسٹر شیعہ نے ایوان میں اپنی تقریر میں کہا:

---

[1] النجم لکھنؤ ۱۳؍ نومبر ۱۹۳۶ء

"لکھنؤ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے میں یہ چاہتا ہوں کہ صحیح حالات سے ایوان کو مطلع کر دوں، میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں بالکل غیر متعصب ہوں، میں نے کوشش کی تھی کہ اس مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے مگر مجھے کامیابی نہیں مل سکی۔ اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں یہ کہوں گا کہ نواب صاحب (لیاقت علی خاں) یا جس کا جی چاہے میرے گھر کے اندر آ کر مدح صحابہ پڑھ لے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا مگر نہ سب سنی نواب زادہ لیاقت علی خاں ہیں اور نہ سب شیعہ علی ظہیر ہیں۔ حکومت کو ان شیعوں کا بھی تو خیال رکھنا چاہیے جو ایسے نہیں ہیں کہ ان کو مدح صحابہ پر کوئی اعتراض نہ ہو کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ عام شیعہ کو مدح صحابہ پر سخت اعتراض ہے۔

نواب زادہ صاحب یہ صحیح کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے مذہبی حقوق کے استعمال کا حق ہونا چاہیے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں امنِ عامہ کے خیال سے ہر قسم کی آزادی نہیں دی جا سکتی، دوسرے یہ کہ جب کوئی ایسا مسئلہ چھیڑ جائے تو یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ آخر رواج کیا رہا ہے، حکومت نے کہہ دیا تھا کہ نئی چیزوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی پھر یہ ۲۷ برس کی خاموشی کے بعد اب کیا کیا جا رہا ہے۔ شیعوں کو مدح صحابہ پر اتنا سخت اعتراض ہے کہ اگر حکومت بلا تحقیق سنیوں کو اس قسم کی مذہبی آزادی دے دے تو یہاں ۱۹۰۹ء کی جیسی حالت پھر ہو جائے گی، علاوہ اس کے مجھے معلوم ہوا ہے کہ مقامی حکام کا یہ خیال ہے کہ سنیوں کا مطالبہ ان کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ سنیوں کو لازم تھا کہ احکام کی خلاف ورزی کرنے کے بجائے جائز طریقے سے حکومت کے پاس اپنی معروضات لے کر جاتے مگر یہاں تو قانون شکنی شروع کر دی گئی۔ میں جانتا ہوں کہ اس تحریک کی پشت پر کون سی قوتیں کارفرما ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں نے اس تحریک کو چھیڑا تھا اب معاملہ ان کے ہاتھ سے بھی نکل گیا ہے۔ بہرحال اگر میری طرح سے سب شیعہ ہو جائیں تو یہ فیصلہ فوراً ہو جائے مگر وہ اس چیز (مدح صحابہ) کو کبھی نہیں مان سکتے[1]۔"

ہوم ممبر کا جواب

ایوان میں ہوم ممبر نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ حکومت اس تجویز پر غور کرنے کی اس لیے مخالفت کرتی ہے کہ اس سے دونوں فرقوں میں اور کشیدگی بڑھنے کا امکان ہے لیکن میں خوش ہوں کہ مقرروں نے اپنے جذبات پر قابو رکھ کر حکومت پر ہی لعنت و ملامت کی ہے۔ حکومت خود

---

[1] النجم لکھنؤ، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۶ء

اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنا چاہتی ہے مگر ابھی تک اس کے پاس سنّیوں کا کوئی وفد نہیں آیا ہے، حکومت سنّیوں سے اس مسئلہ پر گفتگو کرنے کو تیار ہے مگر جب سنّی خود ہی قانون شکنی کرنے لگیں تو حکومت کا یہ فرض ہے کہ ان غیر آئینی کارروائیوں کو روکے۔ مجھے امیّد ہے کہ شیعہ اور سنّی دونوں اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ وہ دونوں مسلمان ہیں اور ایک خدا اور ایک رسول اور ایک قرآن کو مانتے ہیں۔ میں شیعوں سے اپیل کروں گا کہ وہ کوئی ایسا حل قبول کریں جو ایک حد تک سنّیوں کے مطالبات کو مانتا ہو اور جس سے ان کی تشفی ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ میں سنّیوں سے بھی یہ کہوں گا کہ وہ اکثریت میں ہیں اس لیے ان کو فراخدل ہونا چاہیے۔

ہوم ممبر کی تقریر پر تبصرہ

ہوم ممبر کی تقریر کے بعد حافظ محمد ابراہیم جو بعد میں صوبائی اور مرکزی حکومت میں وزیر اور گورنر بھی رہ چکے تھے اپنے بیان میں کہا:

”سیّد علی ظہیر نے یہ کہا ہے کہ اگر حکومت یا ہوم ممبر کی پوزیشن میں کوئی اور ہوتا اور وہ موجودہ صورتِ حال کو جانتا بھی ہوتا تو وہ حکومت کی پالیسی کو حق بجانب تصوّر کرتا مگر میں کہتا ہوں کہ مجھے حکومت کی موجودہ پالیسی سے ہمیشہ اختلاف ہوتا۔ میں حکومت کے موجودہ رویّہ کی ہر صورت میں سخت مذمت کرتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ حکومت کی عام پالیسی نہایت غیر دانشمندانہ جابرانہ اور بعید از انصاف ہے۔ حکومت ہمارے قانونی حقوق کی محافظت کے لیے بنی ہے نہ کہ ہمارے حقوق سلب کرنے کے لیے سیّد علی ظہیر کا خیال ہے کہ حکومت کو بے تکان آزادی پر پابندی عائد کرنا ہوگی مگر میں کہتا ہوں کہ ہر فرقے کو اس کے مذہبی اور شہری حق میں آزادی ہونی چاہیے مگر باعثِ افسوس بات یہ ہے کہ حکومت کا کام صرف آپس میں لڑانا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مدحِ صحابہ ایک بدعت ہے کیونکہ اس کا حق عرصہ سے استعمال نہیں کیا گیا ہے، چنانچہ مقامی حکّام یہ کہتے ہیں کہ حکومت سے اس حق کی اجازت لاؤ لیکن مختلف ہائی کورٹس کا فیصلہ ہے کہ مذہبی حق کے استعمال کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہے (یہاں پر آپ نے آل انڈیا رپورٹر ۱۹۳۱ء الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک فیصلہ کی رولنگ پڑھ کر سنائی) کبھی حکومت ایک نئی چیز کی بھی اجازت دے دیتی ہے اور کبھی جائز حق پر بھی بندش عائد کر دیتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تین

دن کے لیے سرکاری حکم سے لکھنؤ میں مدحِ صحابہ بند تھی لیکن اب یہ سال بھر کے لیے کس بنا پر روک دی گئی ہے، یہاں تک کہ اب محفل میلاد میں بھی مدحِ صحابہ پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں جو نہایت مذموم اور قابلِ نفرت چیز ہے۔ ہوم ممبر صاحب کہتے ہیں کہ کوئی وفد حکومت کے پاس اب تک نہیں آیا، یہ خوب ہے، اگر ان کے پاس کوئی نہیں گیا تو کیا حکومت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ خود دیکھتی کہ لکھنؤ کے حکام کیا زیادتی کر رہے ہیں، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ حکومت کی محض زبردستی ہے اور اس کی عادت ہے کہ وہ رعایا کے جذبات کا خیال نہیں کرتی۔[1]"

ایک اور مباحثہ

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے جوابی تقریر کرتے ہوئے کہا:

"سیّد علی ظہیر نے تو ایسی تقریر کی ہے جو حکومت کی طرف سے ہونی چاہیے تھی، سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مقامی حکام کی کیوں حمایت کرتے ہیں، مسٹر ریڈیچی نے جب صاف صاف اعلان میں لکھ دیا تھا کہ سنّیوں کو مدحِ صحابہ پڑھنے کا بالکل حق ہے تو پھر اب اس حق سے کس بنا پر مسلمانوں کو محروم کیا جا رہا ہے، دنیا میں کوئی شخص یہ دلیل نہیں پیش کر سکتا کہ کچھ عرصہ تک اگر کوئی شخص اپنا حق علی الاعلان استعمال نہ کر سکے تو پھر ہمیشہ کے لیے وہ اس حق سے محرم کر دیا جائے گا۔ میں حکومت سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر اس نے گرفتار شدگان پر دفعہ ۲۹۸ (مذہبی دل آزاری) کے ماتحت کیوں نہیں مقدمہ چلایا اور قانون کے ماتحت کیوں نہیں عمل درآمد کیا۔ آخر دفعہ ۱۴۴ ہی لگانے کی کیا ضرورت پیش آئی، ہوم ممبر اس چیز کو مانتے ہیں کہ شیعوں اور سنّیوں میں کشیدگی ہے مگر پھر بھی حکومت نے محض اس واسطے اس مسئلہ میں مداخلت نہیں کی کہ اس کے پاس ابھی تک کوئی درخواست یا میموریل نہیں بھیجا گیا تھا، اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ روم کے بادشاہ کی طرح حکومتِ یو پی نینی تال میں بیٹھی رہے خواہ لکھنؤ جلتا رہے، کیا میں یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ ہوم ممبر نے دونوں فرقوں کے نمائندوں کو صلح کرنے کے لیے بلایا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں، بس یہی پالیسی حکومت کی غلط ہے جس پر سب کو اعتراض ہے۔ ہوم ممبر نے یہ بھی کہا کہ مدحِ صحابہ سے دوسرے فرقہ کی دل آزاری ہوتی ہے اس لیے یہ پابندیاں عائد کی گئی ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کون چیز باعثِ دل آزاری ہے اس کا فیصلہ کرنا مجسٹریٹ کا کام ہے یا عدالت کا؟ آخر حکومت ان قیدیوں کو عدالت میں کیوں نہیں لے گئی جہاں اس بات کا فیصلہ ہو جاتا۔ بہرحال

---

1. النجم، لکھنؤ، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۶ء

حکومت کا موجودہ رویہ نہایت مذموم ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومت اپنی موجودہ پالیسی کو ترک کرے گی کیونکہ کسی حکومت کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی ایک فرقہ کو پابند کر دے کہ وہ کبھی بھی اپنے جائز مذہبی اور شہری حق کو استعمال ہی نہ کرے[1]۔"

ہوم ممبر نے اپنی دوسری جوابی تقریر میں کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ لکھنؤ کے حکام پر اتنی بوچھار ہو رہی ہے حالانکہ وہ صرف حکومت کے احکامات پر عمل کراتے ہیں۔ اس کے بعد صدر کاؤنسل نے رائے شماری کے لیے کہا کہ جو لوگ تحریکِ التواء کی موافقت میں ہیں وہ موافقت میں اعلان کریں اور جو مخالفت میں ہیں وہ مخالفت کا اعلان کریں۔

حامیانِ مدحِ صحابہ

جن حضرات نے ایوان میں مدحِ صحابہ کا ریزولیشن پیش کیے جانے کی تائید کی تھی اور آخیر تک وہ اس مسئلہ میں دلچسپی سے حصہ لیتے رہے اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

جناب افضال الدین، سیّد یوسف علی، بھیّا رشید الدین، شیخ امتیاز احمد، نواب زادہ لیاقت علی خاں، حافظ عبدالرحیم، شاکر داد خاں، شیخ حبیب اللہ، کنور جمشید علی خاں، مقصود علی خاں، سیّد حبیب اللہ، زاہد علی سبز پوش، شاہ نوازش علی، حاجی نثار اللہ، سید ظہور احمد، عبید الرحمٰن، غلام حسین خاں حافظ محمد ابراہیم، مولوی فصیح الدین، ہادی یار خاں اور شیخ غضنفر اللہ، ہندو ممبران میں جناب رام دیال، ارجن سنگھ اور دھرم سنگھ جیسے حضرات نے بھی تائید کر کے اپنے حق ہمسائیگی کو ادا کیا[2]۔

مسلم وفد کی گورنر یوپی سے ملاقات

مذکورہ بالا لوگوں کے علاوہ دوسرے ممبران نے بھی ایوان اور ایوان کے باہر صدائے احتجاج بلند کی اور رفتہ رفتہ یہ آگ سارے ملک میں پھیل گئی اور سارا ہندوستان حکومتِ یوپی کی اس ظالمانہ روش سے متنفر ہونے لگا خاص طور سے شہر لکھنؤ اور اس کے اطراف کی یہ کیفیت تھی کہ مسلمانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اس چیز کو بری نظر سے نہ دیکھ رہا ہو اور اپنے قلب میں صحابۂ کرام کے مقدّس ناموں پر یہ ناروا پابندی دیکھ کر گہری اذیت نہ محسوس کر رہا ہو، چنانچہ جب لکھنؤ کا متوسط طبقہ سول نافرمانی کر کے ناموسِ صحابہ پر فدائیت کا مظاہرہ کر رہا تھا تو دوسری طرف لکھنؤ

---

[1] النجم لکھنؤ، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۶ء [2] النجم لکھنؤ، ۱۳ر نومبر ۱۹۳۶ء

کے ممتاز تعلیم یافتہ طبقہ نے ایک آئینی کمیٹی جس کو 'مدحِ صحابہ' کمیٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تشکیل دی اور اس کے ذریعہ آئینی طور پر حکومت سے اس مسئلہ میں گفت وشنید شروع کی اور بڑی محنت اور جستجو کے ساتھ پرانے کاغذات مہیّا کر کے ایک عرضداشت تیار کرا کے گورنر یوپی سر ہنری ہیگ سے ملاقات کی۔ اس عرضداشت کو پیش کرنے کے لیے جو وفد تشکیل دیا گیا اس کے اراکین حسب ذیل تھے:

حاجی محمد نسیم ایڈوکیٹ، صدر مدحِ صحابہ کمیٹی، منشی احترام علی رئیس کاکوری، خان بہادر سیّد احمد حسین رضوی اسپیشل مجسٹریٹ، خان صاحب حافظ محمد حسن آنریری مجسٹریٹ، بابو محمد نسیم میونسپل کمشنر، شیخ مستنصر اللہ میونسپل کمشنر، مولانا عبدالسلام فاروقی، شفاء الملک حکیم عبدالحمید، شفاء الملک حکیم عبدالحسیب، مولوی عنایت اللہ فرنگی محلی، منشی اظہر علی ایڈوکیٹ، سیّد ظہور احمد ایڈوکیٹ، جناب غلام حسین بٹ ایڈوکیٹ اور چودھری نعیم اللہ ایڈوکیٹ۔

یہ عرضداشت پہلے ہی سے گورنر کے ملاحظہ کے لیے بھیج دی گئی تھی پھر ۱۴ر نومبر ۱۹۳۶ء کو باقاعدہ اس وفد نے گورنر سے ملاقات کر کے گفتگو کی، اس وقت گورنر سے جو مطالبات کیے گئے تھے ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ ۱۹۰۹ء کا وہ حکم واپس لیا جائے جس کے تحت لکھنؤ میں دسویں محرم، بیسویں صفر اور ۲۱ر رمضان کے موقع پر علی الاعلان مدحِ صحابہ پڑھنے کی ممانعت کی گئی تھی۔

۲۔ مدحِ صحابہ تحریک کے سلسلہ میں جو لوگ گرفتار یا سزایاب ہوئے ہیں ان کو فوراً رہا کیا جائے۔

۳۔ جن لوگوں پر جرمانے کیے گئے یا جن کا سامان جرمانے کے عوض میں قرق کیا گیا وہ سب واپس کیے جائیں۔

مدحِ صحابہ کمیٹی کو یہ پوری توقع تھی کہ اس کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے اور ۱۹۰۹ء کا حکم منسوخ ہو جائے گا۔ اگر یہ مطالبات منظور نہ ہوئے اور مدحِ صحابہ پر یہ بندش بدستور قائم رہی تو مدحِ صحابہ کمیٹی نے اعلان کیا کہ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور اس وقت کے قانون کے مطابق جو ممبرانِ اسمبلی منتخب ہو کر آنے والے تھے ان کے ذریعہ اس حکم کو منسوخ کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ مدحِ صحابہ کمیٹی ہی کی سعی وکوشش اور جدوجہد سے ۱۰ر نومبر ۱۹۳۶ء کو یوپی اسمبلی میں وہ کامیاب مباحثہ ہوا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

گورنر کا جواب

گورنر یو پی نے ۱۴؍ نومبر ۱۹۳۶ء کو مدحِ صحابہ کمیٹی کی پیش کردہ عرضداشت کے جواب میں ایک تحریری بیان دیا جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"...... ضلع حکام نے مقامی صورتِ حال کے پیش نظر کارروائی کرنے کے ساتھ کئی مہینہ ہوئے ان لوگوں کو جو ان کی کارروائی سے غیر مطمئن تھے اطلاع دی تھی کہ اگر وہ اس مسئلہ کو از سرِ نو اٹھانا ہی چاہتے ہیں تو ان کو آئینی طور پر حکومت سے رجوع کرنا چاہیے اور جب تک کسی حکمتِ عملی کا تصفیہ نہ ہو جائے کسی نئے جلوس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ میرے خیال میں یہ بدقسمتی تھی کہ مختلف اسباب کی بنا پر حکومت کے سامنے معروضات پیش کرنے کی یہ سعی جواَب کی گئی ہے اس سے قبل نہیں کی گئی اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض حلقوں نے یہ خیال کر لیا کہ آئینی ذرائع اختیار کرنے کے بجائے احتجاج کے راستے سے ان کے مفاد کو تقویت پہنچے گی۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی ہے کہ آپ لوگوں نے اس طریقۂ عمل کی تائید نہیں کی، بہر کیف میں ماضی سے بحث کرنا نہیں چاہتا اب جبکہ ہم ایک جگہ جمع ہوئے ہیں ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ مستقبل کے لیے کوئی تصفیہ کا راستہ تلاش کریں۔ اگر ہم کو اس امر کا مبینہ طور پر اطمینان دلا دیا جائے کہ براہِ راست کارروائی اور قانون کے خلاف ورزی موقوف ہو جائے گی تو حکومت اپنی جانب سے بہتر فضا پیدا کرنے کے لیے خوشی سے یہ کارروائی کرے گی کہ اس سلسلہ میں جو جرمانے کیے گئے ہیں ان سب کو بھی معاف کر دے گی[1]......"

گورنر کی اس یقین دہانی پر کہ وہ سنیّوں کی شکایات کی تحقیق کریں گے اور کوشش کریں گے کہ باہم فریقین میں مصالحت ہو جائے، تمام گرفتار شدگان کو رہا کر دیا جائے اور جرمانے و قرقیاں واپس کر دی جائیں، عمائدین اور ذمّہ داروں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں سول نافرمانی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی لہٰذا فی الحال یہ تحریک ملتوی کر دی گئی اور شیعوں کے ساتھ مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی لیکن باوجود ہر قسم کی کوشش کے کوئی مصالحت نہ ہو سکی البتہ یہ ضرور ہوا کہ اسیرانِ مدحِ صحابہ کو رِہا کر دیا گیا اور جرمانے وغیرہ کی رقم واپس کر دی گئی۔ جب قابلِ اطمینان تصفیہ کی کوئی شکل نہ نکل سکی اور مہینوں گذر گئے تو حکومت کی طرف سے اپریل ۱۹۳۷ء میں ایک دوسرا تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کیا گیا۔

---

[1] عرضداشت ص ۱۶-۱۷

سولھواں باب

اَلسَپ کمیشن کا قیام

ہمارے اکابر کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ انھوں نے ہر اس مسئلہ میں جس پر کسی قسم کا اختلاف ہو اس میں اعتدال کی راہ اپنائی ہے اور کبھی کسی مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنا کر زبردستی اپنی بات دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ یہی روش لکھنؤ میں شیعہ سنّی اختلافات کے سلسلہ میں بھی رہی۔ علمائے اہلِ سنّت اور عمائدین ملّت نے ان اختلافات کو ہمیشہ کم سے کم کرنے کی کوشش کی اور طاقت کے زور سے ان مسائل کو حل کرنے سے برابر احتراز کیا بلکہ عام پالیسی یہی رہی کہ باہمی مفاہمت اور رواداری سے کام لیتے ہوئے کوئی پر امن اور پائیدار سمجھوتہ ہو جائے مگر ضروری ہے کہ یہ جذبہ دونوں فریق میں یکساں طور پر ہو جب ہی کوئی درمیانی راہ نکل سکتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں اہلِ سنّت نے شیعوں سے رواداری اور وسیع القلبی کا معاملہ رکھا اور ان کی ہر اس بات کو جس سے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچے نظر انداز کیا مگر خود شیعوں کی روش ہمیشہ اس کے خلاف رہی اور انھوں نے کبھی جذبۂ رواداری کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ اپنی مرضی اور ضد کو دوسروں پر تھوپنے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ ان کا یہی طرزِ عمل لکھنؤ کے حالات میں بھی بدستور قائم رہا، عوام تو عوام ہیں ان کے خواص اور علماءِ وقت کی بھی یہی روش رہی۔

چنانچہ ایک شیعہ رہنما مولوی مظہر علی اظہر کی وہ تحریر اس بات کی شاہد ہے جس میں انھوں نے شیعوں کے قبلہ و کعبہ مولوی سیّد کلب حسین مجتہد[1] کی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی کا شکوہ کیا ہے۔

---

[1] مولوی سیّد کلب حسین ابن مولوی آقا حسن جائسی ثم لکھنوی ۶ رشعبان ۱۳۱۱ھ - ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام علی اختر تھا۔ ابتدائی کتب درسیہ مختلف اساتذہ سے پڑھیں۔ پھر سلطان المدارس لکھنؤ سے صدر الافاضل کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد عراق جا کر علمائے کربلا و نجف کے درس میں شریک ہوئے، تقریباً تین سال وہاں قیام رہا، اس کے بعد وہاں سے سند اجتہاد لے کر لکھنؤ لوٹ آئے۔ اخبار ''الناطق'' میں آپ کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ ۱۳۴۷ھ - ۱۹۲۸ء میں ایک پرچہ ''البلاغ'' بھی جاری کیا تھا جس میں زیادہ تر اختلافی مضامین شائع ہوتے تھے۔ آپ اپنی عرفیت 'کبن صاحب' سے بھی خاصے معروف تھے۔ لکھنؤ میں مولوی ناصر حسین مجتہد اور مولوی نجم الحسن مجتہد کے بعد شیعوں کا اچھا خاصہ طبقہ انھیں اپنا رہنما اور (باقی اگلے صفحہ پر)

وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۳۷ء کے اوائل میں مجھے لاہور میں لکھنؤ کے ایک شیعہ بزرگ میر کبّن صاحب (مولوی کلبِ حسین مجتہد) سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، میر کبّن صاحب ایک بااثر شیعہ مجتہد ہیں اور مدحِ صحابہ کی مخالفت میں لکھنؤ میں سب سے زیادہ پیش پیش ہیں۔ لاہور کے بعض شیعہ احباب نے مجھے بلا کر ان سے تعارف کرایا...... میں نے ان کو بہتیرا سمجھایا کہ اس مسئلہ میں شیعوں کو ناحق ضد نہ کرنا چاہیے اور ایسا سخت رویّہ اختیار نہ کرنا چاہیے کہ جس میں مصالحت کی کوئی صورت نہ رہے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ زمانے کے حالات بدل رہے ہیں، حکومت کا نظام بدل رہا ہے اور آئندہ چل کر صورتِ حال کے دگرگوں ہونے کا خطرہ ہے لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور جب کوئی وزنی دلیل نہ دے سکے تو آخر میں ارشاد فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ حکومت کا ہوم ممبر سنّیوں کے ساتھ ہے لیکن چیف سکریٹری ہمارے ساتھ ہے اور سنّی خواہ کتنا ہی زور لگالیں بہر حال فتح ہماری ہی ہوگی۔ میں نے ان کو پھر سمجھایا کہ سرکاری افسروں کی معمولی باتوں پر اس قدر انحصار نہ کرنا چاہیے...... لیکن انھیں چیف سکریٹری پر اتنا اعتماد تھا جنھیں وہ بغیر کسی کے کہے گورنر کی زبان سمجھتے تھے اور اس طرح اِس اُمید افزا فریب میں مبتلا تھے کہ دنیا خواہ ادھر کی ادھر ہو جائے ان ہی کی بات رہے گی اور سنّیوں کو بہر حال شکستِ فاش ہوگی[۱]''

یہ ہیں وہ خیالات اور جذبات جو ایک شیعہ عالم اور رہنما نے مولوی کلب حسین مجتہد کے بارے میں ظاہر کیے تھے جنھیں شیعوں میں بہت معتدل عالم خیال کیا جاتا ہے۔ بھلا ان حالات میں مصالحت کا کوئی راستہ کس طرح نکل سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فرقوں میں جو گفت و شنید کا سلسلہ کچھ دنوں سے جاری تھا زیادہ دنوں تک نہ چل سکا جبکہ حکومت بھی بظاہر یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح مصالحت اور امن کی کوئی صورت نکل آئے مگر یہ سب بے سود ثابت ہوا، لہٰذا سنّیوں کی خواہش پر حکومت نے ایک انکوائری کمیشن بلانے کا فیصلہ کیا جو اَلسپ کمیشن (Allsop Commission) کے نام سے مشہور ہوا۔

(گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) قائد جانتا تھا۔ تیس چالیس سال تک وہ اپنی جماعتی تنظیم و ترقی میں روحِ رواں کی حیثیت سے پیش پیش رہے۔ مشہور تحریک تبرا میں بھی ان کی خدمات بہت نمایاں رہیں۔ چنانچہ موصوف 'تلاوتِ تبرا شریف' کی پاداش میں قید کی سزا پاکر جیل خانہ تک بھی پہنچ چکے تھے۔ آپ تقریباً نصف صدی تک 'ذاکری' کرتے رہے۔ امام بارہ غفران مآب لکھنؤ میں 'شامِ غریباں' کی مجلس آپ ہی کی ایجاد تھی۔ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۶۳ء کو ۷۴ سال کی عمر میں کینسر کے مرض میں انتقال کیا اور اسی امام باڑہ میں مدفون ہوئے۔ مولوی کلب عابد مجتہد اور مولوی صادق مجتہد اور مولوی کلب صادق مجتہد آپ ہی کے فرزند ہیں۔
(تذکرہ بے بہا، مرتبہ مولوی حسین نوگانوی، ص ۳۰۲-۳۰۴، ہفت روزہ حرم لکھنؤ ۱۵؍اکتوبر ۱۹۶۳ء)

[۱] تحریک مدحِ صحابہ، مرتبہ مولانا مظہر علی اظہر، ص ۹۲-۹۳

اَلسَپ کمیشن

یہ کمیشن دو ممبران پر مشتمل تھا، ایک جسٹس السپ (Justice Allsop) جو اس وقت الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج تھے اور دوسرے مسٹر ایچ۔ ایس۔ راس آئی سی ایس (Mr. H.S. Ross, I.C.S.) جو اس وقت علی گڈھ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ جسٹس اَلسَپ اس کمیشن کے چیئرمین منتخب کیے گئے۔ ان دونوں تقرریوں کا نوٹیفکیشن ۱۰/اپریل ۱۹۳۷ء کو ہوا۔ اس اعلان کے ایک ہفتہ کے بعد کمیشن نے اپنی تحقیقات شروع کردیں۔ کمیشن کو جن امور کی تحقیقات کرنا تھی وہ یہ تھے:

۱۔ گذشتہ واقعات کی روشنی میں ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ نے جو پالیسی اپنائی تھی اس میں اب کسی ترمیم یا تبدیلی کی ضرورت ہے کہ نہیں۔

۲۔ اس سلسلہ میں لکھنؤ میں حکّام ضلع نے جو رویّہ اختیار کیا ہے اس میں اب کسی ترمیم یا تبدیلی کی ضرورت ہے کہ نہیں۔

ان امور پر بحث کے دوران کمیشن میں شیعہ سنّی دونوں فرقوں کے مختلف افراد کے بیانات اور شہادتیں بھی قلم بند کی گئی تھیں۔

سنّی وکلاء کی گواہیاں

۲/ [illegible] ۱۹۳۷ء کو چیف کورٹ لکھنؤ میں جسٹس اَلسَپ نے مدحِ صحابہ کمیشن کے لیے سنّی علماء اور وکلاء کے بیانات لینا شروع کیے۔ پورے شہر میں ان حالات کی بڑی شہرت تھی جس کی وجہ سے چیف کورٹ میں ہجوم کی کثرت کی وجہ سے تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ کارروائی کا آغاز کرتے وقت سنّیوں کے بیرسٹر جناب عبدالعزیز سابق منسٹر صوبۂ بہار نے سنّیوں کے دعویٰ مدحِ صحابہ پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی اور پورے مجمع نے بڑے سکون کے ساتھ ان کے بیان کو سنا۔ جناب عبدالعزیز کے علاوہ اور دوسرے وکیل و بیرسٹر صاحبان بھی سنّیوں کی طرف سے کام کر رہے تھے جن میں مولوی محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ ایم۔ ایل۔ اے، سیّد ظہور احمد ایڈوکیٹ، جناب غلام حسین بَٹ ایڈوکیٹ اور چودھری نعیم اللہ ایڈوکیٹ قابلِ ذکر ہیں۔ شیعوں کی طرف سے نواب مہدی حسن، مرزا عابد حسین، مرزا حیدر مہدی اور شری ہردھیان چند پیروی کر رہے تھے۔

شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا بیان

کمیشن میں سنّی علماء کی طرف سے سب سے پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ (م ۱۹۵۷ء) صدر المدرسین دار العلوم دیوبند مدحِ صحابہ کی شرعی حقیقت واضح کرنے کے لیے پیش ہوئے سب سے پہلے ان سے کچھ اس قسم کے سوالات کیے گئے جس سے ان کی مذہبی پوزیشن واضح ہو، حضرتؒ نے بالترتیب ان سوالات کے جواب میں فرمایا:

''میں سنّی المذہب ہوں، میں نے دار العلوم دیوبند میں چھ سال رہ کر علم کی تکمیل کی اور پھر بعض فنون کی تکمیل مدینہ منورہ میں جا کر کی اور پھر وہیں بارہ سال تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں اور اب نو سال سے دار العلوم دیوبند کا صدر مدرس ہوں۔ دار العلوم دیوبند وہ مذہبی اور مرکزی ادارہ ہے جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیائے اسلام میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔''

اس موقع پر کمیشن کے سامنے حضرت مدنیؒ نے مزید جو بیان دیا وہ یہ تھا:

''صحابۂ کرام کی تعریف کرنا ہماری مذہبی کتابوں میں تاکید کے ساتھ موجود ہے، خلفاء راشدینؓ کی تعریف کرنا مستحب ہے، لیکن اگر اسے روکا جائے تو وہ فرض ہے اور یہی قاعدہ ہے کہ کسی ایسے امر کو جس کی شریعت نے اجازت دی ہو اگر کوئی قوت منع کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ جب تک ان میں طاقت ہو اس کو انجام دیں۔ چنانچہ جس جگہ پر صحابۂ کرام کے متعلق غلط فہمی پھیلائی گئی ہو اس جگہ بھی یہ فعلِ مستحب واجب ہو جاتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ کی تعریف ہر جمعہ کے خطبہ میں، عیدین کے موقع پر اور حج کے ایام میں جبکہ سال میں ایک مرتبہ دنیا کے مسلمان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں کرنا ضروری ہے، یہی تین بڑے مجمع مسلمانوں کے ہیں۔ مذہبی تقریر میں بھی صحابۂ کرامؓ کا ذکر کرنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں میں بھی یہ عمل بدستور چلا آرہا ہے۔ مذہبی احکام کسی رسم و رواج پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ یہ اجماعِ امت سے بھی مرتب کیے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک نہیں بہت سی جگہ صحابۂ کرامؓ کی تعریف موجود ہے۔''

ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا:

''محرم کی دسویں تاریخ بہت افضل قرار دی گئی ہے، اس روز سنّیوں کو روزہ رکھنا چاہیے اور شب میں بہ کثرت عبادت کرنا چاہیے۔ سنّیوں کا یہ فعل کربلا کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، قرآن شریف میں ہر موقع پر رونے دھونے اور بین کرنے سے منع کیا گیا ہے اور صبر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ قرآن شریف کی آیات میں صحابہ کے واسطے دُعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صحابہ کی

تعریف اس لیے نہیں کی جاتی ہے کہ کسی کی دل آزاری ہو بلکہ مذہب خود اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ جلسوں اور اجتماعات میں ان کا ذکر خیر کیا جائے، اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ ان حضرات نے کام بھی بڑے عظیم الشان انجام دیئے ہیں۔ محرم کی دسویں تاریخ کو اگر شہدائے کربلا کا ذکر کیا جائے تو لازم ہے کہ ان کے ساتھ صحابۂ کرام کی بھی تعریف کی جائے تاکہ مخالف فرقوں سے مشابہت نہ ہو۔

شیعہ وکیل مرزا حیدر مہدی کے سوالوں کے جواب میں آپ نے فرمایا:

''صحابی وہ ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالتِ ایمان ملا ہو اور ایمان پر قائم رہا ہو۔ مدحِ صحابہ کا جلوس نکالنا اور نظمیں پڑھنا بدعت نہیں ہے۔ ہر زمانے میں مدحِ صحابہ کا طریقہ جداگانہ رہا ہے اس لیے یہ موجودہ طریقہ بھی بدعت نہیں ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی برائی کی تو آپؐ نے حکم دیا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تعریف میں مجمع عام کے اندر قصیدہ پڑھا جائے۔

ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا:

عاشورہ کے دن سنیّوں کے لیے علم وتعزیہ وغیرہ کا جلوس نکالنا جائز نہیں بلکہ حرام ہے، اگر تعزیوں کے ساتھ منقبت پڑھی جائے تو اس سے اس کی حرمت تو نہ جائے گی مگر جرم ہلکا ہو جائے گا، اس طرح مدحِ صحابہ سے اور بھی جرم ہلکا ہو جائے گا۔

آپ نے فریقِ مخالف کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ تعزیہ داری کیوں حرام ہے، فرمایا:

''محرم کے موقع پر تعزیہ داری میں وہی باتیں کی جاتی ہیں جو دشمنانِ اہلِ بیت نے حضرت حسینؓ کو شہید کرنے کے بعد کی تھیں، انھوں نے اپنے گھروں میں روشنی کی تھی، چراغاں کیا تھا، مجلس منعقد کی تھیں، دلدل نکالا اور اُسے گشت کرایا تھا اور شہداء کے سروں کو نیزوں پر پھرایا تھا، یعنی وہ تمام باتیں باتیں جو دشمنانِ اہلِ بیت نے اس وقت کی تھیں وہی آج سب تعزیہ کاری میں ہوتی ہیں اس لیے اس کو حرام سمجھا جاتا ہے، اس کے علاوہ اس کے حرام ہونے کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔''[1]

حضرت مولانا لکھنویؒ کا بیان

دوسرے دن بھی کمرۂ عدالت بھرا ہوا تھا اور کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی اس موقع پر حضرت

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۳ راپریل ۱۹۳۷ء

مولانا لکھنویؒ کو کمیشن کے سامنے بیان دینے کے لیے بلایا گیا، آپ نے اس مسئلہ پر خاص طور سے روشنی ڈالی کہ سنّیوں کے یہاں مدحِ صحابہ مستحب ہے مگر یہ تین حالتوں میں واجب ہوجاتی ہے۔ اوّل جب اس کو طاقت کے زور پر روکا جائے۔ دوم اس وقت جب مسلمانوں کا کوئی ایسا جلسہ ہو جس میں مدحِ صحابہ نہ پڑھنے کی وجہ سے کسی دوسرے فرقے سے مشابہت پیدا ہوتی ہو اور سوم ایسے مقام پر جہاں سنّی آباد ہوں مگر وہاں خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کے متعلق بدگمانی پھیلائی جارہی ہو تو وہاں بھی مدحِ صحابہ واجب ہوجاتی ہے۔ آپ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

> ''قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر صحابۂ کرامؓ کی تعریف کی گئی ہے، تعزیہ رکھنا اور اس کا بنانا بدعت، شرک اور حرام ہے کیونکہ اس سے مرادیں مانگی جاتی ہیں اور اس پر چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے۔ تعزیہ اور اس کے جلوس میں قاتلان حسینؓ کی نقل کی جاتی ہے کہ جس وقت ابن زیاد کے لشکر نے حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو شہید کیا تو ان کے سَر اور ہاتھ کاٹ کر نیزوں پر بلند کر کے بازاروں میں گھمایا تھا...... اگر کوئی شخص کسی آدمی کی مدح صرف اس وجہ سے کرتا ہے کہ اس نے ہمارے بزرگوں کو قتل کیا ہے یا تکلیف پہنچائی ہے تو یقیناً اس سے ہمارے جذبات مجروح ہوں گے لیکن اگر کوئی شخص کسی آدمی کی مدح صرف اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اس کا بزرگ ہے تو اس پر کسی کو بُرا ماننے کی ضرورت نہیں ہے، ہاں یہ ضرور ثابت ہونا چاہیے کہ ممدوح کسی مذہب کا بزرگ ہے[1]۔''

مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہؒ کا بیان

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ سابق صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی نے اپنے بیان میں اس بات پر خصوصیت کے ساتھ اہل سنّت کے مذہبی عقیدہ کی ترجمانی فرمائی کہ سنّیوں کے عقیدہ کے مطابق مدحِ صحابہ پڑھنا مستحب ہے لیکن وہ بعض حالتوں میں واجب ہوجاتی ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا:

> ''اوّل اگر کوئی مدحِ صحابہ کو جبراً روکے، دوم یہ کہ کسی جلسہ یا تقریر میں جہاں غیر سنّیوں سے مشابہت ہونے کا اندیشہ ہو، اور سوم یہ کہ غیر مسلموں میں تبلیغ کی غرض سے صحابۂ کرامؓ کی تعریف کرنا واجب ہوجاتا ہے...... جلوس کے ساتھ مدحِ صحابہ پڑھنا جائز ہے لیکن اگر اس کو روکا

---

[1] اخبار النجم، لکھنؤ، ۲۳ر اپریل ۱۹۳۷ء

جائے گا تو واجب ہو جائے گا...... تعزیہ نکالنا نا جائز ہے اور یہ مکروہ و حرام بھی ہے۔ اسلام میں غم کی یادگار قائم کرنا نا جائز ہے۔ اہل سنت رسولؐ کے حکم کے مطابق روزہ رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو صحابہ سے محبت کرے گا وہ مجھ سے محبت کرے گا اور جو ان سے عداوت کرے گا وہ مجھ سے عداوت کرے گا۔"[1]

مولانا ظفر الملک علویؒ کا بیان

مولانا ظفر الملک علویؒ (م ۱۹۴۶ء) ایڈیٹر الناظر لکھنؤ نے عدالت میں تحریک مدحِ صحابہ کی تفصیل بتاتے ہوئے بیان دیا:

"میں مدحِ صحابہ کمیٹی کا سکریٹری ہوں۔ ۱۹۰۹ء میں تقریباً ایک ہزار مسلمان مدحِ صحابہ پڑھنے کے 'جرم' میں گرفتار ہوئے تھے، اس وقت سنیوں میں بہت زیادہ جوش وخروش تھا، ڈپٹی کمشنر لکھنؤ مسٹر ریڈیچی کے اعلان کے بعد سنی اکابر تو خاموش ہو گئے مگر عوام میں جوش وخروش باقی رہا اور وہ برابر جلسوں میں گورنمنٹ کے اس حکم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء میں دو مسلمانوں نے چہلم کے موقع پر مدحِ صحابہ پڑھی اور گرفتار ہو گئے، ان پر مقدمہ چلایا گیا جو چیف کورٹ تک گیا مگر بعد میں ان سے ایک سال کے لیے مچلکہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں محمد حسین اور عبدالغنی نامی دو مسلمان مدحِ صحابہ پڑھتے ہوئے گرفتار ہوئے، ان دونوں حضرات نے دسویں محرم کو مدحِ صحابہ پڑھی تھی، ان کو فوراً ہی گرفتار کر کے اور بغیر مقدمہ چلائے جیل میں بند کر دیا گیا اور عرصہ تک ان کی کوئی ضمانت منظور نہیں کی گئی، یہاں تک کہ گذشتہ چہلم میں ۱۳ سنیوں نے مدحِ صحابہ پڑھی ان پر بھی مقدمہ چلایا گیا اور سزائیں دی گئیں۔ ۱۹۳۷ء میں ڈپٹی کمشنر کی طرف سے دفعہ ۱۴۴ کے تحت جلوسِ محمدی پر پابندی عائد کر دی گئی تا کہ کوئی بھی آدمی مدحِ صحابہ نہ پڑھ سکے، اس پر مسلمانوں میں سخت ناراضگی پھیل گئی اور احتجاجاً جلوس ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک وفد ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کے پاس سنیوں کے نظریہ کو پیش کرنے کے لیے گیا اور اس کے ساتھ ایس پی کو بھی درخواست دی گئی کہ ایک جلوس نکالنے کی اجازت دی جائے چنانچہ ۱۲ر جون ۱۹۳۷ء کو مسلمانوں نے ایک جلوس نکالا جس میں مدحِ صحابہ پڑھی گئی، اس عرصہ میں مجلسِ احرار کی طرف سے مولوی حافظ مشتاق احمد لدھیانوی صدر مجلسِ احرار یوپی رضا کاروں کی بھرتی کر رہے تھے لہٰذا انھیں اور غازی منے خاں (م ۱۹۵۱ء) اور مولانا یونس خالدی (م ۱۹۸۵ء) کو گرفتار کر لیا گیا۔ مجلسِ احرار کی تحریک پر ٹیلہ شاہ پیر محمد لکھنؤ سے مسلم نوجوانوں نے سول نافرمانی شروع کر دی، اس دوران مجلسِ احرار کے ایک خاص مقرر مولوی

---

1. اخبار النجم لکھنؤ، ۲۳ر اپریل ۱۹۳۷ء

عبدالقیوم کانپوری کو ریلوے اسٹیشن پر گرفتار کرلیا گیا۔ان سب حضرات کو چھ چھ ماہ کی قید ہوئی جو بعد میں تین ماہ قیدِ بامشقت اور ۵۰ روپیہ جرمانے کی شکل میں بدل دی گئی، گرفتاریوں کا یہ سلسلہ پانچ ماہ تک جاری رہا اس کے بعد گورنر یوپی کے پاس سنّیوں کا ایک میموریل روانہ کیا گیا۔گورنر نے کہا کہ اگر سول نافرمانی ترک کردی جائے تو تمام قیدی چھوڑ دیے جائیں گے، ان کے جرمانے معاف کردیے جائیں گے اور قانون پر نظرثانی کی جائے گی۔گورنر کے اس کہنے پر مجلسِ احرار نے سول نافرمانی روک دی لہٰذا تمام قیدیوں کو رہا کردیا گیا۔"[1]

کمیشن کے سامنے حاجی محمد کامل لکھنویؒ نے بھی اپنا بیان دیا اور تاریخی اعتبار سے شیعہ سنّی اختلافات کے اسباب بیان کیے، ان سب شہادتوں کے بعد مسلمانوں نے پھر کسی مزید شہادت کی درخواست نہیں دی۔ مسلمانوں کی شہادت ختم ہوتے ہی کمیشن کے ججوں نے شیعہ نمائندوں سے ان کی شہادت کے متعلق احکام صادر کیے جس پر نواب مہدی حسن نے معذرت کرتے ہوئے آٹھ روز کی مہلت مانگی۔انھوں نے بتایا کہ شیعوں کی طرف سے ہم مولانا ناصر حسین مجتہد کو پیش کرنا چاہتے ہیں مگر وہ اس وقت بیمار ہیں اس لیے عدالت میں نہیں آسکتے۔

سنّیوں کی شہادتوں پر تبصرہ

علمائے اہل سنّت کو صرف دو دن شہادت کے لیے دیئے گئے تھے جس میں انھوں نے ہندوستان کے تین چنے ہوئے عالموں (حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ اور مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب دہلویؒ) کو بہ حیثیت مفتی مذہب پیش کر کے کمیشن کے سامنے مسئلہ مجلسِ احرار کے وجوب پر عقلی و نقلی شہادتیں دلوائیں اور دو گواہوں (حاجی محمد کامل لکھنویؒ اور مولانا ظفر الملک علویؒ) کے ذریعہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۷ء تک کے واقعات پر بحث کرا کے مدحِ صحابہ کی بندش اور اس کی گذشتہ و موجودہ صورتِ حال سے ارکانِ کمیشن کو واقف کرایا۔علمائے اہل سنّت میں سے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی شہادت میں جو چیز نمایاں حیثیت سے قابلِ ذکر تھی وہ مسئلہ مدحِ صحابہ کا شرعی وجوب تھا، انھوں نے اپنے بیان میں شیعہ سنی اتحاد پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی تھی لیکن یہ بھی صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ جب تک شیعہ ہمارے مذہب میں مداخلت اور ہمارے شعائر کی توہین کرتے رہیں گے ہم کسی طرح بھی ان سے اتحاد نہیں کرسکتے۔حضرت مولانا لکھنویؒ کے بیان میں شیعی نقطۂ نظر سے مدحِ صحابہ کے جواز پر بڑی مفید باتیں کمیشن کے علم میں لائی گئیں۔[2]

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۳ ر اپریل ۱۹۳۷ء [2] النجم لکھنؤ، ۲۳ ر اپریل ۱۹۳۷ء

کمیشن میں مولوی نجم الحسن مجتہد کا بیان

مدحِ صحابہ کمیشن میں شیعوں کے مجتہد اعظم مولوی نجم الحسن[1] (م ۱۹۳۸ء) ناظم مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے بیان سے پہلے مرزا حیدر مہدی شیعہ وکیل نے کمیشن کے سامنے موجودہ چپقلش کے متعلق چند منٹ تقریر کی اس کے بعد مولوی نجم الحسن نے حسب ذیل بیان قلم بند کرایا:

"میں شیعوں کا مجتہد ہوں اور مجھ کو گورنمنٹ سے شمس العلماء کا خطاب ملا ہے اور میں مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ کا صدر بھی ہوں جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا اور سب سے بڑا شیعوں کا کالج ہے اور ۴۸ سال سے قائم ہے، میں ابتداء سے اس کا صدر مدرس ہوں، اس کالج میں فقہ واصول وغیرہ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، اس مدرسہ سے اب تک ہزاروں لوگ فارغ ہو کر نکل چکے ہیں۔ شیعوں کی کوئی درسگاہ اس کے مقابل کی نہیں ہے، اس کالج کو گورنمنٹ سے امداد بھی ملتی ہے۔ میں مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کا متوتی اور منتظم بھی ہوں، اس مدرسہ میں وہ لوگ داخل کیے جاتے ہیں جو اکتساب علومِ دینی سے فارغ ہو چکے ہیں، یہاں ان کو مذہبی وعظ و تبلیغ کا کام سکھایا جاتا ہے۔ میں مجلس علماء شیعہ کا صدر بھی ہوں اور بحیثیت مجتہد فتویٰ بھی دیتا ہوں اور حکومت کی مہربانی سے عدالت کی حاضری سے مستثنیٰ ہوں۔

پنجتن پاک میں محمد صلعم، حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن، اور حضرت حسین شامل ہیں۔ شیعوں کا عقیدہ ہے، کہ حضرت علی اور ان کے اہل بیت، رسول کے بعد سب سے افضل تھے، جو شخص ان حضرات سے بغض وعداوت رکھتا ہو ہم اس سے نفرت و بیزاری کرتے ہیں۔

خلیفۂ اوّل و دوئم نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ کو بہت اذیتیں پہنچائیں، بڑے بڑے ظلم کیے، خلیفۂ ثالث کے زمانہ میں قرآن جلایا گیا، حضرت عمار کو پٹوایا گیا اور اتنا پٹوایا گیا کہ ان کو ایک مرض لاحق ہو گیا، حضرت ابوذر کو شہر بدر کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں صاحبان حضرت علیؑ کے دوست تھے اور ان کی مدح کرتے تھے۔ حضرت عثمان نے باغ فدک اپنے

---

[1] مولوی سیّد نجم الحسن بن سید اکبر حسین رضوی کی پیدائش ۶ ر ذی الحجہ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) کو امروہہ ضلع مراد آباد میں ہوئی، انھوں نے سب سے پہلے مولوی سیّد تفضل حسین سنبھلی سے درس لیا اس کے بعد لکھنؤ آ کر سیّد ابوالحسن عرف ابو صاحب، مفتی محمد عباس اور ملا علی نقی سے استفادہ کیا۔ ۱۳۲۶ھ-۱۹۰۸ء میں شیعہ کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۳۲۹ھ-۱۹۱۱ء میں ایران د عراق کا سفر کیا بعدہٗ نواب حامد علی خاں آف رامپور نے اپنے یہاں محکمۂ تعلیم کا ڈائریکٹر مقرر کیا، لکھنؤ میں مدرسہ ناظمیہ، مدرسۃ الواعظین، موید العلوم، الواعظ اور انگریزی میں 'مسلم ریویو' کا قیام عمل میں لائے۔ برطانوی حکومت نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ ۱۷ ر صفر ۱۳۵۷ھ-۱۹۳۸ء کو انتقال ہوا اور مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں تدفین ہوئی۔ انھوں نے مختلف چھوٹے رسائل بھی تحریر کیے تھے اور خاص طور سے مفتی محمد عباس کی تصانیف کو ایڈٹ کر کے مدرسۃ الواعظین سے شائع کیا تھا۔

عزیزوں کو دے دیا، حقیقتاً یہ باغ حضرت فاطمہ کو ملنا چاہیے تھا، چنانچہ جب حضرت فاطمہ کو اس باغ سے محروم کیا گیا تو وہ ان حضرات سے مرتے دم تک ناراض رہیں اور اسی وجہ سے وہ افلاس و فقر میں مبتلا رہیں، اگر فاطمہ کے دروازے پر آگ نہ لگائی جاتی اور حقوق غصب نہ کیے جاتے تو دوسروں کی اتنی ہمّت نہ ہوتی کہ حضرت حسین کو کربلا میں بلا کر شہید کرتے۔

شیعوں میں تولاّ اور تبرّا کے عقیدے واجبات میں سے ہیں، تولاّ محبت اور تبرّا بیزاری کو کہتے ہیں، یہ دونوں جزوِ ایمان ہیں۔ دشمنانِ اہل بیت پر ائمہ بھی لعن طعن کرتے رہے ہیں اور ہم بھی کرتے ہیں۔ اُن پر لعنت کرنے کا حکم قرآن میں بھی مجملاً لکھا ہوا ہے اور ان عقائد کا مدار قرآن وحدیث ہیں۔ اگر خلفاء ثلاثہ کی مدح شیعوں کے سامنے ہوگی تو یہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔

یہ روایت کہ آنحضرت کی دو بیٹیاں خلیفۂ ثالث سے منسوب تھیں بالکل غلط ہے۔ یہ دونوں لڑکیاں نبی کی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ حضرت خدیجہ کے ہمراہ آئی تھیں، اسی لیے لوگ ان کو بھی آنحضرت کی بیٹیاں کہتے تھے، اسی طرح خلیفۂ ثانی کو بھی حضرت علی کی کوئی لڑکی منسوب نہ تھی، حضرت عمر نے درخواست ضرور کی تھی مگر وہ مسترد کر دی گئی تھی۔ حضرت علی اور دیگر ائمہ نے خلفائے ثلاثہ کی مذمّت کی ہے، مدح کبھی نہیں کی، مذہبِ شیعہ کے مطابق قرآن یا احادیث میں خلفائے ثلاثہ کی کوئی مدح نہیں ہے۔ قرآن میں جو بھی آیات مدح کے لیے آئی ہیں وہ دیگر صحابہ کے لیے ہیں۔ محمد بن ابی بکر، مالک اشتر اور ابولولو فیروز ہمارے ممدوح ہیں۔"[1]

مجتہد صاحب سے جرح

مولوی نجم الحسن کا مذکورہ بالا بیان کس قدر دل آزار اور خلاف حقیقت باتوں پر مشتمل تھا پھر بھی اس کو برداشت کیا گیا۔ مجتہد موصوف سے جناب غلام حسین بٹ مسلم بیرسٹر نے جو جرح کے سوالات کیے اور انھوں نے اس کے جو مضحکہ خیز جوابات دیئے تھے اس سے ان کی بدحواسی اور گھبراہٹ کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، سوال کچھ کیا جاتا تھا اور وہ جواب کچھ دیتے تھے۔ اس موقع پر چند سطریں بطور نمونہ پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

بیرسٹر صاحب: دیکھئے مولانا میں آپ سے چند کتابوں اور ان کے مصنّفوں کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں، اگر وہ آپ کے نزدیک معتبر ہوں تو کہہ دیجیے 'ہاں' اور اگر معتبر نہ ہوں تو کہہ دیجیے 'نہیں' لہٰذا پہلے یہ بتلائیے کہ کتاب کافی مصنّفہ یعقوب کلینی آپ کے نزدیک مستند ہے اور آپ اس کو معتبر جانتے ہیں کہ نہیں؟

---

[1] النجم، لکھنؤ، ۱۳؍اپریل ۱۹۳۷ء

مجتہد صاحب: (سوچ کر) اس میں ائمہ کی حدیثیں ہیں، جو احادیث مجتہدین کی جانچ میں آ چکی ہیں وہ صحیح ہیں۔ (سبحان اللہ)

بیرسٹر صاحب: دیکھئے تہذیب الاحکام مصنفہ ابو جعفر طوسی آپ کے یہاں منجملہ اصولِ اربعہ کے حدیث کی ایک کتاب ہے، کیا آپ اسے مستند مانتے ہیں؟

مجتہد صاحب: میں عرض کر چکا ہوں کہ بہت سی احادیث صحیح بھی ہیں اور بہت سی غیر صحیح بھی ہیں۔

بیرسٹر صاحب: من لایحضرہ الفقیہ مصنفہ ابن بابویہ قمی اور الاستبصار مصنفہ ابو جعفر طوسی کیا یہ دونوں مستند ہیں؟

مجتہد صاحب: یہ چاروں کتابیں شیعہ عقیدہ کی سب سے زیادہ مستند ہیں لیکن کوئی کتاب جس میں فقط صحیح حدیثیں جمع کی گئی ہوں میرے نزدیک موجود نہیں ہے ورنہ ویسے تو بحار الانوار بھی ایک کتاب ہے۔

بیرسٹر صاحب: نہج البلاغۃ اور اس کی شرح ابن مثیم بھی کیا مستند ہے؟

مجتہد صاحب: نہج البلاغۃ ادبی اعتبار سے مستند ہے اور اس کے کچھ اجزاء شیعوں کے طریقے سے ملتے ہیں اور کچھ سنیوں کے یہ شریف رضی کا جمع کیا ہوا نسخہ ہے مگر اس میں حضرت علی کا کلام ہے۔

بیرسٹر صاحب: احمد بن ابی طالب نے احتجاجِ طبرسی میں کیا بیان کیا ہے اور یہ کتاب کس پایہ کی ہے؟

مجتہد صاحب: اس میں ائمہ کے مناظرے ہیں اور یہ مستند ہے۔

بیرسٹر صاحب: کیا ملا باقر مجلسی کی کتاب جلاء العیون بھی مستند ہے؟

مجتہد صاحب: جی ہاں!

بیرسٹر صاحب: کشف الغمہ مصنفہ علی بن عیسیٰ اردبیلی بھی مستند ہے؟

مجتہد صاحب: ہاں، ہاں!

بیرسٹر صاحب: ناسخ التواریخ مصنفہ لسان الملک مرزا محمد تقی ایرانی بھی مستند ہے؟

مجتہد صاحب: یہ سب کتابیں مستند تو ہیں مگر میں ان کے ایک ایک حرف کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

بیرسٹر صاحب: کیا خصال ابن بابویہ بھی مستند ہے؟

مجتہد صاحب: باشد۔

بیرسٹر صاحب: کیا حملۂ حیدری مرتبہ علامہ باذل کرمانی بھی مستند ہے؟

مجتہد صاحب: کرمانی ورمانی تو میں جانتا نہیں صرف باذل کو میں جانتا ہوں اور وہ بھی علاّمہ نہیں بلکہ ملاّ باذل کہیے۔

بیرسٹر صاحب: قاضی نور اللہ شوستری کی کتاب مجالس المومنین بھی مستند ہے؟

مجتہد صاحب: جی ہاں! یہ بھی شیعہ تھے (کیا خوب)

بیرسٹر صاحب: مولوی دلدار علی کی کتاب اساس الاصول بھی مستند ہے؟

مجتہد صاحب: یہ اصولِ فقہ کی کتاب ہے۔

بیرسٹر صاحب: اور حیات القلوب؟

مجتہد صاحب: یہ تاریخی کتاب ہے۔

بیرسٹر صاحب: کیا فردوسی مصنف شاہنامہ شیعہ تھے؟

مجتہد صاحب: مجھے اس کی تحقیق کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی۔

دیکھیے مذکورہ بالا سوالات اور پھر مجتہد صاحب کے جوابات کتنے عجیب وغریب ہیں، سوالات کیا تھے اور ان کے جوابات کیا دیئے گئے اسی اثناء میں مجتہد صاحب نے عدالت کو مخاطب کر کے کہا کہ میں صبح نو بجے سے آیا ہوں، میرا خیال تھا کہ مجھ سے مذہبی مسائل کے بارے میں پوچھا جائے گا مگر اب تک مجھے چھٹی نہیں دی گئی ہے، اچھا اب مجھے اجازت دیجیے تاکہ میں ظہرین پڑھ لوں۔[1]

مولوی نجم الحسن مجتہد کے علاوہ کمیشن کے سامنے شیعوں کی طرف سے مولوی فضل علی ایڈیٹر الواعظ لکھنؤ اور مولوی کلب حسین مجتہد بھی پیش ہوئے تھے، مولوی ناصر حسین مجتہد علالت کے حیلہ سے عدالت میں حاضر نہیں ہوئے، ان کے علاوہ شیعوں کے جو وکلاء کمیشن میں پیش ہوئے ان میں مسٹر دھیان چند وکیل اور مرزا حیدر مہدی ہی کے نام ملتے ہیں، ان دونوں نے اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کیا کہ مدحِ صحابہ کی اجازت بالکل نہیں ملنا چاہیے اور اگر اس کی اجازت ملتی ہے تو ہم کو تبرا کی اجازت دی جائے کیونکہ تبرا ہمارا مذہبی حق ہے۔ شیعہ وکلاء کی ان باتوں کی پرزور تردید جناب غلام حسین بٹ نے اپنی تقریر کے ذریعہ کی۔ کمیشن نے شہادتیں قلمبند کرنے اور بحث سننے کے بعد ۱۵/ جون ۱۹۳۷ء کو اپنی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کر دی جو ۲۸/ مارچ ۱۹۳۸ء کو گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوگئی۔[2]

---

۱ النجم لکھنؤ، ۱۳/ اپریل ۱۹۳۷ء ۲ النجم لکھنؤ، ۷/ مئی ۱۹۳۸ء

سترہواں باب

کمیشن کی رپورٹ اور اس کی سفارشات کا مسلم عوام پر اثر

اَلسپ کمیشن (Allsop Commission) نے کم وبیش ایک مہینہ تک اپنی تحقیقات جاری رکھیں، علماء اور خواص سے انٹرویو اور طرفین کے بیانات لیے اور پھر ۱۵ر جون ۱۹۳۷ء کو اپنی رپورٹ مع سفارشات کے حکومت کو پیش کردی مگر حکومت نے نہ معلوم کن مصالح کی بنا پر اس رپورٹ کو شائع نہیں کیا۔ غالباً اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ ۱۹۳۷ء کا زمانہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے لیے بہت اہم زمانہ تھا، اسی سال نئے آئین کا آغاز ہوا تھا، ہر صوبے میں ۳۱ر مارچ ۳۷ء کے بعد پرانا طرزِ حکومت بدل گیا اور اب حکومت کی ذمّہ داریاں ان لوگوں پر آگئیں جو عوام کی جانب سے منتخب ہوکر اسمبلی میں آئے تھے، اتفاق سے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں صوبہ یوپی میں ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی کہ یہاں کانگریس ممبر زیادہ اکثریت کے ساتھ منتخب ہوکر آئے تھے، اور ان کو یہ حق ہوگیا تھا کہ وہ یکم اپریل ۳۷ء سے اپنی وزارات بنائیں لیکن گانگریس ابھی اس بات کا فیصلہ نہیں کرسکی تھی کہ وزارت بنائی جائے یا نہیں۔ اسی لیے چھ صوبوں کے گورنروں نے اقلیتی پارٹیوں سے وزراء کو نامزد کرکے ان صوبوں میں عارضی حکومتیں (Interim Governments) قائم کردیں جو صرف اس وقت تک کام کرسکتی تھیں جب تک اسمبلی کا اجلاس نہ بلایا جائے۔ یوپی میں نواب احمد سعید خاں آف چھتاری وزیر اعلیٰ بنائے گئے تھے اور مسلم لیگی لیڈر راجہ سلیم پور جو مذہباً شیعہ تھے وزارت میں لیے گئے تھے۔

۱۵ر جون ۱۹۳۷ء کو نواب چھتاری اور راجہ سلیم پور کے دورِ وزارت میں اَلسپ کمیشن کی رپورٹ حکومت کے سامنے آئی۔ اس وزارت کو حق تھا کہ مدحِ صحابہ کے مسئلہ میں حق وانصاف کے تقاضہ کو پورا کرتے ہوئے کوئی منصفانہ فیصلہ کرتی لیکن اُس نے اس کام کو آنے والی حکومت ہی کے سپرد کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ بقول مولانا ظفر الملک علوی مرحوم اَلسپ کمیٹی نے جو رپورٹ حکومت کو بھیجی تھی اس کی روشنی میں چھتاری وزارت نے اپنا فیصلہ لکھ لیا تھا کہ ۱۹۰۹ء میں

لیفٹیننٹ گورنر سر جان ہیوٹ نے جو احکام جاری کیے تھے وہی بحال رکھے جائیں یعنی تین دن کی ممانعت مدحِ صحابہ قطعی ہوگی اور سال کے بقیہ دنوں میں مسٹر ریڈ یچی کے اعلان کے بموجب اجازت نامہ حاصل کر کے جلوس وغیرہ نکالا جا سکتا ہے، مگر چھتاری وزارت کی یہ رپورٹ کچھ خاص مصالح کی بنا پر اس وقت منظرِ عام پر نہیں لائی گئی۔[1]

عارضی وزارتوں کے تقریباً چار مہینے کام کرنے کے بعد کانگریس نے اپنی وزارت بنانے کا فیصلہ کیا، اس طرح ان چھ صوبوں میں جن میں ایک یو پی بھی تھا کانگریس وزراء اعلا مقرر ہوئے اور انھوں نے اپنی حکومت بنائی لہٰذا نواب چھتاری کی عارضی حکومت یو پی سے ختم ہوگئی اس لئے اب مدح صحابہ کا معاملہ کانگریس حکومت کے سپرد ہوا۔ ابتداءً جس طرح چھتاری وزارت نے مدح صحابہ تحریک کے معاملہ میں تعویق کرنا ہی مناسب سمجھا تھا اسی طرح کانگریسی حکومت نے بھی اس مسئلہ میں ٹال مٹول سے کام لینا چاہا لیکن اہل سنّت کی طرف سے برابر کمیشن کی رپورٹ شائع کرنے کا مطالبہ کیا جاتا رہا اور اس سلسلہ میں برابر دوڑ دھوپ جاری رہی چنانچہ مولانا ظفر الملک علوی اور جناب غلام حسین بٹ بیرسٹر ایک وفد کی شکل میں وزیرِ اعلیٰ یو پی گووند ولبھ پنت سے ملنے گئے۔ مولانا آزاد (م ۱۹۵۸ء) بھی اس وقت لکھنؤ آئے ہوئے تھے انھیں بھی توجہ دلائی گئی۔ وزیر اعلیٰ نے دورانِ گفتگو میں مطلع کیا کہ راجہ صاحب محمود آباد نے انھیں ایک خط بھیجا ہے اور درخواست کی ہے کہ حکومت فی الحال اپنا فیصلہ صادر نہ کرے کیونکہ ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ شروع نومبر تک مصالحت ہو جائے، اس پر مولانا ظفر الملک علوی صاحب نے کہا کہ راجہ صاحب کی یہ ایک چال ہے جو مسلم لیگ کے جلسہ اور مسٹر جناح کے اعزاز میں نکلنے والے جلوس کی کامیابی کے لیے کی جا رہی ہے۔ اگر راجہ صاحب کو مصالحت کی کوئی فکر ہوتی تو گزشتہ سوا سال کی مدت میں اس طرح کے بہت سے مواقع آئے کہ وہ مصالحت کی کوشش کر سکتے تھے مگر انھوں نے آج تک کچھ نہ کیا۔ اس کے جواب میں وزیر اعلیٰ پنڈت پنت نے کہا کہ کانگریس کے خلاف مسلمانوں کو یونہی بہت بھڑکایا جا رہا ہے اس لیے اگر میں نے اس وقت مصالحت کا موقع نہ دیا تو کانگریسی حکومت پر ہی الزام لگایا جائے گا کہ وہ مسلمانوں کے دو فرقوں میں اختلاف برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ راجہ محمود آباد کی طرف سے جب کوئی مصالحت کا فارمولہ نہیں آیا اور مدحِ صحابہ کمیٹی کے اراکین کی معلومات میں یہ بات بھی آئی کہ نواب چھتاری کے زمانہ میں جو فیصلہ

---

[1] اخبار آفتاب، لکھنؤ، ۱۵ر فروری ۱۹۳۸ء

تیار ہوا تھا اس میں کانگریسی حکومت نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے بلکہ وہ اسی سابقہ فیصلہ ہی کو نافذ کرے گی تو قدرتاً اس موقع پر اہل سنت کی خواہش ہوئی کہ حتی المقدور اس فیصلہ میں اصلاح کرانا چاہیے۔ انہی ایام میں حسنِ اتفاق سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ لکھنؤ تشریف لائے تو ان سے بھی مشورہ ہوا اور طے پایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس مسئلہ کے حل کرنے کے لیے درمیان میں ڈالا جائے تاکہ اس فیصلہ میں کوئی اصلاح ہو سکے۔ حضرت مولانا لکھنویؒ نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا، چنانچہ مولانا آزاد کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی گئی، انھوں نے کانگریس کی مجلس عاملہ میں شرکت کرنے کے بعد جنوری ۱۹۳۸ء کے اوائل میں لکھنؤ آنے کا وعدہ کیا اور وزیر اعلیٰ یوپی کو تار بھیج کر کمیشن کے فیصلہ کی اشاعت ملتوی کرادی۔

حسب پروگرام شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ ۱۰؍جنوری ۱۹۳۸ء کو لکھنؤ پہنچ گئے اور دوسرے دن باہم ملاقات کی۔ مولانا آزاد نے بعض شیعوں سے پہلے ہی ملاقات کرلی تھی چنانچہ اثناء گفتگو میں شیعوں کے اس شکوہ کا انکشاف کیا کہ ان کی طرف سے مصالحت کی گفتگو کرنے کا خیال ظاہر کیا گیا تھا مگر مولانا ظفر الملک علوی، مولوی محمد نسیم بیرسٹر اور منشی احتشام علی کاکوروی نے گفتگو کرنے سے انکار کردیا۔ سنّیوں کی طرف سے اس الزام کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ سنّیوں نے ہمیشہ مصالحت کی ہر تجویز پر بات کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔

دوسرے دن مولانا آزاد نے سنی و شیعہ نمائندوں سے الگ الگ گفتگو کی، پہلے دن سنّیوں سے بات چیت ہوئی، دوسرے دن شیعوں سے اور تیسرے دن پھر سنّیوں سے بات چیت ہوئی، اس گفتگو میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی شریک تھے، غرضکہ اس قسم کی گفتگو کا سلسلہ برابر چلتا رہا، آخرکار مارچ ۱۹۳۸ء کو حکومت نے السپ کمیشن کی رپورٹ اور اس پر اپنا فیصلہ صادر کردیا۔ کمیشن نے ۲۳ صفحات پر مشتمل اپنی رپورٹ میں لکھنؤ کے شیعہ و سنی اختلاف کی پوری تاریخ بیان کرتے ہوئے اپنی رائے یہ صادر کی:

> "ہماری رائے یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں مدحِ صحابہ کے جلوسوں پر پابندی لگانے کے متعلق مقامی افسران کی کارروائی مناسب تھی لیکن ہمارے فیصلہ کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ ہر حالت میں اور ہمیشہ شارعِ عام پر مدحِ صحابہ پڑھنا قابلِ اعتراض ہے مگر ہمارے لیے یہ کہنا بھی لازم ہے کہ آئندہ بھی اس قسم کے موقعوں پر حکام کو اسی قسم کی کارروائی کرنی پڑے گی جو خاص

طور پر اس وقت کی جائے گی جبکہ سنیوں کا ایجی ٹیشن جاری رہے گا، لہٰذا گورنمنٹ ریزولیوشن میں جو اصول و پالیسی پہلے طے ہو چکی ہے اس میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ لکھنؤ میں حکامِ شہر نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت نہیں بشرطیکہ اس میں کوئی ایسی ناجائز کارروائی نہ کی گئی ہو جس سے سنیوں کو پریشان کرنا یا انھیں مشتعل کرنا مقصود ہو۔ مدحِ صحابہ پڑھنے پر پابندی اس وقت لگائی جائے گی جب عوام کو کسی قسم کے وقت پیش آنے کا احتمال ہو یا شیعوں کی دل آزاری ہونے کا اندیشہ ہو[1]"

اَلسپ کمیشن کے اس فیصلہ کی روشنی میں حکومت یو پی نے اپنا حسب ذیل ریزولیوشن شائع کیا:

"حکومتِ یو پی نے غور و خوض کے بعد یہ طے کیا ہے کہ کمیشن کا فیصلہ بالکل مناسب ہے۔ حکومت یہ بات صاف طور پر کہہ دینا چاہتی ہے کہ سنیوں کے علی الاعلان یا نجی طور پر خلفائے ثلاثہ کی تعریف کرنے کے حق کا یہ جھگڑا نہیں ہے، بلاشبہ ان کو اس کا حق حاصل ہے، جھگڑا صرف اس طریقہ اور ان حالات کا ہے جن کے اندر لکھنؤ میں مدحِ صحابہؓ پڑھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب مختلف فرقوں کے اصول اور نظریات میں اختلاف ہو تو حکومت کا اس میں مداخلت کرنا ضروری ہو جاتا ہے تاکہ امنِ عامہ قائم رہے اور آسائشِ عامہ کا توازن برقرار رہے[2]"

اس طرح ایک بار پھر حکومت یو پی نے اگر مگر کے ساتھ مدحِ صحابہ کے حق کو تسلیم کر لیا لہٰذا کمیشن کی اس رپورٹ اور گورنمنٹ گزٹ کو آزمانے کے لیے اہل سنت کی طرف سے محافلِ میلاد اور ان میں مدحِ صحابہ پڑھنے کا اعلان کیا گیا۔ ان اعلانات کے ہوتے ہی ڈپٹی کمشنر کی طرف سے شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی اور ان محافل پر پابندی لگا دی گئی۔ مقامی انتظامیہ کی اس روش سے مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ ان کی تمام قربانیاں رائیگاں ہو گئیں اور اب تک انھیں ایک خوبصورت فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے اس فیصلہ سے مسلمانوں کا کوئی بھی طبقہ مطمئن نہ تھا اور ہر ایک کو سخت مایوسی تھی عوام تو عوام تھے علمائے کرام بھی اس فیصلہ سے بالکل متفق نہ تھے چنانچہ ان کے مقتدر اور معروف علماء نے ایک اپنا متفقہ بیان شائع کیا:

علمائے کرام کا ردِّ عمل اور ان کا متفقہ فیصلہ

علماء نے اپنے خیالات کا اظہار جن الفاظ میں کیا تھا وہ یہ تھے:

"مدحِ صحابہ کے متنازع فیہ قضیہ کا جو فیصلہ حکومتِ یو پی نے ابھی حال ہی میں شائع کیا ہے، ہم

---

[1] اخبار آفتاب لکھنؤ، یکم اپریل ۱۹۳۸ء [2] گورنمنٹ گزٹ مجریہ ۲۸ / مارچ ۱۹۳۸ء، ص ۲۲، مطبوعہ لکھنؤ

نے اسے پڑھا اور ہم افسوس کے ساتھ امر کے اظہار پر مجبور ہیں کہ حکومت نے سنیّوں کا مذہبی، قانونی اور اخلاقی حق ان کو دلانے میں نہ صرف کوتاہی کی ہے بلکہ معاملہ کی اہمیت کو نظر انداز کر کے سنیّوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کیا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ سنیّوں کو نجی اور پبلک مقامات پر مدحِ صحابہ رضی اللہ عنہم پڑھنے کا حق حاصل ہے لیکن ماضی قریب میں حکومت کے حکام نے اس حق کو استعمال کرنے کے راستے میں جو مزاحمت کی ہے اس کو بھی جائز قرار دیا ہے اور صدور فیصلہ کے بعد حکومت نے اس تسلیم شدہ حق کو استعمال کرنے سے سنیّوں کو اسی فرسودہ عذرِ بارد کے ساتھ محروم کر دیا جو اس کے حکام پہلے سے کرتے رہے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ حکومت کا یہ فیصلہ اور طرزِ عمل لکھنؤ کے ۸۰؍ ہزار (۱۹۳۷ء میں) سنیّوں کے لیے ناقابلِ قبول ہے، ہمیں خطرہ ہے کہ حکومت کے اس فیصلہ سے لکھنؤ اور صوبۂ متحدہ کے سنیّوں کے مذہبی جذبات میں سکون واطمینان کی جگہ ہیجان اور اشتعال پیدا ہوگا، اگر حکومت نے سنیّوں کا یہ حق جسے وہ خود تسلیم کر چکی ہے نہ دلایا اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح نہ کی تو اگر سنیّوں نے اس کے نتیجہ میں غم وغصہ اور ازخود رفتگی کے عالم میں خلاف ورزئ احکام کا طریقہ اختیار کر لیا تو وہ معذور ہوں گے اور اس صورت میں تمام مسلمانوں کی ہمدردیاں لکھنؤ کے سنیّوں کے ساتھ شامل ہوں گی اور مسلمانانِ ہند اُن کی ہر ممکن امداد سے دریغ نہ کریں گے اور اس تمام کشمکش کی ذمہ داری صوبہ متحدہ یوپی کی حکومت پر عائد ہوگی[1]۔"

اس بیان پر جن علمائے کرام نے دستخط فرمائے تھے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر المدرسین دار العلوم دیوبند، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور، مولانا عبدالحق مدنی صاحبؒ مہتمم مدرسہ شاہی مراد آباد، مولانا سیّد فخر الدین احمدؒ صدر مدرس مدرسہ شاہی مراداٰد، مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ شیخ الادب دار العلوم دیوبند، مولانا احمد سعید صاحبؒ ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی، مولانا محمد شفیع صاحبؒ مدرس دار العلوم دیوبند، مولانا عبداللطیف صاحبؒ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا محمد اسعد اللہ صاحبؒ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ مدرسہ شاہی مراد آباد اور علاّمہ محمد ابراہیم بلیاوی صاحبؒ دار العلوم دیوبند وغیرہ۔

حکومت کے اس فیصلہ سے مسلمانوں میں ایک عام بے چینی پیدا ہوگئی اور آئندہ کے لیے

---

[1] اخبار آفتاب، لکھنؤ، ۱۷؍ اکتوبر ۱۹۳۸ء

پھر نئے سرے سے جدوجہد کا آغاز کیا گیا چنانچہ حضرت مولانا لکھنویؒ کے مشورے سے مسلمانوں کی طرف سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ظفر الملک علویؒ کے ذریعہ کانگریس وزارت سے گفت وشنید کرنے اور اس مسئلہ کو حل کرانے کی پھر دوبارہ سلسلہ جنبانی کی گئی۔

سِول نافرمانی کا آغاز

کئی مہینے کی انتھک کوششوں اور دوادوش کے بعد بھی جب حکومت کی طرف سے کوئی خاطر خواہ حل نہیں نکل سکا تو مجلس تحفظ ناموسِ صحابہ نے ۱۱؍نومبر ۱۹۳۸ء مطابق ۱۷؍رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ سے حضرت مولانا لکھنویؒ کی قیادت میں سول نافرمانی کا فیصلہ کرلیا مگر عین اس وقت جب کہ مسلمانانِ لکھنؤ ناموس صحابہ پر فدا ہونے کے لیے جوق در جوق قربان گاہ کی طرف پہنچ رہے تھے حکومت کا ایک کمیونک شائع ہوگیا جس میں مسلمانوں کو اپنے مکانات، مساجد اور محافل میلاد میں مدحِ صحابہ پڑھنے کا حق دیا گیا تھا، مزید برآں اس کمیونک میں مدحِ صحابہ کے نام سے پبلک جلسے اور جلوس کی بھی مستقبل قریب میں اجازت دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور یہ یقین دلایا گیا تھا کہ یہ وعدہ دسمبر ۱۹۳۸ء کے آخر تک ضرور پورا کردیا جائے گا، اس کمیونک کے الفاظ یہ تھے:

> ''سنیوں کے مدحِ صحابہ پڑھنے کا حق گذشتہ ۳۵ سال سے زیر بحث چلا آرہا ہے، موجودہ حکومت نے اپنے ریزولیوشن میں صراحتاً اس حق کو تسلیم کرلیا ہے۔ جہاں تک اس حق کو استعمال کرنے کا سوال ہے، سنیوں کو اس امر کی آزادی ہے کہ وہ اپنے مکانوں، مسجدوں اور میلاد کی محفلوں میں بغیر کسی مزاحمت کے مدحِ صحابہ پڑھ سکتے ہیں مگر خاص اس کے لیے محفلیں منعقد کرنا یا جلوس نکالنا یہ ایسے امور ہیں جن سے امنِ عامہ میں خلل پڑنے کا احتمال ہے اس لیے حکومت اس کی عام نگرانی کا حق رکھتی ہے جو امن میں خلل کو روکنے کے لیے ضروری ہے۔ کچھ عرصہ سے حکومت اس بات کا ارادہ کررہی ہے کہ سنیوں کو مذکورہ بالا طریقوں پر برسرِ عام مدحِ صحابہ پڑھنے کی اجازت دی جائے مگر اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ شہر لکھنؤ کی فضا پُرامن ہو لیکن حکومت کو افسوس ہے کہ بعض اوقات قانون شکنی کی دھمکیوں سے اور بعض اوقات دیگر اسباب سے ایسی پُرامن فضا پیدا نہیں ہوسکی۔
>
> فی الحال گورنمنٹ ایک طرف تو شیعوں سے اور دوسری طرف سنیوں (مجلس احرار اور

مولانا عبدالشکور صاحبؒ کی جماعت) سے گفتگو کرتی رہی ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی دوستانہ سمجھوتہ ہو جائے کیونکہ گورنمنٹ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ خود اپنے فیصلہ کا اعلان کرے اس لیے گورنمنٹ سب سے اپیل کرتی ہے کہ شہر میں امن کی فضا پیدا کریں اس سے گفتگو میں بار آور نتیجہ برآمد ہوگا اور پھر مستقبل قریب میں حکومت اپنے فیصلہ کا اعلان کر سکے گی[1]۔"

اس کمیونک کی اشاعت کے بعد سول نافرمانی کی تجویز فی الحال واپس لے لی گئی چنانچہ مولانا ظفر الملک علویؒ سکریٹری مدحِ صحابہ کمیٹی نے اس کی روشنی میں مسلمانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا:

"برادرانِ اہل سنت پر لازم ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں وہ شکریہ ادا کریں کہ ان کی پر خلوص کوششوں کا ثمرہ مرتب ہو رہا ہے اور اچھے سلیقہ کے ساتھ جس قدر ان کا مذہبی حق ان کو مل گیا ہے اس کو استعمال کریں اور جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا مطالبہ بھی پُر سکون طریقہ سے جاری رکھیں، البتہ یہ لحاظ رہے کہ مدحِ صحابہ کے ساتھ کوئی ایسا مضمون ہرگز نہ ہو جس سے کسی دوسرے فرقہ کی دل آزاری ہوتی ہو[2]۔"

حضرت لکھنویؒ اور ان کے رفقاء کی گرفتاری

حکومت نے جو وعدے کیے تھے وہ ابھی تک شرمندۂ وفا نہیں ہو سکے تھے باوجودیکہ مسلمانوں کی طرف سے ایفاء عہد کا بار بار مطالبہ کیا جاتا رہا مگر حکومت التواء پر التواء کرتی رہی حتیٰ کہ مہینوں گذر گئے لہٰذا مجبور ہو کر حضرت مولانا لکھنویؒ نے یکم محرم الحرام ۱۳۵۸ھ مطابق فروری ۱۹۳۹ء کو مندرجہ ذیل مطبوعہ اشتہار کے ذریعہ حکومت کی طرف سے دیئے گئے حق سے فائدہ اٹھانے کے لیے امین الدولہ پارک لکھنؤ میں 'یومِ فاروق' منانے کا اعلان کر دیا۔ جیسے ہی یہ مطبوعہ اشتہار عوام میں تقسیم ہوا حکومت نے اپنے سابق اعلان کا خیال کیے بغیر مولانا کو مع ان کے رفقاء کے گرفتار کر لیا۔ ان گرفتاریوں سے پورے شہر میں بے چینی پھیل گئی اور فوراً مسلمانانِ لکھنؤ نے ملک گیر ایجی ٹیشن شروع کر دیا جس میں غیر منقسم ہندوستان کے اطراف و اکناف سے مسلمانوں نے لکھنؤ آ کر اپنے کو گرفتار کرانا شروع کر دیا۔ گرفتاریوں کا یہ سلسلہ ڈیڑھ ماہ بھی چلنے نہ پایا تھا کہ تقریباً چار ہزار شیدائیانِ صحابہؓ نے یوپی کی مختلف جیلیں آباد کر دیں۔ جس اشتہار کی پاداش میں

---

1. اودھ اخبار لکھنؤ، ۱۲ر نومبر ۱۹۳۸ء و ماہنامہ الداعی، لکھنؤ، ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ

2. اخبار آفتاب، لکھنؤ، ۲۳ر نومبر ۱۹۳۸ء

یہ گرفتاریاں عمل میں آئیں تھیں وہ یہ تھا:

اعلان

برادرانِ اہلِ سنت!

یکم محرم ۲۴ھ کو خلیفہ ثانی امیر المومنین فاروق اعظم حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کی تدفین عمل میں آئی تھی اسی مناسبت سے آج یکم محرم ۱۳۵۸ھ کو بوقت چار بجے امین الدولہ پارک لکھنؤ میں ایک جلسہ عام منعقد ہوگا جس میں حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عظیم الشان کارنامے علی الخصوص فتح بیت المقدس کے حالات بیان کیے جائیں گے اور اسی جلسہ میں حضرت خلیفۂ ثانیؓ اور دیگر خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مناقب وفضائل پر مدحیہ نظمیں پڑھی جائیں گی۔ امید ہے کہ برادرانِ اہلِ سنت جوق در جوق اس مجلس متبرکہ میں شریک ہو کر داخلِ حسنات ہوں گے۔

ناچیز محمد عبدالشکور عفا عنہٗ
دار المبلغین، پاٹانالہ لکھنؤ

آپ کے رفقاء میں سے جن حضرات کو گرفتار کیا گیا تھا ان میں مولانا ظفر الملک علویؒ ایڈیٹر الناظر، لکھنؤ، مولانا عبدالرحیم فاروقیؒ مدرس عربی دار المبلغین لکھنؤ، مولانا عبدالسلام فاروقیؒ مدرس دار المبلغین، مولانا عبدالعزیز فاروقیؒ، مولانا محمد یونس خالدیؒ، حافظ محمد اسحٰقؒ سکریٹری مجلس تحفظ ملت لکھنؤ، حاجی محمد کاملؒ لکھنؤ، منشی محمد ایوب حسینؒ کاکوروی، منشی محمد خلیل اللہؒ کاکوروی اور شیخ عبدالعزیزؒ ساکن چکمنڈی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

'یوم فاروقؓ' کے اعلان پر ان گرفتاریوں کی وجہ سے سارے شہر میں جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی اور بلا کسی تحریک وتحریص کے رضاکارانہ طور پر دو دو آدمیوں کے جتھے مدحِ صحابہ پڑھتے ہوئے شارع عام پر نکلنے لگے اور گرفتاریاں دینے لگے۔ دوپہر کو مولانا لکھنویؒ اور ان کے رفقا کی گرفتاریاں ہوئیں اور شام تک تقریباً بائیس افراد سول نافرمانی کر کے جیل پہنچ گئے۔ جن حضرات کو اس موقع پر گرفتار کیا گیا تھا وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

ہمیں اے جذبۂ اسلام تجھ سے کام لینا ہے
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ علیؓ کا نام لینا ہے

دوسرے روز سے انجمن تحفظ ناموسِ صحابہ کے زیرِ اہتمام سول نافرمانی شروع ہوگئی اور

مسلمانوں نے اس سلسلہ میں اپنی قربانیاں پیش کرنا شروع کر دیں چنانچہ روزانہ چالیس پچاس افراد گرفتار ہوتے رہے یہاں تک کہ ایک ہفتہ کے اندر تقریباً پندرہ سوا افراد جیل پہنچ گئے۔ اس تحریک میں مجلس احرارِ اسلام نے جماعتی حیثیت سے شرکت کر کے اس کو بہت زیادہ تقویت پہنچائی۔ اس کے پلیٹ فارم سے بھی برابر فدائیانِ صحابہ کی جتھے اپنی گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ مولانا لکھنویؒ اور آپ کے رفقاء میں مولانا ظفر الملک علویؒ، مولانا عبدالسلام فاروقیؒ، مولانا محمد یونس خالدیؒ، حافظ محمد اسحٰقؒ اور حاجی محمد کاملؒ صاحبان میں سے ہر ایک کو ایک ایک سال کی سزا دی گئی اور سزا کے تیسرے دن ان اکابر کو لکھنؤ جیل سے باہر منتقل کر دیا گیا۔ حضرت مولاناؒ کو پہلے بلند شہر، میرٹھ اور پھر ہردوئی جیل میں رکھا گیا، مولانا ظفر الملک علویؒ غازی پور بھیجے گئے اور مولانا عبدالسلام فاروقیؒ مرزا پور جیل میں رکھے گئے۔

بے مثال مظاہرے

مجلس تحفّظ ناموسِ صحابہ نے روانہ سول نافرمانی کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ہفتہ میں جمعہ کا دن اپنے مظاہرے کے لیے مخصوص کر لیا تھا چنانچہ جمعہ ۱۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں ٹیلہ شاہ پیر محمدؒ کی تاریخی مسجد سے چالیس ہزار مسلمانوں کے درمیان انجمن تحفظ ناموسِ صحابہ کے تقریباً چار سو رضا کاروں نے اپنی گرفتاریاں پیش کیں۔ یہ منظر بھی عجیب منظر تھا کہ جب مدحِ صحابہ پر بندش کی وجہ سے ہر طرف سخت اضطراب اور بے چینی کا عالم تھا۔ بچے بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں سب کے سب بڑی خندہ پیشانی سے اپنے عزیزوں کو ناموس صحابہ پر قربان ہونے کے لیے رخصت کر رہے تھے۔ سارے مجمع پر صحابہ کرام کی ذواتِ مقدسہ کے ساتھ جو والہانہ محبت و عقیدت تھی وہ ظاہر ہو رہی تھی۔ حکومت کی اس غیر منصفانہ روش کی وجہ سے جس نے مسلمانانِ لکھنؤ کو ایک شرعی اور شہری حق سے محروم کر رکھا تھا ایک ایسا ہیجان بپا تھا جس کو ذمہ دار افسران اور اربابِ حل و عقد نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ ایک محتاط اندازے سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس روز ستر ہزار سے کم مجمع نہیں تھا، اس اجتماع میں صرف خواتین ہی کی تعداد تقریباً سات ہزار تھی جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس تحریک میں کس قدر جوش و خروش تھا۔ اس تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں نہ صرف عوام بلکہ سیکڑوں تعلقدار اور زمیندار خاندانوں کے افراد بھی شریک تھے، یہ تمام مظاہرین شہر کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں باہر سے آئے تھے۔

خواتین میں اس قدر جوش واضطراب تھا کہ وہ ہر بار بے چین ہوکر اس بات کی درخواست کرتی تھیں کہ ان کو بھی اس تحریک میں عملی حصّہ لینے کی اجازت دی جائے۔ بہت سے کمسن بچے جب ان کو جیل جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی تو وہ رونے لگتے تھے اور کسی طرح سمجھانے سے بھی نہیں مانتے تھے۔ ٹیلہ کی تاریخی مسجد کے اس اجتماع میں ہزاروں لوگ رات ہی سے آ گئے تھے اور تقریباً دس ہزار افراد رات بھر وہیں مقیم رہے۔ مجمع پر کنٹرول کرنے اور ان کو سہولت پہنچانے کے لیے متعدد کیمپ لگا دیئے گئے تھے، ایک کیمپ پردہ دار خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اسی طرح مقامی اور بیرونی رضا کاروں کے لیے بھی علیحدہ علیحدہ کیمپ نصب کیے گئے تھے، انھی حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے حضرت مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''صوبے کے اطراف وجوانب ہی سے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر حصّہ میں جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی یہاں تک کہ بمبئی، پنجاب، فرنٹیر اور بنگال وغیرہ سے قانون شکنی کے لیے جتھے آنے لگے اور یہ سلگتی ہوئی آگ شعلے مارنے لگی۔ بعض بعض ایام میں گرفتاریوں کی تعداد پانچ چھ سو تک پہنچ گئی تھی اور اس طرح منظم طریقہ پر یہ سول نافرمانی ہوئی کہ دیکھنے والے عش عش کرنے لگے۔ مسلمانوں کے اس قدر جوش وخروش اور ہماری جدوجہد کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہو کر رہا۔''[1]

بے پناہ جوش

اس مظاہرے کو دیکھنے کے بعد ہر شخص کا خیال یہی تھا کہ اس پُرخلوص طاقت کے سامنے حکومت کو جھکنا پڑے گا۔ مجمع کی کثرت کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک بالکل جام تھا اور منٹوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہو رہا تھا۔ نعرۂ تکبیر کی گونج ہجوم کے دلوں کو اور بھی گرما رہی تھی۔ خواتین اپنے بیٹوں اور شوہروں کو رخصت کر رہی تھیں اور ان کو اس بات کی تلقین کر رہی تھیں کہ اب جیل سے اپنا حق حاصل کیے بغیر واپس نہ آنا۔ جاں نثارانِ صحابہ کے اس جم غفیر میں جہاں ہر شخص اپنے آپ کو آلام ومصائب اور قید وبند کی آزمائش میں ڈالنے کے لیے بے تاب تھا وہیں ایک خاتون نے اپنے خورد سال بچے کو اس طرح رخصت کیا کہ جس وقت وہ اُسے اپنے سینے سے لگا رہی تھی تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بچے نے پوچھا اماں! آپ کیوں رو رہی ہیں ماں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ الفاظ ادا کیے جو تحریک مدح صحابہ کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل

---

[1] ''مسئلہ مدح صحابہ پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا بصیرت افروز بیان'' مرتبہ مولوی مشتاق احمد لدھیانویؒ جوائنٹ سکریٹری مجلس احرار اسلام یو پی، ص ۳-۴

ہیں۔ ماں نے جواب دیا:

بیٹا میں اس لیے نہیں روتی کہ تم جیل جارہے ہو بلکہ میں اس لیے رو رہی ہوں کہ تمھارے جیل جانے کے بعد اب میرے پاس اور کوئی متاعِ عزیز باقی نہیں رہتی ہے کہ میں اُسے ناموسِ صحابہ پر قربان کرسکوں[1]۔''

حضرت مدنیؒ کا خطاب

فدائیانِ صحابہ کے اس بے پناہ ہجوم سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ خطاب فرمارہے تھے اور سارا مجمع ان کے ارشاداتِ عالیہ کو گوشِ دل سے سن رہا تھا۔ خطاب کے درمیان میں ایک خاتون نے حضرت مدنیؒ کی خدمت میں ایک مکتوب اور کچھ رقم ارسال کی، مکتوب کا مضمون یہ تھا کہ جب تاریخ اسلام میں اس قسم کی مثالیں موجود ہیں کہ خواتین نے جہاد میں شرکت کی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمیں سول نافرمانی کی اجازت نہیں دی جاتی۔ حضرت مدنیؒ نے اس کا جواب یہ دیا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ عورتیں اس جہاد میں شریک ہوں، شریعت نے عورتوں کی صف نماز باجماعت میں بھی سب سے پیچھے رکھی ہے اس۔لیے انھیں اس جہاد میں اُسی وقت شرکت کی اجازت ہوگی جبکہ خدانخواستہ مردوں میں کوئی باقی نہ رہے گا۔

بنیادی طور پر حضرت مولاناؒ اور ان کے رفقاء کے مطالبات حکومت یوپی سے حسب ذیل تھے:

۱۔ مدحِ صحابہ کا حق سنیّوں کے لیے لکھنؤ میں تمام سال کے دنوں میں اُسی طرح تسلیم کیا جائے جس طرح تمام اُن قوموں کے لیے تسلیم کیا گیا ہے جو ہندوستان میں بستی ہیں۔

۲۔ ان تین دنوں (دس محرم، ۲۰ رصفر اور ۲۱ ررمضان) میں مدحِ صحابہ پڑھنے کی ممانعت کی قید بالکل اٹھالی جائے۔

۳۔ پبلک مقامات پر جلسہ ہائے عامہ بنام مدحِ صحابہ اور جلوس کی اجازت دی جائے۔

۴۔ مدحِ صحابہ پر کوئی ناگزیر پابندی باقی نہ رکھی جائے۔

۵۔ جلوس مدحِ صحابہ اور جلسۂ عامہ کو عملی طور پر حکومت جاری کرائے۔

یہ مطالبات کوئی غیر معمولی نہ تھے اور نہ ہی ان میں کوئی انوکھی بات تھی مگر حکومت نے نہایت بے اعتنائی اور ستم ظریفی کا مظاہرہ کیا جس کے جواب میں مسلمانوں نے بھی غیرتِ

---

[1] اخبار آفتاب، لکھنؤ، ۳۱ ر مارچ ۱۹۳۹ء

اسلامی اور حمیتِ قومی کا ثبوت دیتے ہوئے اس ناپاک قانون کو پائمال کرانے پر ڈٹ گئے۔

حضرت مدنیؒ کی تائید

حضرت مدنیؒ ان تمام حالات کو دیکھ رہے تھے، انھیں بے حد دکھ اور ملال تھا کہ ان کی ساری کوششیں رایگاں جارہی ہیں اور بے چارے مسلمان اپنے جائز مذہبی حق کے مانگنے پر بے خطا و قصور جیلوں میں ٹھونسے جارہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی اس سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا اور مجلسِ احرار اسلام بھی ان کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوگئی۔ حضرت مدنیؒ نے اس موقع پر ایک طویل بیان جاری فرمایا جس میں آپ نے مدحِ صحابہ کی مذہبی حیثیت اور اس کے وجوب کو ثابت کرتے ہوئے شرعی طور پر مسلمانوں سے اپیل کی کہ:

> ''۳۱ر مارچ ۱۹۳۹ء کو مسلمانوں کو چاہیے کہ بعد نماز جمعہ جلسہ کریں اور اس میں گورنمنٹ کے اس فعل پر کہ اس نے مسلمانوں کے مذہبی، انسانی و شہری حق مدحِ صحابہ میں ناجائز مداخلت کرکے ان کے جذبات کو ایسی ناقابلِ برداشت ٹھیس لگائی ہے جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمان پروانہ وار جیل کی کوٹھریوں میں بند ہوچکے ہیں، صدائے احتجاج بلند کریں اور مطالبہ کریں کہ وہ جلد از جلد مدحِ صحابہ کے جلسوں وجلوسوں پر سے ہر قسم کی پابندیاں اٹھالے اور جس طرح دوسری اقوام اور مذاہب کے لیے آزادی ہے کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کے نام پر جلسے وجلوس پبلک مقامات پر منعقد کرسکتے ہیں اُسی طرح سنّیوں کا بھی عمل وحق تسلیم کرلے اور انھیں جاری کرائے اور اگر کوئی شخص یا قوم سنّیوں کو اس حق پر عمل کرنے سے روکے تو اس کو قرار واقعی سزا دے ہمیں چاہیے کہ ہم ان مجاہدینِ ملّت کو مبارکباد دیں جنھوں نے ملّت و مذہب اور حق قومی کے لیے اپنے آرام وراحت کو تجتے ہوئے قانون شکنی اور سول نافرمانی اختیار کی ہے اور اسی طرح ان کے اعزا واقرباء کو بھی اس کی مبارکباد پیش کریں[۱]۔''

اس بیان سے یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ تحریک مدحِ صحابہ سے حضرت مدنی نوراللہ مرقدہٗ کو کس قدر تعلق اور لگاؤ تھا اور وہ ہر طرح سے اس کے کتنے حامی وناصر تھے۔ آپ برابر کانگریس گورنمنٹ سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے اور اس گفت وشنید کا سلسلہ برابر جاری تھا کہ کسی طرح گورنمنٹ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ ان جائز مطالبات کو تسلیم کرلے۔

---

[۱] مدحِ صحابہ ایجی ٹیشن کا شرعی پروگرام، از حضرت مدنیؒ، ص ۴

حکومت کا دوسرا کمیونک

مولانا لکھنویؒ کی گرفتاری کی وجہ سے پورے صوبہ میں جو اشتعال پھیل چکا تھا اور مسلمانوں کے اندر جو اضطراب و بے چینی کی لہر دوڑ چکی تھی ان سب سے مجبور ہو کر حکومت کو جھکنا پڑا اور بالآخر ۳۰/مارچ ۱۹۳۹ء کی شب میں ساڑھے دس بجے جبکہ احاطۂ شیخ شوکت علی لکھنؤ میں مسلمان ایک پبلک جلسے میں مشغول تھے اچانک حکومت کا ایک دوسرا کمیونک صادر ہو گیا جو مولانا محمد اسماعیل سنبھلیؒ (م ۱۹۷۵ء) ایم۔ ایل۔ اے رکن جمعیۃ علماء ہند و صدر مجلس احرار لکھنؤ کے سوالات کے جواب میں شائع ہوا تھا، اس کمیونک میں یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ:

"گورنمنٹ اپنے اعلان ماہِ نومبر ۱۹۳۸ء میں یہ کہہ چکی ہے کہ سنّیوں کو اپنے مکانات مسجدوں اور میلاد شریف کے موقعوں پر بغیر کسی مداخلت کے مدحِ صحابہ کرنے کا حق ہے۔ اس وقت جو امر تصفیہ طلب باقی رہ گیا تھا وہ یہ تھا کہ گورنمنٹ سنّیوں کو عام جلسے یا جلوس کی شکل میں مدحِ صحابہ پڑھنے کا موقع کب دے گی؟ اس بابت اس بیان میں کہا گیا تھا کہ گورنمنٹ یہ اجازت دینا چاہتی ہے لیکن ایسی صورت میں جبکہ شیعہ و سنّیوں سے اس مسئلہ میں گفتگو کی جا رہی ہو گورنمنٹ کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنی جانب سے کوئی فیصلہ دے۔ اُس وقت سے اب تک اس مسئلہ کی طرف گورنمنٹ کی خاص توجہ رہی ہے...... اس دوران بعض حلقوں سے تین دن کی ممانعت کے متعلق اشتباہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ گورنمنٹ اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی کہ اس معاملہ پر مکرر غور کیا جائے کیونکہ سنّیوں کا پبلک مقامات میں مدحِ صحابہ کرنے کا حق بغیر کسی دن کے استثناء کے گورنمنٹ کے متذکرہ بالا اعلان میں تسلیم کیا جا چکا ہے...... لہٰذا بسلسلۂ اعلان ماہ نومبر ۱۹۳۸ء گورنمنٹ اعلان کرتی ہے کہ سنّیوں کو پبلک جلسے اور جلوس میں مدحِ صحابہ کرنے کا حق ہر حالت میں بارہ وفات کے دن ہر سال اس شرط پر دیا جایا کرے گا کہ وقت، مقام اور راستہ کا تعین حکّام ضلع کریں گے[1]۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت نے اس کمیونک میں صاف اور صریح طور سے مسلمانوں کے مطالبات کو منظور کر لیا تھا مگر حسب سابق اس میں بھی آئینی زبان والفاظ کو استعمال کیا گیا تھا اور اپنے وقار و مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے سابقہ بیانات کی وضاحت کے طریقہ کو ہی اختیار کیا گیا تھا، کاش ایسا نہ کیا جاتا بلکہ مختصر اور عام فہم و سلیس عبارت میں صرف یہ اعلان کر دیا جاتا کہ ہم

---

[1] گورنمنٹ کمیونک، مئی ۱۹۳۹ء، ص ۱۲۷

نے تمھارے فلاں فلاں مطالبات کو منظور کرلیا ہے تو کسی کو شک وشبہ کرنے کی گنجائش باقی نہ رہتی، حضرت مدنیؒ اس کمیونک سے مطمئن ہو گئے تھے کہ اس کی روشنی میں ہمارے سارے مطالبات کو حکومت نے منظور کرلیا ہے لہٰذا آپ کی پختہ رائے یہ ہوگئی کہ سول نافرمانی اور مدحِ صحابہ ایجی ٹیشن کو ملتوی کردینا چاہیے کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

سولِ نافرمانی کا التواء

گذشتہ صفحات میں یہ لکھا جاچکا ہے کہ ۳۰ / مارچ ۱۹۳۹ء کی شب میں احاطہ شیخ شوکت علی مرحوم میں مسلمان ایک پبلک جلسے میں مشغول تھے جب اس جلسے میں کمیونک کی اطلاع پہنچی اور اس کی تفصیلات کا علم ہوا تو منتظمین جلسہ نے عوام کے سامنے اس کو رکھ دیا اور مشورہ طلب کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اہل جلسہ کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ حضرت مولانا لکھنویؒ سے جو اُس وقت ہر دوئی جیل میں مقید تھے استصواب کیا جائے ان کی جو رائے ہو وہی ہم سب کی رائے ہوگی چنانچہ ۳ / اپریل ۱۹۳۹ء کو ایک وفد ہر دوئی جیل جاکر مولانا سے ملا اور ان کے سامنے تمام حالات رکھے اس لیے آپ نے باضابطہ حسب ذیل اعلان بغرض اشاعت مرحمت فرمایا:

برادرانِ اہلِ سنّت ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

''گورنمنٹ کا اعلان پڑھ کر اگرچہ میں مطمئن نہیں ہوا لیکن یہ معلوم کرکے کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے مطمئن ہوکر التواء سول نافرمانی کا اعلان کردیا ہے لہٰذا اب میں بھی آپ سب کو ہدایت کرتا ہوں کہ آپ سب لوگ بھی اس وقت سول نافرمانی ملتوی کردیں۔

محمد عبدالشکور عفاعنہ اسیر مدحِ صحابہ

از ڈسٹرکٹ جیل ہردوئی

جیل کی مہر

۱۲ / صفر ۱۳۵۸ھ

دوسرے دن ۴ / اپریل ۱۹۳۹ء کو مجلس تحفظ ناموس صحابہ لکھنؤ نے مولاناؒ کی اس تحریر کو ہینڈ بل کی شکل میں شائع کرکے یہ اعلان کردیا کہ اب مجلس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس وقت تحریک سول نافرمانی کو ملتوی کردیا جائے۔ چنانچہ اس کمیونک اور اس فیصلہ سے مسلمانوں کا عام طبقہ مطمئن ہوگیا اور فی الحال تحریک ملتوی کردی گئی۔

اٹھارہواں باب

جلوسِ مدحِ صحابہؓ کی اجازت

تیس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد حکومت یوپی نے اپنے وعدے کے مطابق ۳۰ مئی ۱۹۳۹ء کو جلوس مدحِ صحابہ نکالنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ یہ جلوس نہایت شان وشوکت اور تزک واحتشام کے ساتھ بڑے پُرامن طریقے پر نکالا گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس جلوس میں لگ بھگ ڈھائی لاکھ مسلمانوں نے حصّہ لیا تھا۔ جلوس کی لمبائی دو میل سے زائد تھی۔ عیدگاہ عیش باغ لکھنؤ سے یہ جلوس ڈیڑھ بجے دن میں روانہ ہوا اور ۶ بجے شام کو چار باغ گراؤنڈ پر پہنچ کر ایک جلسۂ عام میں تبدیل ہوگیا، یہ پورا راستہ پیدل چلنے سے ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ میں طے ہوتا ہے مگر جلوس نے کثرت ہجوم کی وجہ سے اتنے کم فاصلہ کو پانچ گھنٹہ میں طے کیا۔ جلوس کیا تھا انسانوں کا ایک بہتا ہوا سمندر معلوم ہوتا تھا جس میں ہزاروں قسم کے رنگین پرچم فضا میں لہرا کر ایک عجیب نظارہ پیش کررہے تھے، جلوس میں تقریباً چالیس ہزار چھوٹے پرچم اور چار ہزار بڑے پرچم لائے گئے تھے۔ ان تمام پرچموں کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ ان سے اسلام کی تاریخی عظمت ظاہر ہو اس لیے ہر ایک پرچم کو کسی نہ کسی صحابی کے نامِ نامی سے موسوم کیا گیا تھا۔

جلوس کی ترتیب اور انتظام

جلوس کی ترتیب میں اتنے بڑے مجمع کو کنٹرول کرنا آسان نہ تھا لیکن اس کے باوجود جلوس نہایت پُرسکون اور بہت ہی مہذب اور شائستگی کے ساتھ نکلا۔ غالباً اس وقت ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا مذہبی جلوس تھا جو اتنی شان وشوکت کے ساتھ نکالا گیا تھا جس کا اعتراف خود حکامِ وقت اور ذمہ دارانِ شہر نے بھی کیا تھا۔ جلوس میں حصّہ لینے کے واسطے یوپی کے ہر ضلع سے مسلمان

بڑے ولولے اور جوش کے ساتھ آئے تھے، یو پی کے علاوہ بنگال، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، راجستھان، اڑیسہ اور پنجاب کے بھی مختلف مقامات کے لوگ شریکِ جلوس تھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں ہندو حضرات بھی شامل ہوئے تھے اور مدحِ صحابہ کے اشعار ان کی زبانوں پر تھے، سکھوں کی طرف سے بھی شرکاء جلوس کے لیے پانی اور شربت کی سبیل بڑے حسن وسلیقہ سے رکھی گئی تھی جس میں پان والا یچی کا بھی انتظام تھا۔

شہر کی سقّہ برادری کی طرف سے جلوس کے راستوں پر موٹروں کے ذریعہ پانی پلانے کا انتظام کیا گیا تھا جس میں تقریباً پانچ ہزار افراد اس برادری کے شریک تھے۔ جلوس کی ترتیب اس طرح سے تھی کہ جب وہ عیدگاہ سے روانہ ہوا تو مجلس تحفظ ناموس صحابہ کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا گیا کہ مجلس احرار کا پرچم سب سے آگے رہے گا مگر مجلسِ احرار کی رائے یہ ہوئی کہ سب سے آگے لکھنؤ کے مسلم طلباء کا پرچم رکھا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، طلباء کے پرچم کے بعد مجلسِ احرار کا پرچم تھا جس کی کمانڈ اس کے مخصوص ارکان کر رہے تھے جن میں مشہور قومی رہنما اور عالم دین مولانا محمد قاسم شاہجہاں پوریؒ (م ۱۹۷۶ء) دینی جلسوں کے مشہور خطیب مولانا ابوالوفاء شاہ جہاں پوریؒ (م ۱۹۸۰ء) حافظ مشتاق احمد لدھیانویؒ اور جناب وصی احمدؒ (م ۱۹۷۲ء) سکریٹری مجلسِ احرار شامل تھے۔ جلوس میں ایک دستہ موٹر سواروں کا تھا اس کے بعد سائیکل سواروں کا دستہ تھا اور پھر اس کے بعد مجلس تحفظ ناموسِ صحابہ کا پرچم تھا جس کے دس ہزار رضا کار اپنے بیج اور پرتلوں سے آراستہ مصروفِ انتظام تھے، اس کی قیادت حکیم خواجہ جمیل الدین (م ۱۹۸۱ء) کر رہے تھے جن کے ماتحت آٹھ لیفٹننٹ تھے اور ان کے ماتحت پچیس کیپٹن تھے جو ایک فوجی نظم کے ساتھ باقاعدہ جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ مجمع پر کنٹرول کیا جا رہا تھا جو مختلف کاروں پر نصب کیے گئے تھے۔ ان کاروں کو مجلس تحفظ ناموس صحابہ کے رضا کار اپنے ہاتھوں سے کھینچ رہے تھے۔ انھیں میں سے ایک کار میں جناب مولوی مجید حسنؒ مالک اخبار مدینہ بجنور اور مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ مدیر النجم بیٹھے تھے جو جلوس کو ضرورت کے مطابق ہدایات دے رہے تھے، جلوس میں اس بات کا اہتمام خاص طور سے رکھا گیا تھا کہ مجمع چار چار آدمیوں کے بیچ میں رہے۔ جب یہ اسٹیشن روڈ سے گذر رہا تھا تو اس کا نظارہ قابلِ دید تھا، ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ ایک پُرسکون سمندر ہے جو بغیر تلاطم کے بہتا چلا جارہا ہے، پرچموں کی کیفیت دور سے جہازوں کے اڑتے ہوئے بادبانوں کا منظر پیش کررہی تھی۔ یہ پورا جلوس بڑے پُرامن طریقے پر ٹھیک ۶ بجے شام کو چار باغ گراؤنڈ پر پہنچا جہاں پورا میدان انسانوں سے بھرا ہوا تھا اور فضا میں ہزاروں پرچم لہرارہے تھے، نعرۂ تکبیر اور نعرۂ چار یاری کی صدائیں اور مدح وستائش کے پُرکیف نغمے فضا میں گونج رہے تھے:

نعرہ کہتا تھا کہ تا چرخِ زحل جاؤں گا
بلکہ میں توڑ کر اس کو بھی نکل جاؤں گا

حضرت لکھنویؒ کی تقریر

چار باغ گراؤنڈ میں جلوس ایک جلسہ کی صورت میں تبدیل ہوگیا تھا، اس موقع پر مولانا علیہ الرحمۃ نے ایک مختصر تقریر فرمائی جس میں آپ نے چند آیات قرآنی کی تلاوت کی اور فرمایا کہ آج خدا کے فضل سے ہم لوگوں کی خوشی کا دن ہے، ہمیں مسرت ہے کہ تیس بتیس سال کی انتہائی کوششوں کے بعد ہمیں مدحِ صحابہ کے جلوس نکالنے کا حق ملا ہے۔ میں اس سلسلہ میں ان تمام رضاکاروں اور شرکاء جلوس کا نہ صرف شکریہ ادا کرتا ہوں بلکہ ان کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں جنھوں نے امن وسکون کے ساتھ اس میں شرکت کی ورنہ اتنے بڑے مجمع میں پولیس بھی انتظام نہیں کرسکتی تھی۔ آپ نے دوران تقریر میں بتایا کہ حکام کو اُمید نہ تھی کہ جلوس اتنے امن وسکون کے ساتھ نکل سکے گا۔ انھیں ڈرایا گیا تھا کہ جلوس سے نقض امن کا اندیشہ ہے اس لیے وہ بہت خائف تھے لیکن ہمارے جلوس نے یہ ثابت کردیا کہ اس کو کوئی حکومت روک نہیں سکتی اور اتنے بڑے مجمع کے جذبات کو ٹھکرایا نہیں جاسکتا۔ آپ نے مجمع سے فرمایا کہ مولانا ظفر الملک علوی ابھی جیل سے رِہا نہیں کیے گئے ہیں، میں کل شب اُن سے بارہ بنکی جیل میں مل کر آرہا ہوں اس لیے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ یہ پورا مجمع حکومت سے بلاشرط مولانا کی رہائی کا پُرزور مطالبہ کرے جس کی سارے مجمع نے تائید کی۔ آپ نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا کہ جس صبر وسکون کے ساتھ آپ حضرات نے اس جلسہ میں شرکت کی ہے اُسی صبر وسکون کے ساتھ

آپ لوگ یہاں سے منتشر بھی ہو جائیں، چنانچہ مجمع نہایت خاموشی کے ساتھ منتشر ہونے لگا...... اس طرح کانگریس وزارت تو ایک ہی جلوس نکلوا کر مستعفی ہو گئی مگر دوسرے سال یعنی ۱۹۴۰ء میں گورنر یو پی نے باوجود شیعوں کی انتہائی مخالفت کے جلوسِ مدحِ صحابہ نکلوایا جو گذشتہ سال سے بھی زیادہ کامیاب اور عظیم الشان تھا۔

شیعوں کا جلوس قدحِ صحابہ

شیعوں کو کسی طرح یہ بات گوارا نہ تھی کہ سنی کسی حالت میں بھی اپنے بزرگوں کا نام لے سکیں چنانچہ ۱۹۳۹ء ہی سے وہ جلوس مدحِ صحابہ کو ختم کرانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں لکھنؤ میں متعدد بار فسادات بھی ہوئے مگر جب سنیوں نے ہر طرح سے پُر امن رہنے کا ثبوت دیا تو انھوں نے نہایت خفیہ طور پر حکومت سے ساز باز کر کے یہ کارروائی کی کہ جلوس کے متعلق تمام اختیارات جواب تک حکومت کو حاصل تھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کی طرف منتقل کرا دیئے۔ سادہ لوح سنی اس سازش سے بالکل بے خبر تھے کہ ان کے حق میں کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ غرضیکہ اپریل ۱۹۴۱ء کی بارہ ربیع الاول کے موقع پر جلوس مدحِ صحابہ نکالنے کے لیے سنیوں نے جب ڈپٹی کمشنر کے یہاں درخواست دی تو یہ معلوم کر کے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس سال شیعوں کو بھی اسی تاریخ میں ایک جوابی جلوس ''قدح صحابہ'' کے نام سے نکالنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ اخبارات میں بھی حکومت کا یہ اعلان شائع ہوا کہ شیعوں کو ایک تنقیدی جلوس (قدح صحابہ) نکالنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

مسلمانوں میں اضطراب و بے چینی

حکومت کے اس اعلان نے سارے شہر میں ایک آگ سی لگا دی اور یہاں کا بچہ بچہ ناموس صحابہ پر جان دینے کے لیے ہمہ تن تیار ہو گیا۔ دوسرے دن صبح کو احاطہ شیخ شوکت علی لکھنؤ میں تحفظ ناموسِ صحابہؓ کا جلسہ طلب کیا گیا۔ مسلمانوں کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ سارے شہر کا کاروبار بالکل بند، سڑکیں ویران، اور گلیاں سنسان تھیں۔ مسلمانوں نے اس نامعقول اقدام کے غم میں اس قدر سخت احتجاج کیا کہ اکثر گھروں میں اس روز کھانا نہیں پکایا گیا اور بیشتر لوگوں نے

روزہ رکھ لیا۔ اس جلسہ میں سارے شہر کے مسلمان جمع ہوئے اور مولانا کلیم اللہ آبادیؒ[1] (م ۱۹۹۲ء) مبلّغ دارالمبلّغین لکھنؤ نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔ ایک اندازے کے مطابق اس جلسہ میں تقریباً بیس ہزار مسلمانوں نے مولانا مرحوم کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی اور عہد کیا کہ وہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے مگر جلوس قدح صحابہ کو نکلنے نہ دیں گے، اس 'جرم' کی پاداش میں مولانا کلیم اللہ صاحب الہ آبادیؒ، غازی منّے خاںؒ (۱۹۵۱ء) اور جناب وصی احمد صاحبؒ (م ۱۹۷۲ء) سکریٹری مجلس احرار کو اسی وقت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ غرضیکہ حکومت کی اس نامعقول روش سے سارا شہر بے چین و مضطرب ہو گیا، تین دن تک پورے شہر میں مکمل ہڑتال رہی، ہندو اور مسلمان کسی نے بھی اپنی دوکانیں نہیں کھولیں لہٰذا بارہ ربیع الاوّل کو جبکہ مسلمانان لکھنؤ کی ایک جماعت عظمت صحابہ کا جلوس نکالنے کی تیاری کر رہی تھی اور ایک دوسری جماعت جلوس قدحِ صحابہ کو روک کر ناموس صحابہ پر قربان ہونے کے لیے سر سے کفن باندھ کر میدانِ عمل میں نکلنے والی تھی اُس وقت ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کو اپنی غیر دانشمندانہ روش کا احساس ہوا اور انھوں نے پورے شہر میں ۳۶ گھنٹے کا کرفیو نافذ کر کے جلوس قدح صحابہ کو روک دیا مگر ساتھ ہی ساتھ سنّیوں پر بھی یہ ظلم روا رکھا کہ ان کا جلوسِ مدح صحابہ بھی دفعہ ۱۴۴ کی زد میں آ کر رُک گیا۔ لکھنؤ کے مظلوم مسلمان اگر ایک طرف قدح صحابہ کا جلوس رُک جانے سے خوش تھے تو دوسری طرف انھیں عظمتِ صحابہ کا عظیم الشان جلوس بند ہو جانے کا شدید غم تھا جس کو پچیس تیس سال کی جانی و مالی قربانی دے کر حاصل کیا گیا تھا۔

---

[1] جناب مولانا کلیم اللہ صاحب بن حکیم احمد اللہ صاحب موضع للہٹ ڈاکخانہ پھول پور ضلع الہ آباد یوپی میں یکم جنوری ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ۱۹۲۰ء میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کرنے کے بعد دارالمبلّغین لکھنؤ میں حضرت لکھنویؒ سے مناظرہ اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی تربیت حاصل کی۔ تعلیم سے مکمل فراغت کے بعد دارالمصنفین لکھنؤ ہی میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک درس و تدریس، تبلیغ و مناظرہ کے شعبہ میں کام کرتے رہے۔ تحریک مدحِ صحابہ کے بڑے پُرجوش کارکن تھے۔ تقریر اور خطابت کا بھی آپ کو زبردست ملکہ حاصل تھا۔ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ کی وفات کے بعد ۱۹۷۴ء میں دوبارہ دارالمبلّغین آ کر یہاں کا نظم و نسق سنبھالا۔ یہ سلسلہ ۱۹۷۷ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد صحت کی خرابی کی وجہ سے یہاں سے سبکدوشی حاصل کر کے اپنے وطن چلے گئے، جہاں ۷ر فروری ۱۹۹۲ء میں وفات ہوگئی۔

حضرت لکھنویؒ کی دوبارہ گرفتاری

بالآخر اُسی روز عیدگاہ عیش باغ لکھنؤ میں فوری طور پر مسلمانانِ شہر نے جمع ہوکر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کر کے اور مدحِ صحابہ پڑھ کر اجتماعی گرفتاری پیش کردی۔ چنانچہ ایک ہزار مسلمان گرفتار کر کے جیل بھیج دیئے گئے۔ معززین شہر نے مسلمانوں کی اس بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے حکومت سے گفت وشنید شروع کی۔ ڈپٹی کمشنر نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی مگر مولانا لکھنویؒ نے صرف تین دن کی مہلت دے کر وقتی طور پر ایجی ٹیشن روک دیا۔ اس کے بعد معززین شہر کا نمائندہ جلسہ گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں چودھری نعمت اللہ صاحبؒ (م ۱۹۶۰ء) سابق جج الٰہ آباد ہائی کورٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ چودھری صاحب مرحوم نے نہایت زبردست دلائل کے ساتھ احتجاجی تقریر فرمائی اس کے بعد متعدد ریزولیوشن پاس کیے گئے جن میں حکومت سے سنیوں کے مطالبات پورے کیے جانے پر زور دیا گیا، ان مجوزہ مطالبات کو ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیج دیا گیا مگر جب تین دن کی مہلت کی مدت گذر گئی اور حکومت نے مطالبات منظور نہیں کیے تو مولانا لکھنویؒ نے باوجود اپنی پیرانہ سالی کے ۴ر اپریل ۱۹۴۱ء کو عظمت صحابہ پر اپنی گرفتاری پیش فرمادی۔ آپ کی گرفتاری سے پورے اودھ میں ایک ہلچل سی پڑ گئی۔ اسی وقت تقریباً نو سو مسلمانوں نے اپنے آپ کو مدحِ صحابہ پڑھ کر گرفتار کرادیا، اس موقع پر لگ بھگ ڈھائی مہینہ آپ جیل میں رہے۔ ابتداءً آپ کو لکھنؤ جیل میں رکھا گیا مگر بعد میں حکام نے بنارس جیل میں منتقل کردیا تھا۔

ملک کے دوسرے مقامات پر کشیدگی

تحریک مدحِ صحابہ کے اس موڑ پر آگ کی وہ لپٹ جواب تک لکھنؤ اور یوپی کے مسلمانوں کو خاکستر کئے ڈال رہی تھی اب اس کی تپش اور سوزش ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پہنچنے لگی۔

چنانچہ اب اس تحریک کو مجلس تحفظ ناموس صحابہ، مجلس احرار اسلام اور جمعیۃ علماء ہند نے متحدہ طور پر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حکومت نے اس مرتبہ تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، ایک

طرف جیل میں اسیرانِ مدحِ صحابہ پر کوئی ایسی سختی نہ تھی جو نہ کی گئی ہو تو دوسری طرف غریب مسلمانوں پر بے طرح جرمانے کیے گئے اور نہایت بے رحمی سے ان کے مکانات اور مال و اسباب کو ضبط و نیلام کر کے جرمانے کی رقمیں وصول کی گئیں۔ اب تحریک چلانے کے لیے ذمّہ داروں میں سے کوئی باقی نہ بچا تھا جو گرفتار نہ کر لیا گیا ہو۔ مجلس تحفظ ناموس صحابہؓ کے تمام ذمّہ دار رہنما گرفتار کیے جا چکے تھے اور مجلس احرارِ اسلام و جمعیۃ علماء ہند کے ذمّہ داروں کی بھی گرفتاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

لکھنؤ کے علاوہ باہر سے بھی تحریک کی امداد کرنے والوں کو حکومت نہایت شدّت کے ساتھ کچل رہی تھی۔ بعض مقامات پر تحریک کی مدد کرنے والوں کو دفعہ ۱۲۹ کے تحت وہیں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ پنجاب سے تحریک مدحِ صحابہ میں شرکت کے لیے آنے والوں کو شدومد کے ساتھ روکا جا رہا تھا مگر پورا پنجاب ایک سیلاب کی طرح بہہ کر لکھنؤ آنے کو تیار تھا مگر چند ہی قافلے آئے تھے کہ حکومت پنجاب نے مولانا ظہور احمد بگویؒ ایڈیٹر ماہنامہ شمس الاسلام و قائدِ فوجِ محمدی بھیرہ شاہ پور اور پیرزادہ مولانا زین الدینؒ کو دفعہ ۱۲۹ کے تحت گرفتار کر لیا۔

ان حضرات کی گرفتاری سے تحریک کو اور بھی زیادہ تقویت پہنچی اور اب خود پنجاب میں مستقل طور پر فوجِ محمدی کی طرف سے مدحِ صحابہ ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔ مختلف شہروں سے قافلے لکھنؤ آنے کے لیے اسٹیشن تک آتے اور دفعہ ۱۲۹ کے تحت گرفتار کر لیے جاتے۔ اس طرح سیکڑوں مسلمان پنجاب میں اسیر مدحِ صحابہ ہونے کے اعزاز سے مفتخر ہوئے[1]

اس طرح حکومت نے تحریک مدحِ صحابہ کو کمزور بنانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر آفریں باد برایں ہمت مردانہ را کہ اہل لکھنؤ پورے انہماک کے ساتھ کامل تین مہینے تک نہایت بے جگری سے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ اگر یہ تحریک ابھی ملتوی نہ کی جاتی تو یقیناً سالہا سال تک جاری رہتی اور سارا ملک لکھنؤ کے ساتھ ایجی ٹیشن کرتا رہتا مگر نواب صاحب چھتاری اور خان بہادر غضنفر اللہ صاحب کے اصرار سے اس تحریک کو اس وعدے پر ملتوی کر دیا گیا کہ نواب صاحب چھتاری حکومت سے بات چیت کر کے سنّیوں کے غصب شدہ حق کو واپس دلائیں گے۔

---

[1] ماہنامہ الداعی، لکھنؤ، ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ

اُنیسواں باب

شیعی تبرّا ایجی ٹیشن

قوموں کی تاریخ میں بعض ایسے بھی مقام آتے ہیں کہ جب وہ کسی جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر کچھ ایسے اقدام کر گزرتی ہیں جن سے ان کے مصنوعی رنگ وروپ کے اصلی خدوخال دنیا کے سامنے آجاتے ہیں اور ان کے ظاہر و باطن کا فرق واضح ہو جاتا ہے اور اس سے پھر جو نقصان وخمیازہ بھگتنا پڑتا ہے وہ کئی نسلوں تک چلتا رہتا ہے۔ تقریباً یہی صورتِ حال لکھنؤ میں بھی پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مسلّہ عقائد سے انحراف واختلاف کا حق تو ہر شخص کو حاصل ہے مگر کسی کے بزرگوں اور واجب التعظیم ہستیوں کو برملا منقصت کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دیا گیا ہے، اس کو دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی قوم کسی حال میں بھی ایک لحہ کے لیے برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر کہیں ایسا ہوتا ہے تو قانون قدرت کے مطابق اس کا نتیجہ تباہی وبادی اور کشت وخون کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہر شخص جس کو خدا نے عقل سلیم عطا کی ہے اور وہ کسی اخلاقی نظام کا پابند ہے وہ کبھی اس بات کی تائید وحوصلہ افزائی نہیں کر سکتا کہ چند مٹھی بھر لوگ کسی مذہب کے قابل احترام بزرگوں کی برسرِ عام توہین وتذلیل کریں اور اس پر کوئی روک ٹوک نہ کی جائے۔ گذشتہ صفحات میں لکھا جاچکا ہے کہ ۳۰ر مارچ ۱۹۳۹ء کو حکومت یوپی نے اپنا وہ کمیونک شائع کیا تھا جس کی رو سے مسلمانانِ لکھنؤ کو سال میں ایک مرتبہ جلوس مدحِ صحابہ نکالنے کی اجازت برسہا برس کی کوششوں کے بعد ملی تھی۔ اس کمیونک کے شائع ہونے سے پہلے ہی باخبر حلقوں میں یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ حکومتِ یوپی مسلمانوں کی ایک قدیم مانگ کو اس طرح پورا کرنے جارہی ہے۔ لہٰذا شیعی حلقوں میں اس کا ردّ عمل ہونا شروع ہوگیا۔ اس وقت لکھنؤ میں شیعوں کی دو جماعتیں نمایاں طور پر پیش پیش تھیں جن میں سے ایک شیعہ پولٹیکل کانفرنس اور دوسری انتہا پسند جماعت تنظیم المومنین تھی۔ یہ دونوں جماعتیں آپس میں ایک دوسرے کی حریف تھیں مگر مسلمانوں کے مقابلہ

میں متحد و متفق تھیں اور مدحِ صحابہ کے سلسلے میں ان کے نقطۂ نظر میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

حکومت کی طرف سے شائع ہونے والے اس کمیونک کی پیش بندی کے طور پر سب سے پہلے شیعہ پولٹیکل کانفرنس نے نوٹس لیا اور اس کی ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ ۲۳/ مارچ ۱۹۳۹ء کو سید علی ظہیر بیرسٹر اور سابق صوبائی وزیر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ قبل اس کے کہ مسلمانوں کا جلوس مدحِ صحابہ نکلے ہمیں تبرا ایجی ٹیشن شروع کر دینا چاہیے، اس سے یہ فائدہ پہنچے گا کہ ایک طرف تو مسلمان مشتعل ہو جائیں گے اور ان کی توجہات بجائے جلوس مدحِ صحابہ کے دوسری طرف مائل ہو جائے گی اور حکومت بھی نقضِ امن کے اندیشہ سے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس مقصد کے تحت ۳۰/ مارچ ۱۹۳۹ء کو نواب سلطان علی خاں کی سربراہی میں سولہ رضا کاروں نے امام باڑہ غفراں مآب لکھنؤ سے "تلاوت تبرا شریف" کرتے ہوئے اپنے گالی ایجی ٹیشن کا آغاز کر دیا جس پر ان سب کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ انجمن تنظیم المومنین نے جب یہ دیکھا کہ اس میدان میں رقیب پہل کر کے بازی لے گیا تو انھوں نے بھی جھٹ اس ایجی ٹیشن کی تائید کر کے ۳۱/ مارچ ۱۹۳۹ء سے آصف الدولہ کے امام باڑہ سے روزانہ گرفتاریاں دینا شروع کر دیں اس غیر مہذب اور غیر اخلاقی تحریک میں علماء شیعہ کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے سب سے پہلے مولانا سیّد محمد نصیر مجتھد نے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو تبرائی الفاظ ادا کرتے ہوئے اپنی گرفتاری پیش کی، پھر اس کے بعد سے روزانہ رضا کارانہ طور پر آصفی امام باڑہ سے گرفتاریاں دینا شروع کی تھیں پھر اس کے بعد یو پی کے مختلف اضلاع سے شیعہ جماعتیں اس احتجاج میں آ کر شریک ہونے لگیں۔ تبرّا ایجی ٹیشن کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس تحریک میں پنجاب کے شیعہ روح رواں اور کارواں داروان بنے ہوئے تھے، پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر شیخ کرامت علی اس تبرا ایجی ٹیشن کے منتظم تھے، ان کی شہ پر شیعہ رضا کار صحابہ کرام پر سب وشتم کرنے کے لیے لکھنؤ جاتے اور گرفتار ہوتے تھے۔[1]

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تبرا ایجی ٹیشن سے نمٹنے کے لیے یو پی کی کانگریسی حکومت نے کوئی چابکدستی نہیں دکھلائی اور اس سلسلہ میں وہ برابر نرم گوشہ اختیار کرتی رہی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس تحریک کے پس پشت انگریزوں کی شہ اور ان کی حوصلہ افزائی برابر جاری تھی لیکن پھر بھی اس نے فوری طور پر کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے کہ یہ تحریک ختم ہو سکتی۔ یہ خیال

---

[1] کاروانِ احرار، جلد ۳، ص ۱۲۲

صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ مجلسِ احرار کے ذمہ داروں کا بھی تھا چنانچہ بقول مصنف کاروانِ احرار:

''اقتدار کے سنگھاسن پر جو بیٹھتا ہے وہ اپنے اصول خود وضع کرتا ہے۔ حقیقت خواہ کچھ ہو یو پی کی کانگریسی حکومت کو یہ علم تھا کہ انگریز نے اپنی ضرورت کے لیے لکھنؤ کے شیعہ عقائد رکھنے والوں کو مدحِ صحابہ کے خلاف اکسار کھا تھا ورنہ گالیاں دینا تو کسی مذہب میں روا نہیں۔ اس قضیہ پر صدیاں بیت چکی ہیں پھر بھی ایک ہی شہر کے دو مسلمان عقیدے کی لڑائی میں ایسے اُلجھے کہ غیر ملکی حکمرانوں نے مدتوں یہ تماشہ دیکھا۔ یقین تھا کہ جیسے ہی آئین کروٹ لے گا پرانی عمارت کے کھنڈرات آپ سے آپ گرتے چلے جائیں گے لیکن برا ہو اقتدار کا کہ نئے حکمرانوں نے بھی باہم دست و گریبانی ہی کو اپنے لیے جائز قرار دیا[1]۔''

اس طرح کافی عرصہ تک یو پی کی کانگریسی حکومت نے اس ایجی ٹیشن کا کوئی نوٹس نہیں لیا جس کی وجہ سے دونوں فرقوں میں کشیدگی بڑھتی رہی، عام مسلمانوں میں تو بے چینی اس لیے تھی کہ تبرا ایجی ٹیشن سے ان کے مذہبی جذبات کو سخت ٹھیس پہنچتی تھی اور ان کے قابلِ احترام بزرگوں کی توہین و تذلیل ہوتی تھی، دوسری طرف شیعوں میں اضطراب اس لیے تھا کہ ان کی تحریک بے جان ہوتی نظر آ رہی تھی اور اب زیادہ دنوں اس کا جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔

شیعوں کی گاندھی جی سے ملاقات

تبرا ایجی ٹیشن میں مجتہدین شیعہ میں سے دو شخصیتیں زیادہ پیش پیش تھیں جن میں ایک ناصر الملّت مولوی ناصر حسین مجتہد (م ۱۹۴۱ء) اور دوسرے نجم الملّت مولوی نجم الحسن مجتہد (۱۹۳۸ء) تھے۔ اس کے علاوہ خود شیعوں میں بھی آپسی اختلاف بہت تھے، ایک گروہ اس ایجی ٹیشن کو ختم کر دینا چاہتا تھا اور دوسرا گروہ اس کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اقتدار کی یہ کشمکش شیعوں کے لیے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی، انھوں نے جب یہ دیکھا کہ ہمارے ایجی ٹیشن سے حکومت پر اور عوام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑ رہا ہے تو ان میں ایک قسم کی مایوسی پیدا ہونے لگی اور اس پر مزید تازیانہ یہ لگا کہ تبرائی قیدیوں کی ایک بڑی تعداد معافیاں مانگ مانگ کر جیلوں سے واپس آنے لگی تو اس نازک صورتِ حال میں ایجی ٹیشن کے منتظمین کو تشویش پیدا ہوئی اور انھوں نے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں اور نمایاں رہنماؤں سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا اور ان سے مدد کے خواہاں ہوئے چنانچہ اسی مقصد کے پیشِ نظر شیعوں کا ایک وفد مہاتما گاندھی سے ملنے کے لیے راج کوٹ

---

[1] کاروانِ احرار، جلد ۳، ص ۲۰۹

پہنچا اور ان کو اس مسئلہ میں مداخلت کرنے کے لیے آمادہ کرنا چاہا مگر گاندھی جی نے کوئی خاص دلچسپی نہ لیتے ہوئے بس یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مولانا آزاد سے کہوں گا کہ وہ اس مسئلہ میں پڑ کر کوئی مصالحت کرادیں چنانچہ یہ وفد وہاں سے بے نیل مرام واپس لوٹا، اس وفد کو خود اپنی شکست کا احساس تھا چنانچہ وفد کے ایک ممبر کا خود یہ بیان تھا کہ:

''افسوس اتنا بڑا ایجی ٹیشن اور ایسا ناکامیاب پروپیگنڈہ! جس ہندو کو دیکھئے تبرا کو گالی کہتا ہے۔ مخالفین نے کچھ اس طرح ان سب کو یہ سبق پڑھا دیا ہے کہ یہ اس کو بھلانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں[1]۔''

اس کے بعد ایک دوسرا وفد سعید الملت مولانا محمد سعید مجتہد کی سرکردگی میں مولانا آزاد سے بات کرنے کے لیے کلکتہ پہنچا اور مولانا سے اس مسئلہ میں مداخلت کی گذارش کی، مولانا آزاد کی گفت وشنید سے صرف اتنا نتیجہ نکلا کہ انھوں نے کہا کہ شیعہ پہلے اپنے اس تبرا ایجی ٹیشن کو واپس لیں تب کوئی مصالحت کی گفتگو ممکن ہو سکے گی اس کے بغیر اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے۔ مولانا آزاد کی یہ گفتگو اور بھی شیعوں کے لیے دردسر کا سبب بن گئی۔ اب انھیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا ایجی ٹیشن جاری رکھیں یا اس کے التواء کا اعلان کریں۔ اس کا جاری رکھنا اب شیعوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ ان میں اب کوئی سکت باقی نہ تھی اور دوسری طرف التواء کرنے سے وقار کا سوال درپیش تھا، غرض اسی اُدھیڑ بُن میں تقریباً پانچ مہینے گذر گئے اور یہ ایجی ٹیشن سِسک سِسک کر چلتا رہا۔

۲۴ر جون ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ شروع ہوئی جس میں ہندوستان کے تمام نمائندے موجود تھے اور ملکی سیاست کا جائزہ لیا جا رہا تھا، اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو نے شیعوں کے تبرا ایجی ٹیشن پر اپنا ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں انھوں نے کہا:

''سنیوں نے اپنا مذہبی حق مدح ثلاثہ مانگا گورنمنٹ یوپی نے ان کو عطا کر دیا، اب کچھ تھوڑے سے شیعہ گالی بکنے کا حق مانگتے ہیں تو بھلا کون سی ایسی مہذب گورنمنٹ ہے جو اس حق کو تسلیم کر سکتی ہے......جیل شیعوں کے لیے تفریح گاہ ہے، وہ جیل آتے ہیں اور سیر وتماشا کر کے واپس چلے جاتے ہیں[2]۔''

سنّیوں میں بے چینی

لکھنؤ میں تبرا ایجی ٹیشن کی اشتعال انگیزیوں سے سخت بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا، ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں اس کے خلاف احتجاجی جلسے ہوئے، اس وقت کے تقریباً سب ہی

---

[1] شیعوں کی بیداری، حصہ اوّل، ص ۳۲ [2] شیعوں کی بیداری، حصہ اوّل، ص ۵۵

مسلم اخباروں نے اس کے خلاف اپنے اداریے لکھے اور لکھنؤ کے عوام تو اس سے براہِ راست ہی متعلق تھے لہٰذا ان کا متاثر ہونا تو قدرتی امر تھا، اسی درمیان میں کچھ اس طرح کی بھی سن گن ملی کہ حکومت یوپی تبرا کے اس متنازعہ مطالبہ کو کسی حد تک تسلیم کرنے کا ارادہ کر رہی ہے، اس خبر نے تو اور بھی مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑا دی چنانچہ ۲۳/اپریل ۱۹۳۹ء کو بعد نمازِ ظہر مسلمانانِ لکھنؤ کا ایک جلسۂ عام احاطہ شیخ شوکت علی مرحوم میں منعقد ہوا جس میں متعدد سنجیدہ اور متوازن تقریروں کے ذریعہ حکومت سے پُرامن طور پر یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ تبرا ایجی ٹیشن کو جلد از جلد بند کرائے۔ اس کے ساتھ ہی اس جلسہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ یوپی اسمبلی کے سامنے احتجاجی مظاہرہ بھی کیا جائے اور حکومت کو اپنے احساسات سے مطلع کیا جائے۔ اگرچہ یہ مظاہرہ بالکل پُرامن تھا مگر پھر بھی بعض نوجوانوں نے اسمبلی میں زبردستی گھس کر قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔ منتظمین کی طرف سے اپنی برأت اور اس ناپسندیدہ اقدام کی مذمت بھی کی گئی مگر پھر بھی حکومت نے جھنجھلا کر بعض نوجوان اور ہر دلعزیز مسلم علماء کو گرفتار کر لیا جن میں مولانا عبدالعزیز فاروقیؒ (م ۱۹۵۴ء) ابن مولانا لکھنویؒ، مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ (م ۱۹۹۴ء) برادر زادہ مولانا لکھنویؒ، مولانا کلیم اللہ الہ آبادیؒ (م ۱۹۹۲ء) مولانا مطلوب الرحمٰن ندویؒ، مولانا یونس خالدیؒ (۱۹۸۵ء)، مولوی مجید الحسن ایڈوکیٹؒ، حاجی محمد کاملؒ تاجر چکن (م ۱۹۶۵ء) اور حافظ محمد اسحاقؒ سکریٹری مجلس تحفظ ملت کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[1]

لکھنؤ میں مسلمانوں کا ایک طبقہ وہ بھی تھا جو ان اختلافی معاملات میں اتنا زیادہ حساس نہیں تھا اور وہ اپنی صلح پسندی و عافیت کوشی کی وجہ سے ایک غیر جانبدارانہ پالیسی پر عمل پیرا تھا، اس طبقہ میں خاص طور سے وہ لوگ تھے جو جدید تعلیم یافتہ اور متمول تھے، ان میں اکثریت بیرسٹروں، قانون دانوں اور حکومت کے اعلیٰ مسلم افسران کی تھی۔ یہ حضرات اپنی متانت اور سنجیدگی کی وجہ سے ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ دونوں فرقوں میں یہ خلیج نااتفاقی کسی طرح ختم ہو جائے اور کشیدگی دور ہو جائے، ان کے تعلقات دونوں فرقوں کے لوگوں سے تھے مگر مسلمانوں کا یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی تبرا ایجی ٹیشن کے اس غیر مہذب اور اخلاق سوز رویہ سے چیخ اٹھا اور بالآخر یہ لوگ بھی اس کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان حضرات کی طرف سے جون ۱۹۳۹ء میں گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ایک جلسہ کا اعلان کیا گیا جس میں اتفاق رائے کے ساتھ حکومت یوپی

---

[1] آفتاب، لکھنؤ، ۲/مئی ۱۹۳۹ء

سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ تبرا ایجی ٹیشن کو فوراً بند کرایا جائے اور لکھنؤ کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال پر کنٹرول کیا جائے۔ اس جلسہ میں تقریباً سب ہی مسلم دانشور، وکلا اور بیرسٹر اور عمائدین شہر نے شرکت کی تھی۔ جلسہ کی صدارت منشی اظہر علی صاحب کاکوروی ایم، ایل، اے (م ۱۹۴۹ء) نے کی، جلسہ میں بعض مقررین نے اپنی تقریروں میں جو اپنے چشم دید واقعات بیان کیے تھے ان سے کچھ اس وقت کے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ شہر کے ایک متین و سنجیدہ بزرگ شخصیت چودھری نعمت اللہ سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ (م ۱۹۶۰ء) نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا:

> ''جن گندے الفاظ میں ریلوے اسٹیشن پر شیعہ قیدیوں کو تبرا کہتے ہوئے میں نے خود سُنا ہے اس کو کوئی مہذّب انسان صبر و سکون کے ساتھ نہیں سُن سکتا، مجھے حیرت ہے کہ شیعوں کا تعلیم یافتہ طبقہ کیونکر تبرا کو روا رکھتا ہے، اگر شیعوں نے اپنی اس تبرا بازی کو فوراً بند نہ کردیا تو پھر اس کے عواقب اور انجام کا انگیز کرنا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔''

ہمایوں مرزا صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ و سیشن جج نے اپنی تقریر میں کہا:

> ''جس طرح تبرا بازی ہو رہی ہے اور جن غیر مہذّب اور گندے الفاظ میں خلفاء راشدینؓ کی شان میں بدتمیزیاں کی جارہی ہیں ان کو کوئی انتہا درجہ کا متین اور سنجیدہ سنّی بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ ان گالیوں سے یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ شیعوں کو بچپن ہی سے اس قسم کی فحش گوئی اور تبرا بازی سکھائی جاتی ہے۔''

منشی اظہر علی صاحب ایم ایل اے صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا:

> ''جو سنّی رہنما یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ سنّیوں کو مدحِ صحابہؓ کے حق سے دست بردار ہوکر شیعوں سے مصالحت کرلینا چاہیے وہ ذرا لکھنؤ تشریف لائیں اور اپنے کانوں سے وہ غلیظ الفاظ سُنیں جو تبرا میں خلفائے ثلاثہؓ کے خلاف کہے جاتے ہیں اور اس کے بعد بتائیں کہ کیا ان اشتعال انگیزیوں اور گالیوں کے بعد بھی ایسے گالی بکنے والے شیعوں سے مصالحت کی جاسکتی ہے؟''

اسی طرح کی تقریروں میں ایک تقریر شیخ اقبال علی ایڈوکیٹ ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ لکھنؤ نے بھی کی تھی، انھوں نے دورانِ تقریر میں کہا:

> ''ازواجِ مطہراتؓ بھی ان گالیوں سے نہیں بچیں، میں نے شیعہ اخبار ''حکمران'' کا وہ پرچہ اپنے ایک ہندو دوست کو دکھایا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی زوجۂ محترمہ حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شان میں نہایت کریہہ اور گندے الفاظ لکھے گئے تھے تو میرے

ہندو دوست نے دانتوں کے نیچے انگلی دبالی[1]۔''

علامہ مشرقی اور شیعہ سنّی اختلافات

پنجاب کی سرزمین کو بھی اللہ نے عجیب وغریب خصوصیات سے نوازا ہے۔ اس سرزمین سے بہت سی اسلامی تنظیمیں اور جماعتیں اٹھیں اور متعدد ایسی شخصیتیں اُبھریں جن کا اثر فوری طور پر ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی کافی پڑا۔ تقسیم ہند سے پہلے تو یہاں کافی ہمہ ہمی تھی اور روز ہی کوئی نہ کوئی جماعت یا بزعم خود کوئی رہنما پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی طرح کی ایک شخصیت علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی[2] کی تھی جو خاکسار تحریک کے بانی تھے۔ علامہ مشرقی کی تحریک نے جو بظاہر خدمتِ خلق، امن پسندی اور اسلام کے عسکری نظام کا عملی اعادہ کرنے کے نام پر قائم کی گئی تھی اس نے غیر منقسم ہندوستان کے ہزاروں سادہ لوح مسلم عوام کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا لیکن اس کے پس پردہ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ علاّمہ مشرقی انگریزوں کے آلۂ کار تھے۔ انگریز جانتا تھا کہ ہندوستان پر اپنی گرفت کو مضبوط کرنے اور تحریک آزادی کے اٹھتے ہوئے شعلوں کو سرد کرنے کے لیے جو

---

1. آفتاب، لکھنؤ، یکم جولائی ۱۹۳۹ء

2. علاّمہ عنایت اللہ خاں مشرقی بن عطا محمد خاں ۲۵ راگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے، انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم امرتسر میں حاصل کی، پھر مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھ کر کیمبرج یونیورسٹی گئے،، وہاں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک رہ کر ریاضی میں آنرز کی ڈگری لی۔ پھر فزکس میں بی ایس سی کرکے میکینکل انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد السنۂ شرقیہ عربی وفارسی میں بی، او، ایل کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس آکر ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۵ء تک اسلامیہ کالج پشاور کے وائس پرنسپل اور پھر اس کے بعد ۱۹۱۷ء تک پرنسپل رہے۔ بعض اسباب کی بنا پر حکومت ان سے ناراض ہوگئی جس کی وجہ سے ملازمت میں ان کا تنزل ہوگیا۔ اسی درمیان انھوں نے مسلمانوں کی قومی زندگی کا گہرا مطالعہ شروع کیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۲۴ء میں اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ'' اُردو زبان میں لکھی جس کے بعض مندرجات سے علماء نے سخت اختلاف کیا۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں یورپ کی سیاحت کی، ۱۹۳۱ء میں اپنی دوسری کتاب ''اشارات'' تصنیف کی اور ملازمت ترک کرکے خاکسار تحریک کا آغاز کیا جس کے تحت اس کے کارکن خاکی وردی میں ملبوس بیلچے کاندھے پر رکھے ہوئے بعد نماز مغرب اپنے سرداروں کی رہنمائی میں چپ وراست، چپ راست کی آواز کے ساتھ پریڈ کیا کرتے تھے، انھوں نے اپنا نعرہ فرمانبرداری اور خدمتِ قوم مقرر کیا تھا۔ ان کا نصب العین خلافتِ ارضی حاصل کرنا تھا جس کے لیے سعی عمل اور ایک مستحکم تنظیم کی ضرورت تھی۔ خاکساروں کا مرکزی دفتر اچھرہ لاہور میں تھا۔ ۱۹۴۰ء کے اوائل تک خاکسار تحریک پشاور سے رنگون تک پھیل چکی تھی۔ ہر بڑے شہر میں ان کے اجتماعات ہوتے تھے۔ علامہ مشرقی کی شہرت خاکسار تحریک کی وجہ سے ہوئی۔ ان کی تصنیفات میں تذکرہ، اشارات، تکملہ، حدیث القرآن اور ارمغانِ حکیم مشہور ہیں۔ تحریک کا ایک ہفتہ وار اخبار الاصلاح بھی نکلتا تھا۔ ۲۵ راگست ۱۹۶۳ء کو مرض سرطان میں ان کی وفات ہوئی۔

(اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۱۴/۲، ص ۳۰۲-۳۰۳، طبع اوّل، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۲ء)

سب سے بڑی رکاوٹ راہ میں حائل تھی وہ علماء حق کی جماعت تھی لہٰذا ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں چن چن کر اور ڈھونڈھ کر علماء وقت اور صلحاء امّت کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا، ان کی املاک ضبط کی گئیں اور مدارس و خانقاہوں کو تباہ و برباد کیا گیا، ان علماء کا قصور یہ تھا کہ یہ ہندوستان کے اسلامی قلعوں کے معمار تھے، مسلمانوں کے دلوں پر اُن کی حکمرانی تھی اور ان کی جبین حق پرست باطل کے آگے کٹ تو سکتی تھی جھک نہیں سکتی تھی لہٰذا انگریز کو ضرورت ایسے لوگوں کی تھی جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی علماء پر زبانِ طعن دراز کریں، ان کی ہر طرح کی توہین و تذلیل کا سامان بہم پہنچائیں اور اس طرح عام مسلمانوں کی نگاہ میں ان کا وقار مجروح ہو۔ علامہ مشرقی اس مقصد کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے، انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو انگریز چاہتے تھے۔

ایسی تحریکیں جو نیک نیتی پر مبنی نہیں ہوتیں بلکہ ایک خاص وقتی جذبہ کے تحت وجود میں آتی ہیں ان کے ہوشیار محرک وقت اور موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کہیں بھی نمود و نمائش کا وسیلہ ہاتھ آجائے تو ان کا کام بن جائے۔ غالباً اسی جذبہ کے تحت علاّمہ مشرقی نے بھی وقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے لکھنؤ کے شیعہ سنّی اختلافات میں دخل دینے کا بیڑا اٹھایا اور اس طرح سے اپنی تحریک کو یوپی میں پھیلانے اور شہرت دینے کی کوشش کی چنانچہ اس وقت جبکہ لکھنؤ میں مدحِ صحابہ تحریک ختم ہوچکی تھی اور شیعہ فرقہ تبرا ایجی ٹیشن جاری کیے ہوئے تھا کچھ مخفی اثرات کے تحت علامہ مشرقی نے ۱۶/جون ۱۹۳۹ء کو اپنے اخبار 'الاصلاح' میں لکھنؤ کے شیعہ سنّیوں کے نام یہ وارننگ شائع کی کہ اگر پندرہ روز کے اندر دونوں فرقوں نے باہمی سمجھوتہ کرکے صلح نہ کرلی تو قرآن مجید کے حکم کے بموجب ان دونوں فرقوں کے تین تین رہنماؤں کو قتل کرادوں گا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ مجھے ہر فریق کے ان تین رہنماؤں کے نام بھی معلوم ہیں۔ اعلان تو کردیا گیا مگر قتل کا حوصلہ نہیں ہوا، میعاد بڑھتی گئی تاکہ کسی طرح صلح ہوجائے اور ہماری گیدڑ بھپکی کام آئے۔ بالآخر جب اگست ۱۹۳۹ء تک کچھ نہ ہوا تو انھوں نے اعلان کیا کہ ہم نے تاریخوں کو ملتوی کرکے اتمامِ حجت کردیا، اب کسی کو کوئی شکایت کی گنجائش نہیں ہے۔ اب یہ فیصلہ آگ و خون کے بغیر نہیں ہوسکتا مگر اس کے بعد پھر اس مدّت میں توسیع کی گئی۔ علاّمہ کا منشاء یہ تھا کہ خاکساروں میں اچھی طرح جوش پیدا کرکے میں لکھنؤ پہنچوں تاکہ وہاں پہنچ کر ناکامی نہ ہو اس لیے اگست ۱۹۳۹ء کے الاصلاح میں یوں اعلان کیا گیا:

"دُنیا میں کوئی قوم انسان کے خون کے بہے بغیر اپنا مقام حاصل نہیں کرسکتی، اس لیے اگر خاکسار

کو دُنیا میں رہ کر کسی پائیدار نیکی کی تعمیر کرنا ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ کشتوں کے پشتے لگا کر اس تعمیر کو قائم کرے۔"

انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ۱۸/اگست ۳۹ء کے الاصلاح میں مزید یوں جوش دلایا:

"میں قریب تین ہزار خاکساروں کو یہ حکم دے رہا ہوں کہ لکھنؤ کے شیعہ سنّی فساد کو بزور طاقت ختم کردیں۔ ہم پُرامن رہ کر بلکہ خود زخمی اور قتل ہو کر اس کو بند کرکے رہیں گے، ہم تمام خاکسار اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس لیے تیار ہوئے ہیں کہ شیعہ سنی اصحاب کے درمیان صلح کو ہر قیمت پر حتی کہ اپنی جانوں کو قربان کرکے بزور طاقت نمودار کردیں۔ ہم اس ظلم کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لیے سربکف ہو جائیں اور اپنے خون کا آخری قطرہ یوپی کی وزارت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے بہا دیں[1]۔"

اس طرح ادھر تو علامہ مشرقی یہ دہشت انگیزیاں پھیلا رہے تھے اور دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد کی وساطت سے صلح کی گفتگو ہو رہی تھی۔ حالات کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرنے کے بعد علامہ مشرقی کو جب یہ یقین ہو گیا کہ اب لکھنؤ میں شیعہ وسنّیوں میں صلح کے آثار پیدا ہو گئے ہیں تو اب لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے کے لیے لکھنؤ آدھمکے اور جھٹ ایک چیلنج شائع کر دیا کہ اب میں لکھنؤ آ گیا ہوں لہٰذا دونوں فرقوں کے رہنماؤں کو صلح کر لینا چاہیے۔

شیعی عوام میں تو مایوسی اور بددلی پھیلی ہوئی ہی تھی لہٰذا ان کے رہنماؤں نے مولانا آزاد کے کندھوں پر بات رکھ کر ۲۸/اگست ۱۹۳۹ء کو اپنا تبرا ایجی ٹیشن بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح علاّمہ مشرقی کی تلواریں اور بندوقیں میان میں ہی چھپی رہ گئیں مگر اب انھوں نے لکھنؤ کے عوام اور بالخصوص یوپی میں اپنی تحریک کو پھیلانے کی بھرپور کوشش شروع کر دی، روزانہ علامہ کی پیدل فوج علی الاعلان شاہراہوں پر چپ راست کے مظاہرے کرنے لگی۔ اور یہ مظاہرے بھی اس قدر وحشت انگیز کہ عوام سے کئی مقام پر ٹکراؤ کی بھی نوبت آ گئی۔ حکومت نے پہلے تو خاکساروں کو سمجھایا اور کوشش کی کہ یہ لوگ اپنے وطن واپس چلے جائیں مگر وہ نہیں مانے اور ٹھہرے رہے اور شہر میں وحشت انگیزیاں پیدا کرتے رہے لہٰذا حکومت نے نقضِ امن کے اندیشہ سے علامہ مشرقی اور ان کے ساتھیوں کو دفعہ ۱۰۷ کے ماتحت گرفتار کرکے جیل بھیج دیا اور اس طرح لکھنؤ کے عوام کو اس بلائے ناگہانی سے نجات مل گئی[2]۔

---

[1] الاصلاح، ہفت روزہ، لاہور، ۱۸/اگست ۱۹۳۹ء [2] آفتاب، لکھنؤ، خاکسار نمبر، ۲۵/ستمبر ۱۹۳۹ء

بیسواں باب

تحریک مدحِ صحابہؓ اور اس کے اثرات ونتائج

گذشتہ ابواب میں تحریک مدحِ صحابہ کی تاریخ آغاز سے تقسیم وطن تک کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھی جا چکی ہے، اب اس کو اس باب میں مکمل کر کے اس کے جو اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں اور اس کے جو اثرات ہماری دینی ادبی اور سماجی زندگی پر پڑے ہیں ان پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی۔ اس سلسلہ میں واقعات کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے تحریکی سرگرمیوں کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے تاکہ قارئین کے ذہن میں پوری تصویر آجائے اور پھر اس کے ذریعہ جو اصلاحی اور دور رس نتائج مرتب ہوئے ہیں وہ واضح ہو جائیں، چنانچہ قدیم ریکارڈ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں عید میلاد النبی کے موقع پر حکومت یو پی نے جلوس مدحِ صحابہ نکالنے کی اجازت دے دی تھی جو ۳۹ء اور ۴۰ء میں نہایت پرامن اور شاندار طریقہ پر نکلا مگر اس کے بعد شیعوں کے جلوس ''قدح صحابہ'' کے اعلان اور حکومت کی درپردہ سازش سے اس کی باضابطہ منظوری دیئے جانے سے پورے لکھنؤ شہر میں انتہائی کشیدگی اور بدامنی کی فضا پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے دفعہ ۱۴۴ انافذ کر دی گئی جس سے جلوس ''قدح صحابہ'' نہیں نکل سکا مگر اس کا اثر یہ بھی ہوا کہ مدحِ صحابہ کا جلوس بھی اس پابندی کی زد میں آگیا اور پھر آئندہ برسوں میں وہ حسب روایت نہیں نکل سکا۔ یہ صورتِ حال ۱۹۴۷ء تک بدستور قائم رہی۔ اس درمیان میں ہر سال جلوس کی اجازت کے لیے درخواست دی جاتی تھی مگر حکومت مختلف حیلوں اور بہانوں سے دفعہ ۱۴۴ انافذ کر کے اس کو رد کر دیتی تھی۔ مسلمان اس کے خلاف احتجاج کرتے، قانون شکنی کرتے اور مدحِ صحابہ کا اپنا قانونی، شرعی اور اخلاقی حق مانگتے ہوئے رضا کارانہ طور پر گرفتاریاں پیش کرتے رہے۔ اس عرصہ میں شہر میں ٹکراؤ بھی ہوا، فسادات بھی ہوئے اور بے قصور مسلمانوں کا کافی جانی و مالی نقصان بھی ہوا مگر

حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

سیاسی اعتبار سے اب وہ زمانہ آنے والا تھا جس میں انگریز ہندوستان کی زمام حکومت ملکی رہنماؤں کے سپرد کر کے سرزمینِ ہند سے روانہ ہونے کی تیاریاں کرنے جا رہا تھا اور حریت وطن کی وہ صبح نونمودار ہونے جا رہی تھی جس کی آرزو اور تمنا میں نہ جانے کتنے جانبازوں نے بے شمار جانی اور مالی قربانیاں دی تھیں مگر اس صبح تابناک کی رونمائی کے ساتھ ساتھ تباہی اور بربادی کا ایک سیل رواں بھی دوش بدوش آیا جس کے نتیجہ میں وطن عزیز کی تقسیم عمل میں آئی اور ہزاروں لاکھوں خاندان تباہ و برباد اور بے گھر و بے در ہوگئے اور اس طرح اس خطہ میں ایک نئی اسلامی مملکت پاکستان کے نام سے وجود میں آ گئی۔ مسلمانوں کے متمول اور تعلیم یافتہ طبقہ نے اپنے مستقبل کی امیدیں پاکستان سے باندھیں اور وہ مرضی یا نامرضی سے ترک وطن کر کے پاکستان روانہ ہوگیا اور یہاں صرف وہی لوگ باقی رہ گئے جو ضعیف و ناتواں تھے، کم تعلیم یافتہ تھے یا پھر اپنے آباء واجداد کی یادگاروں کو اپنے سے جدا کرنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ اس صورتِ حال نے باقی ماندہ مسلمانوں کی دینی سماجی اور سیاسی حیثیت ہندوستان کے نئے نقشہ میں غیر محفوظ اور غیر یقینی بنا دی تھی یہاں تک کہ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ مستقبل قریب میں ہندوستانی مسلمانوں کی خود ان کے وطن میں کیا حیثیت ہوگی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ۱۹۵۰ء تک تقریباً یہی حالات رہے، اس عرصہ میں ہندی مسلمانوں کی تمام تر سرگرمیاں تعطّل کا شکار رہیں چنانچہ ہر قسم کی دینی و سیاسی تحریکیں خواہ وقتی طور پر ہی سہی دب کر رہ گئی تھیں۔ یہی حال تحریکِ مدحِ صحابہ کا بھی ہوا، جب تک ملک میں امن و امان قائم نہیں ہوگیا اور یہاں کے مسلمان غیر یقینی حالات سے باہر نہیں نکلے اس وقت تک اس تحریک کو معرضِ التواء میں رکھا گیا لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد ملک کے نئے جغرافیائی حدود میں اور ملک کے نئے آئین کی روشنی میں ایک نئی حکمتِ عملی کے ساتھ اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے سوچا جانے لگا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کا دور تحریک مدحِ صحابہ کا ایک علیحدہ مستقل اور نمایاں دور ہے، اس دور پر کچھ لکھنا فی الحال ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ اس کے لیے مستقل ایک تصنیف کی ضرورت ہے جو نہایت شاندار کارناموں پر مشتمل ہوگی اور اگر یہ کہا جائے کہ اب تک کی تمام کوششوں اور مساعی جمیلہ کے بار آور ہونے کا اصل زمانہ یہی ثابت ہوا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ خدا کرے اس

موضوع پر کوئی صاحبِ قلم اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ کام کردے تو ہندوستان کی مظلوم وناتواں ملّتِ اسلامیہ کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا ہوجائے۔ ہم نے اپنے قلم کو صرف ۱۹۰۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کی درمیانی تحریکی سرگرمیوں تک ہی محدود رکھا ہے کیونکہ یہی وہ دور ہے جس میں اس تحریک کو ابتدا سے لے کر ایک فیصلہ کن مقام تک پہنچانے میں امام اہل سنّت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کا ایک قائدانہ رول رہا ہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے اپنے رفقاء کار کے ساتھ اور اپنے اکابر علماء حق کے بھرپور تعاون سے اس تحریک کو ایک ایسی منزل تک پہنچا دیا جہاں سے اوروں کے لیے اس کام کو آگے بڑھانا آسان ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء تک آپ عملی طور پر اس تحریک سے وابستہ رہے مگر ۱۹۵۰ء کے بعد جب ہندوستانی سیاست میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا اور حالات میں کچھ استحکام آیا تو آپ نے اپنی کبرسنی اور پیرانہ سالی کے پیشِ نظر اس تحریک سے عملاً سبکدوش ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرلی اور مستقبل کی ساری ذمہ داری اپنی تیار کردہ جماعت کی اس نوجوان اور پُرجوش نسل کے سپرد کردی جس میں علماء دین، دانشور، وکلاء و بیرسٹر اور سماجی کارکن جیسے سبھی قسم کے افراد شامل تھے، اس طرح خود یکسوئی اور اطمینان قلبی کے ساتھ اپنے متوسلین اور مسترشدین کے درمیان سلوک کی تعلیم، ذکر و فکر کی تلقین، صلاح نفس اور تذکیۂ باطن جیسے حاصلِ زندگی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ اسی لیے ہم نے تحریک مدحِ صحابہ کے صرف اُسی حصّہ سے سروکار رکھا ہے جس کی رہنمائی اور قیادت آپ نے ذاتی طور پر کی تھی۔

جدوجہد کا آغاز

۱۹۰۴ء سے لکھنؤ میں شیعہ سنّی اختلاف کا آغاز ہوا۔ ابتداءً چھیڑ چھاڑ اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کی تشہیر شیعوں ہی کی طرف سے ہوئی جس نے خوابیدہ سنّیوں کو بیدار کرنے میں بڑی مدد دی اور وہ مجبور ہوئے کہ اپنے مذہب و مسلک کے دفاع میں متحد ہوکر سامنے آئیں۔ اولاً ان اختلافات کا آغاز شیعہ تعزیہ داروں اور سنّی تعزیہ داروں کے درمیان ہوا اور وجہ فساد بھی وہی رسم تعزیہ داری تھی جو آج بھی اکثر دو مسلکوں اور دو فرقوں کے بیچ سبب فساد بنتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتداءً تعزیہ داروں کے ان جھگڑوں میں اہل علم اور خواص اہل سنت حضرات نے کوئی توجہ نہیں دی مگر ان کے اس طرزِ عمل سے مخالفین اہل سنّت کے حوصلے اور زیادہ بلند ہوگئے اور اب وہ

نہ صرف سنّی تعزیہ داروں کے خلاف بلکہ پورے مسلک اہل سنت و جماعت کے خلاف اشتعال انگیز طریقۂ کار اختیار کرنے لگے اور اپنی مجالس میں سنّی اعتقادات پر کھل کر حملہ کرنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ علماء اہل سنت کو بھی برملا مناظرہ کا چیلنج دینے لگے۔ لہٰذا اس صورت میں انھیں بھی مجبوراً متوجہ ہونا پڑا اور اس کی مدافعت کا بیڑا اٹھانا پڑا۔ چنانچہ لکھنؤ کے سرخیل علماء اہل سنت اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے شاگرد رشید مولانا لکھنویؒ کو دہلی سے لکھنؤ طلب کیا اور اس کام کی رہنمائی ان کے سپرد فرمائی۔ درحقیقت آپ کے لکھنؤ آنے کے بعد سے ہی ہم باضابطہ تحریک مدحِ صحابہ کا آغاز سمجھتے ہیں۔

مدحِ صحابہ کے لفظی معنی صحابۂ کرام کی تعریف وتوصیف کے ہیں۔ یہ تعریف وتوصیف نثر میں بھی ہوتی ہے اور نظم میں بھی اور تقریروں میں بھی و نیز تحریروں کے ذریعہ سے بھی ہوتی ہے۔ اس کا عمل درآمد حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی حیاتِ مقدسہ سے لے کر آج تک مختلف طریقوں اور مختلف عنوان سے ہوتا چلا آ رہا ہے اور بقول حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ یہ شعار اہل سنّت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنّفین اپنی کتابوں کے شروع میں صحابۂ کرام کا ذکر تیمنا کیا کرتے ہیں۔ بعض درود میں بھی اصحاب کا ذکر ہوتا ہے اور جمعہ کے خطبوں میں بھی صحابۂ کرام اور خاص طور سے خلفاء راشدینؓ کا ذکر خیر التزام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اہل سنت اپنے مذہبی جلسوں اور جلوسوں میں بھی نعت کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام کی شان میں منقبتی اشعار بھی پڑھا کرتے تھے لہٰذا لکھنؤ میں بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ اُس زمانہ میں ایسے اشعار کو 'چار یاری نظم' کہا جاتا تھا، یہی نظمیں سنّیوں کی مذہبی محفلوں اور شیعوں کی مذہبی مجالس میں وجہ امتیاز ہوا کرتی تھیں۔ سنّی اپنی محفلوں میں 'چار یاری نظمیں' پڑھا کرتے تھے اور شیعہ اپنی مجالس میں مرثیے، نوحے اور ماتمی اشعار پڑھا کرتے تھے جن پر کوئی اختلاف نہ ہوتا تھا۔ انھی 'چار یاری نظموں' کو آگے چل کر 'مدحِ صحابہ' کہا جانے لگا۔ چنانچہ جب شیعوں نے اپنی مذہبی بیداری کی وجہ سے ایسے اشعار پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ اور ان کی طرف سے اس پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا تو حکومتِ وقت نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے محفلوں میں صحابہ کرام کا ذکر خیر کرنے اور مدحِ صحابہ کے اشعار پڑھنے پر بھی پابندیاں لگانا شروع کر دیں جس کے احتجاج میں اہل سنّت اسی قسم کے مدحِ صحابہ کے اشعار پڑھ کر اپنی گرفتاریاں پیش کرتے تھے اور حکومت فوراً

انھیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا کرتی تھی۔

سرکاری عمل اور ردِّ عمل

۱۹۰۴ء کے بعد جب شیعہ سنّی اختلافات نے شدت اختیار کی، کئی بار فسادات ہوئے جن میں جانی و مالی نقصانات بھی ہوئے اور ان تمام باتوں کی وجہ سے امن و امان کو قائم رکھنا ایک مسئلہ بن گیا تو حکومت نے دو مرتبہ تحقیقاتی کمیشن مقرر کیے۔ پہلا کمیشن ۱۹۰۸ء میں پگٹ کمیشن کے نام سے اور پھر دوسرا کمیشن اپریل ۱۹۳۷ء میں السپ کمیشن کے نام سے مقرر کیا گیا۔ پگٹ کمیشن نے شیعہ لابی سے متاثر ہو کر سال میں تین دنوں (دسویں محرم، بیس صفر اور ۲۱ رمضان) میں شارع عام پر مدحِ صحابہ پڑھنے اور صحابہ کرام کا ذکر خیر کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ اس پر سنّیوں کی طرف سے احتجاج شروع ہو گیا اور گرفتاریاں دینا شروع ہو گئیں۔

ستمبر ۱۹۳۶ء میں مدحِ صحابہ کی شرعی اور دینی حیثیت متعین کرنے کے لیے آل انڈیا علماء کانفرنس لکھنؤ میں بلائی گئی جس میں مختلف مکتبۂ فکر کے علماء نے شرکت کی اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ حالات میں مدحِ صحابہ صرف امر مستحب ہی نہیں رہی بلکہ اب ضروریاتِ دین کے زمرے میں داخل ہو گئی ہے لہٰذا حکومت کی جانب سے اس میں رکاوٹ ڈالنا مداخلت فی الدین ہوگا۔ مزید برآں حکومت کی توجہ اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانے کے لیے ۱۰ر نومبر ۱۹۳۶ء کو ممبرانِ اسمبلی نے اس مسئلہ کو یوپی اسمبلی میں بھی اٹھایا اور حکومت کی مخالفانہ روش کی مذمّت کی۔

مدحِ صحابہ اور ملکی صحافت

مدحِ صحابہ کی تحریک اب ایک مقامی یا علاقائی تحریک نہیں رہی تھی بلکہ اب یہ لکھنؤ سے نکل کر پورے صوبہ یوپی میں پھیل گئی اور مزید وقت گذرنے پر اس کے اثرات پورے ملک پر پڑنے لگے تھے۔ یوپی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے بھی مسلمان لکھنؤ آتے اور احتجاجی طور پر مدحِ صحابہ کی حمایت میں اپنی گرفتاریاں پیش کرتے تھے۔ ملک کے بیشتر جرائد میں اس سلسلہ کی خبریں چھپا کرتی تھیں اور مستقل اداریے شائع کیے جاتے تھے۔ جن اخبارات اور رسائل نے اس مسئلہ میں زیادہ دلچسپی لی تھی ان میں روزنامہ حقیقت لکھنؤ، النجم لکھنؤ، آفتاب لکھنؤ،

روزنامہ ہمدم لکھنؤ، اورزمیندار لاہور کے نام اُردو میں اور پانیئر اسٹیٹس مین اور امرت بازار پتریکا وغیرہ انگریزی میں قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستان بھر کے شیعی اخبارات ورسائل نے بھی جی کھول کر حق صحافت ادا کیا تھا۔ ملک کے نامور اور مشہور ادیب وصحافی مولانا ظفر علی خاں (م ۱۹۵۶ء) نے جو غیر منقسم پنجاب کے مقبولِ عام اخبار ''زمیندار'' لاہور کے مدیر اعلیٰ تھے اور اپنی حق گوئی وبے باکی کے لیے پوری اردو صحافت کی دنیا میں بہت معروف تھے، لکھنؤ کی تحریک مدحِ صحابہ پر مستقل اداریے لکھے تھے، اسی زمانے میں انھوں نے اپنی ایک نظم ''مدحِ صحابہ'' کے عنوان سے لکھی تھی جو بہت مشہور ہوئی تھی، اس کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں:

سنا ہے ابرِ ستائش برس نہیں سکتا — حضور سرور عالمؐ کے جانشینوں پر
خدا کے عرش سے جو اُٹھ رہی ہیں پے در پے — بٹھا دیئے گئے پہرے اُن آفرینوں پر
شہیدِ گنج نے جن کو بچا کے رکھا تھا — وہ بَل بھی پڑ گئے حکّام کی جبینوں پر
اگر ہم اپنے بزرگوں کا نام ادب سے لیں — تو لوٹ جاتے ہیں کیوں سانپ ان کے سینوں پر
دعائیں ہم نے انھیں دیں وہ گالیاں سمجھے — مریں تو کیا مریں ان لکھنوی حسینوں پر
کشادہ ہوگئیں سجنِ فرنگ کی راہیں — نظام عدل نصاریٰ کے نکتہ چینوں پر
بُت افتراق نوازی کے اس میں پنہاں ہیں — مری نظر ہے حکومت کی آستینوں پر
وفاشعار ہمارا، روش جفا ان کی — پڑے خدائی کی خاک ان کے ان قرینوں پر

ہے شیوہ ہند میں جن کا مداخلت فی الدین
مدارِ امن ہے ان احمق الذینوں پر[1]

اس نظم میں مدحِ صحابہ کی بندش کو ''مداخلت فی الدین'' قرار دیا گیا ہے اور بندش کا حکم دینے والوں کو ''احمق الذینوں'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ مدحِ صحابہ کی بندش کا حکم افتراق نوازی پر مبنی ہے اور حکومت افتراق نوازی کے ان بتوں کو اپنی آستینوں میں چھپائے ہوئے ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس نظم میں شیعوں کو خطاب کر کے لکھا تھا کہ:

اگر ہم اپنے بزرگوں کا نام ادب سے لیں
تو لوٹ جاتے ہیں کیوں سانپ ان کے سینوں پر

---

[1] اخبار ''زمیندار'' لاہور، ۷؍اکتوبر ۱۹۳۶ء

یہ نظم اس زمانے میں بہت مشہور ہوئی تھی اور اسے بہت سے اخباروں نے نقل کیا تھا۔ مولانا کا اخبار ''زمیندار'' مسلم لیگ کا حامی تھا لہٰذا اس نظم سے مدحِ صحابہ کے بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کا پتہ چلتا ہے مگر سیاسی جماعتوں کی پالیسیوں میں استحکام نہیں ہوا کرتا، یہ مصالح اور حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔

زمیندار لاہور کی طرح اخبار مدینہ بجنور (یوپی) بھی مدحِ صحابہ تحریک کا زبردست حامی تھا۔ اس وقت اس کے مدیر ابوسعید بزمی تھے۔ تحریک کے سلسلہ میں مستقل مضامین اور خبریں اس میں برابر شائع ہوا کرتی تھیں۔ کچھ عرصہ کے بعد بزمی صاحب نے ''مدینہ'' کے کچھ خاص مضامین کے اقتباسات کو منتخب کر کے ''مدحِ صحابہ اور تبرا'' کے نام سے الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا تھا جس میں بارہ مضامین اور تین مدحِ صحابہ کی نظمیں شامل تھیں۔ اس کتاب کے دیباچہ میں بزمی صاحب نے جو خیالات پیش کیے تھے ہم انھیں یہاں نقل کر رہے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مدینہ بجنور کی پالیسی مدحِ صحابہ کے بارے میں کیا تھی:

> ''مدحِ صحابہ کا سوال ایک بالکل اصولی اور سیدھا سادہ سوال ہے لیکن افسوس ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی شیطانی چالبازیوں اور آسودہ حال مسلمانوں کی سیاسی چارہ سازیوں نے (جس کی آخری سرحد اسمبلی کی ممبری کے بعد وزارت کی کرسی پر آ کر ختم ہو جاتی ہے) اس سوال کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ آج سے تقریباً تیس سال پہلے انگریزوں نے شیعوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے انھیں بقیہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اپنا ممنونِ کرم بنانا ضروری سمجھا تھا چنانچہ یہی شیطانی خواہش تھی جس کی بنا پر مدحِ صحابہ کے بالکل فطری و قدرتی حق کو ما بہ النزاع بنایا گیا لیکن چونکہ جھوٹ کو زیادہ دن تک فروغ نہیں ہو سکتا اس لیے رفتہ رفتہ اس چالبازی کے تار و پود بکھرنا شروع ہو گئے مگر بدنصیبی سے آج کل ہمارے آسودہ حال مسلمانوں نے بعض دوسرے مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی شہنشاہیت کے قائم مقامی شروع کر دی ہے۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو راجہ اندر کے درباریوں کی طرح اس دنیائے رنج و محن کی غریب مخلوق پر صرف اسمبلی ہال یا کابینۂ وزارت میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے اپنے بنگلوں کی بلندیوں سے شفقت کی نظریں ڈالنا گوارہ کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے آج ان کی یہی سطحی مصلحتیں انھیں مدحِ صحابہ کے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے پر مجبور کر رہی ہیں یعنی اس وقت ہمارے ان بزرگوں کے سامنے سوال یہ نہیں ہے کہ مدحِ صحابہ مذہبی، شہری اور بنیادی حق ہے یا نہیں بلکہ سوال یہ ہے

کہ شیعوں کو ناراض کر کے وزارت کی سند کو حاصل کرنے یا حاصل شدہ وزارت کو باقی رکھنے میں مشکلات تو نہیں پیدا ہو جائیں گی چنانچہ اسی بنا پر پنجاب و بنگال کے وزیر اعظموں سے لے کر بہار و یوپی وغیرہ کے حسرت مآب ممبرانِ اسمبلی تک مسلم لیگ کے جھروکے سے سر نکال کر مسلمانوں کو مدحِ صحابہ کے حق سے دستبردار ہو جانے کی تلقین فرما رہے ہیں نیز اس سلسلہ میں جتنی ممکن غلط فہمیاں چپ رہ کر یا کچھ کہہ کر پھیلائی جا سکتی ہیں وہ سب پھیلائی جا رہی ہیں، مدینہ نے اس قسم کی غلط فہمیوں کے جواب میں حتی الامکان اپنے فرض کو محسوس کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ یہ اوراق بھی اسی احساس فرض کا نتیجہ ہیں[1]۔''

اس طرح تقسیم وطن سے پہلے جتنے بھی مسلمانوں کے اخبارات و رسائل نکلتے تھے تقریباً سبھی نے تحریک مدحِ صحابہ کی حمایت اور شیعوں کے تبرا ایجی ٹیشن کی مخالفت میں خامہ فرمائی کی تھی۔ تحریک کی دینی اہمیت اور اس سے مسلمانوں کے جذباتی لگاؤ کی وجہ سے اس کی حیثیت کل ہند پیمانہ پر محسوس کی جانے لگی اور پورے ملک کو یہ معلوم ہو گیا کہ لکھنؤ میں خصوصاً اور پورے یوپی میں عموماً مسلمانوں کے شرعی اور دینی حق کو کس طرح کچلا جا رہا ہے اور کس طرح حق کے مقابلہ میں ناحق کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔

مدحِ صحابہ اور سیاسی و مذہبی تنظیمیں

اُس دور میں برصغیر کی اکثر و بیشتر بڑی سیاسی جماعتیں اور بالخصوص مسلمانوں کی دینی و ملی تنظیمیں مسئلہ مدحِ صحابہ سے کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور وابستہ تھیں چنانچہ ملک کی سب سے بڑی جماعت کانگریس شروع ہی سے اس معاملہ میں مسلمانوں کے مطالبات کی حامی تھی مگر جب وہ یوپی میں عبوری حکومت کے دوران برسر اقتدار آئی تو اس نے بعض انتظامی دشواریوں کا حیلہ کر کے مدحِ صحابہ پر لگی پابندیوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں کوئی حق پسندانہ فیصلہ نہیں کیا اور اس مسئلہ کو تعویق ہی میں رکھنے میں عافیت سمجھی۔ مسلم لیگ کی روش بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، یوپی میں اس کے اکثر بڑے رہنما مدحِ صحابہ کی حمایت میں پیش پیش تھے جس کا واضح ثبوت یوپی اسمبلی کی وہ کارروائی ہے جس میں وہاں مدحِ صحابہ کی حمایت میں تحریک التواء پیش کی گئی تھی جس کے روحِ رواں نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے۔

---

[1] مدحِ صحابہ اور تبرا، دیباچہ مرتبہ ابو سعید بزمی، مدیر مدینہ بجنور

مسلمانوں کی دینی وسماجی تنظیموں نے بھی اس مسئلہ کی کھل کر حمایت کی اور ہر طرح سے قولی وعملی امداد کی۔ ان تنظیموں میں جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام، اور امارت شرعیہ صوبہ بہار واڑیسہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے لکھنؤ اور یوپی کے مسلم عوام کا کھل کر ساتھ دیا اور حکومت کی ناانصافیوں کی مبینہ طور پر مذمت کی۔

مدحِ صحابہ اور جمعیۃ علماء ہند

جمعیۃ علماء ہند اور اس کے اکابر نے شروع سے ہی تحریک مدحِ صحابہ کی حمایت میں لکھنؤ کے مسلمانوں کا ہر طرح سے ساتھ دیا ہے۔ علماء کانفرنس (۱۹۳۶ء) آلسپ کمیشن (۱۹۳۷ء) اور دوسرے اہم مواقع پر جمعیۃ کے اکابر بالخصوص شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ وغیرہم نے عملی طور پر نمایاں رول ادا کیا۔ خاص طور سے مدحِ صحابہ کی شرعی حیثیت کی وضاحت کے سلسلہ میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی تحریریں اور عملی جدوجہد ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے تین اجلاسہائے عام میں مسئلہ مدحِ صحابہ کے جائز مذہبی حق کے واگذار کرانے کے لیے تجاویز پاس کیں۔ اور اس وقت کی حکومت کی پُرزور مذمّت کی تھی۔ اس وقت ہم انھیں تجاویز کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمعیۃ کے رہنما اس مسئلہ میں کتنے زیادہ حساس تھے۔ چنانچہ ایک تجویز کے الفاظ اس طرح تھے:

> "جمعیۃ علماء ہند کا یہ جلسہ حکومت یوپی کے اس طرزِ عمل پر جو اس نے مدحِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے قضیہ میں لکھنؤ میں اختیار کیا ہے اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتا ہے جبکہ اس نے اصولاً تسلیم کرلیا ہے کہ پبلک مقامات پر بھی مدحِ صحابہ کرنے کا سنّیوں کو حق ہے اس کے باوجود اس نے مولانا عبدالشکور صاحب، مولانا ظفر الملک صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب وغیرہ کو صرف ایک جلسہ کا اعلان کرنے پر گرفتار کر کے ایک ایک سال کی سزا دے دی۔ یہ کارروائی سراسر ناانصافی اور بے آئینی پر مبنی ہے۔ حکومت پر لازم ہے کہ وہ جلد از جلد اپنی اس غلطی کا تدارک کرے اور گرفتار شدہ اور قید شدہ اشخاص کو فوراً رہا کردے۔ اور سنّیوں کو اپنے شہری اور مذہبی حق کے استعمال کا موقع بہم پہنچائے۔ لکھنؤ کے سنّیوں نے اپنے اس حق کے حاصل کرنے کے لیے مجبور ومضطرب ہوکر سول نافرمانی شروع کی ہے۔ یہ جلسہ سنّیوں کو اس اقدام پر مبارکباد دیتا ہے اور

مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے اس مطالبہ کو حاصل کرنے کے لیے سرفروشانہ جدوجہد جاری رکھیں گے۔

یہ جلسہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ہائی کمانڈ سے پُرزور درخواست کرتا ہے کہ وہ حکومت یوپی کو ہدایت دے کہ وہ سنیوں کے تسلیم کردہ حق پر سے پابندیاں اٹھالے اور اپنی غلطی کا جلد از جلد تدارک کرے[1]۔''

ایک دوسری تجویز میں اس تحریک کی اس طرح حمایت کی گئی تھی:

''جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس اس امر کا اعلان ضروری سمجھتا ہے کہ لکھنؤ میں مدحِ صحابہ کی تحریک سنیوں کی تیس سالہ تحریک ہے جو وہ اپنے ایک مذہبی حق کی تحصیل کے لیے جاری کیے ہوئے ہیں اور یہ کہ مسٹر گوپی ناتھ شریواستوا نے اپنی کتاب۔ کانگریسی دورِ حکومت، میں بالکل غلط لکھا ہے کہ یہ تحریک سنیوں نے کانگریسی حکومت کو مشکلات میں پھنسانے کے لیے جاری کی تھی۔

یہ اجلاس مدحِ صحابہ کے متعلق اپنی تجویز منظور شدہ اجلاس دہلی کی مکرر توثیق کرتا ہے کہ خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی علی الاعلان مدح وثنا کرنا سنیوں کا مذہبی اور شہری حق ہے، وہ اس کو کسی حال میں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور نہ اس پر کسی پابندی کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

یہ اجلاس ان سنّی مسلمانوں کے رویہ پر دلی افسوس کا اظہار کرتا ہے جو معاملات سے واقفیت بہم پہنچانے سے پہلے شیعوں کے ناجائز اور خلافِ عقل ونقل رویہ کی قولی یا عملی تائید کرتے اور سنیوں کے جائز اور مذہبی اور شہری حق کو نقصان پہنچاتے ہیں[2]۔''

ان تجاویز کے علاوہ جمعیۃ علماء ہند کے اکابر حکومتِ وقت سے بھی رابطہ کا ایک ذریعہ بنے اور اس بات کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ مسئلہ سلجھ جائے اور حکومت مدحِ صحابہ پر سے پابندیاں اٹھالے اور سنیوں کو ان کا جائز مذہبی وشہری حق مل جائے۔ حضرت مدنی اور دوسرے رہنمایانِ جمعیۃ حکومتِ یوپی کے ذمہ داروں سے برابر گفت وشنید کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ۱۹۴۵ء کے اجلاس سہارنپور میں ایک بار پھر جمعیۃ علماء ہند نے اجتماعی طور پر

---

[1] جمعیۃ علماء ہند، دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام ۱۹۱۹ء تا ۱۹۴۵ء مرتبہ پر دین روزینہ تجویز اجلاس یازدہم منعقدہ دہلی ۱۹۳۹ء۔ زیر صدارت مولانا عبدالحق مدنی، جلد دوم، ص ۵۲-۶۵۱۔

[2] حوالہ سابق ص ۹۹-۶۹۸، تجویز اجلاس دوازدہم، منعقدہ جونپور، مئی ۱۹۴۰ء، زیر صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ۔

اس سلسلہ میں ایک تجویز پاس کی جس کا متن یہ تھا:

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس حکومت صوبہ جات متحدہ کی اس متشددانہ اور غیر منصفانہ روش پر شدید ناراضگی و ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جو اس نے گذشتہ پانچ سال کے اندر لکھنؤ میں مدحِ صحابہ کی بندش کی صورت میں روا رکھی ہے۔ حکومت صوبہ نے جو وعدہ کیا تھا کہ خواہ حالات کچھ ہوں لکھنؤ کے سنیوں کو لازماً ہر سال بارہ ربیع الاوّل کو جلوس اور جلسۂ عام میں مدحِ صحابہ پڑھنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس موثق وعدہ کو کالعدم کر دیا گیا۔ بلکہ مقامی عمّال کو اس امر کی اجازت دے دی گئی کہ وہ گھروں تک میں صحابۂ کرام کی مدح وثنا کو روک دیں۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس حکومت صوبہ یوپی اور حکّام لکھنؤ کی اس حرکت کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس ناانصافی کو جلد از جلد ختم کر کے مسلمانوں کو مطمئن کرے[۱]۔"

اس طرح جمعیۃ علماء ہند روز اوّل سے اس تحریک سے وابستہ رہی اور ہر نازک مرحلہ پر مسلمانوں کے اس مذہبی اور شہری حق کے حصول میں مدد و معاون بنی رہی۔

مدحِ صحابہ اور مجلس احرار

مسلم تنظیموں میں جمعیۃ علماء ہند کے ساتھ ساتھ مجلس احرار بھی تحریک مدحِ صحابہ میں پیش پیش رہی ہے۔ جولائی ۱۹۳۶ء کے بعد مجلس احرار کا نام اس تحریک میں نمایاں طور پر سامنے اس وقت آیا جبکہ مسلمانانِ لکھنؤ پگٹ کمیشن (۱۹۰۸ء) کی رپورٹ اور حکومت کے ریزولیشن کے تحت سال میں تین دن کے لیے مدحِ صحابہ پر بندش عائد کرنے کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلا رہے تھے۔ ان دنوں ٹیلہ شاہ پیر محمدؒ لکھنؤ سے جہاں سنّی عوام اپنی گرفتاریاں مدحِ صحابہ پڑھ کر پیش کر رہے تھے وہیں احراری رضا کاروں کے جتھے بھی نہایت جوش وخروش کے ساتھ اپنی قربانیاں مذہب وملّت کی حمایت میں دے رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجلس احرار کی شمولیت سے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچی اور اس راستہ سے اس میں نئی نسل اور نیا خون داخل ہوا، اور پُر جوش کام کرنے والے، شعلہ بیان مقرر، زود گو شعراء، بسیار نویس ادیب وصحافی اور دین کو پھیلانے والی علماء ومبلغین کی ایک بڑی جماعت اس کام میں لگ گئی، اگرچہ اس کے بعض

---

[۱] حوالہ سابق، ص ۸۲۶، تجویز اجلاس چہاردہم منعقدہ سہارنپور، مئی ۱۹۴۵ء، زیرِ صدارت شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ

طریقۂ کار سے ہمارے اکابر کو اتفاق نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے خلوص اور جذبہ میں کوئی شک نہیں تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ صدر کل ہند مجلس احرار شروع ہی سے تحریک مدحِ صحابہ سے منسلک تھے۔ کل ہند علماء کانفرنس (۱۹۳۶ء) میں بھی آپ نے شرکت کی تھی۔ جلوس مدحِ صحابہ کی مانگ اور پھر حکومت کے ذریعہ اس مانگ کے پورا ہونے پر اس میں پورے جوش کے ساتھ شرکت اور پھر جب شیعوں نے تبرا ایجی ٹیشن شروع کیا تو اس کے خلاف مسلمانوں کی طرف سے محاذ آرائی میں بھی احراری رضا کار دوش بدوش تھے۔ ۲۹/دسمبر ۱۹۳۶ء کو پانچویں شیعہ پولٹیکل کانفرنس میں جس کی صدارت اودھ کے آخری بادشاہ کے فرزند شہزادہ اکرام حسین نے کی تھی شیعوں نے ایک قرارداد کے ذریعہ سنّیوں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ ''شیعوں کے جذبات اور حقوق کا خیال رکھیں کیونکہ اس طرح سے ان کو عملاً نظر انداز کیا جارہا ہے چنانچہ تحریک مدحِ صحابہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو شیعوں کے خلاف ہے اور یہ ان کی سیاسی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے چلائی گئی ہے'' اس قرارداد کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صدر کل ہند مجلس احرار نے ۳۱/دسمبر ۱۹۳۶ء کو لدھیانہ سے ایک پریس بیان شائع کیا جس کا متن یہ تھا:

''یہ قطعاً غلط ہے کہ تحریک مدحِ صحابہ شیعوں کی سیاسی حیثیت کو ختم کرنے یا انھیں آئندہ الیکشن میں نقصان پہنچانے کے لیے شروع کی گئی ہے۔ اس قسم کی الزام تراشی خود شیعہ امیدواروں کے حق میں مفید نہیں ہوگی بلکہ اس سے ان کے مفاد کو زیادہ نقصان پہنچے گا۔ پنجاب اور یوپی میں مجلس احرار خود شیعہ امیدواروں کی حمایت کررہی ہے، اس کے جنرل سکریٹری مولانا مظہر علی اظہر ہمیشہ بلا مقابلہ منتخب ہوتے رہے ہیں حالانکہ جس حلقہ سے وہ انتخاب لڑتے رہے ہیں وہ تمام کا تمام سنّیوں کا علاقہ ہے اور ان کا مدمقابل سنّی امیدوار تھا۔ مجلس احرار نے شیعہ یا سنّی کا خیال کیے بغیر ہمیشہ حق کی لڑائی لڑی ہے۔ دراصل تحریک مدحِ صحابہ کا مقصد یہ ہے کہ ایک ناجائز قانون کا خاتمہ کیا جاسکے کیونکہ اس قانون کے تحت سنّی اور شیعہ فرقہ کے درمیان ہمیشہ فساد برپا ہوتا رہتا ہے اس لیے انصاف پسند شیعہ حضرات علیحدہ نیابت کا خیال اپنے ذہنوں سے نکال دیں اور مدحِ صحابہ پر غیر ضروری پابندیوں کے خلاف ہمارا ساتھ دیں۔''[1]

مولانا لدھیانوی کے اس پریس بیان سے تحریک مدحِ صحابہ کے بارے میں مجلس احرار کی پالیسی بالکل واضح ہوجاتی ہے چنانچہ اسی پالیسی کے تحت اس کی مرکزی ہائی کمان اور صوبائی شاخ

---

[1] کاروانِ احرار، جلد دوم، ص ۲۷۴، مرتبہ جانباز مرزا۔

دونوں نے متفقہ طور پر اس جدوجہد کے پورے سفر میں سنیوں کا ساتھ دیا تھا۔

مدحِ صحابہ اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ

مسلمانوں کی ایک خالص دینی وملی تنظیم امارتِ شرعیہ صوبہ بہار واڑیسہ ہے جس کی داغ بیل حضرت ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحبؒ (م ۱۹۴۰ء) نے صوبۂ بہار واڑیسہ میں ڈالی تھی۔ امارت کی تنظیم وقت کی ایک اہم ضرورت تھی اور آج بھی اس کی اہمیت وافادیت اسی طرح باقی ہے۔ بہار میں سب سے پہلے مولانا سجادؒ ہی نے اس تنظیم کو قائم کرنے کے لیے علماء ومفکرین سے رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ملاقاتیں کیں اور تبادلۂ خیال کیا، ہندوستان کے سیاسی حالات اور مستقبل کے امکانات وخدشات پر روشنی ڈالی اور پھر اس کے تدارک کے طور پر مسلمانوں کے دین وایمان کو محفوظ رکھنے کے لیے اس تنظیم کی بنیاد ڈالی جو آج تک کسی نہ کسی شکل میں اپنے فرائض انجام دے رہی ہے اور مسلمانوں کی ملی، سماجی اور شرعی ضرورتوں کو اسلام کی مبارک تعلیمات کی روشنی میں پورا کر رہی ہے۔ اس تنظیم نے بھی اپنے موسسؒ کی رہنمائی میں تحریک مدح صحابہ میں بھرپور حصہ لیا، امارت شرعیہ کے ترجمان اخبار ''نقیب'' نے اپنے اداریوں میں مدح صحابہ پر لگی پابندیوں کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا۔ لکھنؤ میں جب مدح صحابہ ایجی ٹیشن چل رہا تھا تو ایک موقع پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد صاحبؒ اس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ٹیلہ کی مسجد اس جنگ کا محاذ تھی جہاں سے ہر جمعہ کو سول نافرمانی کر کے مدح صحابہ کے اشعار پڑھتے ہوئے مسلمان اپنی گرفتاری دیتے تھے۔ اس وقت جوش وجذبہ کا یہ عالم تھا کہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا بھی زبردست مجمع ہوتا تھا، ان کے لیے قناتوں کے ذریعہ پردہ کا معقول انتظام کیا جاتا تھا۔ جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پردہ نشیں عورتوں کے مجمع میں سے ایک خط کسی بچہ کے ذریعہ صدر جلسہ کے نام پہونچا اس میں کسی خاتون نے اپنے دینی ولولہ کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس ایجی ٹیشن میں عملی حصہ لینے کا موقع مجھ کو اور میری دوسری بہنوں کو بھی دیا جائے۔ حضرت مدنیؒ نے جو اس دن اس جلسہ کے صدر تھے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ آپ لاؤڈ اسپیکر کے پاس جا کر اس خط کا میری طرف سے جواب دے دیں اور بہنوں کو بتلا دیں کہ ابھی تو ہم لوگ باقی ہیں، جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود ہے یہ گوارا نہیں ہوسکتا کہ آپ اس راہ میں کوئی تکلیف اٹھائیں۔ اس موقع پر حضرت مولانا محمد

سجاد صاحب" بھی اسٹیج پر موجود تھے انہوں نے فرمایا:

''اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ حرب سلمی (آئینی جنگ) اور تلوار کی جنگ کے احکام شریعت میں جدا گانہ ہیں۔ تلوار کی لڑائی میں تو خاص حالات میں عورتوں کے لیے بھی شرکت کا موقع ہو جاتا ہے مگر یہ آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار ہی کرایا جاتا ہے، اس میں شرکت کا عورتوں کے لیے کوئی موقع نہیں ہوتا بلکہ شرعاً ان کے لیے ناجائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کرا کے قید ہو جائیں، لہٰذا ان بہنوں کا جذبہ قربانی تو قابل قدر ہے لیکن سول نافرمانی میں عملی شرکت کے خیال کو وہ قطعی طور پر دل سے نکال دیں کہ ان کے حق میں یہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کا باعث ہے[1]''

اس طرح ملک میں مسلمانوں کا ہر طبقہ خواہ وہ کسی بھی سیاسی جماعت سے وابستہ ہو یا کسی بھی دینی یا سماجی تنظیم سے منسلک ہو مدح صحابہ سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اور اس کی ہمدردیاں اس مسئلہ میں لکھنؤ کے مسلمانوں کے ساتھ ہو گئی تھیں۔

مدحِ صحابہ اور اُردو شاعری

تحریک مدح صحابہ سے ہمارے اردو ادب کے ذخیرہ میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے، اس کی بدولت اردو کی اصنافِ سخن میں ایک نئی صنف 'مدح صحابہ' وجود میں آئی۔ اب تک مدح صحابہ کے نام سے منقبتی اشعار کہنے کا علیحدہ سے عام رواج نہ تھا لیکن لکھنؤ میں جب صحابہ کرام کا نام لینا جرم قرار دے دیا گیا اور مسلمانوں کو اس جرم کی سزائیں ملنا شروع ہوئیں تو تقریروں اور تحریروں میں صحابہ کرام کے فضائل و مناقب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی ان کی شان میں مدحیہ قصائد لکھ کر نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور اس نے مستقل ایک صنف کی شکل اختیار کر لی۔ بہت سے اردو شعراء نے خاص طور سے اسی صنف کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا چنانچہ لکھنؤ اور اودھ میں ایسے شعراء کی ایک پوری نسل تیار ہو گئی جس نے مدح صحابہ اور منقبت کے اشعار کہنا ہی اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا۔ درحقیقت نعت سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اگر آپؐ کے اولین شاگردوں (صحابہ کرام) کی تعریف اور توصیف نہ کی جائے تو

---

[1] محاسن سجاد، مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی، ص ۶۲-۶۱ (۱۳۶۰ھ) امارت شرعیہ، دینی جدوجہد کا روشن باب، مرتبہ مولانا ظفیر الدین مفتاحی، ص ۲۲۸-۲۲۷۔

نعت گوئی کا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ ان برگزیدہ نفوس کے اندر جو اوصاف حمیدہ پیدا ہوئے ہیں وہ دراصل حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تعلیمات اور آپ ہی کی فیض صحبت کا نتیجہ ہیں اس لیے صحابۂ کرام کی مدح و توصیف بیان کرنا گویا حضور پاکؐ ہی کی شان میں مدح سرائی کرنا ہے۔ اس طرح ذکر نبیؐ اور ذکر اصحاب نبی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء کرام مدح صحابہ کی ان محافل میں بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور اس کو ایک عبادت تصور کرتے ہیں۔ اسی جذبۂ عقیدت و احترام کے پیش نظر لکھنؤ میں آل انڈیا مدح صحابہؓ مشاعرہ کی بنیاد ڈالی گئی جو کئی سال تک منعقد ہوتے رہے۔

جہاں تک پرانے ریکارڈ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے ان مشاعروں کا آغاز ۱۹۴۰ء سے ہوا ہے۔ یہ دو روزہ مشاعرے اپنی نوعیت کے منفرد مشاعرے ہوتے تھے، ان میں داخلہ بذریعہ پاس ہوا کرتا تھا جو بہ قیمت ملتے تھے اور ان کی نشستیں متعین ہوا کرتی تھیں۔ اس کے لیے نہایت وسیع اور خوبصورت دو منزلہ پنڈال بنایا جاتا تھا۔ اوپر کی منزل پردہ دار خواتین کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ یہ سارا انتظام احاطہ شیخ شوکت علی مرحوم میں کیا جاتا تھا اور شعراء کے قیام کے لیے شیخ مشرف مرحوم کی کوٹھی میں جو اسی احاطہ کے قریب ہے اور دارالمبلغین کی عمارت میں بندوبست کیا جاتا تھا اس طرح پہلا مدح صحابہ مشاعرہ ۱۹۴۰ء میں زیر صدارت علامہ اقبال سہیل اعظمی منعقد ہوا تھا، دوسرا مشاعرہ ۱۹۴۱ء میں زیر صدارت رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی، تیسرا ۱۹۴۲ء میں دوبارہ علامہ اقبال سہیل اعظمی کی صدارت میں اور چوتھا مشاعرہ ۱۹۴۴ء میں تیسری بار پھر علامہ سہیل ہی کی صدارت میں ہوا تھا۔

ان مشاعروں کے علاوہ ایک مشاعرہ ۲۰ رنومبر ۱۹۴۳ء کو کاکوری ضلع لکھنؤ میں بھی ہوا تھا جس کی صدارت لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاذ مولانا مصطفیٰ حسن صاحب فریاد علوی کاکورویؒ نے کی تھی۔ ان مشاعروں کی رودادیں، گلدستہ کی شکل میں مرتب کر کے شائع کر دی جاتی تھیں۔ اس دور کے چیدہ اور مشہور تمام ہی شعراء بشوق و ذوق ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ جن شعراء کے مدحیہ کلام کو خاص طور سے پسند کیا جاتا تھا ان میں مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ جناب سیماب اکبر آبادی، علامہ شفیق جون پوری، جناب مجروح سلطانپوری، مولانا ابوالوفاء عارف شاہجہانپوری، جناب ابوالفضل شمس لکھنوی، علامہ انور صابری، جناب نشور واحدی کانپوری، زائر

حرم حمید صدیقی لکھنوی، مولانا عبدالباری آسی، مولانا اثر زبیری لکھنوی، مولانا محمد اسحاق ضیا لکھنوی، جناب اسلم لکھنوی، مولانا افقر موہانی، جناب اسد درّانی، جناب سرشار کسمنڈوی، قاری محبوب علی ابوداؤد لکھنوی، مولوی عبدالسجان ہادی حیدرآبادی، شیخ امیر علی رقم لکھنوی، جناب اقبال صفی پوری، جناب بشیر احمد بشیر صدیقی لکھنوی، مولانا کلیم اللہ صاحب کلیم الہ آبادی، ڈاکٹر آزاد ملیح آبادی، جناب عشرت امروہوی اور ہندو شعراء میں منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی، گوکرن پرشاد کرن لکھنوی اور کرشن بہاری کرشنا لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ قرب و جوار کے اور مقامی شعراء کی تعداد تو سیکڑوں تک پہنچ چکی تھی جن کو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ مدح صحابہ مشاعروں کی یہ روایت لکھنؤ میں اور بعض دوسری جگہوں پر آج بھی کسی نہ کسی شکل میں بدستور باقی ہے۔ لکھنؤ میں ماہ محرم کے پندرہ روزہ شہدائے اسلام کے جلسوں کے آخری دن یعنی ۱۶ محرم کی شب میں ہر سال نعت و منقبت کا ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں مقامی اور بیرونی شعراء کرام شرکت کرتے ہیں۔

بعض حلقوں کی طرف سے تحریک کی مخالفت

اس تحریک کی وجہ سے جو مذہبی بیداری اور ملی شعور پیدا ہوا اس کی قدر تو وہی حضرات بخوبی کر سکتے ہیں جو مذہب سے لگاؤ اور دین سے تعلق رکھتے ہیں مگر کچھ حلقے ایسے بھی تھے جہاں سے اس کی مخالفت بھی ہوئی۔ مخالفت کا اصلی سرچشمہ تو شیعی حلقے ہی تھے۔ لیکن حکومت وقت بھی انہی کی دلدہی و دلداری میں اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ جس پر سنیوں کی طرف سے احتجاج ہوا کرتا تھا۔ ان مخالفین میں ایک تیسرا حلقہ وہ تھا جو عقیدتاً تفضیلی یا نیم شیعہ تھا یا وہ ان روسا و امراء کے زیر اقتدار تھا جن کی دولت وقوت صرف ملت جعفری کی پشت پناہ تھی اور اسی کی فلاح و بہبودی کے لیے مخصوص تھی۔ ایسے لوگوں سے کچھ توقع رکھنا فضول تھا کیونکہ جب کوئی غلط عقیدہ دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو بغیر تائید الٰہی کے صرف بحث و گفتگو سے اس کا ازالہ دشوار و محال ہوتا ہے اور وہ بھی جبکہ ذاتی مفادات درپیش ہوں تو وہاں اس کی آرزو ہی عبث ہے۔ اس طرح مدح صحابہ کی مخالفت کرنے والے یہ تین حلقے وہ تھے جن کو تو ہر حالت میں اس کی مخالفت کرنی ہی تھی اور اس کے علاوہ ان سے کسی دوسری بات کی امید بھی نہیں

کی جا سکتی تھی لہٰذا ان کے بارے میں کچھ کہنا اس وقت ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ البتہ ایک چوتھا حلقہ اور بھی تھا جو تحریک مدح صحابہ کو شبہ اور اعتراض کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس طبقہ میں جدید تعلیم یافتہ اور وقت کے مقتضیات و دینی مصالح سے بے خبر لوگوں کی اکثریت تھی۔ انہی لوگوں میں ایک قلیل تعداد ان ارباب فکر اور صاحب الرائے حضرات کی بھی تھی جو اپنی خدمات اور ملی سرگرمیوں کی وجہ سے خاص قدر و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کی طرف سے بھی کبھی کبھی اس تحریک کے بارے میں شکوک کا اظہار ہو جاتا تھا جس کے ازالہ کے لیے النجم، الداعی، حرم اور آفتاب جیسے جرائد میں برابر لکھا جاتا تھا اور اس کی وضاحت کی جاتی رہی تھی، کچھ مستقل رسالے اور کتابچے بھی شائع کیے گئے تھے، ایک رسالہ شیعہ سنی نزاع، کے نام سے مولانا ظفرالملک علوی مرحوم سکریٹری مدح صحابہ کمیٹی لکھنؤ نے بھی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ ان تمام تحریری مساعی کے علاوہ دینی اجتماعات میں تقریروں کے ذریعہ بھی نہ صرف اس تحریک کے جواز پر بلکہ ان حالات میں اس کے ضروری ہونے پر بھی بارہا روشنی ڈالی جاتی رہی ہے چنانچہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی، مجموعہ فتاویٰ مدح صحابہ، کے نام سے وہ رسالہ بھی ہے جو مولانا محمد محسن حسنی کے زیر اہتمام مرتب ہو کر عمدۃ المطابع لکھنؤ سے ۱۳۵۵ھ میں شائع ہوا تھا جس میں مدح صحابہ کی شرعی حیثیت اس کی اہمیت اور ضرورت متعین کرنے کے لیے سارے ہندوستان سے ہر مسلک و مکتب فکر کے مسلم علماء سے ان کے دستخط شدہ فتاویٰ حاصل کر کے شائع کیے گئے تھے[1]۔

تحریک مدح صحابہ اور اس کے بعض طریقۂ کار سے جن اہل علم حضرات کو اختلاف تھا ان کی طرف سے دو اشکال خاص طور سے پیش کیے جاتے تھے ایک یہ کہ اس تحریک سے افتراق بین المسلمین پیدا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ مدح صحابہ ایک بدعت ہے جس کی نظیر کسی اسلامی مملکت میں نہیں ملتی۔ اس قسم کے اعتراضات عموماً اودھ کے ماحول اور خاص طور سے لکھنؤ کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے کیے جاتے تھے ورنہ ان کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی۔ جہاں تک افتراق بین المسلمین کا سوال ہے، مولانا لکھنویؒ مذہب شیعہ کو ایک علیحدہ مذہب قرار دیتے تھے، ان کے اس نظریہ کی بنیاد شیعوں کے عقیدۂ تحریفِ قرآن، عقیدۂ امامت (جو ہمارے عقیدۂ ختم نبوت سے متصادم ہے)، عقیدۂ بداء، قذف ام المومنین اور سبِّ صحابہ جیسے متعدد عقائد پر ہے۔ شیعی حلقوں

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں 'مجموعہ فتاویٰ مدحِ صحابہ' مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ، ۱۳۵۵ھ

میں یہ خیالات اور عقائد راسخ ہیں، اگر چہ ظاہری طور پر وہ اس کی تردید کرتے ہیں مگر اپنی بنیادی مذہبی کتابوں اور اپنے مذہبی علماء کی تحریروں کو وہ کیسے چھپا سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حقیقت حال کبھی کبھی زبانوں پر اور تحریروں میں آ ہی جاتی ہے چنانچہ ان کے نامور قانون داں اور ممتاز رہنما سر سیّد وزیر حسن[1] سابق چیف جج چیف کورٹ اودھ نے ۵؍فروری ۱۹۴۱ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ کے ایک جلسہ میں اپنی تقریر کے دوران اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا:

''اگر ہندوستان کے شیعوں کو ایک الگ نیشن نہ کہا جائے تو کم از کم وہ ایک مستقل و علیحدہ فرقہ ضرور ہیں جس کے امتیازی خصوصیات اسے دوسرے مسلمانوں سے بالکل علیحدہ کرتے ہیں......
توحید، الوہیت، کلام مجید، رسالت، خلافت، نماز، روزہ، عقد اور تدفین غرض تمام بنیادی اور فروعی امور کی تعبیر میں زبردست اختلاف ہے جو ایک کو دوسرے سے بالکل الگ کر دیتا ہے......
ہماری تاریخ جدا ہے، ہماری روایات جدا ہیں، کیا آپ انکار کریں گے کہ ہمارے قانونی مسائل جس کے مرکز پر ہماری زندگی دور کرتی ہے علیحدہ نہیں ہیں۔ ہمارے قانون عقد، قانونِ طلاق، اور قانونِ وراثت کو دیکھئے سب علیحدہ ہیں لہٰذا ہمارے اور ان کے (یعنی مسلمانوں کے) درمیان اتحاد کس بنیاد پر ہو سکتا ہے؟[2]''

مدح صحابہ کے متعلق حضرت لکھنویؒ کا نقطہ نظر

اب ذرا غور کیا جائے کہ اسلامی تعلیمات اور مذکورہ بالا خیالات کی رو سے کیا تصویر ذہن میں ابھرتی ہے، جب خود ایک رہنما اور ایک ماہر قانون داں اپنے بارے میں ایسا کہتا ہو تو مولانا لکھنویؒ اور ان جیسے دوسرے علماء اپنی رائے کو حق بجانب سمجھنے کے لیے مجبور ہیں۔ لہٰذا ان کے نزدیک اس مسئلہ سے افتراق بین المسلمین پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک مدح صحابہ کے بدعت ہونے کا سول ہے مولانا علیہ الرحمۃ اس خیال کے سخت مخالف تھے۔ وہ

---

[1] سر وزیر حسن ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اور الٰہ آباد یونیورسٹیوں میں تعلیم اور قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وکالت شروع کی، کچھ عرصہ کے بعد چیف کورٹ لکھنؤ کے جج بنائے گئے۔ ۱۹۰۶ء میں جب مسلم لیگ کا قیام ڈھاکہ میں عمل میں آیا تو اس وقت یہ اس کے بانی ارکان میں سے تھے، ابتداءً اس کے اسسٹنٹ سکریٹری اور پھر بعد میں سکریٹری بنائے گئے، ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء کے درمیان آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی کے صدر بنائے گئے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا۔ (انسائیکلوپیڈیا قائد اعظم، مرتبہ زاہد حسین انجم، ص ۷۵۷)

[2] اخبار سرفراز، لکھنؤ، ۹؍فروری ۱۹۴۱ء۔

مدح صحابہ کو شعار اہل سنت سمجھتے تھے اور لکھنؤ کے مخصوص حالات کی روشنی میں اس کو واجب اور ضروری خیال کرتے تھے۔ مدح صحابہ کے جواز میں اور اپنے اصرار کی تائید میں جہاں آپ بہت سے دوسرے دلائل پیش کرتے تھے وہیں آپ نے اپنے ایک مضمون میں درج ذیل دو احادیث بھی نقل فرمائی ہیں:

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا ظهرت الفتن او البدع و سبت اصحابی فلیظهر العالم علمه فمن لم یفعل ذالک فعلیه لعنة الله و الملائکة و الناس اجمعین لا یقبل الله منه صرفا ولا عدلا.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت فتنوں کا یا بدعتوں کا ظہور ہو اور میرے اصحاب کی بدگوئی کی جائے تو (میری امت کے) عالم پر لازم ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے (یعنی صحابہ کرام کے فضائل جو اس کے علم میں ہوں انھیں بیان کرے اور بدگوئیوں کا جواب دے)، پھر جو عالم ایسا نہ کرے گا اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کی نہ کوئی عبادت قبول کرے گا اور نہ اس کی کوئی پرہیزگاری۔

اس حدیث کی تخریج خطیب بغدادیؒ نے اپنی کتاب الجامع میں کی ہے اور ان سے علامہ علی قاری مکیؒ نے شرح مشکوٰۃ میں، علامہ ابن حجر مکیؒ نے صواعق میں اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں اس کو نقل فرمایا ہے۔

(۲) قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا لعن آخر هٰذهِ الامة اولها فمن کتم حدیثاً فقد کتم ما انزل الله.

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اس امت (یعنی امت دعوت) کے لوگ اس امت کے اولین (یعنی صحابہ کرام) پر لعنت کریں تو ایسے وقت میں جو ایک بات بھی (صحابہ کے فضائل و مناقب کی اور ان لعنت والوں کے جوابدہی کی) چھپائے گا تو اس نے یقیناً اللہ کی نازل کی ہوئی چیز کو چھپا ڈالا۔

اس دوسری حدیث میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا...... الیٰ قولہ تعالیٰ...... اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ[۱] یعنی جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی چیز کو چھپاتے ہیں...... ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ

---

۱ البقرہ:۱۵۹

محدث دہلویؒ نے اپنی پاکیزہ کتاب ازالۃ الخفا کی تصنیف کا سبب اسی دوسری حدیث کو ظاہر فرمایا ہے۔[1]

مدحِ صحابہ کے جواز اور لکھنؤ کے مخصوص حالات میں اس کے وجوب کے خیال میں حضرت مولانا لکھنویؒ تنہا نہیں تھے بلکہ اُن کے ہم خیال اُس دور کے تمام ہی علماءِ حق تھے جیسے کہ 'مجموعہ فتاویٰ مدحِ صحابہ' سے پتہ چلتا ہے۔ ان فتاویٰ میں منجملہ دیگر فتوؤں کے ایک فتویٰ یہ بھی تھا:

''ذکر مناقب چار یار عبادت ہے اور جن مواقع میں روافض کی مجالس ہوں اور ذکر چار یار کی مزاحمت ہوتی ہو اور فسادِ عقائد عوام کا اندیشہ ہوتا ہو تو وہاں ذکر چار یار شعارِ اہل سنت ہوگا اور واجب ہوگا۔ لان ماتوقف علیہ الواجب واجب۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور مدح چار یار کبار نظماً یا نثراً پڑھنا فی حد ذاتہٖ جائز اور مستحب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔''

اس فتوے پر دستخط کرنے والوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا عبداللطیف صاحبؒ مظاہر علوم سہارنپور، مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سیّد عین القضاۃ لکھنویؒ، مولانا سیّد ظہور الاسلام فتح پوریؒ، مولانا خلیل الرحمٰنؒ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، شمس العلماء مولانا عبدالحمید فرنگی محلیؒ، مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے نام نامی قابلِ ذکر ہیں۔

اس فتوے کی تصویب میں مندرجہ ذیل عبارت کا بھی اضافہ کیا گیا تھا:

''جواب مذکور صحیح ہے، بیشک ذکر مناقب چار یار عبادت اور بصورتِ مزاحمتِ روافض بغرض حفاظتِ عام مومنین ذکر مناقب چار یار ضروری اور واجب ہے اور نعت سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ افضل الصلوات والتسلیمات و مدح چار یار نظماً یا نثراً اور مجتمعاً یا منفرداً فی حد ذاتہٖ جائز و مستحب ہے اور باعثِ خیر و برکت ہے...... ذکر مناقب چار یار اہل سنت کا ضروری مسئلہ ہے، اس میں مزاحمت کرنا اہل سنت کے مذہب میں دخل دینا ہے...... ذکرِ مناقب خلفاء اربعہ شعارِ اہل سنت ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں...... یہ حرمین محترمین میں بھی رائج ہے۔ واللہ اعلم وحکمہ احکم۔

ان عبارتوں پر دستخط کرنے والوں میں علاوہ مذکورہ بالا علماء کے درج ذیل حضرات بھی قابلِ ذکر ہیں:

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبند، مولانا سیّد احمد حسن امروہویؒ، مولانا محمد سہولؒ دیوبند، مولانا سیّد مرتضیٰ حسنؒ دیوبند، مولانا فضل ربیؒ دیوبند، مولانا حافظ احمدؒ دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن دیوبند،

---

[1] مدحِ صحابہ کی مخالفت میں آیت قرآنی سے غلط استدلال اور اس کا جواب، مرتبہ مولانا لکھنویؒ

مولانا عبدالمومن میرٹھ، مولانا عبدالشکور صاحبؒ لکھنؤ، مولانا محمد شفیعؒ مدرسہ عبدالرب دہلی، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مدرسہ فتح پوری دہلی، مولانا عبدالعزیزؒ مدرسہ حسین بخش دہلی، مولانا ضیاء الحقؒ مدرسہ امینیہ دہلی اور مولانا محمود حسن سہسوانیؒ و مولانا حافظ عبدالرحمٰنؒ مدرسہ شاہی مراد آباد[1]

جلوسِ مدحِ صحابہ کی ضرورت و اہمیت

اودھ اور خاص طور سے لکھنؤ کے مخصوص حالات کے پس منظر میں مدحِ صحابہ کی شرعی و فقہی حیثیت کے بارے میں مولانا لکھنویؒ کا نقطۂ نظر معلوم ہونے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جلوسِ مدحِ صحابہ کے بارے میں بھی آپ کے خیالات معلوم ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ لکھنؤ میں شیعوں کے درجنوں جلوس، علم اور تعزیے وغیرہ نکلا کرتے تھے۔ کسی مہینے کی کوئی جمعرات ایسی نہیں گذرتی تھی جس میں یہ جلوس اور علم نہ نکلتے ہوں اور ایامِ عزاء میں تو ان کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ یہ تمام جلوس اکثر و بیشتر سنّی محلوں کے درمیان سے گذارے جاتے تھے جس کی وجہ سے اس میں شریک لوگوں کا جوش و خروش دیکھنے کے لائق ہوتا تھا، ایسے ہی مواقع پر تبرائی نعرے بھی لگائے جاتے تھے جن کی وجہ سے کئی بار بھیانک فسادات بھی ہو چکے تھے۔ ان جلوسوں سے سیدھے سادے سنّیوں میں گمراہی اور تعزیہ داری کی رسموں کو بڑا فروغ ملتا تھا، اس طرح فریق مخالف کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا بڑا اچھا ذریعہ مل گیا تھا، چنانچہ اس کے تبلیغی مرکز مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کا ترجمان اخبار لکھتا ہے:

> ''اس وقت وہابی مسلک طبقہ پوری طرح اس کوشش میں منہمک ہے کہ کسی نہ کسی...... ترکیب و تدبیر سے عزاداری کو نقصان پہنچ جائے اس لیے کہ یہی وہ ادارہ (ذریعہ) ہے جو سنّیوں کی تعداد میں کمی اور شیعوں کی تعداد میں برابر اضافہ کر رہا ہے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر مدحِ صحابہ کی تحریک بروئے کار لائی گئی ہے[2]''

انہی ایام میں شیعوں کے ایک دوسرے اخبار 'سرفراز' لکھنؤ نے تو یہاں تک لکھ دیا تھا:

> ''مدحِ صحابہ کی تحریک سے ہم کو مخالفت محض اس وجہ سے ہے کہ وہ سنّیوں سے تعزیہ داری ترک کرانے کا ایک کامیاب آلہ ہے[3]''

چنانچہ ان حالات پر قابو پانے اور اپنے لوگوں کو گمراہیوں سے بچانے کے لیے مولانا

---

[1] مجموعہ فتاوائے مدحِ صحابہ، ص ۲۱-۱۸ [2] الواعظ لکھنؤ، یکم و ۸؍ جون ۱۹۳۹ء

[3] 'مدحِ صحابہ کی مخالفت میں آیت قرآنی سے غلط استدلال اور اس کا جواب' مولانا لکھنویؒ

لکھنویؒ نے جلوسِ مدحِ صحابہ کی مانگ کی تھی اور وہ بھی سال میں ایک مرتبہ بارہ ربیع الاول کے موقع پر۔ بڑی جدو جہد اور سعی و کوشش کے بعد حکومت نے اس مانگ کو تسلیم بھی کر لیا تھا اور دو تین سال تک یہ جلوس نکلا بھی مگر پھر مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے اس پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس طرح سنّیوں کا ایک جائز شہری حق ان سے چھین لیا گیا۔

جلوس مدحِ صحابہ کی تائید میں مولانا لکھنویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''بات صرف اتنی ہے کہ سنّیوں کو بہکانے اور صحابہ کرام سے بدظن کرنے کے لیے جلوس کی شکل میں (اپنے مذہب کی) تبلیغ کی جاتی ہے، اس لیے اس کا ازالہ بھی کما حقہٗ جلوس ہی کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ جلوس کی شکل میں جتنی تبلیغ ہوتی ہے، وعظ کی محفلوں اور رسالوں (کی اشاعت) سے اس کی عشر عشیر بھی نہیں ہوسکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ جلوس کی مزاحمت ہو رہی ہے اس لیے اس پر اصرار کیا جا رہا ہے اور جب تک یہ مزاحمت دفع نہ ہو ان شاء اللہ تعالیٰ یہ اصرار قائم رہے گا۔ تیسری بات سب سے بڑی یہ ہے کہ مدحِ صحابہ کے جلوس نے لکھنؤ اور اس کے قرب و جوار میں سنّیوں سے تعزیہ داری ترک کرادی۔ لکھنؤ میں سنّیوں کے گیارہ سو کے قریب تعزیے نکلتے تھے جن میں کچھ تو مواعظ سے بند ہوئے اور بقیہ سب اسی جلوس کی برکت سے بند ہوئے۔ اب صرف سنّیوں کے گیارہ یا بارہ تعزیے شیعوں کی زر پاشی کی وجہ سے باقی رہ گئے ہیں، حقیقت میں وہ لوگ شیعوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ تعزیہ داری کا فساد صرف عمل ہی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر عقائد تک پہنچتا ہے، بہت سی چیزیں اس میں شرک کی حد تک پہنچتی ہیں اور مذہب کی طرف لوگوں کو مائل کرنا تو اس کا خاص کام ہے، چنانچہ اسی تعزیہ داری کی بدولت بکثرت سنّی علانیہ شیعہ ہوچکے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ بھی دراصل نیم شیعہ تھے الا ماشاء اللہ...... ہاں اگر جلوس (یعنی کسی چیز کی تبلیغ مجمع کے ساتھ راستوں اور سڑکوں پر گشت لگا کر کرنا) شرعاً ممنوع ہوتا تو بے شک ہم کسی فائدہ کے لیے کوئی ممنوع طریقہ نہیں اختیار کر سکتے تھے لیکن اس کا شرعاً ممنوع ہونا تو کیا معنی اس کے بعض نظائر بھی شریعت میں موجود ہیں مثل تکبیر تشریق کے کہ وہ عید الاضحیٰ میں عید گاہ جاتے وقت اور لوٹتے وقت بلند آواز سے پڑھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ (اس درمیان) راستوں پر اور سڑکوں پر بھی گذر رہوتا ہے اور جانے والوں کا مجمع بھی ہوتا ہے[1]''

انہی اسباب کی بنا پر مولانا لکھنویؒ مسلک اہلِ سنّت کی حفاظت اور اس کی تبلیغ کے لیے لکھنؤ میں جلوس کو ضروری اور مفید خیال کرتے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ ماحول اور حالات کی تبدیلی کے بعد اس کو مزید برقرار رکھنے کے بھی حامی نہ تھے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

---

[1] ماہنامہ الداعی، لکھنؤ، جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ

"اس حقیر نے بار بار اعلان کیا ہے کہ اگر جلوس مدحِ صحابہ سے پابندیاں ہٹ جائیں تو ہم جلوس کے باقی رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن جلوس سے پابندی ہٹنا تو کجا مدحِ صحابہ کے لیے کوئی محفل و مجلس منعقد کی جائے اس پر بھی پابندی اسی طرح قائم ہے[1]"

ان شواہد کی روشنی میں جلوس مدحِ صحابہ کے بارے میں مولانا کا موقف بالکل واضح ہے لیکن جب یہ حالات باقی نہیں رہے تو اس پر اصرار بھی ختم ہو گیا کیونکہ جلوس فی نفسہ کوئی مذہبی چیز نہ تھی، صرف ماحول اور ضرورت کے پیشِ نظر ہی اس کی مانگ کی جا رہی تھی۔

تحریک مدحِ صحابہ کے دینی فوائد

مسلمانوں کے عمومی تعاون اور ان میں دینی بیداری پیدا ہو جانے کی وجہ سے لکھنؤ شہر، صوبہ یوپی اور پھر یہاں سے نکل کر پورے ملک میں اس تحریک کے اثرات پھیل گئے اور لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ بھی ایک مذہبی مسئلہ ہے جس کے ذریعہ ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جا رہی ہے۔ ۱۹۰۴ء کے بعد سے مخالفینِ اہل سنت میں جو مذہبی عصبیت پیدا ہوئی اور انھوں نے اپنے عقائد کا جس طرح اظہار کرنا شروع کیا اس سے یہاں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلنا لازمی تھا۔ حالات یہاں تک ناگفتہ بہ ہو گئے تھے کہ لکھنؤ میں صحابہ کرام کا نام لینا تک جرم ہو گیا تھا اور اہل سنت و جماعت کا اپنا تشخص باقی رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان باتوں کا ردِ عمل ہونا بھی لازمی تھا۔ چنانچہ اس عرصہ میں ردِّ شیعیت میں اتنا زیادہ لکھا اور کہا گیا کہ ہر ذی شعور مسلمان مرد، عورت، اور بوڑھے بچے کو یہ معلوم ہو گیا کہ شیعہ سنی مذہبی اختلافات کی نوعیت اور بنیاد کیا ہے۔ لہٰذا اب کوئی بھی باہوش اور ملّی شعور رکھنے والا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں فرقے ایک ہی مذہب کی دو شاخیں ہیں یا ان کے درمیان چند فروعی اختلافات ہیں۔ اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو یہ اس کی دینی معلومات کی کمی یا مذہبی بے حسی یا پھر سراسر ہٹ دھرمی کہی جائے گی۔

تحریک مدحِ صحابہ کے جواب میں جب مخالفینِ اہل سنت نے لکھنؤ میں تبرا ایجی ٹیشن شروع کیا جو لگ بھگ پانچ مہینے تک چلتا رہا تو اس نے ان اختلافات کی اور بھی قلعی کھول کر رکھ دی، مزید لطف یہ ہوا کہ شیعہ علماء، واعظین و مبلغین اور ان کے قانون دانوں کی تحریروں اور تقریروں میں مسلمہ اسلامی عقائد کے خلاف ایسے 'شاہکار' خیالات و افکار سامنے آئے جن کو اب تک اُن کے اکابر اپنے سینوں اور تقیہ کی دبیز چادروں میں لپیٹے ہوئے دنیا میں آئے اور چلے گئے مگر آج

---

[1] ماہنامہ الداعی، لکھنؤ، جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ

اُن کے متبعین نے ان رازہائے سربستہ کو افشا کر دیا اور وہ کھل کر سامنے آ ہی گئے۔

مسلمانوں کے اندر سے تعزیہ داری کی رسم کا خاتمہ بھی اسی تحریک کی بدولت ہوا۔ اس رسم میں جہاں بُت پرستی اور شرک کے جراثیم پوشیدہ تھے وہیں یہ ملک کے دو بڑے فرقوں (ہندو اور مسلم) میں ٹکراؤ کا بھی سبب تھی اور اب بھی اکثر مقامات پر اس رسم قبیح کی وجہ سے فسادات ہوتے رہتے ہیں جن میں بہ کثرت جانی و مالی نقصانات ہوتے ہیں۔ لیکن اب سمجھدار اور دینی حمیّت رکھنے والے طبقوں سے یہ رسمِ بد ختم ہو چکی ہے۔ البتہ تھوڑے سے کم پڑھے لکھے اور دین سے ناواقف مسلمانوں میں ہی اس کے اثرات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی محض رسم و رواج کے طور پر ہی ہیں، عقیدہ کا دخل کم ہے۔ تعزیہ داری بھی شیعیت کی تبلیغ کا ایک مؤثر ذریعہ ہے، اس کے تدارک کے بعد جو اور دوسری رسمیں مسلمانوں میں رائج تھیں ان کا بھی بہت کچھ سدّ باب ہوا۔

برسہا برس سے شیعہ اور سنّیوں میں شادی بیاہ ہوتا چلا آ رہا تھا، اس سے بھی بہت سے خاندان شیعیت کی طرف مائل ہو گئے تھے، تاریخ گواہ ہے کہ بہت سی مسلم ریاستیں اور پشتینی سنی رجواڑے محض اس وجہ سے شیعہ ہو گئے کہ اُن کے سربراہوں نے شیعوں سے مناکحت کر لی تھی جس کے نتیجہ میں آج وہ متشدد شیعہ عقائد پر کاربند ہیں۔ تحریکِ مدحِ صحابہ ہی کی برکت سے شادی بیاہ کا یہ سلسلہ بھی ننانوے فیصد ختم ہو چکا ہے، ان کی مساجد تو پہلے ہی سے علیحدہ تھیں اب قبرستان بھی الگ ہو چکے ہیں۔

جب مسلم معاشرہ سے ان رسوم و عقائد کا صفایا ہوا تو لوگوں میں دینداری، پابندی صوم و صلوٰۃ اور دوسرے اعمالِ خیر کی طرف رجحان پیدا ہوا، مساجد جو اب تک نمازیوں کی کمی کی وجہ سے سنسان اور غیر آباد پڑی ہوئی تھیں اب آباد اور معمور ہونے لگیں۔ لوگوں میں علم دین حاصل کرنے کی طرف رغبت پیدا ہوئی چنانچہ اس مقصد کے لیے مساجد اور دوسرے مقامات میں مدارس و مکاتب قائم کیے جانے لگے۔ ان سارے مقاصد کے حصول کی راہیں صرف اسی وقت کھلنا ممکن ہو سکیں جب سنّیوں میں سنّی ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ یہ احساس تحریک مدحِ صحابہ نے پیدا کیا اور اس کو پروان چڑھایا۔ انجم کی مساعی جمیلہ نے، دارالمبلّغین کی خدماتِ جلیلہ نے اور سب سے بڑھ کر حضرت مولانا لکھنویؒ کی تحریری و تقریری خدمات نے جس قدر اسلام کی روشن تعلیمات کی تبلیغ کی اور اغیار کے ذریعہ پھیلائے گئے دجل و فریب کے تانے بانے تارِ عنکبوت کی طرح بکھیرے اس کی کوئی دوسری مثال بہت مشکل سے ملے گی۔

اکیسواں باب

مناظرے ومباحثے

اسلام ایک دعوتی مذہب ہے۔ دعوت کے دوران داعی کو کبھی مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے بالخصوص اس وقت جبکہ دعوت کا کام متحارب اور متجادل قوتوں کے درمیان میں ہو۔ ان حالات میں داعی کی فہم وتدبّر اور حزم واحتیاط کی آزمائش ہوتی ہے، اسے اپنی بات کو اس طرح پیش کرنا پڑتا ہے کہ حق بات واضح ہوکر مقابل کے باطل دعاوی پر غالب آجائے۔ دعوت کا کام کرنے والوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کو اپنے دعوتی نظام کے ہر گوشے اور ہر نکتہ پر دسترس حاصل ہو اور اس کے رموز واسرار وحکم پر ان کی پوری گرفت ہو اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی مدمقابل کی نفسیات، معتقدات اور اس کے بنیادی مذہبی لٹریچر پر بھی پورا عبور ہو، اسی طرح جب ان اوصاف کے ساتھ کوئی داعی متصف ہوتا ہے تب ہی وہ احقاقِ حق اور ابطال باطل کا فریضہ انجام دے سکتا ہے۔

اسلام دینِ رحمت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ لایا ہوا ایک نظام ہے، اس کی تعلیمات زخمی دلوں کا مرہم اور معاشرے کے ٹھکرائے اور ستائے ہوئے لوگوں کے لیے پناہ گاہ ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان تعلیمات کی تبلیغ بھی نہایت رفق ونرمی کے ساتھ کی جائے تا کہ بغیر کسی مزاحمت ومخاصمت کے وہ براہِ راست قلوبِ انسانی کو متاثر کرسکے۔ مگر کبھی کبھی بہ تقاضائے وقت اس کے برعکس بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چیلنج کے مقابلے میں استدلال اور بعض اوقات قوّت کے مقابلہ میں قوت بھی استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ حق کا خاصہ ہے کہ وہ غالب ہی رہتا ہے مغلوب ہوکر نہیں رہ سکتا۔

ایک کامیاب طبیب مرض کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے جہاں میٹھی اور خوش ذائقہ دوائیں

دیتا ہے وہیں اکثر اس کو تلخ اور بدذائقہ دوائیں بھی تجویز کرنی پڑتی ہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد صحت بحال کرنا ہوتا ہے، اسے تلخ اور شیریں ذائقہ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ بعض امراض میں تو تلخ دوائیں ہی زیادہ فائدہ کرتی ہیں۔ طبیب بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو صرف دواؤں کے ذریعہ عام امراض کا علاج کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو عملِ جرّاحی کے ذریعہ مادۂ فاسد کو کاٹ چھانٹ کر صحت یاب بناتے ہیں، اگرچہ یہ طریقہ مریض کے لیے زیادہ تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے مگر اس کی صحت اسی میں مضمر ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح مصلحین امت بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو امّت کی اصلاح کے لیے صرف ترغیب وترہیب کا طریقہ اختیار کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو مذکورہ بالا تدبیر کے بے اثر ہو جانے کی صورت میں احقاق حق کے لیے دلائل و شواہد اور بحث ومناظرہ کے ذریعہ تبلیغ حق کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس راہ میں بڑی دشواریاں، دشنام طرازیاں اور مخالفتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور غیروں کے علاوہ بعض اپنوں کی طرف سے بھی طنز وطعن کے صدمے جھیلنے پڑتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان میں مناظروں کا بازار خاص طور سے گرم تھا جس کے بہت سے اسباب میں ایک سیاسی وجہ بھی تھی۔ انگریز نے ہندوستان پر اپنا تسلّط جما لینے کے بعد دو کام خاص طور سے کیے، ایک تو یہ کہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے یورپ سے عیسائی مبلّغین کی جماعتوں کو فوج درفوج اپنی تمام تر سہولتوں، آسانیوں اور ہمہ قسم کی آزادیوں کے ساتھ بلوانا شروع کیا جہاں انھیں اس بات کی تاکید کی جاتی تھی کہ وہ ہر طرح کی ترغیب وترہیب کو کام میں لاکر ہندوستانیوں کو ان کے مذہب سے برگشتہ کر کے عیسائی بنائیں اور دوسرے یہ کہ یہاں کی آبادی کو باہم لڑا کر ان کی یگانگت اور یکجہتی کو پارہ پارہ کر دیں۔ ان دونوں کاموں میں انھیں خاصی کامیابی بھی ملی۔ انھوں نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کو خاص طور سے نشانہ بنایا۔ ہم نے تاریخ کے اوراق کے مطالعہ سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ جدوجہد آزادی میں ہندوستانی مسلمان صف اوّل میں تھے، چونکہ ملک کو مسلمانوں سے چھینا گیا تھا اس لیے ظلم وستم کا شکار بھی وہی سب سے زیادہ ہوئے۔ جنگ آزادی کی مہم میں مسلمانوں کی قیادت کی ذمّہ داری علماء نے سنبھال رکھی تھی لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے علماء کو سب سے زیادہ دار ورسن کا مستحق قرار دیا اور ایک عرصہ تک چُن چُن کر انھیں

تختۂ دار پر چڑھایا جاتا رہا۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ مسلمانوں کو جانی و مالی نقصان پہنچا کر انھیں مذہبی طور پر بھی منتشر اور پراگندہ حال کرنے کی سازش رچی گئی، چنانچہ پہلے تو عیسائی پادریوں کو ہر قسم کی چھوٹ دے کر مذہب عیسوی کی تبلیغ کے لیے مسلّط کیا گیا، جنھوں نے یہاں گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں بھیڑ اکٹھا کر کے مناظروں کا بازار گرم کر دیا، اس سے بھی زیادہ خطرناک طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے خلاف خود انھی کے اندر کے چھوٹے موٹے طبقوں کو جو فقہی یا نظریاتی اختلاف رکھتے تھے اکسا کر اور در پردہ شہ دے کر مد مقابل بنا کر کھڑا کر دیا تا کہ ان کی ملّی یکجہتی اور رشتۂ اتحاد ٹوٹ کر بکھر جائے، چنانچہ اسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت شیعوں کو کمک پہنچائی گئی، پنجاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کو ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنے اور اپنی نبوت کا دعویٰ کرنے کا راستہ دکھایا گیا اور خود اہل سنت و جماعت کے اندر توڑ پھوڑ کرنے کے لیے مولوی احمد رضا خاں بریلوی کو ایک نئے فقہی مسلک کے فروغ دینے کی تدبیر بجھائی گئی۔ ان تمام تخریبی کارروائیوں کا مآل یہ نکلا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر آپسی ٹکراؤ اور اپنے اپنے مذہبی نظریات کو دوسروں پر زور و زبردستی سے تھوپنے کی لہر چل پڑی اور اس طرح باہمی مناظروں کا سلسلہ چل پڑا جس سے وحدتِ اسلامی کو وہ نقصان پہنچا کہ جس کی تلافی آج تک نہ ہو سکی۔ حصولِ آزادی سے پہلے کی ہندوستانی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو کہیں شیعوں کی طرف سے مناظروں کا چیلنج دیا جانے لگا، کہیں قادیانیوں کے جھوٹے مدعی نبوت نے برانگیختہ کیا تو کہیں دیوبندی بریلوی مسلک کے جھگڑوں میں مبتلا کر دیا گیا۔ اس طرح مسلمانوں کی وہ اجتماعی طاقت جو اب تک انگریزوں کے خلاف مورچہ قائم کیے ہوئے تھی وہی اب اپنے ہی ان ''برادرانِ گندم نما جو فروشوں'' کے خلاف صرف ہونے لگی۔

مذہبی لحاظ سے مناظرہ کوئی غیر محمود شے نہیں ہے، اس کا دارو مدار نیت اور طریقۂ کار پر ہے۔ اگر نیت اظہارِ حق اور تبلیغ دین ہو اور محض اپنے علم و فضل اور قوتِ گویائی کے اظہار کا کوئی شائبہ نہ ہو تو وہ عند اللہ مقبول اور باعث اجر و ثواب ہے۔ اسی طرح اگر متانت و سنجیدگی اور برداشت و تحمل سے کام لیا جائے تو وہ موجب رشد و ہدایت بھی ہے۔

حضرت لکھنویؒ کے جتنے بھی مناظرے ہوئے وہ انھی دو احسن بنیادوں پر ہوئے، کبھی آپ نے اپنی طرف سے کسی کو مناظرہ کا چیلنج نہیں دیا بلکہ دوسروں کے چیلنج کو بطور دفاع قبول کیا۔ کبھی

آپ مناظرے میں مشتعل نہیں ہوئے، کبھی ناشائستہ کلمات آپ کی زبان سے صادر نہیں ہوئے بلکہ فریقِ مخالف کی اشتعال انگیز باتوں پر صبر وتحمل سے کام لیا اور علمی دلائل و براہین سے قائل کرنے کی کوشش کی جبکہ ان کے ساتھ معاملات اس کے برعکس ہوئے۔ اس وقت کے شیعہ مدرستہ الواعظین لکھنؤ کے ایک اہم استاذ مولوی محمد شفیع اپنے ایک رسالہ میں اصولِ مناظرہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مناظرہ داؤں پیچ کا نام ہے، جس طرح بھی ہوسکے حریف کو مغلوب کرنے کی کوشش کرو، ایسے موقع پر قواعد کی پابندی یا اظہارِ حق کی سعی فعلِ عبث ہے"[1]

حضرت لکھنویؒ کے مناظرے مختلف فرقوں سے ہوئے جن میں شیعہ، بریلوی، قادیانی وغیرہ جیسے فرقے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ لکھنؤ چونکہ وطن تھا اور وہاں شیعوں کو مرکزیت حاصل تھی اس لئے زیادہ تر مناظرے انہی سے ہوئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس چیز سے انھیں زیادہ لگاؤ نہ تھا اور نہ ہی وہ اپنے اوقاتِ عزیز کو اس میں صَرف کرنا چاہتے تھے وہی چیز ان کے لیے باعثِ شہرت بن گئی اور اکثر لوگ اسی حیثیت سے ان کو جاننے اور پہچاننے لگے۔ وہ خود اپنی اس حیثیت کو زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیّتِ خداوندی ان کے ذریعہ سے یہی خدمت خاص طور سے انجام دلانا چاہتی تھی چنانچہ اپنی طبیعت، مزاج اور ذوق کے برعکس انھیں بہ تقاضائے حالات کچھ ایسے ہی کام کرنا پڑے۔ آپ نے جن حالات اور جس طریقہ سے مناظرے کیے ان پر خود ہی ایک موقع پر اپنے قلم سے روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں جہاں اور فتنوں کی ترقی ہے وہیں ایک بڑا فتنہ یہ ہے کہ شیعوں کی طرف سے باقاعدہ منظم طور پر اہل سنت و جماعت کے خلاف معاندانہ کارروائی کا طوفان برپا ہے اور وہ ہمارے مذہب پر ہر قسم کے ناروا حملے کررہے ہیں۔ ایک مدّت کی صبر و خاموشی کے بعد اس طرح توجہ کرنی پڑی اور بتوفیقِ خداوندی جو خدمت ہوسکی انجام دی گئی۔ اگرچہ اس حقیر نے اپنے وقت کا زیادہ حصہ مذہبِ شیعہ کے ردّ و ابطال میں صرف نہیں کیا بلکہ زیادہ وقت دوسرے کاموں میں صرف کیا لیکن چونکہ اس وقت اہل سنّت میں کسی اور کو اس طرف توجہ نہیں ہے الا ماشاءاللہ، اس لیے تھوڑے سے کام کی شہرت زیادہ ہوگئی۔

۱۳۲۲ھ سے آج تک مذہبِ شیعہ کے متعلق جس قدر لکھا جاچکا ہے وہ اس مذہب کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے بہت کافی ہے اور حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ تحریر اور تقریر میں جو

---

[1] النجم لکھنؤ (دورِ جدید) شوال ۱۳۵۰ھ

کچھ بھی اس مذہب کے متعلق بیان کیا گیا ہے وہ سراسر تحقیق اور خالص انصاف پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شیعہ ٹھنڈے دل سے اس کا مطالعہ کرے تو انشاء اللہ تعالیٰ بے اثر نہ رہے گا...... بالمشافہہ مناظروں میں بھی کبھی اپنے مخاطب کو خواہ مخواہ مغلوب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ بعونہ تعالیٰ اپنے ضمیر اور اپنی تحقیقات کے مطابق نہایت سادگی سے دلائل پیش کیے گئے جبکہ شیعہ مناظرین کی طرف سے خلافِ تہذیب اور اشتعال انگیز حرکات بھی ہوئیں، کتابوں کے جھوٹے حوالے اور عبارتوں کے غلط ترجمے بھی پیش ہوئے مگر پھر بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے سے پرہیز کیا گیا اور آیتِ کریمہ ادفع بِالّتِي هِيَ اَحْسَنُ پر عمل کر کے تمام تر توجہ اظہارِ حق پر صرف کی گئی''[1]

اپنے انہی زریں اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے ہندوستان کے مختلف فرقوں سے آپ نے مناظرے کیے، اس موقع پر ہم آپ کے ان مناظروں کا ذکر کریں گے جن کی رودادیں شائع ہو چکی ہیں یا ان کا حال النجم کے صفحات میں نظر سے گزرا ہے۔ کچھ مناظرے ایسے بھی ہیں جن کی کوئی تفصیل ہمیں کہیں سے نہیں مل سکی۔ اس کے علاوہ ہم نے ایسے اسفار کو بھی ان میں شامل کیا ہے جو مناظروں کی شرائط، موضوعِ بحث اور فریقین کے درمیان تاریخ کے تعین کے بعد کیے گئے تھے لیکن جائے مناظرہ پر پہنچنے کے بعد فریقِ ثانی نے کسی حیلہ سے مناظرہ ملتوی کرا دیا اور اس طرح اپنی فرار اپنے آپ ہی تسلیم کر لی۔ بہر کیف تلاش و جستجو کے بعد ہمیں جو کچھ مل سکا ہے اسے پیش کیا جا رہا ہے۔ جن مقامات پر بالمشافہہ مناظرہ ہوا تھا انھیں ہم نے ''مناظرہ'' کے نام سے لکھا ہے اور جہاں آپ سفر کر کے تشریف لے گئے مگر فریق ثانی نے موقع سے فرار اختیار کر لیا اور مناظرے کی نوبت نہیں آنے دی تو ایسے مواقع کو ہم نے ''سفر'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔

شیعوں سے مناظرے

۱۔ مناظرہ لکھنؤ (۱) ۱۸۹۴ء

یہ مناظرہ لکھنؤ میں شیعہ علماء سے اس وقت ہوا تھا جبکہ مولانا لکھنویؒ حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ کی خدمت میں طالب علم تھے۔ شہر میں جب اس مناظرے کے انعقاد کی خبر پھیلی تو آپ نے بھی اپنے بعض ساتھیوں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی اپنے علماء کے ساتھ

---

[1] النجم، (دورِ جدید) لکھنؤ، شوال ۱۳۵۰ھ

اس میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ چنانچہ بہ حیثیت معاون کے آپ کو بھی شرکت کی اجازت مل گئی۔ مناظرہ کا انعقاد لکھنؤ کے ایک صاحب مولوی سید محمد ہادی (سنّی) اور مولوی سیّد احمد رضا (شیعی) کی تحریک پر ہوا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک روز مولوی سید احمد رضا نے مولوی محمد ہادی سے کہا کہ ''......شیعہ سنّی میں جو اختلافات ہیں اُن میں اصل اختلاف مسئلۂ خلافت پر ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام خلیفۂ رسول بلا فصل ہیں مگر آپ لوگ ان کو چوتھے درجہ پر خلیفہ مانتے ہیں اور اپنے مطلب کے موافق نصوص صریحہ کی تاویلات رکیکہ کرتے ہیں اور عترت طاہرہ نبویہ کو چھوڑ کر دوسروں سے تمسّک کرتے ہیں، حالانکہ جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے یہ وصیت فرمادی تھی کہ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی یعنی میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑ رہا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسرے اپنے اہلِ بیت مگر اس وصیت پر عمل تو کجا آپ حضرات اہل بیت سے تمسّک اور ان کی قدر و منزلت بھی نہیں کرتے، اسی طرح ایک مرتبہ جناب رسالت پناہؐ نے فرمایا تھا کہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ یعنی جس کا میں حاکم ہوں علی بھی اس کے حاکم ہیں، مگر ان احادیث کے ہوتے ہوئے بھی آپ لوگوں نے اپنے موقف میں تبدیلی نہ کی—'' سید محمد ہادی نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ—''تاویلاتِ رکیکہ ہم نہیں کرتے بلکہ آپ حضرات کرتے ہیں۔ پہلی حدیث میں آپ عترت کو اہل بیت کے معنی میں لیتے ہیں اور پھر اہل بیت کو بھی بتاویلاتِ رکیکہ اولاد کے معنی میں لیتے ہیں جبکہ اس میں زوجہ بھی شامل ہوتی ہے۔ دوسری حدیث میں آپ نے مولیٰ کے معنیٰ حاکم کے بیان فرمائے ہیں حالانکہ مولیٰ کے معنیٰ یہاں حاکم کے نہیں ہیں بلکہ محبّ کے ہیں۔ ان دو باتوں کے علاوہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خلیفۂ برحق کی صاف اور صریح علامات بیان فرمادی ہیں تو پھر کسی اور طرف جانے کی چنداں ضرورت نہیں——'' مولوی سید احمد رضا نے پوچھا کہ وہ کون سی آیت ہے جس میں خلیفۂ موعود کی علامتیں بیان فرمائی گئی ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا[1]...... کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خلیفہ موعود کی منجملہ اور علامتوں کے ایک علامت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ اس کے عہد خلافت میں تمکین دین ہوگی اور اہل اسلام کو امن و امان ملے گا۔ لیکن مولوی سید احمد رضا نے اس آیت کو بھی جناب امیر

---

[1] سورۃ النور: ۵۵

ہی کی شان میں نازل ہونا بتلایا۔

اس ردوکد کے بعد مناظرہ کی بات طے ہوگئی اور دونوں طرف سے مناظر حضرات بھی طے ہوگئے جس میں شیعوں کی طرف سے نواب مولوی سید مہدی حسن خویش، مولوی سید حامد حسین مجتہد مناظر قرار دیئے گئے اور سنیّوں کی طرف سے مولوی عبدالحکیم صاحب مناظر مقرر ہوئے۔ مولوی عبدالحکیم صاحب نے یہ شرط پیش فرمائی کہ اگر آپ جناب امیرؓ کی خلافت بلافصل آیات قرآنیہ سے ثابت فرمادیں گے تو ہم شیعہ ہوجائیں گے اور اگر آپ ثابت نہ کرسکے تو آپ کو اقرار کرنا ہوگا کہ خلافت بلافصل آیات قرآنیہ سے ثابت نہیں ہوسکتی، اس وقت ہم کسی آیت سے حضرت صدیق اکبرؓ کے استحقاقِ خلافت کو ثابت کریں گے، اگر ہم نے ثابت کردیا تو آپ کو بھی مذہب اہل تسنن اختیار کرنا پڑیگا۔ اس شرط پر اتفاق رائے ہوگیا۔

۷/ذی قعدہ ۱۳۱۲ھ ۱۸۹۵ء بروز جمعہ سے یہ مناظرہ شروع ہوا اور ہفتہ میں ایک بار جمعہ کے دن اس کی ایک نشست ہوتی تھی، ابتداءً یہ نشست شیخ عباس علی وکیل درجہ اوّل کے مکان پر ہوئی، دوسری نشست مسجد آغائی واقع محلّہ چاہ کنکر لکھنؤ میں ہوئی اور پھر اس کے بعد سے آخر تک بارہ دری آغا حسو واقع محلّہ چاہ کنکر لکھنؤ میں ہوتی رہی۔ آخری نشست ۱۸/محرم ۱۳۱۳ھ-۱۸۹۵ء کو ہوئی اس کے بعد علماء شیعہ کی طرف سے مسلسل پہلوتہی کی وجہ سے مزید کوئی نشست نہ ہوسکی اور بالآخر اس کی کارروائی ملتوی کردینی پڑی۔

مناظرہ کی ترتیب یہ رکھی گئی کہ پہلے شیعہ حضرات جناب امیرؓ کی خلافتِ بلافصل ثابت کریں گے، اگر نوبتِ اوّل میں خلافتِ بلافصل ثابت ہوگئی تو اسی پر فیصلہ ہوجائے گا اور اہل سنّت بلاتاخیر اسے تسلیم کرلیں گے اور پھر شیعوں سے کوئی دلیل طلب نہیں کریں گے۔ اگر نوبتِ اوّل میں جناب امیرؓ کی خلافت بلافصل ثابت نہ ہوسکی تو نوبت ثانیہ میں اہلِ سنت اثباتِ حقیقت خلافت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہٗ میں کوئی آیت پیش کریں گے، اگر اس سے اہل سنّت کا مدّعا ثابت ہوگیا تو شیعہ بلاتاخیر اس کو مان لیں گے اور دوسری کوئی دلیل اہلِ سنّت سے طلب نہیں کریں گے اور اسی پر مناظرہ ختم ہوجائے گا۔

فریقین کے درمیان جہاں مختلف شرائط مناظرہ منظور ہوئی تھیں وہیں ایک شرط یہ بھی طے پائی تھی کہ اہلِ سنّت کے نزدیک کتب مناقب میں کسی روایت کے موجود ہونے سے وہ عقائد واعمال

کے معاملہ میں ہرگز لائق حجّت اور قابلِ تمسّک نہیں ہے کیونکہ کتب مناقب میں احادیث ضعیفہ و مجہولہ کا بھی بلا امتیاز ذکر کرنا شائع وذائع ہے جیسا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ نے اپنی کتاب عجالۂ نافعہ میں اس بات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ مزید برآں یہ کتاب اقوال وملفوظاتِ صوفیہ سے بھی معمور ہوتی ہیں لہٰذا ایسی تمام کتابیں عقائد کے معاملہ میں علماء اہل سنّت کے لیے لائق حجت نہیں ہیں۔ اہل سنت کی کتب حدیث میں بعض ذخائر محض ہیں جن میں بے شمار احادیث بلا امتیازِ صحت وعدمِ صحت درج ہیں لہٰذا وہ نا قابلِ تمسک ہیں لیکن صحاح اور بہت سی وہ دوسری کتابیں جن میں محدثین نے صرف صحیح روایات کو لکھنے کا اہتمام کیا ہے وہ البتہ قابلِ قبول ہوں گی۔

شیعہ مناظر نے سب سے پہلے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی خلافتِ بلافصل ثابت کرنے کے لیے آیۂ کریمہ اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَهُمْ رَاکِعُوْنَ[1] پیش کی اور یہ دعویٰ کیا کہ اس کا شانِ نزول حضرت علی مرتضیٰؓ کے حق میں ہے۔ اس آیت سے انھوں نے خلافت بلافصل ثابت ہونے کے ۳۳ شواہد ایک نشست میں پیش کیے اور پھر آئندہ نشستوں میں مزید ۲۴ شواہد پیش کیے جن کی کل تعداد ۵۷ ہوگئی، اس کے علاوہ دس شواہد اس بارے میں بھی پیش کیے گئے کہ اس آیت کا شانِ نزول حضرت علی مرتضیٰ کے ہی حق میں ہے۔

آیتِ متعلقہ کے ان سب شواہد کا رد مولوی عبدالحکیم صاحب سنّی مناظر نے مذکورہ بالا شرط کی روشنی میں کیا۔ انھوں نے بیشتر شواہد کا یہ کہہ کر رد کیا کہ یہ غیر مذکور السند ہیں اور کسی ثقہ محدّث نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔ بعض شواہد جو در منثور کے حوالہ سے پیش کیے گئے تھے ان کے بارے میں کہا گیا کہ دُرِ منثور کی روایت بلا حکم صحت مطرود و مردود ہے، ان روایات کے بعض راوی مائل بہ تشیّع ہیں۔ اس آیت کے متعلق جن روایات کو شیعہ مناظر نے اپنے مفید مطلب بیان کیا تھا ان کے سلسلہ میں یہ دلیل دی گئی کہ صاحبِ دُرّ منثور اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان مطالب کو خلافِ تحقیق کہا ہے۔ بات یہیں تک پہنچی تھی کہ شیعہ مناظر نے مزید مناظرہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس سلسلہ میں مختلف حیلہ بہانے تراشنے شروع کر دیئے۔ ایک موقع پر یہ بھی کہا

---

[1] المائدہ: ۵۵، ترجمہ: تمھارے دوست تو خدا اور اس کے پیغمبر اور مومن لوگ ہی ہیں جو نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے (خدا کے آگے) جھکتے ہیں۔

گیا کہ اب ہم بالمشافہہ مناظرہ نہیں کریں گے بلکہ تحریری مناظرہ کریں گے مگر اس پر بھی بعد میں وہ قائم نہیں رہے۔ مولانا لکھنویؒ نے جو اس وقت ایک طالب علم کی حیثیت سے شریک و معاون مناظرہ تھے اِن جمیع شواہد پر تقریباً دس فوائد اپنی طرف سے تحریر کیے اور پھر شیعہ مناظر نے جن جن کتابوں اور حوالوں کو اپنے دلائل میں پیش کیا تھا ان پر بھرپور نقد و تبصرہ لکھ کر روداد مناظرہ میں شامل کر کے شائع کر دیا اس طرح اس مناظرہ میں شیعہ مناظر حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل ثابت کرنے میں ناکام رہے اور مجبور ہو کر مناظرہ سے راہ فرار اختیار کر لی۔[1]

۲۔ مناظرہ لکھنؤ (۲) ۱۹۰۸ء

۱۹۰۴ء کے بعد سے لکھنؤ میں جو شیعہ سنّی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی اس کی تحقیقات کے لیے لیفٹیننٹ گورنر سر جان ہیوٹ نے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا تھا جو پگٹ کمیشن (Piggot Commission) کے نام سے مشہور ہوا تھا۔[2] کمیشن میں دو سنّی، دو شیعہ اور دو ہندو ممبران نامزد کیے گئے تھے۔ سنّی ممبران میں حضرت مولانا لکھنویؒ اور شیعہ علماء میں مولانا ناصر حسین مجتہد (م ۱۹۴۱ء) اس کمیشن کے رکن تھے۔

۲۷ر نومبر ۱۹۰۸ء کو کمیشن کے اجلاس میں سب سے اہم مسئلہ "مدحِ صحابہ اور چار یاری نظموں" کے پڑھنے کا اٹھایا گیا اور وہ اشعار کمیشن کے سامنے پڑھ کر سنائے گئے جن پر شیعوں کو ہمیشہ یہ اعتراض ہوا کرتا تھا کہ اِن سے ان کی دلآزاری ہوتی ہے۔ اس موقع پر مولانا لکھنویؒ نے مدحِ صحابہ اور بالخصوص خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعینؓ کی شان میں منقبت کے اشعار پڑھنے کے جواز میں کمیشن کے سامنے ایک برجستہ طویل تقریر کی تھی جس میں سلسلہ وار تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ عالم اسلام میں ہر دور میں حالات اور رواج کے مطابق تحریر و تقریر اور نظم و نثر میں صحابۂ کرام کی مدح و ثنا کی جاتی رہی ہے، چنانچہ اسی کی پیروی میں لکھنؤ کے عوام بھی اپنے اس مذہبی اور قانونی حق کو استعمال کرنا چاہتے ہیں جس پر کسی کو بُرا ماننے یا اس پر کسی قسم کی رکاوٹ و پابندی عائد کرانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ مبسوط تقریر کمیشن کے تمام اراکین بالخصوص مسٹر ٹی۔ سی پگٹ چیئرمین کمیشن کی موجودگی میں ہوئی اور سب نے بڑی توجہ کے ساتھ

---

[1] النصرۃ الغیبیۃ علی الفرقۃ الشیعیۃ، مرتبہ مولانا لکھنوی

[2] اس کمیشن کی پوری تفصیل اِسی کتاب کے بارہویں باب میں ملخصاً لکھی جا چکی ہے۔

سنی۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۰۸ء کے اجلاس میں دیگر کارروائیوں کے علاوہ مولانا ناصر حسین صاحب مجتہد سے بھی دریافت کیا گیا کہ اگر وہ کچھ کہنا چاہیں تو فرمائیں۔ موصوف نے اپنے فرقہ کی وکالت کرتے ہوئے دو باتوں کی مانگ کی:

۱۔ سنیوں کو کسی طرح بھی مدحِ صحابہ کے جلوس کی اجازت نہ دی جائے کیونکہ اس سے خلفاء ثلاثہ کی یاد تازہ ہوتی ہے جس سے ہمیں تکلیف پہنچتی ہے۔

۲۔ سنیوں کو کسی قسم کے منقبتی اشعار پڑھنے کی بھی اجازت نہ دی جائے کیونکہ اس میں خلفاء ثلاثہ کی تعریف کی جاتی ہے جو کہ ہمارے لیے بے حد دل آزار ہے۔ اپنی اس دل آزاری کے اسباب بیان کرتے ہوئے مجتہد صاحب یہ بھی کہہ گئے کہ خلفاء ثلاثہ نے ہمارے ائمہ پر بہت ظلم و ستم کیے تھے اور وہی ہمارے ائمہ کے قاتل ہیں۔

ان کی اس تقریر کے دوران ہی مولانا لکھنویؒ فوراً کھڑے ہو گئے اور انھوں نے مجتہد موصوف کو چیلنج کرتے ہوئے فرمایا۔

''مولوی ناصر حسین صاحب یہ باتیں اپنی زبان سے تو فرما رہے ہیں مگر میرے سامنے وہ کسی حدیث یا کسی تاریخی حوالہ سے ان کا ثبوت نہیں دے سکتے اور معاف کیجیے گا قرآن کریم کے سامنے تو تمام شیعہ بالکل لاجواب ہیں۔''

چیئرمین نے اس موقع پر جب انھیں احتجاج کرنے سے روکنے کی کوشش کی تو آپ نے فرمایا:

''میں جانتا ہوں کہ یہ کمیشن کسی مذہب کی حقیت یا بطلان کے فیصلے کے لیے قائم نہیں کیا گیا ہے مگر مولوی ناصر حسین کو یہ بات یا تو ہمارے سامنے کہنا نہیں چاہیے تھی اور اگر اب انھوں نے کہا ہے تو اس کو ثابت بھی کرنا چاہیے۔''

مولوی ناصر حسین صاحب بولے:

یہ ہمارا عقیدہ ہے اگرچہ ہم اس کو ثابت نہیں کر سکتے مگر ہم اپنے اس عقیدہ کو بدل بھی نہیں سکتے۔''

اس پر مولانا لکھنویؒ نے فرمایا:

''اگر ایسے عقائد کا لحاظ کیا جائے گا تو تمام عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے گا لہٰذا مجتہد صاحب کو چاہیے کہ وہ حوالوں کے ساتھ اس کو ثابت کریں۔''

مجتہد صاحب نے اس کے بعد بالکل خاموشی اختیار کر لی اور پھر کچھ نہ بولے جس کو کمیشن کے تمام ممبران نے محسوس کیا کہ مجتہد صاحب کے یہ تمام دعوے محض زبانی جمع خرچ کے طور پر تھے جن کا

وہ کوئی ثبوت نہیں دے سکتے، چنانچہ کمیشن نے اس مسئلہ کو یہیں چھوڑ کر اگلی کارروائی جاری رکھی اور مولانا لکھنوی کا اعتراض اپنی جگہ بدستور باقی رہا۔

پگٹ کمیشن ایک سرکاری کمیشن تھا اس میں مذہبی عقائد کی بحث چھیڑنا نامناسب تھا مگر مولانا ناصر حسین صاحب نے اپنے جذبات میں آکر اپنے اس بنیادی عقیدہ کا اظہار کر دیا جس کو ہمیشہ اہل علم کے سامنے مخفی رکھا جاتا ہے۔ مولانا لکھنوی کے احتجاج اور ثبوت طلبی سے عاجز آکر انھوں نے خاموشی اختیار کر لی، اور گفتگو کو آگے بڑھنے نہ دیا ورنہ اور بھی بہت سے راز ہائے سربستہ فاش ہو جاتے۔[1]

۳۔ مناظرہ لکھنؤ (۳) ۱۹۱۰ء

مولانا لکھنوی کا یہ مناظرہ لکھنؤ میں مولوی محمد سجاد لکھنوی شیعی[2] سے اس مسئلہ پر ہوا تھا کہ شیعوں کا ایمان قرآن مجید پر نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ شیعہ یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ اہلِ بیت رسولؐ میں کون لوگ شامل ہیں اور ائمہ اثنا عشر کا مذہب کیا تھا۔ اس مناظرہ میں مولوی سجاد کے معاون مولوی عبد الحسن شیعی تھے۔ یہ دونوں حضرات مولانا لکھنوی کے مذکورہ بالا دلائل کا کوئی جواب نہ دے سکے اور مناظرہ کے درمیان ہی میں گھر جا کر بیٹھ رہے۔ مناظرہ کا حکم پنڈت جگت پرشاد شاستری استاد وزیر دکن کو بنایا گیا تھا انھوں نے اپنے فیصلے میں سنّی مناظر کو کامیاب قرار دیا تھا۔ اس مناظرہ کی ساری کارروائی ''مباحثہ جدید شیعہ سنّی'' کے عنوان سے دونوں فریق کے متفقہ دستخطوں سے شائع ہوئی تھی، ان مرتبین میں ایک نواب محمد علی خاں قمر لکھنوی بھی تھے۔[3]

۴۔ پہلا سفر کھجوہ ضلع سیوان (بہار) ۱۹۱۳ء

مذکورہ بالا مقام سے شیعوں کا ایک ماہوار رسالہ ''اصلاح'' کے نام سے نکلتا تھا جو تقریباً

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۱ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ

[2] مولانا سیّد محمد سجاد لکھنوی اپنے حلقہ میں طب، منطق اور فلسفہ کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ انھیں مذہبی مناظروں سے بیحد دلچسپی تھی اور اسی کو اپنے دین کی تبلیغ خیال کرتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے بھی بہت مناظرے کیے۔ حاضر جوابی اور پھبتیاں کسنے اور تمسخرانہ اشارہ بازی میں یکتا تھے، شیعہ عوام میں 'لڈن صاحب مناظر' کے نام سے شہرت رکھتے تھے۔ آپ کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی، البتہ آپ کا انتقال جمادی الثانیہ ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں ہوا تھا۔

[3] النجم لکھنؤ، ۲۱ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ

۱۸۹۷ء سے برابر شائع ہورہا تھا اور جب ہی سے اس کا محبوب مشغلہ ردِّ اہل سنّت تھا۔ اس کے مدیر شیعوں کے قبلہ وکعبہ، حجۃ الاسلام، آیتہ اللہ، فخر الحکماء مولوی سید علی اظہر تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوسرے پرچہ ''الشمس'' جلد ۸، نمبر ۱۲ مطبوعہ ۱۹۱۳ء میں مدیر النجم مولانا لکھنوی کے بارے میں یہ چھاپ دیا کہ میں دس برس سے مدیر النجم کو زبانی مناظرہ کا اعلان دے رہا ہوں مگر وہ حیلہ حوالہ کررہے ہیں۔ اگر چہ یہ دعویٰ بالکل جھوٹ اور بے بنیاد تھا مگر پھر بھی مولانا لکھنوی نے اس کو قبول کرتے ہوئے بذریعہ النجم انھیں اطلاع دے دی کہ ہمیں آپ کی دعوتِ مناظرہ منظور ہے۔ شیعہ علماء کی یہ عام روش ہے کہ گھر میں بیٹھ کر تحریر وتقریر کے ذریعہ اہل سنت کی بڑی تردید کرتے ہیں مگر بالمشافہہ گفتگو یا مباحثہ سے گریز کرتے ہیں، اسی لیے ان کے فخر الحکماء صاحب بھی اپنے رسالہ اصلاح اور 'الشمس' میں ردّ اہل سنّت میں بڑی لاف وگزاف ہانکتے اور بڑے چیلنج دیا کرتے تھے مگر جب مدیر النجم نے ان کے چیلنج کو قبول کرلیا تو اب آنا کانی اور طرح طرح کی شرطیں لگانے لگے تاکہ کسی طرح سے مناظرہ کی نوبت نہ آنے پائے اور پھر انھیں دُور از کار شرطوں کو پورا نہ کر سکنے کو موصوف حیلہ حوالہ کے نام سے تعبیر کرنے لگے۔ اب جبکہ ان کا چیلنج قبول کرکے تاریخ مناظرہ طے کرنے کے لیے کہا گیا تو جواب میں خاموشی اختیار کرلی اور مہر بہ لب ہوگئے۔ کاش وہ اپنے بڑوں ہی سے سبق حاصل کرلیتے تو انھیں یہ شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔ ان کے امام عالی مقام مولوی حامد حسین مجتہد کے والد مفتی محمد قلی (م ۱۲۶۰ھ) نے ایک مرتبہ ہار تھک کر اہل سنت کے جلیل القدر عالم مولانا رشید الدین خاں صاحب دہلوی (م ۱۲۴۳ھ-۱۸۲۷ء) کو یہ لکھ کردے دیا تھا کہ اب وہ ان کے مقابلہ سے دستبردار ہوتے ہیں، اسی طرح حکیم سبحان علی خاں (۱۸۴۷ء) نے جو شیعوں کے رئیس المتکلمین تھے، مشہور عالم اہل سنّت مولانا حیدر علی فیض آبادی (م ۱۸۸۱ء) کو اپنی مناظرانہ تحریروں سے دستبرداری لکھ کردے دی تھی[۱] مگر انہی کا نام لینے والے ایڈیٹر اصلاح یہ جرأت بیجا دکھلا رہے تھے اور خود پردے میں بیٹھ کر اپنے صاحبزادہ مولوی علی حیدر کے نام سے ردّ اہل سنت میں مضامین لکھتے اور فرضی چیلنج دیا کرتے تھے۔ بہرکیف مدیر النجم نے مناظرہ کو قبول کرتے ہوئے ایڈیٹر اصلاح سے پوچھے جانے والے اپنے چار سوالات مرتب کرکے النجم میں شائع کردیے۔ وہ سوالات یہ تھے:

---

۱ شیعوں کے قبلہ وکعبہ ایڈیٹر اصلاح کی ہزیمت، مرتبہ مولوی عبدالحکیم صاحب، ص ۵

۱۔ آپ کو کس طریقہ سے معلوم ہوا کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور معجزات کے ذریعہ اپنی نبوت ثابت کی تھی؟

۲۔ آپ کو کس دلیل سے معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ نے جس مذہب کی تعلیم دی تھی وہ مذہب شیعہ ہی تھا؟

۳۔ آپ کو کس دلیل سے معلوم ہوا کہ جن بارہ اشخاص کو آپ مثل رسول معصوم اور مفترض الطاعۃ کہتے ہیں وہ مذہب شیعہ سے تعلّق رکھتے تھے اور انھوں نے لوگوں کو اسی مذہب کی تعلیم دی تھی؟

۴۔ آپ کو کس دلیل سے معلوم ہوا کہ اہلِ بیتِ رسول یہی آپ کے فرض کیے ہوئے بارہ اشخاص تھے؟

ان سوالات کے شائع کرنے کے بعد مولانا لکھنویؒ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ-۱۹۱۳ء کو سوان پہنچ گئے اور وہاں کے ایک معزز فرد حکیم فتح محمد صاحب کوکب کے ذریعہ ایڈیٹر اصلاح کو اس کی اطلاع بھیج دی اور لکھا کہ براہِ کرم آپ مناظرہ کے لیے سیوان آجائیں۔ کئی بار کی خط و کتابت کے بعد فخر الحکماء نے اپنے صاحبزادے مولوی علی حیدر کے نام سے اپنے عذر لکھ کر بھیجے کہ وہ سیوان آکر مناظرہ نہیں کر سکتے۔ ان کے چار عذر یہ تھے:

۱۔ اصلاح کا مدیر میں نہیں ہوں بلکہ میرے لڑکے مولوی علی حیدر ہیں۔ اگرچہ یہ بات صحیح نہ تھی مگر مدیر النجم نے ان کو جواب دیا کہ آپ اپنے صاحبزادہ ہی کو مناظرہ کے لیے بھیج دیجیے۔

۲۔ سیوان میں امن وامان کا انتظام سرکاری طور پر کرادیجیے ورنہ وہاں آنا ممکن نہیں۔ یہ انتظام بھی کردیا گیا اور ان کو لکھا گیا کہ آپ یہاں آکر یہ انتظام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

۳۔ اہل سیوان خارجی ہیں اس لیے ہم وہاں نہیں آئیں گے۔ ان کے خارجی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ لوگ آپ سے سلام کلام رکھتے ہیں اور آپ کی مہمانداری کرتے ہیں۔

۴۔ میں سیوان صرف آپ سے ملنے کے لیے آسکتا ہوں مگر مناظرہ کے لیے نہیں۔

ایڈیٹر اصلاح کے یہ اعذار اور ان کے تمام خطوط سیوان میں مجمع عام کے اندر پڑھ کر سُنا دیئے گئے جہاں شیعہ وسنّی دونوں جمع تھے، اس طرح سب کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ مدیر اصلاح مناظرہ سے فرار چاہتے ہیں۔ غرضکہ نہ تو ایڈیٹر اصلاح سیوان آئے اور نہ ہی یہ مناظرہ ہو سکا۔ اس کے بعد سیوان میں حضرت مدیر النجم کے پَے در پَے کئی وعظ ہوئے جن سے اصل حقیقت

اچھی طرح واضح ہوگئی اور وہاں کا بچہ بچہ فریق مخالف کے مکائد سے واقف اور فخر الحکماء کی جسارتِ بیجا پر انگشت بدنداں ہوگیا۔[1]

۵۔ دوسرا سفر کھجوہ ضلع سیوان ۱۹۱۶ء

حضرت مدیر النجم کے پہلے سفر سیوان اور ایڈیٹر اصلاح کی اپنے وطن سیوان میں ہزیمت کو ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ مدیر النجم کے مقابلہ میں کسی طرح سامنے نہیں آئے اور بجائے آنے کے اپنے چار اعذار لکھ کر بھیج دیئے لہٰذا مجبوراً مدیر النجم لکھنؤ واپس آگئے۔ جب ایڈیٹر اصلاح کو یقین ہوگیا کہ مدیر النجم لکھنؤ واپس چلے گئے تو انھوں نے اپنے صاحبزادہ مولوی علی حیدر کو سیوان بھیج کر مذہب اہل سنّت کے متعلق ایسے دلآزار اور توہین آمیز کلمات کہلوائے کہ توبہ بھلی۔ صرف یہی نہیں بلکہ مدیر اصلاح نے فوراً ایک جھوٹا اشتہار بھی مرتب کر کے شائع کر دیا کہ مدیر النجم مناظرہ سے فرار کر گئے۔ اس حرکت سے اہلِ سیوان کو بڑا دکھ پہنچا اور حیرت بھی ہوئی کہ ایڈیٹر اصلاح نے اپنی شکست کو الٹ کر مدیر النجم پر فرار کا الزام لگا دیا چنانچہ اس کے جواب میں وہاں کے اہلِ سنّت نے طرفین کی ساری خط و کتابت چھاپ دی۔

حسن اتفاق سے مولانا لکھنویؒ انہی دنوں ریاست ہتوہ کی انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے وہاں پہنچے تو سیوان کے حضرات نے بھی انھیں اپنے یہاں مدعو کر لیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولاناؒ سے منظوری حاصل کر کے ایڈیٹر اصلاح کو خود انہی کی دعوتِ مناظرہ یاد دلاتے ہوئے دوبارہ انھیں سیوان آکر مناظرہ کرنے کی تحریک شروع کر دی۔ مولانا ممدوح نے ایڈیٹر اصلاح کو یہ خط لکھ کر دستی روانہ کیا کہ اگر آپ اس وقت سیوان تشریف لے آئیں اور صرف اتنا ہی مسلمانوں کے سامنے ثابت کر دیں کہ مذہب شیعہ قبول کرنے کے بعد قرآن پر ایمان ممکن ہے اور پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا یقین حاصل ہوسکتا ہے تو آپ کا احسان نہ صرف مجھ پر بلکہ تمام مسلمانوں پر ہوگا کیونکہ اس وقت یہاں سیوان اور دوسرے اضلاع کے ممتاز اصحاب آپ کا انتظار کر رہے ہیں مگر اس مرتبہ بھی ایڈیٹر اصلاح نے عشرۂ محرم ہونے کا عذر کر کے آنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے خط میں انھیں عشرۂ

---

[1] حاشیہ سابق ملخصاً

محرم ختم ہونے کے بعد سیوان آنے کی پھر دعوت دی گئی تو اس کے جواب میں انھوں نے مولانا کو کھجوہ آنے پر اصرار کیا۔ جب اگلے خط میں آپ نے کھجوہ آنے کی حامی بھر لی تو اس کے جواب میں یہ اطلاع دی کہ کھجوہ کے عمائدین ایسے مناظروں کو اپنے علاقہ میں منعقد کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں اس لیے اب کھجوہ میں بھی یہ مناظرہ نہیں ہوسکتا۔ غرضکہ اسی طرح عذر و معذرت کرتے ہوئے ایڈیٹر صاحب نے کئی روز گذار دیئے اور کسی طرح براہِ راست مناظرہ کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ مجبوراً مولانا لکھنویؒ پھر وطن واپس آ گئے۔ ان کے روانہ ہوتے ہی ایڈیٹر اصلاح نے پھر حسب سابق بے خوف وخطر سیوان آ کر اعلان کرتے پھرے کہ دیکھئے میں تو سیوان آ گیا اور مدیر النجم چلے گئے، اس کے علاوہ اور بہت لاف وگزاف ہانکتے رہے۔ سیوان کے لوگوں کو خیال ہوا کہ ایڈیٹر موصوف پھر اپنی فرضی کامیابی اور حضرت لکھنویؒ کے ''فرار'' کو اشتہار کی شکل میں لکھ کر دوبارہ چھاپیں گے اس لیے انھوں نے ان کی ساری خط وکتابت اور عذر و معذرت کی تحریریں ترتیب وار مرتب کر کے شائع کر دیں اور اس کا نام ''فتح مبین براعدائے اصحاب ختم المرسلینؐ'' رکھا۔ اس متوقع مناظرہ کے سلسلہ میں مولانا کو کئی بار سیوان جانا پڑا اور کئی کئی روز وہاں رہنا پڑا۔ اس لیے وہاں مختلف مقامات پر آپؒ کے مواعظ بھی ہوئے جن سے مسلمانوں میں مذہبِ متعلقہ کے بارے میں اس قدر واقفیت پیدا ہوگئی کہ وہ لوگ مجتہدین شیعہ سے خود ہی مناظرہ کرنے کے لائق ہو گئے۔

سیوان میں جن حضرات نے ان تمام کارروائیوں میں بھرپور تعاون کیا تھا ان میں مولانا جمیل احمد سیوانیؒ، مولانا عبدالہادی پھلوارویؒ، مولانا ابوسعید جھکاویؒ، حکیم محمد احسن سیوانیؒ، حکیم فتح محمد کوکبؒ، مولوی ابوالخیرات نقشبندی مجددیؒ، قاضی امیر احسن سیوانیؒ اور مولانا خلیل احمد حسن پوریؒ کے نام ریکارڈ میں ملتے ہیں۔[1]

۶۔ مناظرہ بمبئی ۱۹۱۶ء

یہ مناظرہ ۲۸/ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ-۱۹۱۶ء سے محرم ۱۳۳۶ھ-۱۹۱۷ء تک ہوا تھا۔ بمبئی شہر اس وقت تک شیعہ سنی اختلافات کی شورشوں سے بچا ہوا تھا اور یہاں کسی قسم کا تناؤ نہیں تھا مگر بُرا

۱؎ فتح مبین براعدائے اصحاب ختم المرسلین، مرتبہ مولوی ابوالخیرات نقشبندیؒ

ہو تعصب اور فرقہ پرستی کا کہ یہاں بھی دوسرے شہروں سے فریق مخالف کے مبلغین آئے اور اپنے جوشِ تبلیغ میں انھوں نے سنیّوں کو بہکانا اور گمراہ کرنا شروع کر دیا۔ انہی مبلغین میں ملا محمد باقر فیض آبادی[1] مقیم بمبئی بھی تھے جو اپنی تقریروں میں اہلِ سنّت پر سخت تنقیدیں اور اکابر اہلِ سنّت کی سخت توہین کیا کرتے تھے اور جب کوئی ناواقف سنی ان کو مل جاتا تو اس کو گمراہ کرنے کی پوری سعی کرتے، ان کی اس روش سے خود ان کے لوگوں میں بھی مذہبی جوش بہت بڑھ گیا تھا اور وہ لوگ بھی ہر اس سنّی سے جو ان کے رابطے میں آجاتا تھا مذہبی بحث شروع کر دیتے تھے۔ اس طرح ملا صاحب کی تحریروں اور اشتعال انگیز تقریروں سے سنّیوں میں بھی بیداری پیدا ہوئی جس کے نتیجہ میں مہدی خاں ولد پیر خاں زردوز لکھنوی (سنّی) مقیم بمبئی اور شیخ احمد ولد سلطان کربلائی (شیعہ) مقیم بمبئی کے درمیان ایک مناظرہ کرانے کی بات طے ہوئی تاکہ حقیقت حال سب پر واضح ہو جائے چنانچہ ان دونوں افراد کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہو گیا اور پھر اس کے بعد مناظر علماء کی تلاش شروع ہو گئی۔ علماء اہلِ سنّت میں مولانا لکھنویؒ، مولانا حافظ عبدالسمیع بنارسیؒ اور ایک کانپوری عالم دین تھے جن کا نام معلوم نہیں ہو سکا مناظرہ کے لیے بمبئی بلائے گئے، ان حضرات میں اصل مناظر مولانا لکھنویؒ ہی تھے۔ مخالفین اہل سنت کی طرف سے پہلے تو مولوی محمد سجاد لکھنوی کا نام بڑے زور و شور سے پیش کیا گیا مگر موصوف بمبئی تو آئے لیکن مناظر گاہ میں نہیں آئے، یہ مولوی سجاد وہی تھے جن سے ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ میں مولانا کا مناظرہ ہو چکا تھا اور ان کو شکست فاش ہو چکی

---

[1] ملا محمد باقر بن فتح محمد دلال اصلاً راجپوت تھے اور جلال پور ضلع فیض آباد (حال ضلع امبیڈکر نگر) یوپی کے رہنے والے تھے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ میں سے کسی نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا تھا، کچھ دنوں سے انھوں نے اپنی رہائش مستقلاً ممبئی میں اختیار کر لی تھی اور وہیں تعلیم بھی مکمل کی۔ ۱۹۰۱ء میں آپ شیعہ خوجوں کے مدرسہ میں مدرس ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں حاجی دیوجی جمال کے وقفی مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ مذہبی مناظروں سے بڑی دلچسپی تھی، آپ عیسائیوں اور سنّیوں سے بہت مناظرے کیا کرتے تھے۔ ممبئی کے شیعوں میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ شیعہ مدیرانِ جرائد ان کو "جناب مستطاب" "معلی الالقاب فاضل اجل واکمل واعظ بے بدل اور ماہر ذوالمناقب والمفاخر حاجی مولوی شیخ محمد باقر جیسے القاب سے نوازتے تھے، کمزور اور ناواقف سنّیوں کو بحث کے ذریعے بہت گمراہ کرتے تھے، آپ کی تصانیف میں رسالہ نجات الدارین، عزائے امام حسین، رسالہ شعلۂ نور بجواب مسائل شولاپور، رسالہ خزانۃ التحقیق اور رسالہ فدک طبع ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ رسالہ خیر الکلام اور رسالہ نفاق الثلاثہ بھی آپ کی طرف منسوب ہے۔ ۱۹۳۱ء تک زندہ تھے، اس کے بعد کا حال اور سنہ وفات نہیں معلوم ہو سکا۔

(تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء، مرتبہ مولوی سیّد محمد حسین نوگانوی، ص ۹۱-۹۳)

تھی اس لیے اب دوبارہ وہ پھر کیسے سامنا کر سکتے تھے اس لیے مجبوراً ان کی جگہ پر ملا محمد باقر فیض آبادی کا نام پیش کیا گیا جنھیں ان کے ہم مذہب ''افضل المناظرین اور عمدۃ الافاضل'' جیسے القاب سے یاد کرتے تھے۔

مناظرہ کا بنیادی مسئلہ اہل سنت کی طرف سے خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت کو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں برحق ثابت کرنا تھا اور فریق مخالف کی طرف سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلافصل اور ان کی امامت کے برحق ہونے کا ثبوت دینا تھا۔ چنانچہ ۲۸/ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۶ء کو بمقام چھاچھ محلہ برمکان جناب بدرالدین عبداللہ قور بمبئی یہ مناظرہ شروع ہوا اور فریقین کے مجوزہ صدر جلسہ جناب محمد حسن مقبہ جے، پی رئیس اعظم بمبئی مقرر ہوئے۔

مناظرہ شروع ہونے کے بعد پہلی تقریر ملا محمد باقر صاحب کی ہوئی اور دوسری تقریر مولانا لکھنویؒ کی ہوئی جس میں آپ نے فرمایا:

''صدر جلسہ کے ارشاد کے مطابق میں اس وقت صرف مسئلہ خلافت کے متعلق عرض کروں گا، مجھ سے کہا گیا ہے کہ خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت از روئے قرآن واحادیث صحیحہ ثابت کروں لہٰذا معلوم ہونا چاہیے کہ حدیث معصوم یا حدیثِ رسول کا درجہ قرآنِ کریم سے کم ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں وہ راویوں کے ذریعہ پہنچی ہیں اور وہ باعتبار تعدادِ رُواۃ دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک متواتر اور دوسری آحاد، متواتر قطعی مانی گئی ہے مگر ہمارے محدثین کی تصریح موجود ہے کہ کوئی حدیث لفظاً متواتر نہیں ہوتی۔ بعض محدثین نے جن احادیث کو متواتر لکھا ہے وہ بھی محققین کے جانچنے کے بعد متواتر ثابت نہیں ہوئیں۔ اخبار آحاد کے متعلق فریقین کے علماء کی تصریح ہے کہ اخبار آحاد قطعی نہیں بلکہ ظنی ہوتی ہیں، اس میں سب سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ مخصوص حدیث صحیح ہے یا نہیں، جب اس کی صحت ثابت ہو جائے جو کہ آسان کام نہیں ہے تو پھر یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ حدیث لائق عمل بھی ہے کہ نہیں کیونکہ باتفاق فریقین ہر صحیح حدیث جائز العمل بھی نہیں ہوتی۔ میں اپنی اس بات کا ثبوت مولوی حامد حسین مجتہد کی کتاب استقصاء الافہام سے دے سکتا ہوں۔ (چنانچہ اس بات کی ملا محمد باقر صاحب نے بھی توثیق کی تھی)''

تقریر کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''اس طرح حدیث کا رتبہ ظنی ہونے کی وجہ سے کم ہو گیا لہٰذا کسی بات کو قرآن کی روشنی میں قطعی اور یقینی ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ اخبار احاد کو نہ ملایا جائے اور

اگر آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ کوئی اور چیز ملانا ضروری ہی ہو تو وہ قوتِ ثبوت میں قرآن کے قوتِ ثبوت سے کم نہ ہو۔ اس طرح اس کا نتیجہ آیاتِ قرآنیہ کا نتیجہ سمجھا جائے گا اور وہ قطعی ہوگا۔ ورنہ اگر آحاد کو ملا کر کوئی نتیجہ نکالا جائے گا تو وہ آیاتِ قرآنیہ کا نتیجہ نہ ہوگا اور نہ ہی وہ قطعی ہوگا کیونکہ قطعی اور ظنی سے مل کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ظنی ہی ہوتا ہے۔''

''اس تمہید کے بعد میں عرض کرتا ہوں کہ حضرات خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت قرآن سے ثابت ہے اور اس کے ثابت کرنے کے لیے ہم کو اخبار احاد کا ضمیمہ بنانے کی حاجت نہیں ہے۔ اگر ہم قرآن کے ساتھ کوئی ایسی چیز ملائیں گے تو وہ ایسی قطعی اور یقینی ہوگی جیسے مکّہ اور بغداد کا وجود۔ میں حضرات خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت کے برحق ہونے کا استدلال قرآن سے کروں گا۔ یہ استدلال دو قسم کا ہوگا، اوّل استدلال کلّی اور دوسرا استدلال جزئی۔ اسدلال کلّی سے مراد یہ ہے کہ کسی ایک آیت سے استدلال نہ کرکے پورے قرآن مجید سے استدلال کروں گا۔ استدلال جزئی سے مراد یہ ہے کہ کچھ خاص خاص آیات سے استدلال کیا جائے گا۔

استدلال کلّی یہ ہے کہ اگر خلفاء ثلاثہ کی خلافت کو برحق نہ مانا جائے اور اُن کے رفقاء کو معاذ اللہ دین کا دشمن مان لیا جائے تو کوئی خاص آیت ہی نہیں بلکہ پورا قرآن ہاتھ سے جاتا رہے گا، اس کے دو اسباب ہیں، اوّل یہ کہ یہ قرآن جو آج کل ہمارے ہاتھوں میں ہے حضرات خلفاء ثلاثہ کا جمع کیا ہوا ہے اور انہی کا رائج کیا ہوا ہے لہٰذا جب کسی کتاب کا جامع قابلِ اعتبار نہ ہو تو وہ خود کتاب کیسے قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔ دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فوراً ہی حضرات خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت قائم ہوئی اور وہ ۲۳ برس تک ہر سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے اور جو کچھ انھوں نے چاہا کیا۔ بقول شیعہ انھوں نے اتنے بڑے بڑے کام کیے جو بظاہر اگر محال نہ سہی تو مشکل ضرور تھے۔ مثلاً بقول شیعہ انھوں نے حضرت علی مرتضیٰؓ جیسے اشجع الاشجعین سے ان کی خلافت چھین لی جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر ہزار کے مجمع میں ان کو اپنا خلیفہ بنا دیا تھا مگر انھوں نے اتنے بڑے جمع غفیر کو اپنا موافق بنا لیا حالانکہ اتنے بڑے مجمع کا متفق علی الکذب ہونا عقل سلیم محال سمجھتی ہے اسی طرح خلفاء ثلاثہؓ کے اور بہت سے دوسرے کارنامے بھی کتب شیعہ میں مذکور ہیں لہٰذا ان حضرات کے لیے قرآن میں تحریف کر دینا کیا مشکل کام تھا[1]۔''

اس کے بعد آپ نے کتبِ معتبرۂ شیعہ سے بطور استدلال کلّی کے قرآن مجید کے کم ہونے، زیادہ کر دیئے جانے اور الفاظ وحروف کے تغیر وتبدل کی روایات مناظرہ میں پیش کیں۔

[1] مناظرہ بمبئی موسوم بہ اسم تاریخی۔ ردمذہب شیعہ (۱۳۳۶ھ)، حصہ اوّل، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۰-۲۲

استدلال جزئی کے طور پر آپ کو قرآن مجید کی چودہ پندرہ آیتوں میں سے صرف ایک ہی آیت وعداللہ الذین آمنو منکم...... فاولئک ھم الفاسقون[1]۔ کو مناظرہ میں پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس آیت کے سلسلہ میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''ہمارا استدلال اس آیت سے صرف تین چیزوں کے جاننے پر موقوف ہے، اوّل اس آیت میں وعدہ کس چیز کا ہے، دوم یہ وعدہ کس سے ہے اور سوم اس آیت کی موعودہ نعمتیں کس کو ملیں۔ قرآن مجید کی اس یت میں مومنین صالحین کو تین نعمتوں کے عطا کیے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے اور وہ تین نعمتیں یہ ہیں (الف) انھیں استخلاف فی الارض یعنی خلافتِ ارضی دی جائے گی (ب) ان کے ذریعہ تمکین دین یعنی دین کو غلبہ وقوت ملے گی اور (ج) ان سے ڈر وخوف کو دور کیا جائے گا یعنی دشمنوں کی طرف سے امن وامان حاصل ہوگا۔ اس آیت کے مخاطب اس وقت کے مومنین صالحین تھے جو نزولِ آیت کے وقت دولتِ ایمان سے سرفراز ہو چکے تھے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفاء ثلاثہؓ برسر اقتدار ہوئے، ان کے دَور میں تمکین دین، اس کی نشو ونما اور تبلیغ نہایت عظیم پیمانہ پر ہوئی اور انھیں تبدیل خوف کی نعمت بھی بدرجۂ اتم حاصل ہوئی۔ تمام ملک حجاز اور قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کی باگ ڈور انہی کے دور میں حاصل ہوئی جس پر تاریخ اسلام گواہ اور شاہد ہے، اس لیے اگر یہ تینوں خلافتیں اس آیت کی مصداق نہ مانی جائیں تو یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ معاذ اللہ وعدۂ الٰہی پورا نہیں ہوا جبکہ یہ بات ناممکن اور محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا نہ ہو۔''

اس کے بعد ایک شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے ایک خاص بات آپ نے یہ فرمائی:

''اگر کوئی صاحب یہ شبہ کریں کہ آیاتِ قرآنیہ سے خلافت کا ثبوت اگر ہوسکتا ہوتا تو یہ آیتیں سقیفۂ بنی ساعدہ میں بوقتِ انعقادِ خلافتِ صدیقیہ کیوں نہ پیش کی گئیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیتوں کی دلالت ہر سہ خلافت کی حقیت پر بالکل ایسی ہی ہے جیسے حدیثِ رایت کی دلالت حضرت علی مرتضیٰؓ کے محب ومحبوبِ خدا ورسول ہونے پر کی جاتی ہے۔ حدیث رایت میں یہ تذکرہ ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر میں ایک موقع پر فرمایا کہ میں کل ایک ایسے شخص کو

---

[1] سورۂ نور: ۵۵، ترجمہ: جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا کہ ان سے پہلے کے لوگوں کو بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے ان کے لیے پسند کیا ہے، مستحکم وپائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں۔

جھنڈا دوں گا جو خدا اور رسول کا محبّ اور محبوب ہوگا۔ حضرت علیؓ کو یہ جھنڈا عنایت کیے جانے سے قبل اس حدیث میں ان کے محبّ ومحبوب ہونے پر مطلق دلالت نہ تھی لیکن جھنڈا ملنے کے بعد روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ وہ محبّ ومحبوب خدا ورسول ہیں، اسی طرح یہاں مذکورہ بالا آیت کی موعودہ تینوں نعمتوں کے ملنے سے پہلے کسی خاص شخص کی خلافت پر اس میں دلالت ممکن نہ تھی مگر ان تینوں نعمتوں کے ملنے کے بعد یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس آیت کی موعودہ خلافتیں یہی ہیں اور یہ لوگ مومنِ صالح ہیں اور ان کا دین پسندیدۂ خدا ہے اور ان کی خلافت کو نہ ماننا ومن کفر بعد ذٰلک...... الآیۃ کا مصداق بنتا ہے۔"

ملّا باقر صاحب نے اپنی تقریروں میں سوائے طول وطویل باتیں کرنے اور موضوع مناظرہ سے غیر متعلق مسائل پر بولنے کے اور کچھ نہ کیا، صدر جلسہ نے ان سے کہا بھی کہ آپ اس وقت مسئلہ متعلقہ پر تفصیل سے بحث کریں تو انھوں نے کہا کہ...... میں حضور صدر صاحب دام اقبالہٗ و مدا جلالہ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ حضور میں اس کے لیے ابھی تیار نہیں ہوں اور اس وقت میرے پاس کوئی کتاب بھی نہیں ہے...... صدر صاحب نے فرمایا...... آپ کو تیار ہوکر آنا چاہیے تھا، تیار نہ ہونے کی کیا وجہ ہے جبکہ مہینوں پہلے سے مناظرہ کی بات چیت چل رہی تھی، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ جو کچھ جواب دے سکتے ہوں ضرور جواب دیں۔ اس پر ملا باقر صاحب نے کہا۔ حضور میں بالکل تیار نہیں ہوں...... حکیم سراج الدین صاحب نے کہا کہ ایک ہی حدیث پیش کر دیجیے، ایک تو یاد ہوگی۔ ملا باقر نے جواب دیا...... میں گذارش کرتا ہوں کہ میں بھی ایک مذہب کا تابع ہوں...... جو کچھ اس مذہب میں معین اور مقرر ہو چکا ہے اس کی پابندی میرے لیے ضروری ہے، یعنی بالفاظِ دیگر میں تقیہ سے باہر نہیں جا سکتا وغیرہ وغیرہ۔ صدر جلسہ نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ بہتر ہے کہ آپ اصل جواب کے متعلق کچھ فرمائیں۔ ملاّ صاحب نے کہا۔ حضور عالی دام اقبالہ! میں اس وقت بالکل تیار نہیں ہوں، کوئی موقع ہوا تو جناب مولانا صاحب قبلہ (یعنی حضرت لکھنویؒ) کی خدمت میں بوقت فرصت حاضر ہوکر زبانی عرض کروں گا۔

اس طرح ملا صاحب نے دفع الوقتی اور بے موقع وبے محل گفتگو میں اپنا سارا وقت گذارا۔ نہ تو مولانا لکھنویؒ کے کسی بیان کی تردید کی اور نہ ہی حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت بلا فصل کو ثابت کرنے میں ایک بات بھی زبان سے نکالی۔ مجبوراً صدر جلسہ نے اعلان کیا کہ اب تقریریں کافی

ہوچکی ہیں اور وقت بھی ختم ہوچکا ہے اس لیے جلسہ برخاست کیا جاتا ہے چنانچہ مناظرہ کی کارروائی ختم ہوگئی۔

اس مناظرہ میں مہاراشٹر، گجرات اور دوسرے مقامات کے تقریباً ۳۵ علماء و معزز حضرات موجود تھے۔صدر جلسہ جناب منشی محمد حسن صاحب مقبہ جے، پی نے اپنا فیصلہ سنانے کے لیے دو ہفتہ کی مہلت مانگی مگر انھوں نے تین ہفتہ کے بعد اپنا فیصلہ تحریری شکل میں پیش کیا جو بہت مفصل و مطول تھا۔اس تحریری فیصلہ کے صرف چند جملے یہاں پیش کیے جارہے ہیں جو خاص طور سے اس مناظرہ کے نتیجہ سے متعلق ہیں:

> ''مولوی محمد عبدالشکور صاحب نے آیت قرآن سے مسئلہ خلافت بخوبی ثابت کیا...... آپ نے حدیث رایت کی مثال خوب پیش کی اور حقیت خلافت کا خوب ثبوت دیا۔ ملا باقر نے عذر و معذرت میں بہت وقت صرف کیا مسئلہ خلافت پر کوئی بحث نہ کی اور طویل تقریریں کیں جن میں الفاظ بہت اور مطلب کم تھا''[1]

اس طرح ملا باقر کی شکست سے پوری علمی دنیا میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ حضرات خلفاء ثلاثہؓ کا مومنِ کامل ہونا اور ان کی خلافت کا موجبِ خوشنودیٔ خدا و رسول ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے اور حضرت علی مرتضیٰؓ کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلافصل قرآن و حدیث کی روشنی میں کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوسکتی۔

۷۔ مناظرہ چکوال ضلع جہلم (پنجاب) ۱۹۱۸ء

اس مناظرہ کا سبب یہ ہوا کہ ۲۵ رجنوری ۱۹۱۸ء کو چکوال ہی میں ایک شیعہ سنّی مناظرہ ہوچکا تھا جس میں شیعوں کو نمایاں شکست ہوئی تھی۔اس مناظرہ میں اہل سنّت کی طرف سے جناب مولانا قاضی کرم الدین دبیر صاحب ساکن بھیں چکوال ضلع جہلم مناظر تھے اور شیعوں کی طرف سے مولوی سیّد احمد شاہ مناظر تھے۔اس شکست نے پوری شیعی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا، اسی لیے انھوں نے اپنی اس خفّت کو مٹانے کی کوشش میں سنّیوں کو ایک دوسرے مناظرہ کا چیلنج دے دیا چنانچہ مقامی علماء اہل سنّت نے اسے بھی قبول کر کے انھیں اطلاع دے دی۔

مقامی حضرات نے بڑے اصرار کے ساتھ مولانا لکھنویؒ کو اہل سنت کی طرف سے مناظرہ

---

[1] مناظرہ بمبئی موسوم بہ اسم تاریخی ردمذہب شیعہ (۱۳۳۶ھ)، حصہ اوّل، دوسرا ایڈیشن، ص ۴۲

کرنے کی دعوت دی لہٰذا آپ نے اپنی تمام مصروفیات مؤخر کر کے ۲۵/ مارچ ۱۹۱۸ء کو چکوال پہنچنے کی اطلاع بھیج دی۔ شیعوں نے ہندوستان کے ان تمام شہروں میں اپنے آدمی دوڑائے جہاں سے انھیں اپنے علماء کے ملنے کی امید تھی مگر اس میں انھیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور مولاناؒ سے مناظرہ کرنے کی خبر سن کر ان کا کوئی آدمی اور عالم چکوال آنے کی ہمت نہ کرتا تھا۔ لے دے کر وہی مناظر مولوی محمد سجّاد صاحب (م ۱۹۵۵ء) لکھنؤ میں اُن کے ہاتھ لگے جن کو مجتہدین لکھنؤ نے بڑی مشکل سے آمادہ کر کے بھیجا تھا۔ یہ صاحب بھی مولاناؒ کے مقابلہ میں دوبار ذلّت کے ساتھ شکست کھا چکے تھے۔ چنانچہ پہلی بار مناظرۂ لکھنؤ منعقدہ ۱۹۱۰ء میں شکست کھائی اور پھر دوسری بار مناظرۂ بمبئی منعقدہ ۱۹۱۶ء میں بھی پہنچے مگر مولاناؒ کو دیکھ کر مجلس مناظرہ میں آنے کی ہمت نہ کر سکے اور لکھنؤ واپس لوٹ گئے۔ ایک بار نان پارہ ضلع بہرائچ میں بھی انھوں نے دروغ گوئی کا مذہبی فریضہ انجام دیا تھا جس میں انھیں بڑی رسوائی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ یہ صاحب کم علمی کے علاوہ اپنی وضع اور صورت کے لحاظ سے بھی نرالے تھے یعنی داڑھی صاف اور مونچھیں نمایاں تھیں۔ اس مناظرہ میں شیعوں کی طرف سے یہی مولوی سجّاد مناظر تھے اور ان کی معاونت کے لیے مولوی مرزا احمد علی امرتسری بھی وہاں موجود تھے۔

بہر حال چکوال میں بمقام پڑاؤ یہ مناظرہ شروع ہوا، حاضرین کی تعداد چھ سات ہزار کے درمیان تھی۔ حضرت لکھنویؒ کے زبردست دلائل نے شیعہ مناظر کو عاجز ومبہوت کر دیا اور وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکے۔ موضوع مناظرہ جو فریقین کی دستخطی تحریر کے مطابق طے ہوا تھا وہ یہ تھا کہ پہلے شیعہ حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل اور اپنے ائمہ کی امامت کو ثابت کریں گے، اہل سنت مناظر کے ذمّہ حضرات خلفاء ثلاثہؓ کے مومن صالح اور خلیفہ راشد ہونے کا ثبوت دینا تھا مگر مجلس مناظرہ میں شیعہ مناظر نے پہلے سنّی مناظر سے اپنے موضوع پر دلائل پیش کرنے پر اصرار کیا، خطرہ اس بات کا تھا کہ اگر ان کی یہ بات نہ مانی جائے گی تو وہ مناظرہ چھوڑ کر بھاگ لیں گے لہٰذا ان کے اس اصرار کو قبول کرتے ہوئے کہا گیا کہ اچھا اگر آپ حضرات یہی چاہتے ہیں اور حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل ثابت نہیں کر سکتے تو ہم حضرات خلفاء ثلاثہؓ کی حقیت خلافت ثابت کرتے ہیں اور یہ کہہ کر مولانا لکھنویؒ نے قرآن مجید کی آیت استخلاف پیش کر دی جس کو اس سے پہلے بھی آپ کئی مناظروں میں پیش کر چکے تھے۔ وہ آیت یہ ہے وعد الله الذين اٰمنوا

منکم وعملو الصالحات...... هم الفاسقون. اس آیت سے تینوں خلفاء کا مومن صالح اور خلیفہ برحق ہونا ایسے قطعی اور واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ جو شخص بھی قرآن مجید پر ایمان رکھتا ہے اس کو بغیر اس کے ماننے کوئی چارہ نہیں ہے، اس کے بعد آپ نے فرمایا:

''اس استدلال کا سمجھنا صرف تین باتوں پر موقوف ہے (۱) خدا کا یہ وعدہ صرف ان مومنین صالحین سے ہے جو اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ اس کی دلیل لفظ منکم ضمیر حاضر کی ہے لہٰذا بعد کا کوئی شخص اس آیت کا مصداق قرار نہیں پا سکتا، اگر ایسا کیا جائے گا تو آیت کا اصل منشا پورا نہیں ہو سکتا۔

(۲) اس آیت میں تین نعمتوں کا وعدہ ہے (الف) استخلاف فی الارض (ب) تمکین دین اور (ج) تبدیل خوف۔ لہٰذا نزول آیت کے زمانہ میں مومنین صالحین میں سے جن کو یہ تینوں نعمتیں ملی ہیں وہی اس آیت کے مصداق ہو سکتے ہیں جن کو صرف ایک نعمت یا دو نعمتیں ملی ہوں انھیں اس آیت کا مصداق قرار دینے سے وعدۂ الٰہی پورا نہیں ہو سکتا۔

(۳) زمانۂ نزول آیت کے لوگوں میں سے ان تینوں نعمتوں کا مجموعہ صرف حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو ہی ملا ہے جو واقعات قطعیہ مسلّمہ فریقین سے ثابت ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ یہ تینوں حضرات مومن صالح تھے اور ان کی خلافت اس آیت کی موعودہ خلافت تھی۔ اگر کوئی شخص ان حضرات کو مومن صالح نہ مانے تو اسے اس آیت کی تکذیب کرنی پڑے گی اور کہنا پڑے گا کہ خدا نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا لہٰذا خلفائے راشدین کے علاوہ اور کوئی اس آیت کا مصداق نہیں ہو سکتا اور ان میں سے بھی صرف تین خلفاء (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ) کو ہی ان تینوں نعمتوں کا مجموعہ ملا تھا۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کے متعلق فریقین کا اتفاق ہے کہ ان کو ان تینوں نعمتوں کا مجموعہ نہیں ملا، اہل سنّت کے نزدیک ان کو صرف دو نعمتیں ملی تھیں یعنی استخلاف فی الارض اور تمکین دین لیکن تبدیل خوف کی نعمت انھیں حاصل نہیں ہو سکی تھی بلکہ شیعوں کے نزدیک تو انھیں صرف ایک نعمت خلافت ہی ملی تھی اور وہ بھی برائے نام تھی۔''

یہ تمام دلائل مولانا نے کتب شیعہ معتبرہ اور اپنی مستند کتابوں سے دیئے تھے۔ دوران تقریر میں آپ نے یہ چیلنج کیا تھا کہ اگر فریق مخالف اس آیت کا مصداق حضرات خلفاء ثلاثہؓ کے علاوہ کسی اور کو ثابت کر دے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ابھی اس کی جماعت میں شامل ہونے کو تیار ہوں۔ اس آیت استخلاف کے علاوہ آپ نے مناظرہ میں قرآن مجید کی دوسری آیتیں بھی پیش کی تھیں جن میں آیۂ دعوتِ اعراب، آیۂ معیت، آیۂ قتالِ مرتدین، آیاتِ فضائل مہاجرین

اور آیاتِ علاماتِ نفاق وغیرہ بھی تھیں جن کی تفصیلات ہم تصنیفات کے باب میں دیں گے۔

ان تمام دلائل کا کوئی معقول جواب شیعہ مناظر نے نہیں دیا اور وہ صرف لفاظی، مغالطہ، الجھاؤ اور محض اعتراض برائے اعتراض کرنے ہی میں وقت گذارتے رہے۔ ان کی ان بے تکی باتوں کا جواب بھی اُسی وقت مدلل طور پر دے دیا گیا تھا جس کے بعد مخالف کیمپ میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ محض دفع الوقتی اور مناظرہ کو طول دینے کی نیت سے شیعہ مناظر نے متعینہ موضوعات سے ہٹ کر قضیہ فدک، واقعۂ قرطاس، بحثِ فرارِ غزوات اور دوسرے دُوراز کار مطاعن صحابہؓ وغیرہ پر دھواں دھار تقریریں شروع کر دیں جن کا رد بھی اسی وقت مجلس مناظرہ میں کر دیا گیا۔ شیعوں کی ان خلافِ موضوع بحثوں کے بعد بطور ردِّ عمل اہل سنّت کی طرف سے بھی کچھ نئے مباحث جواباً اٹھائے گئے جن میں مسئلہ بدا، تقیہ، نکاح حضرت ام کلثوم بنت علی مرتضیٰؓ، فاروق اعظمؓ اور متعہ وغیرہ شامل تھے مگر ان کی تردید میں شیعہ مناظر کوئی بھی مؤثر دلیل نہ دے سکے بلکہ قدم قدم پر علمی ٹھوکریں کھاتے اور عربی عبارتوں کو غلط اعراب کے ساتھ پڑھتے رہے حتی کہ قرآن مجید کی آیات بھی صحیح تلاوت نہیں کر پاتے تھے۔ اکثر غلط حوالوں کے ساتھ عبارتوں میں کتر بیونت کر کے اپنے مفید مطلب حصے پیش کر دیتے اور جب پوری عبارت پڑھنے کا مطالبہ کیا جاتا تو اس کو ٹالنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس مناظرہ سے جو علمی نتائج برآمد ہوئے وہ حسبِ ذیل تھے:

۱۔ حسب اتفاق فریقین حضرت علی مرتضیٰ اور دیگر ائمہ کی امامت کا ثبوت مخالفین اہل سنت کے ذمّہ تھا مگر انھوں نے باوجود اصرار کے آخر تک ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالا۔

۲۔ اہل سنّت کی طرف سے حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے مومن کامل اور خلیفۂ برحق ہونے کا ثبوت آیات قرآنیہ، مستند کتب مثلاً نہج البلاغہ، اصول کافی اور الاحتجاج وغیرہ سے دیا گیا اور ثابت کیا گیا کہ اگر ان حضرات ممدوحین کے مومن کامل اور خلیفہ برحق ہونے سے انکار کیا جاتا ہے تو ان آیات کے سچّے ہونے کی کوئی صورت نہیں ہوگی مگر پھر بھی شیعوں نے ان حوالوں کی بابت کوئی حرف زبان سے نہ نکالا۔

۳۔ فریق مخالف نے سوائے خارج از بحث باتوں اور فضول گویوں کے کوئی معقول جواب نہ دیا۔

۴۔ شیعہ مولوی نے پے در پے مطالبہ کے باوجود حضرت علی مرتضیٰؓ کے ایمان کا ثبوت اپنے مذہب کے مطابق نہ دیا۔

اس طرح تمام حاضرین جلسہ حتی کہ غیر مسلم اصحاب نے بھی اہل سنت کی فتح عظیم اور فریق مخالف کی شکست فاش اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ بہت سے حق پسند اور صاحبِ علم غیر مسلم حضرات بھی اس مباحثہ میں شروع سے آخر تک موجود تھے اور ان میں سے ایک صاحب تو آخر وقت میں اس اجتماع کے میر مجلس بھی رہے تھے جنھوں نے اپنے تاثرات پر مبنی ایک دستخطی تحریر بھی اہل سنّت کے حوالہ کی تھی جو یہ تھی:

"کل کی بحث سے ہم لوگ جو نتیجہ نکال سکے ہیں وہ یہ ہے کہ اہل سنّت کے مولوی صاحب کمال درجہ کے عالم اور فاضل ہیں اور شیعہ مولوی صاحب علمیت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ عربی الفاظ غلط بول کر اور دوسری جانب سے ٹوکے جانے پر خود اپنی غلطی کو تسلیم کر لیتے تھے البتہ یہ ضرور ہے کہ شیعہ مولوی صاحب کی تقریر بہت تیز وطرار ہوتی تھی۔ ہم نے کل کی بحث میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات نوٹ کی کہ (مجلس مناظرہ میں) اہل سنّت کی تعداد شیعوں سے سہ گنا زیادہ تھی مگر اہل سنّت کے کسی شخص کو ہم نے حقہ یا سگریٹ پیتے نہیں دیکھا مگر شیعوں کی جماعت میں کچھ آدمی برابر سگریٹ نوشی کرتے رہے خصوصاً مولوی سجّاد صاحب کے دوسرے ساتھی مولوی (مرزا احمد علی امرتسری) جو کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے برابر سگریٹ نوش کرتے رہے۔

(دستخط) لالہ گوردت مل بی۔اے، ایل۔ ایل۔ بی وکیل۔ بھائی ستھا سنگھ وکیل اور لالہ جوالا پرشاد ساہوکار چکوال[1]"

۸۔ مناظرۂ مکیریان ضلع ہوشیار پور (پنجاب) ۱۹۲۰ء

ایک زمانہ میں اودھ کی طرح پنجاب بھی شیعی علماء کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ چنانچہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ میں ان کے علماء آتے اور اہل سنت عوام کے ایمان کو صراط مستقیم سے برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، اسی عرصہ میں مکیریان ضلع ہوشیار پور میں بھی ان کے مبلّغ اور واعظ آیا کرتے اور طرح طرح سے وہاں کے سنّیوں سے مذہبی چھیڑ چھاڑ کرتے تھے، یہ بات یہاں تک پہنچی کہ کم علم سنّیوں سے کہا گیا کہ تمھارے تینوں خلفاء نعوذ باللہ مومن نہ تھے اور

---

[1] مباحثہ چکوال، مرتبہ قاضی غلام ربانی سکریٹری انجمن اشاعت الاسلام چکوال ملخصاً

تمھارا کوئی عالم ان کا ایمان ثابت نہیں کرسکتا، بس اسی بات پر وہاں مناظرہ طے ہوگیا اور صرف یہی ایک مسئلہ بحث کے لیے طے ہوا کہ اہلِ سنّت حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کا مومن کامل ہونا ثابت کریں۔ اسی وقت بغیر کسی اہلِ سنّت عالم کے مشورے کے شرائط اور تاریخ مناظرہ بھی مقامی لوگوں کے درمیان طے ہوگئیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کرلیا گیا کہ جالندھر کی ایک عیسائی مشنری کے ایک رکن مسٹر عبدالحق جو مرتد ہوکر عیسائی ہوگئے تھے وہ اس مناظرہ کے حکم ہوں گے۔ جب یہ سب کچھ طے ہوگیا اور آخر شعبان ۱۳۳۹ھ۔ (۱۹۲۰ء) کی تاریخ مناظرہ بھی مقرر ہوگئی تو وہاں کے سنّی اکابر نے مولانا لکھنویؒ کو اطلاع دی کہ آپ ہی پر مناظرہ کا دارومدار ہے۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ جو شرائط آپ لوگوں نے خود طے کرلی ہیں وہ تو مناظرین کے باہم طے کرنے کی ہیں، جب اس وقت مجھ سے مشورہ نہیں لیا گیا تو اب میری کیا ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے ان طے شدہ امور کے نقائص بھی تحریر فرمادیئے۔ جناب ممدوح کو پھر لکھا گیا کہ اگر آپ تشریف نہ لائیں گے تو ہم لوگوں کی بڑی شرمندگی ہوگی اور ہمارے درمیان یہ اقرار ہوچکا ہے کہ تاریخ مقررہ پر جس فریق کے مناظر نہیں آئیں گے اس کو بطور جرمانہ پانچ سو روپیہ دینا ہوگا۔ لہٰذا مجبوراً آپ نے بہ تقاضائے حمیت دینی تشریف لانے کا وعدہ فرمالیا۔ شیعوں کی طرف سے مولوی مرزا احمد علی امرتسری[1] مناظر تھے۔ مولانا لکھنویؒ کی آمد کی خبر سن کر فریق مخالف کے کیمپ میں کھلبلی مچ گئی، چنانچہ پہلے تو مناظرہ روکنے کی تدبیر ہوئی جب اس میں کامیابی نہ ہوسکی تو شرائط وغیرہ میں الجھاؤ ڈالا گیا، پھر یہ اصرار ہوا کہ ہر فریق پہلے اپنی تقریر لکھ لے پھر اس کو دستخط کرکے فریق ثانی کو دے دے اور اس کی ایک نقل پادری صاحب کو بھی، جو حکم تھے دے دی جائے اور ہر فریق کو ایک گھنٹہ کا وقت دیا جائے جس میں ۴۵ منٹ لکھنے کے لیے اور ۱۵ منٹ اس کو سنانے کے لیے، اس پر جب کچھ اشکال پیش کیے گئے تو دوسری جانب سے اس پر اتنا شدید

---

[1] مولوی مرزا احمد علی امرتسری ۱۹۰۴ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے، ابتدائی درسی کتابیں پڑھ کر اسکول میں داخلہ لیا اور انٹرمیڈیٹ پاس کرکے فوج میں ملازمت کرلی جہاں سے ترقی کرتے کرتے اکاؤنٹینٹ جنرل کے عہدے تک پہنچے، علوم دینیہ سے واقفیت اور دیگر مذاہب کے مطالعہ کی بنا پر اہلسنّت اور دوسرے فرقوں سے برابر مناظرہ کیا کرتے تھے۔ انھوں نے لاہور سے ''شیعہ'' اخبار بھی نکالا تھا جس کے صفحات اختلافی مسائل سے لبریز ہوا کرتے تھے۔ ۲؍جون ۱۹۷۰ء کو مولوی امرتسری کا لاہور میں انتقال ہوا اور موچی دروازہ کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ ان کی تصانیف میں تعارف بہائیت، دستور العمل اسلام، معارف اقبال اور ترجمہ وحواشی قرآن مجید بھی شیعی عقائد کے مطابق تحریر کیے تھے۔

اصرار ہوا کہ اس شرط کو بھی منظور کرلیا گیا۔

بہر کیف مناظرہ شروع ہوا، آغاز مناظرہ میں اہلِ سنّت کے مناظر نے کہا کہ فریق مخالف ہم سے خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ایمان کا ثبوت طلب کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ وہ ایمان کی تعریف بیان کردے اور اس کے ثابت کرنے کا طریقہ بھی وہ اپنی مرضی سے معین کردے تاکہ ہم اس کے موافق دلائل پیش کریں۔ مخالف مناظر نے اس کا جواب یہ دیا کہ ایمان کی تعریف سب جانتے ہیں، اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر چند اُن سے اصرار کیا گیا مگر اس کا تشفی بخش جواب کسی طرح نہ ملا، بہر کیف اس کو بھی برداشت کرلیا گیا۔

پورے مناظرہ میں پانچ تقریریں اہلِ سنّت کی طرف سے اور چار شیعہ مناظر کی طرف سے ہوئیں، چونکہ اس مناظرہ میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کا ایمان ثابت کرنا تھا اس لیے مناظر اہلِ سنّت مولانا لکھنویؒ نے اپنی پہلی تقریر میں اعلان کیا:

''حضرات خلفائے ثلاثہؓ کے نہ صرف مومن کامل بلکہ سرتاج اہل ایمان ہونے کے ثبوت میں اس حقیر نے اس وقت ۴۰ دلائل تجویز کیے ہیں جن میں دس آیات قرآنیہ، دس مستند احادیث کتب معتبرۂ مذہب شیعہ، دس عقلی اور دس تاریخی دلائل اور علماء شیعہ کی شہادتیں شامل ہیں۔ شاید اس قدر دلائل اس محدود وقت میں پیش نہ ہوسکیں تو جس قدر بھی ہوسکیں گے وہی انشاء اللہ کافی ہوں گے۔ بالفعل آیاتِ قرآنیہ کے پیش کرنے سے پہلے دو ایسی زبردست دلیلیں پیش کرتا ہوں جن کو سن کر ہر شخص سمجھ لے گا کہ فی الحقیقت حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو خدا نے اپنے دین میں بڑا مرتبہ دیا ہے — پہلی دلیل یہ ہے کہ حضرات خلفاء ثلاثہؓ کو مومن ہی نہیں بلکہ مومن کامل ماننا ایسا ضروری امر ہے کہ کوئی شخص ان کے ایمان کا انکار کرنے کے بعد قرآن شریف پر اپنا ایمان ثابت نہیں کرسکتا کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ۲۳ برس تک بقول شیعہ انہی ''دشمنانِ اسلام'' کا غلبہ رہا اور قرآن کی جمع و ترتیب انہی کے دَور میں عمل میں آئی جس پر اسلام کی بنیاد ہے اور پھر کتب شیعہ میں ائمۂ معصومین کے حوالے سے اس قرآن کی کوئی قابل وثوق تصدیق بھی منقول نہیں ہے لہٰذا یہ قرآن مشکوک ہوگیا اور کیا کسی مشکوک چیز پر ایمان ہوسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ کتب معتبرۂ شیعہ میں قرآن کے بارے میں دو ہزار سے زائد روایاتِ تحریف مذکور ہیں اور وہ بھی تین اقراروں کے ساتھ ہیں کہ (۱) یہ روایات متواتر ہیں (۲) یہ روایات تحریف قرآن پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں اور (۳) یہ کہ انھی روایات کے مطابق

تمام شیعہ باستثناء چار اشخاص قرآن کی تحریف کے معتقد ہیں۔اس طرح ان تینوں حضرات کو مومن نہ ماننے کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مشکوک ہو گیا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو مومن کامل ماننا ایسا ضروری امر ہے کہ بغیر اس کے کسی صحابی کا ایمان ثابت نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ حضرت علیؓ کا ایمان بھی ثابت کرنا محال اور اشد محال ہے۔کوئی بھی مخالف اہلِ سنّت یہ نہیں بتا سکتا کہ اس نے حضرت علیؓ کو کس دلیل سے مومن مانا ہے[1]۔"

ان دو باتوں کی وضاحت کے بعد آپ نے اپنی ابتدائی تقریروں میں اپنے موعودہ بارہ دلائل پیش کیے مگر مخالف مناظر مرزا احمد علی امرتسری برابر یہی کوشش کرتے رہے کہ وہ خارج از بحث باتوں میں الجھا کر سنّی مناظر کو اصل موضوع سے ہٹا دیں اور غیر متعلق باتوں میں تمام وقت پورا کر دیں۔ان دلائل میں سے کچھ کا تو انھوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا اور کچھ کے جواب غیر متعلق باتوں سے دے کر وقت کو ٹالتے رہے۔مناظرہ کی جو شرائط فریقین کے درمیان طے ہوئی تھیں ان کی خلاف ورزی ہر قدم پر ہوتی رہی لہٰذا اس سلسلہ میں حکم سے کہا گیا کہ وہ فریق مخالف کو شرائط کی پابندی پر مجبور کریں اور ان سے تحریری معذرت نامہ لے کر داخل کریں ورنہ ان کو تقریر کی اجازت نہ دیں، اگر وہ آیاتِ قرآنیہ کا کوئی جواب نہیں دیتے اور قرآن مجید پر اپنا اور حضرت علی مرتضیٰؓ کا ایمان ثابت نہیں کرتے تو نہ سہی مگر خلفائے ثلاثہؓ کے ایمان پر حضرت علیؓ اور امام جعفر صادقؒ نے جو گواہیاں دی ہیں اور جو اس کی تصدیق کی ہے اس کا جواب ضرور دیں ورنہ حضرات خلفاء ثلاثہؓ کے ایمان کا اقرار کریں۔

ان باتوں میں سے کسی ایک بات پر بھی عمل نہیں کیا گیا اور مناظرہ کو درہم برہم کر دیا گیا اس طرح مرزا امرتسری نے جان چھڑا لی۔چونکہ مناظرہ درمیان ہی میں ادھورا اور نامکمل ختم کر دیا گیا تھا اس لیے بعد میں بقیہ دلائل حضرت لکھنویؒ سے حاصل کر کے مرتب روداد "کشفِ حقیقتِ مذہب شیعہ" نے اپنے رسالہ میں شامل کر کے شائع کر دیے۔

اس مناظرہ میں اہلِ سنّت کو چار طرح کی کامیابیاں حاصل ہوئیں:

(۱) مخالف مناظر نے اہلسنّت کی طرف سے پہلی تقریر کی پہلی ہی دلیل کا جواب دیتے ہوئے اپنے مذہب کے موافق قرآن مجید کا مشکوک ہونا تسلیم کر لیا۔

---

[1] مباحثہ مکیریاں ضلع ہوشیار پور موسوم بہ "کشف حقیقت مذہب شیعہ" مرتبہ ۰ وی سید محمد کامل، ص ۱۱-۱۲

(۲) مخالف مناظر اپنے مذہبی اصول پر حضرت علی مرتضیٰؓ کا مومن ہونا باوجود پے در پے مطالبات کے ثابت نہ کر سکے۔

(۳) مخالف مناظر نے اہلسنّت کے سوالات کا یا تو ناکافی جواب دیا یا بعض وہ سوالات جو شیعی کتبِ احادیث کی روشنی میں کیے گئے تھے ان کا جواب تو بالکل ہی نہیں دیا اور مکمل خاموشی اختیار کرلی۔

(۴) مخالف مناظر نے فریقین کے مجوزہ شرائط مناظرہ کی بار بار خلاف ورزیاں کیں، جب ان سے کہا گیا کہ اپنی اس غلطی کی معافی مانگیں ورنہ شرائط نامہ لکھ کر دے دیجیے تو وہ دونوں باتوں کے لیے تیار نہ ہوئے اور مناظرہ کو درمیان ہی میں ختم کر کے اپنے فرار اور شکست پر مُہر ثبت کردی۔

اس مناظرہ کی مفصل روداد پہلی مرتبہ ۱۳۳۹ھ-۱۹۲۰ء میں مولوی سید محمد کامل، ناظم انجمن اہلِ سنّت، دوکوہہ، ضلع جالندھر نے شائع کی تھی اور پھر دوسرا ایڈیشن ۱۳۴۷ھ میں دفتر انجم لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ یہ دونوں ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ اب عرصہ سے یہ روداد کمیاب تھی لیکن ابھی حال ہی میں خلافت راشدہ اکاڈمی لاہور نے اسے پھر سے شائع کر دیا ہے جس کا ایک نسخہ ہمارے پاس بھی موجود ہے۔

۹۔ مناظرہ امروہہ ضلع مرادآباد (۱۹۲۰ء)

مشہور شیعہ واعظ اور مناظر مولوی مقبول احمد دہلوی (۱۹۲۱ء) جس طرح ہندوستان کے اور دوسرے شہروں میں جا کر وہاں مناظرانہ تقریریں کر کے شیعہ سنّی کشیدگی پھیلانے کی کوشش کررہے تھے اسی طرح وہ امروہہ بھی آیا کرتے تھے اور وہاں بھی اسی قسم کی تقریریں کرتے تھے۔ ان تقریروں سے متاثر ہو کر امروہہ کے شیعی حضرات ابتداءً درپردہ اہلِ سنّت عوام سے مناظرانہ گفتگو کرنے لگے اور بعض اوقات دبی زبان سے بعض اختلافی موضوعات پر مناظرہ کی دعوت بھی دینے لگے تھے۔ اہلِ سنّت عوام نے اپنے مقامی علماء کو ان حالات کی اطلاع دی اور ان کی رائے سے وہ اس دعوتِ مناظرہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے جس کی روشنی میں دونوں فریق کی جانب سے ایک تحریر لکھی گئی اور اس پر دونوں کے دستخط ہوگئے اور پھر مناظرہ کے موضوعات بھی

باتفاق فریقین طے ہوگئے۔ چنانچہ اہلِ سنّت کی طرف سے صرف دس سوالات تجویز ہوئے جبکہ فریق ثانی کی طرف سے ۹۲ سوالات متعین کیے گئے۔ جب فریق مخالف نے دیکھا کہ اب مناظرہ ہوجانا ناگزیر ہوگیا ہے تو انھوں نے خفیہ طور پر بڑی کوششیں اور تدبیریں کیں کہ کسی طرح مناظرہ نہ ہو اور اگر ہو تو ایسے طریقے سے ہو کہ کامل طور سے انکشاف حقیقت نہ ہوسکے اور آخر تک کوئی یہ نہ سمجھ سکے کہ مناظرہ کس سلسلہ میں ہوا تھا اور اس میں فریقین کی بحث کا کیا نتیجہ نکلا، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو کم از کم حقیقت کے انکار ہی کا موقع مل جائے یا کوئی صورت ایسی پیدا ہوجائے کہ شہر میں کشیدگی کا خطرہ لاحق ہوجائے اور حکّام شہر اس کو رکوا دیں مگر خدا کے فضل سے یہ سب کچھ نہ ہوسکا اور مناظرہ کا انعقاد طے ہو ہی گیا۔ اس مناظرہ میں اہلِ سنّت کی طرف سے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ مدعو کیے گئے اور شیعوں کی طرف سے ان کے قبلہ و کعبہ صدرالافاضل مولوی سیّد سبطِ حسن[1] صاحب لکھنوی مناظر متعین ہوئے۔ اہلِ سنّت کی طرف سے صرف دس سوالات مناظرہ کے لیے متعین ہوئے جو حسب قرار داد تاریخ مناظرہ سے پانچ روز پہلے فریق ثانی کے پاس بھیج دیئے گئے تاکہ ان پر غور و خوض کا موقعہ مل جائے۔ چنانچہ ان سوالوں میں سے پہلا سوال مناظرہ میں یہ پیش کیا گیا کہ کیا حضرات شیعہ کا ایمان قرآن شریف پر ہے یا ہوسکتا ہے؟ اس سوال کی وضاحت میں یہ تین باتیں کہی گئی تھیں:

(۱) شیعہ ہوتے ہوئے کیا اس بات پر ایمان ممکن ہے کہ قرآن نام کی کوئی کتاب خدا کی طرف سے بندوں پر نازل ہوئی تھی؟

(۲) کیا اس بات پر ایمان ہونا ممکن ہے کہ یہ کتاب بے کم و کاست، بے تغیر و تبدل اور بلاتحریف و زیادت وہی کتاب ہے جس کو جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کتاب اللہ کے نام سے یاد فرماتے تھے؟

---

[1] مولوی سیّد سبط حسن بن رمضان علی سبزواری جائسی ثم لکھنوی ۱۲۸۴ھ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مولوی حبیب حیدر، مولانا محمد حسین، بحرالعلوم، مولوی سیّد بچھن، تاج العلماء سیّد محمد علی اور مولانا ابوالحسن سے الگ الگ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، معقولات و منقولات وغیرہ کا درس لیا اور طبّی تعلیم بھی حاصل کی۔ سلطان المدارس لکھنؤ سے تعلیم مکمل کر کے نجف اشرف گئے اور ایران کا سفر کیا اور وہاں سے اجازہ اور سند اجتہاد لے کر ہندوستان واپس آئے۔ مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ اور مدرسہ منصبیہ میرٹھ اور جونپور کے مدرسہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۳۶۷ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کی تصانیف میں صفاح العقبان فی تحریف القرآن، مشارع الشرائع، کتاب الزواہر، عرائس الافکار، تحفۃ العوام اور تاج الکرامہ فی اثبات الامامہ وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

(۳) اگر اس کتاب میں کوئی کمی بیشی اور تحریف وتبدیلی ہوئی ہے تو کیا بحالت موجودہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی قابلِ ایمان ہے جس کی بابت قطعی طور پر یقین کیا جا سکے کہ یہ کلامِ خداوندی ہے اور اس کا جو مفہوم سمجھا جاتا ہے وہی مرادِ الٰہی ہے؟

کسی کلمہ گو سے ایمان بالقرآن کی دلیل طلب کرنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ شیعوں سے یہ سوال کرنا ضروری ہے کیونکہ ان کے کچھ عقائد ایسے ہیں جو کسی دوسرے کلمہ گو اہل اسلام میں نہیں ملتے ہیں:

(۱) مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ ناقلانِ قرآن اور راویانِ دین وایمان کی سب سے پہلی جماعت (یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم) بلا استثنا ساری کی ساری جھوٹی تھی مگر فرق اتنا ہے کہ بقول ان کے اس جماعت میں دو گروہ تھے ایک گروہ خلفاء ثلاثہؓ اور ان کے ساتھیوں کا تھا جو سب سے بڑا تھا۔ اس کے جھوٹ کا نام نفاق ہے اور دوسرا گروہ جو حضرت علی مرتضیٰؓ کا تھا جس میں گنتی کے چار پانچ آدمی بیان کیے جاتے ہیں، اس کے جھوٹ کا نام تقیہ تھا جو اُن کے نزدیک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ لہٰذا اس عقیدہ کے ہوتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت، دلائل نبوت، تعلیمات نبوت، آپ کی لائی ہوئی کتاب قرآن مجید ہی نہیں بلکہ دین کی کسی بات پر بھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) بہ اقرار شیعہ موجود قرآن حضرات خلفاء ثلاثہؓ کے زیر اہتمام وانتظام جمع ہوا اور انہی کے ذریعہ تمام عالم اسلام میں پھیلا ہے، اس کے بارے میں ان کے ائمۂ معصومین سے ان کی کتابوں میں کوئی تصدیق بھی نہیں ہے اور اگر تصدیق ہوتی بھی تو بر بنائے تقیہ (جھوٹ) ناقابل اعتبار ہے۔ لہٰذا جو چیز دین کے ایسے دشمنوں کے ہاتھوں سے ملے جو معاذ اللہ خائن بھی ہوں، کاذب بھی ہوں، تحریف دین کے درپے بھی ہوں، صاحبِ سلطنت وشہرت بھی ہوں، جھوٹ بات پر سب کو متفق کر کے ایک بے بنیاد بات کو متواتر بنا دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں تو وہ کیسے قابلِ اعتبار ہو سکتی ہے اور اس پر کسی سمجھ دار آدمی کا ایمان کیونکر ہو سکتا ہے۔

(۳) شیعوں کی نہایت معتبر کتابیں اس مضمون سے بھری ہوئی ہیں کہ ائمہ معصومین نے، جو بقول ان کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم اور مفترض الطاعۃ ہیں، فرمایا ہے کہ اس قرآن سے بے شمار آیتیں اور سورتیں نکال دی گئی ہیں، اس کے الفاظ اور حروف میں بکثرت ردوبدل کر دیا گیا ہے، اس میں قابلِ نفرت اور خلاف فصاحت وبلاغت عبارتیں بنا کر بڑھائی گئی ہیں،

اس کی ترتیب خبط بے ربط کردی گئی ہے لہٰذا یہ قرآن بجائے دین کی تعلیم دینے کے بے دینی کی تعلیم دیتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین کرتا ہے۔

(۴) اکابر علماء شیعہ کا یہ اقرار بھی ہے کہ تحریف، تغیر و تبدل اور کمی بیشی کی یہ روایتیں نہ صرف یہ کہ صحیح ہیں بلکہ مستفیض اور متواتر بھی ہیں اور ان روایات سے قرآن کی تحریف بصراحت ثابت ہے۔

(۵) ان سب کے بعد سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہی روایتوں کے مطابق شیعوں کا عقیدہ بھی ہے۔ یہ عقیدہ بھی ان اہم لوگوں کا ہے جو بلا واسطہ ائمہ معصومین کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے یا امام غائب کے سفیر اور ان سے ملاقات کرنے والے تھے۔ ان عقائد کا اقرار تمام اکابر علماء شیعہ نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

مذکورہ بالا سوال اور اس کی تینوں وضاحتیں اور پھر خاص طور سے شیعوں ہی سے اس سوال کے پوچھے جانے کے اسباب بیان کرنے کے بعد مولانا لکھنویؒ نے کتب معتبرۂ شیعہ کے حوالوں سے موجودہ قرآن میں کمی بیشی اور حروف والفاظ کے ردوبدل ہونے کے ثبوت اور پھر علماء شیعہ کا یہ اقرار کہ تحریف قرآن کی یہ روایات صرف صحیح ہی نہیں بلکہ مستفیض و متواتر بھی ہیں اور انہی کے مطابق ان کا عقیدہ بھی ہے پوری تفصیل کے ساتھ مجلس مناظرہ میں پیش کیے، جس وقت یہ قیامت خیز سوال مجلس مناظرہ میں رکھا گیا تو تمام مجمع پر ایک خاص قسم کا اثر تھا، فریقین کے سمجھ دار لوگوں نے سوال کے سنتے ہی اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اس کے جواب سے عہدہ برآئی شیعوں کے لیے ناممکن ہے۔ پندرہ دن کے لیے یہ مناظرہ طے ہوا تھا لیکن اگر پندرہ برس تک بھی یہ مناظرہ قائم رہتا اور تمام دنیا کے علماء شیعہ متحد ہوکر بھی جواب دینا چاہتے تو بھی اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے چنانچہ اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ صدر الافاضل مولوی سیّد سبط حسن مجتہد تین دن تک اس سوال کے جواب کی تلاش میں سرگرداں رہ کر آخر میں یہ کہہ کر چپ ہوگئے:

''میں کافی جواب دے چکا ہوں اب آپ جو چاہیں فرمائیں، میں کچھ نہ بولوں گا۔''

مولوی سبط حسن نے سوالقاظی و فروعی باتوں میں وقت گذاری، رکیک تاویلات، اپنی مذہبی اصطلاحات کی من گھڑت تعریفات اور جوابی الزام تراشیوں کے کوئی دوسری کارآمد بات نہیں کی جس سے ان کے ہی حلقوں میں ہر طرف مایوسی پھیل گئی، چنانچہ سید ابن حیدر شیعہ منتظم جلسۂ مناظرہ بے قرار ہوکر دست بستہ کھڑے ہوگئے اور حضرت لکھنویؒ سے عرض کرنے لگے کہ

اب یہ بحث کافی ہو چکی ہے براہِ کرم اس کو ختم فرما دیجیے۔

مولانا کے صرف ایک ہی سوال پر سارا مناظرہ ختم ہو گیا اور کسی دوسرے سوال کے پیش کیے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس مناظرہ سے یہ بات بالکل واضح اور عیاں ہو گئی کہ شیعوں کا ایمان قرآن موجودہ پر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔[1]

۱۰۔ مناظرہ بشیر ہاٹ ضلع چوبیس پرگنہ (مغربی بنگال) ۱۹۲۲ء

اس مناظرہ کے سلسلے میں بشیر ہاٹ کے ایک معزز عالم اور شیخ مولانا صوفی ابوبکر صاحب نقشبندی مجددیؒ نے مولانا کو دعوت دی تھی، چنانچہ صوفی صاحب کے خلیفہ اور عالم دین مولوی روح الامین صاحبؒ نے مولانا کو کئی خطوط لکھے کہ یہاں شیعہ مبلّغین آئے ہوئے ہیں اور جا بجا سنّیوں کو شیعہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں لہٰذا آپ کا آنا بہت ضروری ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ یہاں کے تقریباً آٹھ ہزار مسلمان شیعہ ہو جائیں گے۔ اسی درمیان مولوی روح الامینؒ نے شیعہ مبلّغین سے مناظرہ طے بھی کر لیا اور اس طرح کے معاہدے پر فریقین کے دستخط بھی ہو گئے۔ ان حالات میں مولانا لکھنویؒ طے شدہ تاریخ پر بشیر ہاٹ پہنچ گئے مگر شیعوں نے ضلع کلکٹریٹ کو درخواست دے دی کہ یہاں زبردست فساد ہو جانے کا اندیشہ ہے لہٰذا مناظرہ روک دیا جائے۔ کلکٹر نے وہ درخواست مسٹر آسوتوش دت مجسٹریٹ کو بھیج دی۔ جنھوں نے حالات کا اندازہ لگا کر اور شیعوں کی درخواست کو غلط قرار دے کر مناظرہ کی اجازت دے دی اور سرکاری طور پر پورا انتظام بھی کر دیا۔ اس طرح بشیر ہاٹ کے ایک پُر فضا ماحول میں جہاں اورنگ زیب عالم گیر غازیؒ کی بنوائی ایک مسجد بھی ہے، مناظرہ منعقد ہوا۔ اس میں شیعوں کے آٹھ مولوی آئے تھے جن میں سے ایک صاحب امروہہ سے، ایک پنجاب سے، دو مرشد آباد سے اور باقی مقامی شیعہ مولوی تھے۔ جلسہ گاہ میں ان مولوی صاحبان نے درخواست کی کہ ہمیں مناظرہ کی مہلت ملنی چاہیے کیونکہ اس وقت ہم میں کوئی ایسا عالم نہیں ہے کہ جو مدیر النجم سے مباحثہ کر سکے لہٰذا ان کے

---

[1] شکستِ عظیم باعدائے قرآن کریم ملقب بہ الزلزال فی اوّل السوال، نمبر اوّل، مرتبہ مولوی ثمر الدین سکریٹری انجمن اشاعت الاسلام، امروہہ، دوسرا ایڈیشن، شکست عظیم باعدائے قرآن کریم ملقب بہ البطش الشدید بمن لم یومن بالقرآن المجید، نمبر دو ملخصاً۔

مقابلہ کے لیے ہم لکھنؤ سے اپنے مجتہدین کو بلائیں گے۔ سنّیوں نے اس کی منظوری اس شرط پر دی کہ وہ ہمارے علماء کے اخراجاتِ سفر ادا کریں مگر انھوں نے اس پر اپنی عدم استطاعت کا اظہار کیا اور مناظرہ گاہ سے واپس جانے کی اجازت مانگنے لگے یہاں تک کی وہ بلا مناظرہ کیے راہِ فرار اختیار کر گئے لہٰذا مولانا لکھنویؒ کامیاب و کامراں قرار دیئے گئے مناظرہ کی تفصیلی روداد اسی زمانہ میں النجم میں شائع ہو چکی تھی مگر افسوس ہے کہ وہ ہمیں دستیاب نہ ہو سکی جس کی وجہ سے آج ہم اس کی کوئی تفصیل نہیں دے سکے[1]

۱۱۔ سفر حسین آباد ضلع مونگیر (بہار) ۱۹۲۳ء

مونگیر بہار کا ایک مشہور شہر ہے، اسی کے مضافات میں حسین آباد کا قصبہ ہے جہاں شیعوں کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس کے رئیس اعظم نواب دلدار علی خاں تھے۔ چونکہ وہاں کے سنّی بہت غریب اور نا تعلیم یافتہ تھے لہٰذا وہاں کے شیعہ بڑی زور زبردستی کے ساتھ اپنی مجالس کیا کرتے تھے جن میں لکھنؤ سے مجتہدین بلائے جاتے تھے۔ ان مجالس میں سنّیوں کے دل دُکھانے کی جو بھی تدبیریں ممکن تھیں وہ کی جاتی تھیں۔ کئی سال سے وہاں مولوی سبط حسن بلائے جانے لگے تھے، انھوں نے نواب صاحب کے اندر ایسی مذہبی روح پھونکی کہ انھوں نے اپنے حواریوں کے ساتھ بالاعلان تبرا بازی کا پروگرام بنالیا۔ جب مقامی سنّیوں کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے اس پر احتجاج کیا جس سے نواب صاحب کو اور بھی زیادہ کد پیدا ہوئی چنانچہ انھوں نے اپنے یہاں کے کچھ غریب سنّیوں کو بلا کر بڑے تکبّر اور تبختر سے کہا:

> ''تم مجھے نہیں جانتے کہ میں کون ہوں، میں ملٹری بلا کر سرکاری انتظام میں بالاعلان تبرا کر سکتا ہوں، اگر مقدمہ چلے گا تو تمھیں ہر طرف میرے ہی اعزّہ نظر آئیں گے جو وردی پہنے ہوئے کچہری کی سیڑھیوں پر ٹہلتے ملیں گے۔''

ان حالات سے مجبور ہو کر سنّیوں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، مقامی انتظامیہ اور عدالت کو یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر یہاں علانیہ تبرا ہو گا تو حسین آباد اور اس کے اطراف میں آباد سنّی اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جائیں گے لہٰذا مجسٹریٹ نے فوراً تبرا کو ممنوع

---

[1] النجم، ۲۱ رصفر ۱۳۴۴ھ و جمادی الاوّل ۱۳۴۸ھ

قرار دے دیا اور نواب صاحب اور مولوی سبط حسن پر دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس جاری کر دیا اور ان کی سابقہ اشتعال انگیزیوں کا پردہ چاک کیا۔ اس طرح فی الوقت یہ مصیبت ٹل گئی مگر مولوی سبط حسن کا مجالس میں آنا اور مذہب اہل سنّت پر اعتراضات کرنا برابر جاری رہا۔

مقامی غیرت مند سنّیوں میں سے بعض سمجھ دار حضرات برابر دفتر النجم میں اطلاعات بھیجتے رہتے تھے اور حضرت لکھنویؒ سے وہاں آنے کی استدعا کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب ان کی طرف سے اصرار بہت زیادہ بڑھا تو شعبان ۱۳۴۲ھ میں آپ حسین آباد تشریف لے گئے اور وہاں کے آس پاس کے علاقوں میں یعنی حسین آباد اور شیخ پورہ وغیرہ میں آپ کے خالص دینی وعظ ہوئے اور ان میں مذہب اہلِ سنّت کی حقانیت کو مدلل طور پر آپ نے ثابت کیا اور اس طرح جو گمراہیاں مولوی سبط حسن نے وہاں جا کر پھیلا رکھی تھیں ان کا سدّ باب کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد سے پھر دوبارہ مولوی سبط حسن وہاں نہ جا سکے۔

شیعیت کے اثرات وہاں اس قدر پھیل چکے تھے کہ حسین آباد کے ایک پڑھے لکھے سنّی گھرانے کی ایک معمّر خاتون نے ایک بار دریافت کیا کہ حضرت عمر کون تھے؟ انھیں بتایا گیا کہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق خاص اور آپؐ کے دوسرے خلیفہ تھے، اس وقت معلوم ہوا کہ وہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں جانتی تھیں، ہر چند کوشش کی گئی اور بتلانے پر بھی وہ نہ سمجھ سکیں، بالآخر اُن سے پوچھا گیا کہ امام حسینؓ کو تو جانتی ہو، انھوں نے کہا کہ ہاں! انھیں کا تو محرّم ہوتا ہے، اس وقت ان کو بتلایا گیا کہ انھیں امام حسینؓ کے تو نانا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، تب جا کر ان کی سمجھ میں آیا[1] انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۲۔ مناظرہ کولوتارڑ ضلع گوجرانوالہ (پنجاب-۱۹۲۳ء)

علماء شیعہ کی اشتعال انگیز معترضانہ باتوں کو ہمارے علماء اکثر اہمیت نہیں دیتے تھے اور ان سے صَرفِ نظر کیا کرتے تھے، اس چیز نے مخالفین کے حوصلے کچھ زیادہ ہی بلند کر دیئے تھے چنانچہ اسی کے نتیجہ میں گوجرانوالہ پنجاب بھی ان سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور وہاں کا موضع لکھی شاہ اور اس کے قرب وجوار کی کئی بستیاں گمراہ ہوگئی تھیں۔ ان حالات میں وہاں کے مقامی لوگوں کی

---

[1] النجم لکھنؤ، جمادی الآخر ۱۳۴۳ھ

طرف سے نامور عالم دین مولانا ابوالقاسم محمد حسین صاحبؒ مولوی فاضل پنجاب نے مولانا لکھنویؒ کو اطلاع دی کہ یہاں ہمارے اور شیعوں کے مابین ایک مناظرہ طے ہو گیا ہے، براہِ کرم آپ تشریف لاکر ہماری رہنمائی اور مذہبِ حقہ کی ترجمانی فرمائیں۔ مولاناؒ نے ان کی دعوت قبول کرتے ہوئے اپنی منظوری کی اطلاع بھیج دی۔ اتفاقاً مولاناؒ اسی زمانہ میں بہ سلسلۂ وعظ لاہور پہنچے تو اس موقع کو غنیمت جان کر گوجرانوالہ کے حضرات نے وہاں پہنچ کر آپ کے وعدہ کی یاددہانی کی اور مناظرہ کے لیے تشریف لے چلنے کی درخواست کی چنانچہ آپ وہاں گئے، جانے کے بعد معلوم ہوا کہ مقامی اہلِ سنّت کی طرف سے حافظ سردار صاحب ولد نور شاہ ساکن موضع شہابہ، تحصیل حافظ آباد اور شیعوں کی طرف سے امیر علی ولد غلام علی ساکن موضع لکھی شاہ، تحصیل حافظ آباد کے مابین دن و تاریخ اور موضوع مناظرہ وغیرہ سب پہلے ہی سے طے ہو چکا ہے۔ موضوع کے بارے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ اہلِ سنّت کے مناظر اس کا ثبوت دیں گے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ و حضرت عمر فاروقؓ سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ راضی و خوش رہے اور اس کے برعکس ناراض ہونے کا ثبوت شیعوں کے ذمہ ہوگا۔

حضرت لکھنویؒ کا یہ سفر پنجاب مناظرہ کے خیال سے نہیں ہوا تھا بلکہ انھیں لاہور کی ایک دینی تقریب میں شرکت کرنی تھی، اسی لیے آپ کے ساتھ کوئی کتاب وغیرہ بھی نہیں تھی مگر پھر بھی دینی حمیت اور خالص لوجہ اللہ آپ نے مناظرہ میں شرکت قبول کر لی اور ایک روز قبل ہی تحصیل حافظ آباد پہنچ گئے اور وہاں موضع ساکھی میں آپ کا قیام کرایا گیا۔ اس مناظرہ میں سنّیوں کی طرف سے اصل مناظر آپ ہی تھے مگر بطور معاون مولانا محمد مسعود ساکن چونڈہ ضلع سیالکوٹ بھی تھے۔ شیعوں کی طرف سے وہی مولوی مرزا احمد علی امرتسری مناظر تھے جو اس سے پہلے مناظرہ ٹکریاں پنجاب میں حضرت لکھنویؒ سے بدترین شکست کھا چکے تھے۔ امرتسری صاحب کو یقین نہ تھا کہ اس مناظرہ میں بھی ان کا مقابلہ مولانا لکھنویؒ سے ہوگا ورنہ شاید وہ یہاں دوبارہ آنے کی ہمت نہ کرتے۔

مناظرہ کا ثالث بھی شیعوں ہی کے اصرار پر لالہ رام سہائے ہیڈ ماسٹر سٹی اسکول حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کو بنایا گیا تھا۔

شیعوں نے جب یہ دیکھا کہ اب تو مناظرہ ناگزیر ہو گیا ہے تو حسبِ دستور انھوں نے اس

کوٹالنے کی ہر ممکن تدبیریں کرنا شروع کر دیں، پہلے تو یہ طے کیا کہ اپنا پسندیدہ ثالث مقرر کرانے پر اڑ گئے جبکہ پہلے سے فریقین کے درمیان یہ طے ہو چکا تھا کہ ثالث سنّیوں کا مجوزہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی مصلحتاً اس کو مان لیا گیا تو نقض امن کا خطرہ ظاہر کر کے ضلع حکّام کو درخواست دے دی گئی کہ فوراً جائے مناظرہ پر پولیس کا بندوبست کیا جائے جبکہ مقامی حکام پہلے ہی سے ہر طرح کا امن وامان قائم رکھنے کا انتظام کیے ہوئے تھے مگر حکام بالا پر اثر ڈلوا کر ایک شیعہ سب انسپکٹر پولیس کو جائے مناظرہ پر متعین کرالیا گیا جس نے بالآخروہ چال چلی کہ مناظرہ واقعی درہم برہم ہوگیا۔ ہوا یہ کہ لالہ رام سہائے نے حاضرین جلسہ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آپ سب حضرات مجھے اپنا ثالث مانتے ہیں یا نہیں، سنّیوں کے مجمع نے کہا کہ فریقین کے درمیان جو معاہدہ پہلے طے ہوا تھا کہ ثالث ہمارا مجوزہ ہوگا اس کی روشنی میں آپ اصولاً ثالث نہیں مانے جاسکتے لہٰذا وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعہ سب انسپکٹر فوراً کھڑے ہو گئے اور بولے کہ صاحبو! اب اس جلسہ کا صدر اور ثالث میں ہوں کیونکہ سنّیوں نے لالہ صاحب کا ثالث ہونا منظور نہیں کیا ہے اس لیے اب میں حکم دیتا ہوں کہ یہ مناظرہ منسوخ کر دیا جائے۔ ان کے اس اعلان سے شیعہ صاحبان بے حد خوش ہوئے کہ چلو اچھا ہوا جان بچی سو لاکھوں پائے۔ چنانچہ اس حیلہ سے مجلس مناظرہ برخاست ہوگئی اور شیعہ مولوی صاحبان اور ان کے ہمنوا حاضرین سب چلتے بنے۔

شیعہ مولویوں کو جب یہ یقین ہو گیا کہ اب علماء اہلِ سنّت یہاں سے روانہ ہو چکے ہوں گے تو اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے اور عوام پر اپنا بھرم باقی رکھنے کے لیے انھوں نے اطلاع بھیجی کہ ہم لوگ اب بغیر ثالث کے مناظرہ کے لیے تیار ہیں، آپ حضرات مقام گیگے شاہ میں آکر ہم سے مناظرہ کرلیں۔

سنّیوں کے علماء واپس ہو چکے تھے مگر فوراً آدمی دوڑائے گئے اور ان سب حضرات کو راستے سے واپس بلایا گیا، چنانچہ اگلے روز مقام گیگے شاہ میں سب حضرات ایک وسیع پنڈال میں جمع ہو گئے اور شیعہ مولویوں کا انتظار ہونے لگا مگر سارا دن گزر گیا اور کوئی شیعہ مولوی مناظرہ گاہ میں نہیں آیا اور نہ ہی انھوں نے کسی رقعہ کا جواب دیا۔

سنّی اور شیعہ عوام پر مشتمل ایک بڑا مجمع جو تقریباً چھ سات ہزار افراد پر مشتمل تھا وہیں ٹھہرا رہا

اور اسے اب اچھی طرح یقین ہوگیا تھا کہ شیعہ مولویوں نے راہِ فرار اختیار کرلی۔ اس موقع پر حضرت لکھنویؒ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ایک تبلیغی و اصلاحی تقریر فرمائی جس میں آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرا لکھنؤ سے آنا اس مناظرہ کے لیے نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس مناظرہ کا مجھے کچھ خیال تھا اسی لیے کتب شیعہ بھی میرے ہمراہ نہیں آئیں۔ میرا آنا تو اس وقت انجمن اسلامیہ لاہور کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے تھا، وہاں پہنچ کر اچانک کولوتارڑ ضلع گوجرانوالہ سے اس مناظرہ کی اطلاع پہنچی اور میری شرکت کے لیے اصرار کیا گیا چنانچہ میں محض اظہارِ حق کی نیت سے حاضر ہوگیا ہوں، چند کتب شیعہ لاہور میں بڑی دقت سے فراہم ہوئیں ان میں بھی جو کتب میں چاہتا تھا وہ نہ مل سکیں کیونکہ شیعہ صاحبان اپنی کتابوں کو چھپانے اور سنّیوں سے مخفی رکھنے میں بے حد ساعی رہتے ہیں مگر پھر بھی جس قدر مل گئی ہیں انشاء اللہ وہ کافی ہوں گی۔ عام لوگوں کو یہی سمجھایا جاتا ہے کہ مذہبِ شیعہ حضرت علی مرتضیٰؓ اور اولادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے کا نام ہے حالانکہ اس کی اصل حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس مناظرہ کا اصل موضوع یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما سے اللہ اور اس کے رسول راضی وخوش تھے لہٰذا سب سے پہلے میرے ان چند سوالات کا جواب شیعہ مناظر عنایت فرمائیں:

(۱) خدا اور رسول کی رضامندی حاصل ہونے کے اسباب کیا ہیں یعنی کن امور کے سبب سے کوئی بندہ خدا اور رسول کا پسندیدہ ہوسکتا ہے۔

(۲) کسی بندہ کا پسندیدۂ خدا اور رسول ہونے کا علم دوسرے بندوں کو کس طرح ہوسکتا ہے۔

(۳) کیا کسی شیعہ کا قرآن مجید پر ایمان ہوسکتا ہے؟

شیخین رضی اللہ عنہما کے خدا اور رسول کا پسندیدہ ہونا بلکہ افضلِ امت ہونا دینِ الٰہی کے ان مسائل ضروریہ میں سے ہے جن کے انکار کے بعد دین کی کوئی چیز ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔ مناظرۂ مکیریاں (پنجاب) میں خاص اسی بدیہی مسئلہ پر اس حقیر نے ۴۰ دلائل پیش کیے تھے اور بحمد اللہ اس وقت بھی کم از کم اتنے ہی اور نئے دلائل پیش کرنے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔

اتنا فرما کر آپ نے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے پسندیدۂ خدا اور رسول اور افضل امت ہونے کے مزید بیّن نئے دلائل قرآن مجید، احادیث اور تواریخ معتبرہ شیعہ سے برسرِ مناظرہ پیش کردیئے جس سے تمام حاضرین کی آنکھیں کھل گئیں مگر افسوس کہ اس وقت فریقِ مخالف کے

غیر حاضر ہونے کی وجہ سے مناظرہ ہی نہ ہوا۔ ان کے مولوی صاحبان حقیقتِ حال سے واقف تھے اس لیے وہ پہلے ہی میدان مناظرہ خالی کر گئے۔ اس مناظرہ کی مکمل روداد ''ہزیمت شیعیان پنجاب'' کے نام سے مولانا ابوالقاسم محمد حسین صاحبؒ مولوی فاضل پنجاب نے مرتب کر کے ۱۳۴۱ھ میں دفتر النجم سے شائع کرائی تھی بعد میں دوبارہ اس کو علیحدہ کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا تھا[1]

۱۳۔ سفر سٹّی ضلع کانپور ۱۹۲۴ء

کانپور سے جھانسی جانے والی ریلوے لائن پر چورہ نامی اسٹیشن سے سات میل کے فاصلہ پر یہ قصبہ آباد ہے جس میں شیعہ اور سنّی آبادی مشترک ہے۔ کچھ عرصہ سے وہاں شیعہ سنّی کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ ایک بار مقامی شیعوں نے مولوی سبط حسن مجتہد کو سٹّی بلایا جہاں انھوں نے بڑی اشتعال انگیز تقریریں کیں وہیں انھوں نے سنّیوں کو مناظرہ کی دعوت بھی دی۔ مقامی سنّیوں نے فوراً دعوتِ مناظرہ منظور کر کے سید ذاکر علی صاحب کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت لکھنویؒ کے پاس لکھنؤ بھیجا اور ان کو اس مناظرہ کی اطلاع دے کر سٹّی آنے کی دعوت دی۔ آپ نے اپنی منظوری دے دی اور تاریخ مقررہ پر جس ٹرین سے مولانا لکھنویؒ روانہ ہوئے اسی ٹرین سے مولوی سبط حسن بھی عازمِ سفر ہوئے، کوشش اس بات کی گئی کہ مولوی سبط حسن کو مولانا لکھنویؒ کی روانگی کی اطلاع نہ ہو ورنہ خطرہ تھا کہ کہیں درمیان ہی میں وہ ٹرین سے اتر کر غائب نہ ہو جائیں۔ المختصر حضرت مولانا اسٹیشن پکھرایاں پر اتر گئے اور مولوی سبط حسن چورہ کے اسٹیشن پر اترے۔ سٹّی کے شیعوں کو مولوی سبط حسن کے آنے سے بڑی مسرت تھی اور انھیں یقین تھا کہ موصوف سنّی مناظر کو لاجواب کر دیں گے۔ جیسے ہی مولوی سبط حسن سٹّی پہنچے تو تھوڑی دیر کے بعد انھیں مولانا لکھنویؒ کے پہنچنے کی خبر ملی، سنتے ہی ان کے ہوش اُڑ گئے اور جس مکان میں ٹھہرے تھے اس کے دروازہ پر پہرہ بٹھا دیا گیا کہ کوئی اندر نہ آسکے یہاں تک کہ شیعہ بھی وہاں نہ جاسکتے تھے مگر سیّد ذاکر علی صاحب ان کے یہاں پہنچے اور ان کے میزبان سے کہا کہ آپ لوگوں کے چیلنج دینے کی وجہ سے ہم نے مولانا لکھنویؒ کو یہاں بلا لیا ہے اور اب مولوی سبط حسن صاحب بھی آچکے ہیں

---

[1] ''ہزیمتِ شیعیانِ پنجاب'' مولانا ابوالقاسم محمد حسین صاحبؒ ملخصا

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اب مناظرہ ہو جائے اور آپ اپنے مذہب کی سچّائی ثابت کریں۔ آج بعد نمازِ جمعہ جس مقام پر آپ مناسب سمجھیں اپنے مجتہد صاحب کو لے کر آ جایئے، ہم مولانا لکھنویؒ کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں گے اور پھر تہذیب و متانت اور عالمانہ طریقے سے احقاقِ حق ہو جائے گا۔

اس خبرِ وحشت اثر سے مولوی سبط حسن صاحب کی حالت عجیب ہو گئی، ساری مجلس میں سناٹا چھا گیا، مولوی صاحب موصوف نے اپنی خرابی صحت کا حیلہ تراشا اور فوراً لکھنؤ جانے کا تہیّہ کر لیا۔ ہر چند ان کے لوگوں نے اطمینان دلایا اور اصرار کیا اور کہا کہ اب اس وقت آپ کو کوئی گاڑی بھی نہیں ملے گی مگر انھوں نے ایک نہ سنی، کھانا بھی نہیں کھایا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

حضرت مولانا لکھنویؒ ستّی میں ٹھہرے رہے اور بعد نماز جمعہ آپ کا وعظ ہوا اور اسی روز شب میں قصبہ کے اندر آپ کا دوسرا وعظ ہوا اور جو کچھ بھی دوسروں کے بہکانے سے وہاں کے لوگوں کو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے بحمد اللہ وہ سب رفع ہو گئے۔ اس طرح لوگوں کا ایمان از سرِ نو تازہ ہو گیا۔ دوسرے دن صبح کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ ستّی والوں نے حضرت مولانا کو وہاں سے روانہ کیا اور وہ لکھنؤ واپس آ گئے[1]

۱۴۔ سفر نظام آباد ضلع اعظم گڑھ ۱۹۲۴ء

نظام آباد ضلع اعظم گڑھ میں ایک مقام ہے جو رانی سرائے ریلوے اسٹیشن سے چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس قصبہ میں سادات کا صرف ایک خاندان تھا جو وہاں کا زمین دار بھی تھا، باقی لوگ پیشہ ور اور خوشحال تاجر کی حیثیت سے تھے۔ سادات کا یہ خاندان یکجدی تھا اور ایک بزرگ حضرت سیّد نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں تھا، انہی کے نام پر اس قصبہ کا نام بھی رکھا گیا تھا۔ مذکورہ سادات میں صرف ایک گھر مولوی علی صغیر فاضل دیو بند کا تھا جو اپنے آباء و اجداد کے طریقے یعنی اہل سنت و جماعت پر قائم تھا باقی سب لوگ شیعہ ہو گئے تھے۔ ان کے شیعہ ہونے کے اسباب بھی وہی تھے جو ہم نوابینِ اودھ کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں۔

کئی سال سے وہاں کے مقامی شیعہ صاحبان میں مذہبی جوش بہت بڑھ گیا تھا اور وہ سال میں کئی مجالس منعقد کیا کرتے تھے جن میں اپنے اکابر علماء کو مدعو کرتے تھے خاص طور سے مولوی

---

[1] النجم لکھنؤ، جمادی الآخر ۱۳۴۳ھ

سبط حسن مجتہد اور مولوی ابن حسن وہاں ضرور پہنچا کرتے تھے جو اپنے بیانات میں برابر مذہبِ اہل سنت و جماعت اور ان کے بزرگانِ دین پر تعریضات کیا کرتے تھے لہٰذا اہلِ نظام آباد نے حضرت مدیر النجمؒ کو نظام آباد آنے کی دعوت دی اور اس سلسلہ میں آپ کے پاس وہاں سے پورا ایک وفد بھیجا گیا چنانچہ آپ تشریف لائے اور وہاں کے مختلف مقامات پر آپ کے چار وعظ ہوئے۔ پہلا وعظ جامع مسجد نظام آباد میں ہوا جو نماز کی تاکید و ترغیب اور قرآن کی اہمیت و افادیت پر تھا، باقی تین وعظ جلسۂ عام میں ہوئے جن میں فضائل اسلام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور فضائل و مناقب صحابۂ کرامؓ بالخصوص مناقب خلفاء راشدینؓ کی حقیت خلافت قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں بیان کی گئی۔ مولوی سبط حسن اور ان کے ہم مذہبوں نے مذہب اہلِ سنّت پر جو اعتراضات اور الزامات لگائے تھے ان کے بھی شافی و کافی جوابات نہایت تفصیل کے ساتھ دیئے گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ایسے موقع پر کوئی شیعہ مولوی سامنے نہیں آیا۔ بس صرف ایک تحریر جلسۂ عام میں بھیجی گئی تھی جس میں لکھا تھا کہ ہمارے علماء نے قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ خلیفہ کا مقرر کرنا خدا کا کام ہے، بندوں کا منصب نہیں ہے کہ وہ اس کو انجام دیں۔ اس لیے براہِ کرم آپ قرآن مجید سے اس کا ثبوت پیش کریں کہ انسان کو بھی خلیفہ بنانے کا حق حاصل ہے۔ تحریر مذکور کا جواب اسی وقت مجمع عام میں ثبوت کے ساتھ پیش کر دیا گیا۔ اور پھر بعد میں النجم میں بھی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر ایک مضمون شائع کر دیا گیا۔ خیریت ہوئی کہ فریقِ مخالف کا کوئی عالم سامنے نہیں آیا ورنہ اور بھی اس کی قلعی کھل جاتی۔[1]

۱۵۔ سفر فیض آباد ۱۹۲۶ء

اودھ کی قدیم راجدھانی فیض آباد میں سنّیوں کی دل آزاری اور ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی کوششیں ایک زمانے میں بہت بڑھ گئی تھیں جس سے بے چارے سنّی اپنی جگہ پر بہت دل گرفتہ اور ملول رہا کرتے تھے، انہی حالات میں اکتوبر ۱۹۲۶ء میں وہاں کے مقامی شیعوں کی طرف سے "غذائے روح" کے عنوان سے ایک لمبا چوڑا اشتہار چھاپ کر شائع کیا گیا

---

[1] النجم (دورِ جدید) جمادی الآخر ۱۳۴۳ھ

جس میں ایک ہفتہ تک مجالس عزا منعقد کرنے اور اس میں ہندوستان کے نامور شیعہ علماء کی شرکت مع ان کے موضوعاتِ وعظ کا اعلان تھا۔ یہ موضوعات بھی اپنی جگہ بڑے اشتعال انگیز تھے جن کی آڑ میں اہل سنّت کے مذہب پر حملہ کے سوا اور کچھ مقصد نہ تھا۔ لہٰذا مجبور ہو کر مقامی سنّیوں کی طرف سے جناب مصطفیٰ علی سکریٹری انجمن صداقت الاسلام فیض آباد نے ''بقائے روح'' کے عنوان سے تین دن کے تبلیغی جلسوں کا اعلان کیا جو اپنی مقررہ تاریخوں میں منعقد ہوئے، پھر ایک دوسرا اشتہار بعنوان ''فیض آباد کے شیعہ صاحبان کو دعوتِ صلح'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ آج کل مجتہدین شیعہ کی بڑی تعداد فیض آباد میں موجود ہے اور ان کی تقریریں اختلافی مسائل پر ہو رہی ہیں لہٰذا اس سے زیادہ بہتر موقع اور کیا ہوگا کہ آپ اپنے مجتہدین کو ہمارے علماء کرام سے ایک فیصلہ کن علمی مباحثہ پر تیار کر کے لائیں تا کہ شیعہ سنّی اختلافات کا تصفیہ ہو جائے۔ ہماری طرف سے مندرجہ ذیل مسائل زیر بحث ہوں گے جن کا اعلان النجم لکھنؤ میں بیس بائیس سال سے مسلسل ہو رہا ہے:

مسائل مشتہرہ النجم

(۱) شیعوں کا ایمان قرآنِ مجید پر نہیں ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔
(۲) شیعوں کا ایمان آنحضرتؐ کی نبوت و رسالت پر ممکن نہیں ہے۔
(۳) مذہبِ شیعہ کی بنیاد عقیدۂ ختم نبوت کے انکار پر ہے۔
(۴) از روئے مذہبِ شیعہ یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ آنحضرتؐ نے کس دین کی تعلیم دی تھی۔
(۵) از روئے مذہبِ شیعہ یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ حضرت علیؓ اور دوسرے ائمہ کا مذہب کیا تھا۔
(۶) اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے شیعہ یہ نہیں بتا سکتے کہ آلِ رسولؐ کون لوگ ہیں۔
(۷) مذہبِ شیعہ میں اللہ تعالیٰ کو جاہل ماننا ضروری عقیدہ ہے۔ (نعوذ باللہ منہ)
(۸) جھوٹ بولنا مذہبِ شیعہ میں اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور جو شخص جھوٹ نہ بولے اس کو مذہبِ شیعہ بے دین و بے ایمان قرار دیتا ہے۔
(۹) حضرت حسینؓ کے قاتل پیشوایانِ مذہبِ شیعہ تھے جن کا شیعہ ہونا از روئے کتبِ شیعہ خدا کی طرف سے مستند ہو چکا ہے۔

مذکورہ بالا مسائل کے ساتھ شیعوں کو اس بات کی بھی منظوری اور اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ مذہبِ اہلِ سنّت پر جو بھی جارحانہ مسائل چاہیں پیش کر سکتے ہیں (شفائے روحانی، ص ۹)

اس اشتہار کے نکلنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجتہدین شیعہ مذکورہ مجالس کے اختتام سے قبل ہی فیض آباد سے رخصت ہونے لگے، ہر چند شیعانِ فیض آباد نے انھیں رکنے پر اصرار کیا مگر وہ فوراً ہی اپنے اپنے مقامات کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد شیعوں کی طرف سے ایک اور لمبا چوڑا اشتہار شائع ہوا جس میں مولانا لکھنویؒ کی شان میں بے حد گستاخیاں کی گئی تھیں اور آخر میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ ''ہمارے علماء کرام کو ایسے مہمل لوگوں کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے'' اس سے یہ صاف واضح ہو گیا کہ ان کے علماء حضرت لکھنویؒ سے مناظرہ کرنے کی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے ہیں (ص ۱۱)

علماء شیعہ کی روگردانی کے بعد ۱۶ تا ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۶ء تک محلہ سرائے چوک فیض آباد میں اہلِ سنّت و جماعت کی محافل وعظ روزانہ منعقد ہوتی رہیں، اس میں حضرت لکھنویؒ مع اپنے رفقاء مثلاً مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرزاپوریؒ مصنف تحفہ آریہ، تحریف وید، تحفۂ امامیہ، وتاریخ تعزیہ اور جناب مولانا سید حسن عسکری صاحب فتح پوریؒ مصنف ساہوکار لالٹین فیض آباد تشریف لائے۔ یہ مواعظ تین دن تک برابر ہوتے رہے۔ جن میں شیعہ بھی بکثرت شریک ہوتے تھے، ان مواعظ میں صحابۂ کرامؓ اور خصوصاً خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فضائل ومناقب قرآن مجید اور کتب معتبرۂ شیعہ سے بیان کیے گئے اور ان کے مطاعن بسلسلۂ واقعۂ قرطاس اور فدک کے بڑے شافی جواب دیئے گئے۔ مزید آں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا افضل امت ہونا اور حضرت علی مرتضیٰؓ کے متواتر ارشادات مندرجہ کتب فریقین سے اس وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے کہ اس سے پہلے کم ہی لوگوں نے انھیں سنا ہوگا۔ یہ بھی ثابت کیا گیا کہ جب تک صحابۂ کرامؓ کی عظمت وتقدس کا عقیدہ پختگی کے ساتھ دلوں میں قائم نہ ہوگا دینِ اسلام کی کوئی چیز بھی ہاتھ میں نہیں رہ سکتی، پھر اسی کے ساتھ جنگِ جمل و جنگ صفین کے صحیح واقعات بھی بیان کیے گئے، ازواجِ مطہرات کا رتبہ بھی آیاتِ قرآنیہ سے واضح کیا گیا اور مذہبِ شیعہ کی اصل حقیقت بھی اصولاً وفروعاً بیان کی گئی جس میں خاص طور سے یہ کہ ان کا ایمان قرآن مجید پر نہ ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ باوجودیکہ یہ مواعظ ایک طرح سے بحث ومناظرہ کا پہلو لیے ہوئے تھے مگر

اس قدر متانت، تہذیب اور شیریں کلامی کے ساتھ بیان کیے گئے کہ ان کے ذریعے ہر انصاف پسند انسان حق کی شناخت آسانی سے کرسکتا تھا۔ اس نیک نیتی اور پُرخلوص جذبہ کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۲۶ء سے آج تک یہ جلسے ہر سال برابر فیض آباد میں ''شفائے رُوح'' کے نام سے منعقد ہوتے چلے آرہے ہیں۔[1]

۱۶۔ سفر کاگنارہ ضلع چوبیس پرگنہ (بنگال) ۱۹۲۹ء

اُس زمانہ میں میں کاگنارہ کلکتہ کے قریب ایک صنعتی علاقہ تھا جہاں مختلف قسم کے بڑے بڑے کارخانے اور ملیں وغیرہ تھیں جن میں کام کرنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوا کرتی تھی۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعوں نے اپنا تبلیغی مشن وہاں بھی شروع کیا، چنانچہ ایک شیعہ صاحب وہاں جاکر آباد ہوگئے اور اپنے مذہب و مسلک کو مخفی رکھ کر بظاہر اپنی بے تعصّبی اور وسیع المشربی کا سہارا لے کر مسلمانوں سے خوب راہ و رسم بڑھائی اور رفتہ رفتہ سرکاری حلقوں میں بھی بہت کچھ اثر و رسوخ حاصل کرلیا۔ اس طرح گویا وہ وہاں کے تمام مسلمانوں کے لیڈر بن گئے، اس کے بعد انھوں نے غیر محسوس طریقے سے اور مخفی تدابیر کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت شروع کی۔ وقتاً فوقتاً مختلف تقریبات کے موقع پر اپنے واعظین و ذاکرین کو بلانا اور ان سے تبلیغی تقریریں کرانا ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔ رفتہ رفتہ کچھ ناواقف مسلمانوں کو بہکا کر انھوں نے اپنے مذہب میں شامل بھی کرلیا تھا۔ چونکہ بہت سے لوگوں کے دنیاوی مفادات اُن سے وابستہ ہوگئے تھے اس لیے وہ لوگ اُن سے تعلّق رکھنے پر مجبور بھی تھے۔ اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مسلمانوں کو مرتد بنانے کا فریضہ انجام دینا شروع کردیا۔ جب یہ فتنہ زیادہ بڑھا تو پھر کچھ مسلمانوں کو اس کا احساس ہوا اور انھوں نے جمادی الثانیہ ۱۳۴۸ھ میں حضرت لکھنویؒ کو ایک خط کے ذریعہ ان حالات سے مطلع کیا اور ان مفسدانہ کاموں کے توڑ کے لیے آپ کو کاگنارہ آنے کی دعوت دی۔ اس تحریک میں کاگنارہ کے مولوی محمد یعقوب صاحبؒ اور مولوی حکیم فرزند احمد صاحبؒ زیادہ پیش پیش تھے۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ ان کی مطلوبہ تاریخوں پر کاگنارہ پہنچے۔ اس موقع پر وہ مسلمان نما شیعہ لیڈر سامنے نہیں آئے اور نہ ہی ان کے کسی مولوی

---

[1] شفائے رُوحانی، مرتبہ الحاج شاہ محمد شفیع صاحب کچھوچھویؒ برادر خورد حضرت سجادہ نشینؒ درگاہ کچھوچھہ ضلع فیض آباد ملخصاً

نے سامنے آ کر گفتگو کرنے کی ہمت کی بلکہ یہ سب کے سب روپوش ہو گئے۔ لہٰذا مولانا نے کاگناره میں دو تقریریں کیں جو دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹہ تک چلتی رہیں۔ انہی دو تقریروں نے کاگناره کی کایا پلٹ کر دی، وہاں کے مسلمانوں میں ایک دینی بیداری پیدا ہو گئی اور ان کو مذہب شیعہ کی اصل حقیقت سے واقفیت حاصل ہوئی جس کے بارے میں ان کو اب تک کچھ معلوم نہ تھا۔ اس موقع پر کاگناره کے شیعوں نے کلکتہ سے ایک مولوی کو جو مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے فرستادہ تھے بلا لیا تھا اور مولانا کے جلسے میں ان کو مخفی طور پر شریک کیا اور اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مولانا سے سوالات کریں۔ مگر انھوں نے سامنے آ کر سوال کرنے کی ہمت نہ کی حالانکہ ہر تقریر کے شروع میں یہ اعلان کر دیا جاتا تھا کہ اگر کسی کو کچھ دریافت کرنا ہو یا کچھ وضاحت چاہنا ہو تو تقریر کے بعد ایسا کر سکتا ہے مگر صدائے برنہ خاست۔

اس سفر میں کاگناره کے علاوہ کلکتہ میں بھی زکریا مسجد، کمک اسٹریٹ اور مٹیا برج وغیرہ میں آپ کی کئی تقریریں ہوئیں۔ وہاں سے واپسی میں اثناء راہ مدھوپور ضلع دمکا میں بھی ایک روز قیام ہوا اور دو تقریریں وہاں بھی ہوئیں۔ ان تمام تقریروں میں زیادہ تر اتباعِ شریعت، پابندیٔ نماز اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب قرآن مجید سے بیان کیے گئے۔ مولانا کے اس سفر سے کاگناره کے آس پاس کے علاقے شیعی اثرات سے فی الحال محفوظ ہو گئے تھے اور پھر ایک عرصۂ دراز تک وہاں سے کسی قسم کی شکایات موصول نہیں ہوئیں [1]

۱۷۔ سفر الگون تحصیل قصور (ضلع لاہور) ۱۹۲۹ء

کچھ دنوں سے قصبہ الگون میں بھی شیعوں کی تبلیغی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں جس کے نتیجہ میں وہاں کے ایک سنّی نمبردار کو شیعہ بنا لیا گیا تھا اور پھر اس نمبردار نے اپنے اثرات کو کام میں لا کر دوسرے سنّیوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا، ان حالات میں لوگوں کو صورت حال کا احساس ہوا۔ اس وقت فریق مخالفت کے حوصلے بہت بلند تھے اس لیے انھوں نے ہی سب سے پہلے سنّیوں کو مناظرہ کا چیلنج دے دیا اور مطالبہ کیا کہ حضرات خلفاء ثلاثہؓ کا مومن ہونا ثابت کرو، سنّیوں نے ان کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے کہا کہ تم کو بھی اپنا مومن ہونا ثابت کرنا پڑے گا۔ اس طرح یہ مناظرہ

---

[1] انجم، رجب ۱۳۴۸ھ

فریقین کی متفقہ رائے سے طے ہو گیا۔

قصور ضلع لاہور کے سنّی معززین کی طرف سے مولانا لکھنویؒ کو وہاں آنے اور مناظرہ کرنے کی دعوت مل رہی تھی جس کو انھوں نے منظور کرتے ہوئے اطلاع بھیج دی کہ یہ موضوع بحث مجھے خوشی سے منظور ہے مگر شرط یہ ہے کہ شیعوں کی طرف سے کوئی بڑا مجتہد مناظرہ میں آئے، اگر یہ شرط شیعہ منظور کرلیں تو میں انشاء اللہ ضرور آؤں گا اور خود مناظر بنوں گا۔ سنّیوں کی طرف سے مناظرہ کا اعلان تو کر دیا گیا مگر شیعوں نے باوجود اصرار کے اپنے مناظر کا نام ظاہر نہ کیا۔

اتفاق سے انہی دنوں مولانا کو پنجاب کا سفر پیش آ گیا، اس سفر میں بھی قصور کے حضرات نے برابر رابطہ قائم رکھا چنانچہ گوجرانوالہ میں آپ کو اطلاع دی گئی کہ اس مناظرہ میں شیعوں کے بڑے نامی گرامی مجتہدین آ رہے ہیں جن میں ان کے شمس العلماء مولوی سبط حسن مجتہد لکھنؤ، علّامہ سید علی الحائری مجتہد لاہور، شمس العلماء مولوی نجم الحسن مجتہد لکھنؤ اور مولوی مرزا احمد علی امرتسری وغیرہ کے نام قابلِ ذکر تھے۔ مولانا نے اس کے جواب میں فوراً لکھا کہ مجھے کسی طرح یقین نہیں ہوتا کہ جن مجتہدین کے نام آپ لوگوں نے لکھے ہیں وہ مناظرہ میں آنے کی ہمّت کریں گے لیکن اب میں اپنے آنے کا قطعی وعدہ کرتا ہوں اور انشاء اللہ ۱۳/اگست ۱۹۲۹ء کو میں لاہور پہنچ جاؤں گا، آپ حضرات وہاں آ کر مجھ سے مل لیں۔ اس مناظرہ کا پورے پنجاب میں بڑا چرچا تھا، اس دور کے اخباروں نے اس کی رپورٹنگ بھی کی تھی۔

درحقیقت شیعوں کی جانب سے ان کے مناظر مرزا احمد علی امرتسری مقرر ہوئے تھے، وہ مولانا لکھنویؒ سے مناظرہ مکیریان ضلع ہوشیار پور میں اور بعض دوسرے مناظروں میں بھی شرمناک شکست اٹھا چکے تھے۔ اس لیے جب انھوں نے سُنا کہ مولانا لکھنویؒ اس مناظرہ میں بھی تشریف لا رہے ہیں تو انھوں نے ہمّت ہار دی اور مناظرہ سے انکار کر دیا۔ مولانا لکھنویؒ کے علاوہ سنّیوں کی طرف سے مولانا کرم الدین دبیرؒ رئیس بھیں تحصیل چکوال ضلع جہلم، مولانا نظام الدین صاحبؒ وزیر آبادی اور مولانا محمد مسعود صاحبؒ سکنہ الہڑ ضلع سیالکوٹ بھی مناظر بنائے گئے تھے۔ یہ حضرات تو قصور پہنچ بھی چکے تھے اور مولانا لکھنویؒ بھی لاہور میں رونق افروز ہو چکے تھے، وہیں اطلاع ملی کہ شیعوں کی کوششوں سے یہ مناظرہ ملتوی ہو گیا ہے۔

اصل معاملہ یہ تھا کہ جب شیعوں کے مولوی مرزا احمد علی امرتسری نے مناظرہ میں آنے سے

انکار کردیا تو ان کے فرقہ کو بڑی مایوسی ہوئی، مجبور ہوکر شیعوں نے مقامی انتظامیہ کو درخواست دے دی۔ کہ مناظرہ فوراً رکوایا جائے ورنہ ہم سب لوگ قتل کردیئے جائیں گے۔اس طرح مناظرہ رکوادیا گیا۔مناظرہ تو ملتوی ہوگیا مگر مقامی علماء نے مسجد حاجی رانجھے خاں صاحب قصور میں اپنے مواعظ کے ذریعہ شیعیت کی اصل حقیقت سے سنیوں کو اچھی طرح آگاہ کیا جس سے وہاں کی دینی فضا میں بہت خوشگوار تبدیلیاں آئیں اور لوگ اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم ہوگئے[1]

۱۸۔ سفر مہت پور ضلع جالندھر (پنجاب) ۱۹۲۹ء

مہت پور ضلع جالندھر کے شیعوں نے اپنے مولویوں کے بہکانے میں آکر اکثر مسلمانوں سے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ تم لوگ اپنے تینوں خلفاء کا ایمان ثابت نہیں کرسکتے، روز روز کے ان طعنوں کو سن کر وہاں کے مسلمانوں میں سخت اضطراب پیدا ہوگیا اور اُن میں سے چند پُرجوش لوگوں نے اس چیلنج کو منظور کرلیا اور شیعوں کی ساری شرطوں کو مان کر باضابطہ متفقہ طور سے تحریری اسٹامپ تیار کرلیا گیا۔اس مناظرہ کی شرطیں یکطرفہ تھیں یعنی یہ کہ صرف مسلمانوں کو ہی اپنے خلفاء راشدینؓ کے مومن کامل ہونے کا ثبوت دینا تھا اور شیعوں کو اپنے مذہب کے بارے میں کچھ نہیں کہنا تھا۔مناظرہ کے انعقاد کے لیے سرکاری منظوری بھی حاصل کرلی گئی، تاریخ مناظرہ ۱۶/اکتوبر ۱۹۲۹ء بھی متفقہ طور پر طے کرلی گئی۔حضرت مولانا لکھنویؒ کو اس مناظرہ میں شریک کرنے کے لیے ایک آدمی خاص طور سے لکھنؤ روانہ کیا گیا چنانچہ سارے حالات جاننے کے بعد آپ نے اپنی منظوری دے دی۔فریقین کی طرف سے مناظرہ کے سلسلہ میں اشتہارات بھی سارے علاقہ میں چسپاں کردیئے گئے تھے۔

مولانا لکھنویؒ تاریخ مقررہ سے ایک دن پہلے مولانا محمد نعیم لدھیانویؒ اور مولانا رحمت علیؒ لدھیانوی کو اپنے ساتھ لے کر مہت پور آگئے۔دوسری طرف سے مولوی مرزا احمد علی امرتسری مع اپنے دوسرے مولویوں کے وہاں پہنچ گئے لیکن جب وہاں پہنچ کر مرزا امرتسری کو یہ معلوم ہوا کہ مولانا لکھنویؒ بھی یہاں پہنچ چکے ہیں تو ان کے ہوش وحواس غائب ہوگئے اور اب وہ بجائے مناظرہ کرنے کے وہاں سے فرار اور مناظرہ کے التواء کی کوشش کرنے لگے، اس کی وجہ یہی تھی کہ

---

[1] النجم لکھنؤ، ۷/۲۱ ربیع الاوّل ۱۳۴۸ھ، روزنامہ سیاست لاہور، ۳۱/جولائی ۱۹۲۹ء

اس موضوع پر مولانا لکھنویؒ سے ان کا مناظرہ مکیریان ضلع ہوشیار پور میں ہو چکا تھا جس میں انھیں انتہائی ذلّت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا، وہ سارا نقشہ ان کی آنکھوں میں پھر گیا ہوگا لہٰذا وہ اپنی دسیسہ کاریوں میں مصروف ہو گئے اور کوششیں شروع ہو گئیں کہ کسی طرح سرکاری طور پر مناظرہ کی ممانعت ہو جائے جس میں انھیں کامیابی بھی حاصل ہوئی اور مناظرہ کی ممانعت کا اعلان بھی آ گیا۔ جب انھیں مقامی غیر مسلم حضرات نے شرمندہ کرنا شروع کیا تو پھر بادلِ ناخواستہ وہ مناظرہ پر آمادہ ہوئے اور ایک مرتد عیسائی کو ثالث بنانے پر اصرار کرنے لگے، جب اس کو بھی منظور کر لیا گیا تو مقام مناظرہ پر اختلاف کرنا شروع کر دیا چنانچہ مقامی غیر مسلم حضرات میں جناب اندر سنگھ ٹیچر نکودر ہائی اسکول اور لالہ فتح چند ولد گھسیٹا رام، و لالہ رام لعل ولد لالہ رلّہ رام ساکنان مہت پور نے مناظرہ کے لیے ایک دوسری جگہ کا بندوبست کر دیا مگر مرزا صاحب کو تو مناظرہ کرنا ہی نہیں تھا انھیں تو مکیریان کا مناظرہ یاد تھا لہٰذا وہ کسی طرح نہ مانے اور مع اپنے دوسرے ساتھیوں کے موٹر پر بیٹھ کر مہت پور سے روانہ ہو گئے۔ علماءِ حق وہاں پورے ایک دن اور ایک رات تک مقیم رہے اور بستی کے مختلف مقامات پر ان کے وعظ ہوتے رہے اس طرح لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ حق پر کون ہے۔[1]

۱۹۔ مناظرہ منٹگمری (موجودہ ساہیوال، پنجاب) ۱۹۳۰ء

یہ مناظرہ ۲۶/۱ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو منٹگمری میں شیعہ عالم مولوی مرزا احمد علی امرتسری سے ہوا تھا اس میں بھی شیعوں کی طرف سے ایمانِ شیخینؓ اور ان کی حقیتِ خلافت ثابت کرنے کا مطالبہ رکھا گیا تھا۔ ان کے اس مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے سنّیوں کی طرف سے بھی دو مسئلے پیش کیے گئے تھے اوّل یہ کہ کیا مخالفین اہل سنّت کا ایمان قرآن مجید پر ہے اور یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور ختم نبوت پر ان کا ایمان نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے، دوم یہ کہ کیا از روئے مذہب مخالف حضرت علیؓ اور دوسرے ائمہ کا کوئی مذہب متعین ہو سکتا ہے؟ قبل اس کے کہ ان دو سوالات کے بارے میں کوئی جواب آتا مسلمانوں کے جلسہ گاہ میں جہاں مولانا لکھنویؒ تشریف فرما تھے مخالفین اہلِ سنّت اپنے ساتھ ایک جم غفیر لے کر پہنچ گئے اور شور و غل کرنے لگے جس کا مقصد یہ تھا کہ اہلِ

---

[1] النجم لکھنؤ، ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ

سنّت، بھی مشتعل ہو کر آمادۂ فساد ہو جائیں اور پھر نقضِ امن کا بہانہ بنا کر انتظامیہ کو مداخلت کرنے کا موقع دے دیا جائے تا کہ مناظرہ پر پابندی عائد ہو جائے مگر اہلِ سنّت کو سمجھا بجھا کر خاموش رکھا گیا جس کے نتیجہ میں بالآخر مناظرہ کا انعقاد عمل میں آ گیا۔

مخالفین کی طرف سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ مناظرہ کا حَکم (جج) کسی غیر مسلم کو بنایا جائے چنانچہ باتفاق فریقین منشی فتح چند ایڈووکیٹ کا نام منظور کیا گیا، بعد میں فریق ثانی نے ایک اور حکم کے نام کو مزید بڑھانے کی فرمائش کی لہٰذا یہ بھی قبول کر کے پنڈت دولت رام ایڈووکیٹ کے نام کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔

بہر حال مناظرہ شروع ہوا اور ہر فریق کو دس دس منٹ تقریر کے لیے دیئے گئے۔ اس مناظرہ میں آیاتِ قرآنیہ سے حضرات خلفاء ثلاثہؓ کے مومن کامل اور خلیفۂ برحق ہونے کا ثبوت اس وضاحت سے دیا گیا کہ اگر اس کے باوجود کوئی شخص ان کے ایمان یا خلافت کا انکار کرے تو سوا اس کے کہ وہ ان آیات کی تکذیب کرے اور کوئی دوسرا طریقۂ کار نہیں ہو سکتا چنانچہ مولانا لکھنویؒ نے فرمایا کہ میں ایمان شیخین اور ان کی خلافت کے برحق ہونے کی ایک ایسی دلیل پیش کرتا ہوں جس پر بارہا علماء شیعہ کو غور و خوض کرنے کا موقع مل چکا ہے، یہ کہہ کر آپ نے آیتِ استخلاف یعنی وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ...... هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. (سورہ نور: ۵۵) پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا استدلال اس آیت سے دو باتوں پر مبنی ہے اوّل یہ کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے مومنین صالحین کو تین نعمتیں دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ تینوں وعدے اُن مومنینِ صالحین کے ساتھ مخصوص ہیں جو اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے جس کی دلیل لفظ مِنْكُمْ ہے جو حاضر کی ضمیر ہے اور از روئے لغت و اصول حاضر کی ضمیر حاضر ہی کے لیے مخصوص ہوتی ہے البتہ ان آیات احکام میں بعض اوقات حاضر کے ساتھ غائب بھی کچھ خارجی دلائل کی وجہ سے شامل کر لیے جاتے ہیں اس لیے اگر یہ تخصیص نہ ہو تو لفظ مِنْكُمْ بیکار محض متصور ہو گی۔ اور دوم یہ کہ اس وقت کے موجودہ کلمہ گویانِ اسلام میں صرف چار شخصوں کو خلافت ملی یعنی حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو۔ حضرت علیؓ کے متعلق شیعہ سنّی دونوں کا اتفاق ہے کہ ان کو یہ تینوں موعودہ نعمتیں نہیں ملیں چنانچہ شیعوں کے نزدیک انھیں تمکینِ دین نہیں ملی اور تبدیلِ خوف کی نعمت بھی انھیں حاصل نہ ہو سکی البتہ انھیں صرف خلافت ملی تھی وہ بھی برائے نام، لہٰذا حضرت علیؓ کسی طرح اس کے موعود لہٗ نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک پہلے تین خلفاء کا تعلق ہے ان

کو خلافت ملنا بھی ظاہر ہے، تبدیل خوف کی نعمت بھی انہیں حاصل ہوئی، تمام عرب، ایران، روم اور شام سب ان کے قبضہ میں تھا اور ان کو تمکین دین بھی حاصل تھی لہٰذا ثابت ہو گیا کہ وہ تینوں مومن صالح تھے اور ان کی خلافت اس آیت کی موعودہ خلافت تھی اس لیے اگر ان کو مومن نہ مانا جائے یا ان کی خلافت کو موعودہ خلافت نہ مانا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاذ اللہ اس آیت کا وعدہ پورا نہ ہوا اور نعوذ باللہ کلام الٰہی غلط ہو گیا۔ (ص ۹-۱۰) اس آیت کے علاوہ آپ نے بعض دوسری آیات، مختلف کتب شیعہ کی عبارتیں اور عقلی دلیلیں بھی اس سلسلہ میں پیش کیں لیکن شیعہ مناظر نے نہ تو ان قرآنی آیات کا کوئی جواب دیا اور نہ ہی اپنی کتابوں کی عبارات اور عقلی دلائل کا کوئی جواب دیا۔ اوّل سے آخر تک فریق مخالف کی تمام تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ آیاتِ قرآنیہ کے صادق ہونے یا نہ ہونے کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں اور جو بھی قرآنی وعدے اس سلسلے میں کیے گئے ہیں وہ ہمارے عقیدہ کے مطابق اب تک پورے نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اپنی ہر تقریر میں روایات پر زور دیتے رہے اور ان روایات کے حوالوں میں بھی جو خیانتیں کرتے رہے اور مختلف عبارتیں توڑ موڑ کے پیش کرتے رہے مناظرہ گاہ میں اس کا پردہ فاش ہو گیا اور دیکھنے والوں نے اچھی طرح دیکھ لیا اور یہ بات سب پر ظاہر ہو گئی کہ فریق مخالف کو قرآن مجید سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کے مذہب کی بنیاد صرف روایات پر ہے اور روایات بھی ان کے یہاں وہی قبول کی جاتی ہیں جو قرآن کے خلاف ہوں، قرآنی استدلال کے سامنے وہ ہمیشہ اپنی روایات کو ڈھال بناتے ہیں، گویا قرآن کو ان روایات سے رد کرنا چاہتے ہیں حالانکہ روایات صرف اعمال کے لیے ہیں عقائد کی کوئی چیز ان سے ثابت نہیں ہو سکتی لہٰذا صحیح اور قطعی فیصلہ کی صورت صرف یہی ہے کہ استدلال قرآن مجید سے کیا جائے اور اگر آیت قرآنی کی توضیح کے لیے کسی روایت کے ملانے کی ضرورت ہو تو وہ روایت متواتر ہونا چاہیے یا فریقین کے درمیان مسلّم ہونا چاہیے چنانچہ مناظر اہل سنت نے اسی اصول کے مطابق کام کیا اور آیتِ استخلاف سے حضرات خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ایمان و خلافت پر استدلال کیا۔

اس طرح مناظرہ گاہ میں سارے مجمع نے جان لیا کہ فریق مخالف کے ان اعتراضات کی نوعیت کیا تھی اور ان کے کتنے مدلل جواب دیئے گئے تھے۔ جب مناظرہ کا وقت ختم ہو گیا تو ثالث صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ اب میں مناظرہ ختم کرتا ہوں کیونکہ اصل مبحث پر کافی روشنی پڑ چکی ہے، اگر آپ چاہیں تو میں اپنا فیصلہ اسی وقت سنا سکتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ

میرے فیصلہ سے نہ کوئی شیعہ سنّی ہوجائے گا اور نہ ہی کوئی سنّی شیعہ مذہب اختیار کرے گا بلکہ فریقین کے تعلّقات اور زیادہ خراب ہوجائیں گے اس لیے میں اپنا فیصلہ اس وقت محفوظ رکھتا ہوں۔ سنّیوں کی طرف سے فیصلہ سنانے پر ثالث صاحب کو مجبور نہیں کیا گیا کیونکہ مقصد حاصل ہوچکا تھا اور تمام مجمع نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔ اس طرح اس مناظرہ میں فریق ثانی کو جو انتہائی شرمناک شکست اٹھانی پڑی اس کا بہت عرصہ تک چرچا ہوتا رہا[1]

مذکورہ مناظروں کے علاوہ النجم میں دو مناظروں کے نام اور بھی نظر سے گذرے ہیں جیسے (۲۰) مناظرہ تلہ گنگ ضلع کیمبل پور اور (۲۱) مناظرہ کندیان وغیرہ مگر ان کی تفصیلات کچھ نہیں مل سکیں، ممکن ہے کہ ان کی رودادیں کبھی شائع ہوئی ہوں مگر اب نایاب ہوچکی ہیں[2]

رضا خانیوں سے مناظرے

قبل اس کے کہ رضا خانی علماء سے ہونے والے مناظروں کا تذکرہ کیا جائے ایک اہم فتوے کا تعارف کرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کا حوالہ اکثر مناظروں میں آیا ہے بلکہ ایک یا دو مناظرے اسی کی بنیاد پر ہوئے ہیں، اس طرح ان مناظروں کے پس منظر کو سمجھنا آسان ہوجائے گا یہ فتویٰ حسب ذیل ہے:

فتویٰ وہابیت وغیر مقلّدیت

۱۹۱۶ء میں بمبئی میں ملا محمد باقر فیض آبادی شیعی سے مولانا لکھنویؒ کا مناظرہ ہوا تھا جس میں ملا صاحب کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس موقع پر بمبئی میں مولانا کا قیام ایک ماہ سے بھی زیادہ رہا تھا اور روزانہ وہاں ان کے وعظ ہوا کرتے تھے جس سے عوام میں بہت بیداری پیدا ہوگئی تھی۔ اس شکست سے شیعوں کے ساتھ ساتھ رضا خانیوں (بریلوی مسلک کے ماننے والوں) میں بھی سراسیمگی پھیل گئی تھی کیونکہ اس سے ان کی تبلیغی سرگرمیوں پر بھی اثر پڑا تھا اور مقامی سیٹھوں کے ذریعہ ملنے والے نذرانوں کو بھی خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ بمبئی کے شیعہ ہمہ وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ کس طرح مولانا لکھنویؒ سے اپنی اس ذلت ورسوائی کا انتقام لیا جائے چنانچہ انھوں نے بمبئی کے بعض رضا خانی علماء اور واعظین کو آلہ کار بنا کر مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی (م ۱۹۲۱ء) کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مولانا لکھنویؒ کے خلاف کوئی فتویٰ لگائیں۔ اس

---

[1] روداد مباحثہ منٹگمری ملخصاً [2] النجم لکھنؤ، شوال/ذیقعدہ ۱۳۴۲ھ

فتویٰ کے حصول میں اُس وقت کے مشہور رضا خانی واعظ مولوی ابو محمد سیّد دیدار علی شاہ الوری (م ۱۹۳۰ء) نے جو اس وقت بمبئی میں مقیم تھے، خاص رول ادا کیا تھا، اس زمانہ میں وہ آگرہ کی جامع مسجد میں ملازم تھے، وہاں سے علیحدہ ہوئے پھر لاہور کی مسجد وزیر خان میں آ کر نوکر ہوئے اور وہاں بھی ایک فتنۂ عظیم برپا کیا جس پر مقدمہ بازی تک کی نوبت آ پہنچی تھی، مولوی دیدار علی شاہ کے ساتھ بمبئی کے رضا خانیوں کے بعض دوسرے سرکردہ حضرات مثلاً مولوی نذیر احمد خجندی (م ۱۹۳۶ء) مولوی شاہ عبدالعلیم میرٹھی (م ۱۹۳۸ء) وغیرہ نے بھی اس کارِ خیر میں بڑا حصّہ لیا تھا۔ چنانچہ مولوی احمد رضا خاں صاحب نے مولانا لکھنویؒ کی کتاب ''علم الفقہ'' جلد دوم سے اقتدا بالمخالف کے مسئلہ سے متعلق مندرجہ ذیل عبارت کو لے کر ان کے خلاف ''وہابی اور غیر مقلّد'' ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ ''علم الفقہ کی مذکورہ عبارت یہ ہے:

''اگر امام اور مقتدی کا مذہب (فقہی مسلک) ایک نہ ہو مثلاً امام، شافعی یا مالکی مذہب ہو اور مقتدی حنفی مذہب ہو تو اس صورت میں امام کی نماز کا صرف اس کے مذہب کے موافق صحیح ہو جانا کافی ہے خواہ یہ مقتدی کے مذہب کے موافق صحیح ہو یا نہ ہو، ہر حال میں بلا کراہت یہ اقتدا درست ہے[1]''

یہ مسئلہ لکھ کر مولانا لکھنویؒ نے حاشیہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ علماء مذاہب اربعہ کی مختلف توجیہات بھی تحریر کی ہیں اور ان میں سے اس رائے کو ترجیح دی ہے کہ کسی ایک مذہب کے امام کے پیچھے بقیہ (چاروں) مذاہب کے لوگوں کا نماز پڑھنا جائز ہے خواہ امام (اپنے) مقتدی کے مذہب کی رعایت کرے یا نہیں۔

سب سے پہلے بمبئی میں اس فتوے کو حافظ عبدالمجید نامی ایک شخص کی طرف سے ''اشتہار واجب الاظہار'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ حافظ عبدالمجید نامی یہ شخص ایک اُردو خواں اور گم نام آدمی تھا جو ماہم کی ایک مسجد میں امام تھا جس کو علم اور تفقہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اس فتوے کی اشاعت اور اس کی تشہیر میں شیعوں نے بڑا حصّہ لیا تھا اور ہمارے ان گندم نما جو فروش بھائیوں نے خوب خوب بغلیں بجائیں۔ فتوے کی عبارت کو مختلف شہروں میں مختلف انداز سے شائع کیا جاتا تھا اور بعض مقامات پر تو فتویٰ کفر کے نام سے بھی شائع کیا گیا تھا۔ درحقیقت حافظ عبدالمجید کے پردے میں وہی مولوی نذیر احمد خجندی اور مولوی شاہ عبدالعلیم میرٹھی وغیرہ ہی تھے جو مولانا

---

[1] علم الفقہ، جلد دوم، ص ۹۱

لکھنویؒ کی دینی حیثیت کو بزعم خود مجروح کرنے کی کوشش کرتے تھے اور یہی حرکت شیعہ بھی کرتے تھے اور جب کبھی مولانا سے انھیں مناظرہ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا تو وہ فوراً کچھ سنّیوں اور کچھ شیعوں کے نام سے اس اشتہار کے مضمون کو وقت اور حالات کی روشنی میں مرتب کرکے شائع کردیا کرتے تھے۔

دراصل خان صاحب بریلوی نے اپنی افتادِ طبع، شہرت اور نام ونمود کے شوق میں یہ روش اپنائی تھی کہ اُس وقت کے نامور اور مقبول ومعروف علماء اور رہنمایانِ قوم وملّت کے خلاف کفر کے فتوے صادر فرمایا کرتے تھے۔ ان کی اس کفرساز روش سے نہ جانے کتنے مُتدیّن علماء وبزرگ اور اکابر ملک وملّت نشانہ بن چکے تھے، چنانچہ مولانا لکھنویؒ بھی ان کے اس شوق کا شکار ہوئے مگر خیریت یہ ہوئی کہ انھوں نے ان پر کفر کا فتویٰ نہ لگا کر صرف ''وہابیت اور غیر مقلّدیت'' کا ہی فتویٰ صادر کیا تھا۔ خان صاحب کی عادت اور جبلّت کے باعث یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ انھوں نے مولانا کے استاذِ محترم حضرت مولانا سید عین القضاہ صاحب قدس سرہٗ کے خلاف بھی پوری ایک کتاب تصنیف کرڈالی تھی جس کا نام ''میل الهداة الكامل لعين القضاة الباطل'' رکھا تھا۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ کی شان میں بھی آپ نے بڑی گستاخیاں کی تھیں اور ان کی وفات کے بعد ان کے رد میں بھی ایک رسالہ لکھ ڈالا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ جسارت بھی خان صاحب نے کی تھی کہ امام ربّانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی شانِ اقدس میں ناپاک حملے کیے اور اپنے ایک رسالہ ''الیاقوت الواسطۃ'' میں ان کو ''وہابیوں کا آقا، پیشوا اور خداوندِ دولت'' کے الفاظ سے نوازا تھا۔ مولانا لکھنویؒ کے ہم درس اور مشہور عالم وبزرگ حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلیؒ (م ۱۹۲۵ء) پر تو آپ نے اکیسو ایک کفر کا فتویٰ لگایا تھا اور پوری ایک کتاب ان کے خلاف مرتب کرکے شائع کردی تھی جس کا نام ''الطّاری الدّاری لهفوات عبدالباری'' تھا۔ خاندانِ ولی اللّٰہی، علماء دیوبند اور اکابر ندوۃ العلماء تو ان کے خاص نشانہ تھے اور ان حضرات کے خلاف ان کے فتوے بہت مشہور ومعروف ہیں۔ ہندوستان کی تحریکِ خلافت کے بھی آپ سخت مخالف تھے اور رہنمایانِ خلافت کو آپ ''فرقہ گاندھویہ'' لکھا کرتے تھے۔ ان سب کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزادؒ، ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا محمد علیؒ حتیٰ کہ خود اُن کے قدیم محسن یعنی علماء بدایوں بھی ان کی تکفیر سے بچ نہ سکے تھے۔ غرضکہ خان صاحب موصوف کی ساری عمر علماء حق اور اکابرِ ہند کی شان میں

گستاخیاں کرتے اوران کے خلاف کفر کے فتوے دینے ہی میں گذری ہے۔

خان صاحب نے مولانا لکھنویؒ کے خلاف صرف ''وہابیت اور غیر مقلدیت'' کا فتویٰ اقتدا بالمخالف کے مسئلہ کے جواز کے خلاف دیا تھا جو اُن کا ایک طبع زاد اور فقہ حنفی کے بالکل خلاف فتویٰ تھا۔ اُسی زمانہ میں اِس فتوے کی تردید میں اشتہارات، کتابچے اور مضامین شائع کیے گئے تھے اور مزید برآں غیر منقسم ہندوستان کے تقریباً دس ہزار علماء کرام ومشائخ عظام کے فتاویٰ اور فقہی آراء مولانا لکھنویؒ کی تائید میں شائع کی گئی تھیں۔ ان فتووں میں ان علماء نے مولانا علیہ الرحمۃ کے تدیّن اور تبحرِ علمی کا اعتراف کرتے ہوئے ان پر اپنے اعتماد اور بھروسہ کا اظہار کیا تھا اور اقتدا بالمخالف والے مسئلہ کو صحیح اور فقہ حنفی کے عین مطابق قرار دیا تھا۔

جن حضرات نے یہ تحریری فتوے بھیجے تھے ان میں سے چند کے اسماء گرامی یہ تھے: مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ قاضی بھوپال، مولانا سید شاہ وجیہہ الدین اشرفؒ سجادہ نشیں درگاہ کچھوچھہ شریف، مولوی سید محمد شفیع کچھوچھویؒ، برادر گرامی حضرت سجادہ نشین کچھوچھہ، مولانا سید شاہ وارث حسن صاحبؒ کوڑہ جہان آبادی چشتی قادری نقشبندی، ٹیلہ شاہ پیر محمدؒ لکھنو، مولانا محمد سجاد صاحبؒ نائب امیر شریعت بہار، مولوی حکیم شاہ نعمت اللہ فاروقیؒ، سجادہ نشین درگاہ شاہ محب اللہ الٰہ آبادیؒ، مولانا شاہ ولایت حسین صاحبؒ، خلف ارشد مولانا شاہ محمد حسین صاحبؒ الٰہ آبادی، مولانا حکیم شاہ نعمت اللہ فاروقی مانکپوریؒ، مولانا شاہ غنیمت حسین صاحب اشرفی مونگیریؒ، علماء دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ عثمانی، حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ، حضرت مولانا اختر حسین صاحبؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مولانا سیّد مرتضیٰ حسن صاحبؒ چاندپور، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحبؒ دہلوی، علماء فرنگی محل میں شمس العلماء، مولانا عبدالحمید صاحب فرنگی محلیؒ، مولانا محمد ایوب صاحب فرنگی محلیؒ، مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب فرنگی محلیؒ اور مولانا سیّد علی زینبیؒ استاذ ندوۃ العلماء لکھنو ولکھنو یونیورسٹی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین[1]

ا۔ مناظرہ سلطانپور (یوپی) ۱۹۱۸ء

۱۹۱۸ء میں مولانا لکھنویؒ سے ایک مناظرہ علم غیب کے مسئلہ پر سلطانپور یوپی میں ہوا تھا

---

[1] علماء کی رائیں، مرتبہ مولانا مشتاق احمد لدھیانوی

جس میں عقیدۂ علم غیب جمیع ماکان و مایکون کی تردید میں قرآن مجید کی بیس آیات، دس احادیث رسولؐ اور تین کتب فقہ حنفی کی عبارتیں پیش کی گئی تھیں جن کا کوئی جواب فریقِ مخالف سے نہیں دیا جاسکا اور اس نے درمیان ہی میں مناظرہ منقطع کردیا۔ یہ مناظرہ پانچ چھ دن تک جاری رہا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ فریق مخالف کا عالم کون تھا۔ اس کی روداد اسی زمانہ میں ''مباحثہ سلطانپور'' کے نام سے شائع ہوگئی تھی[1] مگر اب وہ نایاب ہوچکی ہے اور ہمیں اس کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوسکا ہے۔

۲۔ مناظرہ کچھوچھہ (یوپی) ۱۹۲۰ء

اس مناظرہ کا سبب یہ ہوا تھا کہ مولوی سید شاہ علی حسین کچھوچھوی[2] اور ان کے لڑکے مولوی سید شاہ احمد اشرف کچھوچھوی نے ایک زمانہ میں بھاگلپور اور اس کے اطراف میں بہت آمد و رفت بڑھا رکھی تھی اور وہاں کے غریب اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں کو اپنے حلقۂ اثر میں لانے کے لیے طرح طرح کے حربے کام میں لا رہے تھے۔ شاہ علی حسین درگاہ عالیہ کچھوچھہ ضلع فیض آباد (موجودہ ضلع امبیڈکر نگر) یوپی کی سجادہ نشینی کے خواہش مند تھے، اس سلسلہ میں آپ نے مدتوں مقدمے بازی کی اور حکام ضلع کو ورغلانے کی بھی بے حد کوشش کی مگر اس میں ناکام رہے۔ اُس وقت وہاں کے سجادہ نشیں حضرت مولانا سید شاہ وجیہ الدین اشرف صاحب کچھوچھویؒ تھے جو ایک متدین عالم اور حق نواز بزرگ تھے۔

شاہ علی حسین اور ان کے بیٹے شاہ احمد اشرف کی عادت یہ تھی کہ یہ حضرات جہاں بھی جاتے قوالی اور گانا بجانا ساتھ میں ہوتا تاکہ عوام کو متوجہ اور گرویدہ بنایا جاسکے اور جہاں موقع دیکھتے وہاں کے

۱؎ النجم، لکھنؤ، ذیقعدہ ۱۳۳۷ھ

۲؎ شاہ علی حسین کی ولادت ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۶۶ھ کو کچھوچھہ میں ہوئی۔ مقامی علماء سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے بڑے بھائی شاہ اشرف حسین سے مرید ہوکر تکمیل سلوک کی، متعدد بار سفر حج کیا، حضرت میاں راج شاہ میواتیؒ (م ۱۳۰۶ھ) نے بھی آپ کو قادریہ اور زاہدیہ سلسلہ کی اجازت دی تھی۔ شاہ محمد امیر کابلیؒ، شاہ آل رسول مارہرویؒ، حافظ احمد حسین خاں شاہجہانپوریؒ اور شاہ خلیل احمد صفی پوریؒ نے بھی اپنے سلسلوں کی اجازت آپ کو دی تھی۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی چنانچہ ''تحائف اشرفی'' کے نام سے آپ کا ایک مجموعہ کلام بھی شائع ہوا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں کچھوچھہ میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

لوگوں کو اوامر و نواہی شرعیہ سے سبکدوش کر دیتے تھے اور اسی طرح سود و رشوت کو بھی مختلف حیلوں سے حلال کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار بہرائچ میں شاہ احمد اشرف نے یہاں تک کہہ دیا:

''عشق رسول نجات کے لیے کافی ہے۔ چاہے نماز کی پابندی ہو یا نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک عاشق کے لیے تین وقت کی نمازیں معاف کر دی تھیں[1]۔''

ان باتوں کے نتیجہ میں نماز کا جو ولولہ اور شوق مسلمانوں کے دلوں میں تھا وہ کم ہو گیا۔ موضع فتح پور بھاگلپور میں ان حضرات نے لوگوں کو جو عقائد کی تعلیم دی اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے متعلق جو گل فشانیاں فرمائی تھیں ان کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے:

''نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ علماء کے ڈھکوسلے ہیں، ایسے لوگ پکے وہابی ہوتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اپنے کو نمازی دکھانے کے لیے یہ لوگ پیشانیوں پر پتھر رگڑ کر نشانہ بنا لیتے ہیں، ایسے لوگوں کو جن کی پیشانی پر اثر سجود دیکھو تو قطعی ان پر وہابی کا حکم لگا دو۔ نماز کی حقیقت تو صرف اس قدر ہے کہ وہ یاد الٰہی کا ایک طریقہ ہے، بیٹھ کر یاد الٰہی کرو یا اٹھ کر اور دل سے کرو یا زبان سے سب صحیح ہے۔ ظہر، عصر اور مغرب کے اوقات کی قید تو صرف اس لیے کہ یادِ الٰہی میں غفلت نہ ہو۔ جن کو یاد الٰہی میں غفلت نہیں ہوتی ان کے لیے اوقات کی پابندی بھی ضروری نہیں۔ یادِ الٰہی کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ کسی اہلِ دل سے اتحاد و رابطہ پیدا کر لو وہ تمھیں اپنے رنگ میں رنگ دے گا۔ بقول شخصے:

نمازِ عابداں سجدہ سجود است
نماز عاشقاں ترک وجود است

حج کے بارے میں ایک دفعہ یوں گویا ہوئے:

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

''وہابی مولویوں نے دین میں کیا کیا بکھیڑے نکالے ہیں، شادی بیاہ میں زمانہ قدیم سے ڈھول، باجہ، ناچ رنگ، آتش بازی، رسم سایہ بندی اور غازی میاں کی کندوری وغیرہ چلا آرہا ہے، بھلا دیکھو تو سہی، اس میں کونسی برائی ہے جسے یہ حرام، مکروہ اور بدعت بتاتے ہیں، کیا پہلے کے لوگوں نے حرام، بدعت اور مکروہات کا ارتکاب کیا ہے؟ ذرا سوچو تو کسی کے دل کو خوش کرنے پر شریعت مطہرہ نے کس قدر ثواب کی امید دلائی ہے اور شادی بیاہ میں ان مراسم سے

---

[1] مباحثہ کچھوچھہ مشمولہ نصرت آسمانی بر فرقہ رضا خانی، ص ۶۵

کتنے بندگان خدا کا دل خوش ہوتا ہے، اسی کے ذریعہ بزرگان دین کی ارواحِ مقدسہ پر فاتحہ خوانی بھی ہوتی ہے جس سے ان کی ارواح بھی خوش ہوتی ہیں۔ بھلا ایسے کار خیر کو وہابی مولوی حرام و بدعت بتاتے ہیں۔ اصل بات تو یوں ہے کہ وہابی کھوسٹ اور خشک ہوتے ہیں اور ان کے تمام مسائل بھی سر تا پا کھوسٹ ہوتے ہیں۔

سود اور رشوت کے حرام ہونے کا بازار بھی انہی وہابیوں کی ذات سے گرم ہے۔ یہ لوگ سود اور رشوت کے مواعید کو تمام لوگوں کو سُنا سُنا کر جائز دنیاوی نفع سے محروم کر دیتے ہیں حالانکہ سود شریعت میں وہی ہے جس میں ظلم ہو اور رشوت بھی وہی ہے جس میں متخاصمین سے روپے لے کر ان کا کام نہ کیا جائے۔ شریعت میں انہی دونوں پر مواعید وارد ہوئی ہیں[1]۔"

اس طرح سے عوام جو عموماً احکام شرعیہ کی پابندی سے گھبراتے ہیں وہ پیر جی کی ان تقریروں سے بڑے خوش ہوئے، اس طرح سے انھیں ہر طرح کے مذہبی اعمال سے آزادی کا پروانہ مل جاتا تھا لہٰذا وہ جوق در جوق ان کے مرید ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ موضع فتح پور اور اگر پور (ضلع بھاگلپور) کے اکثر لوگ ان کے دام تزویر میں آ گئے، لہٰذا اب آپ کی کوشش یہ ہوئی کہ موضع راجپور کے لوگوں کو بھی اپنا مرید بنایا جائے مگر وہاں دال نہیں گل سکتی تھی کیونکہ وہاں لوگوں کی اکثریت مولانا سید شاہ غنیمت حسین صاحبؒ کی مرید و معتقد تھی، چنانچہ پیر جی نے مولانا غنیمت حسین صاحبؒ کے خلاف کفر کا ایک فتویٰ تیار کر کے اپنے مریدوں میں گشت کرایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھائی بھائی میں، باپ بیٹے میں اور میاں بیوی میں تفریق اور جدائی کی نوبت آ گئی۔ شاہ جی کے ایک فتح پوری مرید کی لڑکی موضع راجپور کے ایک زمیندار لڑکے کے عقد میں تھی، شاہ جی نے ان دونوں میں تفریق کرا دی اور اس کے ساتھ ہی اشتہار بازی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مناظرہ کا چیلنج بھی دیا جانے لگا۔ موضع راجپور کے مسلمانوں نے مجبور ہو کر حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے سارے حالات بیان کیے۔ مولانا نے چیلنج قبول کرتے ہوئے حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنویؒ اور مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ کو ان رضاخانیوں سے مناظرہ کرنے کی دعوت دینے کا مشورہ دیا۔ ان حالات میں رؤساء و معززین شہر بھاگلپور جناب شاہ فتح عالم، مولوی شہامت حسین وکیل، حکیم امیر حسن اور حکیم سید زین العابدین جیسے حضرات نے دونوں فریق کو مناظرہ کے لیے دعوت دی اور اعلان کیا کہ آپ حضرات یہاں آ کر محلہ خلیفہ باغ میں میر معونت حسین

---

[1] مباحثہ کچھوچھہ مشمولہ نصرت آسمانی بر فرقہ رضاخانی، ص ۶۵-۶۶

کے مکان پر ہمارے سامنے مناظرہ کریں۔ حضرت مولانا غنیمت حسین صاحب[1] نے اسے منظور کرلیا مگر شاہ احمد اشرف نے انکار کردیا کہ میں کسی کے گھر میں مناظرہ نہ کروں گا بلکہ مجمع عام میں کروں گا، چنانچہ اکابرین شہر نے میدان شاہ جنگی جو اہل شہر کی عید گاہ تھی اسے مناظرہ گاہ کے طور پر تجویز کیا مگر اس پر بھی شاہ جی تیار نہ ہوئے کہ میں تو مسافر ہوں، حفظ امن کا کون ذمہ دار ہوگا، اس طرح عذر و معذرت اور حیلہ سازی کرتے ہوئے وہ بھاگلپور سے روانہ ہوگئے مگر موضع فتح پور اور راجپور کے لوگ کب ماننے والے تھے، انھوں نے طے کرلیا کہ ہم شاہ جی کے وطن کچھوچھہ پہنچ کر اُن سے مناظرہ کریں گے۔ چنانچہ دونوں فریقوں کے نمائندوں نے ۲۳/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کچھوچھہ پہنچ کر مولانا سید شاہ وجیہہ الدین اشرف کچھوچھوی سجادہ نشین درگاہ عالیہ کچھوچھہ کو حکم بنانے کے لیے آمادہ کرلیا۔ اس طرح ۲۵/ اکتوبر ۱۹۲۰ء کی تاریخ مناظرہ کے لیے مقرر ہوگئی۔

مذکورہ بالا مقررہ تاریخ پر اطراف و جوانب کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا مجمع آستانہ عالیہ کچھوچھہ میں جمع ہوگیا۔ موضع فتح پور واگر پور ضلع بھاگلپور کے باشندے شاہ جی کے مریدوں میں تھے اور موضع راجپور کے باشندے مولانا سید شاہ غنیمت حسین صاحب کے متوسلین میں تھے۔ یہ دونوں فریق اس مناظرہ میں شرکت کے لیے کچھوچھہ آچکے تھے اور حضرت سجادہ نشین صاحب مسندِ صدارت پر متمکن تھے۔ اس مناظرہ کا خاص ایجنڈا یہ تھا کہ مولوی احمد اشرف کچھوچھوی نے جو فتویٰ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مؤلف براہین قاطعہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی مؤلف ''تحذیر الناس'' اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مؤلف ''حفظ الایمان'' کے کفر کا دیا ہے اور ان کی مذکورہ بالا کتابوں کے اقتباسات پر توہینِ رسول کا الزام لگایا ہے اُسے برسرِ عام ثابت

---

[1] مولانا حکیم سیّد شاہ غنیمت حسین صاحب ایک جید عالم، خطیب اور مناظر تھے۔ مولانا لکھنوی کے ساتھ اکثر و بیشتر مناظروں میں شریک و سہیم رہے تھے۔ آپ کا میدانِ عمل زیادہ تر ردِّ بدعت، ردِّ قادیانیت اور ردِّ غیر مقلدیت تھا۔ مولانا موصوف کا وطن اور جائے پیدائش موضع مخدوم چک، سمری بختیار پور ضلع سہرسہ (بہار) تھی۔ ابتدائی تعلیم بھاگلپور میں حاصل کرکے پٹنہ آئے اور یہاں ایک مدرسہ میں داخل ہوکر درسِ نظامی کی تکمیل کی اور پھر طب کی تعلیم بھی یہیں مولانا لطیف حسین صاحب سے حاصل کی۔ تجوید کی سند قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی کے بڑے بھائی سے مکہ معظمہ میں حاصل کی۔ خطاطی کی مشق معروف خطاط مولانا بہرام خان صاحب دربھنگوی سے کی۔ مولانا سیّد حسین اشرف بسکھاروی سجادہ نشین درگاہ حضرت سیّد شاہ اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھہ ضلع امبیڈکر نگر یوپی سے بیعت ہوئے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ آپ پر بڑا اعتماد کرتے تھے، آپ کی مطبوعہ علمی یادگار میں دو کتابوں ''ابطالِ اعجازِ مرزا'' اور ''احکامِ موتی'' کے نام ملتے ہیں۔ آپ کی وفات ۱۹۳۸ء میں اپنے وطن میں ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔

کیا جائے تا کہ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا ہو سکے، مگر پیر جی اُسے برسرِ عام ثابت نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ طرح طرح کے حیلہ بہانے تراشتے رہے مگر مجبوراً انھیں بحث کرنا پڑی اور 'حفظ الایمان' کی عبارت پڑھ کر اس میں توہینِ رسول ؐ کو بزعم خود ثابت کر کے اس فتویٰ کفر کی تائید کی۔

مولانا سید شاہ غنیمت حسین صاحب ؒ نے نہایت مہذب پیرایہ میں اس کا رد کیا اور 'حفظ الایمان' کی عبارت کا صحیح مطلب بیان کرتے ہوئے پیر جی کے تمام اعتراضات کا جواب وضاحت سے دیا، انھوں نے کہا کہ 'حفظ الایمان' میں توہینِ رسول ؐ کا شائبہ تک نہیں ہے، انھوں نے ہر پہلو سے اس عبارت کو جانچ پڑتال کر کے ثابت کیا کہ اس میں کسی طرح بھی توہینِ رسول ؐ نہیں نکل سکتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے متعلق جو کچھ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ نے لکھا ہے وہی تمام اہلسنّت کا مسلک ہے اور احناف کا بھی یہی مذہب ہے۔ مولانا غنیمت حسین صاحب ؒ کے مدلل جوابات سے پیر جی لاچار ہو گئے اور جب اپنے دفاع کے لیے ان کے پاس کوئی چارہ نہ رہ گیا تو انھوں نے اپنی بعض مجبوریوں کو ظاہر کر کے مناظرہ کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی کرنے کی درخواست کی۔ اس التواء سے ایک مقصد اُس وقت مناظرہ سے فرار تو تھا ہی دوسرا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اس درمیان وہ اپنی مدد کے لیے کسی دوسرے رضا خانی عالم کو بلا سکیں جس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے چنانچہ محض اس خیال سے کہ کہیں پیر جی اس کو بہانہ بنا کر مناظرہ گاہ سے بھاگ نہ لیں ان کی یہ درخواست منظور کر لی گئی اور پھر آئندہ ۱۳ر نومبر ۱۹۲۰ء کی تاریخ باتفاقِ فریقین طے پائی۔

مناظرہ کے اس منزل پر پہنچنے کے بعد اہل بھاگلپور نے حضرت مولانا لکھنوی ؒ کو بھی یہاں مدعو کر لیا اور وہ تشریف لے آئے، مناظرہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ شاہ جی سیّد علی حسین، مولوی

---

[۱] شاہ محمد محدث ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ میں جائس ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش اپنے نانا شاہ علی حسین کے یہاں ہوئی، فارسی اپنے والد حکیم نذر اشرف سے پڑھی، عربی و درسی نظام کی تعلیم مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے حاصل کی، بعدہٗ مولوی لطف اللہ علی گڑھی سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں، پہلی بھیعت میں شاہ مطیع الرسول عبدالقادر بدایونی سے حدیث پڑھی، اپنے ماموں شاہ احمد اشرف سے مرید ہو کر تکمیل سلوک کی۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، ایک مجموعۂ کلام "فرش بر عرش" طبع ہو چکا ہے، آپ نے ترجمہ قرآن مجید بھی کیا تھا۔ آپ کے معتقدین آپ کو محدث اعظم، وحید العصر، شمس الافاضل، قدوۃ العلماء الراسخین اور علامہ جیسے الفاظ سے یاد کرتے تھے، ۱۳۶۵ھ میں آل انڈیا سنّی کانفرنس کے اجلاس بنارس کے صدر مقرر کیے گئے۔ جماعت رضائے مصطفیٰ کے بھی تاعمر صدر رہے۔ ۱۷ر رجب ۱۳۸۳ھ-۱۹۶۳ء میں آپ کا انتقال ہوا اور کچھوچھہ میں دفن ہوئے۔

نعیم الدین صاحب مراد آبادی، مولوی احمد اشرف اور مولوی سید محمد المعروف بہ محدث[1] رضا خانیوں کی طرف سے مناظرہ میں موجود تھے اور ادھر مولانا سید غنیمت حسین صاحبؒ اور حضرت مولانا لکھنویؒ علماء اہل سنت کی طرف سے تھے۔ شاہ جی نے اپنی طرف سے بولنے کے لیے مولوی سید محمد محدث کو وکیل بنانے کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی، مولوی سید محمد محدث اپنی تقریر گھر سے لکھ کر لاتے تھے اور یہاں پڑھ کر سنا دیتے تھے، جبکہ مولانا لکھنویؒ کی تقریر زبانی ہوتی تھی، یہ مناظرہ ۱۳ ر نومبر ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر ۱۷ ر نومبر تک جاری رہا۔ چنانچہ جب ۱۷ ر نومبر کو مولوی سید محمد مناظرہ کے درمیان اپنی بات رکھ رہے تھے شاہ جی زار و قطار رونے لگے اور فرمانے لگے:

"اے زمین و آسمان! گواہ رہیو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی جا رہی ہے اور توہین کرنے والوں کو کافر کہنے سے بھی روکا جا رہا ہے[1]"

یہ رونے کا سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ وہ روتے ہی ہوئے مجلس مناظرہ سے اُٹھ کر چلے گئے اور پھر دوبارہ نہیں آئے۔ اب تمام حاضرینِ مناظرہ کو یقین ہو گیا کہ پیر جی اور ان کے حوارئین اور مریدین مناظرہ سے بھاگ لیے اور فرار ہونے کا بدنما داغ ہمیشہ کے لیے اپنی پیشانی پر لے گئے۔ چنانچہ حاضرین مناظرہ نے جن میں مقامی اور غیر مقامی ذمہ دار حضرات شامل تھے ایک متفقہ محضر نامہ مرتب کر کے علمائے حق اہل سنت کے حوالہ کیا جس کی عبارت یہ تھی:

"حفظ الایمان" کی بحث کو ناتمام چھوڑ کر اور بقیہ طے شدہ دو کتابوں یعنی "تحذیر الناس" اور "براہین قاطعہ" کی بحثوں کو ترک کر کے مولوی سید علی حسین، مولوی سید احمد اشرف، مولوی سید محمد محدث اور جناب مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی مناظرہ گاہ سے چلے گئے لہٰذا ہم لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ تمام حضرات غلطی پر ہیں اور ان کا کھلا ہوا فرار ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا[2]۔"

اس محضر نامہ پر دستخط کرنے والوں میں مولوی سید شاہ وجیہہ الدین اشرف صاحبؒ سجادہ نشیں، سید علی اوسط اشرفیؒ، سید حسین اشرف اشرفیؒ، سید ظہور الحسن اشرفیؒ، مولوی سید شاہ محمد شفیعؒ ساکن درگاہ شریف، سید علی احمد اشرفیؒ، سید ریاض الدین اشرف اشرفیؒ، محمد رفیع اشرفیؒ، مولوی سید عبدالحی اشرفیؒ بسکھاروی، سید محمود حسن جونپوریؒ، مولوی سید وصی اشرفی بسکھارویؒ، حکیم ہدایت اللہ بنارسیؒ، اشرف حسین اشرفیؒ برادر حقیقی شاہ علی حسین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، ان ناموں

---

[1] مباحثہ کچھوچھہ مشمولہ نصرت آسمانی بر فرقہ رضا خانی، ص ۷۶ [2] ایضاً ص ۷۷-۷۸ ملخصاً

کے علاوہ تقریباً سو نام اور بھی دستخط کنندگان کے ہمارے پاس موجود ہیں جن کو طوالت کے خوف سے ترک کر دیا گیا ہے۔

مولانا لکھنویؒ نے بحث کے دوران چند امور پر مزید تفصیل سے روشنی ڈالی جو اہلِ ایمان کے لیے موجبِ فرحت و انبساط ہوئی۔ مثلاً آپ نے شاہ جی اور مولوی سید محمد کی بعض علمی اغلاط پر گرفت کی اور قرآن مجید کے خلاف جعلی روایات کے بیان کرنے پر ٹوکا تو یہ دونوں حضرات حواس باختہ ہو گئے۔ شاہ جی نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی جو توہین کی تھی اور اُن پر افترا کیا تھا کہ انھوں نے اپنے ایک شعر کے ایک مصرعہ میں یوں فرمایا ہے:

من چہ پروائے مصطفیٰ دارم (نعوذ باللہ منہ)

جب اس پر حضرت مولاناؒ نے سخت گرفت کی تو یہ حضرات مہر بہ لب ہو گئے۔ شاہ جی کے خلافِ سنت افعال اور خصوصاً ان کے ترک جماعت پر مولاناؒ نے گرفت فرمائی جس کا شاہ جی نے کچھ جواب نہ دیا۔ مولوی سید محمد نے ایک بار حضرت جبرئیل علیہ السلام کی شان میں توہین کی مگر جب ان کی گرفت کی گئی تو فوراً جھوٹی قسم کھا کر مکر گئے۔ حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ اس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے اور انھوں نے اس کی گواہی بھی دی تھی۔[1]

۳۔ مناظرہ بمبئی ۱۹۲۵ء

یہ مناظرہ ماہم (بمبئی) میں مولانا لکھنویؒ اور مولانا نثار احمد کانپوریؒ[2] کے درمیان ہوا تھا۔ مناظرہ کے حَکَم فریقین کی متفقہ رائے سے علامہ احمد بن محمد الشبلی نمائندہ سلطانِ مسقط و عمان برائے ہند بنائے گئے تھے۔ اس مناظرہ کا سبب بھی وہی رضاخانیوں کا فتویٰ تھا جس کی تفصیل ہم

---

[1] مباحثہ کچھوچھہ مشمولہ نصرت آسمانی بر فرقہ رضاخانی، ۷۷-۷۸ ملخصاً

[2] مولانا نثار احمد کانپوری اپنے والد مولانا احمد حسن کانپوری کے دوسرے فرزند تھے، اپنے والد کے شاگردوں میں مولانا شاہ عبید اللہ اور مولانا قاضی عبد الرزاق کانپوری اور اپنے خالو مولوی محدث سورتی سے درسِ نظامی پڑھا، سند تکمیل اپنے والد سے حاصل کی۔ پورے ملک میں آپ کے وعظ کی شہرت تھی۔ آپ آزادیٔ ہند کے رہنماؤں میں تھے، کراچی کے مشہور مقدمہ میں ماخوذ ہو کر قید کی سزا پائی، خلافت تحریک میں بھی حصہ لیا۔ شاہی جامع مسجد آگرہ کے خطیب مقرر ہوئے۔ اپنے فرقہ کی تائید اور نصرت آپ کا خاص شیوہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی غریبوں اور طلباء کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے اور جدہ میں انتقال ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ آپ کی موت زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی۔

اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ بمبئی میں مولانا لکھنویؒ کے مواعظ کی مقبولیت اور ان کے اصلاحی اثرات کو دیکھتے ہوئے وہاں کے پیشہ ور واعظین میں کھلبلی مچ جاتی تھی اور وہ ہر ممکن کوشش اس بات کی کرنے لگتے تھے کہ کس طرح مولانا کا یہاں آنا جانا موقوف ہو جائے چنانچہ جب بھی آپ بمبئی آتے تو انہی واعظین کی طرف سے جہاں نت نئے فتنے برپا کیے جاتے تھے وہاں اس فتوے کو بھی اشتہار کی شکل میں شائع کر کے شہر میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ لہٰذا دونوں طرف کے اہالیانِ شہر نے ۱۴؍ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) کو ایک میٹنگ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ آج کل مولانا لکھنویؒ بمبئی آئے ہوئے ہیں، ان سے اس فتوے کے بارے میں مناظرہ ہو جائے۔ اگر یہ رضا خانی واعظین اس فتوے کو فقہ حنفی کی روشنی میں صحیح ثابت کر دیں تو مولانا اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہوئے اپنا توبہ نامہ شائع کر دیں ورنہ پھر یہ حضرات اس فتوے کے غلط ہونے کا اقرار کریں اور آئندہ پھر ایسی باتیں نہ کرنے کا اعلان کریں تاکہ یہ روز روز کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اس طرح یہ مناظرہ طے ہو گیا مگر کچھ بااثر لوگوں نے فریقین کو سمجھا بجھا کر صلح کرا دی اور یہ صلح نامہ بمبئی کے اخبارات میں شائع بھی کرا دیا گیا۔

صلح نامہ شائع ہونے کے چند روز کے بعد مولوی نثار احمد کانپوری کی طرف سے پھر مناظرہ کرنے کی مانگ کی گئی، پہلے تو بہت کچھ سمجھانے بجھانے کی کوشش کی گئی مگر رضا خانی واعظین کی طرف سے اس کا اصرار بڑھتا ہی گیا بالآخر ان کی یہ دعوتِ مناظرہ منظور کر لی گئی اور پھر ۲۷؍ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) کو ماہم میں علامہ شبلی کی قیام گاہ پر مناظرہ کا انعقاد عمل میں آ گیا۔ مناظرہ کا آغاز ہوتے ہی مولانا نثار احمد نے مولانا لکھنویؒ سے سوال کیا کہ سب سے پہلے آپ بتائیے کہ ان سات مسائل (یعنی مسئلہ علم غیب، ندائے غیر اللہ، قیام میلاد اور فاتحہ مروجہ وغیرہ) میں آپ کا کیا عقیدہ ہے۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ ان سات مسائل کے علاوہ اور دوسرے مسائل بھی جن پر آپ چاہیں بحث ہو سکتی ہے مگر پہلے اس مسئلہ کا تو فیصلہ کر لیجیے جس کو ان موجودہ نزاعات کی بنیاد آپ حضرات بھی تسلیم کر چکے ہیں اور بہ تراضی فریقین آج یہی مسئلہ (یعنی مولاناؒ کے خلاف رضا خانیوں کا فتویٰ وہابیت) اس مناظرہ کا اصل موضوع ہے۔ مگر فریق مخالف نے اس پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اصرار کیا کہ پہلے انہی موضوعات پر بحث ہوگی، چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ اچھا! اگر آپ حضرات کا یہی اصرار ہے کہ اس فتوے پر بحث نہ ہو تو مجھے اپنی کسی بات پر

اصرار نہیں ہے مگر اتنا ضرور پوچھوں گا کہ اگر یہی سات مسائل معیار وہابیت ہیں اور ان میں میرا مسلک آپ صاحبان کو اب تک معلوم نہیں ہے جس کی وجہ سے مجھ سے ہاں یا نا کہلوا کر میرا مسلک معلوم کرنا چاہتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ میرا مسلک معلوم کرنے سے پہلے میری وہابیت اور میرے عدم تقلید کا فتویٰ کیوں دیا گیا؟ اس پر مولوی نثار احمد بہت ہی اشتعال انگیز طریقہ سے بولتے ہوئے حضرت مولانا سے تم تم کر کے مخاطب ہونے لگے اور کہا کہ مجھے تمھاری وہابیت میں ذرا بھی تردّد نہیں ہے، دریاباد میں میرا تم سے مناظرہ ہو چکا ہے، مجھے اسی وقت سے تمھاری وہابیت کا یقین ہے۔ اس کے جواب میں مولاناؒ نے بڑی خندہ پیشانی اور عالی ظرفی سے کہا کہ میرے اور آپ کے درمیان میں کوئی مناظرہ دریاباد میں نہیں ہوا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کو لوگ مناظرہ کے لیے لے گئے تھے، جب میں نے سنا تو میں خود ہی جامع مسجد دریاباد چلا آیا اور میں نے آپ سے پوچھا کہ کس بات پر مناظرہ ہوگا تو آپ نے کہا کہ 'علم الفقہ' میں کچھ اغلاط ہیں انہی پر بحث ہوگی، میں نے کہا کہ اس میں مناظرہ کی کیا ضرورت ہے، آپ ان اغلاط کی فہرست مجھے دے دیجیے، اگر واقعی وہ اغلاط ہیں تو میں کتاب کا غلط نامہ شائع کر دوں گا۔ تو اس پر انھوں نے کہا کہ علم الفقہ مجھے دے دیجیے تو میں اغلاط نکالوں، میں نے کہا کہ کیا آپ نے علم الفقہ اب تک نہیں دیکھی تو آپ نے کہا نہیں۔ اس پر میں نے بہت تعجب سے کہا کہ پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس میں اغلاط ہیں، آپ نے جواب دیا کہ مجھ سے لوگوں نے کہا ہے۔[1]

اس گفتگو کے بعد مولوی نثار احمد برسرِ عام قرآن مجید سر پر رکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے خدا کی قسم، قرآن کی قسم، رسول کی قسم، میرا تم سے دریاباد میں مناظرہ ہوا تھا، تم جواب نہ دے سکے اور بھاگ گئے، اگر میں جھوٹی قسم کھاتا ہوں تو تم اسی طرح قرآن سر پر رکھ کر کہہ دو۔ تمام اہلِ ایمان ان کے اس فعل پر کانپ اُٹھے۔ اسی طرح ایک بار اور مولانا کانپوری نے جھوٹا حلف اٹھانے کے لیے قرآن مجید سر پر اٹھالیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ زنگاری محلہ بمبئی کی مسجد میں سیٹھ اسماعیل موتی مولانا لکھنویؒ کا بیان کرانا چاہتے تھے اور مولوی نثار احمد چاہتے تھے کہ مولانا کا بیان نہ ہو، چنانچہ اسی مجمع میں مولانا کانپوری نے کہا کہ قرآن منگاؤ میں ایک آیت دکھلاؤں گا اور اس کی تفسیر بیان کروں گا، جس سے ان کی (یعنی مولانا لکھنویؒ کی) وہابیت کا قطعی فیصلہ

---

[1] تحفۂ لاثانی بر فرقۂ رضا خانی، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۱

ہو جائے گا۔ چنانچہ کسی جگہ سے قرآن مجید منگایا گیا اور جیسے ہی قرآن مجید لایا گیا مولوی صاحب اس کو سر پر لے کر کھڑے ہو گئے اور مولانا صاحب کی وہابیت کی قسم کھائی اور پھر فوراً وہاں سے چل دیئے، اس حرکت کے بعد بھی حضرت مولانا کا وعظ وہاں ہوا اور عوام پر اس کا بہت اچھا اثر مرتب ہوا۔ اس طرح مولوی نثار احمد جھوٹا حلف اٹھانے اور جھوٹی قسمیں کھانے کے بہت عادی تھے جبکہ خود قرآن مجید میں فرمادیا گیا ہے کہ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ[1] یعنی اے نبیؐ زیادہ حلف کرنے والے ذلیل شخص کی بات مت مانیے۔ یہاں ایک مسئلہ اور بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولوی نثار احمد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم کھائی تھی جو فقہ حنفی کی روشنی میں ناجائز بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک شرک وکفر ہے۔[2]

اس قسم کی ردوکد کے بعد اصل مناظرہ شروع ہوا، مولاناؒ نے فرمایا کہ میں آپ کے پیش کردہ سات مسائل پر بحث کرنے کے لیے تیار ہوں مگر پہلے آپ سنّی اور وہابی کی تعریف مستند کتابوں کی روشنی میں فرمادیجیے۔ اس کے جواب میں مولوی نثار احمد نے کہا کہ وہابی وہ سنّی حنفی ہے جو اِن سات مسائل میں ہمارے خلاف ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم سنّی ہو، مقلد ہو، اور حنفی ہو مگر چونکہ ان سات مسائل میں ہمارے خلاف ہو اس لیے تم وہابی ہو۔ تم میں جو خوبی ہے اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ ردروافض میں اس وقت تمھارا کوئی مثل نہیں۔ اس پر مولانا نے پوچھا کہ وہابی کی یہ تعریف کسی مستند کتاب میں دکھلا دیجیے تو مولوی نثار احمد نے کہا کہ یہ کسی مستند کتاب میں نہیں دکھائی جا سکتی یہ تو ہماری اپنی اصطلاح ہے اور میں خود صاحبِ اصطلاح ہوں، اس لیے مجھے حق ہے کہ میں جو چاہوں اصطلاح اختیار کروں۔ اس گفتگو کے بعد مولانا لکھنویؒ نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تمام حاضرین اس خانہ ساز وہابیت کی حقیقت سمجھ گئے ہوں گے، مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ صرف اتنا عرض کروں گا کہ جن مسائل میں اختلاف کرنے کو آپ وہابیت کا معیار قرار دیتے ہیں انھی مسائل کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکّی قدس سرہٗ نے جو اکابر علماء ہندوستان کے پیر و مرشد تھے اور آپ (مولوی نثار احمد) کے والد مرحوم (مولانا احمد حسن کانپوری) بھی ان کے خادم و مرید تھے، اپنی کتاب ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' میں ان مسائل کے اختلاف کو مثل اختلاف حنفی و شافعی قرار دیتے ہیں اور ان میں بحث و مباحثہ کرنے

---

[1] سورہ قلم: ۱۰ [2] تحفۂ لاثانی بر فرقہ رضاخانی، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۲-۲۳

بلکہ فتویٰ لکھنے کو بھی منع کرتے ہیں اور محض اس بنا پر کسی کو وہابی کہنے کو بھی ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اتنا کہہ کر آپ نے ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' کو پڑھ کر سنانا چاہا تو سارے رضاخانی مولویوں نے احتجاجاً شور مچانا شروع کر دیا اور کسی طرح اس عبارت کو سننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ مولوی نثار احمد کا اب اصرار ہوا کہ سب سے پہلے مسئلہ علم غیب پر بحث ہونا چاہیے۔ حکم صاحب نے دونوں مناظرین سے کہا کہ آپ دونوں اپنا اپنا عقیدہ اس مسئلہ میں تحریر فرمادیں۔ چنانچہ مولوی نثار احمد نے اپنا عقیدہ یہ لکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب جمیع ما کان و ما یکون تھے۔ مولانا نے اپنا عقیدہ یہ لکھا کہ حق تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی بہت سی باتوں پر اطلاع دی تھی ان میں ما کان یعنی زمانہ گذشتہ کے غیب کی بہت سی چیزیں اور ما یکون یعنی زمانہ آئندہ کے غیب کی بہت سی چیزیں دونوں شامل ہیں مگر جمیع ما کان و ما یکون کا علم مخصوص بذات حق تعالیٰ شانہٗ ہے۔ اس کے بعد دونوں حضرات سے اپنے دلائل پیش کرنے کو کہا گیا۔ مولانا نے اپنے عقیدہ کی تائید میں آیاتِ قرآنیہ، کتب عقائد کے اقتباسات اور مختلف مدونہ مجموعات فتاوی کی عبارتیں پیش کیں۔ مولوی نثار احمد نے بھی اپنے دلائل بیان کیے مگر بے ربط اور بے جوڑ جن سے ان کے عقیدے کی تائید نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ کبھی تو انھوں نے کہا کہ ما کان و ما یکون سے زیادہ اور ہے بھی کیا، اور کبھی کہا کہ ما کان و ما یکون کے بعد اب صرف معدومات وممتنعات ہی باقی رہتے ہیں، کبھی کہا کہ تساوی علم باری تعالیٰ لازم نہ آئے گی کیونکہ علم باری تعالیٰ ذاتی ہے اور حضورؐ کا علم عطائی ہے، کبھی یہ کہا کہ باری تعالیٰ کا علم غیر محدود ہے اور حضورؐ کا علم محدود ہے اور کبھی یہ کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی مثال خدا کے علم کے سامنے ایسی ہے جیسے ایک چڑیا اپنی چونچ میں سمندر سے پانی بھرے یعنی باری تعالیٰ کا علم سمندر ہے اور حضورؐ کا علم اس پانی کے قطرے کے برابر ہے جو چڑیا کی چونچ میں آتا ہے، استغفر اللہ، چڑیا کی چونچ کی مثال توہین آمیز مولوی نثار احمد نے پے در پے اپنی چار تقریروں میں بیان کی، نعوذ باللہ منہ۔ (ص ۴۲)

وہ آیات واحادیث جن سے حضورؐ کے جمیع ما کان و ما یکون کے عالم الغیب ہونے کی نفی ہوتی ہے اس کے جواب میں مولوی نثار احمد نے کہا کہ یقیناً بعض آیات اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جمیع علم غیب نہ تھا مگر یہ آیات واحادیث اور واقعات پہلے کے ہیں۔ حضورؐ کو جمیع علم غیب آخر عمر میں اور آخر وقت میں ملا تھا۔ مولوی صاحب کی اس بے سروپا گفتگو کو سن کر مولاناؒ نے فرمایا کہ بقول مولوی نثار احمد حضورؐ کو جمیع علم غیب آخر عمر

میں ملا تھا۔ اس پر میرے دو اعتراض ہیں، ایک یہ کہ کیا حضورؐ کی تمام عمر شریف مولوی صاحب نے نعوذ باللہ بے کمالی میں فرض کر لی ہے؟ ان کے اس قول سے کیا حضورؐ کی توہین ثابت نہیں ہوتی؟ دوسرا اعتراض یہ کہ مولوی صاحب کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ حضور کو جمیع علم غیب اخیر عمر میں ملا تھا؟ اس کی تائید میں کیا وہ کوئی آیت یا حدیث پیش کر سکتے ہیں؟ نہیں! ہرگز نہیں پیش کر سکتے، البتہ میں انشاء اللہ قرآن مجید کی ایک ایسی آیت پیش کروں گا جس میں اخیر عمر میں بھی جمیع علم غیب ہونے کی صریح نفی موجود ہے۔ پھر آپ نے آیت شریفہ **ویوم یجمع اللہ الرسل...... الیٰ انک انت علاّم الغیوب** (سورہ مائدہ:۱۰۹) پیش کرنے کا ارادہ کیا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس دن (یعنی قیامت کے دن) کیا جواب ملا تو وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں غیبوں کا جاننے والا تو تو ہی ہے۔ قبل اس کے کہ یہ آیت پیش کی جاتی مجلس مناظرہ درہم برہم کر دی گئی اور موجود حکم علامہ احمد الشبلی نے دل برداشتہ ہوکر آئندہ حکم بننے سے انکار کر دیا اور اس پہلے دن کی ساری کارروائی کے بارے میں اپنا تحریری فیصلہ صادر کر کے فریقین کے پاس بھجوا دیا جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

> ''......روز جمعہ کی کارروائی جلسہ کے متعلق جہاں تک میرا خیال ہے فریقین کا دعویٰ ایک ہی منوال پر ہے، صرف موضوع میں لفظی اختلاف ہے۔ مجمع نے سن لیا کہ دونوں حضرات کے اقوال علم غیب نبی کریم افضل الصلوٰۃ وازکی التسلیم کے متعلق منافی و مثبت تھے۔ مولوی نثار احمد کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم غیب خدا کے علم غیب کے مقابل ایسا ہے جیسے کہ ایک چڑیا سمندر سے اپنی چونچ میں پانی لے لے اور مولوی عبدالشکور صاحب کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی قدر علم غیب تھا جس قدر خدا نے آپ کو عطا فرمایا تھا، ان دونوں دلائل کا مفہوم ایک ہی ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم ماکان و مایکون کے علوم غیبیہ سے اسی قدر واقف تھے جس قدر کہ منجانب اللہ آپ کو عطا ہوئے تھے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ آئندہ فریقین کو اختیار ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی اور حکم منتخب کر لیں میرا استعفیٰ اور عذر قبول فرمائیں......

اس فیصلہ سے رضاخانی مولوی حضرات بہت بے چین ہوئے کیونکہ ان کی یہی شکست کیا کم ہوئی کہ وہ مولانا علیہ الرحمۃ کی وہابیت ثابت نہ کر سکے۔ علامہ شبلی نے رضاخانی مولویوں کی بہت رعایت کی اور ان کی شکست وفرار کے خانہ ساز فتویٰ کی صحت ثابت کرنے سے گریز کیا، وہابی کی من گھڑت تعریف بیان کر کے اس کو اپنی اصطلاح کہنا، ہماری طرف سے پیش کردہ آیات و

احادیث و عبارات فقیہ کے جواب سے عاجز رہنا، کتبِ عقائد سے اپنے عقیدہ کو ثابت نہ کر سکنا اور نقض امن و خلاف تہذیب باتوں سے مناظرہ کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرنے کے الزامات وغیرہ حکم کے فیصلہ میں درج کیے جاسکتے تھے۔ مناظرہ کے ختم ہونے کے بعد مولوی نثار احمد کی بمبئی اور اس کے اطراف میں بے حد رسوائی ہوئی اور خود ان کے اپنے لوگ ان سے برگشتہ ہو گئے۔ مولانا لکھنویؒ اس مناظرہ کے بعد بھی کافی روز تک بمبئی میں مقیم رہے اور وہاں مختلف علاقوں میں آپ کے مواعظ ہوتے رہے جس سے لوگوں میں اصلاحِ عقائد اور دینداری کی لہر پیدا ہو گئی۔[1]

۴۔ سفر نانپارہ ۱۹۲۶ء

مشرقی یوپی کے ضلع بہرائچ میں ریاست نانپارہ واقع ہے جو تعلقدارانِ اودھ کی ریاستوں میں ایک بڑی ریاست تھی، جہاں کے والیانِ ریاست اہل سنت و جماعت ہی ہوتے رہے تھے جن کے داد و دہش نے اس ریاست کو بہت مشہور کر رکھا تھا۔ راجہ جنگ بہادر خاں کے بعد یہاں انقلاب آیا اور متعصب شیعہ خان بہادر محمد مصطفیٰ ریاست کے منیجر مقرر ہو گئے جن کے دور میں شیعوں کو بڑی برتری حاصل ہوئی اور سنّی آبادی مظالم کا شکار ہوئی، یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ راجہ سعادت علی خاں سربراہِ ریاست نہ ہوئے۔ نانپارہ کی سرزمین پر مولانا لکھنویؒ کی آمد بیسویں صدی کے اوائل ہی سے شروع ہو چکی تھی جہاں آپ کے مواعظ حسنہ سے بڑی دینداری پیدا ہو چکی تھی، عام طور پر آپ کے بیانات نماز کی تاکید اور اس کی اہمیت پر ہوتے تھے چنانچہ یہاں کی تمام مساجد بشمول جامع مسجد نمازیوں کے لیے ناکافی ثابت ہونے لگی تھیں، اس طرح یہاں کے مسلمانوں میں ایک قابل قدر دینی فضا پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں کی اس بیداری میں نانپارہ کی انجمن اسلامیہ کا بھی بڑا دخل تھا جس میں اس وقت کی مقتدر شخصیتوں میں جناب نواب علی خاں، شیخ وارث حسین اور نواب سردار علی خاں وغیرہ شامل تھے۔

ریاست کے شیعہ منیجر کے دور میں مجتہد شیعہ مولوی سیّد سبط حسن بھی نانپارہ آیا کرتے تھے اور خاص طور سے رمضان یہیں گذارا کرتے تھے مگر جب سے مولانا لکھنویؒ کے مواعظ شروع ہوئے تو ان کے پیر وہاں سے اکھڑ گئے تھے پھر ان کا وہاں آنا جانا موقوف ہو گیا البتہ رضاخانی خیالات کے حامل چند لوگ وہاں ضرور موجود رہے جو ہمیشہ سنیوں میں باہمی اختلافات اور منافرت پھیلانے کی کوشش کرتے رہتے تھے، انہی لوگوں نے پہلے پہل وہاں علم غیب کا مسئلہ

---

[1] تحفۂ لاثانی بر فرقۂ رضاخانی، دوسرا ایڈیشن، ملخصاً

اٹھایا اور اس پر اچھا خاصا تنازعہ پیدا کیا، یہاں تک کہ اسی موضوع پر مناظرہ کا چیلنج بھی دے دیا جو علمائے حق نے قبول بھی کر لیا۔ اس مناظرہ میں رضا خانی مولویوں میں مولوی عبدالاحد محدث پیلی بھیتی (م ۱۹۳۳ء) مولوی محمد اسماعیل محمود آبادی (م ۱۹۵۱ء) اور مولوی مصباح الدین بلائے گئے اور ہمارے علماء میں لکھنؤ سے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کے علاوہ مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ، مولانا حکیم شاہ عبدالباری نقشبندی مجددیؒ اور مولانا حکیم عبدالمغنی صاحب نقشبندی مجددیؒ کو بھی بلایا گیا تھا۔ یہ حضرات نانپارہ پہنچے مگر مناظرہ کی نوبت نہیں آسکی کیونکہ رضا خانی مولویوں میں دو حضرات تو سامنے ہی نہیں آئے البتہ تیسرے مولوی محمد اسماعیل سے گفتگو ہوئی، انھوں نے مولانا لکھنویؒ سے کہا کہ حق تو وہی ہے جو آپ حضرات کہتے ہیں کیونکہ قرآن مجید، حدیث اور فقہ حنفی سے تو اسی کا ثبوت ملتا ہے مگر اس وقت مصلحت یہی ہے کہ ہم اور آپ دونوں مل کر کوئی مبہم بات عوام کے سامنے کہہ دیں تاکہ رفع نزاع ہو جائے۔ مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ شریعت کے معاملہ میں مصلحت کو دیکھنا ہمارے مذہب میں نہیں ہے، ہم ایسا نہیں کر سکتے، جو حق بات ہوگی وہی کہیں گے۔ چنانچہ مجبور ہو کر مناظرہ کا فیصلہ ہوا مگر مولوی اسماعیل صاحب اس سے قبل ہی نانپارہ چھوڑ کر چلے گئے اور مناظرہ نہ ہو سکا۔

کچھ عرصہ کے بعد پھر رضا خانی حضرات نے اپنے مولویوں کو "گیارہویں شریف" کے موقع پر نانپارہ بلوایا جن میں مولانا محمد فاخر الٰہ آبادی[1] کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ موصوف

[1] مولانا سیّد محمد فاخر دائرہ شاہ محمد اجمل الٰہ آباد کے سجادہ نشینوں میں سے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا عبیداللہ ولایتی کانپوری، مولانا نصیر الزماں خاں شاہجہانپوری اور مولانا شاہ محمد حسین الٰہ آبادی وغیرہ شامل تھے۔ سلوک وطریقت میں اپنے والد مولانا سیّد محمد زاہد الٰہ آبادی کے مجاز تھے۔ سلسلہ ابوالعلائیہ اور سلسلہ چشتیہ سے آپ کا تعلق تھا۔ فن طب کی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم محمد افضل الٰہ آبادی سے حاصل کی تھی۔ اس لیے آپ مطب بھی کرتے تھے۔ شعر وسخن سے بھی دلچسپی تھی اور بیخود تخلص تھا۔ آپ نے اپنے دور کی ملکی وملّی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس سلسلہ میں گرفتار بھی ہوئے اور ایک سال قید بامشقت کی سزا بھی پائی۔ آخر زندگی تک تحریک آزادی میں حصہ لیتے رہے۔ جمعیۃ علماء کے اجلاس امرتسر میں جب اس کی پہلی مجلس منتظمہ بنائی گئی تو یوپی سے آپ ہی کو ممبر نامزد کیا گیا۔ آپ کو اپنے مسلک میں بڑا غلو تھا، ۱۹۲۸ء میں حج کا بھی موقع ملا۔ آپ کی وفات ۲۱ رجولائی ۱۹۳۰ء کو بعمر ۴۷ سال الٰہ آباد میں ہوئی اور اپنی خانقاہ میں اپنے والد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ مولانا سیّد محمد شاہد فاخری الٰہ آبادی آپ ہی کے صاحبزادے تھے جو ایک متدین عالم دین ہونے کے ساتھ آزادی وطن کی جدوجہد میں ایک مرد مجاہد تھے اور بڑے عرصہ تک یوپی اسمبلی کے رکن بھی رہے تھے۔ مولانا شاہد فاخری صاحب بڑے وسیع المشرب اور مرنجاں مرنج صوفی بزرگ تھے۔ جمعیۃ علماء یوپی کے نائب صدر رہے اور راقم الحروف سے بہت مشفقانہ تعلق رکھتے تھے۔ (ملخص از الجمعیۃ ہفت روزہ، جمعیۃ علماء نمبر ص ۴۱۶ نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۹۵ء)

اپنی اشتعال انگیز تقریروں کے لیے مشہور تھے، چنانچہ آپ نے یہاں آ کر پھر بہت اشتعال انگیز تقریریں شروع کر دیں اور حضرت لکھنویؒ کی شان میں بے انتہا گستاخیاں کیں اور فحش گوئی تک پر اتر آئے جس کے نتیجہ میں شہر میں بہت اشتعال پیدا ہو گیا۔ مخالفین کے سرغنہ اکبر خاں نے مولانا کے نام ایک کھلا خط لکھ کر انجمن اسلامیہ نانپارہ کی معرفت بھیجا اور دوبارہ مناظرہ کا چیلنج دیا کہ چونکہ آپ پر ہمارے علماء نے وہابی اور غیر مقلد ہونے کا فتویٰ دے رکھا ہے اس لیے آپ اس کی صفائی میں آ کر بیان دیجیے اور اپنے عقائد سے توبہ کیجیے۔ اس کھلے خط کے جواب میں انھیں لکھا گیا کہ ہم مناظرہ کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ آپ حضرات ان نام نہاد علماء کو بھی بلا لیجیے جنھوں نے حضرت مولانا کے خلاف فتویٰ دیا ہے یا اس پر دستخط کیے ہیں، اگر یہ نام نہاد فتویٰ از روئے فقہ حنفی غلط ثابت ہو جائے تو آپ کے علماء کرام کو بھی توبہ کرنا لازم ہوگا۔ اس طرح فریقین کے درمیان متعدد تحریریں آئیں اور گئیں جس کے نتیجہ میں پھر مناظرہ طے ہو گیا۔ مناظرہ کی بنیاد وہی رضا خانیوں کا فتویٰ بنا اور یہ اچھی طرح طے ہو گیا کہ اس فتوے پر دستخط کرنے والے حضرات بلائے جائیں گے اور وہ اپنے فتوے کا فقہ حنفی کی روشنی میں صحیح ہونا ثابت کریں گے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو انھیں فتوے سے رجوع کرنا ہوگا اور اس پر توبہ کرنا لازم ہوگا۔ بصورت دیگر حضرت مولانا اپنی صفائی میں بیان دیں گے۔

وقت مقرر پر مولانا فاخر الٰہ آبادی اور ان کے ساتھ کوئی محمد عیسیٰ صاحب نانپارہ آ گئے اور فتوے پر دستخط کرنے والوں میں مولوی احمد مختار میرٹھی (م ۱۹۳۸ء) بھی پہنچ گئے مگر مولوی نثار احمد کانپوری مناظرہ کی تاریخ گزرنے کے بعد پہنچے۔ مولانا لکھنویؒ مناظرہ سے دو دن پہلے ہی نانپارہ آ گئے تھے۔ ان حضرات نے جب یہ دیکھا کہ اب تو شاید اس موضوع پر مناظرہ ہو ہی جائے گا اور پھر ان کے علماء بھی جانتے تھے کہ فقہ حنفی کی روشنی میں مذکورہ فتویٰ کو صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ایسی تدبیریں کی جانے لگیں کہ جس سے مناظرہ پھر ٹل جائے چنانچہ سب سے پہلے اپنی اشتعال انگیز تقریروں اور تحریروں سے مولانا الٰہ آبادی نے فضا گرم کر دی اور حکام کو یہ باور کرا دیا کہ اگر مناظرہ ہوگا تو نقض امن کا اندیشہ ہے، دوسرے یہ کہ موضوع مناظرہ بدلنے کی کوشش کی، تیسرے یہ کہ مناظرہ کا حکم پہلے مولانا شاہ وارث حسن صاحبؒ کوڑہ جہان آبادی (م ۱۹۳۶ء) کو باتفاق فریقین مقرر کیا گیا تھا مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ مولانا لکھنویؒ کے ہم خیال اور مؤید ہیں تو ان کی جگہ ایک دوسرے صاحب کو حکم بنانے کی تجویز رکھی گئی مگر وہ بھی نہیں چلی، آخر میں مجبور ہو کر مولانا

فاخرالٰہ آبادی نے مناظرہ کا رُخ موڑنے کے لیے ایک اور چال چلی وہ یہ کہ آپ نے مولانا علیہ الرحمۃ کے پاس اکتالیس سوالات لکھ کر بھیجے اور لکھا کہ پہلے آپ حضرات ان کا جواب دیجیے تاکہ معلوم ہوجائے کہ آپ وہابی ہیں یا نہیں، یہ چال اس لیے چلی گئی تاکہ مناظرہ کے اصل موضوع یعنی ''فتویٰ اعلیٰ حضرت'' کی طرف سے توجہ ہٹ جائے اور اس پر بحث نہ ہوسکے۔ مقامی حکام کو اچھی طرح ڈرا دیا گیا تھا کہ دیکھئے اگر مناظرہ ہوگا تو فساد ہوجانے کا اندیشہ ہے لہٰذا مناظرہ سے چندمنٹ قبل پولیس کی طرف سے مناظرہ ملتوی کرنے کا نوٹس آ گیا اور شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کردی گئی چنانچہ مناظرہ تو ملتوی ہوگیا مگر پورے شہر کے لوگوں کو حقیقت حال سے اچھی طرح آ گاہی ہوگئی اور سب جان گئے کہ مناظرہ سے جان چھڑانے کے لیے حکام شہر کو ڈھال بنا کر یہ چال چلی گئی ہے۔[1]

۵۔ مناظرہ امروہہ ۱۹۲۷ء

۱۹۲۰ء میں امروہہ میں مولانا لکھنویؒ کا شیعوں سے بڑا زبردست مناظرہ ہوچکا تھا جس سے پورے ہندوستان میں یہ حقیقت واضح ہوچکی تھی کہ شیعوں کا ایمان قرآن مجید پر نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے، لہٰذا اُس بات سے شیعہ مدتوں اس موقع کی تلاش میں رہے کہ کس طرح وہ مولاناؒ کو کسی موقع پر شکست دیں۔ ہمارے رضا خانی علماء اس سلسلہ میں ان کے آلۂ کار تھے۔ یہ حضرات وقتاً فوقتاً امروہہ آیا کرتے تھے اور یہاں کے علماء حق پر سب وشتم کے تیر برسایا کرتے تھے، ان میں خاص طور سے مولوی نثار احمد کانپوری اور مولوی حشمت[2] علی پیلی بھیتی کا دور دورہ یہاں بہت ہونے لگا تھا۔ ان لوگوں نے افتراق بین المسلمین کا فتنہ یہاں سب سے پہلے بویا اور کچھ حد تک اس میں انھیں کامیابی بھی ہوئی، چنانچہ مولوی نثار احمد نے یہاں آ کر اپنے متعدد وعظوں میں

۱۔ عبرت نظارہ در واقعہ نانپارہ، مرتبہ مولوی احمد مرزا، سکریٹری انجمن اسلامیہ نانپارہ، ملخصاً۔

۲۔ مولوی حشمت علی قصبہ اینٹھی بندگی میاں ضلع لکھنؤ میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں حاصل کی، مزید تعلیم کے لیے مدرسہ منظر الاسلام بریلی میں داخل ہوئے اور ساری تعلیم وہیں مکمل کی اور پھر اسی مدرسہ میں ملازم ہوئے، مولوی احمد رضا خاں بریلوی سے مرید ہوئے۔ دارالعلوم مسکینیہ دھوراجی گجرات اور مدرسہ اہلسنت پادرہ گجرات میں تدریسی فرائض انجام دیئے، ۱۹۲۸ء میں مستقل طور پر پیلی بھیت (یوپی) میں سکونت اختیار کی، ساری عمر علماء حق سے مناظرہ کرنے اور ان کے خلاف فتویٰ نویسی میں گذری، شعروسخن سے بھی دلچسپی تھی، بمبئی میں آل انڈیا سنی جمعیۃ علماء قائم کی، تقریباً دو درجن کتابیں تصنیف کیں، ۱۹۶۰ء میں پیلی بھیت میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا لکھنویؒ کا نام لے کر مناظرہ کا چیلنج دینا شروع کیا، یہاں تک کہ ایک بار انھوں نے یہ اعلان بھی کردیا کہ مدیر النجم ہرگز میرے مقابلہ پر آنے کی ہمت نہیں کرسکتے، اگر وہ آجائیں تو میں اپنی جیب خاص سے انھیں پچاس روپے بطور نذرانہ پیش کروں گا۔

حسنِ اتفاق سے ایک نجی تقریب میں شرکت کے لیے حضرت مدیر النجمؒ امروہہ پہنچے، اس آمد کی اطلاع ان لوگوں نے مولوی نثار احمد کو بھی دے دی، چنانچہ وہ بھی پہنچ گئے اور مناظرہ طے ہوگیا۔ مقام مباحثہ جامع مسجد امروہہ طے ہوا۔ یہ مناظرہ مسلسل چھ روز تک چلتا رہا اور بالآخر فریق ثانی کی لاجوابی پر ختم ہوگیا۔ مناظرہ کا آغاز ہوتے ہی مولوی نثار احمد سے ان پچاس روپوں کا مطالبہ کیا گیا جو انھوں نے حضرت مدیر النجمؒ کو مناظرہ کے لیے آنے پر اپنی جیب خاص سے دینے کا اعلان کیا تھا۔ چنانچہ مولوی نثار احمد نے مجبوراً حسبِ وعدہ پچاس روپے نکال کر حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کردیا، مولانا نے یہ رقم خود نہ لی بلکہ ان کی طرف سے مولوی سید کاظم علی نے وصول کی اور مولانا نے یہ اعلان کردیا کہ یہ رقم امروہہ کی مذہبی و علمی ضرورت میں صرف ہوگی۔

اس مناظرہ میں جو موضوعاتِ بحث مقرر ہوئے تھے وہ یہ تھے۔

(۱) فریقین میں اہل سنّت و جماعت کون ہے۔ (۲) امکان کذب باری تعالیٰ (۳) امکان نظیر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (۴) مسئلہ علم غیب (۵) مسئلہ ندائے غیر اللہ (۶) مسئلہ قیام میلاد (۷) فاتحہ مروّجہ (۸) شرکت عرس بزرگان دین وغیرہ۔

اس چھ روزہ مناظرہ میں مولوی نثار احمد کی معاونت کے لیے دو مرتبہ ان کے مشہور عالم مولوی نعیم الدین صاحب مرادآبادی (م ۱۹۴۷ء) بھی آکر شریک ہوئے تھے، تیسری مرتبہ جب پھر انھیں اصرار کر کے بلایا گیا تو انھوں نے ایک بڑے مجمع کے سامنے کہا:

''مجھے آپ لوگ کیوں بلاتے ہیں؟ لٹیا ڈوبنا تھی سو ڈوب گئی۔''

اور یہ کہہ کر واپس چلے گئے۔ مولوی نثار احمد نے پورے مناظرہ کے دوران بے حد اشتعال انگیز اور خلافِ تہذیب انداز و الفاظ استعمال کیے کتابوں کے غلط حوالے دیئے، عبارتوں کے پڑھنے میں بڑی خیانت کی اور صریحاً علمی غلط بیانیوں سے کام لیا۔ اسی طرح بہت سی باتیں ایسی کیں جن سے ان کی کم علمی کا اندازہ ہوتا تھا مثلاً شامی جلد اوّل کی ایک عبارت میں فتاویٰ کو فتاوی پڑھا، اس پر جب ٹوکا گیا تو کہا کہ کتاب میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ احادیث کے پڑھنے میں لفظی

اور اعرابی غلطیاں بہت کیں اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (م۱۹۵۶ء) اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م۱۸۲۳ء) کے درمیان ایک مکالمہ بیان کیا جبکہ ان دونوں کے درمیان تقریباً ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا فرق ہے۔

اس مناظرہ میں علماء حق کی طرف سے جو دلائل پیش کیے گئے ان میں بعض کے جواب میں تو معقول یا نا معقول کسی قسم کا جواب الجواب باوجود بار بار کے مطالبہ کے مولوی نثار احمد نے نہ دیا البتہ بعض دلائل کا جواب دیا مگر اس کے جواب الجواب کے بعد بالکل سکوت اختیار کر لیا اور کچھ نہ بولے۔ وہ یہاں تک لاجواب ہو گئے کہ مسائل زیر بحث میں اپنا مسلک تک بدل دیا یعنی جن چیزوں پر پہلے وہ اتنا زور دے رہے تھے کہ ان کو مدارِ مسلکِ اہل سنّت قرار دیتے تھے مگر بحث میں وہ یہاں تک نیچے اتر آئے کہ ان چیزوں کو صرف مباح کہا اور کہا کہ کرو تو الحمد للہ نہ کرو تو الحمد للہ۔ اس بات سے سب نے سمجھ لیا کہ ایسی غیر ضروری باتیں ہرگز مدار مسلک اہل سنّت نہیں ہو سکتیں۔ علم غیب کے مسئلہ میں بھی وہ اپنے اصلی اعتقاد سے ہٹ کر اہل حق کے قریب آ گئے۔

مناظرہ کے دوران مولوی نثار احمد نے اپنے اعتقادات کے سلسلے میں جن جن باتوں کا دعویٰ کیا تھا انھیں وہ آخر تک معتبر و مستند کتب سے ثابت نہیں کر سکے۔ جب ایک مسئلہ پر ان کے پاس دلائل ختم ہو جاتے تو فوراً اسے ادھورا چھوڑ کر دوسرا نیا مسئلہ چھیڑ دیتے۔ یہی روش انھوں نے آخر تک باقی رکھی، یہاں تک کہ جب یہ اندازہ ہو گیا کہ اب مولوی نثار احمد کے پاس دلائل اور براہین کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اور اب وہ کسی وقت بھی کوئی ایسی تدبیر کریں گے کہ مجلس مناظرہ میں انتشار ہو جائے اور وہ درہم برہم ہو جائے تو صدر جلسہ جناب سید علی متقی خان صاحبؒ نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی صلح کل کی حکمت عملی کی مثال دیتے ہوئے دونوں فریق سے مصالحت کی اپیل کی، چنانچہ مولوی نثار احمد نے اس نادر موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کر حضرت مولاناؒ کی خدمت میں آئے اور بڑی بے تکلفی سے ہاتھ پکڑ کر انھیں علیحدہ لے گئے اور دیر تک گفتگو کرتے رہے جس میں سے یہ الفاظ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

> ''مولانا میں بھی شریف کا لڑکا ہوں، پاجی نہیں ہوں، تمام عمر آپ کی اس عنایت کو یاد رکھوں گا، جہاں کہیں آپ تشریف لے جائیں ایک کارڈ مجھے ڈال دیجیے گا، میں فوراً حاضرِ خدمت ہو جایا کروں گا، آپ مجھے آزما لیجیے، اس میں کبھی فرق نہ ہوگا۔''[1]

---

[1] فتح حقانی بر فرقۂ رضا خانی، دوسرا ایڈیشن، ص ۸۶

مصالحت منظور ہو جانے کے بعد مولوی نثار احمد نے خواہش ظاہر کی کہ انھیں ایک ایسی تحریر لکھ کر دے دی جائے کہ وہ ہمارے نزدیک کافر نہیں ہیں۔ مولانا لکھنویؒ نے فرمایا کہ میں نے پہلے بھی کبھی آپ کو کافر نہیں کہا تھا لہٰذا مجھے اس تحریر کے لکھ دینے سے انکار نہیں ہے، چنانچہ آپ نے درج ذیل تحریر مولوی صاحب کو لکھ کر دے دی:

''جو عقائد دوران مناظرہ میں آج تک جناب مولوی نثار احمد صاحب کی طرف سے ظاہر ہوئے ہیں اگر چہ وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہیں بلکہ خلاف دلائل شرعیہ ہیں مگر پھر بھی ان کی بنا پر ہم ان کو کافر و مشرک نہیں کہتے ہیں اور نہیں سمجھتے۔ اگر کسی نے عقائد مذکورہ بالا کی بنا پر ان کو کافر و مشرک کہا ہو تو ہم اس سے متفق نہیں ہیں۔''

اسی طرح کی ایک تحریر مولوی نثار احمد نے بھی لکھ کر دے دی اور مناظرہ ختم ہو گیا مگر اپنے بہترین اثرات سرزمین امروہہ پر چھوڑ گیا جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ فریقین کے اصرار پر صدر جلسہ اور حکم مناظرہ جناب سیّد علی متقی خان صاحب رئیس امروہہ نے اپنا فیصلہ لکھ کر فریقین کو دے دیا جس کے جستہ جستہ اقتباسات نیچے پیش کیے جا رہے ہیں:

''مولانا عبدالشکور صاحب ہرگز اس مناظرہ کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے اور اگر ان کے احباب و معتقدین ان کو سخت مجبور نہ کرتے تو وہ ہرگز مناظرہ کے لیے تیار نہ ہوتے، اس لیے نہیں کہ ان کو مولانا نثار احمد صاحب سے بحث میں شکست کھانے کا خوف تھا یا وہ اپنے عقائد کو بہترین طریقہ سے ثابت کرنے سے قاصر تھے بلکہ محض اس لیے کہ وہ مسلمانوں کے غیر ضروری اختلافات کے مہلک نتائج کو سمجھتے ہیں اور بجائے مسلمانوں سے بحث کرنے کے دشمنانِ اسلام کے حملوں کی مدافعت ہی کو اپنا فرض جانتے ہیں۔

چھ روز تک جو کچھ بحث اختلافی مسائل پر ہوئی اس میں مولانا محمد عبدالشکور صاحب بہت غالب رہے اور جس قدر مسائل پر مختتم یا غیر مختتم بحث ہوئی ان میں سے کسی ایک کی نسبت بھی مولانا شاہ نثار احمد صاحب یہ نہ ثابت کر سکے کہ جو لوگ ان کے ہم عقیدہ و ہم خیال نہیں ہیں وہ دائرہ اسلام یا گروہ اسلام سے خارج سمجھے جانے کے قابل ہیں، یہ کہنا کہ مولوی محمد عبدالشکور صاحب اپنی کمزوری کی وجہ سے صلح پر آمادہ ہوئے سراسر لغو اور غلط ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد عبدالشکور صاحب نے اپنی بحث میں غلط اور غیر متعلق حوالہ جات دینے سے انتہائی احتیاط برتی اور ان کا کوئی حوالہ چھ روزہ بحث کے دوران غلط ثابت

نہیں ہوا لیکن مولانا نثار احمد صاحب کے حوالہ جات میں ان کے کسی مشیر کی نالائقی یا حافظہ کی کمزوری سے بعض حوالہ جات ثابت نہ ہو سکے...... یہ بھی ضروری ہے کہ مولانا شاہ نثار احمد صاحب اپنی تقریر میں کبھی کبھی ایسے سخت اور ناقابلِ برداشت جملے کہہ گذرتے تھے کہ فریق مخالف میں اشتعال پیدا ہو جاتا تھا، میں گھبرا اٹھتا تھا اور امن وامان قائم رکھنے کے لیے مجھ کو سخت جدوجہد کرنا پڑتی تھی، یہاں تک کہ خود شاہ صاحب موصوف بعض اوقات اپنے نفقرات پر اظہارِ ندامت فرماتے اور معافی چاہتے تھے۔ مولانا عبدالشکور صاحب نے اشتعال پیدا کرنے والے اور دل آزار جملے کبھی استعمال نہیں کیے اور ان کی تقریر سے غصہ یا اشتعال کبھی نہیں ظاہر ہوا۔ ان کے تمام الفاظ نہایت سنجیدہ اور نرم ہوتے تھے، ان دونوں حضرات کے طرزِ تقریر ولہجہ میں ایک عظیم الشان فرق تھا[1]"

اس مباحثہ کا نتیجہ بہت اچھا رہا۔ لوگوں پر مسلکِ منکشف ہو گیا اور بہت سے لوگ راہِ راست پر آ گئے تھے۔ سب سے زیادہ عبرت ناک نتیجہ یہ ہوا کہ امروہہ کے شیعوں نے جن کے اکسانے سے علماء بریلی نے یہ مباحثہ کرایا تھا اپنا رشتۂ ہمدردی ان علماء سے ناراض ہو کر منقطع کر لیا اور پھر کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے مجدد وامام احمد رضا خاں صاحب بریلوی کا ایک پرانا رسالہ "ردالرفضہ" کی رد میں امروہہ کے شیعوں نے ایک رسالہ "ارغام الکفرہ" کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا اس میں مولوی احمد رضا خاں صاحب کو گالیاں دینے کے علاوہ انھیں شیعی امراء کا مرہونِ منت بتلایا گیا اور بالخصوص نواب رام پور کے دسترخوان کا خوشہ چین ثابت کیا گیا۔ صحابۂ کرام کی شان میں جو گستاخیاں اس رسالہ میں کی گئی تھیں انھیں تو کوئی شریف آدمی اپنے کانوں سے سُننا پسند نہیں کر سکتا مگر اس کے بعد بھی ان بریلوی علماء کی آنکھیں نہیں کھلیں[2]

۶۔ مناظرہ بھاگلپور ۱۹۲۷ء

اس مناظرہ کے انعقاد کا سبب بھی وہی تھا جس کو ہم "مناظرہ کچھوچھہ" میں لکھ آئے ہیں یعنی یہ کہ یہاں کے اطراف میں کچھ دنوں سے شاہ علی حسین صاحب کچھوچھوی اپنے کو کچھوچھہ کا سجادہ نشین بتاتے ہوئے بحیثیت ایک پیرومرشد کے آنے لگے اور یہاں کے غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اپنا مرید بنانا شروع کیا۔ اس کام میں ان کے معاون مولوی احمد اشرف کچھوچھوی اور مولوی

---

[1] فتح حقانی بر فرقۂ رضا خانی، دوسرا ایڈیشن، ص ۹۲-۹۴ [2] ایضاً

سید محمد محدث کچھوچھوی بھی تھے۔ اسی علاقہ میں ایک بزرگ اور عالم دین مولانا سید شاہ غنیمت حسین صاحبؒ جو اسی خاندان کچھوچھہ سے نسبی تعلق رکھتے تھے، پہلے سے قیام پذیر تھے، انہی کے یہاں شاہ صاحب مذکور اپنی خاندانی نسبت کی بنا پر آ کر ٹھہرا کرتے تھے، چونکہ مولانا شاہ غنیمت حسین صاحبؒ کا اس علاقہ میں بڑا اثر تھا اس لیے ان کی میزبانی شاہ صاحب کی گرمیٔ بازار کا سبب بن گئی اور یہاں ان کے قدم جمنے لگے۔ اس وقت اس علاقہ میں مسلمانوں کے اندر بے دینی کی بہت سی باتیں مروّج تھیں لہٰذا ان میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے شاہ صاحب نے ان خلاف شریعت باتوں کے جواز میں فتوے دینا شروع کر دیئے اور ان فتوؤں کو جو جائز نہ سمجھتا اس کے خلاف بھی کفر کے فتوے دینے لگے۔ شاہ صاحب نے یہاں اپنا اثر بڑھانے کے لیے یہ منصوبہ تیار کیا کہ سب سے پہلے بہار کی مقدس ترین شخصیت حضرت مولانا شاہ محمد علی صاحب مونگیریؒ خلیفہ ارشد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادیؒ اور مولانا شاہ غنیمت حسین صاحبؒ کو نشانہ بنایا جائے کیونکہ جب تک ان دونوں حضرات کا اثر کم نہ کیا جائے گا اس وقت تک بہار کے مسلمانوں کو اپنے زیر اثر نہیں لایا جاسکتا۔ شاہ جی کی زہریلی تقریروں سے علاقہ کے مسلمانوں میں سخت بے چینی اور انتشار پیدا ہونے لگا۔ شہر کے نواح میں پہلام نامی بستی میں شاہ جی کے مریدوں کی آبادی زیادہ تھی اور مبارکپور ضلع مونگیر میں حضرت مولانا شاہ محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین کی کثرت تھی۔ ان دونوں بستیوں کے مسلمانوں میں انہی اسباب سے آپس میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ وہاں کے مسلمانوں نے طے کیا کہ متنازعہ معاملات کو دور کرنے کے لیے دونوں طرف کے علماء کو بلا کر بات چیت کی جائے اور ان کو رفع کیا جائے۔ چنانچہ ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو بمقام پہلام مناظرہ کے مبادی طے کرنے کے لیے فریقین کے علماء اور عام مسلمانوں کا اجتماع ہوا، اس میں علمائے حق اہل سنت کی طرف سے مولانا سید شاہ غنیمت حسین صاحبؒ، مولانا عبدالوہاب صاحبؒ مہتمم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مولانا سید فضل اللہ صاحبؒ نبیرہ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا عبدالاحد صاحبؒ صدر مدرس مدرسہ احمدیہ مدھوبنی، اور مولانا عبدالصمد مونگیریؒ نے شرکت کی اور رضاخانیوں کی طرف سے مولانا سید محمد فاخر بیخودؔ سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الٰہ آباد، مولوی سید محمد صاحب ''محدث'' عرف سیدن میاں کچھوچھوی، مولوی مصطفیٰ اشرف کچھوچھوی اور مولوی شاہ علی حسین کچھوچھوی

کے نام شرکاء میں ملتے ہیں۔ بہرحال بڑی بحث و تمحیص کے بعد مناظرہ کے لیے حسب ذیل موضوعات طے ہوئے:

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب سمجھنا (۲) بزرگوں کے مزارات پر بکرا چڑھانا اور ذبح لغیر اللہ کا مسئلہ (۳) تعزیہ داری (۴) قبروں پر چڑھاوا چڑھانا، سجدہ کرنا اور طواف کرنا (۵) فاتحہ مروّجہ کی حقیقت اور (۶) بدعت کی حقیقت وغیرہ۔

مخالفین کی طرف سے اصرار کیا گیا کہ مقامی نزاعات سے اس مناظرہ کو کوئی تعلق نہ ہو بلکہ صرف حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ کے ایمان کی بحث ہو اور دوسرے یہ کہ مناظرہ کا کوئی حکم مقرر نہ ہو بلکہ ہر فریق اپنا حکم جس کو چاہے منتخب کر لے تاکہ اس کا نتیجہ متعین نہ ہو سکے، اس طرح کے اور بہت سے دوسرے مسائل بھی آئے۔ چنانچہ بڑی رد و کد کے بعد مختلف معاملات پر اتفاق رائے ہو گیا۔ پہلے دن کا مناظرہ مبارکپور میں اور دوسرے دن کا مناظرہ پہلام میں ہونا طے ہوا، رضاخانی حضرات کی طرف سے اعلان ہوا کہ ان کی طرف سے مولانا فاخر الٰہ آبادی مناظر ہوں گے اور اہل سنت کی طرف سے اعلان ہوا کہ ان کی طرف سے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ مناظر ہوں گے۔ یہ بھی طے ہوا کہ پہلے دن مخالف مناظر سائل ہوں گے اور اہل سنت مناظر مجیب اور دوسرے دن اہل سنت مناظر سائل اور مخالف مناظر مجیب ہوں گے۔ اس طرح مبارکپور میں ۲۲ ؍اکتوبر ۱۹۲۷ء کو مناظرہ شروع ہوا۔ اہل سنت نے اپنی جماعت کا صدر جناب مولانا عبدالوہاب صاحبؒ مہتمم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کو مقرر کیا اور رضاخانی حضرات نے اپنا صدر مولوی سید مصطفیٰ اشرف کچھوچھوی کو قرار دیا۔ پہلی تقریر مولانا فاالٰہ آبادی کی ہوئی انھوں نے بغیر خطبۂ مسنون پڑھے کہا کہ میری دلی تمنا اور دیرینہ آرزو مولانا عبدالشکور صاحب سے بحث کی تھی وہ آج پوری ہوئی۔ پھر آپ نے برسرِ عام یہ اعلان کیا کہ میں صاف صاف اپنا عقیدہ بتائے دیتا ہوں:

”میں گور پرست ہوں، قبر کو سجدہ کرنا جائز سمجھتا ہوں، سجدۂ تعظیمی ہمارے یہاں حرام نہیں ہے، تعزیہ کو میں شبیہ کربلائے معلّٰی جانتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جمیع ما کان و ما یکون کا عالم الغیب سمجھتا ہوں اور اس پر یقین رکھتا ہوں اور نذر لغیر اللہ کو بھی جائز سمجھتا ہوں۔“[1]

---

[1] نصرت آسمانی بر فرقہ رضاخانی، ص ۸

اس کے بعد آپ نے کہا کہ کل آپ حضرات نے حفظ الایمان، تحذیر الناس اور براہینِ قاطعہ کے متعلق کہا تھا کہ ہم میں سے بعض نے بعض اجزاء کا مطالعہ کیا ہے۔ لہٰذا میں سب سے پہلے حفظ الایمان ہی کی ایک عبارت پڑھ کر سناتا ہوں:

''پھر یہ کہ آپ کی ذات مقدسہ پر علم الغیب کا حکم کیا جانا اگر بقولِ زید صحیح ہو تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب، اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی کیا تخصیص ہے، ایسا علم غیب تو زید عمرو بکر بلکہ ہر صبی، مجنوں بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔''

دیکھیے اس عبارت میں کس قدر توہینِ سرکار دو عالم روحی فداہ کی ہے کہ آپ کے علم کا انکار کیا۔ اس پر بھی دل کی گرمی نہ نکلی اور کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا تو آپ کے علم کو صبی، مجنوں اور بہائم کے علم سے تشبیہ دی۔ اگر اس میں توہین رسول نہیں ہے تو ہم اس کے دو فوٹو کھینچتے ہیں، پہلا فوٹو یہ ہے کہ اگر ہم یوں کہیں کہ مولوی محمد علی صاحب عاملہ اللہ کما یستحقہ، کو عالم کہا جائے تو اس کے دو معنی ہیں، کل علوم کا عالم کہو تو یہ معنی غلط ہیں اور اگر بعض علوم کا عالم کہو تو ہر پاگل و چوپایہ بھی بعض علوم کا عالم ہوتا ہے۔ دوسرا فوٹو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر معبود کہو تو اگر کل کا معبود کہو تو غلط اور اگر بعض کا معبود کہو تو اس میں خدا کی کیا تخصیص پتھر بھی بعض کے معبود ہیں۔ اب آپ خود غور کر لیں کہ ان مثالوں کو آپ کس قدر توہین آمیز سمجھتے ہیں، یہ واضح رہے کہ یہاں علم غیب کی بحث نہیں ہے کہیں آپ اس کے جواب میں علم غیب کی بحث کو نہ چھیڑ دیں، یہاں تو بحث توہینِ رسول کی ہے اور بس[۱]

مولانا فاخر الہ آبادی یہ تقریر لکھ کر لائے تھے جسے انھوں نے پڑھ کر سنایا تھا، اس کے بعد آپ اپنا پورا وقت استعمال کیے بغیر ہی بیٹھ گئے۔ اس طرح ان کا سارا وقت اسی ایک سوال کی نظر ہو گیا تھا۔ چنانچہ مولانا لکھنویؒ نے اس دن مناظرہ میں پانچ تقریریں یکے بعد دیگرے اسی الزام کے جواب میں کی تھیں جن کا خلاصہ یہاں ہم پیش کر رہے ہیں۔ ہمارا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ مناظروں میں اٹھائے جانے والے ان متنازعہ مسائل میں آپ کی رائے ان اوراق میں محفوظ ہو جائے۔ مولانا فاخر کے جواب میں مولانا نے فرمایا:

''مخاطب کا یہ فرمانا کہ یہ بحث علم غیب کی نہیں ہے عجیب بات ہے، حفظ الایمان کی جو عبارت

---

[۱] نصرت آسمانی بر فرقہ رضاخانی، ص ۱۱

آپ نے پڑھی اس میں علم غیب ہی کی بحث ہے، جب تک یہ مسئلہ بیان نہ کیا جائے یہ عبارت حل ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ اس بحث سے بچنے کی آپ کیوں کوشش کرتے ہیں اور اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ باوجود کوشش کے آپ اس بحث سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ ہمارے مخاطب صاحبان اپنے سنی ہونے کا دعویٰ تو بڑے زور و شور سے کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنے سوا نہ کسی دوسرے کو سنی سمجھتے ہیں نہ حنفی، مگر افسوس ہے کہ عقائد سے لے کر اعمال تک ہر چیز میں یہ حضرات قرآن مجید کے خلاف، احادیث کے خلاف اور فقہ حنفی کے خلاف ہیں، چنانچہ یہی مسئلہ علم غیب اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے۔ یہ حضرات جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب داں مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جمیع ما کان و ما یکون کا علم حضور کو حاصل تھا، آپ دیکھئے کہ یہ عقیدہ قرآن شریف کے کس قدر خلاف ہے، میں اس وقت دو آیتیں پیش کرتا ہوں:

(۱) قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ. (سورۂ نمل:۶۵)

(۲) وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ. (سورۂ یٰسین:۶۹)

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ (اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے کہ سوا اللہ کے نہ کوئی آسمان کا رہنے والا غیب کو جانتا ہے اور نہ زمین کا رہنے والا۔ دیکھئے اس آیت میں کس قدر صاف طور پر علم غیب کو مخصوصات الٰہی میں ہونا بیان فرمایا گیا ہے، کیا اس کے بعد بھی کوئی مسلمان اس کے خلاف عقیدہ رکھ سکتا ہے؟ دوسری آیت میں فرمایا کہ...... ہم نے اپنے نبی کو شعر کا علم نہیں دیا اور یہ علم ان کی شان کے لائق (بھی) نہیں ہے۔ شعر بھی ما کان و ما یکون میں سے ایک چیز ہے، جب اس کی نفی ہو گئی تو جمیع ما کان و ما یکون کہاں رہ گیا۔ پھر اس آیت میں یہ بھی فرمایا کہ شعر کا علم نبی کی شان کے لائق نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ما کان و ما یکون میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا علم شانِ نبوت کے خلاف ہے لہٰذا صاف ظاہر ہو گیا کہ جمیع ما کان و ما یکون کا علم حضورؐ کے لیے ثابت کرنا شانِ نبوت کی توہین کرنا ہے۔ ان آیاتِ قرآنیہ کے بعد اب ہمارے فقہائے حنفیہ کے فتوے بھی ملاحظہ ہوں۔ علامہ محقق ابن ہمام شارح ہدایہ جو ہمارے فقہائے حنفیہ کی جماعت میں صاحبِ اجتہاد مانے گئے ہیں وہ اپنی کتاب ''مسایرہ'' میں لکھتے ہیں: وکذا علم المغیبات ای کعدم علم بعض المسائل عدم علم المغیبات فلایعلم النبی الاعلمه الله احیاناً وذکر الحنفیه فی فروعهم تصریحاً بالتکفیر باعتقادان النبی منها یعلم الغیب معارضة قوله تعالیٰ ''لایعلم من فی السموٰتِ والارض الغیب الا الله۔'' اور ایسا ہی غیب کی باتوں کا علم (ہے)، یعنی

جس طرح بعض مسائل کا علم نہیں اسی طرح غیب کی باتوں کا بھی علم نہیں ہے۔ نبی غیب کی باتیں صرف اسی قدر جانتے ہیں جو کبھی کبھی اللہ نے ان کو بتائیں اور حنفیہ نے اپنی فقہ کی کتابوں میں اس شخص کے کافر ہونے کی تصریح کی ہے جو یہ عقیدہ رکھے کہ نبی غیب جانتے تھے کیونکہ یہ عقیدہ آیتِ قرآنی (قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ) کے خلاف ہے۔

علامہ علی قاری مکیؒ ہمارے امام اعظم کی کتاب ''فقہ اکبر'' کی شرح میں لکھتے ہیں: ثم اعلم ان الانبیاء علیھم السلام لم یعلموا الغیبات الاما اعلمھم الله تعالیٰ احیاناً وذکر الحنفیه تصریحاً بالتکفیر باعتقادان النبی علیه السلام یعلم الغیب لمعارضة قوله تعالیٰ ''قُلْ لا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (ترجمہ) پھر جاننا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام غیب کی باتیں نہیں جانتے مگر جس قدر کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کبھی ان کو بتائیں اور حنفیہ نے اس شخص کو کافر لکھا ہے جو یہ عقیدہ رکھے کہ نبی علیہ السلام غیب جانتے تھے کیونکہ یہ عقیدہ آیت قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ کے خلاف ہے۔

علامہ ابن نجیمؒ جن کو محرر المذہب النعمانی ابوحنیفۃ الثانی کا لقب دیا گیا ہے اپنی کتاب بحر الرائق میں بحوالہ فتاویٰ قاضی خاں و فتاویٰ خلاصہ لکھتے ہیں:

وفی الخانیة والخلاصة لاتزوج بشهادة الله ورسوله لاینعقد ویکفر لاعتقاد ان النبی یعلم الغیب (ترجمہ) فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ خلاصہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول کو گواہ قرار دے کر نکاح کرے تو نکاح نہ ہوگا اور وہ کافر ہو جائے گا بوجہ اس عقیدہ کے کہ نبی غیب جانتے تھے۔

افضل المتاخرین حضرت مولانا محمد عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ اپنے فتوے میں لکھتے ہیں:
ودر شریعت محمدیہ ثابت نہ شدہ کہ آنحضرت برتمامی علوم جمیع اشیاء ماضیہ ومستقبلہ جزئیہ وکلیہ اطلاع داشتند الا ماشاء اللہ تعالیٰ (مجموعۃ الفتاویٰ جلد اول ص ٦، مطبوعہ شوکت الاسلام پریس لکھنؤ)

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ عقیدہ غیب دانی کا آپ حضرات نے شیعوں سے لیا ہے، یہ خاص عقیدہ انہی کا ہے کہ وہ ائمہ کو عالم ماکان وما یکون جانتے ہیں۔ سنیے! حضرت پیرانِ پیر سیدی عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ''غنیۃ الطالبین'' میں فرماتے ہیں ''روافض کے عقائد باطلہ میں سے ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اپنے اماموں کو عالم ماکان وما یکون جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو ہر چیز کا علم ہے۔''

اس کے بعد دیگر کتب روافض سے بھی اس کی شہادت پیش کی گئی جوان رضا خانیوں پر ابھی

طرح چسپاں ہوگئی اور ہر شخص سمجھ گیا کہ بیشک ان کا یہ عقیدہ روافض سے ماخوذ ہے۔ حفظ الایمان کی عبارت کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

''بغور سنیئے! مولانا اشرف علی صاحبؒ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب کہنا کیسا ہے، مولانا اس کا جواب دیتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ عالم الغیب کہنا ناجائز ہے کیونکہ عالم الغیب کے دو ہی معنی ہیں، اوّل کل غیبوں کا جاننے والا تو یہ معنی نصوص قرآنیہ کے خلاف ہے، دوسرے بعض غیبوں کا جاننے والا تو یہ بات بہائم وغیرہ میں بھی پائی جاتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے منع کر رہے ہیں کہ جس سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تشبیہ ان رذیل اشیاء کے ساتھ لازم آئے نہ کہ وہ تشبیہ دے رہے ہیں مگر بات یہ ہے کہ:

ہنر بہ چشم عداوت بزرگ تر عیب است

دو مثالیں جو آپ نے پیش کیں جن کو آپ دو فوٹو کہتے ہیں یعنی مولانا محمد علی صاحب کے عالم ہونے اور خدا کے معبود ہونے کی تو وہ یہاں منطبق نہیں ہوتیں کیونکہ حضرت مولانا محمد علی صاحب (مونگیری) کو ہم عالم مانتے ہیں اور خدا کو معبود جانتے ہیں لہٰذا عالم ہونے اور معبود ہونے کی کسی شق کو اگر ہم رذیل اشیا سے تشبیہ دیں تو یقیناً توہین ہوگی مگر اس کے برخلاف رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو مولانا اشرف علی صاحب ہی نہیں بلکہ اہل سنّت و جماعت میں سے کوئی شخص بھی عالم الغیب نہیں مانتا لہٰذا عالم الغیب ہونے کی کسی شق کی اگر رذائل سے تشبیہ ہو تو کوئی توہین نہیں۔ اگر وہ حضورؐ کو عالم الغیب جانتے اور پھر علم غیب کی کسی صورت کو رذیل اشیاء سے تشبیہ دیتے تو بیشک توہین ہوتی۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب کے متعلق ''کمایستحقه'' کا لفظ بول کر آپ نے مسلمانوں کی دلآزاری کی ہے مگر ہم اس کا بدلہ لینا نہیں چاہتے خدا خود اپنے اولیاء کی طرف سے بدلہ لینے کو کافی ہے۔''

مولانا فاخر الہ آبادی نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ حضور کو جمیع ما کان وما یکون کا علم اخیر عمر میں عطا ہوا تھا لہٰذا جن آیات میں اس کی نفی ہوتی ہے وہ آیات اس سے پہلے کی ہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

''جو آیتیں میں نے یہاں پیش کی ہیں ان کی بابت پھر آپ نے کہا کہ یہ پہلے کی ہیں، استغفر اللہ! بتلانے پر بھی آپ نہیں سمجھتے کہ اصول میں یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے کہ نسخ احکام میں ہوتا ہے نہ کہ اخبار میں، یہ مسئلہ بالکل عقلی ہے کہ اخبار میں اگر تخالف ہو تو دروغ بیانی کہی جائے گی

نسخ نہیں کہا جائے گا، ذرا سوچیے تو آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر آپ کی بات صحیح ہے تو کیا اخیر عمر میں حضور کو شعر کا علم بھی عطا فرما دیا گیا تھا جس کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَمَا یَنْبَغِیْ لَہٗ، یعنی یہ چیز نبی کے لائق نہیں، کیا جو چیز لائق نہ تھی وہ بھی دے دی گئی؟ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ۔ لیجیے میں ایک آیت اور پڑھتا ہوں جس سے صاف معلوم ہوگا کہ اخیر عمر میں بھی جمیع ما کان وما یکون کا علم آپ کو عطا نہ ہوا تھا:

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرسل فیقول ماذا اجبتم قالو لاعلم لنا انک انت علام الغیوب۔ (مائدہ:۱۰۹) ترجمہ: جس دن جمع کرے گا اللہ رسولوں کو پھر پوچھے گا کہ تمھیں کیا جواب دیا گیا تو رسول کہیں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں، تو ہی جاننے والا ہے غیبوں کا۔ دیکھیے قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی غیب دانی اور عالم جمیع ما کان وما یکون ہونے کا انکار کر رہے ہیں اور غیب دانی کو حق تعالیٰ کے مخصوصات میں بتلاتے ہیں۔ اس سلسلہ کی ایک دوسری آیت بھی پیش کرتا ہوں۔ ورسلاً قد قصصنھم علیک من قبل ورسلاً لم نقصصھم علیک (سورہ نساء:۱۶۴) یعنی کچھ رسول ایسے ہیں کہ جن کے احوال ہم نے آپ کو سنائے اس سے پہلے اور کچھ رسول ایسے ہیں کہ جن کے احوال ہم نے آپ کو نہیں سنائے ...... بھلا دیکھیے تو انبیاء علیہم السلام جو ما کان کے اشرف افراد ہیں جب ان اشرف افراد میں بھی سب کا علم آپ کو نہیں دیا گیا تو جمیع ما کان وما یکون کا علم کہاں رہا۔

مولانا فاخر الہ آبادی کے اس اعتراض پر کہ آپ لوگوں کو حضور کے بکثرت علوم غیبیہ پر مطلع ہونے کا تو اقرار ہے مگر پھر بھی آپ لوگ حضور کی غیب دانی کا انکار کرتے ہیں، یہ تضاد بیانی کیوں ہے؟ مولانا اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں:

''علمی کتابوں میں یہ بات طے ہو چکی ہے اور عرفِ عام بھی اس کا شاہد ہے کہ کسی شخص کو کسی چیز کا عالم کہنے کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ شخص اس چیز کے تمام افراد کا علم رکھتا ہو، دوسرے یہ کہ اس کے اکثر افراد کا علم رکھتا ہو، مثلاً علم طب کا عالم اسی کو کہیں گے جو طب کے تمام مسائل جانتا ہو یا ان کی اکثر مقدار کا علم رکھتا ہو، دو چار، دس بیس مسائل طب کا جاننے والا عالم طب نہ کہا جائے گا، علیٰ ہذا فقہ کا عالم اسی شخص کو کہیں گے جو فقہ کے تمام مسائل یا اکثر مسائل کو جانتا ہو، دس بیس مسئلہ فقہ کے جاننے سے علم فقہ کا عالم نہیں کہا جا سکتا، لہٰذا غیب کا عالم اسی کو کہیں گے جو غیب کی تمام جزئیات کو جانتا ہو۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی تمام جزئیات کا جاننے والا

تو آپ لوگ بھی نہیں کہتے لہٰذا اس اعتبار سے تو آنحضور کو غیب داں یا عالم الغیب نہیں کہہ سکتے، اب رہی دوسری صورت یعنی غیب کی اکثر جزئیات کا جاننا تو اکثریت کا حکم لگانے کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے، اول یہ کہ غیب کی کل جزئیات کی تعداد معلوم ہو کہ وہ کتنی ہے۔ دوم یہ کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی جتنی جزئیات پر اطلاع دی گئی ان کی تعداد معلوم ہو اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں مجہول ہیں، نہ غیب کی کل جزئیات کی تعداد کسی کو معلوم ہے اور نہ ہی اس میں جتنی باتوں پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی اس کی تعداد کا کسی کو علم ہے، لہٰذا یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ حضور کو اکثر غیب کی جزئیات پر اطلاع دی گئی تھی لہٰذا اس اعتبار سے بھی آپ کو غیب داں یا عالم الغیب نہیں کہہ سکتے۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بکثرت امور غیبیہ پر اطلاع دی گئی مگر چونکہ یہ نہیں معلوم کہ وہ غیب کی کل مقدار کے لحاظ سے اکثر ہیں یا نصف یا نصف سے کم۔ اس لیے آپ کو غیب داں یا غیب کا جاننے والا یا عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں علم غیب کو حق تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص کیا اور انبیاء علیہم السلام کے لیے اظہار و اطلاع کا لفظ ارشاد فرمایا نہ کہ علم کا۔ اس لیے حضور کے عالم الغیب ہونے کا انکار کرنا ایمان کا حصہ ہے کیونکہ قرآن مجید نے اس کا حکم دیا ہے کہ کہہ دو اللہ کے سوا کوئی غیب کو نہیں جانتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بندوں کے لیے علم کا وسیع ہونا کوئی کمال ہے یا نہیں اس لیے واضح رہے کہ علم کا ایک معنی وہ ہے جو لغت میں ہے یعنی مطلق جاننا خواہ وہ کسی شے کا جاننا ہو اور ایک معنی وہ ہے کہ معارفِ الٰہیہ اور علوم ربانیہ کا جاننا۔ شریعت انہی چیزوں کے جاننے کو علم کہتی ہے۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی چیزوں کے علم کو خود حضورؐ نے اپنے لیے کمال نہیں سمجھا اور اس لیے اپنی برأت فرمائی۔ صحیح مسلم وغیرہ میں تابیر نخل کی حدیث دیکھیے کہ جب حضور کے منع فرمانے سے صحابہ کرامؓ نے تابیر نخل نہ کی تو اس سال پھل کم آئے، جب حضورؐ سے یہ بات عرض کی گئی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا تم جیسے پہلے کرتے تھے ویسا ہی کرو۔ انتم اعلم بامور دنیا کم یعنی تم اپنی دنیا کی چیزوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ اس طرح دنیا کو آپ نے اپنی طرف منسوب بھی نہ فرمایا۔''

علم غیب کی یہ بحث مناظرہ کے پہلے روز سارے دن چلی مگر مولانا فاخرالہ آبادی برابر یہی کہتے رہے کہ حفظ الایمان کی عبارت میں توہین رسول ہوئی ہے اس کا کوئی جواب آپ نے نہیں دیا۔ چنانچہ اپنی آخری تقریر میں مولانا لکھنویؒ نے مولانا فاخرالہ آبادی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''توہین توہین آپ بار بار کہتے ہیں لیکن جو تشفی بخش جواب میں نے دیا اس کا رد نہ آپ نے کیا اور نہ کر سکتے ہیں۔ رہا آپ کے علماء کرام کا فتویٰ تو سچی بات یہ ہے کہ آپ کے علماء کرام کی تکفیر و توہیب سے تو ہندوستان کا کوئی بھی نامور عالم نہیں بچا حتیٰ کہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ، حضرت مولانا شیخ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ پر آپ کے علماء کرام فتوے دے چکے ہیں۔ آخر آخر میں آپ کے مقتدائے مطلق مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلیؒ پر ایک سو ایک کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ افسوس ہے کہ مولوی احمد رضا خاں کی شان میں جو کچھ آپ نے پڑھا اس کو یاد کر لیا لیکن آپ کو یہ پتہ نہ چلا یا نہ چل سکا کہ علمی میدان میں ان کی تحریرات کے بھروسہ پر جانا سوائے ندامت و شرمندگی کے اور کوئی پھل نہیں دے سکتا۔ میں نے آیات قرآنیہ پیش کیں آپ ان کا کچھ جواب نہ دے سکے۔ آپ کی پیش کردہ آیات کا میں نے صحیح مطلب بیان کر کے آپ کے استدلال کی غلطی واضح کر دی تو اس کا بھی آپ کچھ نقض نہ کر سکے۔ حدیثیں پیش کیں اور فقہائے حنفیہ کے فتوے پیش کیے تو ان کا بھی آپ جواب نہ دے سکے اور سوائے زبانی باتوں کے کوئی کتابی حوالہ آپ نے نہ دیا۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی شخص آپ لوگوں کو سنّی حنفی کہے گا۔ افسوس کہ سارا وقت آپ نے انہی باتوں میں صَرف کر دیا۔''

دوسرے دن یعنی ۲۳؍اکتوبر ۱۹۲۷ء اسی مناظرہ کا دوسرا دور بمقام پالام بختیار پور ضلع مونگیر میں شروع ہوا اور اس میں عالم اہل سنّت مولانا لکھنویؒ سائل اور رضا خانی مناظر مولانا فاخر الٰہ آبادی مجیب قرار پائے۔ مولانا لکھنویؒ نے اپنی تقریر میں کہا کہ مجھے آج سوال کرنے کا حق ہے لہٰذا میں خاص انہی مسائل کو بحث کے لیے منتخب کرتا ہوں جن کے سلسلے میں یہاں کے مسلمانوں میں نزاع ہے، حق تعالیٰ اس نزاع کو باحسن وجوہ دور فرمائے۔ یہاں جن مسائل پر نزاع ہے ان میں سے ایک مسئلہ جانوروں کو قبور پر چڑھانے اور دوسرا ذبح لغیر اللہ کا ہے۔ ان دو مسئلوں کے بعد ان شاء اللہ بقیہ مسائل بھی پیش کروں گا۔ اب ہمارے فاضل مخاطب بیان فرمائیں کہ ان دو مسائل میں ان کا کیا عقیدہ ہے، تعزیہ داری اور اس کے مراسم مروجہ کو وہ کیسا سمجھتے ہیں؟ مگر مولانا فاخر صاحب گذشتہ روز کی طرح حفظ الایمان ہی کی عبارت اور توہینِ رسولؐ کے سلسلہ میں ہی سوالات کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ میرے سوالات کے جوابات نہیں دیئے گئے، اس کے علاوہ دوسرے سوالوں کی طرف انھوں نے ذرا بھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی اور وہ توجہ دیتے بھی تو

کیا، ان کے پاس کوئی معقول دلائل تھے ہی نہیں۔ وہ تو صرف دفع الوقتی کررہے تھے۔ ذبح لغیر اللہ کے اپنے سوال پر مولانا لکھنویؒ نے خود ہی اس کے عدم جواز پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''قرآن شریف کی آیت سنیے، جو جانور کسی دوسرے کے لیے نامزد کیا جائے قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ حرام ہے۔ قولہ تعالیٰ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه (سورہ بقرہ:۱۷۳) یعنی حرام کی گئی وہ چیز جس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ ہمارے فقہاء اس آیت کو عام معنی میں لیتے ہیں یعنی خواہ بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے یا ذبح تو اللہ ہی کے نام کیا جائے مگر پہلے سے اس کو غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو۔ درمختار میں ہے کہ ذبح لقدوم الامیر و نحوہ کو احد من العظماء یحرم لانہ اهل به لغير الله ولو ذكر اسم الله تعالىٰ۔ یعنی اگر کوئی شخص امیر کے آنے کی وجہ سے اور یا اسی قسم کی کسی بات سے مثل کسی بڑے شخص کے آنے کی وجہ سے ذبیحہ کرے تو حرام ہے کیونکہ یہ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه ہے، اگر چہ بوقت ذبح اللہ تعالیٰ کا نام لے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَعَنَ اللّٰه مَنْ ذبح لغير الله۔ یعنی اللہ لعنت کرے اس شخص پر جو غیر اللہ کے لیے کسی جانور کو ذبح کرے۔''

مولانا فاخر صاحب نے اس کا کوئی مدلل جواب نہ دیا اور اسی حفظ الایمان کی عبارت پر اڑے رہے، اسی طرح تعزیہ داری، قبروں پر چڑھاوا چڑھانا، اس کا طواف کرنا اور فاتحہ مروجہ کا بھی انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا لہٰذا مولانا لکھنویؒ نے اپنا آخری زلزلہ فگن سوال پیش کر دیا کہ بدعت کے متعلق آپ کا کیا اعتقاد ہے۔ بدعت سے میری مراد یہ ہے کہ دین میں کوئی ایسی بات رائج کرنا جس کا ثبوت شریعت کے چاروں مآخذ سے نہ ہو، یعنی نہ قرآن شریف سے اس کا ثبوت ہو نہ سنّت سے، نہ اجماع سے اور نہ ائمہ مجتہدین کے قیاس سے۔ اگر آپ کے اعتقاد میں بدعت بمعنی مذکور مشروع ہے تو اس کے دلائل بیان فرمایئے اور اگر آپ کے عقیدہ میں بدعت بمعنی مذکور غیر مشروع و ناجائز ہے تو یہ فرمایئے کہ تعزیہ داری، قبروں پر چڑھانا، ذبح لغیر اللہ اور فاتحہ کی صورت مخصوصہ اور جو جو مسائل اب تک میں نے پیش کیے ان کے لیے کون سی دلیل شرعی ان چاروں ماخذوں میں سے آپ کے پاس ہے، اگر کوئی دلیل ہے تو پیش فرمایئے اور اگر نہیں ہے تو بتایئے کہ ان امور کا غیر مشروع و ناجائز ہونا آپ کیوں نہیں تسلیم کرتے؟ اس سوال کا پیش ہونا تھا کہ مناظرہ درہم برہم ہو گیا۔ مولانا فاخر صاحب اس سوال کے بعد کچھ دیر تک تو سرگوشی کرتے رہے اور اس کے بعد سر جھکا کر بیٹھ گئے اور پھر بار بار مطالبہ کرنے کے باوجود کچھ نہ

بولے، اتنے میں نماز عصر کا وقت آ گیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا فاخر صاحب کو غشی طاری ہوگئی ہے۔ بعض لوگوں نے قریب جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ آنکھ بند کیے ہوئے بے حس و حرکت پڑے ہیں اور ان کے اِرد گرد کئی پنکھے چل رہے ہیں۔ خدا کا کرنا یہ کہ بختیار پور سے ایک ڈاکٹر صاحب بھی اسی وقت آ گئے، انھوں نے معائنہ کیا تو تصدیق ہوئی کہ ان پر غشی طاری ہے۔

اس طرح یہ جلسۂ مناظرہ برخاست ہوگیا اور تمام مسلمانوں کو حقیقتِ حال معلوم ہوگئی۔[1]

۷۔ مباحثہ گونڈہ (یوپی) ۱۹۲۷ء

اس مباحثہ کا پہلے سے کوئی طے شدہ پروگرام نہ تھا بلکہ رضاخانی علماء نے خفیہ طریقہ سے ایک جلسۂ وعظ کا اہتمام کیا اور اس میں قرب و جوار کے اپنے علماء و واعظین کو مدعو کیا اور اسی میں مولانا لکھنویؒ کو بھی ان کے کچھ مخلص احباب کے ذریعہ مدعو کرالیا اور مقصد یہ تھا کہ مولانا کو وعظ کے بہانے گونڈہ بلایا جائے اور ان کی گھیرابندی کر کے ان پر بے ہنگم اعتراضات کیے جائیں اور اس طرح امروہہ کے مناظرہ میں اپنی شکست کا انتقام لے کر آتشِ عناد کو کسی حد تک ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جائے۔ بہرکیف مولانا لکھنویؒ اپنے احباب کے ساتھ گونڈہ آ کر جلسہ گاہ میں فروکش ہوئے۔ پروگرام کے مطابق پہلی تقریر آپ ہی کی رکھی گئی تھی۔ آپ نے اسے منظور فرماتے ہوئے اپنے خاص عالمانہ طرز میں جو آپ کے مخصوصات میں سے تھا قرآن مجید سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بے مثل و بے مثال فضائل اور نبوت کے دلائل بیان فرمائے جو شاید وہاں کے لوگوں نے اس سے پہلے کم سنے ہوں گے۔ اپنے وعظ کے اختتام پر آپ نے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بھی بالاختصار بیان فرمایا۔ دوران وعظ آپ نے آیت کریمہ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ. (سورۂ بینہ:۵) کی تفسیر بیان فرمائی جس میں عقیدۂ توحید، نماز اور زکوٰۃ کے تذکرہ سے ایمان والوں کے ایمان کی تازگی میسر ہو رہی تھی مگر رضاخانی حضرات عقیدۂ توحید کے بیان سے سخت مضطرب و بے چین ہو رہے تھے، جیسا کہ حق تعالیٰ نے

---

[1] حوالہ سابق ملخصاً

خود ہی قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے کہ اِذَاذُکِرَ اللّٰہ وَحْدَہٗ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَایُؤْمِنُوْنَ. (سورۂ زمر:۴۵) یعنی (ان کے سامنے) اللہ کی توحید کا بیان ہوتا ہے تو بے ایمان لوگ بے چین ہو جاتے ہیں۔

حضرت لکھنویؒ کے بیان کے بعد نظام جلسہ میں مولوی سید محمد محدث کچھوچھوی کا نمبر تھا مگر نہ معلوم کس طرح مولوی نثار احمد کانپوری کھڑے ہو گئے اور سخت بے چینی و سراسیمگی کے ساتھ مولانا کی تقریر پر اعتراضات شروع کر دیئے۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے جو یہ آیت پڑھی ہے قُلْ لَّا اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعاً وَّلَاضَرًّا. (سورۂ اعراف:۱۸۸) اس میں حضورؐ کے مالک بالذات ہونے کی نفی ہے اور آگے چل کر الا ماشاء اللہ بھی ہے جس کو مولانا نے چھوڑ دیا ہے، کانپوری صاحب نے اپنے عوام کو مخاطب کر کے کہا کہ دیکھو! آدھی آیت پڑھی اور آدھی چھوڑ دی اور پھر بڑی طمطراق سے کہا کہ تمھیں بتاؤ کہ مستثنیٰ منہ پڑھا جائے اور مستثنیٰ چھوڑ دیا جائے تو مطلب خبط ہو جائے گا کہ نہیں؟ اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا کہ حضرت! یہ الا ماشاء اللہ استثناء منقطع ہے متصل نہیں ہے کہ بغیر اس کے ملائے ہوئے مطلب پورا نہ ہو، خود آپ کے بیان کیے ہوئے ترجمہ کی بنا پر بھی استثناء متصل نہیں بن سکتا کیونکہ آیت کا مطلب استثنائے متصل کی صورت میں یہ ہوگا کہ اے نبی کہہ دیجیے کہ میں نفع و ضرر میں مالک بالذات نہیں ہوں لیکن جب خدا چاہے تو مالک بالذات ہو جاتا ہوں۔ یہ مطلب خود آپ کے نزدیک بھی کفر ہے، آیت کا صحیح مطلب استثناء منقطع ہی کی صورت میں بنتا ہے۔ یعنی یہ کہ اے نبی کہہ دیجیے کہ میں نفع و ضرر کا مالک نہیں ہوں بلکہ جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ مولوی نثار احمد اپنی تقریر میں توحید کی رد میں یہ بھی کہہ دیا کہ قرآن سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالک بھی ہیں معطی بھی اور مغنی بھی، پھر خدا جانے کس ترنگ میں یہ بھی کہہ گئے کہ یہ سب اطلاقات مجازی طور پر ہیں، یعنی مجازی کہہ کر اپنی ساری تقریر کو خود ہی رد کر دیا۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ جب یہ سب مجاز ہیں تو مجاز کا ذکر ہی کیا۔ اصل چیز تو معنی حقیقی ہیں، عوام بے چارے حقیقت و مجاز کا فرق کیا جانیں، ان کے حق میں یہ سب باتیں عقائد کے خراب کرنے اور شرک میں مبتلا کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا نتیجہ نہیں دے سکتیں۔

مولوی نثار احمد کے اعتراضات کسی وضاحت طلبی کے لیے تو تھے نہیں وہ تو صرف مولانا کی توہین اور دشنام دہی کر کے اپنے عوام میں اشتعال پیدا کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے ایک

بات نہ سنی اور اپنے سوقیانہ لب ولہجہ میں کوئی ایسا نامناسب لفظ نہیں چھوڑا جو مولانا کی شان میں استعمال نہ کیا ہو، مولانا بالکل خاموش بیٹھے سن رہے تھے اور واقفِ حال حضرات متحیر تھے کہ خدایا یہ وہی شخص ہے جو ابھی چند روز ہوئے امروہہ کے مناظرہ میں مولانا کی خدمت میں پچاس روپے بطور جرمانہ داخل کر چکا ہے اور اس قدر اظہار اخلاص ووفاداری کے ساتھ مصالحت اور پھر مصالحت کے بعد معانقہ بھی کر چکا ہے اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ بھی کر چکا ہے۔

مولوی نثار احمد کو حد سے تجاوز کرتے ہوئے اور اپنے لوگوں میں اشتعال کے آثار دیکھ کر آخر میں مولاناؒ نے ان سے فرمایا کہ کیا آپ امروہہ کا منظر پھر دوبارہ یہاں دیکھنا چاہتے ہیں؟ مولوی صاحب مذکور نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد مولوی حکیم عبدالباری صاحب انصاری گونڈویؒ یہ دیکھ کر کہ صدر جلسہ اپنے فرائض سے بالکل معطل ومعزول ہو چکے ہیں کھڑے ہو گئے اور مولوی نثار احمد سے کہا کہ مولانا! یہ عالموں کی مجلس ہے شہدوں کی محفل نہیں ہے، ان کے اس مہذب، متین اور مختصر جملہ نے ان کی ساری بیہودگی کا انتقام لے لیا بشرطیکہ غیرت و احساس ہو۔ اس کے بعد یہ محفل وعظ تتر بتر ہو گئی اور مخالفین کا اصل منشاء ومقصود بھی یہی تھا۔[1]

۸۔ مناظرۂ رنگون ۱۹۳۱ء

ایک معرکۃ الآراء مناظرہ آپ کا رنگون میں مولوی حشمت علی پیلی بھیتی سے ۱۹۳۱ء میں بھی ہوا تھا جس میں مولوی موصوف کو شکست اٹھانی پڑی تھی۔ اس مناظرہ کی روداد ''دفع شب خون از مانڈلے ورنگون'' ملقب بہ ''عنایت ربانی باستیصال فتنۂ رضاخانی'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں تردید عقائد رضاخانیت میں قرآن مجید کی گیارہ سورتوں اور متعدد آیات کی تفسیر بیان کی گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ یہ روداد اب نایاب ہو چکی ہے اور ہمارے مطالعہ میں نہیں آسکی۔ ہمیں اس کا مختصر حوالہ صرف النجم کے اوراق میں مل سکا ہے۔[2]

۹۔ مناظرہ لکھنؤ

مولوی حشمت علی پیلی بھیتی سے آپ کا ایک مناظرہ لکھنؤ میں بھی ہوا تھا، اس مناظرہ میں بھی

۱۔ فتح حقانی بر فرقۂ رضاخانی، مرتبہ مولوی زاہد حسن رشیدی امروہوی ملخصاً

۲۔ النجم، ۱۷/۲۱، رمضان ۱۳۴۶ھ والنجم رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ

موصوف کو ذلّت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی روداد ''صواعقِ آسمانی بر فرقہ رضاخانی'' کے نام سے شائع ہوئی تھی مگر اب یہ بھی نایاب ہے اور ہمارے مطالعہ میں نہیں آسکی۔ صرف اس روداد کا نام ہمیں النجم میں ملا ہے اس لیے ہم اس کی کوئی تفصیل دینے سے قاصر ہیں۔

قادیانیوں سے مناظرے

۱۔ تحریری مناظرہ لکھنؤ ۱۹۱۳ء

محلّہ بشیرت گنج لکھنؤ میں قادیانیوں کی ایک انجمن احمدیہ عرصہ سے قائم تھی جو اپنے مذہب کی تبلیغ و ترویج میں برابر ساعی رہتی تھی۔ اس انجمن کے سکریٹری مولوی کبیرالدین اکبرآبادی تھے جو اکثر حضرت لکھنویؒ سے تحریری رابطہ رکھتے تھے اور سوال و جواب کیا کرتے تھے، ان کے علاوہ اس جماعت کے ایک دوسرے رکن مولوی حسام الدین فیض آبادی بھی تھے وہ بھی اکثر مولاناؒ سے مذہبی چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں اس انجمن کا ہیڈ کوارٹر تھا جہاں بابو فرمان علی صاحب انجینئر قادیانیت کے پُرزور حامیوں میں سے تھے۔ ان سب حضرات نے متفقہ طور پر مولانا لکھنویؒ کو ایک فیصلہ کن مناظرہ پر آمادہ کیا اور طے کیا کہ یہ مناظرہ لکھنؤ میں ہوگا اور مولوی کبیرالدین قادیانیوں کے مناظر ہوں گے اور موضوع بحث یہ رکھا گیا کہ مولانا لکھنویؒ حیات مسیح کے مدعی ہوں گے اور قادیانی مناظر وفاتِ مسیح کے دعویدار ہوں گے۔ اس کے علاوہ مولانا لکھنویؒ نے اپنے لیے ایک اور اہم موضوع یہ بھی منتخب کیا تھا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت اور اس کے دلائل پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں گے، اس طرح جب فریقین کے درمیان تحریری معاہدہ ہوگیا اور اس کا اعلان بھی کردیا گیا تو انجمن قادیانیہ لکھنؤ کی جانب سے اطلاع آئی کہ ہمارے مرکز قادیان نے ہمیں لکھنؤ میں لسانی مناظرہ کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ طے کیا ہے کہ مولوی میر قاسم علی ایڈیٹر الحق دہلی، مولوی سرور شاہ مدرس اول مدرسہ احمدیہ قادیان اور مفتی محمد صادق ایڈیٹر بدر قادیان وغیرہ آکر مولانا سے مناظرہ کریں گے، چنانچہ اس کو بھی منظور کرلیا گیا، عرصہ تک ان حضرات کا انتظار ہوتا رہا مگر وہ نہیں آئے اسی عرصہ میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے کچھ حضرات قادیان سے بھی آئے جن میں مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا بشیرالدین محمود اور خواجہ کمال الدین ایڈوکیٹ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ سالانہ جلسہ سے

فراغت کے بعد ان لوگوں نے شہر میں بذریعہ اشتہار اعلان کیا کہ مرزا بشیر الدین لکھنؤ کے تین روزہ پروگرام میں اپنے مذہب کی خصوصیات بیان کریں گے لہٰذا مولانا لکھنویؒ نے اس موقعہ پر ان سے مناظرہ کی یاد دہانی کرائی تو مرزا بشیر الدین نے جواب دیا کہ ہم اپنے امام (حکیم نورالدین) کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے مگر جب انھیں بسلسلۂ مناظرہ سابقہ تحریریں، وعدے اور معاہدے کی بابت کاغذات وغیرہ دکھلائے گئے تو یہ حضرات گھبرا کر اپنے بقیہ پروگرام کو ادھورا ہی چھوڑ کر قادیان روانہ ہو گئے۔

النجم کے بار بار تقاضوں کے بعد پھر اتنی بات طے ہوئی کہ مذکورہ بالا تینوں حضرت قادیان سے لکھنؤ بھیجے جا رہے ہیں وہ مناظرہ کریں گے چنانچہ وہ حضرات آ بھی گئے لیکن لسانی مناظرہ کے لیے آمادہ نہ ہوئے اور کہا کہ بجائے لسانی مناظرہ کے ہم تحریری مناظرہ کریں گے اور موضوعِ مناظرہ یہ ہوگا کہ مولانا لکھنوی حیاتِ مسیح کے دلائل تحریر کریں گے اور مرزا صاحب کے دعویٔ نبوت پر بحث کریں گے اور قادیانی مناظر وفات مسیح کے دلائل تحریر کریں گے اور مرزا صاحب کی صداقت کی تصدیق کریں گے اور ان عنوانات پر دونوں فریق اپنے اپنے تین تین مقالات لکھیں گے جو بیک وقت النجم لکھنؤ اور بدر قادیان میں شائع کیے جائیں گے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں باقاعدہ ایک تحریری معاہدہ ہو گیا۔ حضرت مولانا لکھنویؒ نے معاہدہ کے مطابق اپنا ایک مضمون ختم نبوت پر اور ایک مضمون حیات مسیح پر لکھ کر بدر قادیان بھیج دیا مگر اُسے ان لوگوں نے شائع نہیں کیا اور نہ ہی اپنے مضامین النجم میں شائع ہونے کے لیے بھیجے۔ اس طرح وہ تحریری مناظرہ سے بھی گریز کر گئے، بعد میں مذکورہ بالا دونوں مضامین مولانا نے النجم میں شائع کر کے قادیانیوں کی شکست فاش پر آخری مہر ثبت کر دی اور پھر ان کی طرف سے کوئی جواب الجواب نہ آیا[۱]۔

۲۔ تحریری مناظرہ مونگیر ۱۹۱۶ء

سیالکوٹ پنجاب کے ایک سرکاری دفتر کے قادیانی کلرک نے خانقاہ رحمانیہ مونگیر کو ایک تحریری چیلنج لکھ کر بھیجا تھا جس میں انھوں نے بخیال خود حضرت مسیح علیہ السلام کی موت کو ثابت کیا تھا اور مسلمانوں کے اس خیال کو غلط قرار دیا تھا کہ حضرت مسیح زندہ ہیں۔ مولانا لکھنویؒ کی طرف سے اس تحریری چیلنج کا ترکی بہ ترکی جواب دیا گیا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ہمارے علماء کرام کی

۱؎ النجم، ۲۱/ ذی قعدہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۲/ اکتوبر ۱۹۱۳ء

طرف سے مرزا غلام احمد قادیانی کا کذب، قرآن مجید، احادیثِ صحیحہ اور عقلی دلائل سے ثابت کیا جا چکا ہے اور اس عنوان پر درجنوں رسائل و کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا مطالعہ ہر ایک کو کرنا چاہیے۔ مولانا نے اپنے اس جوابی چیلنج میں دعویٰ کیا تھا کہ قادیانیوں کو پہلے مرزا صاحب کے کذب اور جھوٹ کو دلائل کے ساتھ رد کرنا چاہیے تھا اس کے بعد پھر کسی دوسرے مسئلہ کو چھیڑنا چاہیے تھا۔ حیات مسیح کے مسئلہ کو چھیڑ کر ان کی جان بچ نہیں سکتی۔ حیات مسیح پر بھی ہمارے علماء نے درجنوں کتابیں لکھی ہیں جن کا اب تک کسی قادیانی سے جواب نہ بن سکا لہٰذا پہلے وہ ہمارے دعوؤں کی تردید کریں پھر کسی دوسرے مسئلہ کا ادعا کریں کیونکہ جس شخص کا جھوٹا ہونا ہر طرح سے ثابت ہو گیا ہو اور اس کے ماننے والے اس کی صداقت ثابت کرنے سے عاجز ہوں تو وہ مسیح موعود کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ جوابی اعلان پہلے مولانا عبدالغفار صاحب حیدر آبادیؒ کی طرف سے شائع ہونا تھا مگر اچانک ان کی وفات ہو جانے سے حضرت لکھنویؒ نے اس اعلان کو اپنے نام سے ''صحیفۂ رحمانیہ'' نمبر ۱۴ میں شائع کرا دیا۔ خانقاہ رحمانیہ مونگیر نے حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں بہار میں قادیانیت کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے میں نمایاں رول ادا کیا تھا اور اس خاص مبحث میں درجنوں مفید کتابیں شائع کی تھیں جو آج بھی اس موضوع پر مشعل راہ کا کام کر رہی ہیں۔ مولانا کے اس چیلنج کے جواب میں قادیانیوں کی طرف سے پھر کوئی ردعمل کا اظہار نہ ہوا اور انھوں نے اپنی لاجوابی اور پسپائی قبول کر لی[1]

۳۔ مناظرہ پورینی ضلع بھاگلپور (بہار) ۱۹۱۷ء

یہ مناظرہ مشہور قادیانی عالم مولوی عبدالماجد بھاگلپوری[2] سے ان کے مکان واقع موضع پورینی ضلع بھاگلپور میں ہوا تھا۔ مولوی موصوف برابر اپنے جلسوں میں قادیانیت کی تبلیغ اور

---

[1] صحیفۂ رحمانیہ نمبر ۱۴، مطبع رحمانیہ، مونگیر، ۱۳۳۵ھ

[2] مولوی عبدالماجد بن عبدالواحد کی پیدائش اور پرورش بھاگلپور میں ہوئی، ابتدائی کتابیں مقامی اساتذہ سے پڑھ کر حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، تکمیل کے بعد کلکتہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، وہاں سے علی گڑھ پہنچے اور ایک سال تک مدرسۃ العلوم میں کام کیا، اس کے بعد بھاگلپور آ گئے اور یہاں ایک انگریزی کالج میں استاذ ہو گئے، اسی عرصہ میں انھوں نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا اور اس کی تبلیغ و توسیع میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، مولوی صاحب موصوف مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ ثانی مرزا غلام احمد قادیانی کے خسر تھے، ۱۳۷۵ھ میں قادیان میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

(نزہۃ الخواطر جلد ۸، ص ۹-۳۰۸)

مسلمانوں پر ناروا اعتراضات کرتے رہتے تھے جس سے عام مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی مگر وہ کسی عالم سے بالمشافہ گفتگو کرنے سے گریز کرتے تھے۔ حضرت مولانا لکھنویؒ بھی کم وبیش ایک سال سے یہ کوشش کر رہے تھے کہ مولوی عبدالماجد سامنے آ کر حق و باطل کا فیصلہ کرلیں لیکن وہ برابر ٹال مٹول کرتے رہے، بالآخر وہ وقت آ ہی گیا کہ انھیں حق کا سامنا کرنے پر مجبور کیا جاسکے چنانچہ ایک بار موضع پورینی کے مسلمانوں نے اپنے یہاں ایک دینی جلسہ کا بندوبست کیا اور اس میں مختلف علماء کرام کے ساتھ حضرت لکھنویؒ کا بھی مدعو کیا۔ اس جلسہ کو بے اثر کرنے کے لیے مولوی عبدالماجد نے اپنے گھر پر ایک جلسہ کا اعلان کر دیا جس کا منشا یہ تھا کہ لوگوں کا دھیان بٹایا جائے اور بزعم خود مسلمانوں پر اعتراضات کیے جائیں۔ مقامی مسلمانوں نے بہ نیت اظہار حق مولوی عبدالماجد کے پاس پیغام بھجوایا کہ آپ خود ہمارے یہاں تشریف نہیں لاتے ہیں اور نہ ہم کو ہی بلاتے ہیں لہٰذا ہم خود ہی آپ کے جلسہ میں حاضر ہونا چاہتے ہیں، آپ بحث کے لیے تیار ہو جایئے، اس اطلاع کے بعد لوگ ان کے جلسہ میں پہنچ گئے، حاضرین جلسہ کی تعداد معقول تھی اور دونوں طرف کے لوگ وہاں موجود تھے۔ مولوی عبدالماجد سے گفتگو شروع ہوئی۔ شرائط مناظرہ اور حکم کے تقرر پر مباحثہ ہوتا رہا مگر مولوی صاحب کسی پہلو پر قائم نہیں رہتے تھے۔ بالآخر مولانا لکھنویؒ نے فرمایا کہ میں بغیر کسی شرط کے جس طرح آپ چاہیں اور جہاں آپ فرمائیں آپ سے بحث کرنے کے لیے آمادہ ہوں چنانچہ مجبور ہو کر اور ہر طرف سے راہِ فرار مسدود پا کر بادل ناخواستہ مولوی عبدالماجد کو مناظرہ منظور کرنا پڑا۔

اس مناظرہ میں بھاگلپور، چمپانگر، برّہ پور اور آس پاس کے علاقوں کے مسلمان بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور اسی طرح قادیانی عقائد رکھنے والے لوگ بھی اکثر و بیشتر شریک ہوئے۔ مولوی علاء الدین وکیل مناظرہ کے حکم باتفاق رائے مقرر کیے گئے۔ مناظرہ کے شروع میں مولوی عبدالماجد نے یہ اصرار کیا کہ مولانا لکھنویؒ کو دوسرے علماء زبانی یا تحریری کسی قسم کا مشورہ نہ دیں۔ حتیٰ کہ کتابوں کی عبارات محولہ کے نکالنے میں بھی ان کی مدد نہ کی جائے۔ رفع شر کے لیے ان کی یہ بات مان لی گئی اور بحث شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے حضرت لکھنویؒ نے خطبہ مسنونہ پڑھ کر اپنی دس منٹ کی تقریر میں یہ واضح کیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نہ صرف اپنے نبی و رسول ہونے کا بلکہ افضل الانبیاء ہونے کا دعویٰ کیا ہے، بعض انبیاء پر تو صراحتاً اپنی فضیلت بیان

کی ہے اور بعض پر اشارۃً۔ لیکن مرزا صاحب کے حالات واوصاف پر نظر ڈالنے سے ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ جس شخص کے یہ حالات ہوں شریعت اسلامیہ اس کو اچھا آدمی سمجھنے اور کہنے کی بھی اجازت نہیں دیتی اس کو نبی اور رسول ماننا تو بڑی چیز ہے۔ مرزا صاحب کے حالات واوصاف کے بارے میں آپ نے درج ذیل دو باتوں کی حوالوں کے ساتھ وضاحت کی:

(۱) مرزا صاحب نے خدا کے پیغمبروں کی توہین کی ہے اور (۲) مرزا صاحب جھوٹ بہت بولتے تھے۔

یہ دونوں باتیں مرزا صاحب کی تصانیف سے نکال کر سنائی گئیں اور مولوی عبدالماجد کو بھی دیکھنے کے لیے دی گئیں۔

اس دس منٹ کی تقریر کے جواب میں مولوی عبدالماجد نے سوا گھنٹہ تقریر کی جس میں بہت سی خارج از بحث باتیں شامل تھیں۔ اصل مبحث کے متعلق صرف اتنا کہا کہ مرزا صاحب کی نیت توہین انبیاء کی نہ تھی۔ انھوں نے ایسے الفاظ الزامی طور پر استعمال کیے ہیں۔ مرزا صاحب کے جھوٹ کے بارے میں کہا کہ اس طرح تو دیگر انبیاء کا جھوٹ بھی ثابت ہے (معاذ اللہ منہ) حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا۔ حضرت یونسؑ کے متعلق دعویٰ کیا کہ قرآن مجید میں ہے کہ ان کی پیشین گوئی ٹل گئی اور بڑی پُر لطف بات یہ کہی خدا خود اپنی بات ٹال دیتا ہے اور اپنے کلام میں پھیر بدل کر دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ (استغفر اللہ)

حضرت مولانا لکھنویؒ نے اس کے جواب میں پچیس منٹ کی تقریر کی اور کہا کہ مولوی عبدالماجد نے بجائے مرزا صاحب کی برأت کرنے کے ان کا جرم اور زیادہ سنگین کر دیا کیونکہ انھوں نے مرزا صاحب کی ایک عبارت پڑھی جس کا مضمون یہ تھا کہ مسیح علیہ السلام نے قابل نفرت اور مکروہ افعال کا ارتکاب خدا کے حکم سے کیا جس سے ثابت ہوا کہ مرزا صاحب نے خدا کی بھی توہین کی ہے اور خدا کو بھی قابل نفرت اور مکروہ کاموں کا حکم دینے والا کہا ہے (معاذ اللہ منہ) توہین انبیاء کا الزامی نہ ہونا بھی مرزا صاحب کے کلام سے ثابت کیا گیا اور توہین کی نیت نہ ہونے کا بھی شافی جواب دیا گیا، حضرت ابراہیم اور حضرت یونس علیہما السلام کے قصے کا تو ایسا جواب دیا کہ مولوی عبدالماجد گھبرا گئے اور ان باتوں کی تردید میں کوئی واضح بات نہ کہہ سکے جس کو سارے مجمع نے محسوس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک گھنٹہ بارہ منٹ تقریر کی لیکن اس میں

سوائے دفع الوقتی اور بدحواسی کے کچھ نہ کہا۔

آخر میں مولانا لکھنویؒ نے تیس منٹ کی ایک جوابی تقریر کی جس نے مولوی عبدالماجد سے مکابرہ کی طاقت بھی سلب کر لی اور انھوں نے صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ میں تو مناظرہ کے لیے تیار نہ تھا جناب مولوی محمد عبدالشکور صاحب نے اپنی تقریر کا اثر لوگوں پر ڈال دیا، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ میری تقریر کا اثر کسی پر نہ پڑے گا۔ اب میں مناظرہ نہ کروں گا بلکہ آئندہ قادیان سے کسی عالم کو بلوا کر اور تاریخ مقرر کر کے مناظرہ کروں گا۔

اس طرح اس مناظرہ سے اظہارِ حق بہ تمام وکمال ہو گیا اور پورینی و بھاگلپور وغیرہ کے مرزائیوں کو مرزا صاحب کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہوگئی۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس مناظرہ میں مسلمانوں کے مشہور عالم دین مولانا محمد سہول صاحب عثمانی حنفی فاضل دیوبند (م ۱۹۴۸ء) بھی شریک تھے اور انھوں نے اس روداد کی تحریری تصدیق بھی کی ہے۔[۱]

۴۔ مناظرہ رنگون ۱۹۲۰ء

یہ مناظرہ مولانا لکھنویؒ اور قادیانیوں کی لاہوری پارٹی کے رہنما خواجہ کمال الدین بی، اے، ایل، ایل، بی کے درمیان ۱۹۲۰ء میں رنگون (برما) میں ہوا تھا، اس کا اہتمام جمعیۃ علماء رنگون نے کیا تھا جس کے سربراہ اس زمانہ میں حضرت مولانا احمد بزرگ سملکیؒ (م ۱۳۷۱ھ) تھے جو جامع سورتی رنگون کے مہتمم اور مفتی بھی تھے، آپ ہی کی خصوصی دعوت پر مولانا لکھنویؒ رنگون تشریف لے گئے تھے، فرق باطلہ کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے کہ وہ براہِ راست مناظرہ سے گریز کرتے ہیں لیکن آڑ میں بیٹھ کر خطوط یا اشتہار بازی سے کام لے کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ خواجہ کمال الدین نے بھی رنگون میں یہی کیا اور صرف مراسلات و اشتہارات کو ذریعہ تخاطب بنایا اور براہِ راست مناظرہ کی نوبت نہیں آنے دی۔ دوران قیام رنگون میں وہ اپنے فرقہ کے عقائد کی تبلیغ جگہ جگہ کرتے رہے لیکن جب علماء اسلام نے ان کی روک ٹوک کی اور آمنے سامنے بیٹھ کر عقائد کے معاملات میں گفتگو کرنا چاہی تو انھوں نے روگردانی کی کوشش شروع کر دی اور مختلف حیلوں بہانوں سے راہ فرار اختیار کرتے رہے اور مزید ستم یہ کہ اپنی فرضی

---

[۱] آئینہ کمالات مرزا، مرتبہ ناظم دارالاشاعت رحمانی مونگیر، ص ۵۶ تا ۶۳

کامیابیوں کی رودادیں اشتہاروں کے ذریعہ چھاپ چھاپ کر تشہیر کرتے رہے۔ اپنے آخری اشتہار میں خواجہ صاحب نے اسلامی معتقدات کے خلاف چار سوالات قائم کر کے شائع کیے اور اپنے دفاع میں یہ مفروضہ قائم کرلیا کہ علماء اسلام سے ان کا جواب دیتے نہ بن پڑے گا۔ یہ چاروں سوالات اوران کے جوابات ہم اس کتاب کے تیئسویں باب میں تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں وہاں ملاحظہ فرمایا جائے۔

حضرت لکھنویؒ نے جو خاص طور سے خواجہ صاحب سے مناظرہ کرنے کے لیے رنگون بلائے گئے تھے فی الفوران چاروں سوالات کے جوابات قرآن اور حدیث کی روشنی میں لکھ کر شائع کردیئے۔ ان جوابات کے شائع ہونے کے بعد پھر خواجہ صاحب کی طرف سے کوئی جواب الجواب نہیں آیا اور وہ انتہائی ذلت ورسوائی کے ساتھ رنگون سے روانہ ہوگئے۔

مولانا علیہ الرحمتہ نے اس مناظرہ کے سلسلہ میں اپنے وخواجہ صاحب کے تمام مراسلات، ان کے اعتراضات اور اپنے جوابات اور مرزائی عقیدوں کی پوری تفصیل ایک رسالہ میں مرتب کر کے شائع کردی۔[1]

۵۔ مناظرہ شملہ ۱۹۲۲ء

یہ مناظرہ موجودہ ہماچل پردیش کے کوہستانی شہر شملہ میں قادیانیوں سے ہوا تھا جس میں اُس وقت کے ان کے تمام ہی مشہور علماء شامل ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے دارالعلوم دیوبند کے علماء اور حضرت مولانا لکھنویؒ تشریف فرما تھے جو اس مناظرہ کے اصل مناظر تھے۔ یہ مناظرہ گیارہ بجے دن میں شروع ہوکر چار بجے صبح کو ختم ہوا جس میں صرف نمازوں کے اوقات پر کچھ دیر کے لیے کارروائی ملتوی کردی جاتی تھی۔ مناظرہ میں قادیانیوں کی کیا حالت ہوئی اس کے لیے کچھ زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں، حاضرین محفل نے خود اٹھ کر بہ آواز بلند کہہ دیا کہ آج ہم کو معلوم ہوگیا کہ مرزا غلام احمد کی حقیقت کیا ہے۔ مولوی عمر دین صاحب نے جو قادیانیوں کی طرف سے مناظر تھے، اٹھ کر درخواست کی کہ اب مناظرہ بند کیا جائے ہم بغیر حکم کے مناظرہ نہیں کریں گے، ان سے کہا گیا کہ یہ بات آپ لکھ کردے دیجیے چنانچہ انھوں نے لکھ کردے دیا اور

---

[1] صحیفۂ رنگون بر پیروانِ دجال زبون، مرتبہ مولانا احمد بزرگ سملکی ملخصاً

پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک لفظ درست کرنے کے بہانہ سے اسے واپس لے کر دوبارہ نہیں لوٹایا۔ حاضرین محفل بول اٹھے کہ آپ تو حکم بنانے کو ناجائز کہتے تھے اب کیا ہوا؟ تو اس پر کچھ جواب نہ دیا اور مجلس سے بدحواس ہوکر اٹھ کر چلے گئے۔ اس طرح وہاں موجود لوگوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ ہمارے شکوک بالکل رفع ہو گئے اور اب ہمیں کوئی قادیانی بہکا نہیں سکتا۔ مناظرہ کی ساری کارروائی مع فریقین کی تقریروں کے اسی وقت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ (م ۱۹۷۴ء) نے قلمبند کرلی تھی۔ مولانا محمد ادریس صاحب کی علمی زندگی کے یہ آغاز کا زمانہ تھا، آپ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت استاد کام کررہے تھے۔ اس مناظرہ کی روداد کا نام ''ازالۃ الغفلہ عن مرزائیۃ شملہ'' تھا۔ یہ پتہ نہ چل سکا کہ یہ روداد شائع ہوئی تھی کہ نہیں۔ قادیانیوں کے اخبار ''الفضل'' نے اس کی جھوٹی ''تفصیل شائع کی تھی جو بالکل فرضی اور خانہ ساز تھی۔ ہماری یہ اطلاعات النجم سے ماخوذ ہیں۔ جھوٹ بولنا تو قادیانی پیغمبر کی سنت مستمرہ رہی ہے جس کی جزا تو انھیں آخرت میں ملے گی لیکن دنیا میں بھی اُن کو جھوٹ بولنے کے نتیجہ میں ذلّت ورسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔ اخبار ''الفضل'' میں فریقین کی تقریریں بھی چھپی ہیں۔ حالانکہ قادیانیوں کی طرف سے کسی نے بھی ان کا ایک حرف بھی قلمبند نہیں کیا تھا۔ اس سلسلہ میں اپنی معذوری و مجبوری کا اظہار مولوی عمردین نے اپنے دستخطی رقعہ میں کیا تھا۔ ''جوازالۃ الغفلۃ'' میں درج تھا کہ میں تقریروں کے قلمبند کرنے کا کوئی انتظام نہیں کرسکتا اور میری طرف سے کوئی اس مجمع میں انھیں ضابطۂ تحریر میں نہیں لاسکتا ہے لہٰذا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اخبار ''الفضل'' نے جو کارروائی اور تقاریر چھاپی تھیں وہ محض فرضی اور خانہ ساز تھیں [1]

۶۔ مناظرہ ساونت واڑی (کوکن) ۱۹۲۵ء

یہ مناظرہ بمبئی کے اسی سفر کے دوران ہوا تھا جس میں بریلوی عالم مولوی نثار احمد کانپوری سے آپ کا زبردست مناظرہ ہوا تھا۔ ساونت واڑی بمبئی اور گوا کے درمیان ایک سرسبز وشاداب پہاڑ کے اوپر آباد ہے جس کے قریب ایک قدیم بندرگاہ وینگورلا واقع ہے، کسی زمانہ میں یہ علاقہ ریاست بیجاپور (دکن) سے تعلق رکھتا تھا اور اسلامی حکومت عادل شاہی کا مرکز تھا، اس کے

---

[1] النجم، لکھنؤ، ۱۳۴۱ھ

اطراف میں شہر عادل آباد اور اس کی پرانی عمارتوں کے شاہی کھنڈرات اب بھی تھوڑے بہت باقی ہیں۔

ساونت واڑی میں ایک شخص حکیم محمد یونس نے قادیانی مذہب اختیار کرلیا تھا، انھوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے پہلے تو ایک انجمن بنائی اور پھر اخبارات میں مرزا غلام احمد قادیانی کے مسیح، مہدی اور نبی ہونے کے دلائل لکھ کر شائع کرانے لگے۔ چنانچہ جب کچھ لوگ اس قسم کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہونے لگے تو ملّی دردو حمیّت کے حامل لوگوں کو اس کا احساس ہوا کہ اگر اس کا تدارک نہ ہوا تو آئندہ اس کے نتائج خراب نکلیں گے۔ قادیانی انجمن کے ان اخباری مضامین کے سلسلہ میں فقیر محمد صاحب ساکن ساونت واڑی نے حکیم محمد یونس مرزائی کو خط بھی لکھا مگر انھوں نے بجائے اس کا جواب دینے کے ایک اشتہار چھاپ دیا جس میں قادیان سے اپنے علماء کی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے اہل اسلام کو مناظرہ کا چیلنج دے دیا۔ اشتہار مذکور کے نکلنے کے بعد مقامی حضرات نے اپنے علماء سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے مولوی نثار احمد کانپوری ہی سے ساونت واڑی آنے اور قادیانیوں سے مناظرہ میں شکست کھانے کے بعد بمبئی میں ان کی بدنامی اور رسوائی ہونے لگی تو انھوں نے اس مناظرہ میں بھی آنے سے صاف انکار کردیا۔ مجبور ہوکر ساونت واڑی کے لوگوں کے ایک وفد نے بمبئی آ کر حضرت لکھنویؒ سے ملاقات کی اور سارے معاملات سے مطلع کر کے ان کو اس مناظرہ میں شرکت کے لیے مجبور کیا لہٰذا آپ نے وعدہ فرمالیا اور ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو بمبئی سے بذریعہ سمندری جہاز روانہ ہوکر وینگورلا پہنچے اور وہاں سے کار کے ذریعہ ساونت واڑی تشریف لے گئے جہاں آپ نے جناب اسمٰعیل خاں صاحب پروپرائٹر الکٹریسٹی کمپنی کے مکان پر قیام کیا۔ تین دن آپ کا قیام وہاں رہا اور پھر مناظرہ سے فراغت کے بعد وہاں سے ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۵ء کو آپ کی بمبئی واپس ہوئی۔

اس مناظرہ میں مسلمانوں کی طرف سے حضرت لکھنویؒ مناظر تھے اور قادیانیوں کی طرف سے حکیم محمد یونس کے علاوہ ان کے علامہ حافظ روشن علی، مولوی عبدالکریم مولوی فاضل، بی اے، ایل ایل بی اور مولوی عبدالرحمٰن قادیان سے بھیجے گئے تھے جن میں حافظ روشن علی اصل مناظر تھے۔ قادیانی مناظر کا اصرار تھا کہ پہلے بحث کا موقع ان کو ملے تا کہ وہ مرزا صاحب کی سچائی اور نبوت کا ثبوت دیں، مسلمانوں کی جانب سے کہا گیا کہ سچائی ثابت کرنے میں تو بڑا طول ہوگا

کیونکہ کسی کو سچائی ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تمام باتوں کو سچّا ثابت کیا جائے لہٰذا اس کے لیے دو ایک روز نہیں بلکہ مہینوں کی ضرورت ہوگی، مقصد اس اصرار کا یہ تھا کہ وہ مرزا صاحب کی سچائی اور ان کی تعریف دو ایک روز تک بیان کر کے چل دیں گے اور اصل حقیقت پر پردہ پڑا رہ جائے گا لہٰذا مسلمانوں نے ان کے اس اصرار کو قبول نہیں کیا چنانچہ مجبور ہو کر ان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

مناظرہ کا موضوع یہ تھا کہ مولانا لکھنویؒ مرزا غلام احمد کا کذّاب و منکرِ ضروریاتِ دین ہونا ثابت کریں گے اور اس کا جواب دینا قادیانی مناظر کے ذمّہ ہوگا۔ اس مناظرہ میں شیخ آدم صاحب صوبیدار میجر پنشنر کو باتفاق رائے ثالث مقرر کیا گیا تھا۔

مولانا نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں مرزا صاحب کی بہت سی صفات میں صرف دو صفتیں اس وقت بیان کروں گا اور اس کا ثبوت خود انہی کی کتابوں سے دوں گا۔ اول یہ کہ مرزا صاحب بڑے جھوٹے تھے، ان کے جیسا بیباک جھوٹ بولنے والا شاید ہی دنیا میں کوئی دوسرا ہوگا۔ دوم یہ کہ مرزا صاحب نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو نہایت ناپاک اور بازاری گالیاں دی ہیں۔ اس طرح اگر یہی دو صفات کسی شخص میں پائی جائیں تو وہ عقلاً و نقلاً کسی طرح بھی اچھا آدمی نہیں کہا جاسکتا، اس کا نبی و رسول ہونا تو دور کی بات ہے۔ اس کے بعد آپ نے مرزا صاحب کی دو کتابیں ''تحفۃ الندوہ'' اور ''شہادت القرآن'' سے ان کے جھوٹ اور کتابوں کے غلط حوالوں کا ثبوت دیا۔ مرزا صاحب کے توہین انبیاء والے بیانات کو ان کی کتاب ''حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم'' اور ''اعجاز احمدی'' کے حوالہ سے ثابت کیا۔ قادیانی مناظر ان تمام دلائل کی صرف لفظی تاویلات کرتے رہے اور اس میں بھی فرضی حوالے دیئے اور اصل عبارتوں میں کتر بیونت سے کام لیا۔ دوران مناظرہ قادیانی مناظر نے مرزا پر لگائے گئے الزامات کے جواب میں آنحضرتؐ کے متعلق بھی توہین آمیز کلمات کہے جس سے حاضرین کو ان کی اصل حقیقت کا پتہ چل گیا۔ اس کے بعد جلسہ کے ثالث نے کھڑے ہو کر اپنے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ اس طرح سنا دیا۔

''حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے مرزا غلام احمد قادیانی کا کذّاب اور دشنام دہندۂ انبیاء علیہم السلام ہونا ثابت کردیا ہے۔ انھوں نے چار عبارتیں مرزا صاحب کی پیش فرمائی ہیں، مرزائی صاحبان ان چاروں عبارتوں میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہ دے سکے۔'' (تحفۂ ایمانی ص ۱۴)

تمام ہندو مسلمان جو حاضرین جلسہ تھے وہ فیصلہ سننے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اب بات اتنی صاف ہو چکی ہے کہ کسی فیصلہ کی حاجت باقی نہیں رہی۔ مرزائی صاحبان جب مجلس مناظرہ سے اٹھ کر جانے لگے تو وہ منظر پسپائی اور شکست خوردگی دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ اپنی کتابوں سے بھرا ہوا صندوق جس طرح دو آدمیوں کے کندھے پر لاد کر لائے تھے اسی طرح واپس لے گئے۔ مسلمانوں میں کچھ لوگ جو مرتد ہو چکے تھے وہ تائب ہوئے اور جو مذبذب تھے ان کے ایمان درست ہو گئے۔ اس طرح آئندہ کے لیے وہاں اس فتنہ کا سدّ باب ہو گیا۔

مناظرہ سے فراغت پانے کے بعد مولانا لکھنویؒ نے اس کی پوری روداد مرتب کرا کے ''تحفۂ ایمانی'' کے نام سے اپنے رسالہ النجم میں قسط وار شائع کرادی تھی جس کو بعد میں کتابی شکل میں بھی منتقل کر دیا گیا تھا[1]۔

۷۔ مناظرۂ اچولی ضلع میرٹھ ۱۹۲۸ء

۱۹۲۸ء میں قصبہ اچولی ضلع میرٹھ میں قادیانیوں سے ایک زبردست مناظرہ مولاناؒ سے ہوا تھا۔ اس مناظرہ میں دارالعلوم دیوبند سے مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ مولانا محمد شفیع صاحبؒ مفتی دارالعلوم اور بعض دوسرے حضرات بھی تشریف لائے تھے۔ لکھنؤ سے مولانا لکھنویؒ بھی آئے اور اپنے ساتھ امروہہ سے مولانا محمد منظور نعمانی کو بھی لیتے آئے جو اس وقت مدرسہ اسلامیہ چلّہ امروہہ میں تازہ تازہ مدرس ہوئے تھے۔ یہ مناظرہ تین دن تک ہوتا رہا۔ مقامی لوگوں نے پہلے ہی سے موضوع وترتیب مناظرہ باہمی طور پر طے کر رکھی تھی لہٰذا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ مقامی طور پر اس مناظرہ کی اہمیت بہت زیادہ تھی اور خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دین سے زیادہ واقفیت نہ رکھنے والے عوام کہیں راہ حق سے بھٹک نہ جائیں، اس لیے علماء حق کو اس مناظرہ کی فکر زیادہ تھی۔ پہلے سے فریقین کے درمیان جو پروگرام طے ہو چکا تھا اس کے مطابق مسئلہ ختم نبوت پر مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے مناظرہ کا آغاز کیا اور پھر دوسرے دن حضرت مولانا لکھنویؒ نے مستند حوالوں کے ساتھ مرزا قادیانی کے جھوٹے اور کذّاب ہونے کو ثابت کیا اور پھر تیسرے دن اسی طرح کے موضوع پر مولانا سیّد مرتضیٰ حسنؒ صاحب نے مناظرہ کیا۔

اس مناظرہ نے قادیانی مبلّغین کے حوصلے پست کر دیئے اور سوائے فرار کے ان کے پاس

---

[1] تحفۂ ایمانی، مرتبہ مولوی فقیر محمد ساکن گونجاڑہ علاقہ ساونت واڑی، دوسرا ایڈیشن، ملخصاً

کوئی راستہ نہ تھا۔ اس مناظرہ کی برکت سے مسلمانوں کے ایمان میں تازگی اور کمزور ایمان والے لوگوں کے عقیدوں میں پختگی پیدا ہوئی[1]

۸۔ روداد مقدمہ ریاست بھاولپور (پنجاب) ۱۹۳۲ء

مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان نواب سر صادق محمد خاں صاحب کے عہد میں ایک مقدمہ ریاست بھاولپور کی عدالت میں عرصہ سے چل رہا تھا۔ مقدمہ کا سبب یہ تھا کہ مولانا الٰہی بخش صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند وساکن گاؤں مہند تحصیل احمد پور شرقیہ ضلع بھاولپور نے اپنی بیٹی غلام عائشہ (م ۱۹۴۲ء) کا عقد کمسنی میں اپنے ایک عزیز عبدالرزّاق (م ۱۹۳۴ء) کے ساتھ کردیا تھا، عبدالرزاق نے کچھ عرصہ کے بعد اپنے اسلامی معتقدات سے انحراف کرتے ہوئے قادیانی مذہب اختیار کرلیا۔ جب مسماۃ غلام عائشہ سن بلوغ کو پہنچی تو عبدالرزاق نے مولانا الٰہی بخش سے اس کی رخصتی کرنے کے لیے سلسلہ جنبانی کی، اسی عرصہ میں مولوی صاحب موصوف کو عبدالرزاق کے قادیانی ہوجانے کا علم ہوگیا لہٰذا انھوں نے کہا کہ چونکہ عبدالرزاق قادیانی ہوگیا ہے اس لیے شرعاً وہ کافر ہے اور کسی مسلمان لڑکی کو کافر کے نکاح میں نہیں دیا جاسکتا۔ اس طرح جب اس معاملہ میں مولوی الٰہی بخش اور عبدالرزاق کے مابین کشیدگی بڑھ گئی تو مولوی الٰہی بخش نے بحیثیت مختار کے مسماۃ غلام عائشہ کی طرف سے ۲۴؍جولائی ۱۹۲۶ء میں عبدالرزاق کے خلاف احمد پور شرقیہ ضلع بھاولپور کی عدالت میں دعویٰ تنسیخ نکاح دائر کردیا، عبدالرزاق نے جواباً یہ صفائی دی کہ وہ قادیانیت اختیار کرنے سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ بقول اس کے قادیانیت کوئی علاحدہ مذہب نہیں ہے۔ عبدالرزاق کی درخواست پر عدالت عالیہ چیف کورٹ بھاولپور نے مقدمہ کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ۷؍مئی ۱۹۲۷ء کو عدالت ڈسٹرکٹ جج بہاولپور میں منتقل کردیا۔ عدالتِ مذکور نے ایک سابقہ نظیر کی روشنی میں اس مقدمہ کو خارج کردیا۔ عدالت جوڈیشیل کونسل بہاولپور میں اپیل دائر کی گئی جس کے جواب میں کافی غوروخوض کے بعد عدالت نے رائے دی کہ چونکہ اس مقدمہ میں کچھ قانونی اسقام پائی جاتی ہیں اس لیے یہ مقدمہ مزید تحقیقات کا محتاج ہے۔ عدالت نے یہ بھی رائے دی کہ ہندوستان کے جیّد علماء دین

---

[1] النجم، لکھنؤ، ۱۹۲۸ء۔ اس مناظرہ کی اکثر تفصیلات راقم سے جناب حاجی بدرالدین صاحب ایچولوی مرحوم نے بھی بیان کی تھیں جو خود اس مناظرہ کے چشم دید گواہ تھے۔

سے بھی اس معاملہ میں رائے لی جائے اور عبدالرزاق قادیانی کو بھی موقع دیا جائے کہ وہ بھی ان علماء کے مقابلہ میں اپنے اکابر کو پیش کرے۔ اس طرح اب یہ مقدمہ دو فریق کے درمیان نہ رہ کر مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان حق و باطل کا ایک میدانِ کارزار بن گیا[۱]

مسلمانوں کی طرف سے اس مقدمہ کی پیروی انجمن مؤیدالاسلام بہاولپور نے اپنے ہاتھ میں لے رکھی تھی اور حضرت مولانا غلام محمد صاحب گھوٹویؒ شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاولپور نے جو کہ ریاست کے صدر الصدور بھی تھے اس دور کے اکابر و اماثل کو عدالت کے سامنے قادیانیت کے خلاف شہادت دینے کے لیے مدعو کیا تھا چنانچہ حضرت لکھنویؒ کے پاس بھی آپ نے دعوت نامہ بھیجا مگر اس وقت آپ اپنی ناسازی طبع کے باعث بہاولپور تشریف نہ لے جاسکے مگر دوسرے اکابر و اماثل بحمداللہ وہاں پہنچ گئے اور عدالت کے سامنے اپنی اپنی شہادتیں پیش کیں۔ ان حضرات میں حضرت مولانا غلام محمد صاحبؒ شیخ الجامعہ کے علاوہ حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کشمیری شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ صدرالمدرسین مدرسہ امدادیہ مراد آباد، حضرت مولانا نجم الدین صاحبؒ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا ابوالقاسم محمد حسین صاحب کولوتارڑ ضلع گوجرانوالہ اور جناب مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہانپوریؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات کی شہادتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ مرزا غلام احمد اور ان کے متبعین کافر و مرتد ہیں، ان کے ساتھ مناکحت حرام ہے، اگر نکاح کے بعد کوئی شخص مرزائی ہو جائے تو وہ نکاح بغیر قضائے قاضی فسخ ہو جاتا ہے اور اس کی منکوحہ کو کسی دوسری جگہ نکاح کر لینا درست ہے۔ مرزا غلام احمد کے کافر و مرتد ہونے کے پانچ وجوہ بیان کیے گئے تھے۔ اوّل یہ کہ انھوں نے اپنے اوپر وحی نازل ہونے کا دعویٰ کیا تھا، دوم یہ کہ انھوں نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، سوم یہ کہ انھوں نے حضرات انبیاء علیہم السّلام کی اور حضرت سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں سخت گستاخیاں کی تھیں، چہارم یہ کہ انھوں نے ضروریات دین کا انکار کیا ہے۔ اور پنجم یہ کہ انھوں نے تمام دنیا کے ان مسلمانوں کو جو اُن کو نبی نہیں تسلیم کرتے کافر کہا ہے۔

علماء اسلام کی ان شہادتوں کے بعد عدالت نے مقدمہ کی آئندہ پیشی کے لیے ۵ رنومبر ۱۹۳۲ء مقرر کی۔ اس موقع پر مولانا غلام محمد صاحب نے حضرت لکھنویؒ کو پھر دوبارہ ان واقعات

---

[۱] روداد مقدمہ مرزائیہ بہاولپور (۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۵ء) جلد اوّل، ص ۱۳ و ۱۴

کی اطلاع دی اور اصرار کیا کہ آئندہ پیشی پر آپ مرزائی مولویوں کی شہادت سننے کے بعد ان پر جرح کرنے کے لیے بہاولپور تشریف لائیں چنانچہ حضرت ممدوح یکم نومبر ۱۹۳۲ء کو وہاں پہنچ گئے۔ اس سفر میں آپ کے بڑے صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحبؒ بھی شریک تھے۔ قادیانیوں کی طرف سے پہلا گواہ جلال الدین شمس کو قرار دیا گیا تھا جنھوں نے دمشق اور قاہرہ وغیرہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی اور اس وقت اس فرقہ کے تمام اکابر سے زیادہ مستند عالم سمجھے جاتے تھے۔ وہ اپنے فرقہ کے تمام اکابر کے متفقہ مشورہ اور جانکاہ محنت سے مرتب کردہ شہادتی بیان کے ایک ضخیم دفتر کو لے کر عدالت میں حاضر ہوئے تھے اور اسی کو دیکھ دیکھ کر پڑھنا شروع کیا جس کا سلسلہ سات دن تک جاری رہا۔ باوجود یہ کہ یہ شہادت اس قدر محنت اور اتنی مدت میں تیار کی گئی تھی مگر اس میں الفاظ و معانی کا بے ربط و بے محل ہونا، عبارت کا اکثر مقامات میں خبط ہونا، طویل و لاطائل اور مکرر الفاظ کا بے فائدہ بار بار لانا، عربی الفاظ اور اعراب کی غلطیوں کے علاوہ معمولی فارسی عبارتوں اور اشعار کا غلط پڑھنا وغیرہ اس کی غمازی کر رہا تھا کہ اس مقدمہ نے قادیانیوں کو بدحواس کر دیا۔ قادیانیوں کی یہ شہادت ہمارے علماء کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی کیونکہ بقول مرتب ''صولتِ محمدیہ'' اگر پورے ایک سال تک مرزا اور مرزائیوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا جاتا تو بھی اس کے کفریات کی اتنی حقیقت منکشف نہ ہوتی جتنی کہ اس ہفت روزہ شہادت سے منکشف ہوگئی۔

جلال الدین شمس نے ۱۲ر نومبر ۱۹۳۲ء کو اپنی شہادت ختم کی، اب خیال تھا کہ اس پر جرح کا موقع ملے گا مگر عدالت نے جرح کے لیے آئندہ چھ ماہ کے بعد کی تاریخ مقرر کی جس کی بنا پر اس وقت جرح نہ ہوسکی اور فی الوقت یہ مقدمہ آئندہ کے لیے مؤخر ہوگیا لہٰذا حضرت لکھنویؒ وطن واپس آگئے اور پھر دوبارہ آپ کا جانا وہاں نہیں ہوسکا۔ غالباً اسی وجہ سے اس مقدمہ کی جو روداد پاکستان میں ۱۹۸۸ء میں تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس میں آپ کی شرکت کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ لیکن اصولاً اس مقدمہ کے حصہ لینے والوں میں آپ کا ذکر بھی اس میں ہونا چاہیے تھا۔

اس مقدمہ کا حق و انصاف پر مبنی تاریخ ساز فیصلہ جناب محمد اکبر خان صاحب بی اے، ایل ایل بی، ڈسٹرکٹ جج بہاولپور نے دیا تھا جنھوں نے فریقین کے پیش کردہ قانونی حوالہ جات و نظائر کا پوری تحقیق سے جائزہ لینے کے بعد مسماۃ غلام عائشہ کے موقف سے اتفاق کرتے ہوئے ۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو یہ فیصلہ صادر فرمایا:

''قرآن پاک، احادیث نبویہ اور حکومت کے قانون کی روشنی میں مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین اپنے عقائد و اعمال کی بنا پر مسلمان نہیں ہیں بلکہ کافر اور خارج از اسلام ہیں، لہٰذا کوئی مسلمان عورت کسی قادیانی کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔''

چنانچہ اس نکاح کے فسخ ہونے کے بعد مسماۃ غلام عائشہ کا دوسرا عقد ۱۹۳۵ء میں مولانا سلطان محمود صاحب شیخ الحدیث مدرسہ محمدیہ جلال پور پیروالہ ضلع ملتان سے ہوگیا جن سے دو صاحبزادے بھی پیدا ہوئے تھے[1]

۹۔ مناظرہ رُدولی ضلع بارہ بنکی

رودولی ضلع بارہ بنکی (یوپی) میں مولانا لکھنویؒ سے ایک مناظرہ مولوی رونق علی رودولوی سے حیات مسیح کے موضوع پر ہوا تھا جس میں مولوی رونق علی نے لاجواب ہوکر اپنے قادیانی عقائد سے برسرِ عام توبہ کی تھی۔ اس کی روداد ''مناظرہ رودولی'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی مگر اب وہ نایاب ہوچکی ہے اس لیے ہمارے مطالعہ میں نہیں آسکی۔

آریہ سماجیوں سے مناظرے

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جہاں اور بہت سے فرقے اسلام کے خلاف صف آراء تھے وہیں برادرانِ وطن کی ایک شدّت پسند تنظیم بھی اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف قولاً و عملاً مدّ مقابل آگئی تھی اور جابجا مسلمانوں سے مناظرہ اور مباحثہ کرنے اور سیدھے سادے کم پڑھے لکھے مسلمانوں کو اپنا مذہب تبدیل کرکے ہندو دھرم میں شامل کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اس سلسلہ میں آریہ سماجی پنڈتوں نے دیہاتوں اور قصبات میں گھوم پھر کر اکثر مسلمانوں کو مرتد بنا کر اپنے مذہب میں شامل کرلیا اور اس طرح ارتداد کی ایک لہر چل پڑی جس کو ''شدھی آندولن'' کہا جاتا تھا۔ درحقیقت اس کے پردہ میں بھی انگریز حکومت کا ہاتھ تھا جو یہی چاہتی تھی کہ ملک میں ہندو مسلم تعلقات کشیدہ رہیں اور ان دونوں مذاہب کے ماننے والے آپس میں متفق نہ رہ سکیں تاکہ تحریک آزادی کو قوت حاصل نہ ہوسکے۔ اسی زمانہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں سخت گستاخانہ اور توہین آمیز متعدد کتابیں و رسائل اُردو میں تصنیف کرکے شائع کیے گئے جس سے مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی کا پھیلنا فطری بات تھی چنانچہ ملک کے مختلف

---

[1] صولت محمدیہ بر فرقہ غلمدیہ الملقب بہ بطش الصادقین بطاغوت المارقین، مرتبہ حضرت مولانا عبدالسلام فاروقی صاحبؒ، ملخصاً

مقامات پر فسادات ہوئے اور پنجاب و دہلی میں اس قسم کے لٹریچر کی اشاعت پر عدالت میں مقدمات بھی قائم ہوئے جس میں فتح و شکست کا ہنگامۂ کارزار برپا ہوا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی تھی کہ اس دور میں آریہ سماجیوں اور اہل اسلام میں بڑے بڑے مناظرے بھی ہونے اور ہر فریق اپنے مخالف کو اپنے دلائل اور براہین سے جوابات دینے لگا چنانچہ انہی حالات میں حضرت لکھنویؒ سے بھی آریہ سماجی علماء سے متعدد مناظرے ہوئے۔ ان میں سے چند کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات النجم سے فراہم ہوئی ہیں جو یہاں پیش کی جارہی ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ تعداد ان مناظروں کی ہے جن کی کوئی تفصیل ہمیں دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔

۱۔ مناظرہ فیروز آباد ضلع آگرہ ۱۹۱۳ء

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں فیروز آباد ضلع آگرہ بھی ایسے ہی مقامات میں سے ایک اہم مقام تھا جہاں آریہ سماجی رہنما مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے، ان حالات کو دیکھ کر مسلمانانِ فیروز آباد نے ایک انجمن اسلامیہ قائم کی جو اکثر اپنے سالانہ جلسے کیا کرتی تھی، اس سلسلہ میں اس انجمن نے اپنے یہاں ۱۶ر تا ۱۸ر اپریل ۱۹۱۳ء کو ایک دینی جلسہ کا اعلان کیا اور آریہ سماجی رہنماؤں کو بھی دعوت دی کہ وہ اس موقعہ پر آ کر علماء کرام سے مناظرہ کریں چنانچہ آریہ صاحبان نے بھی بخوشی اس پیشکش کو قبول کرلیا۔

یہ جلسے اپنی متعینہ تاریخوں پر شروع ہوگئے، اس سال ان جلسوں میں مولانا ناظر حسن صاحب دیوبندیؒ سابق مدرس مدرسہ محمودیہ چھتاری ضلع علی گڈھ، مولانا محمد یوسف علی صاحب میرٹھیؒ مدرس مدرسہ اسلامیہ فرخ آباد، مولوی عبدالحکیم صاحب لکھنویؒ اور مدیر النجم مولانا لکھنویؒ بھی مدعو کیے گئے تھے۔ مولانا ناظر حسن صاحبؒ نے اپنی تقریر میں مادہ اور روح کی قدامت کا ابطال فرمایا، مولانا محمد یوسف علی صاحبؒ نے تناسخ کے ابطال پر تقریر فرمائی اور مولوی عبدالحکیم صاحبؒ نے مادہ اور روح کی قدامت کے ابطال کے علاوہ کچھ تناسخ کے بارے میں بھی بتلا کر وید کے ناقابلِ عمل ہونے کے دلائل دیئے۔ مولانا لکھنویؒ نے قرآن مجید کے کلامِ الٰہی ہونے کے دلائل و شواہد پر بصیرت افروز تقریر کی۔ ان مواعظ میں آریہ سماجی رہنماؤں میں پنڈت سری پت لال جوائنٹ سکریٹری آریہ سماج فیروز آباد اور پنڈت بھوج دت شرما، ایڈیٹر آریہ مسافر آگرہ اور ان کے صاحبزادے ڈاکٹر لچھمن پرشاد خاص طور سے شریک ہوئے اور یہاں ہونے والی تقاریر کو بغور سنتے رہے۔ مقامی مسلمانوں میں مرزا امراؤ بیگ رئیس و بانی انجمن اسلامیہ فیروز

آباد اور مولانا عبدالعلیم خان صاحب سکریٹری انجمن ہذا ہمہ تن شریک جلسہ رہے۔

مولانا لکھنویؒ نے اپنی تقریر کا آغاز درج ذیل آیات قرآنیہ سے کیا اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ. (سورہ محمد: ۱-۳)

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) خدا کی راہ سے روکا، خدا ان کے اعمال کو رائیگاں کر دیتا ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور اس کتاب پر ایمان لائے جو محمدؐ پر نازل کی گئی ہے اور وہی برحق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے۔ خدا ان کے گناہوں کو مٹا دے گا اور ان کی حالت سنوار دے گا، یہ اس سبب سے کہ کافروں نے باطل کی پیروی کی ہے اور مومنوں نے اس حق کی پیروی کی ہے جو ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے ان کی حالتیں بیان فرماتا ہے۔

اس آیت کے ترجمہ کے بعد آپ نے اس کے بعض اجزاء کی تشریح و تفسیر اور اس کے اسرار و حکم بیان فرمائے۔ پھر فرمایا کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآن کے بارے میں دو طرح کے دعوے بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن برحق ہے اور دوسرے یہ کہ یہ پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، ان دعوؤں کے ثبوت میں بحمد اللہ مسلمانوں کے پاس بہت سے دلائل موجود ہیں۔ ان دلائل کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل داخلی دلائل یعنی وہ دلائل جو خود قرآن میں مذکور ہیں اور دوم وہ دلائل جو قرآن میں نہیں ہیں۔ اس وقت قسم اول کے ہی دلائل بیان کیے جائیں گے۔ قرآن نے اپنے کلام الٰہی ہونے کے جس قدر دلائل پیش کیے ہیں ان سب کا استیعاب تو میں کیا چیز ہوں بڑے بڑے علماء بھی نہیں کر سکتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر تمام دنیا کے درخت قلم بن جائیں اور تمام روئے زمین کے دریا سیاہی بن جائیں تب بھی یہ قلم و سیاہی فنا ہو جائیں گے مگر قرآن کی حقیت کے دلائل تمام نہیں ہوں گے۔

اس کے بعد آپ نے قرآن کی حقّیت کے ثبوت میں نہایت تفصیل سے یہ تین دلائل پیش کیے (۱) فصاحت و بلاغت (۲) اخبار غیب اور (۳) عدم اختلاف۔ ان دلائل کے پیش ہونے سے آریہ صاحبان میں بے چینی اور گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے اور ان کے منجھے ہوئے مناظر پنڈت بھوج دت شرما نے بحث کو الجھاتے ہوئے پہلے آداب مناظرہ کے سلسلے میں بحث شروع کر دی اور پھر اعلان کیا کہ ہم بالمشافہہ گفتگو نہ کریں گے بلکہ تحریری بحث کریں گے، اس الجھاؤ کی بنا پر مجبوراً مناظرہ کا خاتمہ ہو گیا اور شکست و فتح کا کوئی اعلان نہ ہو سکا۔ مگر عوام نے اچھی

طرح سمجھ لیا کہ نتیجہ کیا برآمد ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے مذاہب باطلہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہیں مگر بالمشافہہ گفتگو کرنے سے دور بھاگتے ہیں۔ اسی طرح آریہ صاحبان بھی میدان مناظرہ سے بغیر مناظرہ کو اختتام پذیر کیے ہوئے جلسہ گاہ سے اُٹھ کر چلے گئے اور عوام نے اپنی آنکھوں سے ان کا فرار دیکھ لیا۔[1]

۲۔ مناظرہ لکھنؤ ۱۹۱۳ء

لکھنؤ میں آریہ سماجیوں کی ایک انجمن عرصہ سے قائم تھی اور وہ ہر ہفتہ اس کی میٹنگ اور سال میں دو ایک مرتبہ اس کے بڑے جلسے کیا کرتی تھی جس میں مسلمانوں کو بھی شریک کیا جاتا تھا اور ان کے مذہب پر اعتراضات بھی انہی کے سامنے کیے جاتے تھے اور ستم یہ تھا کہ ان کو جواب دینے کا موقع بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ چنانچہ انہی حالات کے پیش نظر لکھنؤ کے کچھ ذمہ دار اور باحمیت افراد نے ایک جلسہ منشی سخاوت علی صاحبؒ رئیس کاکوری کے مکان پر بلایا اور اس میں آریہ سماجی حضرات کو بھی مدعو کیا۔ کئی بار کی خط وکتابت کرنے کے بعد بھی آریہ سماجی حضرات نے آمنے سامنے آکر گفتگو کرنے کا موقع نہیں دیا اور ان کا کوئی ذمہ دار فرد جلسے میں نہیں آیا البتہ ان کے عوام ضرور آئے اور کچھ عیسائی مشنری کے لوگ بھی خاص طور سے شریک ہوئے جن میں پادری مُلر اور پادری جوالا سنگھ قابلِ ذکر ہیں۔

مسلمانوں کی طرف سے مولانا لکھنویؒ کے علاوہ مولوی عبدالحکیم صاحبؒ، مولوی عبدالکریم صاحبؒ مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء، شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی اور مولانا سیّد علی زینبیؒ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ شریک جلسہ ہوئے۔ پہلے دن مولوی عبدالحکیم صاحب نے سورۂ اخلاص کی تفسیر بیان کی اور احد وصمد کی تحقیق کے ضمن میں تثلیث، تناسخ اور قِدَمِ مادّہ وروح وغیرہ کا ابطال کیا۔ دوسرے دن کے جلسہ میں مولانا لکھنویؒ نے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ...... وَتُؤْمِنُوْنَ بِـاللّٰہِ[2] کی تفسیر بیان کی اور یہ بتایا کہ یہ تین صفات مسلمانوں ہی میں منحصر ہیں، اسی لیے خدا تعالیٰ نے انھیں تمام عالم میں سب سے بہترین امّت قرار دیا ہے اور امر معروف ونہی منکر اور ایمان باللہ کی صفات سے عیسائی اور آریہ سماج دونوں عاری ہیں، جو لوگ اسلام کے منکر ہیں اور قرآن کو کلام خدا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق نہیں مانتے ان میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں (۱) وہ

۱۔ النجم، لکھنؤ، ۲۱ رجمادی الاولیٰ ۱۳۳۱ھ ۲۔ سورۂ آل عمران: ۱۱۰

کہ جنھوں نے اپنی خداداد قوتِ فکریہ سے کام نہیں لیا، ایسے لوگ آنحضرتؐ کی نبوت اور قرآن کی حقیقت سے ناواقف ہیں، یہ عوام کا طبقہ ہے (۲) وہ کہ جنھوں نے اپنی قوتِ فکریہ سے کام لیا اور ان پر حق منکشف ہوا مگر پھر بھی وہ دیدہ و دانستہ حق کی مخالفت کرتے رہے ہیں، یہ خواص کا طبقہ ہے، اس طرح منکروں کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ قیامت کے روز جس طرح وہ فریق معذور نہ سمجھا جائے گا جس نے باوجود انکشافِ حق کے حق کو قبول نہ کیا اسی طرح وہ بھی معذور نہ سمجھا جائے گا جس نے اپنی قوت فکریہ کو اس بارے میں استعمال نہ کیا۔ اس کے بعد تُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ کی بحث میں آپ نے فرمایا کہ جو لوگ مادہ اور روح کو قدیم سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو ایسا معذور سمجھتے ہیں کہ وہ بغیر مادہ اور روح کے کوئی کام کر ہی نہیں سکتا یا جو لوگ خدا کے لیے اس کا ہم مثل اور ہمسر تجویز کرتے ہیں اور تین خدا کہتے ہیں وہ ہرگز تُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ کے مصداق نہیں ہو سکتے۔

پادری جوالا سنگھ کے ایک سوال کے جواب میں کہ خدا تعالیٰ کے علم کی کیفیت و حقیقت کیا ہے، آپ نے فرمایا کہ حق سبحانہٗ کی ذات و صفات کے متعلق کنہ اور حقیقت کا ادراک کرنا انسانی طاقت سے بالاتر کام ہے اس لیے شرائع ربانیہ نے اس کے لیے کچھ تعلیم نہیں دی ہے اور دینا بھی نہیں چاہیے تھی کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا[1] یعنی کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی۔ انسانوں کو حق تعالیٰ نے کچھ ایسا بنایا ہے کہ جس چیز کا نمونہ یا مثال اس کے پیش نظر نہیں ہوتی تو وہ اس کے ادراک سے قاصر رہتا ہے۔ اسی وجہ سے کتبِ الٰہیہ میں نعمائی جنت میں سے صرف انہی چند نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کا کچھ نمونہ دنیا میں موجود ہے گو وہ نمونہ صرف نام ہی کے اعتبار سے ہے، اسی طرح دوزخ کے عذابات میں سے بھی صرف انہی چند عذابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا نمونہ دنیا میں قابلِ مشاہدہ ہے خواہ وہ نام چار ہی کا کیوں نہ ہو۔ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کی کیفیت بھی ایسی ہی ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْئٌ۔ لہٰذا پادری صاحب کا یہ سوال صفت علم کی بابت سوال کرنا ان کے منصبِ شرعی سے بالکل باہر ہے۔ پادری صاحب کا یہ سوال اس درخواست کے مشابہ ہے جو بنی اسرائیل نے بت پرستوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی کہ اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک خدا بنا دو جس طرح ان لوگوں نے اپنا خدا بنا لیا ہے تو کیا اب پادری صاحب بھی یہی چاہتے ہیں کہ خدا کے علم کو انسانی علم کے اقسام میں داخلِ کر دیا جائے۔ حاشا و کلا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

---

[1] سورۂ بقرہ: ۲۸۶

اس تقریر کے بعد آریہ سماجی حضرات کی وہ تحریر پڑھ کر جلسۂ عام میں سُنائی گئی جس میں انھوں نے اپنی شرکت سے معذوری کا اظہار کیا تھا جس سے حاضرین کو یہ احساس ہوگیا کہ وہ فرار حاصل کرنے کے لیے یہ بہانہ تلاش کر رہے ہیں۔ آریہ سماجیوں میں سے کچھ لوگوں نے یہ اجازت طلب کی کہ ہمیں قرآن پر اعتراض کرنے کا موقع دیا جائے۔ مسلمانوں کی طرف سے نہایت فیاضی سے اس کی اجازت دی گئی، انھوں نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں نے یہ اجازت بھی دے دی ہے تو وہ اس قسم کے اعتراض کی ہمّت نہ کر سکے اور کہنے لگے کہ اگر اس کے جواب میں ہمارے وید پر اعتراض کیا گیا تو ہم فی الوقت اس کا جواب نہ دے سکیں گے اس لیے ہم قرآن پر بھی کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ پادری جوالا سنگھ کے بار بار یہ پوچھنے پر کہ خدا کے علم کی حقیقت بتائی جائے اس کے جواب میں مولوی عبدالکریم صاحبؒ نے بڑی عالمانہ تقریر کی اور کہا کہ خدا کی ذات وصفات کی حقیقت بیان کرنا منصب شریعت سے غیر متعلق ہی نہیں بلکہ اس کے خلاف ہے۔ اسلام میں اگر ایسی لغو تعلیم ہوتی تو ہم اسلام سے دست بردار ہو جاتے۔ آریہ سماجی صاحبان، پادری حضرات اور بعض اہل علم شیعہ شرکاء انتہائی خفت اور ناکامی کا احساس لیے ہوئے جلسہ سے اٹھ کر چلے گئے اور اس مناظرہ کا یکطرفہ فیصلہ ہوگیا[1]

۳۔ مناظرہ مرادآباد ۱۹۲۳ء

مئی ۱۹۲۳ء میں آریہ سماجیوں کی طرف سے مرادآباد میں بڑی شان وشوکت کے جلسے ہوئے اور ان میں اسلامی تعلیمات وعقائد کی خوب خوب تردید کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ علمائے اسلام کو مناظرہ کا چیلنج بھی دیا گیا چنانچہ مسلمانان مرادآباد نے بھی اسلامی جلسوں کا اعلان کر دیا جس میں مندرجہ ذیل علماءِ کرام شریک ہوئے۔

۱۔ مولانا مبارک حسین صاحب سنبھلیؒ مدرس اوّل مدرسہ میرٹھ
۲۔ مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ
۳۔ مولانا سیّد فخر الدین صاحبؒ مدرس اوّل مدرسہ شاہی مرادآباد
۴۔ مولانا کاظم علیؒ صاحب

آخری جلسہ کے روز آریوں نے مناظرہ منظور کیا جس کا اعلان کر دیا گیا لیکن ہیبت حق

---

[1] النجم، لکھنؤ، ۱۴ مئی ۱۹۲۳

ایسی طاری ہوئی کہ باوجود تحریری وعدہ کے ان کے پنڈت صاحبان جلسہ گاہ میں نہیں آئے۔ یہ دن حضرت لکھنویؒ کو وعظ کے لیے دیا گیا تھا چنانچہ آپ نے حقانیت اسلام پر ایک پُر زور تقریر کی، یہ تقریر بہت زیادہ مفید اور مؤثر تھی خاص طور پر اس وجہ سے کہ اس کا موضوع یہ تھا کہ قرآن کریم میں حقانیت اسلام پر کیا دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ شروع سے اخیر تک پورا وعظ قرآن مجید کے حوالہ سے تھا۔ اثنائے وعظ میں دو آریہ سماجی یکے بعد دیگرے جوش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہمیں مسلمان کر لیجیے، اس وقت چھ سات ہزار آدمیوں کا مجمع تھا جس میں آریوں کی بھی معقول تعداد تھی، اس مجمع کے سامنے ان دونوں نو مسلموں نے بیان کیا کہ ہم کو کسی نے مسلمان ہونے کی ترغیب اس سے پہلے نہیں دی نہ ہم کو کسی قسم کی لالچ ہے۔ ہم محض اپنی نجات کے لیے مسلمان ہو رہے ہیں۔ اس مبارک واقعہ سے مسلم حاضرین میں بے حد جوش پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مولانا لکھنویؒ کے وعظ کی تاثیر تمام لوگوں کو دکھلا دی۔[1]

۴۔ مناظرہ بارہ بنکی ۱۹۱۳ء

اس مناظرہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ پنڈت بھوج دت شرما ایڈیٹر مسافر آگرہ ایک بار بارہ بنکی آئے اور حسب عادت اپنی تقریروں میں مذہب اسلام پر سخت حملے کیے اور یہ دعویٰ کیا کہ قرآن مجید فتنہ وفساد کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ دعویٰ خود ہی کیا کم فتنہ انگیز تھا چہ جائیکہ انھوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے اور بھی بہت کچھ دل آزار حملے کیے۔ مقامی مسلمانوں نے پنڈت جی سے کہا کہ ہم اپنے کسی بڑے عالم کو بلا لائیں آپ ان سے اس موضوع پر مناظرہ کر لیجیے۔ اس وقت حالات کچھ ایسے ہی تھے کہ پنڈت جی کو اس کی حامی بھرنی پڑی اور پھر دونوں فریق کے درمیان ایک تحریری معاہدہ بھی ہو گیا۔ مسلمانوں کے ایک وفد کے ذریعہ مولانا لکھنویؒ کو بھی مدعو کیا گیا چنانچہ آپ وہاں تشریف لے گئے۔ پنڈت جی نے جیسے ہی مولانا کو دیکھا تو بڑے تپاک سے کہا:

> ''میں آپ کو خوب جانتا ہوں، آپ ایک اخبار کے ایڈیٹر ہیں!''

مولاناؒ نے جواب دیا:

> ''میں بھی آپ کو خوب جانتا ہوں، آپ بھی ایک اخبار کے ایڈیٹر ہیں جس میں ہر قسم کا رطب و یابس شائع ہوتا رہتا ہے اور آپ وہی تو ہیں کہ جن کو فیروز آباد ضلع آگرہ میں مجھ سے مناظرہ

---

[1] النجم لکھنؤ، شوال ۱۳۴۱ھ

کے لیے آریوں نے بلایا تھا چنانچہ آپ آئے مگر مجھ سے مناظرہ کی ہمت نہ کر سکے، پھر ٹرین میں میرا اور آپ کا ساتھ ہوا، اس میں آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر لچھمن پرشاد مجھ سے مناظرہ پر آمادہ ہوئے مگر آپ نے انھیں روک دیا اور خود بھی مجھ سے مناظرہ نہ کیا۔"

مولانا لکھنویؒ نے اس کے بعد ہر ممکن کوشش کی کہ پنڈت جی مذہب آریہ اور مذہب اسلام کے اصولوں پر بحث کریں مگر وہ کسی طرح اس پر تیار نہیں ہوئے بالآخر انہی کے پیش کردہ مسئلہ (یعنی قرآن کی فساد انگیز تعلیمات) پر ہی بحث شروع ہوئی، پنڈت جی نے بخیال خود قرآن کے معلّم فساد ہونے کا ثبوت دینا شروع کیا۔ وہ ایک آیت پڑھتے اور اپنی نافہمی سے اس میں تعلیم فساد نکال کر بیان کر دیتے تھے لیکن مولاناؒ جب اس آیت کا صحیح مطلب بیان کر دیتے تو پنڈت جی اس بات کو وہیں چھوڑ کر دوسری آیت پڑھنے لگتے تھے اور اس سے تعلیم فساد دینے لگتے تھے، جب اس کا بھی صحیح اور حقیقی مطلب بیان کر دیا جاتا تھا تو تیسری آیت تلاش کرنے لگتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے ایک آیت پڑھی۔ لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰىٓ اَوْلِيَآءَ[1] اور کہنے لگے کہ جب یہود ونصاریٰ سے دوستی کی ممانعت کی گئی ہے تو یقیناً ان سے دشمنی کا حکم دیا گیا ہوگا ورنہ ارتفاع نقیضین ہو جائے گا۔ مولاناؒ نے اس کا جواب دیا کہ دوستی اور دشمنی نقیضین نہیں ہیں ممکن ہے کہ نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی ہو، کیونکہ ہزاروں انسان ایسے ہیں کہ جن کو ہم نہیں جانتے اور ان سے نہ ہماری دوستی ہے اور نہ دشمنی۔ بات یہیں تک پہنچی تھی کہ پنڈت جی بدتہذیبی پر اتر آئے اور مولانا کی شان میں کچھ گستاخانہ جملے استعمال کیے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تو آپ کا مہمان ہوں، کم از کم آپ کو میرے ساتھ تو ایسا نہیں کرنا چاہیے اس پر پنڈت جی نے یہ مصرعہ پڑھا:

مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

مولانا نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ میرے دوست نہیں ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ مولانا نے پھر پوچھا کہ کیا آپ میرے دشمن ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں، اس پر مولانا نے پوچھا کہ میرے ساتھ دشمنی رکھنے کی تعلیم آپ کو کس نے دی؟ قرآن نے یا وید نے؟ پنڈت جی نے کہا کہ قرآن نے نہیں بلکہ وید نے دی ہے۔ مولانا نے پنڈت جی اور تمام حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

"دیکھیے! قرآن کریم کا کیسا معجزہ ظاہر ہوا ہے، قرآن کو معلّم فساد کہنے والے کی زبان سے خدا

---

[1] سورۂ مائدہ:۵۱

نے خود ہی کہلوا دیا کہ ان کو وید نے دشمنی کی تعلیم دی ہے۔"

اب پنڈت جی کو احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گئے؟ مگر اب کیا ہو سکتا تھا، وہ خود اپنے کہے پر ششدر ہو گئے اور سکوت اختیار کر لیا۔ اس مناظرہ میں بڑی تعداد میں ہندو، مسلمان اور عیسائی حضرات جمع تھے، خود پادری جوالا سنگھ بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ قرآن کو فساد کی تعلیم دینے والا کہنے والے نے اپنی زبان ہی سے کہہ دیا کہ قرآن نے نہیں بلکہ وید نے انھیں دشمنی کی تعلیم دی ہے۔ بس یہیں پر مناظرہ ختم ہو گیا اور پنڈت جی شرمندگی اور افسردگی کے عالم میں اٹھ کر چلے گئے۔[1]

غیر مقلدین سے مناظرے

النجم لکھنؤ کی قدیم فائلوں کی ورق گردانی کے دوران اس طرح کی تحریر کئی مواقع پر نظر سے گذری تھی کہ حضرت لکھنویؒ کے کئی مناظرے غیر مقلدین سے بھی ہوئے تھے مگر چونکہ ان کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں اس موضوع پر کچھ نہیں لکھا جا سکا تھا۔ اب کچھ عرصہ پہلے اس سلسلہ کے دو مناظروں کی کچھ تفصیلات کا علم ہوا ہے جو اب اس نئے ایڈیشن میں شامل کی جا رہی ہیں۔

۱۔ مناظرہ بڑھنی ضلع بستی (یوپی) ۱۹۲۹ء

بڑھنی نیپال کی سرحد پر ضلع بستی کا ایک گاؤں ہے۔ ۱۹۲۹ء میں یہاں غیر مقلدوں سے حضرت لکھنویؒ اور دوسرے اکابر سے مناظرہ ہوا تھا۔ اس وقت اس گاؤں کی آبادی مذہب اور تعلیم کے لحاظ سے تقریباً بے بہرہ تھی۔ غیر مقلدوں نے یہاں کی فضا کو ہموار اور اپنے مناسب حال دیکھ کر اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی اور یہاں کے ناخواندہ لوگوں میں سے چند افراد کو حرف شناس بنا کر درجۂ اجتہاد تک پہنچا دیا چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سیلاب بلا بہت سے خانوادوں کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ اسی دوران خدا کی قدرت کا ایک عجیب کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ غیر مقلدین کے تربیت یافتوں میں سے ایک نوجوان مدارج تعلیم طے کرنے کے بعد غیر مقلدیت کے بڑھتے ہوئے دھارے کے لیے سدّ راہ بن گیا چنانچہ اس نوجوان فاضل نے ایک جلسہ منعقد

---

[1] النجم لکھنؤ، جمادی الآخر ۱۳۴۲ھ

کر کے علمائے اہل سنت احناف میں سے بعض بلند پایہ علماء کو دعوت دے دی جن میں حضرت لکھنویؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ[1] مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ (م۱۹۷۳ء) اور جناب مولانا محمد ایوب صاحبؒ مئویؒ (م۱۹۸۴ء) جیسے حضرات شامل تھے۔ اس جلسہ کی نمایاں کامیابی یہ رہی کہ تین اشخاص نے عین جلسہ میں تبدیل مسلک کا اعلان کیا۔ احناف کی اس کامیابی سے غیر مقلدین نے اپنی بہت دل آزاری محسوس کی لہٰذا انھوں نے اپنی سرگرمیاں اور بھی تیز کر دیں یہاں تک کہ احناف کو مناظرہ کا چیلنج بھی دے دیا اور ۸/جون ۱۹۲۹ء کو مناظرہ کی تاریخ متعین کر دی۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے اور مناظرہ کے انعقاد کا پروگرام طے کرنے کے لیے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ اور مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ وغیرہ بستی پہنچے۔ شرائط مناظرہ اور دیگر امور طے کرنے میں کئی روز تک ردّ و کد ہوتی رہی مگر مخالفین کسی شرط پر بھی ٹھہرتے نہ تھے اور اپنی ہی ضد پر اڑے رہتے تھے چنانچہ شرائط مناظرہ طے کرنے کے درمیان میں ہی وہ راہ فرار اختیار کر گئے اور اس طرح علماء احناف کی کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔[2]

۲۔ مناظرہ مہوا بسم اللہ خاں ضلع گونڈہ (یوپی) ۱۹۳۷ء

ضلع گونڈہ میں کنٹرو بوڑیہار اور مہوا بسم اللہ خاں دو قریبی مواضعات ہیں۔ ان دونوں کا

---

[1] محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ سے ان کی ابتدائی زندگی سے ہی حضرت لکھنویؒ کو بڑا خصوصی تعلق تھا چنانچہ آپ کے بعض علمی کاموں میں بھی ان کا تعاون شامل حال رہا ہے۔ مولانا اعظمیؒ ۱۹۰۱ء میں مئو ضلع اعظم گڑھ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ اب مئو خود بھی ضلع بن گیا ہے۔ قرآن کریم اور اُردو و فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد مولانا محمد صابرؒ صاحب سے پڑھیں۔ بعد ازاں دار العلوم مئو، انجمن اسلامیہ گورکھپور اور مظہر الاسلام بنارس میں بھی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۸ء میں کچھ عرصہ کے لیے دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے مگر وہاں کی آب و ہوا موافق نہ آنے سے واپس آ گئے اور پھر دار العلوم مئو سے ۱۹۲۱ء میں فراغت حاصل کی۔ آپ نے تدریسی خدمات دار العلوم مئو، مرقاۃ العلوم مئو، مظہر العلوم بنارس، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ اور دار المبلغین لکھنؤ میں انجام دی تھیں۔ تھانہ بھون جا کر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے بیعت بھی ہوئے۔ تقریباً تین درجن کتابیں آپ نے تصنیف و تالیف کیں جو اُردو اور عربی دونوں زبانوں میں ہیں۔ بہت سے اہم حدیثی ذخیروں کو ایڈٹ کیا اور حواشی لکھے، ان میں سے اکثر کتابیں عرب ممالک سے بھی بڑے اہتمام سے شائع ہوئی ہیں۔ ہندوستان اور بعض بیرونی ممالک کی یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں علومِ اسلامیہ کے ماہر کی حیثیت سے آپ رکن رہے، اپنے دَور کے محدث اعظم تھے۔ ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہ کر مارچ ۱۹۹۲ء میں وفات پائی اور اپنے وطن مئو میں سپردِ رحمت کیے گئے۔

[2] حیات ابوالمآثر، مولفہ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی، ص ۱۷۷-۱۷۸، المجمع العلمی مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ، مرقاۃ العلوم، مئو (یوپی) ۲۰۰۰ء بحوالہ قلمی تحریر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ۔

درمیانی فاصلہ صرف ایک کلومیٹر ہے۔ کنٹرو بوڑیہار میں غیر مقلدین اور مہوابسم اللہ خاں میں احناف آباد ہیں۔ قرب وجوار کے دوسرے چھوٹے چھوٹے مواضعات میں بھی بڑے بڑے مدرسے اپنے اپنے طریقوں کے مطابق، دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ بوڑیہار کا مدرسہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوریؒ صاحبِ تحفۃ الاحوذی کا قائم کردہ تھا اور مہوابسم اللہ خاں کا مدرسہ انوارالعلوم مولانا محمد منشاء صاحب انصاریؒ نے قائم کیا تھا جو پورے علاقہ میں ''بڑے مولوی صاحب'' کے نام سے مشہور تھے۔ غیر مقلد مولویوں نے جب جارحانہ انداز میں غیر مقلدیت کی ترویج کی کوشش کی تو دوسری طرف مولانا محمد منشاء صاحبؒ کا حلم وتدبر بھی مدافعانہ طریقہ سے ان کوششوں کو ناکام بناتا رہا۔ ٹھیک اسی دور میں مہوابسم اللہ خاں کے ایک نوجوان رئیس مولانا حفیظ اللہ خاں صاحب مرحوم نے جو لکھنؤ میں تکمیل الطب کالج میں تعلیم حاصل کررہے تھے حضرت لکھنویؒ سے ان حالات کا ذکر کیا تو آپ نے انھیں ایک بڑے جلسہ کے انعقاد کا مشورہ دیا، مولانا حفیظ اللہ خاں مرحوم اس کام کے لیے آمادہ ہوگئے اور انھوں نے علماء کرام کے انتخاب اور ان کے مدعو کرنے کی ذمہ داری بھی حضرت لکھنویؒ کے ہی سپرد کرنے پر اصرار کیا جس کو آپ نے خوشی سے قبول بھی فرمالیا۔

اپنے وطن آکر جب انھوں نے اس طرح کے جلسہ کے انعقاد کے سلسلہ میں لوگوں سے مشورہ تو اس پر سب ہی لوگ تیار ہوگئے اور جلسہ کی تاریخ متعین کرکے اعلان کرادیا گیا۔ اس خبر سے غیر مقلدین کی صفوں میں ہلچل مچ گئی چنانچہ انھوں نے بھی انھی تاریخوں میں ایک جلسۂ عام کا اعلان کردیا اور اپنے شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری[۱] مرحوم کو بطور خاص مدعو کیا اور انھیں اس

---

[۱] جناب مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ اصلاً کشمیری ہیں۔ ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ کچھ دنوں مولانا احمد اللہ امرتسریؒ سے تعلیم حاصل کی، حدیث کی کچھ کتابیں مولانا عبدالمنان صاحب وزیرآبادی سے پڑھیں پھر ۱۳۰۸ھ میں دارالعلوم دیوبند پہنچ کر منطق، حکمت، اصول اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ کانپور جاکر مولانا احمد حسن صاحب سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں مگر اس سے اکابر دیوبند کی وابستگی میں کچھ فرق نہیں پڑا۔ فراغت کے بعد امرتسر میں تصنیف وتالیف میں مصروف ہوگئے۔ مسلکاً اہل حدیث تھے اور اسی نام سے ایک مطبع بھی قائم کیا تھا۔ ۱۳۲۱ھ میں اپنا مشہور ہفت روزہ اخبار ''اہل حدیث'' کے نام سے جاری کیا جو ۴۴ سال تک شائع ہوتا رہا۔ ردِّ قادیانیت میں نمایاں حصہ لیا۔ تحریک آزادی میں اکابر جمعیۃ علماء ہند کے شانہ بشانہ کام کیا۔ آپ کی تصانیف میں تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، تفسیر ثنائی اُردو اور تقابل ثلاثہ بہت زیادہ مشہور ومقبول ہوئیں۔ تقسیم ہند کے بعد گوجرانوالہ (پاکستان) چلے گئے تھے اور وہیں ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ میں بمقام سرگودھا انتقال ہوا۔

بات کے لیے بھی آمادہ کرلیا کہ وہ احناف سے مناظرہ کریں۔

بالآخر جلسہ کی تاریخ آئی اور پورے اہتمام سے ایک ہی باغ میں دونوں جماعتوں کے جلسوں کا انتظام کیا گیا اور اسٹیج بھی آمنے سامنے لگایا گیا۔ حضرت لکھنویؒ نے اپنے جلسہ کا آغاز کرتے ہوئے مولانا ثناء اللہ امرتسری سے پوچھا کہ پہلے آپ تقریر کریں گے یا میں اپنے کسی مقرر کو تقریر کے لیے کھڑا کروں؟ مولانا امرتسری نے قرأت خلف الامام کا موضوع پیش کرتے ہوئے کہا کہ پہلے آپ اپنے مقرر سے اس پر بحث کرائیے اور یہ ثابت کرائیے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا ناجائز ہے۔ ان حالات میں حضرت لکھنویؒ نے ایک نوجوان عالم کے نام کا اعلان کیا اور انھیں اس موضوع پر تقریر کرنے کا حکم صادر فرمایا، یہ نوجوان عالم جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو انھیں دیکھ کر بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی اور اکثروں کے چہرے اتر گئے کہ غیر مقلدوں کے پہاڑ کے مقابلہ میں حضرت لکھنویؒ نے ایک نوجوان کو اکھاڑے میں اتار دیا ہے، اللہ ہی خیر کرے! یہ نوجوان عالم وہی تھے جنھیں بعد میں علمی حلقوں میں فخر اماثل محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کے نام نامی سے شہرت حاصل ہوئی۔

مولانا اعظمیؒ جب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو خطبۂ ماثورہ کے بعد فرمایا کہ قرأت خلف الامام کو غیر مقلدین سب سے اہم اور اپنا مضبوط اور مدلل مسئلہ سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے استدلال مکڑی کے جالوں سے بھی زیادہ کمزور اور بے حقیقت ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے کیا سوچ کر تقریر کے لیے اس موضوع کو منتخب کیا ہے۔

ان جملوں کے بعد مولانا اعظمیؒ نے غیر مقلدین کے تمام دلائل کا محدثانہ اسلوب میں تجزیہ کرنا شروع کیا اور بحث ونظر کا وہ باب کھولا کہ پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا، اہل علم دم بخود تھے اور عوام حیران وششدر تھے۔ یہ سلسلہ فجر کی اذان تک جاری رہا۔ دوسری رات پھر مولانا اعظمیؒ نے اسی موضوع کو شروع کیا اور یہ رات بھی اسی پر بحث کرتے ہوئے گذر گئی۔ غیر مقلدین انگشت بدنداں تھے اور ان کا کوئی عالم اس کے جواب دینے پر آمادہ نہ تھا چنانچہ تیسری رات حضرت لکھنویؒ نے مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم کو مخاطب کرتے ہوئے دعوت دی کہ اب آپ خود یا اپنے کسی منتخب عالم کو جوابی تقریر کے لیے کھڑا کریں بشرطیکہ بحث کا انداز وہی محدثانہ

اسلوب ہو جس میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ نے اپنی بات پیش کی ہے لیکن غیر مقلدین کی صفوں میں انتشار پھیل چکا تھا لہٰذا کوئی بھی جوابی تقریر کے لیے آمادہ نہیں ہوا چنانچہ کچھ وقفہ کے بعد حضرت لکھنویؒ نے خود اختتامی تقریر فرمائی اور فریق مخالف کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اب ہم لوگ صبح کو یہاں سے واپس ہو جائیں گے لیکن ایسا نہ ہو کہ ہمارے جانے کے بعد آپ حضرات بغلیں بجائیں کہ احناف میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اگر ایسا سننے میں آیا تو شاید میں تو نہ آسکوں لیکن میں اپنے ان نوجوان فاضل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کو یہاں ضرور دوبارہ بھیج دوں گا جو احقاق حق کا فریضہ کماحقہٗ ادا کر دیں گے۔ اس واقعہ کے بعد وہاں غیر مقلدیت کا زور ایسا ٹوٹا کہ پھر آج تک وہ اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی[1]

اس طرح مذکورہ مناظروں کی مجموعی تعداد ۴۳ ہوتی ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی مگر امتداد زمانہ کی وجہ سے ہمارے سامنے کوئی قابل وثوق ریکارڈ نہیں ہے اس لیے ہم فی الوقت اتنے ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔

حضرت لکھنویؒ کو ان مناظروں اور دیگر تبلیغی اسفار کے سلسلہ میں ملک کے گوشے گوشے میں جانا پڑا تھا اور بے شمار صعوبتیں اٹھانا پڑی تھیں جبکہ اس دور میں ذرائع آمد و رفت بھی بہت ناکافی اور تکلیف دہ ہوتے تھے۔ جن علاقوں میں آپ کے اسفار زیادہ ہوئے ان میں یوپی، بہار، بنگال، مہاراشٹر، کوکن، گجرات، رنگون، جموں کشمیر، ہماچل پردیش اور موجودہ صوبہ ہریانہ و پنجاب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

صوبہ سندھ میں تو آپ کے درجنوں اسفار ہوئے جن کی تعداد النجم لکھنؤ میں اکثر شائع ہوتی رہتی تھی جیسے کراچی، سکھر، جام شورو، لاڑکانہ اور خیر پور ناتھن وغیرہ۔ اگر تمام مقامات کی تفصیل دی جائے تو وہ کافی طویل ہو جائے گی۔

---

[1] مجلہ "المآثر" (سہ ماہی)، مئو (یوپی) جلد ۸، شمارہ ۱، ۴ر مارچ ۱۹۹۹ء، حسب تحریر جناب مولانا عبدالحفیظ رحمانی

بائیسواں باب

تصنیفات وتالیفات وتراجم

حضرت مولانا لکھنویؒ نے اپنی علمی زندگی کا آغاز ایک مدرس کی حیثیت سے کیا تھا، پھر آپ صحافت کے میدان میں داخل ہوئے اور ''علم الفقہ'' نامی ایک رسالہ کا اجراء کیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد پندرہ روزہ ''النجم'' جاری کیا۔ ان تمام مشاغل کے ساتھ آپ کا تصنیفی وتالیفی سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ماہنامہ ''علم الفقہ'' بعد میں مستقل ایک اہم فقہی تصنیف بن گیا اور ''النجم'' اپنی گونا گوں خصوصیات کے علاوہ آپ کی مختلف تالیفات اور تراجم کے شائع ہونے کا ذریعہ قرار پایا۔

لکھنؤ آپ کا وطن تھا، وہاں کا مخصوص مذہبی ماحول اور اہل سنت کی سماجی، علمی، ودینی حالت سب آپ کی نظر میں تھی، اس ماحول سے آپ اور آپ کے گھرانے کا متاثر ہونا فطری بات تھی، گھر میں انہی باتوں کا چرچا رہتا ہوگا چنانچہ انہی سب چیزوں کا اثر تھا کہ ۱۸۹۵ء میں جبکہ آپ صرف پندرہ سولہ برس کی عمر میں متوسطات کے طالب علم تھے اور اپنے والد کے ہمراہ تحصیل کماسن ضلع باندہ (یوپی) میں مقیم تھے اس وقت لکھنؤ کے مشہور شیعی عالم مولوی سیّد حامد حسین مجتہد (م۱۳۰۶ھ) کی مشہور کتاب ''استقصاء الافحام'' کے بعض ابواب کا جواب فارسی میں لکھ کر ''انتصار الاسلام بجوب استقصاء الافحام'' کے نام سے مرتب کیا تھا جس کو بہت بعد میں ۱۳۰۵ھ کے النجم میں اُردو میں ترجمہ کرکے بھی شائع کردیا تھا۔ یہ آپ کی سب سے پہلی تصنیف تھی پھر ہماری تحقیق کے مطابق آپ کا سب سے آخری علمی کارنامہ نواب محسن الملک مولوی محمد مہدی علی خاں صاحبؒ (م۱۹۰۷ء) کی مشہور کتاب ''آیات بیّنات'' حصّہ اوّل کا فارسی ترجمہ تھا جسے آپ نے مع حواشیِ مفیدہ واضافاتِ جدیدہ کے تحریر کیا تھا جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔

مولانا نے اسلامی ادب کے مختلف موضوعات پر کام کیا ہے جس میں قرآنیات، احادیث نبویہ، فقہ اسلامی، سیرت النبی، صحابہ کرام و بزرگان دین کے فضائل ومناقب، تاریخ وسیر، تائید

مذہب اہل سنت اور اسلام سے ٹکرانے والے فرقوں کے خلاف ایک گراں قدر دینی لٹریچر خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ ان موضوعات پر اکثر تصانیف اُردو زبان میں سب سے پہلے آپ ہی کے قلم سے منظر عام پر آئی ہیں، مثلاً قرآن مجید کی روشنی میں اُردو میں سیرتِ مقدسہ کی اولین کتاب ''سیرت الحبیب الشفیع من الکتاب العزیز الرفیع'' آپ ہی نے مرتب کی تھی، اسی طرح صحابۂ کرامؓ کے حالات وسیرت پر علامہ ابن اثیر جزریؒ کی ایک معتبر وضخیم کتاب ''اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ'' کا مکمل اُردو ترجمہ آپ ہی نے سب سے پہلے کر کے شائع کیا تھا، تاریخ طبری کے پہلے حصّہ کا بھی اُردو ترجمہ آپ ہی نے پہلے پہل لکھ کر شائع کیا تھا، فقہی مسائل پر اُردو میں ضخیم کتاب ''علم الفقہ'' مرتب کرنے کا اعزاز سب سے پہلے آپ ہی کو حاصل ہوا، عورتوں، بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے سیرت نبوی پر مختصر رسائل آپ ہی نے سب سے پہلے اُردو میں مرتب کر کے شائع کیے تھے جو آج بھی مختلف مدارس ومکاتب میں داخل نصاب ہیں، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب کو اُردو میں مرتب کر کے آپ ہی نے سب سے پہلے طبع کیے تاکہ ان برگزیدہ ہستیوں سے مسلمانوں کے دلوں میں محبت وعقیدت پیدا ہو۔ فرق باطلہ پر جتنا زیادہ تردیدی لٹریچر آپ نے تیار کر کے شائع کیا اس کی مثال ماضی قریب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ حیرت تو یہ ہے کہ یہ تمام تصنیفی کام اور ضخیم کتابوں کے تراجم، درس وتدریس، مناظرانہ مصروفیتوں اور مسلسل طویل اسفار کے ساتھ ساتھ انجام پذیر ہوئے اور متعدد کاموں پر تو دوبارہ نظر ثانی کی نوبت بھی نہیں آسکی۔ ان کتب ورسائل کے علاوہ النجم کے صفحات پر آپ کے مضامین ومقالات اور اس کے اداریئے، کتابوں پر تبصرے اور تبلیغی تحریرات مستزاد ہیں جن کے بارہ میں ہمارا اندازہ ہے کہ وہ پچاس ہزار صفحات سے کم نہ ہوں گے۔ اپنے معاصرین کے خطوں کے جوابات دنیا خود اپنی جگہ الگ ایک کام ہے، اس سلسلہ میں کم از کم دو ہزار مکتوبات تو ہمارے ذخیرے میں موجود ہیں۔ ان سب کے علاوہ مختلف مسائل پر فتویٰ نویسی آپ کا ایسا کام ہے کہ اس پر مستقل ایک تصنیف کی ضرورت ہے۔ آپ کے مرتب کردہ فتوے مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ، دارالمبلّغین لکھنؤ کے کتب خانوں اور النجم کے صفحات پر اب تک کسی نہ کسی حد تک موجود محفوظ ہیں۔

مولاناؒ کے ان علمی کاموں کا آغاز آج سے اسّی نوے سال پہلے ہوا تھا مگر اس وقت بھی جو اسلوب زبان انھوں نے اختیار کیا تھا وہ آج کے اسلوب سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ ان کے

اوّلین مخاطب عوام تھے اور انہی کے علم وفہم کے مطابق انھوں نے اپنا طرز تحریر اختیار کیا تھا، چونکہ عوام ہی سب سے پہلے فرق باطلہ کے پروپیگنڈہ کا شکار ہوتے ہیں اس لیے عوام ہی کی اصلاح و تربیت کو انھوں نے اپنا مشن بنایا تھا، اپنے بعض رسائل میں انھوں نے لکھا ہے کہ اگر میرے ان رسائل اور مضامین کو کوئی اچھی طرح پڑھ لے اور انھیں ذہن نشین کر لے تو وہ بڑے سے بڑے مجتہد کو مبہوت و ساکت کر سکتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنا اسلوب بیان نہایت آسان اور سلیس رکھا تھا۔ بڑی سے بڑی بات کو چند جملوں میں ادا کر دینے کی صلاحیت ان کا طرۂ امتیاز تھا، ان کی تحریر میں کوئی ابہام، اغلاق، عالمانہ تام جھام اور فلسفیانہ موشگافیاں نہ ہوتی تھیں، وہ ایجاز و اطناب سے پاک وصاف اور مناظرانہ ہتک آمیزی اور دشنام طرازی سے بری ہوتی تھیں۔ بڑے سے بڑے علمی مسئلہ کو آسان وسادے انداز میں پیش کرنے پر انھیں ملکہ حاصل تھا۔ یہ انداز تحریر اس دَور کے بہت کم علماء کے پاس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے ایک معروف ادیب وناقد حکیم عبدالقوی دریابادیؒ مدیر صدق جدید، لکھنؤ نے ایک موقعہ پر لکھا تھا:

"مناظر اور متکلم کی حیثیت سے وہ لاثانی تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اُردو کے ایک کامیاب و مقبول مصنف بھی تھے، اُردو زبان کی تاریخ میں اس حیثیت سے ان کے نام کی شمولیت ضروری ہے کہ انھوں نے مختلف علوم وفنون پر اس زبان میں کثرت سے کتابیں ثقیل مولویانہ زبان میں نہیں بلکہ سلیس اور عام فہم زبان میں لکھیں اور دوسری زبانوں یعنی عربی وفارسی سے ترجمہ کیں — مناظرانہ لٹریچر اپنی متانت وسلاست کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے، ورنہ عام طور سے مناظرہ کا لٹریچر فریق مخالف کی سخت ترین توہین ودل آزاری سے پُر اور طرز ادا کے اعتبار سے حد درجہ سخت وکرخت ہی ہوتا ہے، مولاناؒ کے رسائل بالخصوص جس میں مولانا نے آیاتِ قرآنی کی تشریح وتفسیر، مخالف فرقوں کی تردید میں پیش کی ہے وہ ان ساری اشتعال انگیزیوں اور دل آزاریوں سے پاک اور مولانا کی قوت استدلال کے پوری طرح آئینہ دار ہیں۔ سنجیدگی اور خلوئے ذہن سے اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان سے تاثر پیدا ہونا یقینی امر ہے — جس زمانہ میں مولانا نے تصنیف وترجمہ کا آغاز کیا اس وقت ہمارے علماء کرام دُو چار کو مستثنیٰ کر کے ایسی اُردو لکھتے تھے جو مشکل اور ادق عربی الفاظ سے بھری ہوتی تھی اور پھر ان کا اسلوب تحریر بھی عالمانہ اور منطقیانہ ہوتا تھا جس سے فائدہ علماء ہی اُٹھا سکتے تھے لیکن مولانا نے شروع ہی سے اپنی راہ الگ اور نئی نکالی تھی، انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا خواہ وہ فقہ ہو یا حدیث، کلام ومناظرہ

ہو یا سیر وسوانح اور مستقل تصنیف ہو یا تلخیص و ترجمہ سب ہی کی زبان کو ہمیشہ سلیس اور طرز ادا غیر مغلق اور دل نشین ہی رکھا اور اسی طرز کو تادم تحریر اپنی تصانیف اور مضامین کے دفاتر میں، جن کی مجموعی تعداد ہزار ہا ہزار صفحات ہوگی بڑی خوش اسلوبی سے نباہا[1]۔"

مولانا کی اسی طرز نگارش کی وجہ سے آپ کی اکثر تصانیف آج تک برابر شائع ہوتی رہتی ہیں جیسے علم الفقہ، سیرت خلفائے راشدین، تنبیہ الحائرین، قاتلان حسین کی خانہ تلاشی، نفحۂ عنبریہ اور تفاسیر آیاتِ قرآنیہ وغیرہ آج بھی بہت مقبول عوام وخواص ہیں۔

مولانا لکھنویؒ کے علمی کاموں میں ایک اہم اور قابل قدر کام ان کی تفسیراتِ قرآنیہ ہیں جو ۲۰ الگ الگ رسائل میں ہیں، ان میں سے صرف دو رسائل پر مخالفین اہلسنّت نے کچھ لب کشائی کی ہمّت کی تھی جن کے جواب میں انھوں نے دو رسالے اور شائع کر دیئے تھے جن میں ازسرنو ان دونوں تفاسیر کی وضاحت ہوگئی تھی۔ ان دو زائد رسائل کے علاوہ ان تفاسیر کے لیے ایک مستقل رسالہ بطور مقدمہ کے بھی لکھا تھا اس طرح ان کی کل مجموعی تعداد ۲۳ ہوگئی ہے۔ ان تفسیری رسائل میں انھوں نے قرآن مجید سے خلفاء ثلاثہؓ کی حقیت خلافت ثابت کی ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی بدلائل ثابت کیا ہے کہ یہ تینوں خلافتیں اللہ کی طرف سے موعودہ خلافتیں تھیں۔ ان میں کچھ ایسی آیات کی تفسیرات بھی ہیں جن سے مخالفین نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت بلافصل ثابت کرنے کی بیجا کوشش کی تھی مگر مولانا نے دلائل کے ساتھ ان کے اس دعوے کا رد کیا ہے اور پھر کسی کو اس کی تردید کی ہمّت نہ ہوئی۔ مشہور عالم دین اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سابق شیخ التفسیر نے ان تفسیری رسائل کے بارے میں اپنی رائے اس طرح دی تھی:

"مجھ کو اس وقت خصوصیت کے ساتھ جس چیز کی طرف متوجہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اہلسنّت و الجماعت کے مقابلہ میں جتنی جماعتیں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں انھوں نے یہی دعویٰ کیا کہ ان کے فکر و نظر کا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور انھوں نے اپنے خیالات کی تائید میں آیاتِ قرآنیہ ہی کو استعمال کیا ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور عالم امام احمد بن محمد بن المختار الرازیؒ نے اپنی تصنیف "حجج القرآن لجمیع اهل الملل والادیان" میں ان تمام آیات کو الگ الگ ابواب میں جمع فرما دیا ہے جن کو یہ جماعتیں دلائل کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔

---

[1] ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

ان جماعتوں کی تردید میں ہمارے پاس بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور ان ذخیروں میں ان آیات سے استدلال واستنباط کے جوابات بھی مذکور ہیں جن کو یہ جماعتیں استعمال کرتی تھیں لیکن یہ کہیں نہیں نظر آیا کہ ان جماعتوں نے جن آیات پر اپنا زور استدلال صرف کیا تھا ان کو مستقل موضوع بنا کر ان آیات سے بحث کی جاتی، موافق ومخالف رائیں جمع کی جاتیں اور تحقیقی انداز میں اصل حقیقت کو ثابت کیا جاتا۔

میں اپنی محدود معلومات کے اعتبار سے کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالٰی نے شیعیت کے مقابلہ میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ کام لیا، انھوں نے ان آیات کا انتخاب فرمایا جن سے مسلک اہل سنت وجماعت کی تائید ہوتی تھی یا جن سے حضرات شیعہ اپنے معتقدات کو ثابت فرماتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات پر الگ الگ محققانہ انداز میں گفتگو فرمائی اور اس طرح انھوں نے قرآن مجید کی خدمت کا ایک جدید اسلوب اختیار فرمایا۔ آج ہمارے پاس مولانا مرحوم کی تفسیر کردہ آیات کا معتد بہ حصہ موجود ہے اس کو مطالعہ کرنے سے ایک طرف مسلکِ اہل سنت وجماعت کی صداقت کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف مخالف کے بے وزن دلائل کا بھرم کھل جاتا ہے نیز ایک محقق عالم کی شان تحقیق اپنے بعد کے آنے والوں کے لیے متانت وسنجیدگی کے ساتھ کسی علمی مسئلہ پر گفتگو کرنے کی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہے[1]۔"

مولانا لکھنویؒ کے پیش رو کچھ علماء جیسے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ وغیرہ نے اپنی بعض تحریرات میں اپنے مخصوص مقامات عالیہ اور اہم خدماتِ دینیہ کا از خود اظہار وانکشاف کیا ہے۔ یہ بات بغرض نمود ونمائش یا بطریق تعلّی نہ تھی بلکہ بسا اوقات اللہ کے بعض بندوں کو اپنے کچھ اعمال کی مقبولیت کا احساس اسی دنیا میں ہوجاتا ہے، اس احساس سے ان کے اندر جذبۂ تشکر کا پیدا ہونا فطری بات ہے، یہی جذبات "تحدیث نعمت" کے طور پر ان کے قلم سے صادر ہوجاتے ہیں۔ مولانا کے قلم سے بھی بعض موقعوں پر اپنے بارے میں کچھ ایسے ہی کلمات صادر ہوئے ہیں جو یقیناً بطور تحدیث نعمت کے ہی ہیں۔ اس وقت ہم صرف ان کی دو تحریروں سے ایسی مثال پیش کر رہے ہیں جن میں سے پہلی مثال ان کے رد

---

[1] حوالہ مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامیؒ ضمیمہ ہفت روزہ "نجم" لکھنؤ، ۲۶؍مئی ۱۹۶۲ء

شیعیت کے کارناموں سے متعلق ہے اور دوسری قرآن مجید کی عمومی خدمت سے تعلق رکھتی ہے جس کے ذریعہ صحابۂ کرامؓ کی حقانیت کو ثابت کرنے اور ان کے ناموس کے تحفظ کا فریضہ ادا کیا گیا ہے، چنانچہ ایک موقعہ پر مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"حق تعالیٰ کے لطفِ بے غایت اور بخشش بے نہایت کا شکر کس طرح ادا ہو کہ اس نے اس ذرۂ ناچیز کو اس دورِ فتن میں اپنے منتقمانہ ارادہ کا آلہ بنایا اور دشمنانِ صحابۂ کرام پر اتمام حجت کا ذریعہ قرار دیا، واللہ ذوالفضل العظیم:

اگر بادشہ بردر پیرزن
بیاید تو اے خواجہ سبلت مکن

مذہب شیعہ کی سربستہ حقیقت کا جیسا انکشاف اور اس انکشاف کا جیسا اعلان اس بندۂ ضعیف سے ظہور میں آیا وہ تائید خداوندی کی ایک روشن دلیل ہے فلہ الحمد حمداً کثیراً۔"[1]

دوسری مثال آپ کی وہ تحریر ہے جو آپ نے اپنے تفسیری رسائل کے بارے میں ایسے ہی احساسات کے اظہار میں شائع کی تھی وہ یہ ہے:

"اللہ اکبر، کہاں اللہ جل شانہٗ کا اتنا بڑا انعام اور کہاں یہ مشت خاک، تمام کاموں سے بے کام کر کے اپنے دین پاک کی خدمت میں لگایا اور خدمات دینیہ میں بھی چن کردہ خدمت سپرد کی جو براہِ راست بارگاہِ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی پاسبانی سے تعلق رکھتی ہے جس میں دلائل نبوت یعنی ذواتِ مقدسۂ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے ناموس کی حفاظت اور قرآنِ عزیز کی حمایت اور اس کے مطالعہ کا کام رہتا ہے۔"

اے خدا قربانِ احسانت شوم
ایں چہ احسان ست قربانت شوم[2]

مولانا کی تصانیف پر لکھتے وقت ایک بات یہ ذہن میں آئی کہ ان کے مختلف مناظروں کی بعض وہ رودادیں جن میں سے کچھ بعض وقتی مصالح کی بنا پر دوسرے حضرات کے نام سے بھی شائع ہوئی تھیں انھیں بھی مولانا کی تصانیف میں شمار کرنا چاہیے کیونکہ ان کی تدوین و ترتیب آپ

---

[1] کشف حقیقت مذہب شیعہ، مؤلفہ مولانا لکھنویؒ، ص ۸۶، دوسرا ایڈیشن

[2] تفسیر آیات مودۃ القربیٰ، مؤلفہ مولانا لکھنوی، ص ۴، مشمولہ "النجم" لکھنؤ، ۷-۲۱ شعبان ۱۳۴۶ھ

ہی کی کی ہوئی ہے اور مزید یہ کہ ان رودادوں کا اسی فیصد مواد آپ ہی کے خطوط اور تقریری اقتباسات پر مبنی ہے۔ اکثر آپ کے یہ مناظرے کئی کئی دن تک جاری رہے تھے اور ہر روز ان میں آپ کی تقریر ہوتی تھی اور یہ تمام تقریریں آپ ہی کے الفاظ میں ان رودادوں میں درج ہیں اس لیے ان کا بڑا حصّہ آپ ہی کی تقریر و تحریر پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ بعض رودادوں میں آپ نے مقابل فرقہ کے بارے میں اپنی بعض اہم تحقیقات بھی بہ تمام وکمال شامل کی ہیں، لہٰذا ہم نے انھیں بھی یہاں اسی زمرے میں شمار کیا ہے۔

مولانا کی ان تصنیفات اور علمی تحقیقات کو خود ان کے معاصرین نے بھی خراج تحسین پیش کیا تھا جن میں صاحب طرز ادیبوں اور محققین فن نے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کیا تھا ان میں اردو کے مشہور ادیب، صحافی اور انشا پرداز، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنویؒ، مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار لاہور، مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق جدید، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحی حسنی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مولانا ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر لکھنؤ اور علماء و مشائخ میں مشہور عالم دین اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحب لکھنویؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید محمد علی صاحبؒ مونگیری بانی ندوۃ العلماء، حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری، بانی جماعت تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کاندھلوی، عارف باللہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ رائے پوری اور مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ دہلوی کے علاوہ اور بہت سے دوسرے دانشور و اہل نظر حضرات کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اب ہم مولانا کی ان تمام تصنیفات و تالیفات اور تراجم کا مختصر تعارف پیش کر رہے ہیں جو ہمارے محدود علم میں آئی ہیں۔ ان میں سے جو غیر مطبوعہ ہیں یا اب نایاب ہو چکی ہیں ہم نے ان کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ابھی ایسی تصانیف بھی کافی ہیں جو ہمارے علم میں نہیں آسکی ہیں۔ ہم نے ان تمام تصانیف کو ان کے موضوع کے لحاظ سے مختلف زمروں میں تقسیم کیا ہے تاکہ قارئین کو سہولت ہو۔

قرآنیات

۱۔ ترجمۃ القرآن:

مولانا لکھنویؒ نے اپنے علمی کاموں کا آغاز اور دارالمبلغین لکھنؤ کا افتتاح خالص تعلیمات قرآنیہ کی نشر و اشاعت سے کیا تھا۔ دارالمبلغین میں آپ کے ذریعہ ترجمۂ قرآن مجید کے کئی دور مکمل ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی علمی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی قرآن مجید کے اُردو ترجمہ کا کام مکمل کرلیا تھا جس کو ''ترجمۃ القرآن'' کے نام سے موسوم کیا تھا۔ کئی بار النجم میں اس کی اشاعت کا اعلان بھی کیا گیا مگر شاید یہ کبھی شائع نہیں ہوسکا۔ بعض حضرات کا خیال تھا کہ آپ نے دہلی کے قیام کے زمانہ میں مرزا حیرتؔ دہلوی (م ۱۹۲۷ء) کے مطبع میں رہ کر قرآن مجید اور نصف صحیح بخاری کا ترجمہ کیا تھا مگر اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا ہے اور نہ ہی مولانا نے کسی موقعہ پر اس کی تصدیق و تائید کی ہے۔ مرزا حیرت کے یہاں ملازمت ضرور کی تھی مگر وہاں قرآن مجید کے اُردو ترجمہ کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ مرزا صاحب کے نام سے جو ترجمہ شائع ہوا تھا اس سے آپ کا کوئی تعلق نہ تھا، اس کو آپ کی طرف منسوب کرنا سراسر خلافِ تحقیق ہے۔ ممکن ہے کہ اسی زمانہ میں آپ نے بطور خود قرآن مجید کا اُردو ترجمہ کا کام مکمل کیا ہو اور اسے ترجمۃ القرآن کا نام دیا ہو مگر یہ یقینی بات ہے کہ یہ ترجمہ کبھی شائع نہیں ہوا اور اب تو اس کا مسودہ بھی نایاب ہے جبکہ مرزا حیرت کا مکمل اُردو ترجمہ خود انہی کے مطبع سے شائع ہو چکا ہے۔ اگر مولانا کا یہ ترجمۃ القرآن خود آپ ہی کی نگرانی میں شائع ہو جاتا تو قرآن حکیم کے مطالب عالیہ ایک نئے اسلوب کے ساتھ منظر عام پر آجاتے اور بہت سے ایسے قرآنی اسرار و رموز کی عقدہ کشائی ہوجاتی جن سے باطل کے اعتراضات کا رد کرنا اہل علم کے لیے مزید آسان ہوجاتا۔

۲۔ سلک المرجان فی مصادر القرآن

اللہ تعالیٰ کی جو عظیم الشان نعمتیں آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے ہم مسلمانوں کو ملی ہیں ان میں سب سے بڑی نعمت قرآن مجید ہے جس پر دین و ایمان کی بنیاد ہے، اسی پر اسلام کی

سر بفلک عمارت جگمگا رہی ہے اور انشاء اللہ نفخ صور تک بلکہ اس کے بعد بھی ابدالآباد تک جگمگاتی رہے گی۔ اس طرح قرآن مجید جو بجائے خود ایک نعمت ہے اور پھر اس سے متعلق دوسری اتنی نعمتیں ہیں جن کی کوئی گنتی بھی نہیں بتائی جا سکتی۔ اس رسالہ میں مولانا نے ان خدماتِ قرآنیہ کی ایک فہرست مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا جو ماضی میں ہمارے سلف صالحین نے بتوفیق خداوندی سرانجام دی ہیں۔ بلاشبہ یہ خدمات ایسی ہیں کہ اُمم سابقہ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ ان خدمات کو دیکھ کر ایک غیر مسلم کی زبان سے بھی یہ نکل جاتا ہے کہ قیامت تک باقی رہنے والی اگر کوئی کتاب ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے۔ کلمہ گویانِ اسلام میں صرف اہل سنت سے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ خدمات لی ہیں تاکہ دنیا پر یہ بات روشن ہو جائے کہ اسلام کے حقیقی اور سچے وارث یہی لوگ ہیں۔

ہمیں اس رسالہ کے چند ابتدائی مطبوعہ صفحات ہی دیکھنے کی سعادت حاصل ہو سکی ہے جو سب سے پہلے النجم میں اشاعت پذیر ہوئے تھے[1]۔ اس کی بقیہ قسطیں باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہو سکیں۔ ان ابتدائی صفحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب 'اتقان' کے طرز پر اُردو زبان میں آسان اور سلیس اسلوب میں یہ رسالہ مرتب کیا گیا تھا جو اگر آج مکمل صورت میں موجود ہو جاتا تو ادب اسلامی میں بیش قیمت اضافہ ہوتا۔

تفسیر آیاتِ قرآنیہ

اس موضوع پر حضرت لکھنویؒ نے تقریباً دو درجن سے زائد رسائل مختلف آیات قرآنیہ کی تفسیر میں مرتب کیے تھے جن میں مسئلہ خلافت و امامت پر اپنی فیصلہ کن تحقیقات پیش کی تھیں، ان کا مجموعی تعارف ہم اسی باب کے ابتدائی صفحات میں کرا چکے ہیں۔ یہ تمام رسائل متعدد بار شائع ہو چکے ہیں، ان رسائل میں حضرت مولاناؒ نے ان آیات قرآنیہ کو اپنا موضوع بنایا ہے جن سے انھوں نے یا تو خلفاء راشدین کی خلافت کو برحق ثابت کیا ہے یا پھر مخالفین صحابہ نے جن آیات سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلافصل یا نظریہ امامت کو ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے ان کا رد کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے قرآن مجید پر ایک نئے انداز سے نظر ڈال کر احقاق حق

---

[1] النجم، ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ

اور ابطال باطل کا فریضہ انجام دیا ہے۔ ان میں سے بعض آیات ایسی بھی ہیں جن پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ اور حضرت مجدد الف ثانی مولانا شیخ احمد سرہندیؒ جیسے حضرات بھی تفسیری کام کر گئے ہیں جن کے بارے میں آج یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت لکھنویؒ نے ان کو مزید مدلل اور مبرہن کر کے درجۂ اتمام تک پہنچا دیا ہے لیکن کچھ تفسیری رسائل ایسے بھی ہیں جن پر پہلی بار آپ ہی نے خامہ فرسائی کی ہے جس سے نئی تحقیقات کا باب کھلا ہے، اس طرح یہ رسائل آپ کے تفردات میں سے ہیں۔ ہم نے ان رسائل کے تعارف میں اس خصوصیت کی نشاندہی کردی ہے۔ اب ہم یہاں ہر ایک تفسیری رسالہ کی علیحدہ علیحدہ تفصیل پیش کر رہے ہیں۔

۳۔ مقدمہ تفسیر آیات خلافت وامامت

مولانا لکھنویؒ نے اپنی تقریروں، تحریروں اور کتابوں میں یہ اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ مخالفین اہل سنت کا ایمان موجودہ قرآن مجید پر نہ ہے اور نہ کبھی ہوسکتا ہے۔ آپ نے اہلسنت اور مخالفین کے درمیان اسی مسئلہ کو حدّ فاصل قرار دیا ہے جہاں سے دونوں کی راہیں الگ ہوجاتی ہیں۔ اب سے پہلے صدیوں تک یہ مسئلہ پردۂ خفا میں رہا اور علماء حق کی نگاہیں فریق ثانی کی مذہبی کتابوں کے انتہائی مخفی ہونے کی وجہ سے اس کی تفصیلات پر نہ پڑ سکیں۔ مشیتِ الٰہی نے یہ کام مولاناؒ ہی سے لیا کہ انھوں نے سب سے پہلے قدیم کتابوں کو حاصل کر کے اور ان کی اچھی طرح چھان بین کر کے حق و باطل میں امتیاز پیدا کر دیا اور یہ بات طے کر دی کہ ہمارے اور ان کے درمیان بنیادی اختلاف ایمان بالقرآن کے مسئلہ پر ہے۔

مذکورہ بالا مسئلہ کو صاف کرنے کے بعد آپ نے مسئلہ خلافت وامامت کی طرف توجہ فرمائی اور اس مسئلہ کا بھی حتمی فیصلہ کر دیا۔ اس مسئلہ کی اچھی طرح تنقیح کر کے مخالفین کے لاحاصل دعوؤں کی تردید کے لیے آپ نے کتاب اللہ کی بعض آیات کی تفسیر لکھنے کا بیڑا اٹھایا جس کی روشنی میں مسئلہ خلافت وامامت کی اصل حقیقت سامنے آگئی اور ثابت ہوگیا کہ قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہوئے خلافت راشدہ کو موجودہ ترتیب کے مطابق مانے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اور اسی طرح مسئلہ امامت کو بھی مخالفین کے مفروضہ معنوں میں قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ان منتخب آیات کی تفسیر لکھنے سے پہلے مولاناؒ نے ایک رسالہ بطور ''مقدمہ'' تحریر فرمایا تھا

جس میں ان تفسیرات کی خصوصیات اور ان کی ترتیب میں کن کن باتوں کا دھیان رکھا گیا ہے ان کی تفصیل بیان کی ہے۔ مولانا نے ان تفسیری رسائل میں دو طرح کی آیات منتخب کی ہیں۔ اوّل وہ آیات جن سے اہلسنّت خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت ثابت کرتے ہیں اور دوم وہ آیات جن سے مخالفین اہلسنّت حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی خلافتِ بلافصل ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ ان دونوں قسموں کی آیات کے لیے الگ الگ رسالے لکھے گئے ہیں۔

اس ''مقدمہ'' میں درج ذیل عنوانات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے:

۱۔ مذہب مخالف کی ایجاد کب ہوئی اور اس کی بنیاد کس کے ہاتھوں پڑی؟

۲۔ مسئلہ امامت میں سنّی شیعہ کے اختلاف کی تنقیح

۳۔ قرآن مجید کے حجت قطعی ہونے اور تفسیر بالرائے کا مطلب

۴۔ روایت حدیث کا شریعت اور عقل کے نزدیک مرتبہ

ان رسائل میں ان دو باتوں کا التزام رکھا گیا ہے:

۱۔ جس آیت کا جو مطلب بیان کیا جائے گا اس میں ظنّیات کا قطعاً کوئی دخل نہ ہوگا بلکہ جو کچھ بیان ہوگا وہ عربی زبان کے مسلّم الکل قواعد اور محاوراتِ قرآنیہ کے مطابق ہوگا۔ بطور شہادت مختلف مفسرین کے اقوال اور دیگر روایات وغیرہ بھی تحریر کی جائیں گی اور اگر تعین مراد کے لیے کوئی واقعہ بیان کیا جائے گا تو وہ واقعہ متواتر اور فریقین کے درمیان متفق علیہ ہوگا۔

۲۔ مخالفین کے اعتراضات یا استدلات کے جواب میں ان کے مسلّمات اور مسلّم الکل قواعد کا لحاظ رکھا جائے گا۔

مولاناؒ کے مطابق ان تفسیری رسائل سے دو قسم کے فوائد حاصل ہوں گے:

اوّل — یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ مخالفین کی خانہ ساز امامت قطعاً قرآن مجید کی تعلیمات کے خلاف ہے اور خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے خلیفۂ برحق ہونے میں کوئی شک وشبہ کرنا گویا کہ خدا اور رسول کے فرمان کی تکذیب کرنا ہے۔

دوم — ان تفاسیر کے مطالعہ سے اہل ایمان کے قلوب میں قرآن مجید کے مطالب عالیہ کو سمجھنے کا شعور پیدا ہوگا۔

اب ہم مولاناؒ کے ان تفسیری رسائل کا الگ الگ تعارف کرا رہے ہیں:

۴۔ تفسیر آیتِ استخلاف

اس رسالہ میں آیتِ قرآنیہ وَعَدَاللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ...... فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَاسِقُوْنَ[1] کی مکمل تفسیر بیان کی گئی ہے جس میں مولاناؒ نے خلفاء ثلاثہ کی حقیت خلافت ثابت کی ہے۔ آیت کے نزول کے وقت موجود ہونے والے تمام مومنین صالحین کو مخاطب کر کے اللہ عزّ و جل ارشاد فرماتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ہمارے رسول پر ایمان لا چکے اور عمل صالح کر چکے ہیں اُن سے ہمارا وعدہ ہے کہ ہم اسی دنیا کی زندگی میں انھیں ان تین نعمتوں سے نوازیں گے:

۱۔ خلافتِ ارضی مثل امم سابقہ (بنی اسرائیل وغیرہ)

۲۔ تکمیلِ دین اور

۳۔ امن کامل اور نجات از خوفِ دشمن ان تین وعدوں کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ اِن تین نعمتوں کے مل جانے کے بعد بھی میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور آخر میں یہ بھی فرمادیا کہ جو شخص اس انعام کے بعد بھی کفر کرے وہ اعلیٰ درجہ کا بدکار ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں اہلِ سنت کی تفاسیر میں جامع البیان، تفسیر کبیر، التنزیل، تفسیر مدارک، تفسیر بیضاوی، تفسیر نیشاپوری، تفسیر خازن، تفسیر ابوسعود، روح المعانی، جلالین، سراج المنیر، فتح البیان، کشاف، غایۃ البرہان اور شیعہ کتب و تفاسیر میں نہج البلاغۃ، شرح نہج البلاغۃ از علامہ ابن مسیم بحرانی، تفسیر صافی، تفسیر قمی، تفسیر عیاشی، مجمع البیان، اور حیات القلوب کی عبارتوں سے اس رسالہ کو مدلل کیا ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ اس آیت سے خلفاء ثلاثہؓ کے خلیفہ راشد اور امام برحق ہونے کا ثبوت ایسا قطعی ہے کہ اگر کوئی اس کو نہ مانے تو نعوذ باللہ یہ آیت غلط ہو جائے گی اور خدا کا وعدہ رائیگاں ہو جائے گا۔ اسی ایک آیت ہی سے خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت روز روشن کی طرح برحق ثابت ہو جاتی ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہی اس آیت کے مصداق تھے اور انہی کو یہ تینوں نعمتیں اسی دنیا میں حاصل ہوئی تھیں۔ ان تینوں نعمتوں کے مل جانے کے بعد ہی اس آیت سے ان کی حقیتِ خلافت ثابت ہوئی ہے، دوسری اہم بات یہ بھی ثابت ہوگئی ہے کہ مخالفین کے اعتراضات کے علی الرغم حضرات خلفاء ثلاثہؓ مومنین کاملین اور صالحین امت میں سے تھے۔ مولانا

---

[1] سورۂ نور: ۵۵

نے اپنے کئی مناظروں میں اس آیت کو پیش کیا تھا جس کا مخالف مناظر کوئی جواب نہ دے سکے تھے۔ ہم اس کو مناظروں کے باب میں تفصیل سے لکھ آئے ہیں۔ مولانا کے ان تفسیری رسائل میں یہ نہایت اہم تفسیر ہے جس پر مخالفین بہت حیراں و سرگرداں رہے مگر کوئی مضبوط جواب نہ دے سکے البتہ بعض سطحی لوگوں نے جواب دینے کی کوشش کی تھی جن میں ایک شیعہ مولوی ڈاکٹر نور حسین جھنگوی بھی تھے جنھوں نے اس کے خلاف ایک رسالہ لکھا تھا جس کا جواب الجواب اُسی زمانہ میں مولاناؒ نے لکھ کر شائع کر دیا تھا جس کے بعد فریق ثانی نے سکوت اختیار کر لیا۔

۵۔ تفسیر آیت مودۃ القربیٰ

قرآن حکیم کی آیتﷺ ذٰلِکَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰہُ...... اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ[۱] کی مکمل تفسیر لکھ کر مولاناؒ نے اس رسالہ میں مخالفین اہل سنت کے اس قول کی پرزور تردید کی ہے کہ آیت مذکورہ کے ایک جز میں محبت اہل بیت کو اجر رسالت کہا گیا ہے۔ مولاناؒ نے اس قول کو قرآن کی معنوی تحریف سے تعبیر کیا ہے اور اس کو بہترین انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایک گھناؤنا حملہ قرار دیا ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ یہی وہ (انعام) ہے جس کی خوشخبری سناتا ہے اللہ اپنے بندوں کو جنھوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کیے، (اے نبیؐ) کہہ دیجیے کہ میں تم سے اِس (تبلیغ رسالت) پر کچھ اجرت نہیں مانگتا سوا محبت کے جو قرابت میں ہے، اور جو شخص جو کچھ نیکی کماتا ہے ہم (اپنی طرف سے) اس نیکی میں خوبی کو بڑھا دیتے ہیں۔ آیت کے ایک جز قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبیٰ کی روشنی میں مخالفین صحابہؓ کے اس عقیدہ کا رد کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعلیم و تبلیغ کا معاوضہ مخلوق سے طلب کرتے تھے اور آپ کو اِس جز میں خدا نے ایسا کرنے کا حکم بھی دیا ہے نعوذ باللہ...... اسی وجہ سے ان کے یہاں یہ جملہ روزمرّہ میں داخل ہے کہ محبتِ اہل بیت اجر رسالت ہے۔ مولانا نے آیت کے اس حصہ کی صحیح تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جملہ کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ نے آپ کو معاوضہ طلب نہ کرنے کا اعلان کرنے کو کہا ہے، اس میں اسی اعلان کی تاکید کی جارہی ہے کہ اے نبیؐ فرما دیجیے کہ میں تم لوگوں سے کوئی اجرت نہیں چاہتا سوا اس کے کہ

---

[۱] سورۂ شوریٰ: ۲۳

قرابت کی وجہ سے تم میرے ساتھ محبت و مہربانی سے پیش آؤ یعنی مجھے ایذا نہ پہنچاؤ اور تبلیغ رسالت میں مزاحمت نہ کرو۔ اسی مضمون کو مولانا نے اس دور کے تاریخی، سماجی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اہل سنت و مخالفین اہلسنّت کی دو درجن معتبر و مستند کتب تفاسیر و احادیث سے اپنے دلائل کو پیش کیا ہے اور مخالفین کے تمام اعتراضات کی تردید کی ہے۔

۶۔ تفسیر آیت فئے ملقّب بہ وظیفۂ مدح صحابہؓ

اس رسالہ میں آیاتِ قرآنیہ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ...... رَبَّنَا اِنَّکَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ[1] کی مکمل تفسیر بیان کی گئی ہے لیکن جس آیت سے اس میں استدلال کیا گیا ہے وہ آخری یعنی دسویں آیت ہے۔ رسالہ میں آیات کے ترجمہ کے بعد سورہ حشر کی بعض عجیب وغریب خصوصیات اور اس کے موضوع بیان پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر مال فئے کی تقسیم اور اس کے مستحقین کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مال فئے کے سب سے پہلے حقدار مہاجرین صحابہؓ ہیں، پھر انصار اور پھر ان دونوں کے بعد وہ لوگ مستحق ہیں جو ان دونوں طبقوں کے اصحاب کے لیے دعاء مغفرت کرتے ہیں اور اپنے دلوں کو ان کے خلاف کینہ و کدورت سے پاک وصاف رکھنے کی دعا کرتے ہیں اور ان کی مدح وثنا کرتے ہیں۔ اس آخری آیت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ صحابۂ کرام بالخصوص مہاجرین وانصار کی مدح کرنا اور ان کے فضائل ومناقب کا چرچا کرنا بعد والے مومنین کے فرائض میں داخل ہے۔ اس سے ایک اہم مسئلہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مال فئے کا مستحق تین جماعتوں کو قرار دیا گیا ہے اول مہاجرین، دوم انصار اور سوم وہ مسلمان جو مہاجرین وانصار کے مدّاح و دعا گو ہوں، اس لیے جو لوگ ان کے مدّاح نہ ہوں بلکہ بدگوئی کرتے ہوں وہ مال فئے کے مستحق نہیں ہو سکتے جبکہ اس کا مستحق ہر مسلمان ہے لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید میں مسلمانوں کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں اور ان تینوں قسموں میں مہاجرین وانصار کی بدگوئی کرنے والے خارج کردیئے گئے ہیں۔ رسالہ میں شیعہ سنّی دونوں کے اُردو فارسی تراجم اور تفاسیر سے دلائل دیئے گئے ہیں اور آخر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ازالۃ الخفاء سے بھی مدد لی گئی ہے اور قضیۂ فدک کے بارے میں بھی قرآنی

1۔ سورۂ حشر: ۸ تا ۱۰

فیصلہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۷۔ تفسیر آیات حفاظت قرآن

اس رسالہ میں قرآن مجید کی تین آیات (ا) اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّالَہٗ لَحَافِظُوۡنَ[1] اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِالذِّکۡرِ لَمَّا جَآءَ ھُمۡ...... مِنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ[2] اور لَاتُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ...... ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ[3] کی تفسیر بیان کر کے مولاناؒ نے ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی تحریف وتبدل سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے اور اس میں کسی قسم کی تحریف کا ہونا ناممکن ہے۔ اس سلسلہ میں علماء مفسرین کے اقوال سے مخالفین کے اعتراضات واشکالات کا بھرپور رد کیا گیا ہے اور احادیث وتفاسیر کے حوالوں سے اور تاریخی وعقلی طور پر قرآن مجید کو ہر قسم کی تحریف سے پاک وصاف اور کامل واکمل ثابت کیا گیا ہے۔

۸۔ تفسیر آیتِ تطہیر

اس رسالہ کا بنیادی موضوع تو صرف آیت کا ایک جزء ہے۔ یعنی اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡھِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَھۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَھِّرَکُمۡ تَطۡھِیۡرًا، مگر سلسلۂ کلام کو باقی رکھنے اور پوری بات کو سمجھنے کے لیے جب تک آگے پیچھے کی سب آیتیں نہ دیکھی جائیں پورا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا لہٰذا اس سلسلہ کی وہ تمام آیتیں یہاں نقل کی گئی ہیں جو یہ ہیں یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلۡ لِّاَزۡوَاجِکَ اِنۡ کُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا...... اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیۡفًا خَبِیۡرًا[4] ان آیات سے مخالفین صحابہؓ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آیتِ تطہیر میں اہل بیت سے مراد ازواجِ مطہرات نہیں بلکہ حضرت علیؓ مرتضیٰ، حضرت فاطمہ زہراؓ اور حضرات حسنینؓ مراد ہیں، دوسرے یہ کہ اُن کے نزدیک اِن آیات سے عصمتِ ائمہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسری خرافات وہ اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتے ہیں لیکن مولانا لکھنویؒ نے کتب معتبرہ کو سامنے رکھ کر اِن آیات کی مکمل ومفصل تفسیر بیان کر کے جو نتیجہ نکالا ہے اسے ہم یہاں پیش کر رہے ہیں:

ا۔ آیت تطہیر میں لفظ اہل بیت سے مراد جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج

---

[1] سورۂ حجر:۹ [2] حم سجدہ:۴۱-۴۲ [3] سورۂ قیامۃ:۱۶ تا ۱۹ [4] سورۂ احزاب:۲۸ تا ۳۴

مطہرات ہی ہیں اوران کے علاوہ کوئی دوسرا مراد ہو ہی نہیں سکتا۔

۲۔ محاورۂ قرآنی میں بھی اہل بیت کو زوجہ کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں کہا گیا ہے اور جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں گھر والے (زوجہ) ہی مراد لی گئی ہے۔

۳۔ لغت عرب میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۴۔ مذکورہ ضمیروں کے استعمال سے بھی مذکورہ معنی ہی نکلتے ہیں۔

۵۔ قرآن مجید میں لفظ اہل بیت کے لیے ہر جگہ مذکر کے صیغے اور ضمیریں ہی آئی ہیں مگران میں سے اکثر مقامات میں باتفاق فریقین سوا عورتوں کے کوئی اور مراد نہیں ہے۔

۶۔ روایات میں یہ لفظ اگر حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ و حضرات حسنینؓ کے لیے وارد ہوا ہے تو یہ حضرت عباسؓ اوران کی اولاد اور حضرت سلمانؓ کے لیے بھی وارد ہوا ہے، وہ بھی اہلِ عبا میں سے ہیں اور پھر وہ بھی اہل بیت میں شامل ہوں گے لہٰذا ثابت ہوا کہ ازواج مطہرات کے سوا جن کو بھی اہل بیت فرمایا گیا ہے وہ بر بنائے پیار و محبت مجازاً فرمایا گیا ہے۔

۷۔ محققین اہلسنّت کا یہی مذہب ہے کہ اہلِ بیتِ رسول حقیقۃً ازواج مطہرات ہی ہیں اور حضرت علیؓ و حضرت فاطمہؓ اوران کی اولادیں اور حضرت عباسؓ اوران کی اولادیں رضی اللہ عنہم بدعائے رسولؐ اس فضیلت میں شامل کیے گئے ہیں۔

۸۔ ازواج مطہرات کے لیے قرآن کریم گواہی دے رہا ہے کہ وہ دنیاوی زندگی اوراس کی زیب و زینت کی طالب نہ تھیں بلکہ اللہ و رسولؐ اور دارِ آخرت کی طالب تھیں، وہ تمام ایمان والوں کی ماں ہیں، خدا نے ابدی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اختیار لے لیا ہے کہ وہ اپنی ازواج کو طلاق دیں، یہ ایک بے نظیر بات ہے۔

۹۔ ازواج مطہرات کے مرتبہ تک کوئی عورت نہیں پہنچ سکتی۔

مذکورہ بالا تمام تحقیقات قرآن کریم ہی کی بنیاد پر ہیں لہٰذا ان کا معارضہ نہ کوئی روایت کرسکتی ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کا قول کرسکتا ہے۔ اس رسالہ میں مولانا نے شیعوں کے سلطان العلماء مولوی سیّد محمد مجتہد کی عبارتوں پر سخت تنقید کی ہے اوراس میں درجنوں علمی غلطیاں ثابت کی ہیں، اس طرح پورا رسالہ بیش قیمت حقائق و معارف کا خزانہ ہے۔

۹۔ تفسیر آیت میراث

اس تفسیری رسالہ میں آیت وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ...... عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ[۱] کے ترجمہ وتفسیر سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت قرآن مجید اور کتب الٰہیہ کی موعودہ خلافت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص فاضلہ کا کامل ترین مظہر ہے۔ اس آیت کا سچا اور صحیح مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں سے کچھ لوگوں کے لیے وارثِ زمین یعنی بادشاہ ہونے کی پیشین گوئی فرمائی ہے اور ان کو اپنا نیک بندہ فرما کر ان کے جامع اوصافِ حمیدہ کا ذکر فرمایا ہے، ایسی ہی بادشاہت کو ''خلافتِ راشدہ'' کہتے ہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ پیشین گوئی صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں ہی پوری ہو جائے کیونکہ قرآن کے مخاطب اوّل وہی تھے، اس طرح اس آیت میں بادشاہتِ ارضی ملنے کی خوشخبری انہی کو دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں مخالفین کی تحریف معنوی اور دوسری رکیک تاویلات کا اس رسالہ میں دلائل قویہ سے رد کیا گیا ہے مزید برآں اس تفسیر میں قرآن مجید کے بہت سے دوسرے اہم معارف بھی آگئے ہیں جو اہل ایمان کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں۔

۱۰۔ تفسیر آیت قتال مرتدین

اس رسالہ میں آیت کریمہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ...... فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ[۲] کا ترجمہ وتفسیر بیان کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفۂ برحق تھے اور ان کے رفقاء اعلیٰ ترین صفات وکمالات کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جس جماعت کو مرتدوں پر مسلّط کرنے کا وعدہ کیا ہے اس کی چھ صفات حمیدہ بیان فرمائی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ وہ جماعت خدا کی محبوب ہے۔

۲۔ وہ خدا کی محب ہے۔

۳۔ وہ مسلمانوں پر مہربان اور متواضع ہے۔

---

۱ سورۂ انبیاء: ۱۰۵ ۲ سورۂ مائدہ: ۵۴-۵۶

۴۔ وہ کافروں پر سخت ہے۔

۵۔ وہ راہِ خدا میں جہاد کرتی ہے اور

۶۔ وہ کسی (ناحق) ملامت کرنے والا کی ملامت سے نہیں ڈرتی۔

جس جماعت میں یہ صفات ہوں ان سے بہتر دنیا میں کوئی جماعت نہیں ہوسکتی، آنحضورؐ کی وفات کے بعد جب فتنۂ ارتداد ظہور پذیر ہوا اور حضرت صدیق اکبرؓ کے ذریعہ اس کا استیصال ہوگیا تب معلوم ہوا کہ اس آیت میں حضرت صدیق اکبرؓ اور ان کے رفقاء کی تعریف وتوصیف بیان ہوئی ہے اور ان کے طفیل میں ان کے رفقاء بھی خدا کے محبوب ومحبّ قرار پائے ہیں اور جب وہ خدا کے محبّ ومحبوب ٹھہرے تو ان کی خلافت کے برحق ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہوسکتا ہے، اس میں وہی شخص شبہ کرسکتا ہے جس کا ایمان قرآن مجید پر نہیں ہے۔

۱۱۔ تفسیر آیت ولایت

آیت ولایت اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ...... ھُمُ الْغَالِبُوْنَ[1] کا کوئی تعلق تو خلافت کے مسئلہ سے نہیں ہے مگر مخالفین صحابہؓ اس سے حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت بلافصل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کا ترجمہ یوں بیان کرتے ہیں کہ اے مسلمانو! تمھارا حاکم اللہ تعالیٰ اور اس کا رسولؐ ہے اور وہ ایمان والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ یعنی صدقہ دیتے ہیں۔ اس ترجمہ کے ساتھ وہ ایک روایت بھی اس میں ملاتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ایک روز نماز کی حالت میں رکوع کے اندر ایک سائل کو اپنی انگوٹھی اتار کر دے دی تھی جس پر یہ آیت نازل ہوئی، لہٰذا اب اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانوں تمھارا حاکم اللہ اور اس کا رسولؐ اور وہ ایمان والے (حضرت علیؓ) نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ نماز میں سائل کو انگوٹھی دے دیتے ہیں۔

مولانا لکھنویؒ نے اپنے اس رسالہ میں مخالفین کے اس دعوے کی تردید میں دس دلائل دیئے ہیں جس نے ان کے ہر تار ثبوت کو بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ آیت ولایت اکثر موقعوں پر علیحدہ سے بھی شائع ہوئی ہے کیونکہ اس کا موضوع کچھ مختلف ہے لیکن بعض ایڈیشنوں میں اس کو تفسیر آیت قتال مرتدین کے ساتھ بھی شائع کردیا گیا ہے مگر ہم نے اس کو ایک علیحدہ تفسیر قرار دے کر

---

[1] سورۂ مائدہ: ۵۵-۵۶

الگ سے ذکر کیا ہے۔

۱۲۔ تفسیر آیت تمکین

اس رسالہ میں ان چار آیات اِنَّ اللّٰہَ یُدَافِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا...... وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ[1] کا ترجمہ اور تفسیر بیان کر کے خالص قطعیات و یقینیات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ جناب سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجر اصحاب کرامؓ کے حق میں قرآن کریم شہادت دیتا ہے کہ بارگاہ الٰہی میں ان کی بڑی قدر و منزلت اور عزت و توقیر ہے۔ ان میں سے ہر شخص امامت و خلافت کی اہلیت رکھتا ہے و نیز ان میں جو لوگ بھی کبھی مسند آرائے خلافت ہوں گے تو ان کی خلافت قرآن کریم کی موعودہ خلافت ہوگی اور ان کے عہد خلافت کے تمام کام خدا کے پسندیدہ اور مقبول ہوں گے۔ ان باتوں کی تائید میں احادیث صحیحہ اور خصوصاً روایاتِ شیعہ بھی نقل کی گئی ہیں۔ ان آیات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہی آیات میں سب سے پہلے کفار سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے ورنہ اس سے پہلے کفار کے مظالم کو برداشت کرنے اور ان پر ہاتھ نہ اٹھانے کی تلقین کی جاتی تھی۔ آیت تمکین کو اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مہاجر اصحاب رسولؐ سے ہی در حقیقت تمکین کا وعدہ اور اس کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور انہی کو کفار کے شر سے محفوظ رکھنے کی خوشخبری سنائی گئی ہے اور انھیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمانۂ تمکین میں ان کے تمام کام مقبول بارگاہِ الٰہی ہوں گے۔ خلفاء راشدین میں چاروں خلفاء مہاجرین میں سے تھے اور ان میں پہلے تین خلفاء کو تمکین بھی حاصل ہو چکی ہے لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ ان کی خلافت موعود من اللہ ہے اور ان کا ہر عمل مقبول اور پسندیدۂ خدا ہے۔

۱۳۔ تفسیر آیت دعوت اعراب

رسالہ تفسیر دعوتِ اعراب میں آیت کریمہ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ...... عَذَابًا اَلِیْمًا[2] کا مکمل ترجمہ اور تفسیر بیان کر کے اصحاب حدیبیہ کے وہ فضائل اور مراتب تفصیل کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں جن سے ان کی عظمت، بزرگی اور عند اللہ ان کی مقبولیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی

---

۱ سورۂ حج: ۳۸ تا ۴۱ ۲ سورۂ فتح: ۱۶

آیت میں اُن بدوؤں کی حالت زار پر رحم فرما کر اللہ تعالیٰ نے انھیں تلافی مافات کا ایک موقع اور دیا تھا جو سفر حدیبیہ میں شریک نہ ہونے پر نادم و متاسف تھے۔ پوری سورۂ فتح میں ان شرکاء سفر حدیبیہ کی جاں نثاری کی ستائش، دلجوئی اور ان کی مقبولیت کا اظہار کیا گیا ہے، ان کو فتح و نصرت کے وعدے دیئے گئے ہیں، ان کے اخلاص کی شہادت دی گئی، بیعتِ رضوان کے فضائل بیان کیے گئے اور اس میں شریک ہونے والوں کو اپنی رضا مندی کی خوشخبری سنائی گئی، ان کو عظیم الشان غنیمتوں کا مژدہ سنایا گیا، ان کو نزول سکینہ کی نعمت سے سرفراز فرمایا گیا اور ان کے اوصاف پسندیدہ وان کی عبادات وطاعات کو سراہا گیا ہے۔ اس سفر حدیبیہ میں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کا ہمرکاب رسالت ہونا اظہر من الشمس ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے خلفاء ثلاثہؓ کی حقیت خلافت ثابت کی ہے۔ تاریخی واقعات کے پسِ منظر میں یہ تمام خوشخبریاں اور پیشین گوئیاں خلفاء ثلاثہؓ اور خصوصاً حضرات شیخینؓ پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں اور جب ان کا داعی جہاد ہونا اور ان کی دعوت کی اطاعت کا فرض ہونا ثابت ہو گیا تو ان کے خلیفۂ برحق ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اسی بات کو پورے ثبوت کے ساتھ اس رسالہ میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۴۔ تفسیر آیت مباہلہ

اس رسالہ میں آیۂ کریمہ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَكَ..... لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ[1] کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس تفسیر کے لکھنے کے محرکات میں ایک محرک یہ پیدا ہوا کہ ایک بار بمبئی کے مخالفین صحابہؓ نے ناواقفوں کو بہکانے کے لیے ایک شوشہ یہ چھوڑا کہ شیعہ سنّی اتحاد کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ ان دونوں کے یہاں جو تقریبات مشترک ہیں انھیں دونوں فریق اکٹھا مل کر منائیں، چنانچہ ان مشترک تقریبات میں ایک عید مباہلہ کو بھی بیان کیا گیا اور کہا گیا کہ اس کا ذکر سنّیوں کے یہاں بھی ہے لہٰذا اگر دونوں فرقے اسے مل کر منائیں تو بہت اچھا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ مسلمان جو ہر وقت دعوت صلح پر لبیک کہنے کو تیار رہتے ہیں اگر اس دعوت کو قبول کر لیں تو ہر سال سنّی شیعہ کا ایک متحدہ جلسہ ہوا کرے اور اس میں واقعۂ مباہلہ کے پردے میں مخالفین صحابہؓ کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا موقعہ ملتا رہے اور حضرت علیؓ کے افضل الصحابہؓ اور خلیفۂ

---

[1] سورۂ آل عمران: ۶۱

بلافصل ہونے کی بات بھی مسلمانوں کے کان تک پہنچائی جا سکے، اس طرح یہ عیدان کی خلافت بلافصل کی یادگار میں مسلمانوں کے یہاں بھی رائج ہوجائے گی۔ اگر یہ افسوں چل جاتا تو مجالس محرم سے زیادہ یہ عید مباہلہ مخالفین کے مذہب کی اشاعت کا ذریعہ بن جاتی مگر خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے بروقت اس کا جواب دے دیا گیا کہ ہمارے مذہب میں عید مباہلہ بالکل بے اصل چیز ہے، ہمارے یہاں سوا ان دوعیدوں کے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائم فرما گئے ہیں کوئی تیسری عید نہیں ہوتی اور ہم کو اپنی طرف سے کسی عید کے اضافہ کرنے کا حق بھی نہیں ہے، اسلامی تاریخ میں بڑے بڑے عظیم الشان واقعات رونما ہوئے اور فتوحات ہوئیں مگر کسی کی بھی کوئی یادگار عید رائج نہیں کی گئی۔ یہ واقعہ مباہلہ کوئی ایسا بڑا واقعہ بھی نہ تھا اور مباہلہ کی نوبت بھی نہیں آئی تھی صرف ارادہ ہی ارادہ تھا۔

اس آیت میں جس واقعہ (مباہلہ) کا بیان ہے اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ کے قریب نجران نامی عیسائیوں کی ایک بستی تھی، جب وہاں کے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت اور آپ کی فتوحات کی خبر پہنچی تو ۸ھ یا ۹ھ میں ان عیسائیوں کی ایک جماعت مدینہ منورہ حاضر ہوئی تاکہ آپؐ سے مل کر صلح کی صورت نکالے اور ساتھ ہی ساتھ آپؐ کی نبوت کو پرکھا اور جانچا بھی جائے۔ ان لوگوں نے آ کر آپؐ سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کچھ سوالات کیے جن کا جواب آپؐ نے بذریعہ وحی الٰہی حاصل کر کے دے دیا، اس پر یہ عیسائی لاجواب تو ہوگئے مگر اپنی کج بحثیوں سے باز نہیں آئے اور آپ کا قیمتی وقت فضول باتوں مین ضائع کرنے لگے، اس پر یہ آیت مباہلہ نازل ہوئی اور ارشاد ہوا کہ اے نبیؐ ان سے فرما دیجیے کہ (اگر تم کو شبہ ہے تو) تم لوگ مجھ سے اس معاملہ میں مباہلہ کر لو اور اس کی صورت یہ ارشاد فرمائی گئی کہ آپ اور آپ کی ساری جماعت مع اپنی عورتوں اور بچوں کے ایک مقام پر جمع ہوں اور یہ عیسائی بھی مع اپنی عورتوں اور بچوں کے وہاں آجائیں اور پھر سب لوگ خدا کے سامنے تضرع وزاری کے ساتھ دعا مانگیں کہ یا اللہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہو اس پر اپنی لعنت نازل فرما۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اطلاع ان عیسائیون کو پہنچا دی، انھوں نے جواب دیا کہ ہم آپس مین مشورہ کر کے اس کا جواب دیں گے، چنانچہ مشورے کے بعد ان کے بڑے بوڑھون نے کہا کہ تم لوگ ایسی غلطی کبھی نہ کرنا، جب تم کو معلوم ہوگیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے نبی

ہیں تو ان سے مباہلہ کرنا بالکل مناسب نہیں ہے، کیونکہ جس قوم نے نبیوں سے کبھی مباہلہ کیا ہے وہ قوم ہلاک ہوگئی ہے اور ان کا بچّہ بوڑھا کوئی بچا نہیں ہے۔ یہ مشورہ سن کر سب کی ہمّت جواب دے گئی اور انھوں نے مباہلہ سے قطعی انکار کردیا اور جزیہ دینا قبول کرلیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مباہلہ کے لیے بالکل تیار ہوگئے تھے یہاں تک کہ آپ نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اور جناب سیّدہ فاطمہ زہرا کو مباہلہ میں شریک ہونے کے لیے بلا بھی لیا تھا اور بعض دوسرے صحابہؓ بھی اپنی آل و اولاد کو لے کر آ گئے تھے۔

یہ ہے قصّہ اس مباہلہ کا جس کا آیت میں تذکرہ ہے۔ مخالفینِ اہلسنّت اس آیت سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل ثابت کرتے ہیں اور حضرت فاطمہؓ و حضرات حسنینؓ کو ساتھ رکھنے سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضور سرورِ کائناتؐ کو صرف انہی حضرات سے تعلّق تھا۔ اس آیت سے انھوں نے یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت علیؓ نفسِ رسول تھے اس لیے نفسِ رسول کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو خلیفہ بنانا جائز نہیں ہوسکتا۔ اس رسالہ میں مولانا نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ اس آیت سے حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافت بلافصل کیا معنی مطلق خلافت بھی ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کا تمام صحابہؓ سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مخالفین نے اس سلسلہ میں جو بھی اعتراضات کیے ہیں ان کا رد بھی اس رسالہ میں بخوبی ہوگیا ہے۔

۱۵۔ تفسیرِ آیتِ اولی الامر

اس رسالہ میں آیت یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ...... اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا[1] کا ترجمہ اور اس کی مکمل تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور اولی الامر (یعنی صاحبانِ حکومت) کی جو تم میں سے ہوں، پھر اگر تم لوگ (یعنی رعیت اور صاحبان حکومت) آپس میں اختلاف کرو کسی بات میں تو اس کو رجوع کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی طرف، اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روزِ آخرت پر تو یہ بہتر ہے — اور بہت خوب ہے باعتبار انجام کے۔ اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اللہ، رسول اور اُن اولوالامر کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہوں یعنی مسلمان ہوں اور یہ

---

[1] سورۂ نساء: ۵۹

بھی فرمایا کہ اولوالامر اور رعیت کے درمیان اگر کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اس اختلاف کا تصفیہ اللہ اور رسول یعنی قرآن و سنّت سے کرانا چاہیے اور اس تصفیہ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ فرمایا کہ اگر تمھارا ایمان خدا پر اور قیامت پر ہے تو تم ضرور ایسا ہی کرو گے اور یہ بھی فرمایا کہ ایسا کرنے میں تمھارے لیے ہر طرح کی بھلائی ہے اور اس کا نتیجہ بہت اچھا نکلے گا۔ اس آیت سے دو باتیں خاص طور سے معلوم ہوئیں ہیں ایک تو یہ کہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہر حال میں واجب ہے اور ان سے کسی بات میں نزاع کرنا حرام ہے، دوسرے یہ کہ اولوالامر (غیر معصوم) کی اطاعت ہر حال میں واجب نہیں، اگر ان کا کوئی حکم خلاف قرآن و سنت ہو تو اس کی اطاعت نہ کی جائے گی اس لیے اولوالامر سے نزاع اور اس نزاع سے فیصلہ کا طریقہ بھی بیان فرما دیا۔

اس آیت سے کسی طرح بھی مخالفین اہل سنت اپنا مدعا ثابت نہیں کر سکتے یعنی اس سے حضرت علی مرتضیٰؓ کی خلافتِ بلافصل اور عصمت ائمہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہ آیت ان کے خلاف ہی جارہی ہے اور اس سے تو عقیدۂ امامت اور عصمت کا تو کھیل ہی بگڑ جاتا ہے۔ اسی بات کو مدلل طور پر اس رسالہ میں بیان کیا گیا ہے اور آخر میں کتاب 'نصیحۃ الشیعہ' مولفہ مولانا احتشام الدین صاحب مراد آبادی مرحوم کی عبارت سے اپنی بات کو مزید پایۂ ثبوت کو پہنچایا گیا ہے۔ اس رسالہ کا پہلا ایڈیشن ۱۳۴۵ھ میں النجم کے صفحات پر شائع ہوا تھا، دوسرا ایڈیشن عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا اور پھر اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوتے رہے ہیں۔

۱۶۔ تفسیر آیات ملک طالوت

اس رسالہ میں قرآن مجید کی آیات اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاءِ مِنْ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ...... وَاِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ[1] کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس وقت کے پیغمبر حضرت شمویل اور ان کے دور کے بادشاہ طالوت (شاؤل) کا مشہور و نتیجہ خیز واقعہ بیان فرمایا ہے جس میں امت محمدیہ کے لیے چند تعلیمات نکلتی ہیں جو اس طرح ہیں:

آ۔ ان آیات میں سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ صحابۂ کرام کو جہاد کی ترغیب دی جارہی ہے اور بتایا جارہا ہے کہ یہ کام بغیر کسی بادشاہ یا امیر کے انجام نہیں دیا جا سکتا۔

---

[1] سورۂ بقرہ: ۲۴۶ تا ۲۵۲

۲۔ جس طرح بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے بعد کسی ایک بادشاہ کی ضرورت محسوس کی تھی اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی جماعت اور صحابہ کرام کو بھی یہ ضرورت پیش آئے گی۔

۳۔ لفظ اُخرِجنَا سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جہاد کی ذمّہ داریاں مہاجرین صحابہ پر عائد ہوں گی اور انصار ان کے تابع ہوں گے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد خلافتِ اسلامیہ مہاجرین کے ہاتھ میں آئے گی۔

۴۔ مُبتَلِیکُم بِنَهَرٍ سے تعلیم دی جارہی ہے کہ دیکھو دنیا کو فراخ کر کے تمھارا ابھی امتحان لیا جائے گا۔ لہٰذا دنیا کو بقدر قوت لایموت ہی استعمال کرنا چاہیے چنانچہ خلفاء راشدین کے دور میں بیشمار عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئیں اور دنیا کی نعمتیں ان پر فراخ ہوئیں لیکن ان کی حالت وہی رہی جو پہلے تھی خصوصاً شیخین کی حالت تو ضرب المثل تھی جس کا دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں اس طرح وہ امتحان میں پورے اُترے۔

۵۔ تَحمِلُهُ المَلآئِکَۃُ کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ خدا کی طرف سے جو مسلمانوں کا خلیفہ مقرر ہوگا اس کے ہاتھوں منجانب اللہ کچھ ایسے کام انجام پائیں گے کہ جو انسانی دست رس سے باہر ہوں گے لہٰذا شیخین کے ہاتھوں اللہ کی مدد شامل حال ہونے سے ایسے بیسیوں کام انجام پذیر ہوئے جو بظاہر انسانی بساط سے باہر تھے چنانچہ فتوحات شام وعراق اس بات کی شاہد ہیں اور روم وایران کی سلطنتوں کا زیروزبر ہوجانا بھی بغیر تائیدالٰہی کے ممکن نہ تھا۔

۶۔ فِئَۃً قَلِیلَۃً کے ذریعہ صحابہ کرام کو فارس اور روم کے جنود مجندہ پر فتح پانے کی خوشخبری سنائی گئی ہے اور یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اپنی قلت اور دشمن کی کثرت سے کبھی ہراساں نہیں ہونا چاہیے۔

۷۔ دشمن کے مقابلہ میں صبر کی تعلیم دی جارہی ہے اور ایسی صورت میں تدبیر ظاہری سے زیادہ رجوع الی اللہ میں ثابت قدم رہنے کو ہی مدار کامیابی بتایا گیا ہے۔

۸۔ وَلَولَا دَفعُ اللّٰہِ النَّاسَ کا تعلق اگرچہ بنی اسرائیل کے قصہ سے نہیں ہے مگر اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو معلوم ہوجائے کہ مومنین صالحین کو کفار کے لیے آلۂ مدافعت

بنانا حق تعالیٰ کی سنت دائمی ہے۔

ان سب آیات سے خلافت وامامت کے بارے میں حسب ذیل اہم مسائل کا فیصلہ ہو گیا ہے:

۱۔ مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ میں اسلامی بادشاہ یعنی خلیفہ یا امیر کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

۲۔ خلافت، امامت اور ملک یعنی بادشاہت ایک ہی چیز ہے لہٰذا جس کے پاس یہ رتبہ نہ ہو اُسے نہ تو خلیفہ کہا جائے گا اور نہ امام وامیر۔

۳۔ خلافت وامامت کا مقصد اعظم مسلمانوں کی سیاسیات اور جہاد وقتال فی سبیل اللہ کا شرعی انتظام کرنا ہے لہٰذا جن میں یہ اوصاف نہ ہوں وہ خلیفہ، امام اور امیر نہیں بن سکتا۔

۴۔ خلافت وامامت فروعات دین میں سے ہیں اور اس کا تعین بندوں کا کام ہے، اسی لیے اہل سنت کے یہاں اصولِ دین صرف تین ہیں توحید، رسالت اور قیامت، باقی سب فروعات ہیں۔

۵۔ خلافت کسی خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، نہ اس میں وراثت کو دخل ہے اور نہ ہی دولت مندی کو اس کا معیار بنایا گیا ہے۔

اس طرح ان آیات سے مسئلہ خلافت وامامت اچھی طرح واضح ہو گیا ہے اور اس سے جو نتائج اخذ ہوئے ہیں وہ سب کے سب اہل سنت کے مسلک کے عین مطابق ہیں اور مخالفین صحابہؓ کے خلاف ہیں۔ یہی ان آیات کی تفسیر کا مقصود ہے۔

۱۷۔ تفسیر آیات اظہار دین

اس رسالہ میں ان دو آیات یعنی يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ...... وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ[۱] کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ آیاتِ مذکورہ میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ قرآن مجید میں تین دوسرے مقامات پر بھی کچھ مختلف الفاظ کے ساتھ آیا ہے اور اس سے خلفاء ثلاثہؓ کی حقیتِ خلافت نہایت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ اس آیت میں دو باتوں کا اظہار ہے، اوّل یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سارے جہان کے لیے ہے اور آپؐ کے مبعوث ہوتے ہی

۱۔ سورۂ توبہ: ۳۲-۳۳

تمام مذاہب منسوخ ہوگئے اور دوم یہ کہ آپ کی بعثت کا مقصد دینِ اسلام کو تمام دینوں پر غالب کردینا ہے اور یہ غلبہ دو طرح سے حاصل ہوسکتا ہے، ایک تو یہ کہ اس دین برحق کی حقانیت کو دوسرے ادیان پر دلائل کے ذریعہ غالب کیا جائے اور دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو تیغ و سنان کے ذریعہ غلبہ دیا جائے۔ درحقیقت یہ دونوں ہی طرح کے غلبے مقصود بعثت ہیں۔ آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ صحابۂ کرامؓ کو یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ آئندہ دونوں طرح کے غلبہ مسلمانوں کو حاصل ہوں گے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ دونوں مقصود صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں بالخصوص خلفاء ثلاثہؓ کے دور میں حاصل ہوچکے ہیں۔ اسی بات کو مولاناؒ نے اس رسالہ میں بدلائل ثابت کیا ہے اور مخالفینِ اہل سنت کے اعتراضات کا بطلان کیا ہے۔

۱۸۔ تفسیر آیاتِ مدحِ مہاجرین

اس رسالہ میں قرآن مجید کی دس آیات کی تفسیر لکھی گئی ہے جن سے مہاجرین صحابہؓ کے فضائل و مناقب اور ان کے افضلِ امت و محبوب ربّ العزت ہونے کے دلائل دیے گئے ہیں۔

یہ آیات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ كُنتُم خَيرَ اُمَّةٍ اُخرِجَتْ ....وَاَكثَرُ هُمُ الفَاسِقُونَ (آل عمران:۱۱۰)

۲۔ اِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ ....وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (سورۂ توبہ:۴۰)

۳۔ اِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَالَّذِينَ ....وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (سورۂ بقرہ:۲۱۸)

۴۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَاُخرِجُوا ....وَاللّٰهُ عِندَهُ حُسنُ الثَّوَابِ (آل عمران:۱۹۵)

۵۔ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَهَاجَرُوا ....رِزقٌ كَرِيمٌ (سورۂ انفال:۷۴)

۶۔ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَهَاجَرُوا ....عِندَهُ اَجرٌ عَظِيمٌ (سورۂ برأت:۲۲)

۷۔ وَالسَّابِقُونَ الاَوَّلُونَ ....ذٰلِكَ الفَوزُ العَظِيمُ (سورۂ برأت:۱۰۰)

۸۔ لَقَد مَنَّ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ ....رَؤُفٌ رَّحِيمٌ (سورۂ برأت:۱۱۷)

۹۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ.....لَو كَانُوا يَعلَمُونَ (سورۂ نحل:۴۱)

۱۰۔ لِلفُقَرَاءِ المُهَاجِرِينَ الَّذِينَ ......رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُفٌ رَّحِيمٌ (سورۂ حشر:۸،۹،۱۰)

مذکورہ بالا آیات کی تفسیر اور پھر ان کے بارے میں علماء و مفسرین کے اقوال تحریر کرکے

مولاناؒ نے ان سے مہاجرین کے حسبِ ذیل فضائل اخذ کیے ہیں:

(۱) یہ حضرات رحمتِ الٰہی کے مستحق ہیں۔ (۲) اللہ کی راہ میں ستائے ہوئے ہیں۔ (۳) مغفور الذنوب ہیں۔ (۴) قطعی جنّتی ہیں۔ (۵) جنت کے مخصوص درجات کے حق دار ہیں۔ (۶) سچے مومن ہیں۔ (۷) عنداللہ بڑے رتبہ والے ہیں۔ (۸) کامیابی والے ہیں۔ (۹) نزولِ رحمت میں سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں۔ (۱۰) امت کے مقتدیٰ وواجب الطاعۃ ہیں۔ (۱۱) دونوں جہاں کی نعمتوں کے موعودلہم ہیں۔ (۱۲) خدا ان سے راضی اور وہ خدا سے راضی ہیں۔ (۱۳) خدا کی بخشش اور رضامندی ہی ان کا مطلوب ہے۔ (۱۴) خدا اور رسولؐ کے مددگار ہیں۔ (۱۵) صادق ہیں۔ (۱۶) انصار کے محبوب ومخدوم ہیں اور (۱۷) قیامت تک کے مسلمانوں پر ان کے لیے دعاء خیر کرنا اور ان کی عداوت سے خدا کی پناہ مانگنا واجب ہے۔ ان فضائل ومناقب کے بعد کیا کسی مسلمان کو اس میں تردد ہوسکتا ہے کہ یہ جماعت جس کو بھی اپنا امام بنائے کیا وہ خدا کا پسندیدہ امام اور خلیفۂ برحق نہ ہوگا؟ اس طرح قرآن مجید میں مہاجرین کے مناقب میں اس قدر اہتمام کیوں کیا گیا اس کے اسباب اور اس کے نتائج پر اس رسالہ میں بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۹۔ تفسیر آیت تبلیغ

اس رسالہ میں آیت يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ ...... اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ[۱] کی تفسیر بیان کی گئی ہے جس میں حق تعالیٰ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہا ہے کہ اے نبی ہماری طرف سے جو جو احکامات نازل ہوئے ہیں ان سب کو بندوں تک پہنچا دیجیے ورنہ آپ کے ذمّہ فریضۂ رسالت باقی رہ جائے گا، اللہ لوگوں (کافروں) سے آپ کی حفاظت کرے گا، بیشک اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اس آیت میں نہ تو خلافت کا تذکرہ ہے اور نہ ہی حضرت علی مرتضیٰؓ کی کسی قسم کی فضیلت کا ذکر ہے اور نہ ہی اس آیت کا کسی خاص واقعہ سے کوئی تعلق ہے مگر مخالفین اہل سنت کہتے ہیں کہ اس میں جس چیز کی تبلیغ کی تاکید کی جارہی ہے وہ حضرت علیؓ کی خلافت ہی ہے، اس کے سوا کوئی عام تبلیغ مراد نہیں ہے۔ اس رسالہ میں اسی بات

---

[۱] سورۂ مائدہ: ۶۷

کی تردید کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ 'من کنت مولاہ فعلی مولاہ' پر جرح کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور اس سلسلہ میں مولوی سیّد حامد حسین مجتہد شیعہ کے اقوال کا بھی بطلان کیا گیا ہے۔

۲۰۔ تفسیر آیاتِ امامت

اس رسالہ میں قرآن مجید کی ان بارہ آیات کی تفسیر بیان کی گئی ہے جن میں لفظ 'امام' آیا ہے اور ان سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں لفظ 'امام' کے وہ معنی مراد نہیں لیے گئے ہیں جو مخالفین اہل سنت مراد لیتے ہیں۔ قرآن مجید میں 'امام' کے معنی پیشوا کے ہیں جو اچھے اور برُے دونوں معنوں میں آیا ہے لہٰذا اس مفروضہ مسئلہ امامت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی ان آیات سے یہ نام نہاد مسئلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہر جگہ رسول ہی کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اسی پر نجات کا دارومدار ہے، خواہ مخواہ مسئلہ امامت کو توڑ موڑ کر ثابت کرنے سے سوا اس کے اور کوئی بات نہیں ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت کمزور پڑے اور انبیاء علیہم السّلام کی شان میں دھبہ لگے۔

۲۱۔ تفسیر آیات مذمّتِ منافقین

اس رسالہ میں قرآن مجید کی سات متفرق آیات کی تفسیر بیان کی گئی ہے جن میں منافقوں کا ذکر آیا ہے یا جن میں مخلصین اور منافقین کے درمیان امتیازات قائم کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کی ان ساتوں آیتوں میں منافقین کی جو خصوصیات بیان فرمائی گئی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) منافقین خلافِ شریعت باتوں کی تلقین اور موافق شریعت باتوں سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ (۲) وہ بخیل ہوتے تھے۔ (۳) وہ مدینہ اور اس کے آس پاس رہنے والے یہودی تھے۔ (۴) مہاجرین میں کوئی منافق نہ تھا۔ (۵) منافقوں کا نفاق بے حد مخفی ہوتا تھا (۶) رسول کو ان کی بات ماننے کی ممانعت تھی۔ (۷) ان کے مقابلہ میں خدا کی مدد ملنے کا وعدہ تھا۔ (۸) ان میں جو توبہ نہ کریں گے ان کو دنیا و آخرت دونوں جگہ عذاب دیا جائے گا (۹) ساری دنیا میں ان کا کوئی معین و مددگار نہ ہوگا۔ (۱۰) نبیؐ ان سے جہاد کریں گے۔ (۱۱) وہ مدینہ میں زیادہ دنوں رہ نہ سکیں

گے اور رسولؐ کی حیات ہی میں ختم ہو جائیں گے (۱۲) وہ مدینہ سے بھاگ کر جہاں بھی جائیں گے وہیں پکڑے اور قتل کیے جائیں گے (۱۳) انھیں عذاب آخرت سے پہلے دو مرتبہ دنیا میں بھی عذاب دیا جائے گا۔ (۱۴) اور ان تمام سزاؤں کا ملنا ایک خدائی قانون ہے۔

تاریخ اسلام، احادیث نبویہ اور واقعاتِ صحابہؓ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس طرح کی کوئی خصوصیت خلفاء ثلاثہ اور اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں پائی جاتی تھی چنانچہ اسی بات کو اس رسالہ میں دلائل وثبوت کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

۲۲۔ تفسیر آیاتِ متفرقہ

یہ تفسیری رسالہ مولانا علیہ الرحمۃ کے تفردات میں سے ہے، آپ سے پہلے کسی بھی اہلِ علم نے ان آیات سے صحابۂ کرامؓ کے فضائل ومناقب میں استدلال نہیں کیا، ان آیات کی تفسیر سے یہ بات اچھی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مخالفین اہل سنت نے جو عقائد صحابۂ کرام کے بارے میں اختیار کر رکھے ہیں وہ قرآن مجید کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔ مولانا نے حسبِ ذیل دس آیتوں کا انتخاب کیا ہے:

۱۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ .... لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ (سورۂ آل عمران:۱۶۴)

۲۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ .... فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا (سورۂ آل عمران:۱۰۳)

۳۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ.......... وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (سورۂ حجرات:۷-۸)

۴۔ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ.......... لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ (سورۂ انعام:۸۹)

۵۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ .... مِنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ (سورۂ مزمل:۲۰)

۶۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ .... سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ (سورۂ عبس:۱۱ تا ۱۶)

۷۔ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (سورۂ نصر:۲)

۸۔ وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ .... فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (سورۂ آل عمران:۱۲۱-۱۲۲)

۹۔ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ .... مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (سورۂ انفال:۵)

۱۰۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ .... فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (سورۂ تحریم:۳-۴)

ان دسوں آیتوں کی صحیح ترجمانی نہ کر کے مخالفین نے قرآن مجید کی معنوی تحریف کی ہے اور

لوگوں کوگمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔مولاناؒ نے ان آیات کا صحیح ترجمہ اور حقیقی تفسیر کر کے تمام اعتراضات کا قلع قمع کیا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔سب سے پہلے یہ رسالہ ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا تھا اس کے بعد سے اب تک اس کے بہت سے ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔

۲۳۔ تفسیر آیت معیّت

اس رسالہ میں آیت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ...... مَغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا[1] کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔اس میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لے کر آپ کی صفت رسالت کو بیان فرمایا اور پھر صحابۂ کرام کے فضائل بیان فرمائے ہیں۔سورۂ فتح کی یہ آیت صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی، اس مغلوبانہ صلح سے صحابۂ کرام کے دل بے چین تھے لہٰذا اس پوری سورت میں ہر طرح سے ان کی دلدہی و دلداری کی گئی ہے، کہیں ان کے فضائل بیان کیے گئے ہیں، کہیں ان کو فتح و نصرت کی خوشخبری دی گئی ہے تو کہیں ان کے دشمنوں کو خود ان کے ہی ہاتھوں ذلیل و خوار ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی تہدید و تنبیہ بھی کی گئی ہے جو اس سفر حدیبیہ میں آنحضرتؐ کے ساتھ نہیں گئے تھے۔مولاناؒ نے اس آیت سے ثابت کیا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کے جن اوصاف و کمالات کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے یقیناً ان کے حامل حضرات ظالم و غاصب نہیں ہو سکتے لہٰذا ان کی خلافت حتمی طور پر خلافتِ حقہ ہوگی۔خلفاء ثلاثہ کا سفر حدیبیہ میں آنحضرتؐ کے ہم رکاب ہونے اور اس معرکہ میں ان کے شامل ہونے اور آخر تک اس میں شریک رہنے کا روشن ثبوت تاریخی طور پر فریقین کو تسلیم ہے۔ اس استدلال سے تینوں خلافتوں کا حق ہونا ثابت ہوتا ہے، آیت میں کھیتی کی مثال سے ان خلافتوں کا نہ صرف حق ہونا بلکہ موعودہ ہونا اور نہ صرف موعودۂ قرآن بلکہ موعودۂ توریت و انجیل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

۲۴۔ تفسیر آیت رضوان

اس رسالہ میں آیت کریمہ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ تا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ

---

[1] سورۂ فتح:۲۹

تَبـــدِیلاً[1] کی مکمل تفسیر بیان کی گئی ہے۔ان آیات سے خلفاء ثلاثہ اور تمام اصحابِ حدیبیہ کے مندرجہ ذیل فضائل معلوم ہوئے ہیں:

۱۔ حق تعالیٰ نے ان کو مومن فرمایا ہے جس سے ان کے ایمان کی شہادت ملتی ہے۔
۲۔ حق تعالیٰ نے ان سے اپنا راضی ہونا ظاہر کیا ہے۔
۳۔ ان کے دلوں کی بہترین حالت اور ان کی نیک نیتی و اخلاص کی گواہی دی گئی ہے۔
۴۔ اللہ نے ان پر سکینہ نازل فرمایا جس سے ایمان میں پختگی اور عمل میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔
۵۔ انھیں یہ تین نعمتیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے: (الف) فتح قریب (ب) مغانم کثیرہ اور (ج) دیگر غنائم جو اُس وقت عربوں کی قدرت سے باہر تھے۔
۶۔ فتح قریب اور مغانم کثیرہ کا وعدہ صرف اُن لوگوں سے تھا جو اس بیعت میں شریک تھے، دوسروں کے ساتھ یہ وعدہ نہ تھا۔
۷۔ پیشین گوئی کی گئی کہ کفار کو اب ان پر غلبہ حاصل نہ ہو سکے گا بلکہ انھیں ہمیشہ ہزیمت ہی ہو گی۔
۸۔ اللہ کے یہ وعدے اٹل ہیں اور یہی اس کی ہمیشہ کی سنت رہی ہے۔
۹۔ موت کی اس بیعت کو ممتاز کرنے کے لیے اس درخت کا بھی تذکرہ کر دیا جس کے نیچے بیٹھ کر حضورؐ نے یہ بیعت لی تھی۔
۱۰۔ فتح مکہ اور فتح خیبر کو ایمان والوں کے لیے ایک نشانی فرمایا گیا یعنی یہ دونوں فتوحات آئندہ ہونے والی فتوحات کا پیش خیمہ ہیں۔

مندرجہ بالا آیات سے اصحاب حدیبیہ کا مومن کامل اور پسندیدۂ خدا ہونا اس صفائی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات بھی بلا شک و شبہ باتفاق فریقین ثابت ہے کہ تینوں خلفاء اس بیعت میں شریک تھے اور جن اصحاب نے ان کی خلافت کا انتخاب کیا تھا وہ بھی اس بیعت میں شامل تھے۔ لہٰذا ان آیات کی روشنی میں وہ سب پسندیدۂ خدا اور مومن مخلص ٹھہرے اور ان کی خلافت خلافتِ راشدہ ثابت ہوئی اس لیے ایسے

---

[1] سورۂ فتح: ۱۸ تا ۲۳

برگزیدہ اصحاب کی خلافت کوظلم وجور کی خلافت کہنا کلام الٰہی کی تکذیب کرنا ہے۔

سب سے پہلے یہ تفسیر ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوئی تھی پھر دوسری بار ۱۳۵۱ھ میں شائع کی گئی اور پھر اس کے بعد متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں۔

۲۵۔ تحفۃ الانصاف لصاحب الاختلاف فی تفسیر آیت الاستخلاف

جس زمانہ میں مولانا لکھنویؒ نے النجم میں تفسیر آیات استخلاف شائع کی تھی جب ہی سے مخالف علماء اہل سنت میں ایک کھلبلی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ اس آیت سے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف ہوا تھا جس کا رد کرنا ان کے لیے ناممکن تھا لہٰذا ان کی طرف سے اکثر عوام کو مطمئن کرنے کے لیے چند اِدھر اُدھر کی ان مل بے جوڑ باتیں لکھ کر شائع کردی جاتی تھیں اور یہ اعلان کردیا جاتا تھا کہ تفسیر آیت استخلاف کا رد کردیا گیا۔ چنانچہ اسی طرح کا ایک جواب مذہب شیعہ کے ایک مبلّغ ڈاکٹر نور حسین جھنگوی نے بھی لکھنؤ کے شیعی رسالہ ''سہیل'' میں ''رفع الاختلاف'' کے نام سے شائع کرایا جس میں موصوف نے دعویٰ کیا کہ یہ تفسیر آیتِ استخلاف کا جواب ہے۔ چنانچہ زیرنظر رسالہ ''تحفۃ الانصاف'' ڈاکٹر جھنگوی کے اسی رسالہ کا جواب الجواب ہے۔ مولانا لکھنویؒ سے اسی آیت استخلاف پر تین مناظرے بھی شیعہ علماء کے ہوئے تھے ایک بمبئی میں ملاّ محمد باقر فیض آبادی سے، دوسرا چکوال میں مولوی محمد سجّاد لکھنوی سے اور تیسرا منٹگمری میں مولوی مرزا احمد علی امرتسری سے ہوا تھا[۱] ان تینوں میں فریق مخالف کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ شیعی علماء نے جن میں ڈاکٹر جھنگوی بھی شامل تھے اس سلسلہ میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان سے جو وعدے یعنی خلافتِ ارضی، تمکینِ دین اور تبدیلِ خوف کیے گئے ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات ہی میں پورے ہوچکے ہیں حالانکہ ان کا یہ دعویٰ خود ان کے متقدمین علماء کے تحریرات کے خلاف ہے۔ چونکہ ''تحفۃ الانصاف'' ڈاکٹر جھنگوی کا جواب الجواب ہے اس لیے خاص طور سے اس میں ان کے ذریعہ دیئے گئے حوالوں کی حقیقت، واقعات کو توڑ مروڑ کر بیان کرنے کی مثالیں اور غلط تراجم کی نشاندہی پورے ثبوت کے ساتھ کی گئی ہے جس کے نتیجہ میں مخالفین کی طرف سے پھر دوبارہ کوئی اس کا جواب نہیں بن سکا۔

۱۔ یہ تینوں مناظرہ ہم مناظروں کے باب میں ذکر کرچکے ہیں۔

اس رسالہ میں تین باتیں خاص طور سے واضح کی گئی ہیں اوّل یہ کہ آیت استخلاف کی تصدیق اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ تینوں خلافتوں کا موعود من اللہ ہونا تسلیم نہ کرلیا جائے، دوم یہ کہ صحابۂ کرام پر طعن کرنے والوں کے اصول پر نہ تو کوئی نبی طعن سے محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ ہی کسی نبی کی نبوت ثابت ہوسکتی ہے اور دین اسلام کی تو ایک بات بھی محفوظ نہیں رہ سکتی اور سوم یہ کہ مذہبِ مخالف کی بنیاد جھوٹ بولنے (تقیہ) اور عقیدۂ ختم نبوت کے انکار پر ہے۔ مولانا کے اس جواب سے تفسیر آیت استخلاف کی مزید وضاحت اور اس میں کچھ نئے حوالوں کا اضافہ بھی ہوگیا ہے۔

''تحفۃ الانصاف'' کئی بار النجم کے صفحات پر قسط وار شائع ہوچکی ہے اور پھر بعد میں اس کو کتابی شکل میں بھی شائع کیا جاچکا ہے۔

۲۶۔ رسالہ ہدایت بجواب ''غوایت'' (دو حصّوں میں)

مارچ ۱۹۱۵ء میں ''مناظرہ اور اظہار حق'' کی قسطیں النجم میں شائع ہورہی تھیں اور اس میں ایک مسلسل مضمون ''اصولِ مذہبِ شیعہ اور ان کے نتائج'' کے عنوان پر بھی شائع ہورہا تھا جس میں منجملہ اور بہت سی باتوں کے اِن کا ایک عقیدہ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ نعوذ باللہ انبیاء علیہم السلام غیر اللہ سے بہت ڈرتے تھے اور اسی وجہ سے بعض احکام الٰہی کی تبلیغ میں اکثر انھیں پس وپیش ہوتا تھا اور اگر مجبوراً انھیں کسی ایسی بات کا اعلان کرنا بھی پڑتا تھا تو اسے گول مول انداز میں کیا کرتے تھے جس پر ''معنی الشعر فی بطن الشاعر'' کی مثال صادق آتی تھی۔

شیعہ ماہنامہ ''اصلاح'' کھجوہ ضلع سیوان کے ایڈیٹر مذکورہ بالا مضمون کی تاب نہ لاسکے اور انھوں نے اس کے رد میں ایک طویل مضمون اپنے رسالہ میں ''غوایت النجم'' کے نام سے چار قسطوں میں شائع کردیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ بیشک انبیاء علیہم السلام غیر اللہ سے بہت ڈرتے تھے اور ان کا یہ ڈرنا قرآن کی فلاں فلاں آیات سے ثابت ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غیر اللہ سے ڈرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ مولانا نے اپنے رسالہ ''ہدایت بجواب غوایت'' کے پہلے حصہ میں ایڈیٹر اصلاح کے اس جوابی مضمون کا رد کیا ہے جو النجم کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا[1] اپنے اس

---

[1] النجم لکھنؤ، ۷؍جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ و ۲۱؍جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ

تردیدی جواب میں آپ نے معتبر کتب شیعہ کے حوالہ اور ان آیاتِ قرآنیہ کے ترجمہ وتفسیر سے یہ واضح کیا ہے کہ ایڈیٹر اصلاح نے ان آیات کے غلط تراجم تحریر کر کے عوام کو دھوکہ دیا ہے۔

اس رسالہ کے دوسرے حصہ میں ایڈیٹر اصلاح کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے مولانا کی مرتبہ تفسیر آیت مودۃ القربیٰ پر وارد کیے تھے۔ آیت مودۃ القربیٰ یعنی قُـلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْراً اِلاَّ الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبیٰ[1] کا ترجمہ یہ ہے کہ (اے نبی) آپ کہہ دیجیے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی اجرت سوا محبت کے جو قرابت میں ہے اہلِ سنت کے نزدیک اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ حق تعالیٰ نے آپ کو (رسالت) کا معاوضہ طلب نہ کرنے کا اعلان کرنے کو فرمایا ہے کہ اے نبیؐ آپ فرمادیجیے کہ میں تم لوگوں سے کوئی اجرت نہیں چاہتا سوا اس کے کہ قرابت کی وجہ سے میرے ساتھ محبت و مہربانی سے پیش آؤ اور مجھے ایذا نہ پہنچاؤ۔ مگر مخالفین صحابہؓ نے اس مطلب کو خراب کر کے اپنی طرف سے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ یہ مطالبۂ محبت درحقیقت محبت اہل بیت کا مطالبہ ہے اور یہی اجر رسالت ہے، نعوذ باللہ۔ یہ قرآن مجید کی معنوی تحریف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر نہایت سخت حملہ ہے۔ غرضکہ اسی قسم کے اعتراضات کے جواب میں یہ دونوں رسالے مرتب کر کے شائع کیے تھے۔[2]

سیرتِ نبویہ

۱۔ مختصر سیرتِ قدسیہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ پر مشتمل یہ ایک مختصر اُردو رسالہ ہے، اسے خاص طور سے بچّوں، عورتوں اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس میں نہایت آسان زبان میں اور بڑے اختصار کے ساتھ آپ کے حالات پیدائش سے لے کر وفات تک کے جمع کردیئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اکثر و بیشتر مدارس عربیہ کے دینی نصاب میں داخل رہی ہے۔ سیرت کے موضوع پر آسان اور مختصر کتابیں اس زمانہ میں اُردو میں آسانی سے میسّر نہ تھیں اور طلباء کے لیے تو نصاب میں داخل کرنے کے لیے ایسی کتابوں کے لکھنے کا اس دور میں

---

[1] سورۂ شوریٰ: ۲۳ [2] النجم لکھنؤ، ۲۱رجمادی الاولیٰ و ۲۱رجمادی الاخریٰ ۱۳۴۳ھ

اتنا رواج بھی نہ تھا چنانچہ جتنی بھی معیاری کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں وہ سب بعد کی ہیں لہٰذا یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ آسان اُردو میں سیرت مقدسہ پر لکھنے کا سلسلہ سب سے پہلے مولاناؒ ہی نے شروع کیا تھا۔ النجم کے اجراء کے بعد حضرت مؤلفؒ کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ ہر سال ربیع الاول کے مہینے میں النجم کا جو شمارہ شائع ہوتا تھا اس میں سیرت نبویہ سے متعلق کوئی نہ کوئی مضمون یا پھر کوئی مستقل کتاب ضرور شائع ہوتی تھی۔ مذکورہ بالا رسالہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے سب سے پہلے ۱۳۳۰ھ کے النجم میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد کتابی شکل میں بھی اب تک شائع ہوتا رہا ہے، بعد کے ایڈیشنوں میں کچھ مزید ترمیم و اضافے بھی کیے گئے ہیں۔

۲۔ سیرت الحبیب الشفیع من الکتاب العزیز الرفیع ملقب بہ مختصر سیرت نبویہ

سیرت طیبہ پر یہ کتاب بڑی معرکۃ الآراء ہے۔ اس میں قرآن مجید کی آیات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک مرتب کی گئی ہے۔ پوری کتاب ایک مقدمہ، چار ابواب اور ایک خاتمہ پر تقسیم کی گئی ہے، مقدمہ چار مسائل پر منقسم ہے۔

پہلا مسئلہ: لفظ سیرت کے معنی اور مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے۔

دوسرا مسئلہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نہایت آسان ہے اور اس کی معرفت فرض قطعی ہے۔

تیسرا مسئلہ: اس بات کے دلائل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآن کریم میں مذکور ہے اور صرف قرآن ہی نہیں بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

چوتھا مسئلہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی حفاظت خدا نے اپنے ذمّہ لی ہے اور اس نے اپنی ذمّہ داری کو باحسنِ وجوہ پورا کیا ہے۔

باب اوّل: عرب کا زمانہ جاہلیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے خطۂ عرب کے مخصوص ہونے کی حکمت۔

باب دوم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات قبل از نبوت

باب سوم: نبوت اور دلائل نبوت

باب چہارم: حالات بعد نبوت

خاتمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین سے جن عظیم الشان نعمتوں کے عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے ان کا ذکر، اتباع کا طریقہ اور اصل حقیقت

اس طرح پوری کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع ہے اور ساتھ ہی ساتھ مختصر بھی ہے یعنی صرف ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے ربیع الاوّل ۱۳۳۲ھ میں النجم کے صفحات پر شائع ہوئی تھی پھر قارئین کے اصرار پر دوبارہ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں بھی شائع ہوئی۔ بعد میں علیحدہ کتابی شکل میں بھی طبع ہوئی تھی مگر اب کم یاب ہے۔ قرآنی سیرت کے موضوع پر اُردو میں یہ سب سے پہلا رسالہ ہے اور اسے اولیت کا مرتبہ حاصل ہے۔

برصغیر کے مشہور صحافی، انشاء پرداز اور صاحب تصنیف تالیف بزرگ مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے کافی عرصہ کے بعد جب اپنی کتاب ''قرآنی سیرت نبوی'' مرتب کی تو اس کے اختتامیہ میں اپنے مآخذ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا کے اس رسالہ کی افادیت اور تقدم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''ترتیب زمانی کے لحاظ سے اس سے بھی مقدم (یعنی سیرت النبی از علامہ شبلیؒ وسید سلیمان ندویؒ) کتاب مولانا عبدالشکور لکھنوی مدظلہ صاحب النجم کی کتاب مختصر سیرت نبویہ ہے جس کا پورا نام سیرت الحبیب الشفیع من الکتاب العزیز الرفیع ہے۔ کتاب مختصر اور چھوٹی سی ہے یعنی ۸/۲۶×۲۰ تقطیع پر ۶۴ صفحوں کی ضخامت ہے، پھر بھی بہت کام کی ہے۔ یہ مولانا کی ابتدائی کتابوں میں سے ہے اور ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء کی چھپی ہوئی ہے۔ اُردو میں ہی نہیں بلکہ میری محدود نظر میں تو عربی میں بھی اس خصوصی موضوع پر لے دے کے یہی ایک کتاب ہے۔ یہ کتاب اب اگر مصنف کی نظر ثانی کے بعد چھپتی تو ضخیم تر ہو سکتی تھی۔''[1]

۳۔ نفحۂ عنبریہ بذکر میلاد خیر البریہؐ

یہ رسالہ سیرت کے موضوع پر نہایت سلیس اور آسان زبان میں ہے اور اُس دور میں تحریر ہوا تھا جبکہ اُردو میں سیرت مقدسہ پر بہت کم لٹریچر ملتا تھا بالخصوص مسلم بچوں اور کم پڑھی لکھی خواتین کے لیے یہی وجہ ہے کہ بیشتر مدارس اسلامیہ میں یہ کتاب بھی داخل درس رہی ہے۔ ایک مستقل

۱۔ قرآنی سیرت نبوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ص ۶۱-۲۶۰

تصنیف کی حیثیت سے یہ رسالہ سب سے پہلے ۱۳۴۳ھ کے النجم میں شائع ہوا تھا اور پھر اس کے بعد کتابی شکل میں منتقل ہو کر اب تک برابر شائع ہوتا رہا ہے۔

اس رسالہ کے شروع میں ضروری اور بنیادی اسلامی عقائد کا بیان ہے جنھیں بہت آسان اور سلیس پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ آخرت کی فلاح و بہبودی کے لیے عقائد کی درستگی بے حد ضروری ہے اس کے بغیر کوئی نیکی مفید نہیں ہو سکتی، عقائد اگر درست ہوں گے تو تھوڑی نیکی بھی بہت ہو سکتی ہے اور اگر خطا و قصور بھی ہو جائے تو اس کے مغفرت کی امید ہے لیکن اگر عقائد درست نہ ہوں گے تو اچھے سے اچھا عمل بھی رائیگاں ہو جائے گا۔ یہاں عقائد اسلامیہ سے مراد عقائد اہل سنت و جماعت ہیں، جو عقیدے اہل سنت و جماعت کے خلاف ہوں تو وہ عقائد اسلامیہ نہیں کہلائیں گے بلکہ وہ اپنے فرقوں کی طرف منسوب کیے جائیں گے چنانچہ اہل سنت کے عقائد کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

> ''یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اہل سنت و جماعت کے عقائد کیا ہیں یہ وہی عقائد ہیں جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کرام کو تعلیم فرمائے اور صحابۂ کرام کی ساری جماعت بلا اختلاف ان عقائد پر قائم رہی۔ زمانہ مابعد میں لوگ نئی نئی باتیں نکال نکال کر الگ الگ فرقے بن گئے، کوئی معتزلی ہو گیا، کوئی مرجئی، کوئی جہمی، کوئی قدری، کوئی جبری، کوئی رافضی اور کوئی خارجی وغیرہ ہو گیا۔ لیکن اہل سنت و جماعت لکیر کے فقیر بنے ہوئے انھی عقائد پر مضبوطی سے قائم رہے جو صحابۂ کرام سے انھوں نے پائے تھے۔ یہ وہی عقائد ہیں جو آج اللہ کی مقدس کتاب قرآن مجید میں موجود ہیں۔ جو عقائد اصل الاصول ہیں وہ تو صراحۃً قرآن شریف میں بیان ہوئے ہیں اور جو اس سے کم درجہ کے ہیں وہ بالاجمال قرآن مجید میں ہیں اور بالتفصیل متواتر حدیثوں میں ہیں۔ بعضے فروعی اعتقادات ایسے بھی ہیں جن کی تفصیل غیر متواتر حدیثوں میں وارد ہوئی ہے مگر ان پر شریعت مقدسہ کو کچھ زیادہ اہتمام نہیں ہے[1]''

اسی طرح اصل الاصول عقائد یعنی توحید، نبوت اور قیامت کے بارے میں عقیدہ کا ذکر کرنے کے بعد صحابۂ کرام و خلفاء راشدین کے بارے میں اہل سنت کے ضروری عقائد کو بیان کر کے حضور پاکؐ کے حالات تحریر کیے گئے ہیں۔ حضورؐ کے حالات میں پیدائش سے لے کر

---

[1] نفحۂ عنبریہ، مولانا لکھنوی، ص ۴

وفات تک کی تمام ضروری باتیں تحریر میں آ گئی ہیں، حالات قبل ہجرت اور حالات بعد ہجرت سب سلسلہ وار اور بڑے اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں تا کہ بچے اور کم خواندہ لوگ آسانی کے ساتھ انھیں یاد رکھ سکیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی معجزات آپ کی استعمالی اشیاء، آپ کے متعلقین ومخصوصین کے اسماء گرامی اور ان کے مختصر حالات، آپ کے خدمتگار، خدام، ایلچی، کاتبانِ وحی وفرامین، نجباء، عشرۂ مبشرہ' صحابۂ کرام اور خلفاء راشدین وغیرہ جیسے سبھی عنوانات پر ضروری باتیں جمع کردی گئی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا جاننا اور یاد رکھنا ہر شخص کے لیے ضروری اور مفید ہے یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اب تک داخل نصاب ہے۔ اس کی اشاعت برابر ہو رہی ہے۔

۴۔ اردو ترجمہ شمائل ترمذی

امام ابوعیسیٰ ترمذیؒ (۸۲۴تا۸۹۲ء) صحاح ستہ میں ایک صحیح کے مرتب تھے اور امام بخاریؒ و امام ابوداؤدؒ کے شاگردوں میں تھے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ جس گھر میں ان کی کتاب جامع ترمذی ہو گویا اس گھر میں ایک پیغمبر موجود ہے جو باتیں کر رہا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے زیادہ سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ان کے ورد زبان اور حرز جان ہو اور آپؐ کی شکل وصورت وآپؐ کے عادات وخصائل کا نقشہ ہر وقت دل میں رہے۔ انسان کامل وہی ہے جس کو آپ کی معرفت ومحبت میں کچھ حصہ ملا ہے ورنہ دنیا کی ہر چیز موجب نقصان وخسارہ ہے مگر اس کے ساتھ ہی غیر مستند روایات کا آپ کی شان میں بیان کرنا بھی بڑا وبال ہے اس لیے امام ترمذیؒ نے کتاب الشمائل مرتب فرمائی جس میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وصورت، آپ کی سیرت وعادات اور لباس وطعام غرض ہر چیز نہایت صحیح ومستند طریقہ سے مذکور ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء اس کتاب کے باعث خیر وبرکت ہونے اور آڑے وقت میں اس کے مطالعہ سے جملہ مقاصد کے حصول میں مجرب ہونے کے قائل ہیں چنانچہ ہر دور میں اور ہر زبان میں اس کی شرحیں اور ترجمے کیے گئے ہیں۔[1]

پوری کتاب میں چار سو آٹھ احادیث ہیں، آغاز کتاب باب ماجاء فی خلق رسول اللہ صلی

---

[1] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء المتقباء المحدثین، نواب صدیق حسن خاں، ص ۱۰۰

اللہ علیہ وسلم سے اور اختتام عن ابن سیرین قال هذا الحدیث دین فانظروا عمن تاخذون دینکم پر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا نے اس کتاب کا ترجمہ ''شمائل النبی'' کے نام سے کیا ہے۔ترجمہ حامل المتن ہے اور بعض بعض مقامات پر حواشی بھی لکھے ہیں اور کتاب کے آخر میں حضرت نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کو خواب میں دیکھنے کے متعلق چند ہدایات بھی تحریر فرمائی ہیں۔آغاز ترجمہ میں اپنی اس آرزو کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں اس خدمت کا صلہ بارگاہِ خداوندی میں یہ چاہتا ہوں کہ زندگی میں اس مبارک سرزمین کی زیارت مل جائے جس کا نام مدینہ طیبہ ہے، وَمَا ذالک علیٰ الله بعزیز:

کے بود یارب کہ رُو در یثرب و بطحا کنم
گہ بمکہ منزل وگہ در مدینہ جا کنم[1]

حسب سابق یہ ترجمہ بھی ابتداء میں النجم کے صفحات پر شائع ہوا تھا اور کئی بار شائع ہوا تھا مگر پھر بعد میں اس کو کتابی شکل میں علیحدہ سے بھی طبع کر دیا گیا جو اَب بھی دستیاب ہو جاتا ہے۔

۵۔ **اردو ترجمہ چہل حدیث**، مرتبہ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ

ہر دور میں علماء و صلحاء نے اپنے ذوق اور مقتضائے وقت کے مطابق چالیس حدیثوں کے مجموعے مرتب کیے ہیں جن کے بڑے فضائل و مناقب ہیں۔احادیث میں آیا ہے کہ جناب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ میری امت میں سے جس نے چالیس حدیثیں یاد کرلیں اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز فقہاء کے زمرے میں محشور کرے گا اور میں اس کے ایمان کی گواہی دوں گا اور اس کی شفاعت کروں گا۔چنانچہ انھیں ترغیبات کی روشنی میں علماء و مشائخ نے مختلف مقاصد اور مختلف نقطہ نظر سے احادیث کا انتخاب کیا ہے۔کسی نے فضائل صحابہؓ سے متعلق حدیثوں کو جمع کیا ہے، کسی نے فضائل حج سے متعلق، کسی نے تصوف سے تعلق رکھنے والی احادیث اور کسی نے اخلاقیات سے تعلق رکھنے والی احادیث جمع کی ہیں، اس طرح حدیثی لٹریچر میں اربعینات کے نام سے اچھا خاصا ذخیرہ مہیا ہو گیا ہے۔چنانچہ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی

---
[1] شمائل النبی مترجم، مولانا لکھنوی، ص ا

شیخ احمد سرہندیؒ نے بھی چہل حدیث کا ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا، یہ مجموعہ ''مکاشفات غیبیہ'' نامی ایک بیاض میں درج تھا جو بھوپال میں حضرت مولانا شاہ ابو احمد صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہٗ کے پاس محفوظ تھی اور صاحب مکاشفات غیبیہ نے اسے براہ راست شیخ سرہندیؒ کے دست مبارک کے لکھے ہوئے نسخہ سے نقل کیا تھا۔ ایک موقعہ پر حضرت شاہ ابو احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا سے اس کا اُردو ترجمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی چنانچہ آپ نے اسی خواہش کی تعمیل میں اس چہل حدیث کا اُردو میں ترجمہ کیا جو عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ چہل حدیث کا یہ ترجمہ ۲۰×۲۶/۸ سائز کے سولہ صفحات پر چھپا تھا جس کے ہر صفحہ پر مفید حواشی بھی تحریر کیے گئے تھے حضرت امام ربانیؒ نے جتنی بھی احادیث اس مجموعہ میں شامل کی ہیں وہ سب ہی متفق علیہ ہیں۔

فقہ

ا۔ علم الفقہ

حضرت لکھنویؒ کی علمی خدمات میں ''علم الفقہ'' کی تصنیف سرفہرست ہے۔ برصغیر کی علمی تاریخ میں اُردو کے اندر فقہی مسائل کو کتابی شکل میں مدون کرنے کا سب سے پہلا کارنامہ آپ ہی کا ہے۔ علم الفقہ سے پہلے اُردو زبان میں ایسی کوئی جامع اور مکمل کتاب موجود نہ تھی جو اہل علم کے ساتھ ساتھ عوام کے لیے بھی کارآمد اور مفید ہوتی۔ علم الفقہ آپ کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔ ۱۹۰۰ء میں جب آپ نے باضابطہ اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا تو سب سے پہلے علم الفقہ کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ لکھنؤ سے نکالنا شروع کیا جس میں مسائل فقیہ کو عام فہم اور سلیس اردو میں مرتب کر کے شائع کیا جاتا تھا، کئی اشاعتوں کے بعد جب ایک خاص قسم کے مسائل مکمل ہوجاتے تو انھیں ایک 'جلد' کی شکل دے دی جاتی تھی۔ اس طرح سے آج علم الفقہ چھ ضخیم جلدوں میں ہمارے سامنے ہے۔ جلد اوّل طہارت کے مسائل سے متعلق ہے، جلد دوم نماز، جلد سوم روزہ، جلد چہارم زکوٰۃ، جلد پنجم حج و زیارت اور جلد ششم نکاح کے مسائل پر مشتمل ہے۔ اس طرح علم الفقہ کی یہ تمام جلدیں ۲۰×۲۶/۸ سائز کے تقریباً ایک ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔

اس کی قدامت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اپنی تصنیف ''بہشتی زیور'' کے گیارہویں حصہ یعنی ''بہشتی گوہر'' کا مآخذ علم الفقہ ہی کو بنایا ہے چنانچہ حضرت تھانویؒ اپنے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''بعد الحمد والصلوٰۃ یہ رسالہ بہشتی گوہر تتمہ ہے بہشتی زیور کا جو اس کے دس حصوں میں شائع ہو چکا ہے اور جس کے اخیر حصے کے ختم پر اس تتمہ کی خبر اور ضرورت کو ظاہر کیا جا چکا ہے لیکن بوجہ کم فرصتی کے اس کے جمیع مسائل کو اصل کتب فقہیہ متداولہ سے نقل کرنے کی نوبت نہیں آئی بلکہ رسالہ علم الفقہ کہ لکھنؤ سے شائع ہوا ہے اور جس میں اکثر جگہ اصل کتب کا حوالہ بھی دیا گیا ہے ایک طالب علمانہ نظر سے مطالعہ کر کے اس میں سے اس تتمہ کے مناسب یعنی ضروری مسائل جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں مقصوداً اور کسی عارضی مصلحت سے مسائل مشترکہ تبعاً منتخب کر کے ایک جگہ جمع کرنا کافی سمجھا گیا ہے[1]''

علم الفقہ میں مسائل دینیہ کو اس طرح اُردو زبان میں مرتب کیا گیا ہے کہ وہ عوام کے علاوہ علماء و فضلاء کے لیے بھی یکساں طور پر مفید و کارآمد ثابت ہوں چنانچہ اکثر مقامات پر جہاں ائمہ فقہ کے درمیان مسائل پر کچھ اختلافات زائے ہے وہاں حاشیہ پر موافق و مخالف دونوں کے دلائل تحریر کر کے جو مفتیٰ بہ قول ہے اسے لکھ دیا گیا ہے، یہاں تک کہ راسخ الخیال حنفی ہوتے ہوئے بھی متعدد مواقع پر ائمہ احناف کے بعض اجتہادات سے اختلاف بھی کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں اپنی رائے اور اس کی وجہ ترجیح بھی لکھ دی ہے۔ اس سے مؤلف کی فقہی بصیرت اور وسیع النظری و عمیق مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس موقع پر ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے استاذ تفسیر و حدیث اور وہاں کی مجلس شرعیہ کے ناظم جناب مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب کے وہ خیالات پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے علم الفقہ کے امتیازات اور خصوصیات کے سلسلہ میں ظاہر کیے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ علم الفقہ اُردو زبان کے اندر فقہی مسائل کے بیان میں جامعیت اور حسنِ ترتیب کے لحاظ سے ممتاز ترین کتاب ہے، اس میں بہت سے وہ مسائل بھی نہایت آسان اور عام فہم انداز سے بیان کر دیئے گئے ہیں جو ضخیم عربی کتابوں ہی کا اب تک حصہ تھے اور پھر اس کے ساتھ بہت سی وہ اصطلاحیں جو فقہ کی عربی کتابوں میں ہی عام طور پر ملتی ہیں اور جن سے واقف

---

[1] بہشتی گوہر، مؤلفہ حضرت تھانویؒ، ص ۶۷۹

ہوئے بغیر صحیح مطلب اخذ کرنا عربی دانوں کے لیے بھی دشوار ہے ان کی تفصیل مولانا نے اس طریقہ پر علم الفقہ میں بیان کردی ہے کہ اس سے عوام ہی نہیں علماء بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں...... علم الفقہ یوں تو پوری کی پوری نہایت مفید اور ان خوبیوں کی حامل ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن راقم السطور کا اندازہ ہے کہ اس میں طہارت سے متعلق جتنی تفصیلات اور کارآمد بحثیں ملتی ہیں اتنی کسی ایک اُردو کتاب میں تو کیا بعض عربی کتابوں میں بھی یکجا ملنا مشکل ہیں اس لیے کتاب کا یہ حصہ خاص طور پر بہت ممتاز بن گیا ہے، اس کے بعد احقر کی نظر میں سب سے زیادہ مفید اور جامع حصہ وہ ہے جو زکوٰۃ کے احکام پر مشتمل ہے اس میں بھی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو مذکورہ بالا حصہ میں ہیں[1]۔''

علم الفقہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فقہی مسائل کے اندر استاذ الاساتذہ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی آراء کو زیادہ تر بنیاد بنایا گیا ہے اور عمومی طور پر وہ مسلک اختیار کیا گیا ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور مولانا فرنگی محلیؒ کا مسلک تھا اسی لیے اختلافی مسائل میں تحقیق و تطبیق اور اجتہاد کا رنگ نمایاں طور پر ملتا ہے، پھر بھی کسی مخصوص مسئلہ میں اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے، مسائل میں حالات و زمانہ کے تغیر اور نئی تحقیقات کی روشنی میں کسی حد تک تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ فقہ کے کسی مخصوص مسئلہ میں کسی ایک فقیہ کی رائے کو جامد اور اٹل نہیں سمجھنا چاہیے۔ مثلاً زکوٰۃ کے مسائل میں درم و مثقال کے اوزان اور قصر نمازوں کے لیے مسافت کے تعین میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے لیکن اس سے کتاب کی افادیت، اہمیت اور اوّلیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ علم الفقہ کی تالیف کے بعد مولانا کو اس پر نظر ثانی کا موقعہ کبھی نہیں مل سکا کیونکہ اس کے بعد ان کی ساری توجہ اور توانائی دوسرے محاذ پر لگ گئی چنانچہ خود ہی ایک موقعہ پر فخر المحدثین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا:

''علم الفقہ ہر پنج جلد کے تین نسخے روانہ ہو چکے ہیں، مل گئے ہوں گے، اس میں کتاب الصلوٰۃ کے تین نسخے بھی ہیں۔ دوبارہ طباعت میں نظر ثانی نہیں ہوسکی ورنہ پچیس تیس برس پہلے کے مضامین میں کچھ تجدد و ترفع کی امید تھی[2]۔''

---

[1] امام اہل سنّت اور علم الفقہ، مولانا برہان الدین سنبھلی، ماہنامہ ''البدر'' کاکوری۔ ص ۱۳۰-۱۳۱

[2] مکتوب مولانا لکھنویؒ بنام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحبؒ مملوکہ راقم الحروف۔

اس کے علاوہ علم الفقہ میں بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کے متعلق مزید تحقیقات کے بعد آپ نے اپنی رائے بدل دی تھی مثلاً پہلے شیعوں کی تکفیر کے بارے میں آپ کو تامّل تھا، چنانچہ ۱۳۳۳ھ کے ایڈیشن میں جلد ششم ص ۵۵ پر تکفیر شیعہ کی تردید کی ہے مگر ایک عرصہ کے بعد جب کتب شیعہ کی مزید چھان بین کی اور ان کی دوسری کتابیں دستیاب ہو کر مطالعہ میں آئیں تو پھر آپ نے اپنی رائے میں تبدیلی فرمالی اور اس سلسلہ میں متعدد رسائل تحریر فرمائے فتوے شائع کیے، مختلف مقامات پر اسی سلسلہ میں مناظرے بھی کیے اور پھر مستقل کتابیں بھی لکھیں۔

علم الفقہ کی ہر جلد کے آخر میں اس کے موضوع کے مطابق چالیس احادیث اور چالیس اقوال و آثار حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ' بھی لکھے گئے ہیں جس سے اس کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں علم الفقہ کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب تک برابر شائع ہو رہے ہیں۔

۲۔ اُردو ترجمہ فقہ اکبر

فقیہ اعظم حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہ کوفیؒ (۶۹۹ - ۷۶۷ء) کی طرف منسوب ایک مختصر کتاب ''فقہ اکبر'' کے اس اُردو ترجمہ کی پہلی قسط ۲۸ رشوال ۱۳۲۲ھ کے النجم میں شائع ہوئی تھی جو بعد میں مسلسل قسطوں میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کے آخر میں حضرت امام اعظمؒ کے وصیت نامہ کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کتاب کی نسبت امام اعظمؒ کی طرف کہاں تک صحیح ہے یہ کتاب علم کلام کی قدیم ترین کتابوں میں سے شمار کی جاتی ہے اور اس کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ بڑے بڑے نامور علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں جس میں ملاّ علی قاری مکیؒ مؤلف مرقاۃ شرح مشکوٰۃ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس رسالہ میں اُردو ترجمہ کے ساتھ ساتھ عربی متن بھی درج ہے، اس ترجمہ کی ایک بڑی خصوصیت اس کے وہ مفید حواشی ہیں جو مترجم نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں اضافہ کیے ہیں۔ جس عبارت پر حاشیہ لکھنا ہوا وہاں لکھ دیا گیا ہے کہ — ''مترجم کہتا ہے'' اور جب حاشیہ مکمل ہو گیا تو وہاں لکھ دیا گیا ہے کہ — ''مترجم کا قول ختم ہوا۔'' اس لیے یہ ترجمہ ان حواشی کی وجہ سے مزید ضخیم اور علمی طور پر مزید مفید ہو گیا ہے۔
ترجمہ اور حواشی کا ایک نمونہ یہ ہے:

''اور خدا کا ثواب اور عذاب کبھی فنا نہ ہوگا اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے ہدایت کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بمقتضائے انصاف گمراہ کرتا ہے۔

مترجم کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہدایت اور ضلالت دونوں خدا کی طرف سے ہیں مگر فرق اس قدر ہے کہ ہدایت محض فضل خداوندی سے ہوتی ہے اور ضلالت ہمارے اعمال و افعال قبیحہ کی پاداش میں۔ مترجم کا قول ختم ہوا۔

خدا کا گمراہ کرنا اس کا خذلان ہے، خذلان کے معنی یہ ہیں کہ بندے کو اپنی رضامندی کی باتوں کی توفیق نہ دے اور یہ خدا کا انصاف ہے اور اسی طرح جس شخص کو خدا نے توفیق نہیں دی اسے گناہ پر عذاب کرنا بھی انصاف ہے۔ مترجم کہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا جو کچھ کرتا ہے وہ یا تو بمقتضائے لطف و فضل ہوتا ہے یا بمقتضائے عدل، کوئی کام اس کا ظلم نہیں ہوتا، ظلم کہتے ہیں غیر کی ملک میں بیجا تصرف کرنے کو، اور خدا جو کچھ کرتا ہے اپنے ملک میں کرتا ہے لہٰذا اس کا کوئی کام ظلم نہیں کہا جا سکتا۔ مترجم کا قول ختم ہوا[1]''

اس طرح فقہ اکبر کا اُردو ترجمہ راقم کی نظر سے النجم کے صفحات ہی میں گذرا ہے۔ علیحدہ سے رسالہ کی شکل میں آنا ہمارے علم میں نہیں ہے۔

۳۔ وصّاف اُردو ترجمہ ''الانصاف''

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسلامی فقہ کی تاریخ، مختلف فقہی مسالک کے درمیان اختلافات اور ان کے اسباب کے بارے میں عربی زبان میں ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا۔ شاہ صاحبؒ کے فقہی نظریات کی معرفت کے لیے یہ رسالہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام اس کتاب کو اگر تاریخ فقہ و علم حدیث کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ حقیقتاً یہ کتاب عہد سعادت سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک فقہ کی تدوین، کتب حدیث کی فراہمی اور مختلف مذاہبِ فقہ کے آغاز کی ایک نہایت دلچسپ، منصفانہ اور پُر معلومات تاریخ ہے —— شاہ ولی اللہؒ کے اس رسالہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں اسلام کی علمی تاریخ سے کتنی واقفیت تھی۔ اس کتاب میں نہایت وضاحت اور انصاف پسندی سے تقریباً ان

---

[1] النجم، لکھنؤ، ۱۴ ذی الحجہ، ۱۳۲۲ھ

سب اہم بنیادی مسائل کا ذکر آگیا ہے جن پر علماء میں اختلافات ہوئے، (آپ نے) ان اختلافات کی توضیح کی ہے ساتھ ہی ساتھ چاروں مذاہب یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کی خصوصیات اور ان کی جداگانہ تشکیل کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے، جمع احادیث اور محدثین مثلاً بخاریؒ، مسلمؒ، ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ کے مجموعوں کی خصوصیات (بھی) بیان کی ہیں، اجتہاد اور تقلید کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور ان وجوہات کا ذکر کیا ہے جن کی بنا پر مسلمانوں میں تقلید کا رواج ہوگیا ہے۔[1]

مولانا لکھنویؒ نے اس رسالہ کا اُردو ترجمہ "وصاف" کے نام سے کیا تھا جو عربی متن اور ترجمہ کے ساتھ کتابی شکل میں عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ پورا رسالہ ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ درحقیقت الانصاف کے درمیانی بیس پچیس صفحات کے مضامین تو نئے ہیں باقی مانده پوری کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" جلد اول کے مختلف ابواب کی لفظ بہ لفظ نقل ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحبؒ نے اس رسالہ کا نام "علیۃ الانصاف" تجویز فرمایا تھا، شاہ صاحبؒ نے فقہی اختلافات کے جو اسباب، ان کی تاریخ اور مختلف اختلافی امور میں جو تطبیق کی ہے وہ حقیقتاً انہی کی جامعیت اور فقہی بصیرت کا کارنامہ ہے۔ جناب مترجم نے جا بجا اس میں حواشی بھی تحریر کیے ہیں اور بعض مقامات پر بعض وضاحتیں بھی کی ہیں، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فقہی اختلافات کے سلسلہ میں مترجم نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "واضح رہے کہ صحابہ میں باہم جس قدر اختلافات تھے وہ سب فروعی تھے، اصول میں وہ سب باہم متفق تھے۔ وہ عقائد جن پر مدار نجات ہے سب کے سب یکساں تھے اور وجہ اس کی یہ تھی کہ اصول دین کو انھوں نے بہت یقین، اہتمام اور ضبط واتقان کے ساتھ مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کیا تھا۔"[2]

الانصاف کا اُردو ترجمہ اور اپنے اہتمام میں اس کی اشاعت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ فقہی مسائل میں تطبیق اور جامعیت کی جو روش حضرت شاہ صاحبؒ کے اندر تھی، اسی روش اور انہی اصولوں پر خود مولانا لکھنویؒ بھی کاربند تھے اور اسی کو عام مسلمانوں میں مقبول اور مروّج بنانا چاہتے تھے۔

ترجمہ کے دوران بعض مقامات پر احادیث کی تخریج بھی کی ہے اور بعض فقہی اصطلاحات کی تعریف وتوضیح بھی کی ہے جس سے رسالہ کی افادیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کا ایک

---

[1] آب کوثر، شیخ محمد اکرام، ص ۳۰۱-۳۰۲ [2] وصاف ترجمہ الانصاف، ص ۳

ترجمہ مولانا محمد احسن نانوتویؒ (م ۱۸۹۵ء) نے بھی کیا تھا جو آج بھی دستیاب ہو جاتا ہے۔[1]

۴۔ دُرِّ فرید

اس نام سے ایک رسالہ مولانا نے تالیف کیا تھا جو مسئلہ تقلید کے جواز میں تھا۔ اب یہ رسالہ نایاب ہے۔

فضائل ومناقب اور سیر وسوانح

۱۔ سیرت خلفاء راشدینؓ

مولانا لکھنویؒ نے جب سیرتِ مقدسہ پر ایک مختصر مگر نہایت جامع رسالہ "نفحۂ عنبریہ بذکر میلاد خیر البریہ" لکھ کر شائع فرمایا تو وہ بے حد مقبول ہوا اس لیے بعض قریبی حلقوں نے فرمائش کی کہ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات بھی اسی طرح مرتب کر کے شائع کر دیئے جائیں تا کہ عام مسلمانوں کے دلوں میں ان حضرات کی عظمت و محبت پیدا ہو اور ایمان میں تازگی آئے لہٰذا انہی تقاضوں کے پیشِ نظر آپ نے "سیرت خلفاء راشدینؓ" تالیف فرمائی جس کو منجانب اللہ بڑی قبولیت حاصل ہوئی۔ کتاب کے آغاز میں آپ نے لکھا ہے کہ صحابۂ کرام خصوصاً خلفاء راشدین کا تذکرہ اور ان کے اوصاف و کمالات کا بیان درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک ہی کا تتمہ و تکملہ ہے بلکہ ان حضرات کے کمالات کا مطالعہ کرنے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عظمت، رفعت اور محبت دل میں پیدا ہوتی ہے وہ ہرگز کسی اور دوسرے طریقے سے نہیں ہو سکتی۔

یہ کتاب پونے تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جس کے مقدمہ میں صحابۂ کرام اور خصوصاً خلفاء اربعہ کے بارے میں اہل سنت و جماعت کے مخصوص عقائد بھی تحریر فرمائے ہیں۔ اس ضمن میں جنگ صفین کے سلسلہ میں اہلسنّت کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جنگ صفین میں ایک جانب حضرت علی اور دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما تھے، اس لڑائی کے متعلق اہلسنّت کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ خلیفہ برحق تھے اور حضرت معاویہؓ اور

---

[1] علم الفقہ، جلد سوم، ۳۲۔

ان کے ساتھ باغی اور خاطی۔ مگر اس خطا پر ان کو بُرا کہنا جائز نہیں کیونکہ وہ بھی صحابی ہیں اور
صاحب فضائل ہیں، ان کی یہ خطا غلط فہمی کی وجہ سے تھی اور غلط فہمی کے اسباب بھی موجود تھے۔
ایسی خطا کو خطائے اجتہادی کہتے ہیں جس پر عقلاً و شرعاً کسی طرح مواخذہ نہیں ہوسکتا۔۔۔
حضرت معاویہؓ ابتداءً تو باغی تھے مگر حضرت حسن بن علیؓ کی صلح و بیعت کے بعد وہ بلاشبہ خلیفۂ
برحق ہوگئے[1]۔''

اہلسنّت کے عقائد ضروریہ کے بعد چند صفحات میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ ہے پھر اس کے بعد حسب ترتیب الگ الگ خلفاء اربعہ کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں زیادہ تر مواد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلویؒ کی کتاب ''ازالۃ الخفاء'' سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں اور کسی کتاب سے مدد لی گئی ہے وہاں اس کا حوالہ بھی درج ہے۔ کتاب میں سوانح سے زیادہ فضائل و مناقب پر توجہ دی گئی ہے جو اودھ اور خصوصاً لکھنؤ کے مخصوص حالات کے پیش نظر ضروری بھی تھا کیونکہ جہاں صحابۂ کرام اور خلفاء راشدین کی شان میں بے ادبی و گستاخی عام ہو وہاں ان ذوات مقدسہ کی عظمت و بزرگی کی تبلیغ زیادہ سے زیادہ ضروری ہے۔ خلفاء اربعہ میں سے ہر ایک کے حالات میں زیادہ تر وہی حالات درج کیے گئے ہیں جن سے ان کا خلوص، ایمان کی پختگی و بلندی، مسلمانوں کے تئیں ان کی خیر خواہی و ہمدردی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و جاں نثاری، اتباع سنت، غزوات میں شرکت و ان کی فتوحات اور دور خلافت میں عدل و انصاف کی سچّی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ہر خلیفۂ راشد کے حالات کے آخر میں ان آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے متن بھی مع ترجمہ کے شامل کیے گئے ہیں جن سے ان حضرات کے مخصوص فضائل اور مناقب کا اظہار ہوتا ہے۔

سب سے پہلے اس کتاب کی اشاعت ربیع الاول ۱۳۴۹ھ میں النجم کے صفحات پر ہوئی تھی، بعد میں مقبولیت اور مانگ کے پیشِ نظر اس کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا جب سے برابر اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن شائع ہورہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں اس قدر برکت اور تاثیر عطا فرمائی ہے کہ یہ لکھنؤ، دہلی، دیوبند اور پاکستان سے برابر شائع ہوتی رہتی ہے اور ہاتھوں ہاتھ نکل جاتی ہے۔ بعض ثقہ حضرات سے یہ بات سننے میں آئی ہے کہ حضرت مؤلفؒ نے اس کتاب کے

---

[1] سیرت خلفائے راشدین، ص ۹-۸

صلہ میں اللہ تعالیٰ سے حج مبرور کی سعادت حاصل کرنے کی دعا مانگی تھی چنانچہ اسی سال اللہ تعالیٰ نے آپ کو حج کی دولت سے نوازا اور پھر متعدد بار یہ سعادت نصیب ہوتی رہی۔

۲۔ تنویر الایمان اُردو ترجمہ تطہیر الجنان

علامہ ابن حجر مکی شافعیؒ (۹۰۹ء تا ۹۷۴ھ) نے ہندوستان کے مغل بادشاہ ہمایوں کی درخواست پر یہ کتاب بنام "تطہیر الجنان واللسان من الخطور والتفوہ بثلب سیّدنا معاویہ بن ابی سفیانؓ" تحریر کی تھی، تنویر الایمان اسی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے جو ایک سو بیس صفحات پر مشتمل ہے، پوری کتاب ایک دیباچہ، ایک مقدمہ اور تین فصلوں میں منقسم ہے۔ پہلی فصل حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے اسلام لانے کے بیان میں ہے، دوسری فصل حضرت معاویہؓ کے فضائل و مناقب اور ان کے علوم واجتہادات کے بیان میں ہے اور تیسری فصل ان اعتراضات کی تردید میں ہے جو حضرت معاویہؓ پر معاندین اہلسنّت کرتے ہیں۔ دیباچہ میں مترجم نے کتاب کی اہمیت اور مصنّف تطہیر الجنان علاّمہ ابن حجر مکّی کے حالات بھی درج کیے ہیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے عظیم المرتبت صحابی کی بدگوئی اور تنقیص کرنے والے ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور اپنے کو مستحق عذاب بناتے رہے ہیں، بعض ناواقف اور بے خبر اہلسنّت بھی خواہ مخواہ روافض کا دل خوش کرنے کے لیے ان کی شان میں گستاخانہ کلمات کہہ کر اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں اس لیے ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ کتاب مشعلِ راہ ہے۔ حضرت معاویہؓ کے بیشمار فضائل ہیں، منجملہ ان میں شرفِ اسلام، شرف صحابیت، شرف نسب اور شرفِ مصاہرتِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے صرف شرفِ مصاہرت ہی جنت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا ضامن ہے، آپ کاتبِ وحی بھی تھے، شرفِ علم اور شرفِ خلافت بھی حاصل تھا۔ ان اوصاف میں اگر ایک وصف بھی کسی میں پایا جائے تو اس کے محبوب ہونے کے لیے کافی ہے چہ جائیکہ یہ تمام اوصاف کسی ایک شخص میں جمع ہو جائیں تو کیا کہنا۔

مولانا نے اس کتاب کا سلیس اور آسان اُردو زبان میں ترجمہ کر کے عوام کی ہدایت کا دروازہ کھول دیا، ترجمہ کے اس عمل سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ کتاب کے مندرجات کو آپ کی تائید حاصل ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ عوام تک یہ مضامین پہنچیں تاکہ وہ پھر کسی غلط فہمی کا

شکار نہ ہوں۔ ترجمہ کا نمونہ یہ ہے:

''اس رسالہ میں حضرت معاویہؓ کی لڑائی کا بھی بیان اور ان شبہات کا بھی جواب ہے جن کی وجہ سے بہت سے اہل بدعت و ہوا نے ان کی بدگوئی کو جائز سمجھا ہے۔ یہ لوگ ناواقف ہیں یا ان کے دلوں میں عظمت نہیں ہے ان تاکیدی ممانعتوں کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے اصحاب کرام خصوصاً آپ کے سسرالی رشتہ داروں، آپ کے کاتبوں و نیز اُن لوگوں کے بُرا کہنے کے متعلق منقول ہیں جن کو آپ نے بشارت دی تھی کہ وہ عنقریب آپ کی امت کے بادشاہ ہوں گے[1]''

تنویر الایمان کے آخر میں مولانا نے ایک 'تبصرہ' بھی تحریر فرمایا ہے جس میں صحابۂ کرام کے بارے میں اہلسنّت کے عقائد اور قرآن مجید سے اس کی تائید اور دشمنان قرآن کی بعض تدلیسات و تلبیسات کا خاکہ کھینچا ہے جو اپنے اختصار اور جامعیت میں اپنی نظیر آپ ہے، اس ترجمہ کے دو ایڈیشن ہمارے سامنے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۳۲۶ھ میں النجم کے صفحات پر اس کی اشاعت ہوئی تھی، دوسری بار رمضان ۱۳۴۸ھ میں علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا، پھر اس کے متعدد ایڈیشن ہند و پاک سے برابر شائع ہوتے رہے ہیں اور اب بھی دستیاب ہو جاتے ہیں۔

۳۔ اوّل المومنین

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور تصنیف ازالۃ الخفاء کے مقصدِ دوم میں ایک فصل ''مآثر جمیلہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ'' کو بڑے مستند اور تحقیقی انداز میں تحریر کیا ہے[2]۔ اسی مآثرِ جمیلہ کا اُردو ترجمہ نہایت صاف اور سلیس زبان میں مولانا نے کیا ہے جس کا نام ''اوّل المومنین'' رکھا ہے۔ یہ ترجمہ النجم میں کئی قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔ راقم کو درمیان کی صرف ایک ہی دو قسطوں کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہو سکی ہے[3]۔

---

۱ تنویر الایمان ترجمہ تطہیر الجنان، مترجمہ مولانا لکھنویؒ، ص ۵-۴

۲ ازالۃ الخفاء، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، مقصد دوم، ص ۷ تا ۴۲

۳ النجم، ربیع الاوّل، ۱۳۶۲ھ

۴۔ اُردو ترجمہ اُسد الغابہ فی معرفۃ الصّحابہ (۱۰ جلدوں میں)

علامہ عز الدین علی بن محمد بن عبدالکریم جزری معروف بابن اثیرؒ[۱] نے ایک ضخیم کتاب مسمّٰی اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ مرتب کی تھی جس میں تقریباً ساڑھے سات ہزار صحابہؓ کرام کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے تھے۔ اس کتاب کا مکمل اُردو ترجمہ مولانا لکھنویؒ نے کیا تھا جو پہلے بالاقساط النجم لکھنؤ میں ۷؍رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ میں شائع ہونا شروع ہوا اور پھر مکمل ہو جانے کے بعد کتابی شکل میں بھی علیحدہ سے شائع ہوا۔ پوری کتاب کو ۱۰ جلدوں میں منقسم کیا گیا ہے جو بڑے سائز کے بارہ سو صفحات پر محیط ہے۔ اس کی آخری جلد ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوئی تھی۔ صحابہؓ کرام کے حالاتِ زندگی اور مناقب میں اُردو زبان کے اندر اس سے پہلے کوئی اور اتنی ضخیم اور مستند کتاب نہ تھی، اس عربی کتاب کو اُردو میں منتقل کر کے مولانا لکھنویؒ نے اُردو کے مذہبی اور تاریخی لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ آپ کی اس عظیم الشان خدمت کو اس وقت کے مشہور جرائد اور دیگر اہلِ علم حضرات نے خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ ترجمہ کے علاوہ مختلف مقامات پر آپ نے مفید حواشی بھی تحریر کیے ہیں۔ ترجمہ کا نمونہ حسب ذیل ہے:

> ''امابعد (واضح رہے کہ) کوئی علم علمِ شریعت سے زیادہ بزرگ نہیں ہے کیونکہ اسی کے سبب سے دنیا وآخرت کی بزرگی حاصل ہوتی ہے، پس جو شخص اس علم کے ساتھ آراستہ ہو وہ بیشک بہت نفع دینے والی تجارت اور باعزت و بلند مرتبہ تک پہنچ گیا ہے اور جو اس سے خالی ہوا وہ یقیناً نقصان میں رہا، اور اس علم میں اصل (علم) اللہ عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے مگر کتابِ بزرگ (قرآن مجید) تو متواتر ہے اس (کے کلام الٰہی ہونے) پر سب کا اجماع ہے، اس کے نقل کرنے والوں کے حالات بیان کرنے کی حاجت نہیں، باقی رہی سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو وہ البتہ اپنے راویوں کے حالات اور ان کے اخبار کی شرح کی محتاج

---

[۱] علامہ ابن اثیر جزریؒ جزیرہ ابن عمر میں ۱۱۶۰ء میں پیدا ہوئے، موصل اور بغداد میں تعلیم پائی اور ملک شام کی بھی سیاحت کی۔ آپ نے پوری زندگی ایک نجی عالم کی حیثیت سے گذار کر ۱۲۳۲ء میں بمقام موصل وفات پائی۔ آپ کی تالیفات میں اسد الغابہ کے علاوہ الکامل فی التاریخ، اللباب فی معرفۃ الانساب، تاریخ الدول الاتابکیہ، الجامع الکبیر فی البلاغہ، تحفۃ العجائب وطرفۃ الغرائب اور تاریخ موصل (نامکمل) بھی قابل ذکر ہیں۔

ہے، اور سب سے پہلے اس کے روایت کرنے والے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں اور وہ اپنے زمانہ میں نہ لکھے گئے اور نہ یاد کیے گئے جیسا کہ ان کے بعد والوں یعنی علماء تابعین وغیرہم کے ساتھ اس وقت تک کیا گیا، کیونکہ وہ دین کی مدد کی طرف اور کافروں کے جہاد کی طرف متوجہ تھے، اس وقت یہی بڑی مہم تھی کیونکہ اسلام کمزور تھا اور اہل اسلام (تعداد میں) کم تھے، پس ان میں سے ہر کسی کو اس کا جہاد، مجاہدۂ نفس اور انہماکِ عبادت اس کو معاش کی فکر یا کسی اور دوسرے کام میں مصروف ہونے سے روک دیتا تھا، ان میں ایسے لوگ نہ تھے جو کتابت جانتے ہوں مگر تھوڑے سے آدمی، اگر وہ اسی زمانہ میں محفوظ کر لیے جاتے تو یقیناً وہ اس سے بھی بہت زیادہ ہوتے جس قدر علماء نے ذکر کیا ہے[1]"

اس ترجمہ کی آٹھ جلدیں ہماری نظر سے گذری ہیں جس میں حصہ اول میں ۶۶۴ صحابہ کرام کا تذکرہ ہے، حصہ دوم میں ۶۶۳، حصہ سوم میں ۵۷۸، حصہ چہارم میں ۷۰۳، حصہ پنجم میں ۶۲۱، حصہ ششم میں ۲۴۸، حصہ ہفتم میں ۷۰۶، اور حصہ ہشتم میں ۵۹۱ صحابہ کا تذکرہ ہے اس طرح ہمارا اندازہ ہے کہ یہ کتاب دس جلدوں میں مکمل ہوئی ہوگی مگر آخر کے یہ دو حصے ہماری معلومات میں نہیں آسکے ہیں۔

۵۔ کراماتِ موسویّہ

گجرات کے ایک ولی کامل اور صاحبِ دل بزرگ حضرت شیخ موسیٰ جی ترکیسریؒ (۱۲۵۴-۱۳۰۹ھ) کے حالات میں یہ کتاب مولانا نے مرتب کی تھی۔ شیخ موسیٰ جیؒ کا تعلق سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے تھا، وہ مولانا نظام الدین باجوڑیؒ (م ۱۲۸۳ھ) کے مرید و خلیفہ تھے جن کو مولانا شیخ محمد جان شیخ الحرمؒ (م ۱۲۶۶ھ) سے خلافت حاصل ہوئی تھی اور وہ حضرت مولانا شاہ غلام علی مجددی قدس سرہٗ (م ۱۲۴۰ھ) کے مرید و مجاز تھے۔ شیخ موسیٰ جیؒ اپنے دور کے تارک الدنیا اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے جن کے متوسلین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ بانی مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کو بھی آپ سے ہی بیعت و خلافت کا شرف حاصل ہوا تھا۔

اس کتاب میں شیخ موسیٰ جیؒ اور ان کے مرشد مولانا نظام الدینؒ کے تفصیلی حالات درج

---

[1] ترجمہ اسد الغابہ، مولانا لکھنویؒ، ص ۱-۲، ضمیمہ ہفت روزہ النجم لکھنؤ

ہیں، کتاب کے آخر میں سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں کے مختصر احوال بھی مرقوم ہیں اور بعض مقامات پر تصوف کے بڑے اہم نکات کی تشریح بھی کردی گئی ہے۔اس کتاب کا سبب تالیف یہ ہے کہ شیخ موسیٰ جی رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب میں ایک عربی قصیدہ ان کے مرید خاص مولوی محمد بن احمد سامرودیؒ (م ۱۳۴۱ھ) نے لکھا تھا، ایک عرصہ کے بعد جب اس قصیدہ کو شائع کرانے کا ارادہ ہوا تو حضرت ممدوح کے فرزند گرامی مولوی حکیم غلام حسینؒ اور مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ کی خواہش پر اس قصیدہ کے ساتھ مولانا لکھنویؒ نے حضرت موسیٰ جی ترکیسری کے مفصل حالات اور ان کے مشائخ کا تذکرہ بھی شامل کر کے شائع کردیا۔اس دور کے مختلف اُردو اور فارسی کے شعراء نے حضرت موسیٰ جیؒ کی شان میں جو قصائد اور مناقب تحریر کیے تھے اور ان کے شجرۂ طریقت کو نظم کیا تھا ان سب کو بھی مولاناؒ نے اس کتاب میں شامل کیا ہے۔پوری کتاب ایک سو دس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، اس کے دو ایک نسخے راقم الحروف کے پاس بھی ہیں اور چند نسخے مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ اور دار المبلغین لکھنؤ کے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔

۶۔ الخطبۃ الشوقیہ فی حضرۃ المجدّدیہ

۱۳۵۰ھ میں جب مولانا منظور نعمانیؒ مدیر الفرقان لکھنؤ نے الفرقان کا ''مجدد الف ثانی نمبر'' نکالنے کا فیصلہ کیا تو جہاں انھوں نے اس کے لیے اور مشاہیر علماء سے مضامین کے لیے فرمائش کی وہیں مولانا لکھنویؒ سے بھی کچھ لکھنے کا اصرار کیا جس پر آپ نے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (م ۱۶۲۴ء) کے حالات اور خدمات پر مشتمل ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو الفرقان میں شائع ہوا۔حضرت مجددؒ پر ہر دور میں لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر یہ مقالہ اپنے اختصار کے باوجود انتہائی جامع اور کامل ہے، اس میں ہر بات کو خواہ وہ ذاتی حالات سے متعلق ہو یا علمی و دینی خدمات سے سب کو مکتوبات شریف کے حوالہ سے درج کیا گیا ہے اور ان مکتوبات کی اصل عبارتیں بھی نقل کی گئی ہیں۔مکتوبات کے علاوہ دوسری جو کتابیں آپ کے پیش نظر رہیں ان میں سے بھی کچھ کا ذکر آپ نے بطور حوالہ کیا ہے جیسے حضرات القدس مولفہ مولانا بدر الدین سرہندیؒ، برکات احمدیہ مولفہ مولانا محمد ہاشم کشمیؒ، روضۂ قیومیہ مؤلفہ مولانا محمد احسانؒ اور شیخ آدم بنوریؒ کی ایک تالیف جس کا نام درج نہیں ہے قابل ذکر ہے۔

اس مقالہ میں حضرت مجددؒ کے ظاہری اور باطنی کمالات کے علاوہ ہر ضروری بات اختصار کے ساتھ آ گئی ہے، اسی طرح سے ان کے زمانہ کا دینی وسیاسی ماحول اور اس کی روشنی میں ان کی خدمات، ان کی باقیات صالحات اور ان کے خلفاء کا تذکرہ بھی آ گیا ہے۔ آخر میں مکتوبات شریفہ کی افادیت تحریر کی ہے اور ان کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے، مکتوبات کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ آپ کی کھلی ہوئی کرامت ہے کہ ہر وقت کے مناسب ہدایات ان مکتوبات سے حاصل ہوتی ہیں۔ آج کل بدعت کا رواج زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ بدعت کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں ایک بدعت حسنہ اور دوسری بدعت سیئہ، مکتوبات قدسیہ میں متعدد مکتوبات اس کے متعلق ہیں جن میں آپ نے بڑی تحقیق سے تحریر فرمایا ہے کہ بدعت ہرگز حسنہ نہیں ہو سکتی[۱]''

یہ مقالہ سب سے پہلے الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر میں شائع ہوا تھا، بعد میں اِس کو مکتبہ فاروقیہ لکھنؤ کی طرف سے علیحدہ کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا تھا جو اڑتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ابھی چند سال پہلے یہ مقالہ ''تذکرہ امام ربّانی'' کے نام سے لکھنؤ سے پھر شائع کر دیا گیا ہے، اس طرح اس مقالہ کے متعدد ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں جو عام طور پر دستیاب ہیں۔

۷۔ اُردو ترجمہ تاریخ طبری (جلد اوّل)

یہ ترجمہ الامام العالم والحبر الکامل الفہامہ الورع التقی الزاہد الفرد الحافظ صاحب التفسیر المشہور علامہ محمد بن جریر بن یزید ابن کثیر الطبری[۲] کی معروف تاریخی کتاب ''تاریخ الامم والملوک''

۱۔ الخطبۃ الشوقیہ، مولانا لکھنویؒ، ص ۳۷

۲۔ علامہ طبری طبرستان کے پایۂ تخت امل میں ۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور بغداد میں اقامت اختیار کی، آپ کی یہ تالیف جس کا لائڈن ایڈیشن اس ضخیم تصنیف کی تلخیص ہے جو ملخص ہونے پر بھی تقریباً بارہ جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ پوری کتاب اس ایڈیشن سے کوئی دس گنا زیادہ ضخیم تھی۔ تمہید کے بعد کتاب کا آغاز بطریقوں، انبیاء اور قدیم ترین زمانہ کے حکمرانوں کی تاریخ سے ہوتا ہے پھر عہد ساسانی کے بعد عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے بعد خلفائے راشدین کی تاریخ آتی ہے، بعدہٗ تاریخ بنوامیہ اور اخیر میں تاریخ بنوعباس تحریر کی ہے۔ یہ کتاب جولائی ۹۱۵ء تک کے واقعات پر ختم ہوئی ہے لیکن اس کے بعد دوسرے مؤرخین نے اس کو جاری رکھا۔ اس تاریخ کے علاوہ ان کی چند اور تالیفات بھی ہیں جن میں جامع البیان فی تفسیر القرآن المعروف بہ تفسیر طبری، اختلاف الفقہاء، تہذیب الآثار (نامکمل) المسترشد فی علوم الدین اور القراءۃ لائق ذکر ہیں۔ علامہ طبری نے چوراسی سال کی عمر میں ۹۲۳ء میں بغداد میں وفات پائی۔

کے پہلے حصہ کا ہے۔ مولانا لکھنویؒ اپنی گوناں گوں مصروفیتوں کے باعث صرف تاریخ طبری جلد اول کا ہی ترجمہ کرسکے تھے جو ۱۳۳۲ھ سے النجم میں چھپنا شروع ہوا تھا اور پھر بعد میں الگ سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوا تھا۔ ترجمہ کے شروع میں آپ نے ایک تفصیلی دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں علم تاریخ کی تعریف، اس کے نتائج اور اس کے فوائد کے ساتھ ساتھ تاریخ طبری جیسی بے نظیر کتاب کا اُردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت واہمیت اور اس کے معتبر ومستند ہونے کے دلائل وشواہد بھی تحریر کیے ہیں۔ اس ترجمہ کے بعض خصوصی التزامات واہتمامات کے ذیل میں آپ نے لکھا ہے کہ ترجمہ میں مصنّف کا طرز بیان اور ان کی شانِ کلام برقرار رکھی گئی ہے اور لفظ ومحاورہ دونوں کی رعایت رکھتے ہوئے اس کا لحاظ رکھا جائے گا کہ مطلب پیچیدہ نہ ہونے پائے۔ مزید برآں ترجمہ کے دوران علامہ ابن اثیر جزریؒ کی تاریخ الکامل بھی سامنے رکھی جائے گی چنانچہ جو فوائد تاریخ الکامل سے لے کر اضافہ کیے گئے ہیں یا جس فروگذاشت کی انھوں نے اصلاح کی ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا بلکہ ترجمہ میں ان مضامین کو بطور ضمیمہ کے شامل کردیا جائے گا تاکہ یہ ترجمہ تاریخ طبری اور تاریخ الکامل دونوں کا جامع ہوجائے اور ناظرین کو دونوں جلیل القدر تاریخوں پر عبور حاصل ہوجائے۔ چنانچہ تاریخ طبری کے اوصاف بیان کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے:

> سوائے انبیاء کے اور کوئی دوسرا معصوم نہیں ہے...... کسی کتاب کے معتبر ومستند ہونے کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس شخص کے کلام میں یا کتاب میں کوئی غلطی نہیں ہے، معتبر ومستند ہونے کا مدار صرف قلت خطا اور کثرت صواب پر ہے...... اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں واقعات کو مع سند کے بیان کیا گیا ہے۔ پھر بھی اس قسم کی شاذ ونادر فروگذاشت سے اس کو پاک نہ سمجھنا چاہیے، جہاں اس قسم کی فروگذاشت ہوئی ہے وہاں میں اپنی کوشش سے کام لوں گا...... حافظ ابن ایثر جزریؒ مصنّف اُسد الغابہ نے اپنی تاریخ کامل اسی تاریخ طبری سے مرتب کی ہے اور اپنی تاریخ کے دیباچہ میں اس کی وجہ یہ ظاہر کی ہے کہ یہ کتاب سب کے نزدیک لائقِ اعتبار ہے اور اختلاف کے وقت اس کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ علامہ ذہبی نے بھی تذکرۃ الحفاظ میں اس کا تذکرہ نہایت پرزور الفاظ میں کیا ہے۔ (دیباچہ از مترجم)

ترجمہ میں صرف اس قدر تصرف کیا گیا ہے کہ اسانید کو اصل ترجمہ سے حذف کردیا گیا

ہے اور بسند ہ لکھ کر اخیر راوی پر اکتفا کیا گیا ہے البتہ بسندہ پر حاشیہ نمبر دے کر اس سند کے تمام رجال کے اسماء حاشیہ پر لکھ دیے گئے ہیں تا کہ اختصار بھی رہے اور فائدہ بھی فوت نہ ہو۔

ترجمہ کا نمونہ حسب ذیل ہے:

ہر طرح کی تعریف اللہ کے لیے سزاوار ہے جو ہر پہلے سے پہلا اور ہر پچھلے سے پچھلا ہے، (یعنی اس کی ذات پاک سب کے پہلے سے ہے اور سب کے بعد بھی باقی رہے گی) وہ ہر چیز پر قادر ہے بغیر (اس کے کہ اس کو) منتقل[1] ہونے کی (ضرورت پیش آئے) اپنی مخلوق کو اس نے بغیر شکل[2] اور مثال کے پیدا کیا ہے، وہ یکتا ہے اور ایک ہے بغیر گنتی[3] کے اور وہ ہر ایک کے بعد باقی رہنے والا ہے بغیر انتہا اور میعاد کے اسی کے لیے بڑائی اور عظمت اور نور اور عزّت، اور سلطنت اور قدرت ہے۔ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کی سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہو یا اس کی وحدانیت میں کوئی مثل ہو یا اس کی تدبیر میں کوئی اس کا معین اور مددگار ہو یا اس کا کوئی بیٹا ہو یا اس کی بی بی ہو یا اس کا کوئی ہمسر ہو، وہم اس کو نہیں گھیر سکتے اور قطر اس پر حاوی نہیں ہو سکتے، آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں، وہ بہت پاکیزہ اور باخبر ہے[4]۔"

پوری کتاب میں کل تین سو اٹھہتر صفحات ہیں اور ہر صفحہ پر حواشی بھی ہیں اس طرح یہ کتاب بہت اہم اور مفید ہو گئی ہے۔

۸۔ شجرۂ طیّبہ

اس رسالہ میں مولانا نے اپنے پیرانِ طریقت کا شجرہ اپنے متوسلین کے لیے مرتب کر کے شائع کیا تھا جس میں پورے سلسلۂ طریقت اور مذکورہ مشائخ عظام کے حالات درج ہیں، اس

---

[1] جو اشیاء کہ محدود ہوتی ہیں ان کو اکثر اس امر کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ اپنی جگہ سے منتقل ہوں لیکن باری تعالیٰ کی ذات چونکہ غیر محدود ہے لہٰذا انتقال وہاں متصور ہی نہیں ہو سکتا۔

[2] یعنی پہلے سے ان اشیاء کی کوئی شکل یا مثال قائم نہ تھی کہ اللہ نے اس مثال کو دیکھ کر پیدا کیا ہو۔

[3] جس طرح گنتی میں ایک دو ہوتے ہیں وہ اس طرح کا ایک نہیں ہے کیونکہ گنتی کا ایک بوجہ عروض عدد کے محدود ہوتا ہے۔

[4] ترجمہ تاریخ طبری جلد اوّل، ص ۸ دیباچہ از مؤلف، ضمیمہ النجم ۲۱ ر رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ

کے علاوہ طریقۂ نقشبندیہ کی افضلیت، اس کی تعلیمات، ذکر قلبی کا طریقہ، شرح مصطلحات ہشت گانہ جس پر اس طریقہ کی بنیاد ہے اور مشائخ سلسلہ کے تمام ختمات کی تفصیل بھی دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود اپنا بھی ختم تجویز فرمایا ہے۔ اس رسالہ میں مولاناؒ نے خود اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھے ہیں جو آپ کی اس سوانح کا اولین ماخذ ہے۔ آپ نے رسالہ کے آخر میں مفصل ختم خواجگان کے ساتھ ایک جدول بھی دی ہے جس میں مشائخ طریقت کی تاریخ و یوم وفات اور جائے مزار کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ پورا رسالہ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے جو مہدی خاں صاحب سوداگر مرحوم، محلہ ٹکیٹ گنج جدید، لکھنؤ کی فرمائش پر مرتب کر کے ۱۹۴۵ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع کیا گیا تھا۔

۹۔ راحۃ القلوب بذکر المحبوب (قلمی)

اس اہم تالیف کو آپ نے اپنے پیرانِ طریقت کے تفصیلی حالات مرتب کرنے کے ارادہ سے شروع کیا تھا مگر اسے پایہ تکمیل کو نہ پہنچا سکے اور یہ ادھوری رہ گئی۔ ضمناً اس میں اپنے حالات اور اپنے خاندانی بزرگوں کے احوال بھی مرتب کرنے کا پروگرام تھا۔ اس کے ابتدائی صفحات ہم نے اپنے ذخیرہ میں بطور تبرک محفوظ کر رکھے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس تالیف کو آپ نے مندرجہ ذیل چار وصل (ابواب) میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا تھا:

وصل اوّل: جس میں خود اپنا تذکرہ ہے۔

وصل دوم: جس میں اپنے والد ماجدؒ کے حالات درج کرنے تھے۔

وصل سوم: جس میں اپنے پیران طریقت کے حالات درج کرنا تھے۔

وصل چہارم: جس میں فقر و درویشی یعنی تصوّف کے متعلق کچھ ضروری امور، طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ کی افضلیت اور ذکر قلبی کا طریقہ لکھنا تھا۔

ہمارے پاس جو اوراق ہیں ان میں اپنے ابتدائی حالات کم و بیش سب تحریر کر دیئے ہیں جو نہایت قیمتی ہیں۔ اگر یہ کتاب اپنے پروگرام کے مطابق مرتب ہو جاتی تو آج ہمارے ہاتھوں میں ایک نہایت مستند تاریخ و تذکرہ ہوتا۔

تائید حق

ا۔ ابوالائمہ کی تعلیم (تعلیمات حضرت علی مرتضیٰؓ)

یہ رسالہ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ونیز دوسرے ائمہ اہل بیت کی ان تعلیمات و ارشادات پر مبنی ہے جن سے خلفاء ثلاثہ اور دوسرے اکابر صحابہ کے ساتھ ان کے اخلاص ومحبت اور نہایت خوشگوار باہمی روابط کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ اس رسالہ میں مسلمانوں اور شیعوں دونوں کی معتبر ومستند کتابوں سے ان کی تعلیمات کو نقل کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسوۂ مرتضوی کی پیروی مذہب اہلسنّت کو اختیار کیے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی۔ رسالہ کے ابتدائی حصّہ میں اہلسنّت کی کتب معتبرہ سے حضرت علی مرتضیٰؓ کے وہ اقوال وفرمودات منتخب کر کے پیش کیے گئے ہیں جن سے حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کی افضلیت وفوقیت ظاہر ہوتی ہے چنانچہ حضرت علیؓ سے مروی وہ حدیث بھی نقل کی گئی ہے جو کتب معتبرۂ اہلسنّت میں اسّی سندوں کے ساتھ منقول ہے جس میں آپ (حضرت علیؓ) نے فرمایا کہ خیر الامة بعد نبیها ابوبکرؓ ثم عمرؓ یعنی امت میں نبیؑ کے بعد سب سے بہتر ابوبکرؓ ہیں اور پھر ان کے بعد عمرؓ یہ روایت علم حدیث کی سب سے زیادہ معتبر کتاب صحیح بخاری میں بھی موجود ہے۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کے علاوہ حضرات حسنینؓ، سیدنا امام زین العابدینؓ، امام محمد باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ سے بھی ان تینوں خلفاء خاص کر حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے بہت سے فضائل منقول ہیں، شیعوں کی کتب معتبرہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نہایت اہم معاملات میں شیخین کو مفید مشورے بھی دیا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ مفید مشورے اپنوں ہی کو دیئے جاتے ہیں دشمنوں کو نہیں، اسی طرح آپ نے حضرت عثمان غنیؓ کے فضائل شمار کرتے وقت ان کے داماد رسولؐ ہونے کی فضیلت کی بھی تصدیق فرمائی ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کے یکے بعد دیگرے حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آئی تھیں، یہ تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت ہے مگر مخالفین اہلسنّت اپنے مذہب کے بنیادی اصول سے کچھ ایسے مجبور ہیں کہ ان تاریخی واقعات کا بھی صاف انکار کر دیتے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں کرتے کہ اس

انکار سے ان کی کتابوں پر اور حضرت علیؓ کی صداقت پر کیا حرف آتا ہے۔

شیخین کے ساتھ اور بالخصوص حضرت عمر فاروقؓ کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰؓ کی محبت و مودت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی بیٹی حضرت ام کلثوم کا عقد حضرت عمرؓ سے کر دیا تھا، یہ معاملہ مخالفین صحابہؓ کے لیے بڑا دردِ سر ہے، ان سے نہ انکار کرتے بنتا ہے اور نہ اقرار۔

اس رسالہ میں مولانا نے شیعی کتب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے بلا کسی تاخیر و تامل کے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت پر بیعت کرلی تھی، وہ ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے اور ہمیشہ ان دونوں کے ساتھ صلح و محبت کا معاملہ رکھتے تھے۔ رسالہ کے آخر میں مخالفین اہلسنّت کے چند خصوصی عقائد کا بھی ذکر کیا ہے جیسے عقیدۂ تحریف قرآن، تقیہ، عصمت ائمہ، سبِّ صحابہؓ، عقیدۂ بدا اور متعہ وغیرہ کی تشریح کی ہے۔ اب تک اس رسالہ کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۲۔ کشف الغطاء عن السنّۃ البیضاء (اُردو ترجمہ ازالۃ الخفاء حصہ اوّل)

یہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کی مشہور اور اہم فارسی کتاب ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء کے مقصد اوّل کا نفیس اردو ترجمہ ہے۔ ازالۃ الخفاء حضرت شاہ صاحبؒ کی بے حد مقبول تصنیف ہے جس میں آپ نے خلفاء راشدینؓ کی حقیتِ خلافت کو کتاب اللہ اور احادیث نبویہ سے ثابت کیا ہے اور اسی ضمن میں شریعت مقدسہ کے بنیادی اصول اور اسلامی مملکت کے قواعد جہاں بانی بھی پوری تفصیل کے ساتھ تحریر میں آگئے ہیں جس سے کتاب کی افادیت دوچند ہوگئی ہے۔ پوری کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ کا نام مقصد اوّل ہے اور دوسرے حصہ کا نام مقصد دوم ہے۔ مقصد اوّل میں آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور دلائل عقلیہ سے خلفاء راشدینؓ کی خلافتوں کا برحق ہونا ثابت کیا گیا ہے اور دوسرے حصہ میں خلفاء راشدینؓ کے کارناموں کا بیان ہے۔ ازالۃ الخفاء کے بارے میں خود حضرت مترجم نے اپنے دیباچہ میں ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"یہ کتاب ازالۃ الخفاء حضرات خلفاء راشدینؓ کی بہترین سیرت اور بہترین تاریخ ہونے کے

علاوہ بہت سے دوسرے دینی علوم و معارف کا خزانہ ہے اور بلاشبہ مصنفؒ کی عمدہ تصانیف میں سے ہے۔ علماء کاملین نے شہادت دی ہے کہ فی الحقیقت یہ کتاب اپنے موضوع میں بے نظیر ہے۔ نہ حضرت مصنفؒ سے پہلے کسی نے ایسی کتاب اس موضوع پر لکھی اور نہ ان کے بعد، چنانچہ علامہ لکھنویؒ کی عبارت ابھی نقل ہو چکی ہے[1] اس کتاب کی عظمت خود اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتی ہے[2]۔"

ازالۃ الخفاء کے شروع میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کتاب کے لکھنے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"امابعد کہتا ہے فقیر حقیر ولی اللہ عفی عنہ کہ اس زمانہ میں بدعت تشیع آشکار ہو گئی ہے اور عام لوگوں کے دل ان کے شبہات سے متاثر ہو گئے ہیں اور اس ملک کے اکثر لوگ خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خلافت کے ثبوت میں شک کرنے لگے ہیں، لہٰذا توفیق الٰہی کی روشنی نے اس بندۂ ضعیف کے دل میں ایک علم پیدا کیا جس سے یقین کے ساتھ معلوم ہوا کہ خلافت ان بزرگوں کی ایک اصل ہے اصول دین سے، جب تک لوگ اس کو مضبوطی سے نہ پکڑیں گے کوئی مسئلہ مسائل شریعت کا مضبوط نہ ہوگا...... لہٰذا جو شخص اس اصل کے توڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ فی الحقیقت تمام فنونِ دینیہ کو مٹانا چاہتا ہے[3]۔"

جس خطرہ کا احساس حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عہد میں کیا تھا وہی خطرہ مولانا لکھنویؒ کے دور میں بھی بعینہٖ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مہیب شکل میں ہندوستان میں محسوس کیا جا رہا تھا۔ اسی خطرہ کے پیش نظر مولانا لکھنویؒ نے اس کتاب کا ترجمہ اُردو میں کیا تا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

ایک عرصۂ دراز سے ازالۃ الخفاء نایاب ہو چکی تھی، بس چند قدیم کتب خانوں میں ہی اس

---

[1] علامہ لکھنویؒ یعنی حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب التعلیق المجد کے مقدمہ میں حضرت دہلویؒ کے حالات و تصانیف کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی تصانیف کے ذیل میں ازالۃ الخفاء کے بارے میں آپ نے لکھا ہے کتاب عدیم النظیر فی بابہ یعنی اپنے موضوع میں بے نظیر کتاب ہے، ازالۃ الخفاء کے اس ترجمہ کے ساتھ التعلیق المجد کی اس پوری عبارت کو بھی حضرت مترجمؒ نے ترجمہ کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔

[2] کشف الغطاء، ص ۴ [3] کشف الغطاء، ص ۶-۷

کے قلمی نسخے ملتے تھے۔ سب سے پہلے منشی جمال الدین خاںؒ (م۱۸۸۱ء) مدار المہام ریاست بھوپال نے بڑے اہتمام سے ۱۸۶۹ء میں مطبع صدیقی بریلی سے زیر نگرانی مولانا محمد احسن نانوتویؒ (۱۸۹۵ء) اس کو طبع کرایا تھا۔ اگرچہ اس کی طباعت میں صحت وصفائی کا بہت اہتمام کیا گیا تھا مگر پھر بھی بہت سی غلطیاں ٹھیک ہونے سے رہ گئی تھیں اور بعض مقامات پر حواشی بھی صحیح نہیں درج ہوسکے تھے جن کی طرف حضرت مترجمؒ نے اپنے ایڈیشن میں نشاندہی کی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ نسخہ بھی کمیاب ہوگیا اسی لیے ایک عرصہ سے اصل متن اور اس کے ترجمہ کی بڑی ضرورت محسوس کی جارہی تھی چنانچہ ۱۹۰۶ء میں منشی انشاء اللہ نے حمیدیہ اسٹیم پریس لاہور سے ازالۃ الخفاء کا ایک اُردو ترجمہ شائع کیا جو غیر حامل المتن تھا اور اس میں کتاب کی مسخ وتحریف اس بیدردی کے ساتھ کی گئی تھی کہ اہل ایمان کے قلوب کو سخت صدمہ پہنچا۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مولانا نے ازالۃ الخفاء کو اُردو جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور اس کے پہلے حصّہ یعنی مقصد اوّل کا ترجمہ کرکے ۱۳۲۹ھ میں اپنے پریس عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع کردیا جو "۹×"۱۲ اسائز کے ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ کے حوض میں اُردو ترجمہ اور حاشیہ پر اصل متن اور پھر حاشیہ کے باہر ضروری حواشی درج ہیں۔ اس طرح ترجمہ کے ساتھ ساتھ اصل کتاب کا متن بھی نہایت صحت اور صفائی کے ساتھ محفوظ ہوگیا ہے۔ ترجمہ کے آغاز میں حضرت مترجم نے اپنا ایک دیباچہ بھی تحریر کیا ہے جس میں کتاب کی اہمیت، اس کی کمیابی اور مطبوعہ نسخہ کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے اس کے بعد حضرت مصنفؒ کے مختصر حالات بھی درج کیے ہیں۔ ازالۃ الخفاء کے زیر نظر ترجمہ میں جن چیزوں پر خاص طور سے توجّہ کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ ترجمہ میں توضیح مطلب کا لحاظ اور عبارت کی سلاست وشگفتگی کی پوری رعایت رکھتے ہوئے مصنف کے اصل الفاظ کی پابندی بھی برقرار رکھی گئی ہے۔

۲۔ جن آیتوں کا ترجمہ مصنفؒ نے نہیں کیا تھا ان کا ترجمہ بھی آیت کا اوّل لفظ لکھ کر کردیا گیا ہے۔

۳۔ احادیث کے ترجمہ میں شروح حدیث سے پوری مدد لی گئی ہے اور شرح طلب احادیث کی شرح حاشیہ پر لکھ دی گئی ہے۔

۴۔ مکرر احادیث میں حاشیہ پر بتادیا گیا ہے کہ یہ حدیث فلاں صفحہ پر بھی آچکی ہے وہاں دیکھی جائے۔

۵۔ عربی زبان کے وہ الفاظ جن کا ترجمہ دو ایک لفظ میں نہیں ہوسکتا تھا یا اس کے ترجمہ کرنے سے فصاحت میں فرق آنے کا اندیشہ تھا وہاں ترجمہ میں وہ الفاظ اسی طرح قائم رکھے گئے ہیں اور حاشیہ پر انھیں حل کر دیا گیا ہے۔

۶۔ جس مقام پر مصنّف نے کتب شیعہ سے کوئی عبارت نقل کی ہے وہاں صفحہ وسطر کا حوالہ حاشیہ پر بڑھا دیا گیا ہے اور اگر کوئی مضمون مصنّف نے کتب اہلسنّت سے نقل کیا ہے لیکن مترجم کی نظر سے کتب شیعہ میں بھی گزرا ہے تو حاشیہ پر کتب شیعہ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔

۷۔ اگر کسی مقام پر مصنّف کے استدلال کو مزید قوت پہنچانے کے لیے شواہد وغیرہ کی ضرورت پیش آئی ہے یا شیعوں کی طرف سے کسی مقام پر کوئی اعتراض وارد ہوا ہے تو مترجم نے اس کا دفاع بھی کیا ہے اور ان مضامین کو حاشیہ پر بڑھا دیا گیا ہے۔

۸۔ طبع اوّل کے محشی و مصحح نے جس مقام پر اصل کتاب کے الفاظ تبدیل کر دیئے تھے یا حاشیہ صحیح نہیں لکھا تھا اس کا اتباع نہیں کیا گیا ہے بلکہ جو صحیح سمجھا گیا وہی اختیار کیا گیا ہے، جہاں کہیں ایسا ہوا ہے وہاں حاشیہ پر اس کا اشارہ کر دیا گیا ہے۔

ان خصوصیات کی وجہ سے مولانا کا یہ ترجمہ بے حد پسند کیا گیا۔ اس ترجمہ سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو مصنّف کی اصل کتاب محفوظ ہوگئی اور دوسرے یہ کہ ترجمہ کی مدد سے خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی اس کے مضامین عالیہ سے واقف ہو گئے۔ مولانا علیہ الرحمہ نے پوری ازالۃ الخفاء کا ترجمہ مکمل کر لیا تھا مگر اشاعت صرف مقصد اول کی ہی ہو سکی تھی، مقصد دوم مسودہ کی شکل میں تھا جس کی کتابت بھی ہو چکی تھی مگر اشاعت کی نوبت نہیں آئی، کاش یہ حصّہ بھی ترجمہ کے ساتھ چھپ کر شائع ہو جاتا تو عالم اسلام پر ایک احسان عظیم ہوتا۔

۳۔ افاضۃ العینین علیٰ شہادۃ الحسنین ملقب بہ تحقیقی شہادت نامہ

عام طور پر محرم کے مہینہ میں خواتین اور کم پڑھے لکھے مسلمانوں میں یہ رواج ہے کہ واقعۂ کربلا کی یاد تازہ کرنے کے لیے گھروں میں ذکر شہادت کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے کتب فروشوں کے یہاں ''شہادت نامہ'' کے نام سے مختلف لوگوں کی مرتب کردہ کتابیں ملتی ہیں جو اکثر و بیشتر غیر معتبر، ضعیف اور موضوعہ روایات پر مشتمل ہوتی ہیں، جن کے پڑھنے سے تو

نہ پڑھنا ہی زیادہ بہتر ہے، یوں بھی شرعی نقطۂ نظر سے اس مخصوص زمانہ میں اس طرح کے شہادت نامہ پڑھنے کی کوئی فضیلت بھی نہیں آئی ہے اور نہ ہی اس کے متعلق کوئی حکم ہے لیکن ان شہادت ناموں کا انتساب جن ذواتِ مقدسہ سے کیا جاتا ہے ان کی عظمت و بزرگی میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان گرامی قدر شخصیتوں کی یاد تازہ کرنے کے لیے اگر کسی کا دل چاہے تو کم از کم اس کو اس حادثۂ عظمٰی کے متعلق صحیح اور معتبر تاریخ اور مستند احادیث سے باخبر کردیا جائے تاکہ کسی قسم کی غلط باتیں عقیدہ کا جزو نہ بن سکیں چنانچہ خود حضرت مولف اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''اس شہادت نامہ کے لکھنے کی غرض دو ہیں اوّل یہ کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ریحانتین کی مدح سرائی اور ان کا ذکر جمیل شاید پسندیدۂ بارگاہِ الٰہی ہو جائے اور اس آشفتۂ روزگار کے لیے وسیلۂ نجات بن جائے، دوم یہ کہ مروجہ شہادت ناموں سے بوجہ غیر معتبر روایتوں اور خلاف شریعت مضامین یا اسی قسم کی دوسری خرابیوں سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اور ثواب کے بدلے جو عذاب کا سامان ہو رہا ہے اس کا سدِ باب ہو جائے[1]''

پورے رسالہ کو خلفاء راشدینؓ کے اعداد کے لحاظ سے چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل چند ضروری مسائل شرعیہ جن کا لحاظ بزرگان دین کے ذکر کی ہر تقریب میں رکھنا ضروری ہے، بغیر اس کے ایسی محافل سے ہرگز کسی ثواب کی امید نہیں ہے۔ باب دوم شہادت کی فضیلت اور شہداء کے مراتب کا بیان۔ باب سوم سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بیان۔ باب چہارم سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت کا بیان۔ ابتداءً یہ رسالہ النجم لکھنؤ میں قسط وار شائع کیا گیا تھا اور پھر بعد میں اس کو علیحدہ کتابی صورت میں بھی طبع کرادیا گیا تھا مگر راقم الحروف کی نظر سے یہ پورا رسالہ نہیں گذرا بلکہ اس کی صرف دو قسطیں ہی دیکھنے کو مل سکی ہیں۔ یہ رسالہ یقیناً اس موضوع پر نہایت اہم رسالہ ہوگا، کاش یہ پورا اور مکمل رسالہ کہیں مل جاتا تو اس کی دوبارہ اشاعت کی جا سکتی تھی۔

۴۔ احیاء المیت فی تحقیق الآل واہل البیت

یہ دس صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ ہے جس میں لفظ ''آل'' اور ''اہل بیت'' کے معنی کی

۱؎ افاضۃ العینین مشمولہ النجم لکھنؤ، ۷ رمحرم ۱۳۳۲ھ مطابق ۶ ردسمبر ۱۹۱۳ء

تحقیق عربی لغت اور آیات قرآنیہ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ علماء شیعہ لفظ آل اور ''اہل بیت'' سے اولاد کے معنی لینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ عوام کو مغالطہ میں ڈالا جا سکے اور اولاد رسولؐ کے مقابلہ میں صحابہ کرام کی عظمت و رفعت مسلمانوں کے دلوں میں کم ہو جائے اور قرآن مجید تعلیمات نبوت اور دلائل نبوت سب مشکوک ہو جائیں، چونکہ ان چیزوں کے چشم دید گواہ صحابہ کرام ہیں ہیں لہٰذا ان کے مقابلہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا مرتبہ بڑھا کر اس بات کا موقع حاصل کیا جائے کہ چند لوگوں کو آپ کا ہم رتبہ بتا کر عقیدۂ ختم نبوت کو ایک لفظ مہمل قرار دے دیا جائے، چنانچہ اکثر ناواقفوں کو یہ کہہ کر بہکایا جاتا ہے کہ ہمارے مذہب کی بنیاد محبتِ آل رسول اور اتباعِ رسول پر ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نماز میں جو درود پڑھا جاتا ہے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی آل پر بھی درود بھیجا جاتا ہے اور آل کے سوا کسی دوسرے کا کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا یہ معلوم ہوا کہ دین میں سوا محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے کسی تیسرے کی کوئی بزرگی ثابت نہیں ہے۔

اس رسالہ کو حضرت مؤلفؒ نے دو باب اور ایک خاتمہ پر مرتب کیا ہے۔ باب اوّل میں لفظ ''آل'' کی تحقیق اور باب دوم میں لفظ ''اہل بیت'' کی تحقیق کی گئی ہے اور خاتمہ میں اس مبحث کے کچھ فوائد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ پورا رسالہ دراصل مولانا لکھنویؒ کی ایک تقریر کا تحریری قالب ہے جو انھوں نے دارالمبلغین لکھنؤ کے ایک درس میں کی تھی جس کو بعد میں ادارہ کے کارکنوں نے نوٹ کر کے رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا۔

آپ کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے کہ آل اور اہل بیت کے معنی اولاد کے نہیں ہیں بلکہ آل سے مراد پیروی کرنے والے اور تعلق رکھنے والے کے ہیں چونکہ اولاد بھی اکثر و بیشتر اپنے باپ دادا کی پیروی کرنے والی اور ان سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہے اس لیے اس کا اطلاق بھی اس پر ہوتا ہے لہٰذا جب کسی لفظ کے دو معنی ہوں تو قرینہ جس کا مقتضی ہوگا وہی معنی لیے جائیں گے۔ آپ نے اپنے قول کے ثبوت میں لغات عربی میں منتہی الارب صراح، مفردات امام راغب اصفہانیؒ اور مجمع بحار الانوار علامہ محمد طاہر گجراتیؒ کے حوالہ سے اور متفرق آیات قرآنیہ سے یہی دلائل دیئے ہیں کہ آل کا لفظ متبعین اور پیروی کرنے والوں کے لیے آیا ہے۔ اگر کہیں اولاد کے معنوں میں استعمال ہوا بھی ہے تو مطیع و فرمانبردار اولاد کے لیے آیا ہے۔ اسی طرح اہل بیت کے

معنی وہی لیے گئے ہیں جو عام عربی لغات میں ہیں یعنی زوجہ کے لیے چنانچہ مولانا نے عربوں کے محاورے اور قرآن مجید کی آیات سے ثابت کیا ہے کہ اہل بیت سے مراد ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

پورا رسالہ راقم الحروف کی نظر سے صرف رسالہ ''الداعی'' لکھنؤ کے شمارہ میں گذرا ہے، علیحدہ سے اس کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوسکا۔[1]

۵۔ باقیات صالحات فارسی ترجمہ آیات بینات

یہ کتاب نواب محسن الملک مولوی سیّد محمد مہدی علی خاں[2] کی مشہور ومعروف کتاب 'آیات بینات' کے حصہ اوّل کا فارسی ترجمہ ہے۔ تردید شیعیت میں یہ وہ مشہور اور عظیم کتاب ہے جس کا

---

[1] ماہنامہ ''الداعی''، لکھنؤ، جمادی الآخر ۱۳۵۹ھ

[2] نواب محسن الملک سیّد مہدی علی خاں بن سیّد ضامن علی ۱۸۲۷ء میں اٹاوہ، یوپی کے ایک شیعہ خاندان میں پیدا ہوئے، جب کچھ بڑے ہوئے تو مکتب میں بٹھادیے گئے، آپ نے بڑی محنت اور ذہانت سے تعلیم حاصل کی، یہاں تک کہ ۱۷-۱۸ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت کرلی اور فارسی زبان وادب میں درجۂ امتیاز حاصل کرلیا۔ انگریزی زبان بھی اتنی جانتے تھے کہ اخبارات وغیرہ خود پڑھ کر سمجھ لیتے تھے۔ تعلیم کے بعد حصولِ معاش کے لیے دس روپیہ ماہوار پر سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ پہلے کلرک ہوئے، پھر اہلمد، سررشتہ دار، تحصیلدار اور پھر ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ۲۲ سال کی عمر میں مذہب شیعہ کو ترک کرکے راسخ العقیدہ مسلمان ہوگئے۔ ۱۸۷۴ میں سرسالار جنگ نے اُنھیں بارہ سو روپیہ ماہوار پر حیدرآباد بلالیا، وہاں اُنھیں ریونیو سکریٹری اور فائنانشل وپولیٹکل سکریٹری بنایا گیا اور ان کی خدمات کے صلہ میں 'محسن الدولہ'، 'محسن الملک' اور 'منیر نواز جنگ' کے خطابات سے بھی نوازا گیا۔ ۱۸۹۳ء میں وہ حیدرآباد سے پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے اور سرسیّد مرحوم کے ساتھ قومی خدمت اور کالج کے انتظام وانصرام میں مصروف ہوگئے۔ سرسیّد کے انتقال کے بعد آپ ہی نے ان کی نیابت کی اور کالج کو سنبھالا۔ ان کے دَور میں کالج کو مالی استحکام نصیب ہوا اور اس کی عظمت ورفعت بڑھی، مسلمانوں کو سیاسی حقوق ملے اور ان کی پولیٹکل حیثیت کو تسلیم کیا گیا۔ مسلسل ملّت کی فلاح وترقی کے کام کرنے سے ان کی صحت خراب رہنے لگی جس کے نتیجے میں ۱۶/ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ان کی وفات ہوگئی۔

آیاتِ بینات کے علاوہ نواب محسن الملک مرحوم کی دوسری تصانیف میں رسالہ میلاد شریف، قانونِ مال، قانون فوجداری، کتاب المحیط والشوق، تقلید اور عمل بالحدیث اور مختلف مضامین وتقاریر کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں، مگر ان کی شہرت آیاتِ بینات ہی کی وجہ سے زیادہ ہوئی۔ شیعوں کی طرف سے اس کے جواب میں دو جلدوں میں ایک کتاب ''آیاتِ محکمات'' کے نام سے شائع کی گئی تھی، مگر دونوں کتابوں کے طرزِ بیان اور طریقۂ استدلال کو اگر ملاکر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آیاتِ محکمات کے مصنف نے گویا منہ چڑھایا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تحفۂ اثناعشریہ کے بعد یہ کتاب نہایت اہم ہے۔ سب سے پہلے یہ کتاب ۱۸۷۰ء میں چھپی تھی پھر اس کے بعد متعدد ایڈیشن ہر دَور میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

صحیح جواب آج تک علماء شیعہ نہ دے سکے۔اس کتاب میں خود مذہب شیعہ کی کتب اوران کے علماء کے اقوال سے صحابۂ کرام کے فضائل اور خلافتِ راشدہ کو برحق ثابت کیا گیا ہے،اس کے علاوہ نکاح حضرت ام کلثومؓ اور مسئلہ فدک پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اس پہلی جلد میں دیباچہ اور تمہید کے بعد صحابہ کی فضیلت میں پانچ مستند دلیلیں پیش کی گئی ہیں اور توریت وانجیل کے علاوہ مختلف شواہد نقلی تحریر کیے گئے ہیں اور سات مہتم بالشان آیاتِ قرآنیہ سے صحابہ کی فضیلت میں استدلال کیا گیا ہے۔اس کے بعد شیعانِ عبداللہ بن سبا کے اعتراضات اوران کے جوابات تحریر کیے گئے ہیں۔صحابہ کی فضیلت میں ائمہ کرام کی شہادتیں بیان کرنے کے بعد تابعین کی فضیلتیں اوران کی نشانیاں بھی بیان کی گئی ہیں،آخر میں فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطابؓ کے نکاح حضرت ام کلثومؓ بنت حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کا تفصیلی ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔

آیات بینات جلد اول کے فارسی ترجمہ کے بعد حضرت مولانا لکھنویؒ نے اسی کے ساتھ لگ بھگ دوسو صفحات پر مشتمل ''تکملۂ مفیدہ'' کے نام سے ایک اور رسالہ فارسی زبان میں تحریر کر کے لگا دیا ہے۔ہمارے خیال میں یہ تکملہ حضرت لکھنویؒ کے رد شیعیت کے تمام کاموں کا نچوڑ ہے۔اس کو پڑھنے کے بعد اس مذہب کی اصل حقیقت اور پھر اس سلسلہ میں مولانا کی مکمل تحقیقات کا علم ہو جاتا ہے۔

۶۔ مدحِ صحابہ کی مخالفت میں
آیتِ قرآنی سے غلط استدلال اور اس کا جواب

جس زمانہ میں لکھنؤ میں تحریک مدح صحابہ اپنے شباب پر تھی انہی ایام میں بعض گوشوں سے اس کی مخالفت میں بھی آواز اٹھائی گئی تھی جس کی بنا پر اپنے حلقوں میں انتشار پیدا ہو رہا تھا چنانچہ مولوی حکیم عبدالباری انصافی گونڈویؒ نے اس مسئلہ میں کچھ سوالات مرتب کر کے مولانا لکھنویؒ کی خدمت میں بطور استفسار پیش کیے تھے جو یہ تھے:

۱۔ کیا مدح صحابہ کا اعلان بالجہر واجب ہے؟

۲۔ کیا شریعت میں مدح صحابہ کے لیے کوئی صاف اور واضح حکم ہے؟

۳۔ جلوس مدح صحابہ کی ضرورت اور اس کی افادیت کے شرعی دلائل کیا ہیں؟

اس رسالہ میں انہی سوالات کے بالتفصیل جوابات حوالوں کے ساتھ درج کیے گئے ہیں جن سے ان تمام اشکالات کی تردید اور رسائل کی تشفی ہوگئی۔ سب سے پہلے یہ رسالہ شاہی پریس لکھنؤ سے اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اب اخیر میں اس کو بعض دوسرے رسائل کے ساتھ مولوی سید علی مطہر نقوی امروہوی نے نومبر ۱۹۹۳ء میں کراچی سے بنام ''مدح صحابہ ایجی ٹیشن کی علمی و دینی حیثیت'' دوبارہ شائع کردیا ہے۔

۷۔ مدح صحابہ شیعوں کی معتبر کتابوں سے

لکھنؤ میں شیعہ سنّی اختلافات جب شروع ہوئے تو مخالفین صحابہ کی طرف سے یہ بات بار بار دہرائی جاتی تھی کہ ''مدح صحابہ'' ہی کی وجہ سے یہاں کشیدگی پیدا ہوتی ہے لہٰذا اس کو بند کرایا جائے۔ اہلسنّت کا کہنا تھا کہ صحابہ کرام کی تعریف وتوصیف بیان کرنا ہمارا مذہبی حق ہے اسے بند نہیں کیا جاسکتا۔ صحابہ کرام کے جو احسانات اسلام اور مسلمانوں پر ہیں ان کا حق اب اسی طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ ان کی مدح وثنا کی جائے اور ان کے لیے دُعاءِ خیر کی جائے چنانچہ ہر دور میں یہ کارِ خیر حالات اور رسم و رواج کے مطابق انجام دیا جاتا رہا ہے۔ جب لکھنؤ میں شیعہ سنّی اختلافات زیادہ بڑھے تو حکومت یوپی نے ۱۹۳۷ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جس کو السپ کمیشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کمیشن کے سامنے بھی سنّیوں کی طرف سے یہ کہا گیا کہ مدح صحابہؓ کسی کی دل آزاری کے لیے نہیں بلکہ اپنے مذہبی فریضہ کے طور پر کی جاتی ہے، اس کے ثبوت میں جہاں اور بہت سی دلیلیں پیش کی گئی تھیں ان میں خود شیعی کتابوں سے بھی صحابہ کرام اور خلفاء راشدین کی مدح وستائش کی مثالیں بھی دی گئی تھیں کیونکہ جو سچ ہوتا ہے وہ زبان وقلم پر بھی خود بخود بے اختیار آجاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا لکھنویؒ نے معتبر شیعی کتب سے صحابہ کرام کے ذکر خیر کی بہت سی مثالیں جمع کر کے ایک رسالہ کی شکل میں کمیشن کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا تھا۔ پچیس تیس صفحات پر مشتمل یہ رسالہ بعد میں النجم کے شماروں میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس رسالہ میں جن کتب شیعہ کے حوالے دیئے گئے تھے ان میں تفسیر قمی مرتبہ علی بن ابراہیم قمی، کشف الغمہ عن معرفۃ الائمہ مولفہ علی بن عیسیٰ اردبیلی، احتجاج طبرسی، مجالس المومنین مرتبہ قاضی نور اللہ شوستری، بحار الانوار شریف مرتضٰی، ذوالفقار از مولوی دلدار علی عفراں مآب، نہج البلاغۃ، روضۂ کافی وفروع کافی از یعقوب کلینی، اساس الاصول، ناسخ التواریخ، کتاب المآثر والآثار از مرزا سیّد مہدی

ایران، شاہنامہ فردوسی، تفسیر مجمع البیان علامہ طبرسی، شرح نہج البلاغۃ علامہ ابن میثم بحرانی، کتاب معانی الاخبار ابن بابویہ قمی، تفسیر امام حسن عسکری، صحیفۂ کاملہ امام زین العابدین اور حملۂ حیدری از علامہ باذل ایرانی وغیرہ لائق ذکر ہیں۔ یہ مطبوعہ رسالہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

۸۔ ارشاد الامم بجواب ''مصباح الظلم''

مصباح الظلم کے مصنف نواب مولوی امداد امام اثرؔ عظیم آبادی تھے، اس کے معتبر و مستند ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ مولوی نجم الحسن مجتہد لکھنؤ اور مولوی مقبول احمد شیعہ مترجم قرآن نے اس کی تصدیق و تصویب کی ہے۔ اس کتاب کا موضوع یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس میں واقعہ کربلا کے اسباب کی تحقیق کی جائے گی مگر یہاں سوائے تبرا اور دشنام طرازی کے اور کچھ اس میں نہیں ہے۔ مولانا لکھنویؒ نے ۱۳۴۸ء میں اس کا جواب ''ارشاد الامم'' کے نام سے ۱۰۳۶ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب میں لکھا تھا جس کی چند قسطیں النجم میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ افسوس ہے کہ یہ مسودہ مولانا کے قیام امروہہ کے دوران کہیں ضائع ہو گیا اور پھر شائع نہیں ہو سکا۔ ہماری معلومات کا ذریعہ بس یہی اس کی چند قسطیں ہی ہیں۔

۹۔ قاطع اللسان بجواب ''دافع البہتان''

چکوال ضلع جہلم (پاکستان) کے مناظرہ کی روداد جب شائع ہوئی جس کا تاریخی نام ''ردِ اثنا عشری'' ہے تو اس کے کئی سال کے بعد امروہہ ضلع مراد آباد کے ایک شیعہ نے اس کا جواب لکھا جس کا نام ''دافع البہتان'' تھا۔ یہ کتاب ''قاطع اللسان'' اسی کا شافی و کافی جواب الجواب تھی، غالباً یہ کتاب شائع نہیں ہو سکی اور اب تو اس کا مسودہ بھی نایاب ہو چکا ہے۔

۱۰۔ نصرۃ الشریعہ شرح ''نصیحۃ الشیعہ''

مولانا احتشام الدین مراد آبادیؒ کی مشہور کتاب ''نصیحۃ الشیعہ'' کی شرح و تکملہ مولانا لکھنویؒ نے ''نصرۃ الشریعہ'' کے نام سے لکھی تھی اور یہ النجم میں بھی شائع ہوئی تھی، کافی عرصہ ہوا ملتان (پاکستان) کے کسی مکتبہ نے اس کو یکجا کر کے شائع بھی کر دیا تھا۔ نصرۃ الشریعہ میں نصیحۃ الشیعہ کے مباحث کی مزید توضیح اور اس کے دلائل کو مزید مضبوط کرنے کے لیے بہت سے

مقامات پر اضافہ بھی کیا گیا تھا۔ ''نصیحۃ الشیعہ'' اپنے مبحث میں یونہی کیا کم اہم کتاب تھی کہ اس کی شرح اور تکملہ نے اس کو اور بھی اہم ترین بنا دیا ہے۔

۱۱۔ ترجمہ وتحشیہ ''تحفۂ اثنا عشریہ''

شیعہ سنّی مسائل پر مسند وقت حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کی مہتم بالشان کتاب ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کا اردو ترجمہ مولاناؒ نے اپنی زیر نگرانی دفتر النجم لکھنؤ میں کرایا تھا اور پھر اس کی تصحیح و اصلاح کا کام بھی خود انھوں نے کیا تھا اور مزید برآں اس پر اپنے حواشی اور تعلیقات بھی تحریر کیے تھے مگر غالباً اس کی طباعت نہیں ہو سکی۔ ہماری نظر سے صرف النجم (اخباری سائز میں) کے اندر اس کا اشتہار گزرا ہے لہٰذا اس کے شائع ہونے کا علم نہیں ہے۔

۱۲۔ عقل سلیم اور صراطِ مستقیم

مولاناؒ کی یہ ایک مستقل اور ضخیم تصنیف تھی اور ۳۵-۴۰ قسطوں میں النجم میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں مسلک اہلسنّت و جماعت کو معتبر و مستند کتب کے حوالوں سے عقل سلیم کے عین مطابق ثابت کیا گیا ہے۔ مولانا کی یہ نادر تحقیقات پہلی اور آخری بار النجم کے ہی صفحات پر منظر عام پر آئی تھیں، بعد میں معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ اور بھی یہ تمام قسطیں النجم ہی میں شائع ہوئی تھیں، اگر آج یہ قسطیں کتابی صورت میں موجود ہوتیں تو اس سے ہر جویائے حق کو بڑا علمی فائدہ پہنچتا مگر افسوس ہے کہ اب یہ بہت کمیاب ہو چکی ہیں۔

۱۳۔ ائمہ اثنا عشر اور ان کا مذہب

اصلاً یہ رسالہ ''مناظرہ اور اظہار حق'' کی جلد ہشتم ہے جو الگ سے بھی مدون ہو کر شائع ہوا تھا، اس میں شیعوں کے ائمہ اثنا عشر اور ان کے ظاہری و باطنی مذہب و مسلک پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب یہ رسالہ نایاب تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہے۔

۱۴۔ القول الصوّاب

یہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری، اس کا صرف ایک حوالہ ہی ہماری نظر سے گذرا ہے۔[1]

---

[1] ہفت روزہ حرم لکھنؤ، ۲۶ مئی ۱۹۶۴ء

تردید شیعیت

۱۔ حرمت متعہ کا ثبوت آیات قرآنیہ سے

متعہ کی فضیلت مذہب شیعہ میں بہت بلند ہے، کتب شیعہ میں اس کا جتنا ثواب بیان کیا گیا ہے اتنا ثواب نہ نماز میں ہے نہ روزہ میں نہ حج میں اور نہ زکوٰۃ میں ہے، یہاں تک کہ خدا کی راہ میں اگر کوئی شہادت کا مرتبہ حاصل کرلے تو وہ بھی اس ثواب کا عشر عشیر بھی نہیں پاسکتا جو متعہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اپنے اس رسالہ میں مولانا لکھنوی ؒ نے شیعوں کے عالی مرتبت مفسر علامہ فتح اللہ کاشانی کی تفسیر منہج الصادقین سے ایک حدیث نبوی نقل کی ہے کہ:

"ایک مرتبہ متعہ کرنے سے امام حسین کا مرتبہ مل جاتا ہے، دو مرتبہ متعہ کرنے سے امام حسن کا، تین مرتبہ متعہ کرنے سے حضرت علی کا اور چار مرتبہ متعہ کرنے سے رسولِ خدا کا......"

مولانا ؒ فرماتے ہیں کہ شاید یہاں راوی سے سہو ہوگیا کہ پانچویں مرتبہ متعہ کرنے سے ضرور خدا کا مرتبہ مل جائے گا۔ پھر چند سطروں کے بعد اسی تفسیر سے ایک حدیث شیعہ اور نقل کرتے ہیں:

"متعہ کرنے والے مرد وعورت جب تک اس کام میں مشغول رہتے ہیں فرشتے ان کی پاسبانی کرتے ہیں اور اس فعل کے بعد غسل کرنے سے پانی کے ہر قطرہ سے ایک فرشتہ پیدا ہوتا ہے جو قیامت تک تسبیح وتقدیس کرتا رہتا ہے اور اس کا ثواب ان دونوں کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ (سبحان اللہ)

اب اس عظیم فضیلت کے بعد کیا کسر باقی رہ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مفسر صاحب نے ایک اور حدیث تحریر کی ہے:

"جو شخص بغیر متعہ کیے ہوئے دنیا سے جائے گا وہ قیامت کے دن نکٹا یعنی ناک کٹا ہوا آئے گا۔

مولانا لکھنوی ؒ لکھتے ہیں کہ مولانا رشید الدین خاں دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "شوکت عمریہ" میں یہ حدیثیں تفسیر منہج الصادقین سے جب نقل فرمائیں تو شیعوں کے سلطان العلماء مولوی سید محمد مجتہد اعظم لکھنوٗ نے اس کے جواب میں اپنی کتاب "ضربت حیدریہ" میں یہ لکھا تھا:

"اگر باداۓ سنتِ پیغمبر وترک بدعتِ عمر درجہ معصومین حاصل شود چہ عجب است۔

غرضکہ اتنی مہتم بالشان عبادت کی مذہب شیعہ میں جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے مگر اہل سنت

وجماعت اس کو قطعی حرام کہتے ہیں اور اسے زنا کے مترادف مانتے ہیں۔ مولانا لکھنوی ؒ نے اپنے اس رسالہ میں قرآن مجید کی پانچ آیتوں سے اس کی حرمت ثابت کی ہے اور اس کے جواز میں شیعوں کے ہر قول کا رد کیا ہے۔ یہ رسالہ بھی ناتمام ہے۔ اس میں آپ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ دونوں سے بحث کرنا چاہتے تھے لیکن مختلف موانع کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔ اب اس میں صرف آیات قرآنیہ کی بحث ہے اور وہ بھی کسی قدر ناتمام ہے۔ غالباً یہ پہلی بار رسالہ الداعی لکھنؤ شعبان ۱۳۶۳ھ میں شائع ہوا تھا پھر اس کی مزید قسطیں دستیاب نہیں ہوسکیں۔

۲۔ **کشف الاستار**: یعنی کتاب استبصار کا اُردو ترجمہ وتنقید

مذہب شیعہ میں حدیث کی چار کتابیں صحت واعتبار کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں اور انھیں چاروں کتابوں کو وہ اصول اربعہ کہتے ہیں۔ ان چاروں کتابوں اور ان کے مصنّفین کے نام یہ ہیں:

۱۔ کتاب کافی: ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ

۲۔ کتاب من لایحضرہ الفقیہ: ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمّی ملقب بہ شیخ صدوق متوفی ۳۳۱ھ۔

۳۔ کتاب تہذیب: ابو جعفر محمد بن حسن بن علی طوسی متوفی ۴۶۰ھ

۴۔ کتاب استبصار: ابو جعفر محمد بن حسن بن علی طوسی متوفی ۴۶۰ھ

یہی چار کتابیں ہیں جن پر مذہب شیعہ کی بنیاد ہے۔ ان چاروں کتابوں کی علمی ودینی حیثیت کیا ہے اس کے متعلق خود مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس وقت بعونہ تعالیٰ ارادہ کیا گیا ہے کہ ان چاروں کتابوں کی حالت علی الوجہ الجزئی والتفصیلی بیان کردی جائے تاکہ ایک اندھا بھی بالبداہت محسوس کرلے کہ اس فرقہ کا ہاتھ جس طرح قرآن سے خالی ہے اسی طرح دامن اہل بیت سے بھی بے نصیب ہے اور جس چیز کا نام ان لوگوں نے ''احادیث اہل بیت'' رکھا ہے وہ کذب ودروغ وبہتان وافتراء کا ہی ایک مجموعہ ہے اور بس۔

زیر تبصرہ رسالہ انہی چاروں کتابوں کی تنقید میں لکھا گیا تھا جس میں سب سے پہلے کتاب الاستبصار پر تنقید اور اس کا ترجمہ شائع کیا گیا تھا۔ باقی تین دوسری کتابوں کا ترجمہ وتنقید شائع ہوئی تھی یا نہیں اس کا علم نہیں ہوسکا۔ کشف الاستار کی بھی صرف پہلی قسط نظر سے گذری ہے۔[1]

---

[1] النجم لکھنؤ، صفر ۱۳۳۰ھ

شیعوں کی مذہبی کتابوں کی علمی حیثیت کیا ہے اور وہ کتنی معتبر و مستند ہیں ان کے علماء خود بہت اچھی طرح جانتے ہیں اسی لیے وہ انھیں بہت مخفی رکھنا چاہتے ہیں مگر کب تک؟ اس بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ:

"شیعوں کو اپنی کتابوں کے چھپانے میں بے حد کوشش رہی اور ہے۔ جب منشی نولکشور نے ان کی کتابوں کے طبع کرنے کا ارادہ کیا تھا تو اس وقت مجتہدین شیعہ پر جو کچھ حالت گذری وہ دیکھنے والے جانتے ہیں۔ منشی نولکشور نے یہ اور ستم کیا کہ مجتہدین سے ان کے طبع کرنے کی اجازت مانگی اور اپنے خارجی اثرات سے ان کو متاثر کیا۔ بچارے کیا کرتے۔ اجازت دینی پڑی۔ سنگ آمد وسخت آمد۔ مگر پھر بھی کوئی مجتہد اس بات پر راضی نہ ہوا کہ ان خرافات کا ترجمہ اُردو میں شائع کر کے عام پبلک کو اپنے مذہب پر رائے زنی کا موقعہ دیتا۔ بحمد اللہ آج وہ کام النجم کے ذریعہ سے ہو رہا ہے۔ جس شیعہ مجتہد کا حوصلہ ہو وہ ہمارے ترجمہ پر اعتراض کرے۔

کاش یہ پورا ترجمہ اگر آج دستیاب ہو جائے تو ایک بیش بہا علمی خزانہ ہمارے ہاتھ میں آجائے گا۔

۳۔ کشف اللّفافہ لاظہار مافی النّبوۃ والخلافہ

لکھنؤ کے مشہور شیعہ مجتہد مولوی نجم الحسن نے ایک رسالہ النبوۃ والخلافہ لکھا تھا جس کو شیعہ درس گاہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ نے شائع کیا تھا بعد میں اسی رسالہ کو انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے بھی شائع کرایا گیا تھا، کشف اللفافہ اسی کے رد میں لکھا گیا تھا۔ مولوی نجم الحسن نے اپنے رسالہ میں مسلمانوں کو مغالطہ دینے کے لیے چند باتوں کا خاص طور سے التزام کیا تھا۔

اوّل: بعض امور کو مسلمانوں میں متفق علیہ ظاہر کیا ہے حالانکہ وہ امور مخصوصاتِ شیعہ میں سے ہیں اور اہلسنت کو ان سے قطعاً اختلاف ہے۔

دوم: شیعوں کے بعض عقائد ایسے بیان کیے ہیں جو از روئے کتب شیعہ صحیح نہیں ہیں اور بعض عقائد شیعہ کا بیان ترک بھی کر دیا گیا ہے۔

سوم: بعض باتیں ایسی تحریر کی گئی ہیں جو شیعوں اور سنّیوں دونوں کے خلاف ہیں۔

چہارم: اہلسنت کے اختلاف اور ان کے دلائل کو بہت کمزور کر کے دکھایا گیا ہے اور اپنے مذہب

کی تائید میں جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان کے رد میں اہلسنت کی طرف سے جو جوابات دیئے گئے ہیں انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ان مغالطات کو دور کرنے کے لیے مولانا لکھنویؒ نے یہ رسالہ کشف اللفافہ تحریر فرمایا تھا۔ پورے رسالہ کو ایک مقدمہ، ایک مقصد اور ایک خاتمہ پر منقسم کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں نبی اور امام کا فرق اور دونوں کے فرائض فریقین کے عقائد کے مطابق علیحدہ علیحدہ لکھے گئے ہیں، مقصد کے تحت مجتہد صاحب کی متنازعہ عبارتیں نقل کر کے ان کا رد کیا گیا ہے، مجتہد صاحب کی عبارت نقل کرتے وقت ''قال مجتہد الشیعہ'' کا عنوان اور اپنا جواب لکھتے وقت ''اقول بحول اللہ ذی الدرجات الرفیعہ'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔

اس رسالہ کی پہلی قسط سب سے پہلے النجم میں ۷ر رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ میں اور پھر اس کی دوسری قسط ۲۱ر شوال ۱۳۴۴ھ کے النجم میں شائع ہوئی تھی۔ راقم الحروف کو صرف یہی قسطیں دیکھنے کو ملی ہیں باقی تحریر کا تادم تحریر کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ موجودہ دونوں قسطیں جو چوبیس صفحات پر مشتمل ہیں کافی اہم ہیں اور ان میں بہت سی مفید باتیں مکمل طور پر آ گئی ہیں۔ کاش اس کے بقیہ حصے بھی مل جاتے تو اس پر مکمل تبصرہ کیا جا سکتا تھا۔

۴۔ معجزۃ القرآن

مولوی سید علی نقی مجتہد شیعہ[۱] جب ۱۹۳۳ء میں تازہ تازہ عراق سے سند اجتہاد لے کر لکھنؤ پہنچے تو انھوں نے اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کے لیے ''امامیہ مشن'' کے نام سے ایک تبلیغی ادارہ قائم کیا اور اس کی جانب سے مختلف شیعہ سنّی اختلافی موضوعات پر رسالے اور کتابیں لکھ کر شائع کرنا شروع کر دیں، انہی رسالوں میں ایک رسالہ موصوف نے ''تحریفِ قرآن کی حقیقت'' کے

۱۔ مولوی سیّد علی نقی مجتہد ابن مولوی سیّد ابوالحسن نقوی ۲۶ر دسمبر ۱۹۰۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عراق سے سند اجتہاد بھی حاصل کی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ علوم السنہ شرقیہ میں استاد مقرر ہوئے، وہاں سے جا کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ دینیات میں ڈین بنائے گئے۔ اپنے دَور کے بہت مقبول مقرر و واعظ تھے۔ تقریباً ایک سو پچاس کتابوں کے مصنف تھے جن میں ''تاریخِ اسلام''، ''لاتفسدوا فی الارض''، ''شہید انسانیت'' اور ''مجاہدۂ کربلا'' خاص طور سے بہت مشہور ہوئیں۔ ۱۸ر مئی ۱۹۸۸ء میں لکھنؤ میں انتقال ہوا اور امام باڑہ جنت مآب اکبری گیٹ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

نام سے بھی شائع کیا تھا۔اس رسالہ کے اندر انھوں نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے قرآن مجید کے بارے میں عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے دو طرح کے خیالات پیش کیے تھے۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں قرآن مجید کی فضیلت، اس کی حفاظت اور صحابۂ کرام کی اس سلسلہ میں مساعی جمیلہ کا بھی، خواہ دبے الفاظ ہی میں سہی، اعتراف کیا تھا مگر کچھ ہی صفحات کے بعد اپنے اصلی رنگ پر آ گئے اور پھر اپنے مذہب کے عین مطابق نقائص قرآن بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مولانا لکھنویؒ اسی رسالہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''رسالہ ''تحریف قرآن کی حقیقت'' کے ابتدائی صفحات کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مجتہد صاحب کے دل میں اسلام کا ایک دَرد ہے اور مذہبِ شیعہ کی اس غلط کاری کو جو اس نے قرآن مجید کے غیر معتبر اور مشکوک بنانے میں صَرف کی ہے محسوس کر کے نہایت بے چین ہیں اور چاہتے ہیں کہ مذہب شیعہ سے بھی تعلق قائم رہے اور قرآن مجید پر بھی ایمان ثابت ہو جائے، ہم لعل بدست آید و ہم یار نہ رنجد، مگر ان ابتدائی صفحات سے آگے بڑھ کر خیال میں دفعۃً ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ مجتہد صاحب کا اصلی مقصد اس رسالہ کی تصنیف سے وہی ہے جس پر مذہبِ شیعہ کی چکّی گھوم رہی ہے یعنی قرآن مجید کو مشکوک و غیر معتبر ثابت کرنے ہی کے لیے یہ رسالہ تالیف فرمایا گیا ہے اور ابتدائی مضامین محض اس لیے زیب رقم ہوئے ہیں کہ مسلمان متوحش نہ ہوں بلکہ وہ دلی توجہ سے اس رسالہ کا مطالعہ کریں، یا ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مجتہد صاحب کے دل میں ابتداءً وہی ایک جذبہ تھا کہ کسی طرح فرقہ شیعہ کا ایمان قرآن مجید پر ثابت کریں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت جب چند صفحات لکھ چکے تو یکایک چونکتے ہیں کہ یہ کیا ہوا، اس طرح تو قرآن مجید پر ایمان ثابت کرنے کی دُھن میں مذہبِ شیعہ فنا ہوا جاتا ہے، یہ خیال آتے ہی قلم کی باگ دوسری طرف پھر گئی اور پھر جو کچھ ابتداء میں لکھ آئے تھے اب اس کے خلاف لکھنا شروع کر دیا کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثا۔ غرض اس چھوٹے سے رسالہ میں دو متضاد پہلو ایک بام دو ہوا کا لطف دے رہے ہیں لہٰذا اس کے جواب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ معجزۃ القرآن مجتہد صاحب کے اسی رسالہ کے پہلے حصہ کا جواب ہے جس میں قرآن مجید کی مدح سرائی میں موصوف کی تقیہ آمیز عبارتوں کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے اور قدم قدم

پر ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ آپ کے یہ بیانات مذہب شیعہ کے متفقہ اصولوں کے خلاف جارہے ہیں۔ یہ پورا رسالہ چوالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ سے قرآن مجید کا یہ معجزہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ قرآن مجید کا کیسا ہی دشمن کیوں نہ ہو جب اپنے کو مسلمان ثابت کرنا چاہے گا تو اسے قرآن مجید کے محفوظ و مکمل ہونے کا اقرار کرنا ہی پڑے گا اور اس کو صحابہ کرامؓ کے دامن میں پناہ لے کر ان کے محامد و مناقب کا اعتراف کرنا بھی لازمی ہوگا۔ معجزۃ القرآن اگر چہ مجتہد صاحب کے رسالہ کے ابتدائی حصہ کا جواب ہے مگر اپنی جگہ یہ ایک مستقل رسالہ ہے اور تحریف قرآن کی رد میں نہایت تحقیقی اور اعلیٰ مضامین سے پُر ہے اور چھپ چکا ہے۔

۵۔ نصرۃ القرآن

یہ رسالہ بھی مولوی سیّد علی نقی مجتہد کے اسی رسالہ ''تحریف قرآن کی حقیقت'' کے آخری حصہ کا کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ اگر چہ یہ جواب کا حصہ دوم ہے مگر بجائے خود ایک مستقل رسالہ ہے اور اس کا کوئی مضمون حصہ اول پر موقوف نہیں ہے۔ اس رسالہ کو مولانا لکھنویؒ نے بارگاہ رسالتؐ میں بطور نذرانہ پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:

''یہ کتاب دنیا کے کسی بادشاہ یا اس کے نائب یا کسی خیالی امام غائب کے سامنے پیش کرنے اور اس حیلہ سے کچھ زخارف فانیہ حاصل کرنے کے لیے نہیں لکھی گئی ہے بلکہ آرزو یہ ہے اور صرف یہی ہے کہ یہ حقیر تحفہ قبہ خضراء میں حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم کے دربار سراپا انوار میں پیش ہو جائے:

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش ست

وماذٰلک علی اللہ بعزیز، چھوٹا منہ اور بڑی بات ضرور ہے مگر ذرہ نوازی نے ہمّت دلائی:

الیٰ بابہ العالی مددت یدالرجاء

ومن جاء ھٰذا الباب لایخشی الردا

مجتہد صاحب نے اپنی اس کتاب کے حصہ اول میں عجیب کمال کیا ہے، انھوں نے دو متضاد پہلو اختیار کیے ہیں۔ اسی وجہ سے اس رسالہ کا جواب بھی دو حصّوں میں دیا گیا ہے۔ پورے رسالہ کو چار فصلوں اور ایک خاتمہ پر تقسیم کیا گیا ہے۔

فصل اوّل میں مجتہد صاحب کے متعارض کلمات کی سیر کرائی گئی ہے کہ ابتداء میں وہ کیا لکھ آئے ہیں اور اب کیا لکھ رہے ہیں۔اس کے ساتھ ہی ان کی کچھ علمی اور دیانتی کارروائیوں کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔

فصل دوم میں قرآن مجید میں تحریف وتبدیل کا شرعاً وعادتاً محال ہونا ثابت کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فریقین کا قرآن مجید کے بارے میں عقیدہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

فصل سوم میں مجتہد صاحب کے ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو انھوں نے قرآن مجید پر وارد کیے ہیں نیز ان روایات اہلسنّت کی توضیح کی گئی ہے جن سے مجتہد صاحب نے قرآن کو محرف ومشکوک ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔

فصل چہارم میں مجتہد صاحب نے جو روایات شیعہ کی لیس پوت کی ہے اس کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے۔

خاتمہ میں مجتہد صاحب سے اس مبحث کے بارے میں کچھ فیصلہ کن سوالات کیے گئے ہیں۔

مجتہد صاحب نے اپنے رسالہ کے آخری حصہ میں قرآن مجید پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں بے ترتیبی نمایاں ہے۔اس کی بلاغت کو دھچکا پہنچ چکا ہے جس سے تسلسل کلام اور ارتباط بیان کو غیر معمولی صدمہ پہنچا ہے اور اس کی ترتیب کی الٹ پھیر سے اس کی افادی حیثیت باقی نہیں رہی۔ وغیرہ نعوذ باللہ۔

مولانا لکھنویؒ نے اپنے رسالہ کے شروع میں شیعوں کے عقیدۂ تحریف قرآن کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> مجتہد صاحب کی اس دورنگی کارروائی نے ان کو کچھ فائدہ پہنچایا یا نہیں مگر اس تحقیق پر ضرور مہر تصدیق لگادی کہ بلاشبہ قرآن اور مذہب شیعہ میں ایسا تضاد ہے کہ نہ کبھی دونوں ایک جگہ جمع ہوئے اور نہ ہوسکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر فرقہ شیعہ کا وجود نہ ہوا ہوتا تو قرآن مجید کے ساتھ تحریف کا لفظ کبھی دیکھنے اور سننے میں نہ آتا مگر مشیت الٰہی یونہی تھی۔ قرنِ صحابہ کے بعد اسلام میں بہت سے فرقے ہوگئے اور ان میں آپس میں بہت سے اختلافات بھی رونما ہوئے مگر قرآن مجید کے متعلق کسی فرقہ نے کوئی اختلاف ذرّہ برابر بھی نہ کیا۔ سب نے اس کا کامل ومکمل

اور ہر قسم کی تحریف سے پاک ہونا قطعاً ویقیناً تسلیم کیا لیکن ایک مٹھی بھر فرقہ نے جو اپنے کو شیعہ اور امامیہ کہتا ہے اور جس کی تعداد زمانہ سلف میں جس قدر اوپر نظر ڈالو کم سے کم ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعد وفات نبویؐ کے خود ان کا اقرار ہے کہ صرف پانچ آدمی اس مذہب کے تھے۔ اس فرقہ نے اسلام کی ایک مسلّم الکل چیز کو جس پر دین اسلام کی بنیاد ہے مختلف فیہ بنانے کی کوشش کی مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کی حفاظت کاملہ نے قرآن مجید کو مشکوک ہونے سے بچالیا اور اس فرقہ کی تمام مساعیِ غیر مشکورہ کو رایگاں کردیا۔

اس رسالہ کے ابتدائی ۴۶ صفحات راقم الحروف کی نظر سے گذرے ہیں اس کی اگلی قسط دستیاب نہیں ہوسکی۔ مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگے کی قسط بھی کم ازکم اتنے ہی صفحات پر ضرور مشتمل ہوگی۔ اتفاق سے انہی دنوں میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے نکلنے والے ایک اُردو میگزین میں ایک صاحب کی ایک غیر ذمہ دارانہ اور بے اصل عبارت نظر سے گذری کہ:

"لکھنؤ کے رسالہ النجم کے مدیر نے تحریفِ قرآن کا الزام جب شیعیت پر لگایا تو سرکار سیّد علماء (یعنی مولوی علی نقی مجتہد) نے ہی اس کا جواب "تحریف قرآن" لکھ کر اصلی حقیقت آشکارا کی جس کا پھر کسی سے جواب ممکن نہ ہوسکا۔"[1]

مضمون نگار نے یا تو تقیہ اور کتمان حق کی وجہ سے ایسی لچر بات لکھ دی یا پھر یہ دونوں رسالے ("معجزۃ القرآن" اور "نصرۃ القرآن") ان کی نظر سے نہیں گذرے ورنہ ایسا لکھنے کی ہمت نہ ہوتی، اگر وہ مدیر النجم کا حوالہ نہ دیتے تو ہم بھی ان کی تردید نہ کرتے اور بات درگذر کردیتے۔

۶۔ قاتلانِ حسینؓ کی خانہ تلاشی

تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حادثہ کربلا کا اصل ذمہ دار کون ہے؟ اور یہ خونِ ناحق کس کی گردن پر ہے؟ اس سلسلہ میں مختلف نقطۂ نظر سے بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے ۱۳۲۲ھ میں جب لکھنؤ میں شیعہ سنّی اختلافات بہت بڑھ گئے تو شیعی اخبارات ورسائل میں جہاں اور بہت سے الزامات واتہامات اہل سنّت پر لگائے گئے وہیں حادثہ کربلا کے متعلق بھی یہ لکھا جانے لگا کہ اس کے ذمہ دار اہل سنّت ہی ہیں چنانچہ مجبور ہوکر النجم

---

[1] فکر ونظر، علی گڑھ کا ناموران علی گڑھ نمبر، جلد دوم، ص ۳۷۱، مرتبہ پروفیسر شہریار محمد صابر

دور قدیم کی پہلی جلد میں ایک مفصل مضمون اس کے متعلق لکھا گیا ہے اور پھر دور جدید میں بھی ایک رسالہ ''قاتلان حسین'' کے نام سے مرتب ہوا، بعد میں مزید تحقیقات سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہوگئی کہ نواسہ رسولؐ سیّدنا حسین رضی اللہ عنہ کے اصل قاتل وہی لوگ تھے جو محبّ اہل بیت ہونے کا ظاہری دعویٰ کرتے ہیں۔ رسالہ ''قاتلان حسین'' کے شائع ہونے کے بعد شیعوں کی طرف سے متعدد مضامین اور رسائل اس کے جواب میں بطور صفائی کے شائع ہوئے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ قاتلان حسین کو شیعہ یا سنّی نہ کہا جائے بلکہ وہ لامذہب تھے اور ان کا کسی دین یا فرقہ سے کوئی تعلق نہ تھا چنانچہ اسی مقصد کے لیے لکھنؤ کے مولوی علی نقی مجتہد نے بھی ''قاتلان حسین کا مذہب'' کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا اور ''امامیہ مشن'' لکھنؤ سے اس کو شائع کیا۔ موصوف نے اس میں اپنے مذہب کی طرف سے جہاں صفائی دینے کی کوشش کی ہے وہیں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''قاتلانِ حسین کی جگہ اگر نکل سکتی ہے تو اہلسنّت کے اصول وتعلیمات میں ہی نکل سکتی ہے۔'' مجتہد صاحب کے اس رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا لکھنویؒ نے تحریر فرمایا تھا:

''نکل سکنے کی ایک ہی رہی، نکالنے کو آپ جہاں چاہیں نکالیں مگر حقیقت میں ان کی جگہ جہاں ہے وہیں رہے گی اور اگر آپ کی تسکین ان خیالی وفرضی باتوں سے ہوسکتی ہے تو ہمیں بھی کچھ عذر نہیں:

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

مجتہد صاحب نے سب سے زیادہ عجیب بات یہ کی ہے کہ اس نوتصنیف رسالہ میں شروع سے آخر تک کتبِ شیعہ کو کہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ کتب اہلسنّت کے حوالہ سے لکھا ہے اور ان حوالوں میں بھی اپنی طرف سے بہت کچھ قطع وبرید کی ہے جس کا نمونہ (کتاب کے) خاتمہ میں پیش کیا جائے گا۔

مجتہد صاحب کی اس کارروائی نے ان کے مقصد کی ناکامی کو اظہر من الشمس کردیا کیونکہ قاتلانِ حسین کو شیعہ کہنے کی بنیاد کتب شیعہ پر ہے اور جبکہ انھوں نے کتب شیعہ کو ہاتھ بھی نہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ کتب شیعہ کی روشنی میں قاتلان حسین کے شیعہ ہونے کا انکار ممکن نہیں۔''

مجتہد صاحب کے اسی رسالہ کے جواب میں مولانا نے یہ رسالہ ''قاتلان حسین کی خانہ

تلاشی'' تحریر فرمایا تھا جس کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ قاتلان حسینؓ خود مخالفین اہلسنّت ہی تھے، انھوں نے ہی حضرت حسینؓ کو کوفہ دھوکہ دے کر بلوایا اور پھر ان سے بدعہدی کی جس کے نتیجہ میں میدان کربلا میں ان کی اور ان کے اعزا و اقرباء کی مظلومانہ شہادت ہوئی۔

اس رسالہ کے اب تک درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب بھی عام طور سے دستیاب ہے۔ اس رسالہ کو دو باب اور ایک خاتمہ پر تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اوّل میں مخالفین اہلسنّت کے عام حالات بیان کیے گئے ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی بے وفائی اور بدسلوکی ہر امام کے ساتھ ہوتی رہی ہے، انھوں نے کبھی بھی اپنے ائمہ کے ساتھ وفاداری اور جاں نثاری کا معاملہ نہیں کیا۔ باب دوم میں خاص حضرت حسینؓ کے ساتھ ان کے سلوک کا بیان ہے۔ رسالہ کے آخر میں مجتہد صاحب کی طرف سے حضرت ابوسفیانؓ حضرت معاویہؓ اور دیگر صحابۂ کرامؓ کے خلاف لگائے گئے جھوٹے مطاعن کے جوابات دیئے گئے ہیں اس کے علاوہ ان کے بعض دوسرے فرسودہ اعتراضات کی تردید اور کتب اہلسنّت کی کتابوں کے ترجموں میں انھوں نے جو تصرفات و اضافات اپنی طرف سے کیے تھے ان کے نمونے پیش کر کے تصحیح کی گئی ہے۔ یہ رسالہ ردِّ شیعیت میں مولانا کی تصانیف میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

۷۔ قصۂ قرطاس کا مختتم فیصلہ

لکھنؤ میں شیعوں کے ایک مشہور رسالہ ''سہیل'' نے حدیث قرطاس کو آڑ بنا کر صحابۂ کرام پر اور بالخصوص فاروق اعظم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پر خوب لعن طعن کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ''سہیل'' کے پس پردہ مدیر مولوی سبط حسن مجتہد تھے مگر وہ مضامین میں اپنے نام کے بجائے ''ایک محقق'' کے نام سے زہر افشانی کیا کرتے تھے۔ اس رسالہ کو لکھنؤ کے تمام ہی مجتہدین کا علمی و قلمی تعاون حاصل تھا۔ ان حالات سے مجبور ہو کر مولانا لکھنویؒ نے ۱۳۴۵ھ میں اپنے صحیفہ النجم میں مذکورہ بالا عنوان پر ایک مبسوط مضمون لکھا، کچھ دنوں تک اس کا جواب اور پھر جواب الجواب کا سلسلہ دونوں طرف سے چلتا رہا مگر اخیر میں فریق مخالف کو سوائے خاموشی اور سکوت کے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ ۱۳۶۰ھ میں بعض لوگوں کے اصرار پر اس مضمون کو ماہنامہ 'الداعی' لکھنؤ نے علیحدہ سے رسالہ کی شکل میں دوبارہ شائع کر دیا جو ۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

احادیث کی روشنی میں اس قصہ کی اصلیت صرف اتنی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آخری بیماری میں وفات سے پانچ روز قبل یہ فرمایا کہ قرطاس یعنی کاغذ لاؤ تاکہ میں ایک ایسی تحریر لکھوادوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بیماری کی تکلیف زیادہ ہے (اس لیے آپؐ ایسا فرما رہے ہیں)، انھوں نے یہ بھی کہا کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ یعنی اللہ کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ یہ تحریر لکھوا لینی چاہیے، اسی اثناء میں کچھ لوگوں نے جن کا نام کسی روایت میں مذکور نہیں کہا کہ اَھَجَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِسْتَفْھِمُوْہُ یعنی کیا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کا وقت آ گیا ہے؟ آپ سے پوچھو تو اس واقعہ کے پانچ دن بعد تک آپؐ اس عالم میں رونق افروز رہے مگر پھر کسی وقت بھی اس تحریر کے لکھوانے کو نہیں فرمایا۔

اس واقعہ کو بنیاد بنا کر مخالفین صحابہؓ نے امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کی بوچھار کردی کہ انھوں نے نعوذ باللہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہذیان بکنے والا کہا، ایک ضروری تحریر جس کے بعد گمراہی کا اندیشہ باقی نہ رہتا لکھنے نہیں دی اور ساتھ ہی رسولؐ کے حکم کی نافرمانی کی، مزید برآں انھوں نے حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ کہہ کر یہ ثابت کردیا کہ سنتِ رسولؐ کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں بس اللہ کی کتاب ہم کو کافی ہے، اس طرح سنت نبوی کی توہین کی وغیرہ وغیرہ۔ مخالفین کو اپنے ان اعتراضات پر بڑا ناز ہے اور صراحتہً واشارۃً اس واقعہ کو بیان کرنے میں ان کو بڑی لذّت ملتی ہے حتیٰ کہ ان کے شعراء اکثر اپنی غزلیہ شاعری میں بھی اس مضمون کو باندھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک شاعر کہتا ہے:

خط مجھے لکھتے ہیں وہ، لکھنے نہیں دیتے رقیب
ماجرا یہ بھی کم از قصۂ قرطاس نہیں

بہرکیف ان اعتراضات کا مکمل جواب النجم لکھنؤ میں مولاناؒ نے تحریر فرمایا جس کا ماحصل یہ ہے کہ اوّل تو قصۂ قرطاس کے صحیح ہونے میں محققین کو درایۃً کچھ کلام ہے۔ مسلمانوں کی کتابوں میں اس قصہ کا راوی حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے، طبقۂ صحابہ میں ان کے سوا کسی اور نے اس واقعہ کو روایت نہیں کیا۔ پھر ان کے سیکڑوں شاگردوں میں صرف عبیداللہؒ (جو

حضرت ابن مسعودؓ کے پرپوتے ہیں) اور سعید ابن جبیرؓ کے سوا کوئی اس کا راوی نہیں، ایسی روایت قطعی ویقینی چہ معنی ظنی روایت کی بھی اعلیٰ قسم نہیں ہوسکتی بلکہ یہ ادنیٰ قسم کی روایت میں شمار ہوتی ہے جس کا نام اصطلاح محدثین میں 'غریب' ہے۔

دوم یہ کہ ھَجَرَ کے معنی صرف ہذیان سرائی ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ جدائی کے معنی میں بھی آتا ہے یہی معنی زیادہ مشہور ومتبادر ہے، اُردو و فارسی شاعری میں بھی یہ لفظ بہت مستعمل ہے اور جدائی کے معنوں میں ہی بکثرت شعراء استعمال کرتے ہیں چنانچہ حدیث قرطاس میں بھی یہ لفظ جدائی کے معنوں ہی میں آیا ہے، اگر اس کو ہذیان کے معنوں میں لیا جائے گا تو اس کے آگے آنے والا جملہ اِستَفھِمُوہ' بالکل بے ربط ہوجائے گا کیونکہ جس کو ہذیان ہو اس سے کچھ پوچھنا کیا معنی۔

سوم یہ کہ یہ لفظ حضرت عمرؓ کا مقولہ نہیں ہے، کسی روایت میں اس کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف نہیں کی گئی ہے بلکہ روایات میں قَالُوْا اَھَجَرَ یعنی جمع کا صیغہ آیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ کسی شخص واحد کا کہا ہوا نہیں ہے۔

چہارم یہ کہ اگر بفرض محال یہ لفظ ہذیان ہی کے معنوں میں لیا جائے تو بھی بات نہیں بنتی کیونکہ یہ لفظ ہمزۂ استفہام کے ساتھ آیا ہے لہٰذا جس شخص نے بھی اس لفظ کو کہا اس نے ہذیان کا انکار کیا ہے اثبات نہیں کیا۔

ان اعتراضات کا مدلل جواب دیتے ہوئے مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ مذکورہ تحریر لکھوانے کا الزام تنہا حضرت عمرؓ پر لگانا سخت بے انصافی ہے، اگر انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا تھا تو دوسرے صحابہؓ نے کیوں نہ لکھوایا خاص طور سے اس وقت جبکہ یہ حکم نبوی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ہی ملا تھا لہٰذا اس صورت میں یہ الزام صرف انہی پر عائد ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں نہ ہونے دیا، دوسرے یہ کہ معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ الزام آتا ہے کہ آپؐ نے بھی ایسی ضروری تحریر کیوں نہ لکھوائی جبکہ رسول ہونے کی وجہ سے اس کی تبلیغ آپؐ پر فرض تھی۔ اگر آپ حضرت عمرؓ کے کہنے سے اس فعل سے باز رہے تو گویا آپؐ نے فرض رسالت کو ترک کردیا۔ العیاذ باللہ۔ انبیاء علیہم السلام اگر اسی طرح کسی کے روکنے سے یا کسی کے خوف سے تبلیغ و ہدایت کا کام ترک کردیا کریں تو دین پر اعتبار ہی نہ رہے گا اور نبوت بازیچۂ اطفال ہوجائے گی۔

حضرت عمرؓ کا مقولہ حَسْبُنَا كِتَابُ الله کے سلسلہ میں آپ نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ کو سنا مگر اس پر کسی قسم کا انکار نہ فرمایا حالانکہ انبیاء علیہم السلام کے لیے یہ حرام ہے کہ کوئی ناپسندیدہ قول یا فعل ان کے علم میں آئے اور وہ اس پر انکار نہ کریں۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ کتاب اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور سنّت رسولؐ کی ہم کو ضرورت نہیں، اگر خواہ مخواہ یہی مطلب مراد لیا جائے تو قرآن مجید کی آیت حَسْبُنَا اللّٰـهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے رسول کی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں آپ مزید تحریر فرماتے ہیں:

> "اس مقولہ نے اچھی طرح ظاہر کر دیا کہ حجتِ حقیقی اور مستقل دلیل شرعی صرف کتاب اللہ ہے، سنّت رسولؐ حجت مستقل نہیں بلکہ کاشف کتاب اللہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سنت سے جس طرح احکام قرآنی کا کشف ہوتا ہے ویسا کشف اور دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔ جو تفسیر آیاتِ قرآنیہ کی رسول رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ویسی تفسیر کوئی مفسر نہیں کرسکتا...... لہٰذا سنّت نبویؐ سے کسی طرح استغنا نہیں ہوسکتا کیونکہ کتاب اللہ کی کاشف وہی ہے۔ شارع حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور حاکم حقیقی بھی وہی ہے، سنّت سے کوئی ایسی چیز جس کی تاسیس کتاب اللہ نے نہ کی ہو ہرگز ثابت نہیں ہوسکتی۔ پس اصل کتاب اللہ ہے اور سنّت اس اصل کی توضیح وتفسیر ہے لہٰذا حَسْبُنَا كِتَابُ الله بالکل صحیح اور درست ہوا جیسا کہ حسبنا اللہ کہنا۔

اس واقعۂ قرطاس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے مولاناؒ نے لکھا ہے کہ غور اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود کسی تحریر کا لکھوانا تھا ہی نہیں بلکہ آپؐ اپنے صحابۂ کرام کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ ایمان میں کہاں تک ان کو رسوخ حاصل ہوا ہے، آیۂ قرآنی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہو چکی تھی اور سب کو بتا دیا گیا تھا کہ دین الٰہی کامل ہو چکا اور نعمت خداوندی کی تکمیل ہو چکی ہے، اگر کہیں خدانخواستہ اکابر صحابہؓ (تحریر) لکھوانے کی درخواست کرتے تو حضرتؐ کو بڑا رنج وصدمہ ہوتا کہ باوجود اس آیت کے تم اب تک اس دین کو کامل نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی ایسی ضروری تحریر باقی تھی تو دین بغیر اس کے کامل نہیں ہوسکتا تھا لیکن الحمد للہ صحابہ کرام اس امتحان میں کامل اترے اور اس کامیابی میں سب سے نمایاں حصّہ حضرت فاروق اعظمؓ کو ملا۔ چند نامعلوم الاسم حضرات تحریر لکھوانے کے

خواہش مند تھے جن کی بابت ظن غالب یہ ہے کہ وہ جدید الاسلام حضرات ہوں گے۔

مولاناؒ نے اپنی اس رائے کے ثبوت میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ صاحب فتح الباری کے اقوال بھی تائید میں پیش کیے ہیں، اس کے علاوہ علامہ محمد طاہر گجراتیؒ صاحب مجمع بحار الانوار جیسے شراح حدیث کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ اپنے رسالہ کے آخر میں آپ نے ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں ''سہیل'' اور ''النجم'' کے تمام مباحث کا خلاصہ دیا ہے۔ رسالہ کے ابتداء میں مطاعن صحابہ سے شیعوں کی دلچسپی، مسئلہ امامت اور تقیہ جیسے مسائل پر بھی بڑی مؤثر بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ کئی بار چھپا ہے اور حالیہ برسوں میں پاکستان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

۸۔ تنبیہ الحائرین بحمایۃ الکتاب المبین

ردّ شیعیت میں مولانا لکھنویؒ نے جو تحریری ورثہ چھوڑا ہے اس میں یہ کتاب ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی روش کے مطابق اس کتاب کو بھی انھوں نے الزاماً نہیں لکھا ہے بلکہ مخالفین کی طرف سے لگائے گئے ایک الزام کے جواب میں مرتب کیا تھا۔ غیر منقسم پنجاب کے ایک مشہور شیعہ مجتہد مولوی سید علی الحائری لاہوری نے ایک رسالہ ''موعظہ تحریف قرآن'' کے نام سے لکھا تھا جس کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ شیعہ تحریفِ قرآن کے قائل نہیں ہیں بلکہ اہلسنت کا ایمان قرآن پر نہیں ہے۔ اپنے اس دعوے کی دلیل میں مجتہد موصوف نے اہلسنت کی کتابوں سے اختلاف قرائت یا نسخ آیات کی روایات بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کی تھیں، چنانچہ جب یہ رسالہ مولاناؒ کی نظر سے گذرا تو انھوں نے اس کی تردید میں یہ کتاب لکھی اور اس کا لقب ''سوط العذاب علیٰ اعداء الکتاب'' تجویز کیا۔ آپ نے اس کتاب میں پوری وضاحت اور کتب شیعہ کے اصل حوالوں کے ساتھ یہ بات روز روشن کی طرح ثابت کر دی کہ شیعہ تحریف قرآن کے صرف قائل ہی نہیں بلکہ اس کے محرف ہونے پر مصر بھی ہیں اور ان کا یہ عقیدہ ان کے ضروریاتِ دین میں سے ہے۔

پوری کتاب کو حضرت مؤلفؒ نے ایک مقدمہ اور دو بحثوں میں منقسم کیا ہے۔ مقدمہ میں حائری صاحب کے ''موعظہ تحریف قرآن'' کی تمہید کا جواب ہے۔ پھر بحث اوّل میں آپ نے کتب شیعہ کے مستند حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ شیعوں کا ایمان نہ اس قرآن موجود پر ہے اور

نہ کسی دوسرے موہوم فرضی قرآن پر ہی ہوسکتا ہے اوران کے ایمان بالقرآن نہ ہوسکنے کی وجہ صرف عقیدۂ تحریف ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی اسباب ہیں جن میں خاص طور سے ان تین اسباب کا آپ نے ذکر کیا ہے جن کو ۱۹۲۰ء کے مناظرۂ امروہہ میں آپ نے پیش کیا تھا۔ یہ تینوں اسباب ہم اس کتاب کے مختلف ابواب میں بہت تفصیل سے لکھ چکے ہیں مگر چونکہ "تنبیہ الحائرین" کا اصل موضوع تحریف قرآن ہی ہے اور شیعیت کی تردید میں مولانا لکھنویؒ کی یہ بنیادی تحقیقات میں سے ہے اس وجہ سے ہم ان اسباب کو پھر دوبارہ یہاں تحریر کررہے ہیں تاکہ یہ بنیادی تحقیق پھر سے تازہ ہوجائے۔

مذکورہ بالا تین اسباب کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) شیعوں کا نہایت ضروری عقیدہ بلکہ ان کے مذہب کی بنیاد یہ ہے کہ ناقلان قرآن اور راویانِ دین وایمان کی پہلی مقدس جماعت یعنی جماعتِ صحابہؓ ساری کی ساری جھوٹی تھی اوران میں سے ایک بھی متنفس ایسا نہ تھا جو جھوٹا نہ ہو، نعوذ باللہ، فرق اتنا ہے کہ بقول شیعہ اس جماعت کے دو گروہ تھے ایک حضرات خلفاء ثلاثہؓ کا جو کہ بڑا گروہ تھا اوراس میں ہزاروں لاکھوں آدمی تھے۔ دوسرا گروہ حضرت علی مرتضیٰؓ اوران کے ساتھیوں کا تھا جس میں گنتی کے چار پانچ آدمی تھے۔ مذہبِ شیعہ کے مطابق یہ دونوں گروہ جھوٹے تھے۔ پہلے گروہ کے جھوٹ کا نام انھوں نے نفاق رکھا تھا اور دوسرے گروہ کے جھوٹ کا نام تقیہ تھا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلا گروہ جھوٹ بولتا تھا مگر جھوٹ کو عبادت نہ جانتا تھا اور دوسرا گروہ یعنی حضرت علی مرتضیٰؓ اوران کے ساتھ والے نعوذ باللہ جھوٹ بولنے کو بہت بڑی عبادت اور بہت ضروری فرض جانتے تھے۔ شیعوں کے خیال کے مطابق پہلا گروہ اپنے اندر مافوق الفطرت قوت رکھتا تھا اور وہ مختلف المزاج اشخاص کو آسانی جھوٹ پر متفق کرلیتا تھا لہٰذا دین کی ہر وہ چیز جو صحابۂ کرام کے ہاتھوں سے امت تک پہنچی ہے وہ کسی طرح بھی معتبر اور قابل ایمان نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ منافق اور جھوٹے گروہ کے ذریعہ امت تک منتقل ہوئی ہے۔

(۲) مذہب شیعہ کی روایات کے مطابق قرآن مجید خلفاء ثلاثہؓ کے زیر اہتمام وانتظام جمع ہوا اور انھیں کے ذریعہ تمام عالم میں پھیلا ہے، اس قرآن کی کوئی قابل وثوق تصدیق ائمہ معصومین سے

کتب شیعہ میں منقول بھی نہیں ہے اور حضرات خلفاء ثلاثہؓ کے متعلق شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ معاذ اللہ وہ نہ صرف مخالفِ دین تھے بلکہ دشمنِ دین بھی تھے لہٰذا ایسے ہاتھوں کے ذریعہ جمع کیا ہوا قرآن کیسے معتبر ہوسکتا ہے اور اس پر کیسے ایمان لایا جاسکتا ہے؟

(۳) کتب شیعہ کے مطابق موجودہ قرآن محرّف ہے کیونکہ اس میں پانچ قسم کی تحریفات ہوئی ہیں (۱) قرآن مجید کے بہت سے حصّے حذف کردیئے گئے (۲) بہت سے حصّے بڑھادیے گئے (۳) الفاظ تبدیل کردیئے گئے (۴) حروف بدل دیئے گئے اور (۵) آیات وسورتوں کی ترتیب میں بھی خرابی وردوبدل کردیا گیا ہے۔ ان پانچوں قسم کی تحریفات کی تائید میں شیعوں کی معتبر اور مستند کتابوں میں دو ہزار سے زائد روایات موجود ہیں اور یہ روایات علماء شیعہ کے ان تین اقراروں کے ساتھ ہیں۔

۱۔ یہ روایات کثیر اور متواتر ہیں۔
۲۔ یہ روایات تحریف قرآن پر صراحۃً دلالت کررہی ہیں۔
۳۔ انھیں روایات کے مطابق شیعہ تحریف قرآن کے معتقد ہیں۔

یہ وہ تین اسباب ہیں جن کی بنیاد پر یہ بات مختتم ہوگئی کہ شیعوں کا ایمان قرآن مجید پر نہ ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ پہلے دو اسباب کا تعلق تحریف قرآن سے نہیں ہے مگر کتب شیعہ میں اگر تحریف قرآن کی کوئی روایت بھی نہ ہوتی تو بھی ان دو اسباب سے ان کا ایمان قرآن مجید پر نہیں ہوسکتا۔ ان پہلے دو اسباب کا کوئی جواب اب تک ان کی طرف سے نہیں دیا گیا ہے اور نہ دیا جاسکتا ہے البتہ تیسرا سبب تحریف قرآن سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔

بحث دوم میں آپ نے یہ تحریر کیا ہے کہ اہلسنّت کے یہاں نہ تحریف کی کوئی روایت ہے اور نہ ہی ان کا کوئی متنفس کبھی تحریف کا قائل ہوا ہے۔ مذہب اہلسنّت میں جو شخص بھی تحریف قرآن کا قائل ہو وہ قطعاً کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اہلسنّت کی وہ روایات جن کو شیعہ روایات تحریف کہتے ہیں وہ نسخ اور اختلافِ قرأت کی روایات ہیں۔ علماء اہلسنّت نے تشریح کی ہے کہ ان کے ایک عالم نے بھی ان روایات سے تحریف کو نہ سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے۔ اہلسنّت کی یہ روایات اخبار احاد ہیں متواتر نہیں ہیں۔ ان روایات میں اکثر کے صحیح ہونے میں بھی کلام ہے۔ اگر بفرض محال یہ روایتیں تحریف پر دلالت بھی کرتیں تو بھی اہلسنّت کے نزدیک قابل اعتبار نہ

ہوتیں کیونکہ قرآن مجید متواتر ہے اور غیر متواتر شئے سے متواتر شئے کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، برخلاف اس کے شیعوں کی روایاتِ تحریف متواتر ہیں اور ان کے متواتر ہونے کا اقرار خود ان کے علماء نے بھی کیا ہے۔ اہلسنّت کے یہاں تحریف ناممکن اور محال ہے۔ ان کے نزدیک رسول کے علاوہ اور کوئی بھی معصوم نہیں ہے اور رسول کا کوئی قول تحریف کے سلسلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اہلسنّت تحریف قرآن کے معتقد کو قطعی کافر جانتے ہیں لہٰذا اگر ہزاروں روایات تحریف کی ہوتیں تو بھی یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان کے مذہب کی روشنی میں قرآن محرف ہے، برخلاف اس کے شیعہ تحریف قرآن کے معتقد ہیں اور معتقدینِ تحریف کو کافر کہنا تو کجا ان کو وہ اپنا پیشوا مانتے ہیں۔

مولاناؒ نے اسی بحث میں حائری صاحب کی پیش کردہ روایات کی حقیقت، غلط تراجم اور عبارتوں کی غلط ترجمانیوں کی بہت سی مثالیں تحریر کی ہیں اور ان کے الزامات کا مکمل جائزہ لے کر ان کا جواب دیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ حائری صاحب نے اپنے دجل و فریب کے کیسے کیسے جوہر دکھائے ہیں۔

تنبیہ الحائرین ۸/۲۶×۲۰ سائز کے ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں النجم کے صفحات پر قسط وار شائع ہوئی تھی، اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں اسی نام سے کتابی شکل میں دفتر النجم نے اس کو شائع کیا، پھر اس کے بعد سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ اس کا آخری ایڈیشن ''شیعہ اور قرآن'' کے نام سے بھی عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں اس کا ایک اور ایڈیشن لکھنؤ سے لیتھو پر شائع ہوا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا، اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں اس کا آفسیٹ ایڈیشن بھی لکھنؤ سے شائع کیا گیا ہے جو آج کل بآسانی دستیاب ہے۔

۹۔ تفضیح الحائرین (تکملہ تنبیہ الحائرین)

یہ رسالہ تقریباً ۳۵ صفحات پر مشتمل ہے اور ابتداءً بطور ضمیمہ کے تنبیہ الحائرین کے آخر میں منسلک شائع ہوا کرتا تھا مگر بعد میں علیحدہ کتابی شکل میں بھی عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ علامہ سیّد علی الحائری مجتہد پنجاب لاہور نے اپنے رسالہ 'موعظۂ تحریفِ قرآن' میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ مذہبِ شیعہ عقل انسانی کے عین مطابق ہے۔ اس دعوے کی تردید میں مولاناؒ نے مستند کتب شیعہ سے ان کے چالیس اہم عقائد منتخب کر کے شائع کر دیئے اور ان سے یہ ثابت کر دیا کہ

ان عقائد کی روشنی میں ان کے مذہب کی حقیقت کیا ہے اور وہ عقل و شعور سے کتنا دور ہیں۔ یہ رسالہ بہت دلچسپ، معتبر اور قابل مطالعہ ہے اور تنبیہ الحائرین کے ساتھ برابر شائع ہوتا چلا آرہا ہے۔

۱۰۔ انتصار الاسلام بردّ استقصاء الافحام (حصۂ اوّل)

یہ رسالہ مولانا لکھنویؒ کے ان چند مضامین کا مجموعہ ہے جنھیں آپ نے ۱۸۹۷ء میں بمقام تحصیل کماسن ضلع باندہ (یوپی) میں جہاں آپ کے والد ماجدؒ اس زمانہ میں تحصیلدار تھے تحریر کیے تھے۔ وہ زمانہ آپ کی طالب علمی کا تھا لہٰذا اس اعتبار سے یہ آپ کی سب سے پہلی تصنیف تھی۔ اصل مضامین فارسی میں تھے جن کا بعد میں اُردو ترجمہ کرکے ۱۹۰۴ء میں النجم لکھنؤ کی مختلف اشاعتوں میں قسط وار شائع کردیا گیا تھا اور پھر کئی سال کے بعد ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ-۱۹۳۲ء میں ان مضامین کو ایک رسالہ کی شکل میں بھی شائع کردیا گیا تھا۔

علماء اہلسنّت نے ردِّ شیعیت کو کبھی اپنا نصب العین نہیں بنایا، جب فریق ثانی کی طرف سے درجنوں کتابیں ردِ اہلسنّت پر آجاتی تھیں تب ہمارے علماء میں سے کوئی ایک ان کا جواب لکھ دیتا تھا اور اس کو بھی وہ کوئی اپنا اہم کارنامہ خیال نہیں کرتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک شیعیت کوئی قابل ذکر چیز نہ تھی۔ مگر ملک کے سیاسی حالات بدلے اور نت نئے فتنوں نے سر اٹھانا شروع کردیا، چنانچہ علامہ حکیم سبحان علی خاں (م ۱۲۶۴ھ) شیعہ رکن سلطنت اودھ نے ایک نہایت سخت تبرائی کتاب فارسی میں لکھی جس کا جواب مولانا حیدر علی[1] فیض آبادیؒ نے دیا جس کا نام "منتہی الکلام" رکھا جو ایک ضخیم کتاب تھی جس نے مخالف کیمپ میں ایک زلزلہ ڈال دیا اور ہندوستان سے ایران

---

[1] مولوی حافظ حیدر علیؒ بن محمد حسنؒ فیض آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے اور وہیں کے بعض علماء شیعہ مثلاً مرزا فتح علی، مولوی نجف علی اور حکیم میر نواب سے تحصیل علم کی اور پھر دہلی آگئے اور وہاں مولانا رشید الدین خاں صاحب دہلویؒ، شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ سے تحصیل علم کی۔ علم مناظرہ اور علم کلام میں اپنے ہمعصروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے، کتب مذہب شیعہ پر گہری نظر تھی، نظام حیدرآباد کی دعوت پر آپ حیدرآباد تشریف لے گئے جہاں دو سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر آپ کا تقرر ہوا، آپ کے بیٹے بھی وہیں ملازم ہوگئے تھے۔ ردشیعہ میں بڑی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں جن میں منتہی الکلام، رسالہ در نکاح ام کلثومؓ، نضارۃ العینین عن شہادۃ الحسنینؓ، ازالۃ الغین عن بصارۃ العین (سہ جلد) کاشف البشام عن تدریس المجتہد القمقام، الداہیۃ الحاطمہ علی من اخرج اہل بیت الفاطمہ وغیرہ زیادہ مشہور ہوئیں۔ ۱۸۸۱ء میں آپ کی حیدرآباد میں وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔

تک تمام مجتہدین اس کتاب کے جواب سے عاجز رہے۔ اسی اثناء میں مولوی حامد حسین مجتہد شیعہ (م ١٣٠٦ھ) نے بزعم خود منتہی الکلام کے جواب میں ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی جس کا نام استقصاء الافحام رکھا۔ مولانا لکھنویؒ نے اسی کتاب کا جواب ''انتصار الاسلام برد استقصاء الافحام'' کے نام سے لکھا تھا مگر مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ کے صاحبزادہ مولانا محمد اسحٰق صاحب مقیم حیدر آباد جو اس وقت حیات تھے انھوں نے اس جواب کا نام ''استیعاب الکلام واستنظاف المرام بنقض استقصاء الافحام'' تجویز کیا تھا استقصاء الافحام دو ضخیم جلدوں میں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ منتہی الکلام کے درمیانی چونتیس صفحات ہی کا یہ جواب ہے، بقیہ شروع کے پانچ سو صفحات اور آخر کے کئی سو صفحات ترک کر دیئے گئے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ استقصاء الافحام کا سب سے پہلا باب تحریف قرآن پر ہے اور آخری باب حسدِ آدم پر ہے لہٰذا جس کتاب کا آغاز کتاب اللہ کی توہین وتنقیص سے ہو اور اس کا اختتام ایک نبی اللہ کی تذلیل وتحقیر پر ہو اس تصنیف کے عدیم النظیر اور متبرک ہونے میں بھلا کیا کسی کو کلام ہو سکتا ہے۔

مولانا لکھنویؒ نے اس رسالہ میں اپنے تین مضامین کو شامل کیا ہے، پہلا مضمون النجم میں ١٤ ر رمضان المبارک ١٣٢٢ھ میں شائع ہوا تھا جس میں صحیح بخاری پر مولوی حامد حسین کے اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ دوسرا مضمون النجم میں ٢١ ر جمادی الثانیہ ١٣٢٣ھ میں شائع ہوا تھا جس میں مولوی حامد حسین کے صحیح مسلم پر اعتراضات کا جواب ہے، تیسرا مضمون ٧ ر رجب ١٣٢٣ھ کے النجم میں شائع ہوا تھا، یہ بھی صحیح مسلم کی تنقید کے جواب میں ہے۔ یہ پورا رسالہ ۵٤ صفحات پر مشتمل ہے جس میں مبحث تحریف قرآن اور مبحث قدح احادیث کا مکمل جواب دیا گیا ہے اور ''استقصاء الافحام'' اور ''عبقات الانوار'' نامی کتب کی اچھی طرح قلعی کھولی گئی ہے۔ ان مضامین کا جواب اب تک فریق مخالف کی طرف سے نہیں دیا گیا ہے۔[1]

١١۔ مولوی اعجاز حسن بدایونی کا جواب

٢٣ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ مولوی اعجاز حسن بدایونی شیعی سابق مدرس ومبلغ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے ایک مضمون کا جواب ہے جو اُن کے اخبار ''درنجف'' سیالکوٹ کے شمارہ یکم اپریل

---

[1] النجم، ١٤ ر رمضان المبارک ١٣٢٢ھ، ٢١ ر جمادی الثانیہ ١٣٢٣ھ، ٧ ر رجب ١٣٢٣ھ

۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ مولوی اعجاز حسن نے بخیال خود اپنے اس مضمون میں مولانا لکھنویؒ کے مضامین متعلقہ ایمان بالقرآن کا جواب دیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مولانا موصوف پر جس طرح دشنام طرازیاں کی تھیں وہ ان کے ضمیر اور مبلغ علم کی پراگندگی اور سطحیت کی بخوبی عکاسی کرتی ہیں۔ مولانا لکھنویؒ نے مولوی اعجاز حسن کے اس مضمون کا رد جس طرح اس رسالہ میں کیا ہے وہ انہی کا حق تھا۔ اس رسالہ میں مولانا نے ثابت کیا ہے کہ جس طرح شیعوں کا قرآن مجید پر ایمان ثابت کرنا موجب خجلت ہے اسی طرح سنّیوں پر عدم ایمان بالقرآن کا بہتان لگانا سبب ذلّت ہے۔ رسالہ میں مولانا نے مولوی اعجاز حسن کے مضمون کے ہر پیراگراف کو پورا پورا نقل کر کے اس کا جواب تحریر کیا ہے تاکہ قاری کو ان کے اعتراض کی حقیقت اور مولانا کے جواب کی صداقت معلوم ہو جائے، اس طرح ترکی بہ ترکی جواب دے کر مولانا نے اپنے مخاطب کو لاجواب کر دیا۔

یہ رسالہ سب سے پہلے ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوا تھا پھر دو ڈھائی سال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۳۴۶ھ میں مسلمانانِ جونپور (یوپی) کی فرمائش پر عمدۃ المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ دونوں ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گئے اور مولوی بدایونی کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ اس رسالہ کا تیسرا ایڈیشن مولوی سیّد علی مطہر نقوی امروہوی نے جنوری ۱۹۹۲ء میں کراچی (پاکستان) سے بھی شائع کیا ہے۔

۱۲۔ مناظرہ اور اظہار حق (نو۹ جلدوں میں)

یہ مجلدات مولاناؒ کے اولین تصنیفی کارناموں میں ہیں جن میں مخالفین اہلسنّت کے تمام مذہبی لٹریچر کو کھنگالا گیا ہے اور اہلسنّت کے مذہبی اصولوں سے ان کا موازنہ کر کے اصل حقیقت کو آشکارا کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ شیعی کتب کے غلط حوالے، عبارتوں کے بے ربط تراجم اور ان کے مفروضہ و مزعومہ الزامات سے غلط نتائج کے حصول کی بیشمار مثالیں ان مجلدات میں درج کی گئی ہیں۔ مذہب مخالف کے بارے میں کما حقہٗ جاننے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسری کتاب اُردو میں نہیں ہو سکتی۔ پوری کتاب کو نو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ہر جلد خاصی ضخیم ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

جلد اوّل و دوم: ان دونوں جلدوں میں مخالفین صحابہ کے عقیدۂ تحریف قرآن کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور اسے امّہات کتب شیعہ و کتب اہلسنّت کی روشنی میں جانچا و پرکھا گیا ہے جس کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل دس باتوں کی تحقیق و تصدیق ہوئی ہے:

۱۔ مخالفین اہلسنّت تحریفِ قرآن کے معتقد ہیں۔

۲۔ تحریف قرآن کا عقیدہ ان کے ائمہ معصومین سے منقول و مروی ہے۔

۳۔ عقیدۂ تحریف کی روایات ائمہ معصومین سے نہایت قطعی ہیں۔

۴۔ ان کے صرف چار علماء تحریف کے منکر ہیں مگر وہ اپنے اس عقیدۂ عدم تحریف کی کوئی سند اپنے ائمہ تک نہیں پہنچا سکے۔

۵۔ ان کی تمام روایتیں تحریفِ قرآن پر نص صریح ہیں۔

۶۔ عقیدۂ تحریف کے خلاف ان کے یہاں کوئی روایت نہیں۔

۷۔ ان کا متفقہ اصول ہے کہ تمام صحابہ اور خصوصاً خلفاء راشدینؓ درپردہ دشمن اسلام تھے اس لیے موجودہ قرآن ناقابل اعتبار ہے کیونکہ یہ انھیں دشمنان دین کا جمع کیا ہوا ہے۔

۸۔ ان کے جو علماء منکر تحریف قرآن ہیں وہ بھی قرآن پر ایمان رکھنا ضروریات دین میں شمار نہیں کرتے۔

۹۔ اہلسنّت میں آج تک کوئی عالم تحریف کا قائل نہیں ہوا ہے، وہ ایمان بالقرآن کو ضروریات دین میں مانتے ہیں اور منکر قرآن کو کافر جانتے ہیں۔

۱۰۔ اہلسنّت کی کتابوں میں تحریف قرآن کی کوئی روایت نہیں ہے۔

جلد سوم، چہارم اور پنجم ان تینوں جلدوں میں اہلسنّت و شیعہ کے فن حدیث و اصول حدیث لفظ معصوم سے فریقین کی مراد، ان سے اخذ حدیث کے طریقے اور پھر ان احادیث سے اخذ احکام کے طریقے بیان کیے گئے ہیں اور ان پر مکمل بحث کی گئی ہے۔

جلد ششم: اس میں اہلسنّت کی حدیثی خدمات، اس کے قواعد و ضوابط اور راویوں کی جانچ پڑتال کے اصولوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

جلد ہفتم: فقہ شیعہ اور اس کے دیگر مباحث پر اس جلد میں بحث کی گئی ہے۔ اس جلد کی اہمیت اس لیے بھی اور زیادہ ہے کہ اس میں مخالفین کے اصول اربعہ پر بھرپور تنقید کی گئی ہے۔

علماءِ شیعہ اپنی کتابوں کو چھپانے کی بے حد کوشش کرتے تھے مگر اب ان کی یہ کوششیں ناکام ہوگئی ہیں، مولانا لکھنویؒ نے اس جلد میں ''استبصار'' کا بامحاورہ اردو ترجمہ بھی مع عربی متن کے شائع کردیا ہے جو قابل دید ہے۔

جلد ہشتم: اس جلد میں ان کے ائمہ عشرہ اور ان کے ظاہری و باطنی مذہب و مسلک پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

جلد نہم: اس آخری جلد میں مذہب شیعہ کے اصول، ان کے ماخذ اور ان کے نتائج پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس طرح سے ''مناظرہ اور اظہار حق'' کی نو جلدوں میں مخالفین اہلسنت کے پورے مذہبی ذخیرے کی چھان بین کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اہلسنت کے دینی مآخذ یعنی قرآن، حدیث اور فقہ وغیرہ سے ان کا موازنہ کرکے حق و باطل کے درمیان حد امتیاز قائم کردی گئی ہے۔ ابتداءً یہ ساری جلدیں النجم میں قسط وار شائع ہوتی رہی تھیں مگر بعد میں ان کو الگ الگ نو جلدوں میں مدون کرکے بھی شائع کردیا گیا تھا لیکن اب یہ جلدیں کمیاب ہوچکی ہیں، صرف بڑے کتب خانوں اور لائبریریوں میں ہی دستیاب ہیں۔ مولانا کے تردیدی کاموں میں اس کتاب کا ایک ممتاز مقام ہے۔

مخالفین اہل سنت کے دو سو مسائل

مولانا لکھنویؒ نے مذہب مخالف کے دو سو مسائل منتخب کرکے ان پر تبصرہ کرنے اور ہر مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ بعض حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو سو مسائل میں سے ۱۶۱ مسائل پر الگ الگ رسالے شائع بھی ہوچکے تھے[1] مگر اب اس میں سے صرف پانچ ہی رسائل ملتے ہیں اور باقی سب نایاب ہوچکے ہیں۔ ان پانچ کے علاوہ دوسرے رسائل راقم کی نظر سے نہیں گذر سکے لیکن خوشی کی بات ہے کہ یہی پانچ رسائل ہی اصل حقیقت کو ظاہر کردینے کے لیے کافی ہیں۔ ان مسائل کی ترتیب مولانا نے اس طرح رکھی تھی۔

---

[1] ہفت روزہ حرم، لکھنؤ، ۲۶ر مئی ۱۹۶۴ء

۱۔ الاول من المائتین علی المنحرف عن الثقلین۔ یہ رسالہ مسئلہ تحریف قرآن سے متعلق ہے اور چار حصوں میں منقسم ہے۔

۲۔ الثانی من المائتین۔ یہ رسالہ مسئلہ تقیہ سے متعلق ہے اور تین حصوں میں منقسم ہے۔

۳۔ الثالث من المائتین۔ یہ رسالہ عقیدۂ بدا سے متعلق ہے۔

۴۔ الرابع من المائتین۔ یہ رسالہ حدیث ثقلین کی شرح میں ہے۔

۵۔ الخامس من المائتین۔ یہ رسالہ مسئلہ امامت کی شرح میں ہے اور تین حصوں میں منقسم ہے۔

اب ہم ان رسائل کا مختصر تذکرہ لکھتے ہیں، یہاں خاص بات یہ ہے کہ ہر مسئلہ کے رسائل کے جتنے بھی حصے ہیں وہ اپنا مستقل ایک موضوعِ بیان رکھتے ہیں اس لیے ہم نے انھیں ایک علیحدہ رسالہ کی حیثیت دی ہے۔

الاوّل من المائتین

۱۳۱۔ اقامۃ البرہان علیٰ انّ الشیعۃ اعداء القرآن (حصہ اوّل)

دوسو منتخبہ مسائل میں سے پہلا مسئلہ شیعوں کا عقیدۂ تحریف قرآن ہے جس کی مکمل تحقیق و تفصیل ان چار حصوں میں بیان کی گئی ہے۔ بیس صفحات پر یہ رسالہ مشتمل ہے جس میں مولاناؒ نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ مذہب متعلقہ کی بنیاد مخالفتِ قرآن پر ہے، اس کے بانیوں نے قرآن کو مشکوک اور ناقابل اعتبار بنانے کے لیے بڑے عجیب کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس رسالہ میں مولانا نے قرآن مجید پر مخالفین اہلسنّت کا ایمان نہ ہونے اور نہ ہو سکنے کے بہت سے دوسرے اسباب کے علاوہ تین وہ اسباب خاص طور سے بیان کیے ہیں جنھیں آپ نے امروہہ کے مناظرہ میں مولوی سبط حسن صاحب مجتہد کے سامنے پیش کیے تھے جس کا جواب دینے کے لیے موصوف تین دن تک سرگرداں رہے مگر پھر بھی عاجز رہے۔ ان تینوں اسباب کو ہم تفصیل کے ساتھ اسی کتاب کے ۱۲ویں باب، ۲۴ویں باب اور پھر اسی باب میں کتاب ''تنبیہ الحائرین'' کے ذیل میں بھی اس کی تلخیص لکھ چکے ہیں اس لیے اب یہاں مزید تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔[1]

---

[1] النجم لکھنؤ، ۲۱ رصفر ۱۳۴۴ھ

۱۴۔ قطع الوتین من الذی یستبدل الشک بالیقین (حصہ دوم)

الاول من المائتین کا یہ دوسرا حصّہ ہے۔اس رسالہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ترک قرآن کے بعد مذہب شیعہ نے اپنے لیے کون کون سے مآخذ ایجاد کیے ہیں اور کن کن مفروضہ کتابوں کو قرآن و حدیث کا متبادل قرار دیا ہے۔اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن وحدیث کو چھوڑ کر انھوں نے متعدد مفروضہ کتابوں کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔مثلاً (۱) صحیفہ (۲) حقیر (۳) مصحف فاطمہ (۴) کتاب علیؓ (۵) کتاب شب قدر (۶) نجوم یا جوتش اور (۷) وحی حقانی وغیرہ۔اصول کافی، فروع کافی، صافی شرح کافی جیسی معتبر کتب شیعہ میں ان تمام مآخذ کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ان کے نزدیک ان مآخذ کی عزت وتوقیر قران کریم اور مشکوٰۃ نبوت سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

یہ رسالہ النجم میں پہلی بار ۱۳۴۴ھ میں شائع ہوا تھا پھر اس کے بعد بار بار چھپتا رہا ہے اور پھر علیحدہ سے کتابی شکل مین بھی بار بار شائع ہو چکا ہے اور عام طور سے دستیاب ہے۔

۱۵۔ نہایت الخسران لمن ترک القرآن (حصہ سوم)

اس رسالہ میں کتب معتبرہ شیعہ اور ان کے اصول مسلّمہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ترک قرآن کے بعد دین کی ہر چیز ان کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔موجودہ قرآن پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ازروئے مذہب شیعہ ان میں پانچ قسم کی خرابیاں لازم ہوتی ہیں جن کا دور کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔رسالہ کے آخر میں تحریف قرآن کی دو ہزار سے زائد شیعی روایات کی روشنی میں مولانا نے ایک بڑی لطیف بات یہ لکھی ہے کہ بقول شیعہ دور صحابہ میں قرآن میں تحریف کی جاتی رہی اور دین برباد کیا جاتا رہا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان تمام کارروائیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور سنتے رہے اور انھیں روکنے کی کوئی تدبیر انھوں نے نہیں کی حتیٰ کہ جب آپ خلیفہ بنائے گئے تو اس وقت بھی آپ نے اصلی قرآن کو رائج نہ فرمایا اور اسی محرف قرآن پر عمل کرتے رہے۔یہ بات ان کی شجاعت، حق گوئی اور بہادری کے منافی ہے اس لیے تحریف قرآن کا الزام یہ خود ان پر بھی عائد ہوتا ہے جس سے بری الذمّہ ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ان کے بعض علماء نے اس کی کچھ تاویل کرنے کی کوشش کی ہے جس کا رد مولاناؒ نے اس رسالہ میں کیا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔سب سے پہلے یہ رسالہ ۷؍رجب ۱۳۴۴ھ میں

النجم میں شائع ہوا تھا پھر اس کے بعد علیحدہ سے کتابی شکل میں بھی شائع ہوتا رہا ہے۔

۱۶۔ اجوبۃ المتحرفین فی ترک الکتاب المبین (حصہ چہارم)

اس رسالہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ علماء شیعہ نے ان دلائل کا کیا جواب دیا ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ایمان قرآن مجید پر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، ان جوابات کے دیکھنے سے پورا اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ دلائل بالکل صحیح ہیں اور اُن کے جوابات نا قابل التفات ہیں۔ علماء شیعہ کے ان جوابات کا رد مولانا نے اس رسالہ میں انہی کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے بخوبی کیا ہے جو لائق مطالعہ ہیں۔ سب سے پہلے یہ رسال اور ۲۱ رشوال ۱۳۴۴ھ کے النجم میں شائع ہوا تھا اس وقت سے اب تک برابر شائع ہوتا رہا ہے۔

الثانی من المائتین

۱۷۔ تحذیر المسلمین عن خداع الکاذبین (حصہ اوّل)

دنیا میں جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جس کو کسی زمانے میں بھی کسی نے اچھا نہیں سمجھا، اہل مذہب اور لا مذہب سب ہی اس سے نفرت کرتے ہیں لہٰذا جس مذہب و ملّت میں جھوٹ بولنا اعلیٰ ترین عبادت ہو اس کے باطل ہونے میں کسی کو کیا شک ہو سکتا ہے اور اس کے لوگ اگر کسی بات کی خبر دیں یا کوئی روایت بیان کریں تو اس پر کوئی اعتبار کر سکتا ہے۔ اگر جھوٹ بولنے کی بوقت ضرورتِ شدیدہ عوام کے لیے جائز کیا جاتا تو اس میں اتنی قباحت نہ تھی مگر جب یہ بات جائز سے بھی زیادہ ترقی کر کے فرض و واجب ہو جائے اور اس کو عبادت کہا جانے لگے تو یقیناً عقل سلیم اس کو کبھی پسند نہیں کر سکتی۔

اس رسالہ میں مخالفین اہلسنت کی چار اہم اور مستند مذہبی کتابوں کے حوالے سے جن کو وہ لوگ اپنے مذہب کے اصول اربعہ کہتے ہیں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تقیہ کا ان کے یہاں بڑا درجہ ہے اور بقول امام جعفر صادقؒ دین کے دس حصّوں میں نو حصّے تقیہ میں ہیں اور جو شخص تقیہ نہ کرے اس کے پاس دین نہیں ہے۔[1] اس لیے جب دین کا اتنا بڑا حصہ تقیہ میں حاصل ہوتا ہے تو اس سے

[1] اصول کافی، باب التقیہ، ص ۴۸۲ مطبوعہ لکھنؤ

بڑھ کر ثواب کی دوسری چیز اور کون سی ہوسکتی ہے۔ تقیہ کے لیے خوفِ جان و مال کی بھی شرط نہیں ہے اور یہ نہ صرف جائز اور مباح ہے بلکہ فرض و واجب قرار دیا گیا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ تقیہ اور جھوٹ کی تعریف میں ان کی کتابوں کے مطابق کوئی فرق نہیں ہے اس لیے تقیہ اور جھوٹ کو ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر امام تقیہ کرتا تھا اور ان کا دین ہی تقیہ کرنا تھا۔ بحوالہ کتاب "من لایحضرہ الفقیہ" تقیہ فرض نمازوں کی طرح فرض قطعی ہے، تقیہ نہ کرنے والا بے دین ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں ہمارے علماء کو تقیہ کے مفاسد کے بارے میں کوئی علم نہ ہوسکا تھا اسی لیے ہمارے اکابر محدثین نے اپنی کتب حدیث میں ان کے راویوں سے بھی کچھ روایتیں لے لی تھیں، صدیوں بعد جب تقیہ کا راز کھلا اور مخالفین اہلسنّت کو یہ محسوس ہوا کہ تمام لوگ اس عقیدہ کو سخت نفرت اور حقارت کی نگاہ دیکھتے ہیں تو انھوں نے اس کی تاویلیں کرنا شروع کردیں، پہلی تاویل یہ کی کہ تقیہ جھوٹ کے مترادف نہیں ہے، دوسری تاویل یہ کی کہ تقیہ شدید خوف کے وقت کیا جاتا ہے اور تیسری تاویل یہ کہ تقیہ اہلسنّت کے مذہب میں بھی درست سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا مولانا علیہ الرحمۃ نے ان تمام تاویلات کا اس رسالہ میں رد کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ مخالفین کا عقیدہ ان تمام تاویلات کے برعکس ہے۔

۱۸۔ الحجۃ القویّہ بذکر مواقع التقیہ (حصہ دوم)

اس رسالہ میں ائمہ مخالفین اہلسنّت کے ان مفروضہ مواقع کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن میں انھوں نے تقیہ سے کام لیا ہے اور یہ مواقع تقیہ خود علماء شیعہ کے متعین کردہ اور انہی کی کتب معتبرہ سے ماخوذ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ شیعہ نے ایک ہی مسئلہ کے متعلق مختلف موقعوں پر مختلف فتوے دیئے ہیں، جیسے حالات دیکھے ویسی ہی بات کہہ دی۔ ان حالات میں علماء شیعہ اپنا دامن چھڑاتے ہوئے اکثر یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں مسئلہ میں ہمارے امام نے ایسا فتویٰ بر بنائے تقیہ دیا ہے، چنانچہ ایسے ہی تقیہ کے تقریباً چالیس واقعات مولاناؒ نے ان کی کتابوں سے لے کر یہاں نقل کیے ہیں۔ تقیہ کی یہ مثالیں عقائد اور اعمال دونوں ہی سے متعلق ہیں۔ ان مباحث کی تنقیحات سے رسالہ میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ تقیہ مذہب مخالف کا رکن اعظم ہے اور اس کی اعلیٰ ترین عبادت ہے اور یہ کسی قسم کے ڈر، خوف یا ضرورت شدیدہ کے ساتھ مشروط نہیں ہے،

مزید پھر اس بات کی مدلل وضاحت کی گئی ہے کہ تقیہ کے معنی سوا جھوٹ اور کذب بیانی کے اور کوئی دوسرا معنی نہیں ہے۔

۱۹۔ التحفة البهيّة فی نتائج التقیہ (حصہ سوم)

اس رسالہ میں درج ذیل دو باتوں کی وضاحت کی گئی ہے، اوّل یہ کہ ائمہ شیعہ سے جو حدیثیں منقول ہیں ان میں باہم بے حد اختلاف ہے جن کا اقرار خود علماء شیعہ بھی کر چکے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر موقعہ پر یہ معلوم کرنا انسان کی طاقت سے بالاتر ہے کہ یہ اختلاف کس سبب سے ہے، آیا یہ تقیہ کی وجہ سے ہے یا کسی اور وجہ سے۔ دوم یہ کہ ائمہ کے اصحاب نے دین کے اصول و فروع کو براہِ راست ائمہ سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ ثقہ اور غیر ثقہ جو کوئی بھی ان کو مل جاتا اس سے احکامِ دین سیکھ لیتے تھے اور یہی ان کے لیے حکم بھی تھا، حیرت کی بات ہے کہ امام معصوم زندہ موجود ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے مگر اصحاب امام ان کے بجائے ہر فاسق و فاجر سے علم دین حاصل کر لیتے ہیں لیکن امام سے نہیں حاصل کرتے۔ درحقیقت وہ ایسا کرنے پر مجبور بھی تھے، وہ اگر ایسا نہ کریں اور یہ نہ کہیں تو اصحاب ائمہ کے باہمی اختلافات کا وہ کیا جواب دے سکتے ہیں۔ اگر اصحاب ائمہ کے جمیع علوم کا ائمّہ سے ماخوذ ہونا تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کا جواب ناممکن ہے کہ ائمّہ کی زندگی ہی میں ان میں باہم اس قدر شدید اور کثیر اختلاف کیوں تھا۔ اس رسالہ میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ اصحاب ائمّہ میں باہم لڑائیاں بھی ہوتی تھیں یہاں تک کہ آپس میں سلام وکلام بھی موقوف ہو جاتا تھا۔ انہی اسباب سے یہ کہا جاتا ہے کہ ائمہ کے مذہب اصلی کے بارے میں یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا تھا۔ جب بانیانِ مذہب کے عقائد صحیحہ کا ہی علم نہ ہو تو دوسرے پیروکاروں کے عقائد کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔

الثالث من المائتين

۲۰۔ مسئلہ بدا کی تحقیق

اس رسالہ میں مخالفین اہلسنّت کے ایک بہت اہم عقیدے کی نشاندہی کی گئی ہے جس کو عقیدۂ بدا کہتے ہیں۔ اس عقیدہ پر ان کے یہاں خدا کی طرف سے بڑے عظیم ثواب کا وعدہ کیا گیا

ہے، ان کی احادیث میں ہے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بداء پر کتنا ثواب ملتا ہے تو اس پر عمل کرنے میں کبھی سستی نہ کریں، کوئی نبی دنیا میں ایسا نہیں بھیجا گیا ہے جس سے بداء کا اقرار نہ کرالیا گیا ہو[1]۔

اہل زبان کے مطابق بدا کے معنی کسی ایسی بات کا معلوم ہو جانا ہے جو پہلے سے معلوم نہ ہو۔ قرآن مجید میں بھی اس کے یہی معنی نکلتے ہیں یعنی نامعلوم چیز معلوم ہو جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں، ایک صورت تو یہ ہے کہ جو بات اب معلوم ہوئی ہے پہلے اس کے برخلاف علم تھا جو اب غلط ثابت ہو گیا اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس خاص بات کا پہلے کچھ علم نہ تھا لیکن اب علم ہو گیا ہے، اس طرح پہلی صورت 'جہل مرکب' کی ہے اور دوسری 'جہل سادہ' کی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بدا محض جہل کے معنوں میں ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نعوذ باللہ خدا کو بدا ہوتا ہے یعنی، نقل کفر کفر نہ باشد، خدا جاہل ہے اور اس کا علم اکثر غلط ثابت ہوتا رہتا ہے جس کی بنا پر اس کو اپنا فیصلہ بھی بار بار بدلنا پڑتا ہے، فریق مخالف کی معتبر کتابوں میں خدا کے بدا ہونے کے متعدد واقعات بطور ثبوت کے ذکر کیے گئے ہیں جن کو مولاناؒ نے اس رسالہ میں حوالہ کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کی روشنی میں یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ مخالفین کو خدا کے بدا ہونے پر اصرار ہے اور بدا جہل ہی کا دوسرا نام ہے۔ مخالفین کے بعض علماء نے تقیہ کی طرح بدا سے بھی انکار کیا ہے مگر مولاناؒ نے خود انہی کی کتابوں سے اس انکار کو رد کیا ہے اور ان کی ہر تاویل کی تردید کی ہے۔ آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ دراصل مخالفین نے اپنے مذہب کو بچانے کے لیے تقیہ اور بدا کا سہارا لیا تھا مگر یہ سہارا بھی کچھ مددگار ثابت نہیں ہوا اور اس کی جتنی تاویلات کی جاتی رہیں بات اتنی ہی بگڑتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے مسلمان سمجھ گئے کہ یہ لوگ نعوذ باللہ خدا کو جہل کے عیب سے متہم کرنا چاہتے ہیں اور اس کی آڑ میں اپنے اماموں کی غلط پیشین گوئیوں، ان کے آپس کے اختلاف اور ان کے اصحاب کی دروغ گوئیوں کی پردہ پوشی کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اسی ضمن میں مولاناؒ نے مولوی سیّد دلدار علی غفراں مآب مجتہد اور مولوی سیّد حامد حسین مجتہد وغیرہ کے اقوال کی اچھی طرح خبر لی ہے اور مزید برآں اصول کافی کی روایات اور شیعی رسالہ 'سہیل' لکھنؤ کی تحریرات کی اصل حقیقت ظاہر کے تقیہ اور بدا کی چادر تار تار کر دی۔

---

[1] اصول کافی ص ۸۴ مطبوعہ لکھنؤ

اس رسالہ کو چار فصل اور ایک خاتمہ پر تقسیم کیا گیا ہے۔ فصل اوّل میں عقیدۂ بدا کی اہمیت، اور تاکید و فضائل کا بیان ہے، فصل دوم میں بداء کے معنی کا بیان ہے، فصل سوم میں اُن اسباب کو بیان کیا گیا ہے کہ عقیدۂ بدا کی ایجاد سے ان بانیان مذہب کا کیا مقصد تھا، فصل چہارم میں ان کے علماء نے بدا کے متعلق جو تاویلات کی ہیں ان کا جواب ہے اور خاتمہ میں "سہیل" لکھنؤ کے پردہ نشیں محقق و مدیر (مولوی سبط حسن مجتہد) کے لیے اس رسالہ کے جواب کے لیے کچھ ہدایتیں درج کی گئی ہیں۔

الرابع من المائتین

۲۱۔ شرح حدیث ثقلین

ملّت اسلام پر مختلف حیثیتوں اور مختلف انداز سے ہر زمانے میں یورشیں کی گئی ہیں، کبھی تقیہ اور کتمان حق کو ڈھال بنایا گیا ہے، کبھی قرآن مجید کو مشکوک اور نامعتبر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور کبھی وضعی اور فرضی حدیثیں ہمارے حدیثی ذخیرہ میں خلط ملط کردینے کی کوششیں کی گئیں۔ ان سب کے علاوہ ایسا بھی بکثرت ہوا ہے کہ اسلامی معاشرے میں صوفیاء و مشائخ، علماء وفقہا اور مفتیوں وقاضیوں کے بھیس میں برسوں تک اسلامی عقائد کے علی الرغم اپنے مفروضہ اعتقادات کی تبلیغ و تشہیر کی جاتی رہی ہے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر بفضلہٖ تعالیٰ دین اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکا جو کہ محض حفاظتِ خداوندی کا نتیجہ تھا۔ منجملہ ایسی کارروائیوں میں ایک حدیث ثقلین کا بھی بے جا استعمال ہے۔ اس رسالہ میں حدیث ثقلین کی اصل حقیقت کا بیان مولانا علیہ الرحمۃ کے تفردات میں سے ہے، اس سے پہلے ہمارے اکابر نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہ دیا تھا اس لیے جیسا کہ حق تھا اب تک کشف حقیقت نہ ہوسکی تھی۔

حدیث ثقلین کے الفاظ جو عام طور پر مشہور ہیں یہ ہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انی تارک فیکم الثقلین ان تمسکم بھما لن تضلو ابعدی کتاب اللہ و اھل بیتی و انھما لن یفترتا حتیٰ یردا علی الحوض یعنی بہ تحقیق میں تم لوگوں میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر تم ان دونوں چیزوں سے تمسک کروگے تو میرے بعد ہرگز

گمراہ نہ ہوگے، (یہ دو چیزیں) کتاب اللہ اور میرے اہل بیت ہیں اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ یہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں گے (یعنی قیامت تک اور قیامت کے بعد بھی ان میں باہم جدائی نہ ہوگی)

یہ حدیث مخالفین صحابہ میں بڑی اعلیٰ پایہ کی مانی گئی ہے اور اسی پر ان کے مذہب کی چکی گھوم رہی ہے۔ اس کی صحت قرآن مجید، احادیث رسول اور ائمہ معصومین سے ثابت کی گئی ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ اہلسنّت کے یہاں بھی یہ روایت تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے برعکس اہلسنّت کے یہاں اس کو اخبار احاد سے زیادہ کوئی رتبہ نہیں ملا بلکہ احاد کی بھی اعلیٰ قسم میں یہ شامل نہ ہوسکی حتیٰ کہ صحیح بخاری بھی اس کے ذکر سے خالی ہے اور صحیح مسلم میں بھی ان الفاظ میں نہیں ہے۔

مخالفین کا کہنا ہے کہ اس حدیث ثقلین میں اہل بیت سے مراد بارہ امام ہیں اور تمسک سے مراد بارہ اماموں کے احکام پر عمل کرنا ہے۔ وہ بڑے زور و شور سے اس حدیث کو اہلسنّت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس حدیث سے بارہ اماموں کا واجب الاتباع ہونا ثابت ہوتا ہے جس سے ان کے معصوم ہونے کی بھی صراحت ہوتی ہے، مزید برآں چونکہ اہلسنّت کا مذہب اس حدیث کے قطعاً خلاف ہے اس لیے وہ قابل رد ہے۔ 'مصباح الظلم' کے شیعہ مصنّف نے اس حدیث سے علماء اسلام کی بے تعلّقی و بے توجّہی پر بڑی گریہ وزاری کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت عمر کے ایک جملہ حسبنا کتاب اللہ نے اس عظیم الشان حدیث کو بے وقعت بنا دیا جس سے عالم اسلام میں یہ حدیث قابل التفات نہ رہی۔

اہلسنّت کا کہنا ہے کہ اس حدیث میں لفظ اہل بیت سے بارہ اماموں کا مراد لینا قطعاً غلط ہے، لفظ اہل بیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے علاوہ اور کوئی دوسرا مراد نہیں ہوسکتا۔ تمام مسلمانوں نے اس سے یہی سمجھا ہے اور یہی روزمرّہ میں بھی داخل ہے، اگر بالفرض ازواج کے ساتھ اولاد، داماد یا چچیرے بھائیوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو اس سے صرف بارہ کی تخصیص بھی ختم ہوجائے گی اور قیامت تک ہونے والی سب اولاد مراد ہوگی، دامادوں میں حضرت عثمان غنیؓ اور چچیرے بھائیوں میں حضرت عباس اور ان کے بیٹے بھی اہل بیت میں شامل ہوجائیں گے، اس طرح لفظ اہل بیت کے معنیٰ اس قدر وسیع ہوجانے کے بعد تمسّک باہل بیت ناممکن ہوجائے گا اور آج تک کی تمام اولاد اہل بیت، معصوم اور مفترض الطاعۃ ہوجائے گی لہٰذا

تمسک اہل بیت سے ان احکام پر عمل کرنا مراد نہ لیا جائے بلکہ ان کے ساتھ محبت کرنا مراد لیا جائے۔ اس طرح حدیث ثقلین کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کے احکام پر عمل کرو اور میرے اہل بیت کے ساتھ محبت کرو۔ مخالفین کے بیان کیے ہوئے مفہوم پر کئی اعتراضات وارد ہوتے ہیں مثلاً:

۱۔ اگر اہل بیت سے بارہ امام مراد لیے جائیں تو اِس سے جناب سیّدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا زمرۂ اہل بیت سے خارج ہوئی جاتی ہیں۔

۲۔ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو واجب الاتباع اشیاء میں دو چیزوں کو ماننا پڑے گا یعنی قرآن اور اہل بیت، اس میں سنت نبوی کا کوئی مقام نہ رہے گا اور یہ بات دونوں فرقوں کے یہاں ناقابلِ قبول ہے، کتب شیعہ اور جناب امیر علیہ السلام کی احادیث سے قرآن اور سنّت نبوی کا واجب الاتباع ہونا اس درجہ ثابت ہے کہ کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

۳۔ حدیث حدیث ثقلین سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور اہل بیت دونوں قیامت تک دنیا میں موجود رہیں گے اور دونوں کے احکام پر عمل کرنا ہر ایک کے لیے ممکن ہوگا ورنہ غیر موجود پر عمل کرنے کا حکم دینا تکلیف مالا یطاق ہوگا جو کسی طرح جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تینوں باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر حدیث ثقلین سچّی ہے تو قرآن کا محرّف اور اہل بیت کا غائب ہونا غلط ہے اور اگر ان دونوں کا محرّف اور غائب ہونا صحیح ہے تو حدیث ثقلین غلط ہے، ان میں سے جس کسی کو بھی غلط مان لیا جائے تو مذہب مخالف نقشہ سے غائب ہوا جاتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد اگر بقول ان کے حدیث ثقلین پر ہے تو دوسری بنیاد قرآن کے محرف ہونے اور اہلِ بیت کے غائب ہونے پر ہے لہٰذا فیصلہ یہ ہے کہ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہرگز صحیح نہیں ہے اور ایسی بات جو ضروریات قطعیہ کے خلاف ہو وہ قولِ رسول ہو ہی نہیں سکتی۔

مولاناؒ کی تحقیق کے مطابق بخاری میں حدیث ثقلین کا وجود نہیں ہے، مسلم میں قرآن سے تمسک کرنے کا تو حکم ہے مگر وہاں اہل بیت کے لیے کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی ہے، صرف اذکر کم اللہ فی اھل بیتی فرمایا گیا ہے جس میں محض ان کے حقوق کی رعایت کی تاکید ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ جن دو گرانقدر چیزوں کے چھوڑ جانے کا ذکر ہے اس میں قرآن کے بعد دوسری چیز یعنی تمسک باہل بیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث سے اس گرانقدر چیز کا علم ہو جانے کے بعد دوسری چیز کی تلاش کی گئی تو حدیث کی سب سے پہلی کتاب اور تمام کتب

حدیث کی اصل یعنی حضرت امام مالکؒ کی موطا نے پوری پوری رہنمائی کردی، مؤطا میں امام مالکؒ روایت فرماتے ہیں جس کو صاحب مشکوٰۃ نے نقل کیا ہے کہ قرآن کے بعد دوسری چیز سنت رسول ہے، اس طرح یہ راز فاش ہوگیا کہ صحیح مسلم کی جس روایت میں سنت نبوی محذوف تھی وہ مؤطا امام مالکؒ سے واضح ہوگئی، اس طرح اب حدیث ثقلین قرآن و حدیث کے مطابق ہوگئی کہ دو گرانقدر چیزیں تمسک بالقرآن اور سنّت نبوی پر عمل ہی ہیں، یہی دو چیزیں قیامت تک باقی رہیں گی اور امّت کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ مخالفین اہل سنّت نے حدیث ثقلین کے جن الفاظ مشہورہ کی روایت مختلف طرق سے کی ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ روایتیں شیعہ راویوں کی چالاکیوں سے ہمارے یہاں آ گئی ہیں۔

مذکورہ بالا خلاصۂ بحث کو مولاناؒ نے اس رسالہ میں بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مع ضروری حوالوں کے تحریر کیا ہے۔ پورا رسالہ دو حصّوں میں منقسم ہے، پہلے حصّے میں صرف متنِ حدیث پر بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصّے میں اس کی سند کی تحقیق کی گئی ہے جس میں ایک مقدمہ ایک مقصد اور ایک خاتمہ ہے۔ یہ رسالہ بھی متعدد بار النجم، الداعی اور بعض دوسرے جرائد میں چھپتا رہا ہے اور علیحدہ سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے مگر اب کمیاب ہے۔

الخامس من المائتین

۲۲۔ شرح مسئلہ امامت (حصہ اوّل)

عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ امامت کا مسئلہ ہمارے اور مخالفین اہلسنّت کے درمیان اختلاف کی بنیاد ہے، یقیناً ایک حد تک یہ بات صحیح بھی ہے مگر مولاناؒ کی تحقیق کے مطابق ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف کی بنیاد ایمان بالقرآن کا مسئلہ ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ قرن صحابہؓ کے بعد کلمہ گویان اسلام میں نئے فرقے پیدا ہونے لگے، ان نئے فرقوں کی بنیاد غلط فہمی یا ہوا پرستی پر تھی، ان میں سے کسی کو دین اسلام سے دشمنی نہ تھی اور نہ ہی وہ دین کو بگاڑنا و مسخ کرنا چاہتے تھے سوا اس ایک فرقہ مجوشہ کے کہ جس کو اس کے بانیوں نے جان بوجھ کر محض اسلام کی تخریب کے لیے ہی ایجاد کیا تھا۔[1]

---

[1] شرح مسئلہ امامت حصہ اوّل، النجم، لکھنؤ ۱۳۵۰ھ، ص ۲۔

اس رسالہ میں مولاناؒ نے اس فرقے کی امامت کے بارے میں ان بارہ اعتقادات کا ذکر کیا ہے جس کا حوالہ ان کی معتبر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان اعتقادات کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ جس فرقہ کا یہ عقیدہ ہو وہ اسلام سے خارج ہے کیونکہ ان کے ماننے سے ختم نبوت کا عقیدہ کالعدم ہو جاتا ہے امامت سے متعلق مخالفین کے یہ بارہ عقائد اس طرح ہیں:

(۱) امامت اصول دین میں ہے (۲) دنیا کسی وقت بھی امام کے وجود سے خالی نہیں رہتی، ہر زمانے کے امام کا تقرر منجانب اللہ ہو چکا ہے جن کی تعداد بارہ ہے (۳) یہ بارہ امام ہر بات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مثل ہیں اور آپؐ ہی کی طرح معصوم، مفترض الطاعۃ اور تحلیل و تحریم کے بارے میں صاحب اختیار ہیں (۴) ائمہ کے سارے علوم قرآن و حدیث سے ماخوذ نہیں ہوتے بلکہ ان کے پاس اور بہت سے دوسرے وسائل علم بھی ہیں (۵) ائمہ کے پاس تمام آسمانی کتابیں اپنی اصلی اور غیر محرف حالت میں موجود ہوتی ہیں، وہ تمام ماکان و ما یکون کے عالم ہوتے ہیں اور کوئی چیز ان کے علم سے پوشیدہ نہیں ہوتی (۶) ائمہ کو اسم اعظم یاد ہوتے ہیں اور تمام انبیاء کے معجزات بھی ان کے پاس ہوتے ہیں (۷) ہر امام کو اپنی موت کا وقت معلوم ہوتا ہے اور ان کی موت ان کے اختیار میں ہوتی ہے (۸) امام ہر شخص کو اس کی شکل اور آواز سے دیکھ کر اور سن کر جان لیتا ہے کہ وہ مومن ہے، منافق ہے، ناجی ہے یا ناری ہے (۹) جس طرح انبیاء کا انتخاب خدا کے اختیار میں ہے اسی طرح امام مقرر کرنے کا اختیار بھی خدا ہی کے قبضہ وقدرت میں ہے۔ (۱۰) ہر امام کو خدا کی طرف سے ایک رجسٹر ملتا ہے جس میں ان کے پیروؤں کے نام مع ولدیت کے درج ہوتے ہیں (۱۱) امام کی باتیں ہر شخص کی سمجھ سے باہر ہوتی ہیں جن کو ہر شخص برداشت نہیں کرسکتا (۱۲) بارہویں امام پیدا ہو کر غائب ہو گئے اور غار سرمن رائی میں پوشیدہ ہو گئے ہیں، قرب قیامت وہ ظاہر ہوں گے تو ان کی حکومت تمام دنیا میں قائم ہوگی اور وہ اپنے تمام مخالفین سے انتقام لیں گے۔

مذکورہ عقائد اہلسنّت کے یہاں باطل ہیں، ان کے ماننے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہوتی ہے، ان کا مرتبہ گھٹتا ہے اور آپؐ کے خاتم الانبیاء ہونے کا عقیدہ مجروح ہوتا ہے، مسلمانوں کے یہاں رسول اللہ کے علاوہ کوئی معصوم نہیں، کوئی مفترض الطاعۃ نہیں اور کسی کو حلال و حرام کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ مخالفین کے مذکورہ عقائد کو ان کی معتبر کتابوں کے حوالے سے اس

رسالہ میں ذکر کیا گیا ہے اور ان سب کے علاوہ اور بھی بہت سے دوسرے نوادرات وتحقیقات اس میں درج ہیں جن کو دیکھنے ہی سے پورا اندازہ ہوتا ہے۔ اس رسالہ کے مختلف ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور تلاش کرنے پر اب بھی دستیاب ہو جاتے ہیں۔

۲۳۔ شرح مسئلہ امامت (حصہ دوم)

اس رسالہ میں مسئلہ امامت کی دلچسپ تاریخ بیان کی گئی ہے جس سے ثابت کیا گیا ہے کہ امامت کی تاریخ بڑی خونیں تاریخ ہے، ہر دور اور ہر زمانے میں اس کی وجہ سے بے گناہ انسانوں کی خونریزیاں ہوئی ہیں، اس کی وجہ سے دنیا میں بڑے بڑے فسادات برپا ہوئے ہیں۔ کتب مخالفین کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جو جنت سے علیحدہ کیا گیا تھا وہ صرف عقیدۂ امامت کے نہ ماننے سے تھا حالانکہ قرآن مجید اس کے برخلاف کہتا ہے۔ ان کے بقول ہر نبی پر اسی مسئلہ کو نہ ماننے کی وجہ سے مصائب وآفات نازل ہوتی رہی ہیں، جب کوئی نبی مبعوث ہوتا تھا تو اللہ کی طرف سے اس سے عقیدۂ امامت کو قبول کرنے کے لیے کہا جاتا تھا مگر ہر نبی اس سے انکار کرتا تھا جس پر اس کو سزا دی جاتی تھی۔ خاندانِ رسالت میں بھی اسی پر جھگڑے ہوتے رہے اور ہر نسل میں اس خاندان کے اندر امامت کے دعویدار پیدا ہوتے رہے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے جھگڑتے اور سخت وسست الفاظ استعمال کرتے رہے ہیں جس کی مثالیں کتب مخالف سے بقید صفحہ وسطر دی گئی ہیں۔ اب ان باہمی جنگوں کا زمانہ تو گذر گیا مگر آج بھی مخالفین ان برادرکش لڑائیوں کو ایک دستاویز بنائے ہوئے ہیں اور دو گروپوں میں جو اقلیت میں ہوتا ہے اس کا وہ ساتھ دیتے ہیں اور دوسرے پر جو اکثریت میں ہوتا ہے ان پر تبرا اور لعن طعن کرتے ہیں۔ خاندان رسالت میں گنتی کے چند لوگوں کو مانتے ہیں، باقی بے گنتی بے شمار نفوس پر لعنت کرتے ہیں۔ یہ رسالہ پہلی بار النجم، شوال، ذیقعدہ ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوا تھا جب سے اکثر شائع ہوتا رہتا ہے اور اب بھی مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہو جاتا ہے۔

۲۴۔ شرح مسئلہ امامت (حصہ سوم)

مسئلہ امامت کا تیسرا اور آخری حصہ بھی مرتب ہو کر شائع ہوا تھا جس میں مخالفین اہلسنّت کے فرضی ائمہ کے کچھ کارنامے ہدیۂ ناظرین کیے گئے تھے مگر افسوس ہے کہ راقم کو اس کے مطالعہ

کی سعادت حاصل نہیں ہوسکی۔

۲۵۔ مقدمہ جائس

مذکورہ بالا نام سے بھی ایک رسالہ مولاناؒ کا شائع ہوا تھا مگر اب یہ نایاب ہوگیا ہے اس لیے اس کے بارے میں کچھ لکھنے سے ہم قاصر ہیں۔

۲۶۔ النصّرۃ الغیبیہ علی الفرقۃ الشیعیہ

یہ کتاب لکھنؤ کے اُس مناظرہ کی روداد ہے جو ذی قعدہ ۱۳۱۲ھ میں شیعہ وسنّی کے درمیان ہوا تھا جس میں شیعوں کی طرف سے مولوی فدا حسین اور نواب مولوی مہدی حسن اور سنّیوں کی طرف سے مولوی عبدالحکیم صاحب مناظر بنائے گئے تھے۔ اس مناظرہ کی مکمل روداد خود مولانا لکھنویؒ نے مرتب کر کے شائع کی تھی، یہ زمانہ مولانا لکھنویؒ کی طالب علمی کا تھا مگر آپ اس مناظرہ میں خود بطور معاون مناظر شریک ہوئے تھے۔ اس طرح یہ کتاب بھی آپ کی ابتدائی تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ مناظرہ کا بنیادی موضوع یہ تھا کہ شیعوں کا دعویٰ تھا قرآن مجید کی آیت انّما ولیکم الله ورسوله...... وهم راكعون (سورہ مائدہ: ۵۵) سے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی خلافت بلافصل ثابت ہوتی ہے جس کے ثبوت میں انھوں نے اہلسنت کی کتابوں سے ۶۷ شواہد پیش کیے تھے مگر سنیوں کی طرف سے مولوی عبدالحکیم صاحب نے ان سب کا رد کیا تھا۔ مناظرہ کی یہ تمام کارروائی وقفہ وقفہ سے تقریباً تین ماہ تک چلتی رہی، جب مخالفین نے اپنے دلائل کو بے اثر ہوتے ہوئے دیکھا تو انھوں نے مناظرہ کو درمیان ہی میں ادھورا چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرلی، اس طرح سب لوگوں نے ان کی شکست فاش کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مولاناؒ نے مخالفین اہلسنّت کے تمام شواہد تحریر کرنے کے بعد ان پر اپنی طرف سے مزید دس 'فوائد' تحریر فرمائے اور مخالف مناظر نے جن جن کتابوں اور حوالوں کو اپنی کتابوں میں پیش کیا تھا ان پر بھرپور نقد و تبصرہ لکھ کر روداد میں شامل کر کے شائع کردیا۔ پوری روداد میں آپ نے جابجا مفید حواشی بھی تحریر کیے ہیں جس سے اس کی علمی حیثیت اور بھی بلند ہوگئی ہے۔ یہ روداد مطبع مجتبائی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔

ردّ قادیانیت وبدعت

۱۔ اُردو ترجمہ ازاحۃ العیب عن مبحث علم الغیب (عربی)

حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنویؒ (م ۱۹۲۵ء) کے عربی رسالہ کا یہ اُردو ترجمہ ہے۔ مؤلف رسالہ نے اس میں دلائل قطعیہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت علماء اہلسنت اور علماء بریلی کے درمیان بڑے شدومد سے زیر بحث تھا چنانچہ علماء اہلسنّت کے موقف کی تائید میں حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ نے یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا جس کو بعد میں مولانا لکھنویؒ نے اس کو اُردو میں ترجمہ کر کے شائع فرمادیا تھا۔ مولانا لکھنویؒ نے اس ترجمہ کے ساتھ اپنا ایک دیباچہ بھی تحریر کیا تھا جس میں اصل کتاب کا تعارف اور اس کی تالیف کا پس منظر بیان کیا ہے۔ ہم یہاں اسی دیباچہ کے کچھ حصّوں کو پیش کررہے جس سے اس کی اہمیت اور ضرورت کا پتہ چلتا ہے:

"نہایت رنج وافسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں ایک شرذمۂ قلیلہ چند روز سے یہ شور مچا رہا ہے کہ حضرت اکرم الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے، جو اس عقیدہ کا انکار کرے اس پر طعن وتشنیع کی جاتی ہے، اس کی تکفیر وتفسیق کے آوازے بلند کیے جاتے ہیں اور معاذ اللہ حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے حالانکہ یہ عقیدہ سلف سے آج تک کسی کا نہ تھا اور صریح آیات قرآنیہ اس کی تکذیب کرتی ہیں اور بہ ندائے بلند اعلان کررہی ہیں کہ عالم الغیب سوا ذات پاک خداوند عالم کے اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا عالم الغیب نہ ہونا مسلمانوں کے روزمرّہ میں داخل ہوگیا ہے اور بہت سے واقعات متواترہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں، آج یہ کہا جاتا ہے کہ عالم الغیب نہ کہنا موجب توہین حضرت رسالتؐ ہے، کل کہا جائے گا کہ مرتبۂ الوہیت سے آپ کے مرتبہ کو کم سمجھنا موجب توہین ہے، معاذ اللہ من ذالک، سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ کا احصاء ہم لوگوں کے امکان سے باہر ہے جو وصف آپ کا ہے وہ ایسا کامل اور بے نظیر ہے کہ کسی دوسرے میں اس وصف کا سوا نام کے پتہ بھی نہیں ملتا...... المختصر اس حالت کو دیکھ کر حضرت استاذ علامہ عم فیضہٗ نے تین رسالے اس باب میں تالیف کیے، ایک کا نام

"التحقیق المجتبیٰ فی علم المصطفیٰ" دوسرے کا نام "البیان الصائب فی تفسیر علم الغائب" اور تیسرے کا نام "ابراز المکنون فی مبحث العلم بما کان و ما یکون" ہے۔ یہ تینوں رسائل بے مثل تحقیقات پر مشتمل ہیں اور ان میں بدلائل ثابت کر دیا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ہے اور نہ کوئی عالم ما کان و ما یکون ہے۔ ان رسائل کو جس نے غائر نظر سے دیکھا ہے اور وہ فہم کلام اعلام کی استعداد رکھتا ہے اس کو کسی قسم کا شک و شبہ اس مسئلہ میں نہیں رہ سکتا......

اب حال میں حضرت استاذ علامہ نے ایک نہایت مختصر رسالہ اور تالیف فرمایا ہے جو تمام رسائل سابقہ کا عطر اور ان کی روح ہے، محض بغرض تعمیم نفع یہ رسالہ ترجمہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔[1]

اس طرح یہ ترجمہ حامل المتن تیرہ صفحات پر مشتمل رسالہ النجم لکھنؤ میں ۱۹۰۷ء کے شمارہ میں بطور ضمیمہ شائع ہوا تھا اور آج بھی مختلف بڑی لائبریریوں میں موجود ہے۔

۲۔ رفع النزاع عمّا یتعلق بالسّماع

اس اُردو رسالہ میں مشہور اختلافی مسئلہ غنا اور مزامیر کو مکروہ تحریمی ثابت کیا گیا ہے اور مستند فقہی کتابوں سے اس کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ غالباً یہ رسالہ چھپ نہیں سکا۔ ہماری نظر سے اس کا حوالہ صرف علم الفقہ میں گذرا ہے اور اب اس کا مسوّدہ بھی نایاب ہو چکا ہے۔[2]

۳۔ صداقت کا نشان بجواب نبی کی پہچان

یہ کتاب قادیانیت کے رد میں تھی۔ اس کے مسوّدے کے آخر میں کچھ تائیدی اور توصیفی عبارت حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیری علیہ الرحمۃ بانی و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بھی درج تھی۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب بھی چھپ نہیں سکی اور اب اس کا مسوّدہ بھی امتدادِ زمانہ کی وجہ سے نایاب ہو گیا ہے۔

۴۔ ہدایت اہل امریکہ

ریاست متحدہ امریکہ کے جزیرہ ٹرینی ڈاڈ کے مسلمانوں کے کچھ ضروری سوالات جو انھوں نے قادیانیت کے بارے میں کیے تھے ان کے تشفی بخش جوابات اس رسالہ میں درج کیے گئے

---

[1] اردو ترجمہ ازاحۃ العیب، ص ۲-۳، النجم ۱۳۲۵ھ-۱۹۰۷ء [2] علم الفقہ، جلد ۶، ص ۲۳

تھے جس سے مرزائیت کا خرمن خاکستر ہو گیا تھا۔ خانقاہ رحمانیہ مونگیر نے اس کو اسی زمانہ میں شائع بھی کر دیا تھا مگر اب نایاب ہے اور ہمارے مطالعہ میں نہیں آسکا۔

۵۔ القول الاحکم

یہ رسالہ بھی ردقادیانیت میں حیات مسیح علیہ السلام کے متعلق ایک معتبر و مستند رسالہ تھا، غالباً یہ بھی خانقاہ رحمانیہ سے شائع ہو چکا ہے مگر ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

۶۔ نبوت کی ضرورت

یہ رسالہ بھی ردقادیانیت میں ہے اور النجم لکھنؤ میں شائع ہو چکا ہے۔[1]

۷۔ تحفۂ محمدیہ

اس رسالہ کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات نہیں حاصل ہو سکیں، اس کا حوالہ ہمیں صرف ہفت روزہ 'حرم' لکھنؤ میں نظر سے گذرا ہے۔[2]

متفرق تصانیف

۱۔ کتاب الصلوٰۃ

مولانا لکھنویؒ نے مسلم معاشرہ کی اصلاح کی جو تحریک چلائی تھی اس کی بنیاد نماز پر تھی چنانچہ آپ جب بھی وعظ فرماتے اس کا بنیادی موضوع نماز ہی ہوتا تھا۔ بعض تعلق رکھنے والے حضرات کے اصرار پر ۱۹۱۹ء میں نماز سے متعلق ان مضامین کو کتابی شکل میں آپ نے جمع فرما دیا تھا اور ''نماز کی کتاب'' اس کا نام تجویز فرمایا جو بعد میں 'کتاب الصلوٰۃ' کے نام سے مشہور ہوئی، چند سال پہلے اس کا ایک ایڈیشن 'نماز کی عظمت' کے نام سے بھی شائع ہوا تھا۔ ۱۷۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اب تک درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور برصغیر کے بہت سے مدارس اسلامیہ میں داخل درس ہے۔ حضرت مؤلفؒ نے کتاب الصلوٰۃ کو ترتیب دینے کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نماز کے متعلق چار کاموں کی ضرورت ہے۔ اوّل نماز کی محبت دل

---

[1] النجم لکھنؤ ۲۱ رشعبان ۱۳۴۴ھ [2] ہفت روزہ حرم لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

میں قائم کی جائے جو کم از کم اتنی تو ہو جتنی بلا تشبیہ ایک غریب مفلس کو اپنے مال سے ہوتی ہے یا ایک افیونی کو اپنی افیون سے ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ تاکید کی جائے کہ پانچ وقت کی نماز کی پابندی جماعت اور مسجد کے ساتھ ادا کی جائے۔ سوم نماز کے ضروری مسائل کا علم حاصل کیا جائے اور چہارم نماز کے اندر جو چیزیں پڑھی جاتی ہیں ان کے معانی اور مطالب سے واقفیت حاصل کی جائے۔

پوری کتاب کو تین رسالہ میں تقسیم کیا گیا تھا، پہلے رسالہ میں نماز کی عظمت و رفعت کا بیان ہے اور یہی چیز اس رسالہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ دوسرے رسالہ میں نماز کا طریقہ اور اس کے ضروری مسائل کا بیان ہے۔ تیسرے رسالہ میں اذکار نماز کا ترجمہ ہے اور اسی سلسلہ میں ایک ربع پارہ عم کا ترجمہ اور مختصر تفسیر بھی ہے۔ پوری کتاب کا خاکہ تو اسی طرز پر متعین کیا گیا تھا مگر غالباً یہ مکمل شائع نہیں ہوسکا، اس وقت اس کتاب کا صرف پہلا رسالہ ہی چھپی ہوئی شکل میں ملتا ہے۔

اس رسالہ کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ قرآن مجید سے نماز کا رتبہ دکھایا گیا ہے مگر ساتھ ہی کچھ احادیث و آثار بھی آیات کے ساتھ بیان کردیئے گئے ہیں تاکہ مطالب قرآنیہ کی مزید توضیح ہوجائے لہٰذا اس رسالہ کو بھی چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں قرآن مجید کی آیات کریمہ ہیں، دوسرے باب میں کچھ احادیث نبویہ ہیں۔ تیسرے باب میں صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال ہیں اور چوتھے باب میں نماز کی خصوصیات اور خوبیاں عقلی پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔

رسالہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ۹۹ آیات سے نماز کی عظمت اور فضائل بیان کیے گئے ہیں پھر تقریباً ساٹھ احادیث سے متعلقات نماز کا بیان ہے۔ مزید برآں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان تمام آیات اور احادیث کا پہلے آسان اُردو میں ترجمہ بھی لکھا گیا ہے، پھر ان کی مختصر تفسیر لکھی گئی ہے اور اسی ضمن میں جو مسائل فقہیہ آئے ہیں انھیں بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے۔ یہ رسالہ مولاناؒ کی مقبول ترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

۲۔ تحفۃ الاسلام لجمیع الاقوام

مئی ۱۹۳۶ء میں تمام مذاہب کی ایک کانفرنس لکھنؤ میں یہ جاننے کے لیے منعقد ہوئی تھی کہ سب سے سیدھا، سچا اور آسان مذہب کون سا ہے؟ اس کانفرنس کے داعی بابا صاحب امبیڈکر کی

قائم کردہ ایک انجمن کے اراکین تھے جن کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ہندوستان میں رائج پانچ بڑے مذاہب میں کون سا مذہب اپنی تعلیمات اور اعمال کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے تاکہ ہریجن لوگ اسی کو اپنے لیے منتخب کرلیں۔ اس کانفرنس میں مولاناؒ نے نہایت کامیاب اور دل نشیں انداز میں مذہب اسلام کی حقانیت اور اس کی خوبیاں بیان کی تھیں جس کا خلاصہ بعد میں کتابی شکل میں شائع کردیا گیا تھا۔ اس وعظ کا اثر یہ ہوا کہ پانچ پانچ اور دس دس افراد کے جتھوں میں ہریجن حضرات 'دارالمبلغین لکھنؤ' آتے اور آپ کے دست حق پر داخل فلاحِ دارین ہوتے تھے۔

اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے باب میں اسلامی تعلیمات آٹھ خصوصیات کا ذکر کیا گیا تھا، مثلاً اسلام کی محفوظیت، اکملیت، حریت و مساوات، عالم گیریت کے علاوہ اس کا سہل العمل اور قوی التاثیر ہونا ثابت کیا گیا ہے اور مزید یہ کہ ان تعلیمات میں کوئی جبر و اکراہ نہیں بلکہ اس میں دوسرے ادیان کے احترام کی بھی ہدایت دی گئی ہے۔ پوری کتاب میں ہر جگہ اپنے بیان کا استدلال آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے نتائج پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سلسلہ میں مولاناؒ نے لکھا ہے کہ کسی مذہب کے اختیار کرنے کا مقصد اصلی خدا کی خوشنودی اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہیے جس کا لازمی نتیجہ فلاحِ آخرت ہی ہے۔ دین اسلام کا منجانب اللہ ہونا، ساری دنیا کے لیے ہونا، قیامت تک کے لیے ہونا اور اس کی تعلیمات کا قابل اطمینان حفاظت کے ساتھ موجود ہونا وغیرہ مضبوط دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، قرآن مجید نے دنیا کی بے ثباتی، دنیاوی زندگی کا خواب وخیال ہونا اور دنیا کی راحت و تکلیف کا عارضی اور وقتی ہونا ایسے موثر اور بلیغ طرز سے بیان فرمایا ہے کہ جس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی، اس کا اثر یہ ہوا کہ قرآن کی ان نصیحتوں نے نہایت قلیل مدّت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی ایک لاکھ چوبیس ہزار انسانوں (صحابہ کرامؓ) کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جو خدا کے ساتھ تعلق رکھنے میں اپنی نظیر آپ تھی۔ اسلام کا دوسرا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس نے یہ تعلیم دی کہ دولت وثروت کی فراوانی اور دنیا کے گونا گوں تعلقات کے باوجود بھی مذہب کا اصلی مقصد حاصل ہوسکتا ہے اسلام میں رہبانیت اختیار کرنا مذموم ہے عمدہ لباس اور عمدہ غذا سے پرہیز کرنا ضروری نہیں بلکہ خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کے ترک کرنے کو عبادت سمجھنا ایک طرح

کی بغاوت ہے۔ اسلام نے اپنے حلقہ بگوشوں کو دنیا کی ہر قسم کی اعلیٰ نعمتوں اور ہر قسم کی عزت و ثروت کا امیدوار بنایا ہے جس کا ثبوت دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

تیسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کے دلائل دیئے گئے ہیں مثلاً یہ کہ آنحضرتؐ کے متعلق آپؐ سے پہلے کے انبیاء کی کتب الٰہیہ میں پیشین گوئیاں ہیں آپ کے معجزات بھی آپؐ کے نبی ہونے کی دلیل ہیں آپ کے تمام زمانہ نبوت میں کوئی دن ظہور معجزات سے خالی نہیں گذرا، آپؐ کا امی ہونا اور اس کے باوجود علوم ربانیہ اور معارف الٰہیہ کا درس دنیا بھی آپؐ کے نبی ہونے کی دلیل ہے۔

چوتھے باب میں اسلامی تعلیمات کا اجمالی بیان ہے جن میں عقائد و اعمال کا مدلل ذکر اور توحید رسالت، قیامت، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ اور مطلق اعمال صالحہ کی اہمیت و فضیلت قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں خود مولانا کے زیر اہتمام دارالمبلغین کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ ایک عرصہ کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن 'اسلام میرا مذہب' کے نام سے ۱۹۶۸ء میں کراچی سے شائع کیا گیا تھا جو کہیں کہیں اب بھی مل جاتا ہے۔ راقم الحروف نے ان دونوں ایڈیشنوں مطالعہ کیا ہے۔

مولانا لکھنویؒ کے جو مناظرے مختلف فرقوں سے ہوئے تھے ان میں اکثر اہم مناظروں کی رودادیں اسی دور میں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، ہم ان سب رودادوں کو باستثناء چند مولاناؒ کی تالیفات تو نہیں مگر 'مثل تالیفات' کے ضرور مانتے ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں، اول یہ کہ ان کا اسلوب اور طرز بیان صاف بتلا رہا ہے کہ ان کی ترتیب آپ ہی کی دی ہوئی ہے چنانچہ بعض رودادوں کے مسودات مولاناؒ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہماری نظر سے گزر بھی چکے ہیں۔ دوم یہ کہ ان رودادوں میں آپ کے علمی مضامین، آپ کی لفظ بلفظ تقریریں اور فریق مخالف سے آپ کی خط و کتابت وغیرہ بھی شامل ہیں، یہ سب مل کر روداد کا اسّی (۸۰) یا نوّے (۹۰) سے فیصد حصہ بنتی ہیں لہٰذا جس کتاب میں اتنا زیادہ مواد مولاناؒ کی تقریروں و تحریروں پر مبنی ہو اس کو 'مثل تالیفات' کا درجہ دینا حق بجانب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض وقتی مصالح کی بنا پر یہ رودادیں بعض دوسرے حضرات کے نام سے شائع ہوئی تھیں جو اکثر یا تو داعیٔ مناظرہ ہوتے تھے یا ان کی

طباعت واشاعت کے وہ ذمہ دار ہوتے تھے مگران کے مندرجات سب مولاناہی کی نگارشات پر مبنی ہوتے تھے لہٰذا اس وقت ہم ان کوآپ کی 'مثل تالیفات' مان کرانکی ایک فہرست درج کررہے ہیں۔ان رودادوں کی تفصیلات اور موضوعات مناظروں کے باب میں درج کیے جاچکے ہیں:

۱۔ صیحۂ رنگون بر پیروانِ دجال زبون: مناظرۂ رنگون قادیانیوں کی لاہوری پارٹی کے سربراہ خواجہ کمال الدین بی،اے،ایل۔ایل۔بی سے ۱۹۲۰ء میں مطبوعہ لکھنؤ۔سنہ ندارد۔

۲۔ صولتِ محمدیہ بر فرقۂ غلمدیہ: کارروائی مناظرہ منعقدہ سابق ریاست بھاگلپور وسفر برائے جرح از قادیانی، مطبوعہ انجم لکھنؤ ۱۹۳۲ء۔

۳۔ شیعوں کے قبلہ وکعبہ ایڈیٹر اصلاح کی ہزیمت: ۱۹۱۳ء شیعہ ایڈیٹر اصلاح کھجوہ ضلع سیوان سے مناظرہ کے لیے سفر، مطبوعہ مفید عام پریس پاٹانالہ لکھنؤ۔سنہ ندارد

۴۔ فتح مبین بر اعدائے ختم المرسلین: روداد مناظرہ ایڈیٹر اصلاح شیعہ ۱۹۱۶ء مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ۔۱۹۱۶ء۔

۵۔ مناظرۂ بمبئی موسوم بہ اسم تاریخی ''رد مذہب شیعہ'': ملامحمد باقر جلال پوری فیض آبادی سے ۱۹۱۶ء میں۔مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ۔

۶۔ مباحثہ چکوال (ضلع جہلم)، پنجاب: مولوی محمد سجاد لکھنوی شیعی سے ۱۹۱۸ء میں، مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ۔

۷۔ مباحثہ مکیریان، ضلع ہوشیار پور (پنجاب) ملقب بہ کشف حقیقت مذہبِ شیعہ: مولوی مرزا احمد علی امرتسری شیعی سے ۱۹۲۰ء میں۔مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ، ۱۳۴۷ء

۸۔ شکستِ عظیم باعدائے قرآن کریم، ملقب بہ الزلزال فی اوّل السوال: مولوی سبط حسن مجتہد سے ۱۹۲۰ء میں بمقام امروہہ، دوحصوں میں۔مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ ۱۹۲۰ء۔

۹۔ ہزیمت شیعانِ پنجاب: مناظرہ کولوتاڑ ضلع گوجرانوالہ، پنجاب: مولوی مرزا احمد علی امرتسری شیعی سے ۱۹۲۳ء میں۔مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ۔

۱۰۔ شفائے روحانی۔سفر برائے مناظرہ شیعان فیض آباد، یوپی۔مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنؤ۔ ۱۳۴۵ھ

۱۱۔ روداد مباحثہ منٹگمری (موجودہ ساہیوال پنجاب) مولوی مرزا احمد علی امرتسری شیعی سے

۱۹۳۰ء میں۔ مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنو ۱۳۴۲ھ۔

۱۲۔ نصرت آسمانی برفرقۂ رضاخانی: مولوی محمد فاخرالہ آبادی سے بھاگلپور (بہار) ۱۹۲۷ء میں۔ مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنو ۱۹۲۷ء۔

۱۳۔ مناظرہ کچھوچھہ مشمولہ نصرت آسمانی: مولوی شاہ علی حسین کچھوچھوی اور سید احمد اشرف کچھوچھوی سے ۱۹۲۰ء میں۔ مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنو ۱۹۲۷ء۔

۱۴۔ تحفۂ لاثانی برفرقہ رضاخانی: مناظرہ بمبئی مولوی نثار احمد کانپوری سے ۱۹۲۵ء میں۔ مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنو ۱۹۲۵ء۔

۱۵۔ عبرت نظارہ درواقعۂ ناںپارہ: مناظرہ مولوی محمد فاخرالہ آبادی سے ۱۹۲۷ء میں۔ مطبوعہ اصح المطابع وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو ۱۹۲۷ء۔

۱۶۔ فتح حقانی برفرقہ رضاخانی: مناظرہ امروہہ، مولوی نثار احمد کانپوری سے ۱۹۲۷ء میں۔ مطبوعہ نامی پریس لکھنو ۱۹۸۲ء۔

۱۷۔ مناظر پورینی ضلع بھاگلپور، بہار: مولوی عبدالماجد بھاگل پوری قادیانی سے ۱۹۱۷ء میں۔ مشمولہ آئینہ کمالات مرزا، مطبوعہ مونگیر سنہ ندارد۔

۱۸۔ تحفۂ ایمانی، مناظرہ ساونت واری کوکن: حافظ روشن علی قادیانی سے ۱۹۲۵ء میں۔ مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنو ۱۳۴۴ھ۔

۱۹۔ صواعق آسمانی برفرقۂ رضاخانی: مولوی حشمت علی پیلی بھیتی سے۔ مطبوعہ عمدۃ المطابع لکھنو سنہ ندارد۔

الحمدللہ اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں مولانا لکھنویؒ کی ایک سو بارہ تصنیفات وتالیفات کی نشاندہی ہو چکی ہے، ہوسکتا ہے کہ ابھی کچھ اور کتابیں اور رسائل بھی ہوں مگر وہ ہمارے علم میں نہیں ہیں۔

حضرت لکھنویؒ کا منظوم کلام

بہت عرصہ سے اس کی تلاش تھی کہ مولانا کا کوئی منظوم کلام مل جائے مگر کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی مولاناؒ نے اپنی اکثر کتابوں رسائل اور مضامین میں بڑے موقع ومحل کے لحاظ سے منتخب

اردو اور فارسی کے اشعار درج کیے ہیں مگر ان کے بارے میں یہ یقین نہیں ہے کہ وہ آپ کے اپنے ہوتے تھے یا کسی اور کے مگر اس سے اتنا تو یقین تھا کہ شعر و سخن کا آپ کو بڑا اچھا ذوق تھا، یہ ذوق آپ کو اپنے خاندانی ورثہ میں ملا تھا، آپ کے والد صاحب مولوی شیخ ناظر علی ناظر کاکوروی بھی ایک قادر الکلام شاعر تھے، اسی تلاش و جستجو میں ہمیں مولانا لکھنویؒ کا ایک قلمی مکتوب ملا جس میں آپ نے فارسی میں اپنے چند اشعار درج کئے ہیں۔ ایک زمانہ میں آپ کا سیوان کا سفر تبلیغی و اصلاحی سلسلہ میں اکثر ہوا کرتا تھا اور وہاں کے حضرات آپ سے بڑا تعلق اور بے حد محبت رکھتے تھے، انہی اسباب سے آپ کو بھی وہاں کے اہل تعلق لوگوں سے خصوصی ربط و ضبط پیدا ہو گیا تھا، ایسے ہی ایک سفر میں سیوان سے واپسی پر وہاں کے احباب اور عقیدتمندوں سے متاثر ہو کر آپ نے فارسی میں چند اشعار حافظ محمد صدیق صاحبؒ نیا بازار سیوان کو اپنے قلم سے لکھ کر بھیجے تھے جنھیں ہم نیچے درج کر رہے ہیں:

اے صبا با اہل سیواں از زبانِ ما بگو — کای سر باطل پرستاں خاک میدانِ شما
سیعہا کردید در ارغام اعدائی رسولؐ — در ترقی باد دائم سعی و سامانِ شما
جند انور یکہ چشم اہل باطل خیرہ کرد — باد روشن تر زمہرو ماہ برہان شما
شیعیاں را نیست بر قرآن ایمان و یقین — مصحفِ عثمانؓ بلاریب است قرآن شما
بر رسول حق چساں ایمان خود ثابت کنند — ہست ایں دولت زمخصوصات از عانِ شما
بس بود بہر شما ایمان و قرآن و نبیؐ — کافی و تہذیب و استبصار قربان شما
ہر فریبی کس میرسی بے کمالے بے ہنر — کز کرم ہائے شما گردید مہمان شما
لطفہا کردید بے امید تحسین و جزا — از خدا آید جزائے لطف و احسان شما

با ہزاراں ابتہال و با ہزاراں التجا
از خدا خواہیم حفظ دین و ایمانِ شما[1]

قابل رشک ہیں وہ اہل سیوان جن کے خلوص و محبت سے متاثر ہو کر آپ نے یہ اشعار نظم کئے تھے۔ یہ اشعار خود آپ نے اپنے قلم سے لکھ کر بھیجے تھے لہٰذا آپ سے ان اشعار کی نسبت قطعی و یقینی ہے۔

---

[1] مکتوب مولانا لکھنویؒ بنام حافظ محمد صدیق صاحبؒ سیوان (بہار) مورخہ ۲۹؍ ربیع الاوّل ۱۳۳۵ھ بروز چہار شنبہ مطابق ۱۹۱۷ء

تیئیسواں باب

مخصوص افکار و نظریات

اس باب میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ حضرت لکھنویؒ کے کچھ وہ خیالات و نظریات اور آپ کی وہ علمی تحقیقات جن کا ذکر اس کتاب میں تفصیلاً اب تک کسی اور جگہ نہیں آیا ہے ضابطہ تحریر میں آجائیں جس سے انہیں سمجھنے میں مزید سہولت ہو۔ اوائل زندگی میں درس و افتاء آپ کا امتیازی وصف تھا اور مناظرہ و تردیدی ادب میں آپ کی مشغولیت ثانوی حیثیت رکھتی تھی مگر اتفاق ایسا ہے کہ یہی دوسری حیثیت زیادہ شہرت پا گئی۔ آپ کی پوری زندگی پر اگر غائر نظر ڈالی جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ تین ادوار پر منقسم تھی۔ پہلا دور تعلیم کے بعد خالص وعظ و نصیحت، مذہبی عقائد و مسائل کی تبلیغ اور اسی سلسلے کے مضامین اور کتابیں تصنیف و تالیف کرنے کا تھا۔ دوسرا دور فرقِ باطلہ اور اہل حق سے متصادم جماعتوں سے مناظرہ و مدافعت کا تھا اور تیسرا آخری دور خالص سلوک و طریقت کا تھا جس میں تمام مشاغل سے کنارہ کش ہو کر صرف اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ پوری زندگی انتہائی مصروف، اسفار میں رواں دواں، اپنے دینی و ملی افکار کی تبلیغ و اشاعت اور پرورش لوح و قلم میں گذری۔ آپ بیک وقت بہترین واعظ و خطیب، کامیاب مناظر، ماہر مدرس، صاف گو صحافی اور معتبر مصنف تھے۔ آپ کے تمام افکار و نظریات اور علمی خدمات میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے ہر معاملہ میں آپ کا اعتدال و توازن، صبر و تحمل، ناخوشگوار حالات کو برداشت کرنے اور ہر مسئلہ پر متانت و سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے کی عادت جو اکثر عام علماء کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہی وہ امتیازات تھے جنہوں نے آپ کو 'حجۃ الاسلام' 'امام اہل سنت' اور مجدد ماءۃ رابع عشر، جیسے وقیع خطابات سے نواز نے پر اہل علم اور اہل قلم حضرات کو مجبور کیا تھا۔ ان صفحات میں ہم پہلے آپ کے فقہی و دینی عقائد

اور شرک و بدعت کے بارے میں مخصوص خیالات وتحقیقات خود آپ ہی کے علمی ذخائر سے چن بٹور کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

عقائد

آپ کی پوری حیات ایک کھلی کتاب کی طرح روشن تھی، آپ کے خیالات وافکار آپ کی تحریروں سے پوری طرح آشکارا ہیں۔ چنانچہ اپنے نجی عقائد کو ایک جگہ اس طرح تحریر فرمایا ہے:

''میرے جو بھی عقائد ہیں ان میں ذرا بھی تلوّن وتغیر نہیں ہے اور یہ وہی عقائد ہیں جو بقیۃ السلف الصالحین، مذکرۃ الاولیاء والکاملین، عالم الاسلام الامام المقدام مولانا سید محمد عبدالسلام احلہ اللہ دار السلام نقشبندی مجددیؒ نے میرے والد مرحوم کو تعلیم فرمائے اور پھر والد مرحوم نے مجھے بچپن میں سکھائے تھے، پھر جناب مرحوم ہی نے حضرت امام ربانیؒ کے اکثر مکاتیب سنائے اور ان کی بعض بعض عبارتیں یاد کرائیں جن میں سے کچھ اب تک یاد بھی ہیں، پھر میرے استاذ جن سے میں نے فقہ، نور الانوار اور تفسیر جلالین وغیرہ پڑھی تھیں وہ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، ان کے بھی میں نے وہی عقائد پائے، پھر جب لکھنؤ حاضر ہوا اور توفیق الٰہی نے استاذ الوقت حضرت مولانا سید عین القضاۃؒ کے آستانہ فیض کاشانہ پر پہنچایا تو انھیں بھی انہی عقائد کا معتقد پایا اور وہ بھی مولانا رشید احمد صاحبؒ اور علماء دیوبند کے معترف ومداح تھے۔ اور پھر جب حضرت کریم وہاب نے میری آنکھ میں کچھ بینائی عطا فرمائی تو میں نے اپنے عقائد کو خوب جانچا اور بحمد للہ تعالیٰ انھیں مطابق شریعتِ طاہرہ کے پایا۔ میں اولیاء اللہ کا منکر نہیں ہوں، اولیاء اللہ تو ایک مفہوم عام ہے، میں جمیع طوائفِ اہلِ حق کو علی تفاوتِ منازل لائق صد احترام سمجھتا ہوں۔ نہ صرف فقہاء ومحدیث ومفسرین بلکہ میں تو حضراتِ صوفیہ کا بھی منکر نہیں ہوں، انھیں خلاصۂ کائنات سمجھتا ہوں خاص کر ساداتِ نقشبندیہ کو مولانا جامی علیہ الرحمۃ کے اس شعر کا بہترین مصداق جانتا ہوں:

بے عنایاتِ حق وخاصانِ حق　　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

اور ان میں بھی خاص طور سے حضرت امام ربانیؒ اور ان کے متبعینِ صادقین کو بہترین نمونہ یقین کرتا ہوں۔[1]''

---

[1] ایک خصوصی مکتوب گرامی حضرت مولانا لکھنویؒ، مملوکہ راقم الحروف

ایک دوسرے مقام پر اپنے ان معتقدات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنے 'مسلک وسط' پر عمل پیرا ہونے کا یوں اظہار کرتے ہیں:

''اس وقت ہندوستان میں تین گروہ اپنے کو اہلِ سنّت و جماعت کہنے کا شرف رکھتے ہیں۔ایک وہ گروہ جو اپنے کو اہلِ حدیث کہتا ہے اور جس کو دوسرے لوگ عام طور پر محمد بن عبدالوہاب نجدی کی طرف منسوب کر کے 'وہابی' کہتے ہیں۔ دوسرا وہ گروہ جو اپنے لیے سنّی حنفی، کا لفظ استعمال کرنے بلکہ اس لقب کو اپنے ساتھ مخصوص کرنے پر اس قدر مصر ہے کہ جیسا کسی زمانہ میں اہل مکہ اپنے کو ابراہیمی اور حنیفی کہنے پر مصر تھے، چونکہ یہ فرقہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی کو اپنا مجدد مانتا ہے اس لیے اس کو 'رضا خانی' کہا جاتا ہے۔اہلسنّت و جماعت کا مسلک اِن دونوں فرقوں کے بیچوں بیچ (وسط) میں ہے جس میں نہ پہلے فرقہ کی سی تفریط ہے کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید صحیح کو حرام و ناجائز کہا جائے اور ولایت خاصہ یعنی تصوّف و احسان یا بالفاظِ دیگر فقر و درویشی کا انکار کیا جائے اور نہ دوسرے فرقہ کی سی افراط ہے کہ علماء صوفیہ کو شارع سمجھ لیا جائے اور ان کو احداث فی الدین کا حقدار مان کر محدثات کو بدعتِ حسنہ کہا جائے۔ ہندوستان میں بالخصوص امامنا الاعظم ابوحنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید اہم واجبات میں سے ہے اور ولایت خاصّہ برحق ہے اولیاء اللہ کے سلاسلِ مشہورہ صحیح، درست اور موصل الی اللہ ہیں، ان کا انکار موجبِ حرمان ہے، دین وہی ہے جو رسولِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا۔ اصولِ شریعت چار ہیں قرآن، سنّت، اجماع اور قیاس۔ جو بات ان چاروں سے ثابت نہ ہو ائمہ مجتہدین اس کو دین میں اضافہ، بدعت اور ضلالت کہتے ہیں۔ یہ بدعت کبھی حسنہ نہیں ہوسکتی کما قال علیہ السلام کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار۔یہی مسلک صحیح اور مسلک وسط ہے جس پر ہمارے سلف صالحین گامزن تھے اور ہندوستان کے اکابر علماء و عرفاء اِسی مسلک کے پابند اور اِسی کی تعلیم و تبلیغ فرماتے تھے۔

مذکورہ بالا سطور سے مولانا علیہ الرحمۃ کے عقائد اور مسلک کی پوری پوری وضاحت ہوجاتی ہے، اس پر مزید کسی تبصرہ اور تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ دونوں تحریریں اتنی جامع اور مکمل ہیں کہ ان سے آپ کے فقہی اور عرفانی دونوں نظریات کا ادراک ہوجاتا ہے۔لیکن اس کے باوجود ہم ان عنوانات پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

فقہی جامعیت

مولانا لکھنویؒ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بیک واسطہ شاگرد تھے۔ اور استاذ الوقت مولانا سید عین القضاۃؒ کے براہِ راست شاگرد تھے اس لیے ان کا وہی فقہی مسلک تھا جو ان علماء کا تھا۔ اسی طرح وہ مولانا محمد علی مونگیریؒ اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے بھی معتمدین میں سے تھے۔ مزید برآں قدیم ہندی علماء میں وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فقہی خیالات سے بھی بہت متاثر تھے چنانچہ وہ حنفی المسلک اور مقلّد تھے۔ تقلید کے جواز میں انھوں نے 'دُرفرید' کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا تھا جو اَب نایاب ہے۔ آپ کے ہمعصر اکابر علماء بھی آپ کے تفقہ کے قائل اور معترف تھے چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ جیسے حضرات نے آپ کی کتاب 'علم الفقہ' کا تتبع کیا تھا۔ آپ کے فقہی مقام کی عظمت و بلندی کے اعتراف میں ہم اپنے دور کے ایک ممتاز عالم دین کی رائے پیش کرتے ہیں جسے انھوں نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا ہے:

> ''مولانا مرحوم (مولانا لکھنویؒ) محشی ہدایہ، فقیہ الہند، خاتم المحققین مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے بیک واسطہ شاگرد اور سنہری سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ مولانا کے اس وصف کا ان سے گہری واقفیت رکھنے والے ممتاز اہل علم تسلیم کرتے اور اس کا برملا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ ہندوستانی علماء کی سب سے زیادہ مستند اور جامع تاریخ 'نزہۃ الخواطر' میں مولانا کے بارے میں ہمیں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں جید النظر فی الفقہ یعنی فقہ میں اچھی نظر تھی۔ اسی طرح مشہور داعی الی اللہ اور عارف باللہ، بانیِ جماعتِ تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس رحمہ اللہ و قدس سرہٗ کا یہ فرمانا کہ — مولانا عبدالشکور صاحب کا یہاں وہی درجہ ہے جو ہمارے اطراف میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تھا — جس سے حضرت تھانویؒ کے دیگر کمالات کی طرح فقہ سے مناسبت تامہ میں بھی مولانا کی مشابہت کا پتہ ملتا ہے۔[1]''

مولانا علیہ الرحمہ بنیادی طور پر ایک فقیہ تھے اور اسی فن سے انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز

---

[1] ''امام اہل سنت اور علم فقہ'' مرتبہ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء و ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ، مشمولہ ماہنامہ البدر کاکوری

بھی کیا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے علم الفقہ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالا تھا جو چھ سات سال تک پابندی کے ساتھ نکلتا رہا، یہی رسالہ بعد میں ان کی کتاب 'علم الفقہ' کی شکل میں چھ جلدوں میں منقسم ہو کر مقبول عوام و خواص ہوا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی معروف کتاب 'الانصاف فی بیان سبب الاختلاف' کا اردو ترجمہ بھی آپ نے وصّاف کے نام سے کیا تھا جو اُسی زمانہ میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ یہ ترجمہ اس بات کا شاہد ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے فقہی نظریات سے آپ کو پورا پورا اتفاق تھا چنانچہ خود آپ کی فکر میں بھی جامعیت، اعتدال اور تطبیقیت کی شان پیدا ہو گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ کے خیالات میں تصلُّب اور جمود بالکل نہ تھا بلکہ فقہا کے درمیان اختلافی معاملات میں میانہ روی کا پہلو اختیار کرتے تھے، 'علم الفقہ' میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ اکثر مختلف فیہ مسائل میں ان کی یہی روش تھی جس سے ان کی وسعتِ نظر اور اصابت رائے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے چنانچہ تقبیل ابہام کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

> "بعض احادیث اس مضمون کی وارد ہوئی ہیں کہ اذان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام گرامی سن کر انگوٹھے کو چومنا چاہیے مگر کوئی حدیث اس سلسلہ میں جلیل القدر محدثین کے نزدیک حجت کو نہیں پہنچتی، سب ضعیف ہیں۔ ان ضعیف احادیث پر عمل جائز ہے بشرطیکہ اس عمل کے سنت ہونے کا خیال نہ کیا جائے اور اس کو کوئی ضروری چیز نہ سمجھا جائے۔ ہمارے زمانے میں افراط و تفریط کی حد ہو گئی ہے۔ اذان میں انگوٹھے چومنے کا اس قدر رواج ہے کہ بعض لوگ اس کو سنت سمجھتے ہیں، اطرافِ دکن میں بعضوں کو اس کے وجوب کا بھی خیال ہے، اگر کوئی نہ کرے تو اس پر لعنت و ملامت کی جاتی ہے لہٰذا ایسی حالت میں اس کا ترک کرنا بہتر ہے[1]"

تقلید و عدم تقلید

برصغیر ہندو پاک میں تقلید و عدم تقلید کا مسئلہ ہمیشہ سخت باہمی آویزش کا مسئلہ رہا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اچھا خاصا لٹریچر تیار ہو چکا ہے، اس موضوع پر فریقین کے درمیان بڑے مناظرے ہو چکے ہیں۔ حضرت لکھنویؒ ان باہمی اختلافات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور دونوں طرف کے غلو کو ناپسند کرتے تھے چنانچہ نماز میں آمین آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کے مشہور

---

[1] علم الفقہ جلد دوم، حاشیہ ص ۲۴

اختلافی مسئلہ پر اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آمین کا آہستہ کہنا حنفیہ کا مذہب ہے اور ایک روایت میں امام مالکؒ سے بھی یہی منقول ہے اور امام شافعیؒ کا بھی اخیر قول یہی ہے مگر احادیث سے دونوں کا ثبوت ہے اسی لیے بعض محققین مثل شیخ ولی اللہ حنفی محدث دہلویؒ نے رسالہ ''مذہب فاروق اعظمؓ'' میں لکھا ہے کہ کبھی آہستہ آواز سے آمین کہی جائے اور کبھی بلند آواز سے۔ محقق کمال الدین ابن ہمامؒ نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں لکھا ہے کہ آمین ایسی آواز سے کہی جائے کہ صرف قریب کا آدمی سن سکے یعنی کچھ آہستہ آواز سے بھی رہے اور کچھ بلند بھی رہے تاکہ اس طریقہ سے دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے۔ فی الحقیقت آہستہ آواز اور بلند آواز سے آمین کہنے میں کوئی بہت سخت اختلاف نہیں ہے مگر افسوس اس زمانہ میں جہالت کا ایسا زور ہے کہ آہستہ آمین کہنے والے بلند آواز سے آمین کہنے والوں پر ملامت اور نفریں کرتے ہیں اور ان کو بددین اور خدا جانے کیسے کیسے بُرے الفاظ سے یاد کرتے ہیں بلکہ بعض متعصبین تو ان کو اپنی مسجد سے نکال دیتے ہیں۔ اسی طرح دوسری طرف سے بھی ناجائز اور ناگفتہ بہ امور وقوع میں آتے ہیں۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک اب دین اور سنت کا دارومدار آمین کے آہستہ یا بلند آواز سے کہنے پر ہی رہ گیا ہے۔ میرے نزدیک دونوں فریق کی یہ باتیں نہایت نفرت اور بُری نظر سے دیکھنے کے قابل ہیں اور زیادہ تعجب ان لوگوں سے ہے جو اہل علم میں شمار کیے جاتے ہیں کہ وہ کیسے ان قبیح باتوں کو جائز رکھتے ہیں۔ اس اخیر زمانہ میں علامۂ وقت شیخ ابوالحسنات مولانا عبدالحی فرنگی محلی نور اللہ مرقدہٗ نے بھی اس مسئلہ کو نہایت انصاف اور تحقیق سے اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی عمدہ جزا دے۔ آمین۔''[1]

اسی ضمن میں آگے چل کر مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے زمانہ کے بعض متعصب مقلدین غیر مقلدین کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، یہاں تک کہ اگر کسی امام کو بلند آواز سے آمین کہتے۔۔۔ یا سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے دیکھ لیا تو اپنی نماز کا اعادہ کر لیتے ہیں۔ میری ناقص فہم میں یہ تعصب نہایت بُرا ہے اور غالباً کوئی عقلمند جو شریعت کے مقاصد سے واقف ہے اس فعل قبیح جس سے کہ امت میں افتراق پیدا ہو جائز نہ رکھے گا، ہاں اگر کوئی غیر مقلد ہمارے امام صاحبؒ کو بُرا کہتا ہو تو وہ ایک مسلمان کی غیبت کرنے سے فاسق

---

[1] علم الفقہ جلد دوم، ص ۲۷

ہو جائے گا لہٰذا اس صورت میں اس کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی مگر جائز پھر بھی رہے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے کم علموں پر تقلید واجب ہے۔[۱]''

اس طرح کم از کم اس برصغیر میں تقلید کو آپ ضروری سمجھتے تھے چنانچہ اس مسئلہ کی تائید میں آپ نے ایک رسالہ ''درفرید'' کے نام سے لکھا تھا جو اب نایاب ہے۔ النجم میں بھی ایک موقع پر آپ نے لکھا تھا کہ — ''ہندوستان میں بالخصوص امامنا الاعظم ابی حنیفہ کوفی رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید اہم واجبات میں سے ہے'' — اس طرح تقلید میں بھی حنفیت کو ترجیح دیتے تھے۔ غالباً یہی اسباب رہے ہوں گے کہ آپ نے حضرت امام اعظمؒ کے رسالہ ''فقہ اکبر'' کا اردو ترجمہ اور اس پر حواشی مرتب کر کے شائع کیے تھے۔ ان شواہد سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فقہی مسلک کے مطابق مقلد اور حنفی تھے لیکن ان میں غلو اور انتہا پسندی بالکل نہ تھی بلکہ وہ اعتدال، جامعیت اور تطبیقیت کے اصول پر کاربند تھے۔ بعض علماء کی رائے کے برعکس وہ حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی مقلد اور حنفی ہی مانتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں یہی مسلک اور طرز فکر انسب و اوفق ہے۔

نقشبندیت

آپ مشرباً نقشبندی مجددی تھے اور اس سلسلہ میں حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ، شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ، حضرت مرزا مظہر جانجاناں شہید دہلویؒ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ اور خود اپنے شیخ مولانا شاہ ابو احمد صاحب بھوپالیؒ کے افکار و تعلیمات سے متاثر تھے۔ حسن اتفاق سے آپ نے جن بزرگوں سے تربیت حاصل کی و استفادہ کیا وہ سب بھی نقشبندی مجددی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے سب سے پہلے سرپرست و مربی آپ کے والد ماجد مولوی ناظر علی صاحبؒ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ کے مجاز تھے جو نقشبندی مجددی تھے۔ دوسرے وہ استاد جن سے آپ نے اپنی تعلیم کا سب سے بڑا حصّہ مکمل کیا یعنی حضرت مولانا سیّد عین القضاۃ صاحبؒ وہ حضرت شاہ موسیٰ جی ترکیسری نقشبندیؒ کے مرید و خلیفہ تھے، دہلی کے زمانۂ قیام میں حضرت مولانا شاہ ابوالخیر صاحب نقشبندیؒ کی خدمت میں حاضری دیتے رہے

---

۱ علم الفقہ، جلد دوم، ص ۹۲

یہاں تک کہ اپنی اہلیہ صاحبہ کو ان سے بیعت بھی کرادیا تھا پھر ایک وقت وہ بھی آ گیا کہ جب آپ بھوپال جاکر حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب نقشبندی مجددیؒ سے بیعت ہو گئے اور کچھ ہی عرصہ کے بعد انہی سے خلافت بھی پائی۔ یہ بھی حسنِ اتفاق ہی ہے کہ مذکورہ بالا تمام حضرات کا سلسلہ حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ سے جاکر متصل ہو جاتا ہے۔

بزرگانِ دین سے محبت

حضور سرورکائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمیشہ کے لیے نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور اب قیامت تک صرف آپ کی ہی شریعت باقی رہے گی جس پر عمل کر کے دنیا میں سربلندی وراحت اور آخرت میں نجات حاصل کی جاسکتی ہے، اس حقیقت کا ادراک کر لینے کے بعد بزرگانِ دین اور مشائخ عظام نے اپنے آپ کو شریعت کے سانچے میں ایسا ڈھالا کہ ان کی پوری زندگی اسلامی تعلیمات کا بہترین نمونہ بن گئی، انھوں نے اپنی زبان وقلم سے کفر وشرک ظلمت کو مٹا کر لوگوں کے دلوں کو نور ایمان سے منور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تذکرے اور حالات میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک گہرا تعلق نظر آتا ہے اسی لیے امت کی قابلِ اعتماد ہستیوں نے بزرگانِ دین کی سیرت کے مطالعہ پر بہت زور دیا ہے۔ بقول حضرت سفیان بن عینیہؒ عند ذکر الصّالحین تتنزل الرحمۃ یعنی صالحین کے ذکر سے زیادہ کوئی چیز قلب کو نفع دینے والی نہیں دیکھی[1]۔ خود علامہ ابن جوزیؒ (م ۱۲۰۰ء) نے بہت پُرزور الفاظ میں سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی تاکید کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> ''میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماعِ حدیث میں انہماک ومشغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ سلف صالحین کے حالات و واقعات کا مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام وحلال کا خالی علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لیے کچھ زیادہ سودمند نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے مؤثر احادیث وحکایات سے اور سلف صالحین کے حالات سے...... اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ وحدیث کی تحصیل میں سلفِ صالحین اور زہادِ امت کی سیرت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تا کہ اس سے تمھارے دل میں رقت پیدا ہو[2]۔''

---

[1] صفۃ الصفوۃ، علامہ ابن جوزیؒ، پہلا ایڈیشن، ج ۱، ص ۱۱-۱۲

[2] تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ اوّل، ص ۲۰۳-۲۰۴، دوسرا ایڈیشن، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء، بحوالہ صید الخاطر لابن جوزیؒ

مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ دل میں نرمی، سوز و گداز اور اعمالِ حسنہ کی انجام دہی کی رغبت پیدا کرنے کا بہترین اور زود اثر ذریعہ خاصانِ خدا اور اولیاء اللہ کے حالات کا مطالعہ ہے، اسی لیے حضرت لکھنویؒ بھی بزرگانِ دین کے تذکروں سے فیوض و برکات حاصل کرنے کی بڑی تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

''ذکر بزرگانِ دین میں نیت محض خوشنودیٔ خدا کی ہونی چاہیے کیونکہ خاصانِ خدا کا ذکر سنت اللہ ہے اور موجب نزولِ رحمت ہے۔ یہ نیت نہ ہونا چاہیے کہ وہ بزرگ ہم سے خوش ہو جائیں گے اور ہم کو کچھ نفع پہنچائیں گے۔ نیت یہی ہونا چاہیے کہ ان بزرگوں کا تذکرہ کرنے سے ان کے ساتھ للہی محبت پیدا ہو جو کہ بڑے ثواب اور فضیلت کی چیز ہے۔ محبت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ محب کو محبوب کا ہم رنگ بنا دیتی ہے[1]۔''

محافل میلاد

ہر ذی نفس جس کے گوشۂ دل میں ایمان کا چراغ روشن ہے اس کو معلوم ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا مہینہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں باعثِ تخلیقِ کائناتؐ نے اپنے وجود عالمتاب سے اس خاکدانِ تیرہ کو نور پاش فرمایا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہر مومن کے دل میں اِن ایام میں خصوصاً عشقِ رسولؐ کا بیکراں بحر موج زن ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ عبدالحق صاحب محدّث دہلویؒ نے اپنی کتاب 'ماثبت بالسنۃ' میں ربیع الاول کی سرخی قائم کر کے اس موقع کے بہت سے فضائل و مناقب تحریر کیے ہیں[2]۔ اس فضیلت اور اہمیت کے باوجود مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی خاطر ایک طبقہ کی طرف سے اکثر بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اسی لیے یہ موضوع ایک اختلافی موضوع بن گیا ہے اور اس کی مخالفت و موافقت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جو کہ نہ ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اسی پس منظر میں آپ نے النجم میں ایک بار لکھا تھا:

''بعض جہلاء نے یہ غلط مشہور کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ حضور پر نورؐ کے ذکر مولد شریف کو بدعت کہتا ہے۔ میرے خیال میں وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں جو حضور پاکؐ کے تذکرہ کو منع

۱؎ تحقیقی شہادت نامہ، مولانا لکھنویؒ

۲؎ ماثبت بالسنۃ، مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، ص ۳۷

کرے یا بُرا کہے۔ مولد شریف کا بیان طبعاً اور شرعاً ہر طرح سے عبادت ہے بلکہ ہم خستہ جانوں کے لیے یہی تذکرہ باعثِ بالیدگی حیات اور غذائے روح ہے۔ جو شخص آپ کے ذکر شریف کو منع کرے یا بدعت قرار دے ہمیں اس کے خارج از اسلام ہونے میں ذرہ برابر کلام نہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی عالم نے خلافِ ادب کلمات، موضوع روایات، غلط اور توہین انگیز اشعار یا اس قسم کی دوسری بدعات کو منع کیا ہو اور ضمناً یہ کہہ دیا ہو کہ ایسا تذکرۂ ولادت بیان کرنا جس میں ادب و احترام ملحوظ نہ ہو بدعت ہے۔ یقیناً اس پردۂ خاک پر کوئی مسلمان بھی ایسے بے سروپا بیانات کو سننا گوارہ نہ کرے گا اور نہ ہی شرعاً ایسی محفلوں میں جانا چاہیے لیکن اگر سچّے اور صحیح واقعات حضورؐ کی احادیثِ صحیحہ و کلام الٰہی سے مستنبط کر کے ذکر کیے جائیں اور مجلس میں خلاف شرع کسی امر کا ارتکاب نہ کیا جائے اور اس طرح نہایت ادب کا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اگر کوئی عالم دین تذکرۂ ولادت بیان کرے تو اس میں کسی مسلمان کا نہ اختلاف ہے اور نہ ہی اس کو کوئی بدعت کہتا ہے۔ نفس ذکر (ولادت) ہر مسلمان کے لیے تازگی بخش قلب و جگر ہے۔ رہے زوائد مثل تعین یوم و تاریخ تو اگر وہ اس نیت سے کی جاتی ہے کہ تعین کی صورت میں کاموں کی سہولت ہو جائے گی اور لوگ بغیر کسی اعلان کے جمع ہو جائیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر یہ نیت ہو کہ اس خاص زمانہ میں اس کام کا کرنا شریعت اور شارع کی طرف سے مقرر ہے تو ناجائز اور حرام ہے۔ جھاڑ، فانوس اور فرش و فروش وغیرہ کا زیادہ اہتمام کرنے کا نتیجہ سوائے اسراف کے اور کچھ نہیں اور اسرافِ مالِ مسلمین نہ شرعاً جائز ہے اور نہ ہی اس اسراف کو کوئی صاحبِ عقل اچھا سمجھ سکتا ہے۔ ان محافل میں آج کل ان چیزوں کے متعلق رعایت نہیں کی جاتی ہے، اسی بنا پر جب علمائے دین اس کو روکتے ہیں تو ان پر کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ مسلمان ان مزخرف محفلوں سے احتراز فرمائیں اور واقعی انھیں ذکر رسول سننے کا شوق ہے تو شرعی قیود کا لحاظ رکھیں[1]۔"

اس طرح ذکر ولادت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جو سرتاپا خیر و برکت اور اہلِ ایمان کے لیے موجب فرحت و انبساط عمل تھا لیکن آج اس میں جن غیر شرعی امور اور رسم و رواج کی آمیزش کر دی گئی ہے اُن کی نشاندہی آپ نے کر دی اور صاف صاف فیصلہ کر دیا کہ ذکر ولادت میں شرعی قیود کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ اس سے محترز رہنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

---

[1] النجم لکھنؤ، دورِ جدید، ربیع الاوّل، ۱۳۵۰ھ

میلاد میں قیام

محافلِ میلاد میں ایک رسم قیام کرنے کی بھی ہمارے یہاں مروج ہے، ایک گروہ اس کے کرنے پر بضد اور مصر ہے اور جو نہ کرے اسے وہ بُرا بھلا کہنے بلکہ اسلام ہی سے خارج کر دینے میں پس و پیش نہیں کرتا جبکہ دوسرے لوگ اسے غیر شرعی اور غیر ضروری فعل سمجھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں غالباً اس کی اصل صرف اتنی رہی ہوگی کہ کسی زمانہ میں کسی بزرگ یا کسی شیخ نے ایسی کسی محفل میں اپنے وقتی جذب و شوق کے عالم میں اور فرطِ محبت و ادب میں کھڑے ہو کر بارگاہِ رسالت مآبؐ میں ہدیۂ صلوٰۃ و سلام پیش کیا ہوگا جس کے بعد ان کے متبعین نے ایک دلیل و نظیر بنا کر اس کو محفل میلاد کا ایک اہم جزو بنا دیا اور اب جو اس ''کارِ خیر'' کو کرے وہ مستحق ثواب اور جو نہ کرے وہ مستوجب عذاب ٹھہرایا گیا، اس طرح جو چیز کسی وقت میں ایک شخصی عمل اور انفرادی فعل کی حیثیت رکھتی تھی اب وہ مومن اور غیر مومن میں حدّ فاصل بنا دی گئی۔ ان سطور کے لکھتے وقت مولانا علیہ الرحمۃ کا ایک قول نظر سے گذرا جس سے مذکورہ بالا خیال کی اور بھی تائید ہوگئی۔ ۱۹۲۷ء میں امروہہ ضلع مراد آباد کے مناظرہ میں آپ نے یہی بات کہی تھی جس میں فریق مقابل مولوی نثار احمد کانپوری تھے جنھوں نے اس بات کی کوئی تردید نہیں کی، اس موقع پر آپ نے فرمایا تھا:

''واضح رہے کہ ۶۰۴ ہجری سے پہلے مسلمانوں میں کبھی کوئی محفل میلاد شریف کے نام سے نہیں ہوئی ۶۰۴ھ میں پہلی محفل اس نام سے مظفر الدین (ابو سعید کوکبری) بادشاہ اربل نے قائم کی۔ بعض علماء نے اس محفل کو بدعت قرار دے کر اس سے اختلاف کیا مثل علامہ فاکہانیؒ و علامہ ابن امیر حاجؒ وغیرہما کے، مگر علماء محققین نے اس کو ذکر خیر کے تحت داخل کیا اور بدعت نہ فرمایا لیکن بوقت ذکر ولادت شریف قیام کرنے کا اس وقت تک بھی نام و نشان نہ تھا، یہاں تک کہ علامہ تاج الدین سبکی شافعیؒ کا زمانہ آیا اور اُن کے سامنے ایک مرتبہ ذکر ولادت شریف ہوا تو غایت مسرت سے بحالت وجد وہ کھڑے ہوگئے، اس کے بعد علامہ موصوف کی یہ عادتِ مستمرہ ہوگئی کہ جب ان کے سامنے ذکر ولادت شریف ہوتا تو ان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ کھڑے ہو جاتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو جب کسی بات پر وجد طاری ہوتا ہے تو پھر وہ ان کی حالتِ مستمرہ ہو جاتی ہے کہ جب بھی انھیں وہ بات پیش آتی ہے تو وجد طاری ہو جاتا ہے۔

علامہ ممدوح کے بعد ان کے تلامذہ اور مسترشدین میں قیام کا رواج ہوا لیکن محض اس خیال سے کہ ایک بزرگ شیخ کی یہ روش ہے اور صالحین کی روش اختیار کرنے میں برکت ہوتی ہے۔ اُس وقت سے علماء میں دو گروہ ہو گئے، بعض تو تشبہ بالصالحین کی نیت سے اس کو کرتے تھے اور بعض اس کو دین میں نئی بات قرار دے کر منع فرماتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ محفل میلاد شریف میں بوقت ذکر ولادت شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور یہ قیام حضورؐ کی آمد کی تعظیم کے لیے ہے[1]......"

اس طرح ''محفل میلاد شریف'' اور اس میں ''قیام'' کرنے کی ابتدا ہوئی۔ اسی وقت سے علماء ربانیین کی ایک جماعت اس کے روکنے اور مخالفت کرنے کی درپے ہوئی اور اس میں انھوں نے بہت شدّت اختیار کی کیونکہ ان کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محفل میں تشریف لانے والے عقیدہ سے یا تو اللہ تعالیٰ پر نعوذ باللہ الزام عائد ہوتا ہے یا خود رسول پر، کیونکہ حضورؐ کے تشریف لانے کا عقیدہ یا قرآن مجید سے ثابت ہو یا احادیث سے لیکن یہ دونوں معتبر ذرائع اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث سے اس عقیدہ کا جواز نہیں نکلتا۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہوتا چلا گیا کہ اس 'قیام' کا درجہ لوگوں نے فرض و واجب سے بھی زیادہ بڑھا دیا اور تارکِ قیام کو 'وہابی' بے دین اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگے اس لیے اس وقت سے علماء کی طرف سے اس کو اور بھی روکا جانے لگا۔ یہ رائے تنہا حضرت لکھنویؒ کی ہی نہیں تھی بلکہ آپ کے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلیؒ کا بھی یہی فتویٰ تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''(ترجمہ) انہی موضوع روایات میں سے (یہ بھی) ہے کہ جو واعظ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود محفل میلاد میں بوقت ذکر ولادت شریف تشریف لاتے ہیں، اسی پر لوگوں نے بوقت ذکر ولادت تعظیماً و اکراماً کھڑے ہونے کی بنیاد ڈالی حالانکہ یہ بیان بھی جھوٹی روایتوں میں سے ہے۔ حضورؐ کا تشریف لانا کسی روایت سے ثابت نہیں اور محض احتمال و امکان قابلِ ذکر نہیں ہے[2]۔''

حضرت مولانا فرنگی محلیؒ کے کئی اور دوسرے فتوے بھی اس قیام مروج کی مخالفت میں ہیں

---

[1] فتح حقانی بر فرقۂ رضاخانی، جدید ایڈیشن، ۱۹۸۲ء، ص ۷۴-۷۵۔

[2] الآثار المرفوعہ فی الاخبار الموضوعہ، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ، ص ۴۶

جوان کے مجموعۃ الفتاویٰ میں دیکھے جاسکتے ہیں[1]۔ امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات سے تو یہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ قیام تو کجا محفلِ میلاد کو بھی جو حد جواز میں آتی ہے اچھا نہیں سمجھتے تھے ان کا یہ کمالِ احتیاط بدعات کے سدِ باب کے لیے تھا۔

فاتحۂ مروجہ

فاتحہ اور ایصال ثواب ایک بہت مستحسن عمل ہے مگر بُرا ہو دین میں جدّت پیدا کرنے والوں کا جنھوں نے اس مسئلہ کو بھی مختلف فیہ بنا دیا ہے۔ آج ہمارے ملک میں عوام کے اندر فاتحہ اور ایصال ثواب کا جو طریقہ رائج ہے اس کے بارے میں مولانا علیہ الرحمۃ نے اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے:

”آج کل ہمارے اطراف میں جو یہ طریقہ رائج ہے کہ کھانا یا شیرینی وغیرہ آگے رکھ کر قرآن مجید کی سورتیں پڑھتے ہیں اور اس کو ایک ضروری امر خیال کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کرے یعنی بغیر اس کے کہ کھانا آگے رکھا جائے قرآن مجید کی سورتیں پڑھ کر اس کا ثواب میت کو پہنچا دے تو اس پر سخت انکار کیا جاتا ہے۔ عوام کے خیال میں یہ بات جم گئی ہے کہ جب تک یہ خاص صورت نہ کی جائے میت کو ثواب نہ پہنچے گا حالانکہ یہ ایک سخت بدعت ہے۔ کھانا اگر کسی کو کھلایا جائے تو اس کا ثواب علیحدہ میت کو پہنچے گا اور جو قرآن مجید کی سورتیں پڑھ کر بخشی جائیں گی اس کا ثواب علیحدہ پہنچے گا، ان دونوں کو ایک دوسرے پر موقوف سمجھنا نہایت جہل ہے۔ عوام کے اس خیال کا سبب جہاں تک میں غور کرتا ہوں شاید یہ ہو کہ کسی بزرگ نے کسی میت کے ایصال ثواب کے لیے چاہا ہوگا کہ عبادتِ مالی اور عبادتِ بدنی دونوں کا ثواب اس کو پہنچایا جائے لہٰذا انھوں نے قرآن مجید کی تلاوت بھی کی ہوگی اور کھانا بھی کسی محتاج کو کھلایا ہوگا اور یہ دونوں عبادتیں اتفاق سے کسی ایک ہی مجلس میں ہوئی ہوں گی۔ اس حالتِ اجتماعی کو دیکھ کر بعض ناواقف سمجھے ہوں گے کہ کھانا آگے رکھ کر کچھ (سورتیں) پڑھنا ایک ضروری امر ہے[2]۔ یہ رسم برصغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش کے علاوہ اور کسی ملک میں نہیں ہوتی۔“

---

۱ مجموعۃ الفتاویٰ، ج ۱، ص ۹۵، ج ۲، ص ۴۲۲-۴۲۳، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ

۲ علم الفقہ، ج ۲، ص ۲۲۴-۲۲۵، مکتبہ فاروقیہ

تیجا، دسواں، بیسواں، چالیسواں ششماہی اور برسی وغیرہ کی حقیقت

مذکورہ بالا فاتحہ وایصال ثواب کے لیے اس طور پر کچھ دن عوام نے مخصوص کر رکھے ہیں، ان میں بھی وہی قباحتیں ہیں جو اوپر مذکور ہو چکی ہیں۔ اب اس کو بھی اختلاف کا سبب بنالیا گیا ہے۔ چنانچہ ان رسوم کے بارے میں آپ کی رائے یہ ہے:

''ایصال ثواب کے لیے دن اور تاریخ کا مقرر کرنا جیسا کہ ہمارے زمانہ میں رائج ہے محض بے اصل ہے اور یہ تعین وقت ناجائز ہے۔ اسی لحاظ سے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس اجتماعِ خاص کو جو سوئم کے دن ہوتا ہے بدعت وحرام لکھا ہے۔[۱] ہمارے زمانہ میں ان تاریخوں پر سخت التزام ہو گیا ہے، اگر کوئی ان تاریخوں میں اِن اعمال کو نہ کرے تو نشانۂ ملامت ہوتا ہے جس کے سبب سے دو خرابیاں سخت پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک یہ کہ عوام کا اعتقاد خراب ہو گیا ہے وہ خدا جانے ان تاریخوں کے اعمال کو کیا سمجھنے لگے ہیں سنت یا مستحب یا اس سے بھی زیادہ؟ دوسرے یہ کہ بعض لوگ جو اِن اعمال کی اصلیت سے ناواقف ہیں اور ان کے اعتقاد میں کسی قسم کی خرابی نہیں آئی ہے وہ محض خوفِ ملامت سے ان اعمال کو کرتے ہیں اس سے مقصود خوشنودئ الٰہی نہیں ہوتی، ان بیچاروں کو جس طرح بھی ممکن ہو قرض لے کر دستور کے مطابق کرنا ہی پڑتا ہے۔ علاوہ ان سب خرابیوں کے جس چیز کو شریعت نے ہم پر لازم نہیں کیا اس کو لازم سمجھ لینا خود ہی کیا کم بدعت ہے۔[۲]

زیارتِ قبور

زیارتِ قبور کا مسئلہ اسلامی شریعت کا ایک صاف اور سادہ مسئلہ ہے لیکن عوام نے اس میں بھی اپنی نفس پرستیوں کو شامل کر کے اس کی دینی افادیت کو کم کر دیا ہے اور شارع کی منشاء کے خلاف اس کو بھی ایک تفریح گاہ اور میلہ کی شکل دے دی ہے۔ جہاں تک اس کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں حضرت مولاناؒ لکھتے ہیں:

''قبروں کی زیارت کرنا یعنی ان کو جا کر دیکھنا جائز ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہفتہ میں کم سے کم ایک

---

۱ شرح سفر السعادۃ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، ص ۲۷۳

۲ علم الفقہ، جلد دوم، ص ۲۲۵-۲۲۶۔

مرتبہ زیارتِ قبور کے لیے جائے اوراس کے لیے بہتر یہ ہے کہ جمعہ کا دن ہو۔ بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لیے سفر کر کے بھی جانا جائز ہے۔ عورتوں کے لیے بھی زیارتِ قبور جائز ہے بشرطیکہ وہ جوان نہ ہوں۔ اور رنج وغم تازہ کرنے کے لیے وہ زیارت نہ کریں بلکہ عبرت اور برکت حاصل کرنے کی غرض سے ہونا چاہیے[1]۔"

اس طرح زیارتِ قبور کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ تاکید بھی ہے کیونکہ اس سے اپنی موت کو یاد کرنے کی اس سے بہتر کوئی دوسری اور صورت بھی نہیں، دوسرے یہ کہ موت کا یاد کرنا بھی ایک عبادت ہے مگر عوام نے اپنی طرف سے اس عمل خیر میں بھی دنیاوی خرافات شامل کردی ہیں۔ شب برأت کے موقع پر قبرستانوں کو ایک میلہ گاہ بنالیا جاتا ہے جہاں مردوں سے زیادہ عورتوں کا مجمع ہوتا ہے، کھانے پینے اور دوسری اشیاء کی خرید فروخت کے لیے دکانیں سجائی جاتی ہیں۔ اگر بتی اور موم بتی کے دھوئیں اور ان کی آگ سے سارا ماحول کثیف ہوجاتا ہے۔ ان حالات میں فاتحہ خوانی کے ساتھ ساتھ ہر وہ فعلِ عبث یہاں ہوتا ہے جو شاید میلوں ٹھیلوں میں بھی نہ کیا جاتا ہوگا۔ لہٰذا مذکورہ بالا شرعی جواز کو آڑ بنا کر آج جو کچھ کیا جارہا ہے کیا اس زیارتِ قبور سے وہ فوائد حاصل ہوسکتے ہیں جو شریعتِ حقہ کو مقصود ہیں۔

ردِّ قادیانیت

مرزا غلام احمد قادیانی (م ۱۹۰۸ء) نے جب سے اپنے باطل دعاوی کا آغاز کیا اسی وقت سے علمائے حق نے ان کے خلاف آواز اٹھانا شروع کردی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حق و صداقت کی راہ میں رخنے ڈالے گئے، طاغوتی طاقتوں نے سر اٹھانا شروع کیا اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے خلاف جو طبقہ سب سے پہلے سامنے آیا وہ ہمارے علماء کرام ہی کا تھا جس نے مذہب کے نام پر پیدا ہونے والی ہر اسلام مخالف تحریک کے خلاف سربکف اور کفن بردوش کھڑے ہوکر اس وقت تک نبرد آزمائی کی جب تک کہ حق و باطل کے درمیان حد فاصل قائم نہیں ہوگئی۔ قادیانیت بھی اسی قسم کی ایک اسلام دشمن اور جناب نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی ذاتِ مقدسہ سے بغض و عناد رکھنے والی جماعت ہے جس نے

---

[1] علم الفقہ، جلد دوم، ص ۲۲۵-۲۲۶ بحوالہ ردالمحتار و شرح منیہ وغیرہ

ہندوستان میں جنم لے کر پورے عالم اسلام کو اپنے گرداب بلا میں لپیٹنا چاہا ہے۔ مرزا کی تحریرات کے منظر عام پر آنے کے بعد ہی سے علماء نے ان کے عزائم اور مستقبل کی خطرناکیوں کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ لہٰذا اس کے سدّ باب کے لیے قلمی اور لسانی جہاد کا اعلان کیا گیا، مضامین لکھے گئے، رسائل و کتابیں تصنیف کی گئیں اور پھر اخیر میں براہِ راست مناظرے بھی کیے گئے تاکہ عامۃ المسلمین کو عقائد کی گمراہیوں سے بچایا جا سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ردِّ قادیانیت پر دیکھتے ہی دیکھتے اچھا خاصا ذخیرہ معرض وجود میں آ گیا جس کی مدد سے دین کی فہم و فراست رکھنے والوں کو اس فرقہ کو سمجھنے اور اس کو خارج از اسلام قرار دینے میں بڑی مدد ملی۔ مولانا لکھنوی علیہ الرحمہ نے بھی قادیانیت کی تردید میں اپنے رسالہ 'النجم' میں خوب لکھا اور اس کے پیروکاروں سے متعدد مناظرے کیے جس میں فریق مخالف کو شکست فاش کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا۔

قادیان یا کادیان

مولاناؒ کی تحقیق کے مطابق مرزا غلام احمد کے وطن کا اصلی اور صحیح نام کادیان تھا۔ اہل پنجاب بھی اس کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ پنجابی زبان میں کادی کیوڑہ کو کہتے ہیں، چونکہ اس بستی میں زیادہ تر کیوڑہ فروش رہتے تھے اس لیے پوری بستی کو کادیان کہا جانے لگا۔ مرزا صاحب کو جہاں دینی اور مذہبی مآخذ میں توڑ موڑ اور تحریف و تاویل کا چسکا لگ چکا تھا وہیں وہ دنیاوی معاملات میں بھی ردوبدل اور حقائق کی پردہ پوشی میں مصروف رہا کرتے تھے لہٰذا اپنی اسی ذہنیت کی بنا پر انھوں نے کافی روپیہ خرچ کر کے سرکاری کاغذات میں اپنے قصبہ کا نام ''قادیان'' لکھوایا اور مشہور کیا کہ یہ لفظ درحقیقت ''قاضیان'' تھا جو آج بگڑ کر ''قادیان'' ہو گیا ہے۔[1]

اس فرقہ کو احمدی کہنا گناہ ہے

اس فرقہ کے لوگ اپنے کو ''احمدی'' لکھتے اور بولتے ہیں اور اسی کو پسند بھی کرتے ہیں مگر حضرت مولاناؒ اس سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''مرزا غلام احمد کے پیرو کس لقب سے یاد کیے جائیں، اس میں بھی بعض ناواقف حضرات سخت

---

1 صبحِ رنگون، ص ۳

غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔عرفِ عام اور کافۂ اہل اسلام نے اس فرقہ کو ''مرزائی'' کا لقب دیا ہے اس لقب کا رواج بھی کافی ہو چکا ہے، بعض لوگ اس فرقہ کو ''قادیانی'' بھی کہہ دیتے ہیں چنانچہ یہ لقب بھی پوری طرح شہرت حاصل کر چکا ہے اور اس سے سمجھنے میں کچھ تامل نہیں ہوتا لیکن خود اس فرقہ کے ماننے والے اپنے کو ''احمدی'' لکھتے اور کہتے ہیں۔اور اسی نام پر ان کو اصرار بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اکثر مسلمان بھی اپنی نادانی اور کم علمی کی بنا پر انھیں ''احمدی'' کہہ دیتے ہیں حالانکہ ان کو احمدی کہنے میں تین گناہ ہیں جو کہ نہایت سخت ہیں۔

اوّل یہ کہ اس فرقہ کو احمدی کہنا گویا اس افتراء کی تصدیق کرنا ہے جو مرزا اپنی کتابوں میں لکھ گئے ہیں کہ آیت کریمہ وَمُبَشِّراً بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ (سورۃ الصّف:۶) یعنی میں بشارت سناتا ہوں کہ ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے ان کا نام احمد ہوگا۔اس آیت کا مصداق میں ہی ہوں (نعوذ باللہ)

دوؔم یہ کہ احمدی کہنے میں اس امر کا شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ نسبت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک 'احمد' کی طرف ہے جبکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔سوؔم یہ کہ آج سے بہت پہلے لفظ احمدی امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے متوسلین کا مخصوص لقب رہ چکا ہے، چنانچہ اس سلسلہ کے اکابر بطور شعار یہ لفظ اپنے نام کے ساتھ استعمال کیا کرتے تھے۔جیسے شاہ غلام علی احمدیؒ اور شاہ احمد سعید احمدیؒ وغیرہ۔ان حضرات کی مہروں میں یہ نسبت اسی طرح کندہ تھی اس لیے قادیانیوں کو احمدی کہنا گویا اکابر امت کے ایک امتیازی لقب کا غصب کرنا ہے[۱]''

فرقہ غلمدیہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس فرقہ کو کس نام سے پکارا جائے چنانچہ ہمارے علماء نے اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیا ہے۔عام طور سے اس فرقہ کا مشہور نام ''مرزائی'' ہے لیکن یہ لوگ اس نام سے چڑتے ہیں۔حضرت مولانا محمد علی (کانپوری) مونگیریؒ اس فرقہ کو ''جدید عیسائی'' کہا کرتے تھے کیونکہ ان کا مقتدیٰ اپنے عیسیٰ ہونے کا مدعی تھا لیکن مولانا لکھنویؒ نے بمقام بھاگلپور مولوی عبدالماجد مرزائی کے اس اصرار پر کہ ہمیں غلام احمد کے نام کی طرف نسبت دیجیے ان کو

۱؎ صحیفۂ رنگون، ص ۹ وصولتِ محمدیہ، ص ۲۰

''غلمدی'' کا لقب دیا تھا۔ غلام احمد کے نام میں دو جز ہیں اور ان دونوں کی طرف نسبت اس نام میں آ گئی ہے۔ عربی قاعدے کے مطابق بھی یہ طریق نسبت کثیر الاستعمال ہے جیسے عبد شمس سے عبشمی، عبدالدار سے عبدری، اور عبدالقیس سے عبقسی وغیرہ۔ چنانچہ علمی حلقوں میں یہ نام بھی بہت مقبول ہوا اور بعض اہلِ علم کی مطبوعہ تحریرات میں بھی آ چکا ہے۔ حضرت مونگیریؒ نے بھی اس نام کو بہت پسند کیا تھا[1]

قادیانیوں کے مختلف گروہ

مرزا غلام احمد قادیانی کے مرنے کے بعد ان کی جماعت کے سربراہ حکیم نورالدین ہوئے اور جب وہ بھی چل بسے تو مرزا کے فرزند بشیر الدین محمود خلیفہ بنائے گئے۔ ان کے زمانہ میں اس جماعت کے اندر بعض معاملات میں اختلافات پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے یہ جماعت مختلف حصّوں میں منقسم ہو گئی جس کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔

پہلی جماعت لاہوری جماعت ہے جس کے قائدین میں مسٹر محمد علی لاہوری اور خواجہ کمال الدین وغیرہ تھے۔ لاہوری جماعت مرزا کو مقتدیٰ، پیشوا، مسیح موعود اور مجدد وقت سب کچھ مانتی ہے مگر ان کی نبوت کے متعلق اپنا عقیدہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ مجازی طور پر نبی تھے حقیقی نبی نہ تھے۔ مرزا نے جن جن الفاظ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا یہ جماعت ان الفاظ کی دور از کار تادیلات کر کے حقیقتِ حال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔

دوسری جماعت محمودی جماعت ہے جس کے قائد مرزا بشیر الدین محمود تھے جو مرزا غلام احمد کے بڑے بیٹے تھے۔ یہ جماعت مرزا کے تمام جھوٹے سچے دعووں کے سچا ہونے کی تصدیق و تائید کرتی ہے اور ان کی کسی طرح کی کوئی تاویل یا تردید نہیں کرتی۔

تیسری جماعت ظہیری جماعت ہے جس کا بانی ظہیر الدین اروپی تھا۔ یہ جماعت مرزا کو نبی و رسول سے بھی بالاتر مان کر انھیں خدا کا مظہر قرار دیتی ہے، یہاں تک کہ وہ ان کی الوہیت کی بھی قائل تھی۔ ظہیر الدین خود اپنے کو بھی مظہر خدا مانتا تھا۔ اس جماعت کا یہ بھی اصرار تھا کہ قادیان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا چاہیے کیونکہ وہ مکّہ جیسی عظمت والا شہر ہے جہاں خدا کے ایک (نئے)

---

[1] صولتِ محمدیہ، ص ۲۱

رسول نے جنم لیا ہے۔

چوتھی تیماپوری جماعت ہے جس کا پیشوا عبداللہ تیماپوری تھا۔ وہ تو مرزا سے بھی زیادہ سبقت لے گیا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے خود اپنے بازو سے الہام ہوتا ہے مزید یہ کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوّا کی عظمت و عصمت پر بھی رکیک حملے کیے تھے۔

پانچویں سمبریالی جماعت ہے جس کا پیشوا محمد سعید تھا جو کہتا تھا کہ مجھے خدا نے قمر الانبیاء کہا ہے۔ اس کے بقول مرزا کو نئی شریعت ملی تھی۔ مزید یہ کہ وہ شریعت محمدیہ کی ''اصلاح'' کے لیے بھیجے گئے تھے مگر پورے طور پر انھیں اس کو نافذ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان اصلاحات میں سے چند یہ تھیں کہ شراب حلال ہے، ختنہ کرانا حرام ہے اور خالہ پھوپھی، چچا اور ماموں کی لڑکی سے نکاح حرام ہے۔

اس طرح یہ پانچوں جماعتیں اگرچہ آپس میں شدید اختلاف رکھتی تھیں اور ایک دوسرے کو کافر کہتی تھیں مگر دین اسلام کو تباہ کرنے اور مسلمانوں کے عقائد خراب کرنے کے مسئلہ میں سب آپس میں متحد الخیال تھیں۔ ان کی یہ متفقہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو خاتم الانبیاء رحمۃ للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظل رحمت سے نکال کر مرزا غلام احمد کی امت میں شامل کر دیا جائے۔[1]

مذکورہ بالا مرزائی فرقوں میں دو فرقے یعنی لاہوری اور محمودی بقیہ دوسرے فرقوں سے بڑے اور اہم ہیں لہٰذا انھیں دونوں فرقوں کا تعاقب اور ابطال ہمارے علماء نے ہمیشہ کیا ہے۔ یہ دونوں فرقے واقف کار علماء اسلام کے سامنے آنے سے ہمیشہ گھبراتے ہیں کیونکہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ان کی بنیاد خالص مفروضات پر ہے اس لیے مجبوراً اگر کبھی یہ علماء اسلام کی زد میں آ بھی گئے تو فوراً حیات مسیح علیہ السلام کی بحث چھیڑ دیتے ہیں یا پھر کبھی کبھی ختم نبوت کے مسئلہ پر بحث کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان فرقوں کو کسی طرح بھی ان دونوں مسئلوں پر بحث کرنے کا موقع ہرگز نہیں دینا چاہیے کیونکہ ان دونوں بحثوں کے نتیجہ میں مرزا غلام احمد کی اصلی حالت کھل کر سامنے نہیں آنے پاتی اور کہنے کو ہو جاتا ہے کہ مرزائیوں نے مسلمانوں سے بحث کی۔ ان دونوں بحثوں سے درحقیقت مرزا کو کوئی تعلق بھی نہیں ہے، بالفرض اگر حضرت

---

[1] صحیفۂ رنگون، ص ۷-۸

مسیح علیہ السلام کی وفات ہو بھی چکی ہو اور نعوذ باللہ سلسلۂ نبوت بھی ختم نہیں ہوا ہو تو اس سے مرزا کیونکر مسیح موعود یا خدا کا نبی ہو سکتا ہے۔[1]

غلمدیوں کے بارے میں ایک مشورہ

مذکورہ بالا بیان کی مزید وضاحت کرتے ہوئے حضرت لکھنویؒ نے غلمدیوں (قادیانیوں) سے مناظرہ ہونے کی صورت میں علماء اسلام کو ایک مفید مشورہ یہ دیا تھا:

"کسی مسلمان کو اگر کسی غلمدی سے مذہبی مباحثہ کی نوبت پیش آجائے تو جلد سے جلد فیصلہ کر دینے والی اور نہایت آسانی سے اس بحث کو ختم کر دینے والی صورت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کی کتابوں سے اس کے جھوٹ دکھلائے جائیں اور حضرات انبیاء علیہم السلام کو جو گالیاں اور ان کی جو توہین اس نے کی ہے ان کو پیش کر دیا جائے۔ اس موضوع کے شروع ہوتے ہی بڑے سے بڑا حیادار غلمدی بھی مبہوت ہو جاتا ہے۔ کسی دوسری بحث سے اس قدر جلد اور صحیح نتیجہ نہیں نکلتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات و حیات کی بحث یا ختم نبوت کی بحث اگر ہو بھی تو اس بحث کے بعد ہونی چاہیے۔"[2]

مرزا غلام احمد اور ان کے ہمنواؤں کی تصانیف کے مطالعہ سے ہر اس شخص پر جو حق شناس ہو اور جس کا دل نور ایمان سے منور ہو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا غلام احمد بہت بڑے کذاب تھے، انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی شان اقدس میں بڑی گستاخیاں اور توہین آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں، انہوں نے نبی اور رسول اور صاحب شریعت ہونے بلکہ افضل الانبیاء ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور اس کی صورت یہ اختیار کی تھی کہ پہلے تو اپنے کو ایک روشن ضمیر صوفی ظاہر کیا، پھر مجدد ہونے کا دعویٰ کیا پھر مثیلِ مسیح ہونے کا اور پھر مہدی ہونے کا ادعا کیا، یہاں تک کہ مریم بھی بنے اور ابن مریم بھی بنے اور پھر اس کے بعد ختم نبوت کا انکار کر کے اپنے آپ کو نبی و رسولِ صاحبِ وحی اور صاحبِ شریعت ہونے کا اعلان کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے کو تمام انبیاء سابقین سے اعلیٰ اور افضل بھی قرار دیا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ کرشن ہونے کا شرف بھی حاصل کیا اور بعض اوقات دعویٰ الوہیت بھی کر بیٹھے تھے غرضکہ کوئی رتبہ مرزا صاحب سے

---

[1] صیحۂ رنگون، ص ۲۷ [2] صولت محمدیہ، ص ۲۱-۲۲

چھوٹنے نہیں پایا۔ ان کے ان سب دعوؤں کو جو نہ مانے وہ ان کے نزدیک کافر ہے اس لیے ان کے معائب اور دعاوی کے پیش نظر کوئی عقلمند آدمی ایسے شخص کو کسی شریعت میں نیک وسچا تک نہیں کہہ سکتا، نبی ورسول وغیرہ ماننا تو بہت دور کی بات ہے۔

چند اعتراضات اور ان کے جوابات

فرق باطلہ کا ہمیشہ دستور رہا ہے کہ وہ براہ راست مناظرے سے گریز کرتے ہیں لیکن آڑ میں بیٹھ کر خطوط یا اشتہار بازی سے کام لے کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خواجہ کمال الدین مرزائی نے رنگون میں مولانا لکھنوی کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ انہوں نے صرف مراسلات واشتہارات ہی کو ذریعہ تخاطب بنایا اور اس طرح دوبدو مناظرہ کرنے کی نوبت نہیں آنے دی۔ اپنے آخری اشتہار میں خواجہ صاحب نے اسلامی معتقدات کے خلاف چار سوالات قائم کر کے شائع کیے اور اپنے دماغ میں یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ علماء اسلام سے ان کا جواب دیتے نہ بن پڑے گا لیکن حضرت مولانا قدس سرہ نے فی الفور ان سوالات کے جوابات لکھ کر شائع کر دیے جس کے بعد پھر خواجہ صاحب نے کسی اور اعتراض کی ہمت نہ کی۔ ان کے اعتراضات یہ تھے:

پہلا اعتراض: قرآن مجید سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر رسول پر اسی قوم کی زبان میں وحی آئی ہے جس کی طرف وہ بھیجا گیا ہے، اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن عربی زبان میں اس لیے نازل ہوا ہے تاکہ مخاطب لوگ اس کو سمجھ سکیں لہٰذا معلوم ہوا کہ قرآن اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف عرب ہی کے لیے آئے تھے، اس لیے یہ دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے کہ قرآن ساری دنیا کے لیے آیا ہے؟

جواب: قرآن مجید میں مذکورہ مضمون صرف ان نبیوں کی بابت آیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آئے تھے کیونکہ آپ سے پہلے کسی نبی کی نبوت ساری دنیا کے لیے نہیں ہوئی تھی چنانچہ ہر نبی صرف ایک خاص قوم کے لیے ہوتا تھا اور اسی قوم کی زبان میں ان پر وحی آتی تھی۔ اس قضیہ کو الٹ کر یہ نتیجہ نکالنا کہ جس نبی کی جو زبان ہو اس کی نبوت اسی قوم کے ساتھ مخصوص ہے غلط ہے۔ قرآن عربی زبان میں اس لیے آیا ہے کہ سب سے پہلے اس کی روشنی عرب میں پھیلے اور پھر اس کے ذریعہ ساری دنیا منور ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد باری ہوتا ہے:

لِیَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْداً۔ (سورۃ البقرۃ:۱۴۳)

(اے اہل عرب!) تم سب لوگوں کے سامنے گواہی دینے والے بنو اور رسول تمہارے سامنے گواہی دینے والے بنیں۔

یہاں قرآن یہ تصریح کر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کی ہدایت ساری دنیا کے لیے ہے چنانچہ اس سلسلہ میں حسب ذیل آیتیں مزید اس کی شاہد ہیں:

۱۔ قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعاً...... فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ (سورۃ الاعراف:۱۵۸)

اے نبی کہہ دیجئے کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر۔

۲۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْراً۔ (سورۂ سبا:۲۸)

اے نبی ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

۳۔ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَ مَنْ بَلَغَ۔ (سورۃ الانعام:۱۹)

یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا تا کہ میں تم کو اس کے ذریعہ سے ڈراؤں اور نیز ان تمام لوگوں کو (ڈراؤں) جن تک یہ قرآن پہونچ جائے۔

۴۔ تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْراً۔ (سورۃ الفرقان:۱)

برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا تا کہ وہ تمام دنیا کے لیے ڈرانے والا بنے۔

لہٰذا جب قرآن مجید کی یہ واضح تصریح ہے تو اس کے خلاف آیت کا مطلب لے نا کیسے صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ کسی کلام سے کوئی ایسا مفہوم استنباط کرنا جو اس کلام کے دوسرے حصّہ کی تصریح کے خلاف ہو یہ عقلاً بھی جائز نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض: قرآن دوسرے مذاہب کے خدائی آغاز کو تسلیم کرتا ہے اور توریت کو نور و ہدایت کہتا ہے اس لیے ایسی حالت میں اگر یہ وحیاں کامل تھیں تو کیوں منسوخ ہوئیں اور اگر کامل نہیں تھیں تو وہ کیوں کامل چیز سے محروم کیے گئے؟

جواب: قرآن شریف نے بیشک یہ بیان کیا ہے کہ ہر قوم اور ہر ملک میں نبی آئے اور ہدایت اتری ہے مگر یہ کہیں نہیں بیان کیا گیا کہ دنیا کے موجودہ مذاہب بعینہٖ وہی ہیں جنکی تعلیم ان کے نبیوں نے دی تھی جبکہ اس کے برعکس یہ تصریح ضرور اکثر آیتوں میں ہے کہ انبیاء کی تعلیمات

اوران کی خدائی کتابوں میں ان نبیوں کے بعد بہت کچھ ترمیم وتحریف کردی گئی ہے۔اس تحریف و ترمیم کا ثبوت تاریخی واقعات اور دوسرے دلائل سے بھی ہم کوملتا ہے،لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اگلی شریعتوں کے منسوخ ہونے کے دو اسباب ہیں، ایک یہ کہ وہ شریعتیں اصلی حالت پر باقی نہیں رہی تھیں اوران میں بہت کچھ تحریفات کردی گئی تھیں دوسرے یہ کہ قرآن مجید دین کامل لے کرآیا ہے جبکہ اگلی شریعتیں بہ نسبت شریعتِ محمدیہ کے دین کامل لے کرنہیں آئی تھیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشادفرمایا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ. (سورۃ المائدہ:۳) آج میں نے تمہارادین تمہارے لیے کامل کردیا۔

لہٰذا اگلی شریعتوں کے بہ نسبت شریعت محمدیہ کا مکمل ہونا مذکورہ بالا دوسری شریعتوں کے مسائل دیکھنے سے بھی بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔

اب یہ کہنا کہ اگلی قومیں کیوں ایسے دین کامل سے محروم کی گئیں یہ ایک بے جا اعتراض ہے۔نظام عالم ہم کو بتلا رہا ہے کہ قانون قدرت یہی ہے کہ ترقی بتدریج ہوتی ہے۔چنانچہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ اس وقت کمزور ہوتا ہے کیونکہ بولنا چلنا پھرنا اور تمام وہ قوتیں جو انسان سے تعلق رکھتی ہیں وہ بتدریج اس میں پیدا ہوتی ہیں۔ترقی کرتی ہیں لہٰذا اس پر یہ اعتراض کرنا کہ پہلے ہی سب قوتیں انسان کو کیوں نہ مل گئیں اور بچے اس کمال سے کیوں محروم کیے گئے قانون فطرت پر اعتراض کرنا ہے۔

تیسرا اعتراض: بہائی لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبری ختم نہیں ہوئی ہے،خدا نے حضرت آدم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم وقتاً فوقتاً نبی بھیجتے رہیں گے اس لیے نبی آدم میں ہمیشہ نبوت کا سلسلہ قائم رہنا چاہیے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے کا عقیدہ غلط ہے۔

جواب: بہائی لوگوں کا یا ان سے سیکھ کر مرزا غلام احمد قادیانی اوران کے پیروں کا یہ کہنا کہ نبوت ختم نہیں ہوئی ہے قرآن اور عقل دونوں کے خلاف ہے۔قرآن واضح طور پر کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہوگئی ہے۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِّجَالِکُمْ وَ لٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ. محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں۔

(سورۃ الاحزاب:۴۰)

قرآن مجید کی وہ آیات جن کا حوالہ اعتراض میں ہے ان کا مطلب وہ نہیں ہے جو بہائی اور مرزائی بیان کرتے ہیں بلکہ ان کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ خدا کی طرف سے نبی آئیں گے اور ہدایت آئے گی، کسی لفظ سے اشارۃً بھی یہ نہیں نکلتا کہ نبوت کبھی ختم نہیں ہوگی۔ یہ بات دوسرے اعتراض کے جواب میں بیان ہو چکی ہے کہ اگلی شریعتیں کیوں منسوخ ہوئی ہیں، چونکہ منسوخیت کی وہ وجہ شریعتِ محمدیہ میں نہیں ہے اس لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو جانا عقل کے بھی موافق ہے، اگلی شریعتیں دین کامل نہیں تھیں اور شریعتِ محمدیہ دین کامل ہے، اگلی شریعتوں میں تحریف ہوگئی تھی لیکن شریعتِ محمدیہ کے محفوظ رہنے کا خود خدا تعالیٰ ذمہ دار ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ — یہ نصیحت ہم نے اتاری ہے اور ہم خود (ہی) اس کے محافظ ہیں۔ (سورۃ الحجر:۹)

شریعتِ محمدیہ کا محفوظ رہنا ان سلسلۂ اسانید کے علاوہ جو اہل اسلام کے پاس ہیں تاریخی واقعات اور غیر مسلم اصحاب کی شہادت سے بھی بخوبی ظاہر ہے۔

چوتھا اعتراض: قرآن کسی خاص پیغمبر کی پیروی میں نجات کو منحصر نہیں کرتا جیسا کہ دوسرے پارے کی آیت سے ظاہر ہے لہٰذا صرف دین اسلام ہی قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: کسی خاص پیغمبر کی پیروی میں نجات کا منحصر نہ ہونا صرف مرزائیوں ہی کا قول ہے ورنہ قرآن کی بہت سی آیتوں میں بیان ہوا ہے کہ نجات دین اسلام میں منحصر ہے

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْناً فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔ (سورۂ آل عمران:۸۵) — جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔

دوسرے پارے کی وہ آیت جس کا حوالہ لائق معترض نے دیا ہے اس کا مطلب انہوں نے صحیح بیان نہیں کیا ہے۔ اس آیت کا منشاء صرف اس قدر ہے کہ قرآن نجات کو کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں بتاتا جیسا کہ یہودیوں کا قول تھا الذین امنوا اور نصاریٰ صائبین وغیرہ الفاظ مذہبی حیثیت سے متجاوز ہو کر قومیت کے معنی میں مستعمل ہونے لگے تھے، لفظ عرب قومیت کے معنی میں مخصوص ہے مگر تمدن عرب کا مصنف مذہبی معنوں میں استعمال کرتا ہے یعنی مسلمانوں کو خواہ کسی بھی قوم کے ہوں وہ عرب کہتا ہے اس لیے قرآن نے بتایا کہ جو شخص اسلام قبول کرے خواہ وہ کسی قوم کا ہو نجات کا حقدار ہے۔ اگر آیت کے وہ معنی لیے جائیں جو خواجہ کمال الدین مرزائی کہتے ہیں تو معاذ اللہ یہ مہمل کلام ہو جاتا ہے اس لیے کہ الذین امنوا کے ساتھ من امن کا لفظ کسی

طرح نہیں لگ سکتا یعنی ایمان والوں کیلیے یہ شرط لگانا کہ وہ ایمان لائیں بے معنی ہے۔[1]

قادیانیت کے بطلان کے چند اور دلائل

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے تمام دعاوی وقفہ وقفہ سے تدریجاً کیے تھے جس کا منشاء حبّ جاہ اور حصول دولت وعزت اور اسلام دشمنی کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ ان دعاوی کے سلسلہ میں انھیں ابتداً کچھ منتشر الخیال اور فاسد عقائد کے حامل لوگوں کے افکار سے بھی بڑی مدد ملی تھی جن سے آئندہ کے لیے ان کا راستہ آسان ہو گیا اور وہ اسی راستہ پر چل پڑے جس کی انھیں طلب تھی، ان کے ان افکار و خیالات کی تائید انگریز حکومت بھی کرتی تھی تاکہ ان کے ذریعہ سے انہیں بھی مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا کرنے کا موقع مل سکے۔ مرزا صاحب کے دماغ میں نبی اور رسول بننے کے داعیہ میں جن لوگوں کی صحبت و ہم نشینی سے مدد ملی ان کے بارے میں ایک مقام پر مولانا علیہ الرحمۃ نے تحریر کیا تھا:

> خوش قسمتی سے مرزا غلام احمد کو ابتدائی زمانہ میں کچھ دنوں سر سید احمد خاں کی صحبت بھی نصیب ہو گئی اور ان کے آزاد خیالات نے مرزا کے لیے اس کے مجوزہ راستے کو کچھ سہل کر دیا۔ اس زمانہ میں سر سید یہ مسئلہ اختراع کر چکے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں کیونکہ کوئی انسان اتنے دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ انگریزی داں طبقہ اس مسئلہ سے مانوس ہو چکا تھا، لہٰذا مرزا غلام احمد نے اپنے آغاز مقصد کے لیے اسی مسئلہ کو منتخب کر لیا چنانچہ انہوں نے ابتداء اسی پر بڑا زور دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں بڑے بڑے اشتہارات شائع کیے۔ علاوہ عقلی استبعادات اور خانہ ساز الہامات کے کئی آیاتِ قرآنیہ اور کئی حدیثوں کو بھی دور از کار تاویلات کا لباس پہنا کر انہوں نے اپنے استدلال میں پیش کیا، علمائے اسلام کو مباحثے کے لیے چیلنج بھی دیے اور کئی مقامات پر مباحثہ بھی کیا.......... مرزا غلام احمد کو خوش قسمتی سے ابتداء میں کچھ شیعہ علماء کی بھی صحبت حاصل ہوئی چنانچہ ایک صاحب جو شیعہ مذہب کے عالم تھے مدتوں آپ کے استاد رہے۔ اس ذریعہ سے آپ کو شیعوں کے مسئلہ امامت پر کافی اطلاع حاصل ہوئی اور اس طرح ختم نبوت کے انکار کا راستہ آپ کے لیے اور بھی سہل ہو گیا اور آپ کے ذہن رسا نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ کس طرح ایک نئے مذہب کی بنیاد پڑتی ہے اور اس کے لیے کس طرح پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔[2]"

---

[1] صحیفۂ رنگون، ص ۲۸ تا ۳۲ [2] صولتِ محمدیہ بر فرقۂ غلمدیہ، ص ۲۸-۲۹

اس طرح مرزا نے اپنے مستقبل کے افکار کی عمارت مختلف متجددین اور مرتدین کے خیالات سے رہنمائی حاصل کر کے تعمیر کی اور پھر بزعم خود ایک نئی امت کی تشکیل کی جو اسلام کے متوازی ایک نئے دین پر گامزن ہوئی۔ مرزا کی حیات ہی میں علماء کرام نے ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا اور ہر جگہ جہاں بھی وہ مل گئے انہیں مغلوب کر کے ذلت و رسوائی سے ہم کنار کیا مگر جب مقصد حصول دنیا ہو اور باطل طاقتوں کی طرف سے ہمت افزائی بھی ہو رہی ہو تو پھر انسان سب کچھ برداشت کر کے نفس کے مطالبات پورے کرتا رہتا ہے اب ہم حضرت لکھنویؒ کی تحریروں سے ان دلائل کو پیش کر رہے ہیں جن سے انہوں نے مرزا اور مرزائیت کا بطلان کیا تھا اور انہیں خارج از اسلام قرار دیا تھا۔

مرزا کے مکذوبات

دنیا میں ہمیشہ ہر زمانہ میں تمام اہل مذاہب اور لامذہبوں نے جھوٹ کو بدترین عیب مانا ہے لیکن مرزا غلام احمد قادیانی جھوٹ بولنے کے ایسے عادی تھے کہ شاید ہی کوئی امکانی جھوٹ ان سے چھوٹا ہو، عقلی طور پر جھوٹ کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں (۱) گذشتہ واقعات کے متعلق جھوٹ بولنا (۲) موجودہ واقعات کے متعلق جھوٹ بولنا اور (۳) آئندہ پیش آنے والے واقعات کی جھوٹی پیشین گوئی کرنا — مرزا کی تالیفات میں ان تینوں جھوٹ کی قسمیں اس کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ اگر کوئی شخص انکو یکجا کرنا چاہے تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ اس طرح مرزا کا جھوٹا ہونا ایک ایسی ناقابل انکار حقیقت بن گئی ہے کہ خود ان کے ماننے والوں کو دبی زبان سے اقرار کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ قادیان سے ایک رسالہ شائع ہوا تھا جس کا نام نبی کی پہچان تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ مرزا کی پیشن گوئیاں دس سے زیادہ جھوٹ ثابت نہیں ہوئیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اس شخص کے نزدیک دس باتوں کا جھوٹ ثابت ہو جانا کوئی عیب کی چیز نہیں ہے جبکہ ہمارے محدثین کے نزدیک اگر کسی شخص کا عمر بھر میں صرف ایک جھوٹ بھی ثابت ہو جائے تو اس کی ہر روایت موضوع اور ناقابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ اس طرح معمولی راویوں کے بارے میں تو ہمارے یہاں اتنی احتیاط برتی جاتی ہے لیکن کیا مرزا غلام احمد جو دعویدارِ نبوت ہیں ان کا جھوٹا ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے؟ لہٰذا دیکھنا یہ چاہیے کہ جس مذہب میں نبوت کا مدعی ایسا کذاب ہو تو اس کے امتی کیسے ہوں گے۔ علمائے اسلام نے مرزا کے سیکڑوں جھوٹ اور جھوٹی پیشین گوئیاں اپنی

تحریروں میں گنائی ہیں۔ انہی حالات کو دیکھ کر مولوی عبدالماجد مرزائی بھاگلپوری کو ’منہاج النبوت‘ نامی کتاب لکھنا پڑی جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جھوٹ بولنا تمام نبیوں کا شیوہ رہا ہے (نعوذ باللہ منہ) اس طرح ایک ایسے شخص کو نبی اور رسول ماننا، اس کو افضل الانبیاء سمجھنا، اسے مامور من اللہ کہنا اور اس کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دینا عقلاً کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ مرزا قادیانی کے ان مکذوبات کو اگر دیکھنا ہو تو ان کی کتابیں اربعین کے مختلف حصے، تحفۃ الندوہ، شہادۃ القرآن، نشان آسمانی تحفۂ غزنویہ، انجام آتھم، کشتیٔ نوح، دافع البلاء، اعجاز احمدی، چشمۂ معرفت اور ازالۂ اوہام وغیرہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ اخبار بدر قادیان اور الحکم قادیان کے مختلف شمارے بھی ان کی شہادت دیتے ہیں۔[1]

مرزا اور توہین انبیاء علیہم السلام

خدا کی مخلوق میں سب سے اعلیٰ مرتبہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، خدا نے ان کو ہدایت خلق کے لیے بھیجا اور ان کے اقوال و افعال اور احوال کو اپنے بندوں کے لیے حجت اور واجب الاقتداء قرار دیا ہے، ان پر ایمان لانے کی تاکید اور نجاتِ آخرت کو اسی ایمان پر منحصر کیا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجودیکہ وہ سید الانبیاء ہیں یہ منع فرمایا ہے کہ مجھے یونس علیہ السلام پر بھی فضیلت نہ دو۔ قرآن مجید نے بار بار بڑے اہتمام سے اس مقدس جماعت کی عظمت و جلالت کے عقیدے کی تعلیم دی اور ان کی توہین کو کفر قرار دیا ہے، لہٰذا جو شخص اس جماعت کی توہین کرے اور ان کی شان میں گستاخانہ الفاظ لکھے تو کیا وہ خدا کے یہاں کسی رتبہ کا مستحق ہو سکتا ہے؟ اس کا نبی و رسول ہونا تو بڑی بات ہے ایسا شخص اچھا آدمی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مرزا غلام احمد کے متعلق اس مبحث میں بھی قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے کیونکہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی جس قدر توہین کی ہے اس کی کوئی حد نہیں مثلاً ضمیمہ ”انجام آتھم“ صفحہ ۵ کے حاشیہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت وہ لکھتے ہیں۔ ”یہ بھی یاد رہے کہ آپ کو کسی قدر جھوٹ بولنے کی بھی عادت تھی۔“ نعوذ باللہ منہ۔ اسی کتاب کے صفحہ ۷ میں انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں لکھا ہے کہ — ”آپ کے ہاتھ میں سوا مکر و فریب کے اور کچھ نہ تھا۔“ استغفر اللہ! انہی پیغمبر جلیل القدر کے مبارک خاندان پر رکیک حملہ کرتے ہوئے وہ طنزیہ لکھتے ہیں۔ — ”آپ کا خاندان بھی نہایت پاک اور مطہر

---

[1] صحیفۂ رنگون، ص ۲۷ تا ۹۲

ہے۔ تین دادیاں اور نانیاں آپ کی زنا کار اور کسبی عورتیں تھیں جن کے خون سے آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا مگر شاید یہ بھی خدائی کے لیے ایک شرط ہوگی۔ آپ کا کنجریوں سے میلان اور صحبت شاید اسی وجہ سے ہو کہ جدّی مناسبت درمیان میں ہے ورنہ کوئی پرہیز گار انسان ایک جوان کنجری (کسبی) کو یہ موقع نہیں دے سکتا کہ وہ اس کے سر پر اپنے ناپاک ہاتھ لگائے اور زنا کاری کی کمائی کا پلید عطر اس کے سر پر ملے اور اپنے بالوں کو اس کے پیروں پر ملے، سمجھ والے سمجھ لیں کہ ایسا انسان کس چلن کا ہو سکتا ہے۔'' استغفر اللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی احادیث کی تو جو توہین مرزا نے کی ہے وہ بھی جہنم کی دعوت دینے کے لیے کافی ہے۔ بطور نمونہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ 'ازالۂ اوہام' صفحہ ۳۱۰ و ۳۱۱ میں احادیث رسول کی توہین مرزا نے اس طرح کی ہے۔ ''ہم اس کے جواب میں خدائے تعالیٰ کی قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ میرے اس دعوے کی بنیاد حدیث نہیں بلکہ قرآن اور وحی ہے جو میرے اوپر نازل ہوئی، ہاں تائیدی طور پر ہم حدیث بھی پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق ہیں اور میری وحی کی معارض نہیں (بقیہ) اور دوسری حدیثوں کو ہم ردی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔'' دیکھیے کیسی صریح توہین حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کی تردید میں لکھتے ہیں کہ ''سیر معراج اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھی بلکہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا کشف تھا جس کو در حقیقت بیداری کہنا چاہیے۔'' پھر چند سطروں کے بعد تحریر ہے کہ ''اس قسم کے کشفوں میں خود مؤلف (یعنی مرزا) صاحب تجربہ ہے۔'' مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نزدیک معراج ایک قسم کا کشف تھا اور فی الواقع سیر عالم بالا کے لیے آنا و جانا نہ تھا کیا اس عبارت سے معراج کا صاف انکار نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ مرزا اپنے کو اس معاملہ میں صاحب تجربہ کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ خود ان کو کئی مرتبہ ایسی معراج ہو چکی ہے۔ مزید یہ کہ اس عبارت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم لطیف و الطف —— کو کثیف کہنا کیسی گستاخی ہے جس کا صدور کسی صاحب ایمان سے ہرگز ممکن نہیں۔ ازالۂ اوہام حصہ اول، حاشیہ صفحہ ۷۴ پر ایک طویل عبارت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''دجال وغیرہ کی حقیقت سمجھنے میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غلطی ہوگئی کیونکہ یہ چیزیں ان کے زمانے میں غیب محض تھیں کوئی نمونہ وغیرہ موجود نہ تھا اور میرے زمانہ میں چونکہ نمونہ موجود ہے لہٰذا میں ان چیزوں کی اصلی حقیقت سمجھ گیا۔'' اہل ایمان غور کریں کہ اس عبارت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر توہین ہے اور شریعت الٰہیہ کو

کس طرح بازیچۂ اطفال بنایا گیا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دجال وغیرہ کی حقیقت غیب محض ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آئی تو جنت دوزخ اور عالم آخرت کے متعلق جو کچھ آپ نے خبر دی ہے اس کا کیا اعتبار رہ گیا کیونکہ وہ تو غیب الغیب ہیں، نعوذ باللہ منہ۔ مرزا نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''بعض پیشین گوئیوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اقرار کیا ہے کہ میں نے ان کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔'' ازالۂ اوہام خرد، جلد اول ص ۴۰۰ مرزا جی نے انبیاء کرام کی توہین کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام کی توہین کا ثواب بھی اپنے نامۂ اعمال میں اضافہ کرایا ہے، چنانچہ اعجاز احمدی ص ۵۲ و ۸۱ پر لکھا ہے کہ ''ابو ہریرہ غبی تھا اور درایت اچھی نہیں رکھتا تھا۔'' نیز اسی کتاب کے صفحہ ۱۸ میں لکھا ہے کہ ''حق بات یہ ہے کہ ابن مسعود ایک معمولی انسان تھا۔'' استغفر اللہ![1]

مرزا کی مذکورہ بالا عبارتیں ان کی درجنوں عبارتوں میں سے منتخب کر کے بطور نمونہ بسلسلۂ توہین انبیاء واصحاب رسولؐ پیش کی گئیں جن سے ان کی اسلام دشمنی اور نبیوں کی مخالفت واضح ہو گئی ہے۔ منجملہ اور دلائل کے ان کے خارج از اسلام ہونے کے لیے یہ بھی اہم دلیل ہے۔ مزید تفصیلات جاننے کے لیے ان کی کتابیں ضمیمہ انجام آتھم معیار المذاہب، توضیح المرام، ازالۂ اوہام حصہ اول اور اعجاز احمدی وغیرہ بھی دیکھنا چاہیے۔

مرزا کا دعویٰ نبوت

مرزائیوں میں قادیانی گروپ تو صاف صاف مرزا کے مدعی نبوت ہونے کا مقر اور عقیدہ ختم نبوت کا منکر ہے لہٰذا اس فرقہ کے سامنے تو صرف یہ ثابت کر دینا کافی ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ واحادیث متواترہ کی دلالت قطعیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبوت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی اور آپ کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے وہ دجال کذاب، مردود اور ملعون ہے۔ لیکن لاہوری گروپ اول تو ناواقفوں کے سامنے مرزا کے مدعی نبوت ہونے سے انکار کرتا ہے اور بدقسمتی سے اگر کسی واقف کار سے واسطہ پڑ گیا تو کہہ دیتا ہے کہ مرزا نے نبوت کا دعویٰ تو کیا ہے مگر وہ مجازی، ظلی، بروزی اور غیر مستقل نبی ہونے کا دعویٰ ہے لہٰذا اس گروہ کے مقابلہ میں مرزا کے وہ اقوال دکھانے چاہئیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حقیقی نبوت کا دعویٰ

---

[1] صحیفۂ رنگون، ص ۹۴ تا ۱۰۰

کیا ہے۔ یہ گروپ مسلمانوں کے لیے زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ اس سے عام مسلمان اپنی بے خبری کی وجہ سے جلد دام فریب میں آجاتے ہیں لہٰذا اب اس سلسلہ میں ہم مرزا کے وہ اقوال پیش کرتے ہیں جن میں انہوں نے صاف اور واضح الفاظ میں اپنے نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

انجام آتھم صفحہ ۶۲ پر ہے ''الہامات میں میری نسبت بار بار بیان کیا گیا ہے کہ یہ خدا کا فرستادہ، خدا کا مامور، خدا کا امین اور خدا کی طرف سے آیا ہوا ہے۔ یہ جو کچھ کہتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور اس کا دشمن جہنمی ہے۔'' دافع البلاء۔ صفحہ ۱۱ میں ہے کہ ''سچا خدا وہی ہے جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔'' اعجاز احمدی صفحہ ۷ میں ہے کہ ''مجھے بتایا گیا تھا کہ تیری خبر قرآن و حدیث میں موجود ہے اور تو ہی اس آیت کا مصداق ہے هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ۔'' یہ آیت قرآن مجید کی ہے اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، لیکن مرزا کہتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق میں ہوں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا صاحب ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث ہونے اور صاحبِ شریعت ہونے کے مدعی ہیں، اربعین نمبر ۳ صفحہ ۳۶ میں ہے کہ ''خدا وہی خدا ہے کہ جس نے اپنے رسول یعنی اس عاجز کو ہدایت، دین حق اور تہذیب اخلاق کے ساتھ بھیجا ہے۔'' حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۵ میں ہے کہ ''—— اور یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ جس قدر خدا تعالیٰ نے مجھ سے مکالمہ و مخاطبہ کیا اور جس قدر امور غیبیہ مجھ پر ظاہر فرمائے ہیں تیرہ سو برس ہجری میں کسی شخص کو آج تک بجز میرے یہ نعمت عطا نہیں کی گئی، اگر کوئی منکر ہو تو بار ثبوت اس کی گردن پر ہے، غرض اس حصہ کثیر وحی الٰہی اور امور غیبیہ میں اس امت میں سے میں ہی ایک فرد مخصوص ہوں اور جس قدر مجھ سے پہلے اولیاء، ابدال، اقطاب اس امت میں گذر چکے ہیں ان کو یہ حصۂ کثیر اس نعمت کا نہیں دیا گیا پس اس وجہ سے نبی کا نام پانے کے لیے میں ہی مخصوص کیا گیا اور دوسرے تمام لوگ اس مقام کے مستحق نہیں۔'' مرزا جی اپنے کو تمام انبیاء سے حتیٰ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل کہتے تھے جیسا کہ دافع البلاء صفحہ ۱۳ میں لکھا ہے کہ ''خدا نے اس امت میں مسیح موعود بھیجا جو اس پہلے مسیح (حضرت عیسیٰؑ) سے تمام شان میں بڑھ کر ہے۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر مسیح ابن مریم میرے زمانہ میں ہوتا تو وہ کام جو میں کر سکتا ہوں وہ ہرگز نہ کر سکتا۔'' حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۹-۱۵۰ میں ہے کہ ''اوائل میں میرا بھی یہی عقیدہ تھا کہ مجھ کو مسیح ابن مریم سے کیا نسبت ہے، وہ نبی ہے اور خدا

کے برگزیدہ مقربین میں سے ہے اور اگر کوئی امر میری فضیلت کی نسبت ظاہر ہوتا تو میں اس کو جزئی فضیلت قرار دیتا تھا مگر بعد میں جب خدا کی وحی بارش کی طرح میرے پر نازل ہوئی تو اس نے مجھے اس عقیدہ پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھ کو دیا گیا۔" اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا جی حضرت مسیح علیہ السلام پر اپنے کو فضیلت کلی دے رہے ہیں۔ تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۸ میں ہے کہ "میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے اور اسی نے مسیح موعود کے نام سے (مجھے) پکارا ہے اور اسی نے میری تصدیق کے لیے بڑے بڑے نشان ظاہر کیے جو تین لاکھ تک پہنچتے ہیں۔" اسی کتاب کے صفحہ ۸۹ میں لکھا ہے کہ "تمام دُنیا میں کئی تخت اُترے پر تیرا (یعنی مرزا کا) تخت سب سے اونچا بچھایا گیا ہے۔" استفتاء صفحہ ۸۷ میں تحریر ہے کہ "واتانی مالم یوت احداً من العالمین یعنی خدا نے جو کچھ مجھے دیا ہے سارے جہان میں کسی کو نہیں دیا۔" مکتوبات احمدیہ جلد ۳ صفحہ ۴۹ میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات جو صحابہؓ کی شہادتوں سے ثابت ہیں وہ تین ہزار معجزہ ہیں (لیکن) اس خدا نے میری تصدیق کیلیے بڑے بڑے نشان ظاہر کیے جو تین لاکھ تک ہیں۔" قصیدۂ اعجازیہ کے ایک شعر میں ہے کہ اس کے لیے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے) چاند کا خسوف ظاہر ہوا اور میرے لیے چاند اور سورج دونوں کا۔ اب کیا تو (پھر بھی) انکار کرے گا؟" دیکھئے کس قدر گستاخی کے ساتھ اپنا مقابلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر کے اپنے کو فضیلت دی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزۂ شق القمر کو مرزا جی چاند گہن کہتے ہیں۔ اربعین نمبر ۴ صفحہ ۱۹ میں ہے کہ "جبکہ مجھے اپنی وحی پر ایسا ہی ایمان ہے جیسا کہ توریت وانجیل وقرآن کریم پر تو کیا انہیں مجھ سے یہ توقع ہوسکتی ہے کہ میں ان کے ظنیات بلکہ موضوعات کے ذخیرہ کو سن کر اپنے یقین کو چھوڑ دونگا جس کی بنا حق الیقین پر ہے۔" ازالۂ اوہام جلد دوم صفحہ ۶۹۱ میں ہے کہ "ہاں میں یہ کہتا ہوں کہ چونکہ میں مسیح موعود ہوں اور خدا نے عام طور پر میرے لیے آسمان سے نشان ظاہر کیے پس جس شخص پر میرے مسیح موعود ہونے کے بارے میں اتمام حجت ہو چکا ہے اور وہ میرے دعوٰی پر اطلاع پا چکا ہے تو وہ قابل مواخذہ ہوگا کیونکہ خدا کے فرستادوں سے دانستہ منہ پھیرنا ایسا امر نہیں ہے کہ اس پر کوئی گرفت نہ ہو، اس گناہ کا دادخواہ میں نہیں بلکہ ایک ہی ہے جس کی تائید کے لیے میں بھیجا گیا (ہوں)۔" مرزا نے اپنے نہ ماننے والوں کو کافر کہا ہے اور ان کے

پیچھے نماز پڑھنے کو منع کیا ہے۔ انہوں نے اخروی نجات کو اپنے ماننے والوں میں منحصر قرار دیا ہے چنانچہ اربعین نمبر ۳ صفحہ ۲۸ کے حاشیہ میں ہے کہ ''خدا نے مجھے اطلاع دی ہے کہ تمہارے اوپر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ (تم) کسی مکفر یا مکذب یا متردد کے پیچھے نماز پڑھو بلکہ تمہارا امام وہی ہو جو تم میں سے ہو۔'' اسی قسم کے خیالات ایک دوسری جگہ فتاویٰ احمدیہ جلد ۱، صفحہ ۸۲ میں تحریر کرتے ہیں کہ ''سوال ہوا کہ اگر کسی جگہ امام نماز حضور (یعنی مرزا) کے حالات سے واقف نہیں تو اس کے پیچھے نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، (اس کے جواب میں) فرمایا کہ پہلے تمہارا فرض ہے کہ (تم) اسے واقف کراؤ پھر اگر (وہ) تصدیق کرے تو بہتر (ہے) ورنہ اس کے پیچھے اپنی نماز ضائع نہ کرو اور اگر کوئی خاموش رہے (یعنی) نہ تصدیق کرے نہ تکذیب تو وہ بھی منافق ہے اس کے پیچھے (بھی) نماز نہ پڑھو۔'' بعض تحریروں میں مرزا نے اپنے کو خدا اور خدا کا بیٹا ہونے کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۵ میں ہے کہ ''خدا نے فرمایا کہ اے مرزا تیری شان یہ ہے کہ تو جس (چیز) کو کہدے کہ ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔ قرآن مجید میں خدا نے یہ شان اپنی بیان فرمائی ہے۔'' اسی کتاب میں ایک جگہ لکھا کہ ''خدا نے فرمایا ہے کہ اے مرزا تو میرے لڑکے کے برابر ہے۔'' آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۵۶۴ میں ہے کہ ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بعینہ اللہ ہوں اور میں نے یقین کیا ہے کہ میں ہی خدا ہوں پھر میں نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں نے کہا کہ ہم نے آسمانی دنیا کو چراغوں سے زینت دی ہے۔''[1]

اس طرح مرزا صاحب نہ صرف حقیقی نبوت بلکہ وہ قطعاً و یقیناً اپنے افضل الانبیاء ہونے کے بھی مدعی ہیں، انہوں نے صرف اسی پر اکتفاء نہیں کی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر خدائی کا دعویٰ اور خدا کے بیٹے ہونے کا بھی دعویٰ کر چکے ہیں نعوذ باللہ منہ۔ ان کو اگر مفصل دیکھنا ہو تو ان کتابوں کو خاص طور سے دیکھنا چاہیے: انجام آتھم، دافع البلاء، اعجاز احمدی، اربعین نمبر ۳۔۴، حقیقۃ الوحی اور اس کا تتمہ، کتاب استفتاء مکتوبات احمدیہ قصیدۂ اعجازیہ، ازالہ اوہام، فتاویٰ احمدیہ، آئینہ کمالاتِ اسلام اور تحفۂ گولڑویہ وغیرہ۔

مرزا کا انکارِ ضروریاتِ دین

مرزا غلام احمد نے اپنے لاتعداد جھوٹ توہین انبیاء اور دعویٰ نبوت کے ساتھ ساتھ

---

[1] صحیفۂ رنگون، ص ۱۰۰ تا ۱۰۸

ضروریات دین کا بھی انکار کیا ہے جس کا ثبوت مذکورہ بالا کتب میں بکثرت ملتا ہے۔ضروریات دین کے انکار کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ خداتعالیٰ (معاذاللہ) جھوٹ بولتا ہے۔
۲۔ وہ اپنے وعدے سے مکر جاتا ہے۔
۳۔ اکثر نبیوں سے وحی کے سمجھنے میں غلطی ہوجاتی ہے۔
۴۔ نبیوں سے گناہ کبیرہ بھی سرزد ہوجاتے ہیں۔
۵۔ حضرت مسیح کے بے باپ پیدا ہونے سے مرزا کو انکار ہے۔
۶۔ وہ معراج کے منکر ہیں۔
۷۔ ملائکہ کے منکر ہیں۔
۸۔ حشر جسمانی اور جنت ودوزخ کے منکر ہیں۔
۹۔ دجال، دابۃ الارض، یاجوج وماجوج اور دوسری غیبی باتوں کے منکر ہیں۔
۱۰۔ ختم نبوت کے منکر ہیں۔
۱۱۔ تناسخ کے عقیدہ کے معتقد تھے اور وہ
۱۲۔ حیات مسیح کے منکر ہیں۔[۱]

مذکورہ بالا باتوں کے انکار کی تائید ان کی کتابوں مثلاً جلسۃ المذاہب، منارۃ المسیح، ازالۂ اوہام اور کتاب استفتاء وغیرہ سے بخوبی ہوتی ہے۔ہم نے مرزا کے یہ اقوال بطور نمونہ پیش کیے ہیں اس لیے اگر ان کی تفصیلات جاننے کی خواہش ہو تو النجم کی فائلیں، صحیۂ رنگون اور صولت محمدیہ نامی مرزائیوں سے مناظرے کی رودادیں اور اکابر علماء حق کی مفصل کتابیں دیکھنی چاہیں جن میں بہت تفصیل اور حوالوں کے ساتھ مرزا کے ان خیالات اور عقائد کا ذکر ملتا ہے۔

مرزا کے کفر کا فتویٰ

انہی واضح دلائل وشواہد کی روشنی میں حضرت مولانا لکھنویؒ نے ۱۹۱۹ء مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین کے کفر پر ایک فتویٰ مرتب کر کے شائع کیا تھا جس کے الفاظ یہ تھے:

''مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین قطعاً کافر ہیں، ان کے ساتھ کوئی اسلامی معاملہ جائز

۱۔ صحیۂ رنگون، ص ۱۰۹ تا ۱۱۰

نہیں۔ان کے ساتھ نہ تو مناکحت درست ہے اور نہ ہی ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال ہے، اسی طرح ان کو اپنی مسجدوں میں نہ نماز کی اجازت اور نہ ہی ان کے مردہ کو اپنے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت دینی چاہیے۔

اس فتویٰ کی تائید میں تقریباً تین سو علماء نے اس پر دستخط کیے تھے جن میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا محمد داؤد غزنویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ، مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا عبدالماجد بدایونیؒ، اور مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ جیسے اکابر علماء وقت کے نام قابل ذکر ہیں۔اس طرح مرزا اور مرزائیت کے بارے میں اسی زمانے میں مختتم فیصلہ ہوگیا تھا جس کی بحمداللہ آج عالم اسلام نے بھی تائید کردی۔

مشاجراتِ صحابہؓ اور یزید کے بارے میں حضرت لکھنویؒ کی رائے

تردید شیعیت میں بڑا نازک مقام یہ ہوتا ہے کہ ایک ذمہ دار عالم اپنے آپ کو توازن اور اعتدال میں رکھے، وہ اپنی حدود سے ذرہ برابر نہ تو تجاوز کرے اور نہ ہی اپنے قول و فعل سے صحابہ کرامؓ کے فضائل و مناقب کی تبلیغ و اشاعت میں خاندانِ رسالت اور اہل بیت نبوی کے مرتبہ و مقام میں ادنیٰ سی بھی کمی واقع ہونے دے، جب کہ خود اہل بیت نبوی کے اکثر اکابر زمرۂ صحابہؓ میں بھی شمار کیے جاتے ہیں۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت اور اس کے بعد کے حالات جنگ جمل و جنگ صفین اور آخر میں حادثہ کربلا اور شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک کا دور اسلامی تاریخ میں بڑا اندوہناک اور کربناک دور ہے۔سبائی گروہ نے تاریخ کے اس دور میں خوب خوب رنگ آمیزی کی۔اس نے فرضی الزام تراشی، تہمت آفرینی اور کردار کشی کے وہ تیر برسائے کہ کسی کا دامن بھی داغدار اور غیر محفوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو جس کی حمایت پر اترا اس میں اس نے اتنا غلو اختیار کیا کہ اس کو الوہیت کی صفات سے متصف کردیا اور جس کسی کی مخالفت منظور ہوئی تو اس کے حق میں دشنام طرازی اور تبرابازی کی کوئی کسر نہ چھوڑی، چنانچہ اس سلسلہ میں بعض واقعات اور بعض شخصیتوں کو ایسا مشتبہ اور مشکوک کردیا گیا ہے کہ ان کے صحیح حالات اور ان کے اصلی خدوخال تاریخ کی متضاد روایات اور فرضی داستانوں کی چادر میں لپٹ کر افراط و تفریط کا شکار ہوگئے اور پھر اس آڑ میں سب و شتم کی وہ برق اندازیاں کی گئیں کہ مقدس و بزرگ شخصیتوں کے دامن تقدس کو خاکستر کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا

گیا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق نے تاریخ کے اس روح فرسا دور کی ورق گردانی میں بڑی احتیاط اور چھان بین سے کام لیا ہے تاکہ کسی بھی بزرگ کے حقیقی منصب و مرتبہ اور ان کی شان کے خلاف ان سے کوئی عمل صادر نہ ہو۔ درحقیقت یہ سب کچھ محبت اہلِ بیت کے پردے میں اور بغض صحابہ کے جذبہ کی تسکین کے لیے کیا گیا ہے جس کا ردعمل ظاہر ہونا ضروری تھا چنانچہ شیعیت کے غلو کے جواب میں خارجیت نے سر اٹھانا شروع کیا، اس طرح عمل اور ردعمل کے سیلاب میں نہ جانے کتنی ذہین، متدین اور قابل اعتماد شخصیتیں بہہ گئیں۔ شیعیت اور خارجیت دونوں ایک دوسرے سے متضاد نظریات کی حامل ہیں اور دونوں ہی اہل سنت و جماعت کے مسلک اعتدال سے ہٹی ہوئی اور جادۂ حق سے کوسوں دور ہیں۔ حضرت مولانا لکھنویؒ کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے حب صحابہ اور حب اہل بیت دونوں کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ انہوں جہاں اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے فضائل و مناقب کو محبت و احترم کے ساتھ بیان کیا ہے وہیں اسی پاس و لحاظ کے ساتھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم المرتبت صحابی اور کاتب وحی الٰہی حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے بھی فضائل و مناقب کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دونوں بزرگوں میں جو فرق مراتب تھا اس کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے چنانچہ جنگ صفین کے سلسلہ میں ان دونوں بزرگوں کے منصب و مرتبہ کے بارے میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس لڑائی کے متعلق اہل سنت کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلیفۂ برحق تھے اور حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھ والے باغی اور خاطی، مگر اس خطا پر ان کو برا کہنا جائز نہیں کیونکہ وہ بھی صحابی ہیں اور صاحبِ فضائل ہیں، ان کی یہ خطا غلط فہمی کی وجہ سے تھی اور غلط فہمی کے اسباب موجود تھے۔ ایسی خطا کو خطائے اجتہادی کہتے ہیں جس پر عقلاً و شرعاً کسی طرح مواخذہ نہیں ہوسکتا ــــ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ابتداءً تو باغی تھے مگر حضرت حسن بن علیؓ کی صلح و بیعت کے بعد وہ بلاشبہ خلیفۂ برحق ہوگئے (تھے)[1]''

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان اسی فرق مراتب کے متعلق حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے بھی حضرت لکھنویؒ سے خود اپنی سنی ہوئی ایک روایت ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ میں نقل کی ہے کہ آپ نے ایک موقع پر ان سے فرمایا تھا:

> ''حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سابقین اولین کی پہلی صف کے بھی اکابر میں ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج ہیں لیکن حضرت علی

---

[1] مقدمہ سیرت خلفائے راشدینؓ، مرتبہ مولانا لکھنویؒ، چھٹا ایڈیشن، دہلی [2] الفرقان لکھنؤ، ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ

مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کو کیا نسبت؟ ان کی مجلس میں اگر صفِ نعال میں بھی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جگہ مل جائے تو ان کے لیے سعادت اور باعثِ فخر ہے۔''

ان دونوں شہادتوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ نے مشاجراتِ صحابہ اور دیگر اختلافی امور میں کبھی جادۂ حق سے انحراف نہیں کیا اور ہمیشہ مسلکِ وسط کو اختیار کیا ہے۔ یہی مسلک ہمارے اکابر اہل سنت کا طرۂ امتیاز ہے اور سوادِ اعظم کا متفقہ عمل ہے۔ اختلافاتِ صحابہؓ کے سلسلے میں ہمارے علماء نے کفِ لسان کا حکم دیا ہے اور فریقین میں سے کسی کو بھی تنقید کا نشانہ بنانے کو منع کیا ہے کیونکہ نبی کی طرح صحابہ معصوم عن الخطا تو نہیں ہیں مگر وہ مصئون و محفوظ ضرور ہیں، وہ سب کے سب عادل اور مجتہد تھے، ان سے خطائے اجتہادی تو ہو سکتی ہے مگر اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا بلکہ وہ موجبِ ثواب ہوگی۔

حضرت لکھنویؒ کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ آپ اپنی تقریروں اور تحریروں میں واقعاتِ کربلا کا تذکرہ زیادہ نہیں کرتے تھے۔ اس احتیاط کے اسباب وہی ہیں جنھیں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اس حادثہ فاجعہ کے سلسلہ میں تاریخی کتابوں میں صحیح اور موضوع روایات اس کثرت سے خلط ملط کر دی گئی ہیں کہ اصل و بے اصل کا امتیاز کرنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس لیے ان واقعات کے تذکرہ میں انہوں نے سکوت ہی اختیار کرنا بہتر سمجھا ہے۔ البتہ ان واقعات کی جو صحیح تفصیلات انہیں تاریخ و سیر کی معتبر کتابوں میں مل سکی تھیں انھیں اپنی کتاب 'افاضۃ العینین علی شہادۃ الحسنین' المعروف بہ تحقیقی شہادت نامہ میں جمع کر کے شائع کر دیا تھا جو اس موضوع پر نہایت معتبر و مستند کتاب ہے۔

تقریباً یہی صورتِ حال یزید کے سلسلے میں بھی ہے، ان کی حمایت اور مخالفت میں بھی شروع ہی سے بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے اور ان کے حامی و مخالف دونوں طبقے غلو کی انتہا کو پہونچے ہوئے ہیں لہٰذا اہل سنت و جماعت اور اکابر علماء حق کی روش یہی رہی ہے کہ تاریخ اسلام کے اس سب سے زیادہ متنازعہ فرد یزید کے بارے میں جو کفر کے الزامات ہیں ان پر سکوت اختیار کیا جائے البتہ ان کا فسق متفق علیہ ہے اب رہا یہ سوال کہ ایسے فاسق و فاجر شخص کو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلمانوں کا امیر کیسے بنا دیا تو اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ معذور تھے اور انہیں صحیح صورت حال کا علم نہ ہو سکا تھا اس لیے ان کا یہ فیصلہ کسی بدنیتی پر نہیں بلکہ ایک قسم کی خطائے اجتہادی پر مبنی تھا چنانچہ اس ضمن میں علامہ ابن حجر مکیؒ نے اپنی کتاب 'تطہیر الجنان' میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ایک ایسی سند سے جس میں ایک راوی متروک

ہے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو تمہارا کیا حال ہوگا جب تمھیں ایسی قوم سے سابقہ پڑیگا جس کا سردار تو جنت میں داخل ہوگا مگر اس کے متبعین دوزخ میں جائیں گے آگے چل کر اس کی وجہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ اس قوم کا سردار بوجہ اپنے سوابق کے جنت میں جائے گا لیکن متبعین ان بدعات کی وجہ سے جن کا وہ ارتکاب کریں گے دوزخ میں جائیں گے مطلب اس حدیث کا یہ ہے کہ (واللہ اعلم) کہ سردار تو مجتہد ہوں گے لہٰذا ان کو ثواب ملے گا اور متبعین چونکہ مجتہد نہ ہونگے لہٰذا جو کام وہ اپنی رائے سے کریں گے اس کا ان سے مطالبہ کیا جائے گا اسی طرح وہ ایک اور حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس کی سند میں بعض راوی ایسے ہیں جو مناکیر کی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابہ سے (بعض اوقات) کچھ لغزش ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ معاف کردیگا مگر ان کے بعد کچھ لوگ ہونگے جن کو اللہ تعالیٰ سرنگوں کر کے دوزخ میں ڈالے گا۔ اس حدیث کی صحت اگر مان لی جائے تو مطلب اس کا یہ ہوگا کہ لغزش سے مراد وہ فعل ہے جو خلاف اولیٰ ہو کیونکہ ابرار کے حق میں جو امور نیکی کے سمجھے جاتے ہیں وہ مقربین کے حق میں گناہ متصور ہوتے ہیں[1]۔ ان احادیث سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے علامہ ابن حجر مکیؒ تحریر کرتے ہیں:

> ”لیکن اس کے باوجود بعض (صحابہ) سے ایسی باتیں صادر ہوئی ہیں جو ان کے مرتبہ کے لائق نہ تھیں جیسے حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلیفہ بنادیا۔ بیٹے کی شدتِ محبت نے اس کے کمالات ان کی نظر میں جمادیئے تھے اور اس کے عیوب ان کی نظر سے پوشیدہ کردیئے تھے حالانکہ اس کے عیوب آفتاب سے بھی زیادہ روشن تھے، پس یہ بات حضرت معاویہؓ کے مرتبہ کے لحاظ سے لغزش تھی (جس پر) اللہ ان کو بخش دے گا مگر کسی دوسرے کو حضرت معاویہؓ کی تقلید اس فعل میں جائز نہیں اور جو شخص اس بات میں ان کی تقلید کرے گا وہ سرنگوں کر کے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا[2]۔“

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ عیاں ہوگیا کہ یزید میں فسق تھا اور حضرت معاویہؓ سے انھیں امیر بنانے میں خطائے اجتہادی ہوئی تھی۔ تطہیر الجنان کا اُردو میں ترجمہ کرکے حضرت لکھنویؒ نے دو بار اسے شائع کیا تھا مگر اس مقام پر انھوں نے کوئی اختلافی نوٹ نہیں لگایا جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی اس رائے سے متفق تھے ورنہ ضرور اس کے خلاف اپنی رائے تحریر کرتے۔

---

[1] تنویر الایمان اُردو ترجمہ تطہیر الجنان، مترجمہ مولانا لکھنویؒ، ص ۷۷-۷۸ [2] تنویر الایمان، ص ۷۸۔

چوبیسواں باب

تردیدِ شیعیت

گذشتہ ابواب میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اودھ اور لکھنؤ کے دینی حالات بے حد ناگفتہ بہ تھے۔ یہاں اہل سنت کا اپنا کوئی تشخص باقی نہ تھا، دینی بے حسی اور اعمال خیر سے بے نیازی عام تھی، مسجدیں غیر آباد، مدارس سنسان اور اکثر خانقاہیں حال وقال سے تہی دست بلکہ حصول دنیا کا ذریعہ بنی ہوئی تھیں، اس طرح پورا مسلم معاشرہ دوسروں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ عوام کے نزدیک مذہب چند رسوم کا نام ہو کر رہ گیا تھا، کہیں محرم کی دھوم دھام، کہیں مہندی کا جلوس، کہیں چپ تعزیہ کا اہتمام، کبھی نوروز کے نام سے رنگ اور گلال سے چھیڑ چھاڑ، امام غائب کی پیدائش کی خوشی میں شب برات کے حلوے و پٹاخے، کہیں آگ پر ماتم، زنجیروں کا ماتم اور چھریوں کا ماتم و نیز شام غریباں کے نام سے فرضی ہولناک مناظر کی تصویر کشی بس انھی باتوں کا نام مذہب ہو گیا تھا اور اسی کا نام اسلامی کلچر اور اسلام تہذیب وتمدن پڑ گیا تھا۔ حضرت لکھنویؒ اپنے اِرد گرِد یہی دلخراش اور ظلمت انگیز ماحول دیکھ رہے تھے جس سے مجبور ہو کر انھوں نے اپنی زبان اور قلم کو اس محاذ پر استعمال کیا، اس لیے اگر آج کوئی یہ کہے کہ ہندوستان میں شیعہ سنّی اختلافات کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہے تو یہ سراسر خلافِ حقیقت اور جھوٹا پروپیگنڈہ ہوگا۔ مخالفین کی طرف سے ہمیشہ یہی کہا جاتا رہا ہے جس سے بعض ناواقف اہلسنّت بھی بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر ان حالات کا جائزہ لینے کے لیے جب ان کے گرد و پیش کا مطالعہ کیا جائے گا اور اودھ کی سیاسی، مذہبی اور معاشرتی صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے اس مسئلہ کا تجزیہ کیا جائے گا تو ضرور مولانا کو معذور سمجھا جائے گا۔

مولانا کی پوری زندگی پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ہمیشہ ان تمام عناصر سے

بھرپور مقابلہ کیا جو اپنے اپنے طریقوں سے اسلام کے روشن اور صاف وشفاف چہرے کو کفر و شرک اور بدعت کی کثافت سے داغدار بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے جذبۂ ایمانی اور ملّی حمیت کی بنا پر وقتی مصلحتوں، سیاسی تقاضوں اور دنیاوی مفادات سے اوپر اٹھ کر اسلام کے متفقہ اور بنیادی عقائد سے متحارب فرقوں سے مسلسل نبرد آزما رہے۔

اس خصوصی موضوع پر ہر دور میں ضرورت اور حالات کے مطابق کام ہوتا رہا ہے اور جب کبھی مخالفین اہلسنت کی طرف سے دین مبین پر اعتراضات اور زبان طعن دراز ہوئی علمائے اہل سنت نے اس کے استیصال کی ہر ممکن کوشش کی، چنانچہ اس عنوان پر برصغیر سے باہر جن علماء نے خصوصی طور پر قلم اٹھایا ہے ان میں امام ابن حزم اندلسیؒ، قاضی عیاض مالکیؒ، پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، علامہ ابن تیمیہ حنبلیؒ، علامہ کمال الدین ابن ہمامؒ، علامہ علی قاریؒ اور ابن عابدین شامی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین قابلِ ذکر ہیں اور ہمارے اس برصغیر میں علامہ بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی، مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا حیدر علی فیض آبادی، خواجہ نصر اللہ کابلی، مولانا سیف اللہ بن اسد اللہ ملتانی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا احتشام الدین مراد آبادی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور اب آخر میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری علیہم الرحمۃ والرضوان نے بھی نمایاں علمی خدمات انجام دی ہیں، اس طرح یہ موضوع ہمیشہ علماء امت کے پیش نظر رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آخری دور میں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل بن گیا تھا اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہاں کے بعض علاقوں میں شیعیت کو سیاسی غلبہ حاصل ہو گیا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ بھولے بھالے اور کم خواندہ مسلمانوں کو طرح طرح سے گمراہ کر رہے تھے۔ چونکہ اس فرقہ کے بارے میں اس وقت تک ہمارے علماء متفقہ طور پر اور اجتماعی حیثیت سے کوئی مختتم فیصلہ نہیں کر سکے تھے اس لیے اس کے تدارک کی کوئی موثر کارروائی نہیں ہو پا رہی تھی۔ سیاسی بالادستی حاصل ہونے کی وجہ سے شیعوں کو ہر طرح کی چھوٹ اور ہر قسم کی سہولت حاصل تھی جس سے وہ مسلمانوں کے عقائد خراب کرنے، انھیں دبانے کچلنے اور مفلس و کنگال بنا کر اپنے مذہب میں ضم کرنے پر شب و روز منہمک رہا کرتے تھے اور ہماری طرف سے اس کا کوئی مؤثر دفاع نہیں ہو رہا تھا۔ اس عدم دفاع کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ علماء شیعہ اپنی مذہبی کتابوں

کو عام لوگوں سے ہمیشہ مخفی رکھا کرتے تھے حتیٰ کہ اپنے عوام کو بھی انھوں نے اپنے مذہب کی اصل حقیقت سے بے خبر رکھا۔ اس اخفاء کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان کے ظاہر ہونے سے شیعیت کے اصلی خدوخال سے لوگ واقف ہو جاتے اور پھر اس کی روشنی میں اسلام سے ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ اسی مقصد کے لیے ایک حدیث وضع کی گئی کہ:

سلیمان خالد سے روایت ہے کہ ابوعبداللہ (امام جعفر صادقؒ) نے فرمایا کہ بیشک تم ایسے دین پر ہو کہ جو اس کو چھپائے گا اللہ اس کو عزّت دے گا اور جو اس کو ظاہر کرے گا اللہ اس کو ذلیل کرے گا۔	عن سلیمان بن خالد قال قال ابوعبداللّٰه علیه السّلام یاسلیمان انکم علیٰ دین من کتمه اعزه الله و من اذاعه' اذله الله۔[1]

اس طرح ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک ہمارے علماء کو شیعوں کی بیشتر معتبر کتابوں سے پوری طرح واقفیت نہیں ہو سکی اور وہ کوئی حتمی اور مختتم فیصلہ نہ کر سکے لیکن اب گذشتہ دو سو سالوں سے ان کی اس روش میں کچھ تبدیلی آئی اور یہ کتابیں پردۂ خفا سے باہر آنے لگیں، اس تبدیلی کا سبب کچھ تو ذرائع ابلاغ کی فراوانی اور کچھ تقیہ کے پردے سے باہر نکلنے کی خواہش اور اپنے مفروضات کی حقانیت کو ثابت کرنے کا شدید جذبہ کارفرما ہوا۔

ردِّ شیعیت میں حضرت لکھنویؒ کی بنیادی تحقیقات

اودھ میں شیعوں کی حکومت رہ چکی تھی اور لکھنؤ اس کا گہوارہ تھا اس لیے یہاں جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ حضرت مولانا لکھنویؒ یہاں کے حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے اور قبل اس کے کہ حالات زیادہ خراب ہوں انھوں نے دفاعی حکمتِ عملی پر کام شروع کر دیا چنانچہ انھوں نے مذہبِ شیعہ کی تقریباً تمام ہی اہم اور بنیادی کتابوں کو بڑی جدوجہد سے حاصل کر کے ان کا مطالعہ کیا اور اُن کے تمام عقائد کی مکمل چھان بین کی اور جہاں جہاں ان کو اسلامی معتقدات کے خلاف باتیں ملیں ان پر لکھنا اور عوامی جلسوں میں ان پر اظہار خیال کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ابتداء میں شیعوں کی طرف سے کچھ جواب دینے کی کوشش کی گئی مگر ان کے جواب الجواب کے بعد انھیں سکوت اور خاموشی اختیار کرنے میں ہی عافیت محسوس ہوئی۔ اس طرح مولاناؒ نے تحفظ ناموس

---

[1] تنبیہ الحائرین، دوسرا ایڈیشن، ص ۴، بحوالہ اصول کافی مرتبہ یعقوب کلینی (شیعی) ص ۴۸۶

صحابہؓ، حقیت خلافتِ راشدہ، تبرا وتولاّ، متعہ، تقیہ، واقعہ قرطاس واِفک اور مسئلہ فدک جیسے بہت سے دوسرے مسائل پر تفصیلی طور پر کام کیا ہے، چنانچہ آپ کی تصنیفات، النجم کے مضامین اور مخالفین اہلسنّت سے کامیاب مناظروں کی بنا پر ردّ شیعیت کے سلسلہ میں آپ کی شہرت بہت ہوئی یہاں تک کہ اس کی وجہ سے آپ کی دوسری علمی و دینی خدمات ثانوی درجہ میں آگئیں جبکہ صورتحال اس کے برعکس تھی، چنانچہ آپ نے خود ایک بار النجم میں اس سلسلہ میں تحریر فرمایا تھا کہ:

''اس زمانہ میں جہاں اور فتنوں کی ترقی ہے ایک بڑا فتنہ یہ ہے کہ باقاعدہ منظم طور پر اہل سنّت و جماعت کے خلاف معاندانہ کارروائیوں کا طوفان برپا ہے، ہمارے مذہب و بزرگانِ مذہب پر ہر قسم کے حملے ہو رہے ہیں مگر سنیوں کو کبھی ان کے ابطال و استیصال کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ ایک مدت تک صبر و خاموشی کے بعد اس طرف توجہ کرنی پڑی اور بتوفیق خداوندی جو کچھ بھی خدمت ہو سکی انجام دی گئی، اگرچہ اس حقیر نے اپنے وقت کا زیادہ حصّہ مذہبِ شیعہ کے ردِ و ابطال میں صَرف نہیں کیا بلکہ زیادہ وقت اور دوسرے مفید کاموں میں صرف کیا لیکن چونکہ اِس وقت اہل سنّت میں کسی اور کو اس طرف توجہ نہیں ہے الاماشاء اللہ، اس لیے تھوڑے کام کی شہرت زیادہ ہوگئی[۱]''

اس طرح ردِ شیعیت آپ کے نام کے ساتھ وابستہ ہوگئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ سے اس سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دلائے اور جس طرح فریقِ مقابل کے بے بنیاد الزامات کے جوابات دیئے اور ان کے مزعوماتِ باطلہ کی تردید کی وہ آگے چل کر آپ کی امتیازی شان بن گئی۔

کلمہ گویانِ اسلام میں پرانے اور نئے فرقے بہت سے ہوئے جن میں باہم سخت اختلافات بھی ہوئے مگر کسی نے قرآن مجید کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا اور نہ ہی کسی قسم کا شک و تردّد اس کے متعلق کبھی ظاہر کیا لیکن ایک فرقہ شیعہ ہے جس نے قرآن میں اختلاف کیا اور محض اختلاف ہی نہیں بلکہ قرآن کے مشکوک بنانے میں اپنی ساری طاقت صرف کردی۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ سنّی نزاع کی تاریخی حقیقت سے کبھی کسی کو انکار نہیں ہوا، ہر طبقے اور ہر زمانے میں اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی رہی ہے۔ حضرت مولاناؒ کی ان تحقیقات سے پہلے

---

[۱] ہفت روزہ ''حرم'' لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء، بحوالہ النجم

برصغیر میں عام طور پر عوام میں یہ خیال تھا کہ شیعہ صرف خاندان اہل بیت کے ساتھ محبت میں غلو کرتے ہیں یا زائد سے زائد یہ کہ وہ بعض صحابہؓ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اسی بنا پر عوام تو عوام ہیں بعض علماء اہلسنت تک انھیں اکثر اسلامی فرقوں میں شمار کرتے رہے ہیں اور گنتی کے چند مسائل کو چھوڑ کر زندگی اور موت کے تقریباً تمام ہی معاملات میں انھیں اپنے ہی ہم پلہ اور مساوی جانتے رہے ہیں۔ اس ساری غلط فہمی کا بنیادی سبب صرف وہی تھا کہ وہ مذہب شیعہ کی اصل و بنیاد سے ہمیشہ ناواقف و ناآشنا رہے کیونکہ اس مذہب کی تعلیمات کتابی ہونے کے باوجود مخفی اور خانگی طور پر دی جاتی رہیں اسی لیے ان کے عمل و عقیدے سے متعلق جتنا بھی لٹریچر ہے اس کا بڑا حصہ کبھی منظر عام پر نہیں آنے دیا گیا اور کبھی کبھار اگر کوئی دو ایک کتابیں سامنے آ بھی گئیں تو انھیں لغویات و خرافات کا ذخیرہ سمجھ کر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

ردِ شیعیت میں آپ کا تحقیقی کام اس سلسلہ کے اور دوسرے موضوعات کے علاوہ خاص طور سے ان کے عقیدۂ تحریفِ قرآن اور عقیدۂ امامت پر ہے۔ ان دونوں بنیادی عقائد پر جس شرح و بسط کے ساتھ آپ نے تحریری و تقریری بحث کی ہے وہ آپ کے تفردات میں سے ہے اور ان ہی دونوں عقائد کی بنیاد پر آپ نے اس فرقہ کے بارے میں حتمی فیصلہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ شیعیت ایک مستقل مذہب ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ جس کا ایمان اس موجودہ قرآن مجید پر نہ ہو اور جو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متوازی عقیدۂ امامت کو مانتا ہو اس کا تعلق اسلام سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ مولانا علیہ الرحمۃ کے نزدیک شیعہ موجودہ قرآن مجید کو محرّف مانتے ہیں اس لیے ان کا ایمان قرآن مجید پر نہیں ہو سکتا اور جب قرآن مجید پر سے ایمان اٹھ گیا تو پھر اسلام سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہ سکتا، بس یہیں سے ہماری اور ان کی راہ الگ ہو جاتی ہے، اس مسئلہ کی بنیاد پر مولاناؒ فرماتے ہیں:

> ”اس مسئلہ نے اب دوسرے مسائل میں شیعوں سے بحث کرنے کی حاجت نہیں رکھی، اب نہ شیعوں سے مطاعنِ صحابہ کی بابت بحث کرنے کی حاجت، نہ مسئلہ امامت و خلافت پر بحث کرنے کی ضرورت، نہ توہینِ انبیاء میں ان سے الجھنے کی حاجت اور نہ متعہ و زنا و شراب خوری و تقیہ وغیرہ پر ردّ و کد کی حاجت (باقی رہی)، جب ان کا ایمان ہی قرآن شریف پر نہیں ہے تو ان مباحث سے ان کا کیا تعلق ہے:

چوں ترکِ قراں کردهٔ آخر مسلمانی کجا
خود شمعِ ایماں کشتهٔ پس نور ایمانی کجا[1]

اسی طرح صحابۂ کرام پر لعن وتبرا وغیرہ سب اسی سلسلہ کی چھوٹی چھوٹی کڑیاں ہیں ورنہ حقیقت میں تو اس فرقہ کو اختلاف صرف آنحضرتؐ کی نبوّت ورسالت اور قرآنِ حکیم سے ہے۔ صحابۂ کرام چونکہ قرآن حکیم کے اصلی اور بنیادی راوی تھے اور ان ہی نے آنے والی نسلوں کو اپنے عمل اور قول سے یہ بتایا کہ آنحضرتؐ نے دنیا کو یہ پیغام دیا اور خدا نے اپنے نبی آخرالزماں پر یہ احکام بہ شکل قرآن اتارے ہیں لہٰذا انھیں بھی مجروح ومقدوح کرنا پڑا۔ مولاناؒ نے اپنی متعدد کتابوں، رسائل اور مضامین میں جب ان عقائد کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور دیانتدار وسمجھدار اور صاحب ایمان لوگوں نے اپنی فکر ورائے میں بتدیلی کی اور حالات نے صحیح رُخ اختیار کیا۔ اس تمہید کے بعد اب ہم حضرت مولاناؒ کی وہ تحقیقات پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے شیعوں کے عقیدۂ تحریفِ قرآن کے سلسلہ میں اپنی تحریرات کے اندر پیش کی ہیں۔ قبل اس کے کہ تحریفِ قرآن کے بارے میں کچھ لکھا جائے بہتر ہے کہ پہلے یہ واضح کر دیا جائے کہ اہلسنّت کا نقطۂ نظر قرآن مجید کے بارے میں کیا ہے۔

قرآن مجید کے متعلق اہلسنّت کا عقیدہ

ساری دنیا جانتی ہے اور مسلم وغیر مسلم سب ہی اس بات سے واقف ہیں کہ اسلام کی بنیاد قرآن مجید پر ہے۔ امتِ اسلامیہ کے پاس قرآن مجید کے سوا کوئی ایسی دوسری کتاب نہیں ہے جس کو پورے یقین اور وثوق کے ساتھ اللہ کا کلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کہا جاسکے۔ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کو ہم مسلمان پورے ایمان ویقین کے ساتھ اللہ کا کلام مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے آخری نبیؐ پر جو آخری آسمانی کتاب نازل ہوئی، جس پر دینِ اسلام کی بنیاد اور اساس ہے اور جس کی دعوت وتعلیمات مخلوق کی رہنمائی کا ذریعہ اور وسیلہ ہیں وہ آج بھی اپنے ہر حرف اور نقطہ کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں میں محفوظ اور کتابی شکل میں مکتوب ومدوّن ومرتّب ہے۔ سارا عالم اسلام مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۴

تک اس کی دن رات تلاوت کرتا ہے اور اس کے لاکھوں کروڑوں حفاظ دنیا کے ہر مقام پر، جہاں مسلمان بستے ہیں، پائے جاتے ہیں۔ ساری امتِ اسلامیہ کا بالا جماع یہ عقیدہ ہے کہ آج جس ترتیب کے ساتھ قرآن مجید کی سورتیں اور آیات مرتّب و مدوّن ہیں ٹھیک اسی ترتیب کے ساتھ عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ میں بھی ان کی تلاوت کی جاتی تھی اور آئندہ قیامت تک یہ انشاء اللہ اپنے ان ہی الفاظ و ترتیب کے ساتھ محفوظ رہے گا۔ لہٰذا یہ قرآن جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ ہر طرح کی تحریف، تغیّر و تبدّل اور تقدیم و تاخیر سے پاک و صاف ہے۔ اور یہ سب اس لیے ہے کہ خود اللہ عز و جل نے اس کی حفاظت کی ذمّہ داری اپنے اوپر لی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ [۱] یعنی یہ کتابِ نصیحت ہم نے ہی اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ اسی لیے علماء امّت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف قطعی اور یقینی ہے اور اسی پر دین اسلام کی بنیاد ہے، اس میں نہ تو کسی قسم کی کمی بیشی ہوئی اور نہ ہی کوئی ترمیم ہوئی اور نہ ہی اس کی ترتیب میں کوئی تبدیلی ہوئی لہٰذا جس کسی کو اگر اس کے ایک حرف پر بھی خدانخواستہ شک پیدا ہو جائے تو وہ خارج از اسلام سمجھا جائے گا۔

شیعوں کا ایمان قرآن مجید پر نہ ہونے کے وجوہ

اس عنوان پر حضرت مولانا لکھنویؒ کی تحقیق یہ ہے کہ شیعوں کا ایمان نہ تو اِس موجودہ قرآن پر ہے اور نہ ہی کسی دوسرے موہوم و فرضی قرآن پر ہو سکتا ہے، ان کا ایمان نہ ہو سکنے کی وجہ صرف عقیدۂ تحریف قرآن ہی نہیں بلکہ بعض دوسری وجوہ بھی ہیں جن میں سے اس وقت صرف وہ تین وجوہ پیش کی جا رہی ہیں جو آپ نے مناظرہ امروہہ منعقدہ ۱۹۲۰ء میں پیش کی تھیں۔

وجہ اوّل: شیعوں کا نہایت ضروری عقیدہ بلکہ ان کے مذہب کی بنیاد یہ ہے کہ ناقلانِ قرآن و راویانِ دین و ایمان کی پہلی جماعت (یعنی صحابۂ کرامؓ) ساری کی ساری نعوذ باللہ جھوٹی تھی۔ ان میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو جھوٹا نہ ہو، فرق صرف اس قدر ہے کہ ان کے نزدیک اس جماعت میں دو گروہ تھے ایک حضرات خلفاء ثلاثہؓ اور ان کے ساتھیوں کا تھا جو سب سے بڑا گروہ تھا اور اس میں ہزاروں لاکھوں افراد تھے۔ دوسرا گروہ حضرت علیؓ مرتضیٰ اور ان کے ساتھیوں کا تھا

---

[۱] سورۃ الحجر:۹

جن میں گنتی کے چار پانچ افراد بیان کیے جاتے ہیں جن کے نام یہ ہیں: (۱) حضرت علی مرتضیٰؓ (۲) حضرت ابوذر غفاریؓ (۳) حضرت مقدادؓ (۴) حضرت سلمان فارسیؓ اور (۵) حضرت عمار بن یاسرؓ۔ مذہبِ شیعہ کے نزدیک یہ دونوں گروہ جھوٹے تھے۔ مگر پہلے گروہ کے جھوٹ کا نام انھوں نے ''نفاق'' رکھا ہے اور دوسرے گروہ کے جھوٹ کو وہ ''تقیہ'' کہتے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلا گروہ جھوٹ بولتا تھا مگر وہ جھوٹ کو عبادت نہیں سمجھتا تھا لیکن دوسرا گروہ، یعنی حضرت علیؓ اور اُن کے ساتھیوں کا جھوٹ بولنے کو بہت بڑی عبادت اور اسے بہت ضروری و فرض جانتا تھا۔ بخیال شیعہ پہلا گروہ اپنے اندر ایسی مافوق الفطرت قوت رکھتا تھا کہ وہ مختلف الطبائع اشخاص کو جن کی تعداد حدِّ تواتر کو پہنچی ہوئی تھی با آسانی سب کو جھوٹ پر متفق کر لیتا تھا جبکہ اتنے بڑے گروہ کو جھوٹ پر متفق کر لینا فطرۃً محال ہے لہٰذا شیعوں کو نہ صرف قرآن بلکہ دین کی کسی بھی چیز کا مثلاً آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٔ نبوت اور دلائل نبوت وغیرہ میں سے کسی پر بھی کسی طرح یقین نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ تمام چیزیں صحابۂ کرامؓ ہی کے نقل و روایت کے ذریعہ بعد والوں کو پہنچی ہیں اور ظاہر ہے کہ جھوٹوں اور جھوٹ پر اتفاق کرنے والوں کی نقل و روایت پر کسی طرح یقین و ایمان نہیں ہوسکتا۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ فرماتے ہیں:

''بہ علم الیقیں دانستہ شد کہ اثباتِ خلافتِ ایں بزرگوراں اصلے است از اصولِ دین تا وقتیکہ ایں اصل رامحکم نہ گیرند ہیچ مسئلہ از مسائل شریعت محکم نہ شود...... ہر کہ در شکستنِ ایں اصل سعی می کند بحقیقت ہدم جمیع فنونِ دینیہ می خواہد۔

(ترجمہ) یقین کے ساتھ معلوم ہوا کہ ان بزرگوں کی خلافت ایک اصل ہے اصولِ دین سے، جب تک اس اصل کو مضبوط نہ پکڑیں گے کوئی مسئلہ مسائلِ شریعت سے مضبوط نہ ہوگا...... (لہٰذا) جو شخص اس اصل کے توڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ فی الحقیقت تمام فنونِ دینیہ کو مٹانا چاہتا ہے[1]۔''

اس طرح ثابت ہوا کہ شیعوں کا ایمان قرآن مجید پر نہیں ہوسکتا[2]۔

وجہ دوم: شیعوں کے اعتراف و اقرار اور ان کی روایات کے مطابق موجودہ قرآن خلفاء

---

[1] ازالۃ الخفاء، مقصد اوّل، مترجم مولانا لکھنویؒ، دوسرا ایڈیشن، حصہ اوّل، ص ۲۰۷

[2] تنبیہ الحائرین، دوسرا ایڈیشن، ص ۲۱-۲۲، شکستِ عظیم باعدائے قرآن کریم، دوسرا ایڈیشن، حصہ اوّل، ص ۶-۷، اوّل من امنا ئمین نمبر اوّل، مولانا لکھنوی، ص ۱۹-۲۰

ثلاثہ کے اہتمام وانتظام سے جمع ہوااوران ہی کے ذریعہ سے تمام عالم میں پھیلا ہے اوراس کے قابلِ وثوق ہونے کی کوئی تصدیق بھی ان کے ائمہ معصومین سے ان کی کتابوں میں منقول نہیں ہے۔ خلفاء ثلاثہ کے متعلق توان کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ معاذ اللہ صرف مخالفِ دین ہی نہیں بلکہ دشمن دین بھی تھے لہٰذا جو چیز دین کے ایسے 'دشمن' کے ذریعہ ملے جو بقول ان کے خائن، کاذب، تخریبِ دین کے درپے اور صاحبِ سلطنت وشوکت ہو اور پھر ایسی مافوق الفطرت قوت بھی رکھتا ہو کہ سب کو جھوٹ پر متفق کر کے ایک بے بنیاد بات کو متواتر اور ایک متواتر بات کو بے بنیاد بنادے اور اس 'دشمن' کے سوا کوئی دوسرا معتبر ذریعہ تصدیق بھی میسر نہ ہو تو بھلا وہ چیز کیوں کر قابلِ اعتبار ہوسکتی ہے اور اس پر کس طرح کسی سمجھدار انسان کا ایمان ہوسکتا ہے؟ یہ ایسا ہی ہے کہ اگر آج کوئی یہودی قرآن مجید کو لکھ کر فروخت کرے تو کوئی مسلمان اس پر اعتبار نہ کرے گا اور نہ ہی اس کو خریدے گا تاوقتیکہ کسی معتبر حافظ کو دکھلا کر اس کی تصدیق نہ کرالے۔ اور کسی صحیح نسخہ سے اس کا مقابلہ نہ کرالے اس لیے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ شیعوں کا ایمان کسی طرح بھی موجودہ قرآن پر نہیں ہوسکتا۔[1]

وجہ سوم: مذہب شیعہ کی نہایت معتبر و مستند کتابوں میں قرآن مجید کی تحریف میں دو ہزار سے زائد روایاتِ تحریف موجود ہیں جن میں قرآن مجید میں ہونے والی پانچ قسم کی تحریفات بتائی گئی ہیں:

۱۔ موجودہ قرآن سے بہت سی آیتیں اور سورتیں نکال دی گئیں۔

۲۔ اپنی طرف سے عبارتیں بنا کر اس میں داخل کردی گئی ہیں۔

۳ قرآن مجید میں بہت سے الفاظ بدل دیئے گئے ہیں۔

۴۔ اس کے بہت سے حروف تبدیل کردیئے گئے ہیں۔

۵۔ سورتوں، آیات اور کلمات کی ترتیب بھی بدل دی گئی ہے۔

مذکورہ بالا اقسام تحریف کے بارے میں علماء شیعہ نے اِن تین باتوں کا اقرار بھی کیا ہے کہ:

۱۔ یہ روایاتِ تحریف کثیر اور متواتر ہیں۔

۲۔ یہ روایات تحریفِ قرآن پر صراحۃً دلالت بھی کر رہی ہیں۔

۳۔ انہی روایات کے مطابق شیعہ تحریفِ قرآن کے معتقد بھی ہیں۔[2]

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۲۲، الاوّل من المأتین نمبر اوّل، ص ۲۱-۲۲، اور شکست عظیم باعدائے قرآن کریم

[2] تنبیہ الحائرین، ص ۲۲-۲۳، الاوّل من المأتین نمبر اوّل، ص ۲۲، شکست عظیم باعدائے قرآن کریم، ص ۸-۹

مولاناؒ نے تحریفِ قرآن کے موضوع پر ایک نہایت مستند اور اہم شیعہ تصنیف ''فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب ربّ الارباب'' مصنفہ علامہ حسین بن محمد تقی نوری طبرسی مطبوعہ ایران ۱۲۹۸ھ کی دستیابی پر خوشی کا اظہار اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کتاب کے مصنف اکابر شیعہ میں سے ہیں اور واقعی یہ کتاب نہایت جامع ہے۔ انھوں نے عقلی و نقلی ہر طرح سے قرآن کا محرف ہونا اپنے مذہب کی روشنی میں ثابت کر کے تمام روایات تحریف اس میں جمع کر دی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ شیعوں میں جو گنتی کے چار اشخاص ان تمام اقسام تحریف کے منکر ہیں ان کی خوب خبر لی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی شیعہ تحریف قرآن کا منکر نہیں ہے اور نہ ہی وہ کبھی منکر ہو سکتا ہے۔

شیعوں کے عقیدۂ تحریف قرآن کے قائل ہونے کے مذکورہ بالا تین اسباب لکھنے کے بعد اب ہم مولانا لکھنویؒ کی تحقیق کردہ ان شیعی روایات کو نقل کریں گے جن سے قرآن مجید میں تحریف کا ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ ان روایات میں مذکورہ بالا پانچوں قسم کی تحریفات بیان کی گئی ہیں جو ان کی معتبر و مستند کتابوں میں مذکور ہیں۔

قرآن مجید کے کم کیے جانے کی روایتیں

(۱) شیعوں کی سب سے زیادہ معتبر کتاب ''اصول کافی'' ہے جس کے مصنف محمد بن یعقوب کلینی (م ۹۳۹ء) ہیں جو بیک واسطہ ''امام معصوم مفترض الطاعۃ'' یعنی حضرت امام حسن عسکریؒ کے شاگرد ہیں۔ یہ کتاب امام غائب کی غیبت صغریٰ کے زمانے میں لکھی گئی اور پھر سفیروں کے ذریعہ ان کے پاس غار میں بھیجی گئی جس کو دیکھ کر امام نے تصدیق کی اور فرمایا ھٰذا کافٍ لِشِیْعَتِنَا یعنی یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے، اسی لیے اس کا نام ''کافی'' رکھا گیا۔ اس کتاب میں ایک باب ہے باب انه لم یجمع القرآن کله' اِلاّ الائمَۃَ یعنی یہ باب ان حدیثوں کے بیان میں ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پورا قرآن سوائے ائمہ کے اور کسی نے جمع نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ آج کل جو قرآن موجود ہے وہ ائمہ کا جمع کیا ہوا نہیں ہے اس لیے اس کا

ناقص ہونا ثابت ہو گیا[1]

(۲) اسی کتاب میں ایک باب ہے "باب فیه نکت و نتف من التنزیل فی الولایه" یعنی یہ باب اس بیان میں ہے کہ (مسئلہ) ولایت (یعنی امامت) کے متعلق قرآن میں قطع و برید کی گئی ہے چنانچہ اس باب میں ایک روایت یہ بھی ہے:

عن ابی بصیر عن ابی عبدالله علیه السلام فی قول الله عزو جل ومن یطع الله و رسوله فی ولایة علی والائمة من بعدهٖ فقد فاز فوزاً عظیمًا هٰکذا نزلت[2]

ابوبصیر ابوعبداللہ یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل کا قول اس طرح نازل ہوا تھا: ومن یطع الله ورسوله فی ولایة علی والائمة من بعدهٖ فقد فاز فوزاً عظیمًا.

مگر اب قرآن مجید میں "فی ولایة علی والائمة من بعدهٖ" کے الفاظ نہیں ہیں۔ بغیر ان الفاظ کے آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ کامیاب ہوگا، مگر ان اضافی الفاظ کے ساتھ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کامیابی کا وعدہ صرف ان احکام کی اطاعت پر ہے جو امامت علیؓ و دیگر ائمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۳) اسی کتاب کے باب مذکور میں عبداللہ بن سنان سے روایت ہے:

عن ابی عبدالله علیه السلام فی قولهٖ ولقد عهدنا الیٰ آدم من قبل کلمات فی محمد وعلی وفاطمة والحسن و الحسین والائمّة من ذریتهم فنسی

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ولقد عهدنا الیٰ آدم من قبل کلمات فی محمدوعلی وفاطمة والحسن والحسین والائمة من ذریتهم فنسی

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۲۳ بحوالہ کتاب اصول کافی مرتبہ یعقوب کلینی، اصول کافی شیعوں کی چار بنیادی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے میں علمائے شیعہ لکھتے ہیں کہ "درعقائد حقہ اسلامیہ واستنباط احکام دینی مرجع اکابر و مورد استفادہ فحول فقہاء و محدثین بزرگ است"۔ اسی طرح کلینی کو ثقۃ الاسلام، شیخ مشائخ شیعہ، رئیس محدثین علماء امامیہ واوثق واعدل واثبت واضبط ایشاں، مروّج مذہب شیعہ در غیبت صغریٰ امام، ممدوحِ خاص و عام اور مفتی طوائف اسلام جیسے پرشکوہ الفاظ سے نوازا جاتا ہے۔ (لغت نامہ علی اکبر دہخدا، ص ۱۳۶-۱۳۷)

[2] تنبیہ الحائرین، ص ۲۴

ھٰکذا واللہ انزلت علیٰ محمد صلی اللہ علیہ والہٖ[1]	اللہ کی قسم اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل کیا گیا تھا۔

اب قرآن مجید میں ”کلمات فی محمد و علی وفاطمة والحسن والحسین والائمة من ذریتھم“ نہیں ہے۔ بغیر ان الفاظ کے آیت کے مطلب یہ ہے کہ ہم نے آدم کو پہلے ہی حکم دیا تھا مگر وہ بھول گئے۔ یہ حکم دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درخت کے کھانے کی ممانعت کی گئی تھی۔ مگر اب ان الفاظ کے ساتھ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آدم کو محمد وعلی وفاطمہ وحسنین ودیگر ائمہ کے متعلق کوئی حکم دیا گیا تھا اور وہ حکم کتاب ”کافی“ کی دوسری روایت میں مذکور ہے کہ حضرت آدم کو ائمہ پر حسد کرنے کی ممانعت کی گئی تھی مگر انھوں نے اس کے باوجود حسد کیا اور اسی کی سزا میں جنت سے نکال دیئے گئے۔

(۴) اسی کتاب کے باب مذکور میں روایت ہے کہ:

عن ابی جعفر علیه السلام قال نزل جبریل بھٰذہٖ الآیة علیٰ محمد صلی الله علیه والہٖ بئسما اشتروا بهٖ انفسهم ان یکفروا بما انزل الله فی علی بغیًا۔[2]	امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ جبریل اس آیت کو محمد صلی اللہ علیہ والہٖ پر اس طرح لے کر آئے تھے بئسما اشتروا بہٖ انفسهم ان یکفروا بما انزل الله فی علی بغیًا۔

اب قرآن مجید میں ”فی علی“ کے لفظ کا پتہ نہیں۔ بغیر اس لفظ کے آیت میں خدا کی ہر نازل کی ہوئی چیز کے انکار کی مذمت تھی مگر اس لفظ کے ساتھ امامت علی کے انکار کی مذمت ہوئی۔

(۵) اسی کتاب کے باب مذکور میں امام محمد باقر سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا:

نزل جبریل بھذه الآیة علیٰ محمد صلی الله علیه والہٖ ھٰکذا ان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فی علی فأتوا بسورة من مثلهٖ۔[3]	جبریل اس آیت کو محمد صلی اللہ علیہ والہٖ پر اس طرح لے کر آئے تھے۔ ان کنتم فی ریب مما نذلنا علیٰ عبدنا فی علی فأتوا بسورة من مثله۔

اب اس آیت میں ”فی علی“ کا لفظ نہیں ہے۔ اس آیت میں قرآن کا معجزہ ہونا بتلایا

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۲۴ بحوالہ اصول کافی، ص ۲۶۳ [2] ایضاً ص ۲۴ [3] ایضاً ص ۲۵

ہے اور فرمایا ہے کہ اس کے مثل ایک سورت بھی کوئی نہیں بنا سکتا۔ ''فی علی'' کے لفظ سے معلوم ہوا کہ پورا قرآن معجزہ نہ تھا بلکہ اعجاز صرف ان آیتوں میں تھا جو حضرت علیؓ کے متعلق تھیں مگر افسوس اب وہ آیتیں قرآن مجید میں نہیں ہیں۔

(۶) اسی کتاب کے باب مذکور میں امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے:

فی قول الله عزو جل كبر على المشركين بولاية على ماتدعوهم اليه يا محمد من ولاية على هٰكذا فی الكتاب مخطوطة۔[1]	اللہ عزوجل کا قول کبر علی المشرکین بولایة علیٰ ماتدعوهم اليه يا محمد من ولاية على اسی طرح قرآن میں لکھا ہوا ہے۔

ائمہ کے قرآن میں اسی طرح ہوگا مگر ہمارے قرآن میں تو اب ''ولاية علی'' اور ''يا محمد من ولاية علی'' کہیں نہیں ہے۔ آیت کا تو مطلب یہ ہے کہ مشرکوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ دین ناگوار ہے مگر ان انوکھے الفاظ کے ملانے سے مطلب یہ ہوا کہ حضرت علیؓ کی امامت میں جو شرک کرتے ہیں صرف ان کو آپ کی دعوت اور وہ بھی فقط امامتِ علی کے متعلق ناگوار ہے، باقی حصّہ آپ کی دعوت کا کسی کو ناگوار نہیں، نہ توحید ناگوار ہے نہ رسالت اور نہ کچھ اور۔

(۷) اسی کتاب کے باب مذکور میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

فی قوله سأل سائل بعذاب واقع للكافرين بولاية على ليس له' دافع ثم قال هٰكذا والله نزل بها جبريل علىٰ محمد صلى الله عليه واٰله۔[2]	اللہ تعالیٰ کا قول سال سائل بعذاب واقع للكافرين بولاية على ليس له' دافع اسی طرح اللہ کی قسم جبریل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لے کر نازل ہوئے تھے۔

اب ''بولاية علی'' کا لفظ آیت میں نہیں ہے۔ آیت میں مطلق کافروں کے عذاب کا ذکر تھا کہ اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا مگر اس لفظ کے ملانے سے آیت میں صرف امامت علی کے انکار کرنے والوں پر عذاب بیان ہوا ہے کہ اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

(۸) اسی کتاب کے باب مذکور میں امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۲۴ بحوالہ اصول کافی [2] ایضاً ص ۲۵-۲۶

نزل جبریل بھٰذہ الاٰیۃ علیٰ محمد صلی اللہ علیہ و الہٖ ھٰکذا فبدّل الذین ظلموا اٰل محمد حقھم قولاً غیر الذی قیل لھم فانزلنا علی الذین ظلموا اٰل محمد حقھم رجزاً من السمآء بما کانوا یفسقون۔[1]

جبریل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر یہ آیت اس طرح لے کر نازل ہوئے تھے: فبدل الذین ظلموا اٰل محمد حقھم قولاً غیر الذی قیل لھم فانزلنا علی الذین ظلموا اٰل محمد حقھم رجزاً من السمآء بما کانوا یفسقون.

اب قرآن مجید کے اندر اس آیت میں "اٰل محمد حقھم" کا لفظ دونوں جگہ سے نکلا ہوا ہے۔ بغیر اس لفظ کے آیت میں بنی اسرائیل کے واقعہ کا بیان ہے کہ ان سے خدا نے فرمایا تھا کہ اس بستی میں جاؤ اور اس میں داخل ہونے کے وقت "حطۃ" کہنا مگر انھوں نے ازراہِ شرارت اس لفظ کو بدل دیا جس کی وجہ سے ان پر عذاب آیا مگر اس لفظ کے ملانے سے معلوم ہوا کہ آیت میں بنی اسرائیل کا نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کا حال بیان ہو رہا ہے کہ انھوں نے آل محمدؑ پر ظلم کیا جس کی وجہ سے ان پر آسمان سے عذاب آیا۔ مگر افسوس کہ واقعات سے اس مطلب کی تائید نہیں ہوتی۔ براہِ عنایت کوئی مجتہد صاحب بتا دیں کہ صحابۂ کرامؓ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کونسا ظلم آلِ محمدؑ پر کیا تھا اور کونسا عذاب ان پر آسمان سے آیا تھا۔ اس قسم کی روایات اس کتاب کے بابِ مذکور میں بکثرت ہیں۔[2]

(۹) اسی کتاب کے باب النوادر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

ان القرآن الذی جآء بہٖ جبریل علیہ السلام الیٰ محمد صلی اللہ علیہ و اٰلہٖ سبعۃ عشر الف اٰیۃ۔[3]

بہ تحقیق جو قرآن جبریل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر لے کر آئے تھے اس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں۔

اب قرآن مجید میں علیٰ اختلاف الروایات چھ ہزار چھ سو سولہ آیتیں ہیں لہٰذا آدھے سے بہت زیادہ قرآن نکل گیا۔

(۱۰) کتاب احتجاج طبرسی[4] کے صفحہ ۱۱۹ سے لے کر صفحہ ۱۳۳، تک ایک طویل روایت حضرت علی

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۲۶ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] کتاب احتجاج بھی مذہب شیعہ کی بڑی معتبر کتاب ہے، اس کے مصنف شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی (م ۱۲۲۳ء) نے کتاب کے دیباچہ میں لکھ دیا ہے کہ اس کتاب میں سوا امام حسن عسکری اور جس قدر ائمہ کے اقوال آئے ہیں ان پر اجماع ہے یا وہ عقل کے موافق ہیں یا اس قدر کتب سیرت وغیرہ میں ان کی شہرت ہے کہ موافق اور مخالف سب کا ان پر اتفاق ہے۔

مرتضیٰؑ سے منقول ہے کہ ایک زندیق نے آں جناب کے سامنے کچھ اعتراضات قرآن پر کیے اور آپ نے قریب قریب ہر اعتراض کے جواب میں فرمایا کہ قرآن میں تحریف ہوگئی ہے۔ اس روایت میں قرآن مجید میں پانچوں قسم کی تحریفات ثابت ہوتی ہیں۔ کمی کے متعلق جو مضامین اس روایت میں ہیں وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک اعتراض اس زندیق نے یہ کیا تھا کہ قرآن میں فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّاتُقْسِطُوْا فِی الْیَتَامیٰ فَانْکِحُوْا مَاطَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ یعنی اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے حق میں انصاف نہ کرسکو گے تو جن عورتوں سے چاہو نکاح کرلو، زندیق نے کہا کہ یہاں شرط و جزا میں کوئی ربط نہیں معلوم ہوتا ہے، یتیموں کے حق میں انصاف نہ کرسکو تو عورتوں سے نکاح کرلو، ایک بالکل بے جوڑ بات ہے۔ جناب امیر علیہ السلام اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں:

و اما ظهورک علیٰ تناکر قوله فان خفتم الاّ تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ماطاب لکم من النساء ولیس یشبه القسط فی الیتامیٰ نکاح النساء ولا کل النساء ایتاماً فهو مما قدمت ذکره من اسقاط المنافقین من القرآن وبین القول فی الیتامیٰ و بین نکاح النساء من الخطاب والقصص اکثر من ثلث القرآن وهذا وما اشبه مما ظهرت حوادث المنافقین فیه لاهل النظر والتامل ووجد المعطلون واهل الملل المخالفین للاسلام مساغاً الی القدح فی القرآن۔[1]	اور تجھ کو جو اللہ تعالیٰ کا قول فان خفتم الا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ماطاب لکم من النساء کے ناپسندیدہ ہونے پر اطلاع ہوئی اور تو کہتا ہے کہ یتیموں کے حق میں انصاف کرنا اور عورتوں سے نکاح کرنے کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتا اور نہ تمام عورتیں یتیم ہوتی ہیں لہٰذا اس کے وجہ یہی ہے جو میں پہلے تجھ سے بیان کرچکا ہوں کہ منافقوں نے قرآن سے بہت کچھ نکال ڈالا فی الیتامیٰ اور فانکحوا کے درمیان میں بہت سے احکام اور قصے تھے، تہائی قرآن (یعنی دس پارے) سے زیادہ وہ سب نکال ڈالے گئے، اسی وجہ سے بے ربطی ہوگئی۔ اس قسم کی منافقوں کی تحریفات کی وجہ سے جو اہل نظر و تامل کو ظاہر ہوجاتی ہیں، اس سے بے دینوں اور اسلام کے مخالفوں کو قرآن پر اعتراض کرنے کا موقع مل گیا۔

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۲۷-۲۸

جناب امیر اس زندیق کے کسی اعتراض کا جواب نہ دے سکے۔ اس روایت کو دیکھ کر صاف کہنا پڑتا ہے کہ شیعوں کی طرح ان کے جناب امیر بھی قرآن کے سمجھنے سے عاجز و قاصر تھے حالانکہ آج اہلسنّت کے ایک ادنیٰ طالب علم سے پوچھیے تو وہ بھی اس آیت کا ربط اچھی طرح بیان کردے گا۔ آیت میں یتامیٰ سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں، بعض لوگ یتیم لڑکیوں سے نکاح کرتے تھے اور ان کا مہر کم باندھتے تھے اور ان کے دوسرے حقوق بھی ادا نہ کرتے تھے کیونکہ ان یتیموں کی طرف سے کوئی لڑنے جھگڑنے والا تو ہوتا نہ تھا لہٰذا اس آیت میں حکم دیا گیا کہ اگر یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں بے انصافی کا اندیشہ ہو تو ان سے نکاح نہ کرو۔ بلکہ دوسری عورتوں سے نکاح کرلو۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ جناب امیر نے اس زندیق سے فرمایا:

ولو شرحت لک کلما اسقط وحرف وبدل مما یجری ھذا المجری الطال وظھر ماتحظر التقیة اظھاره۔[1]	اگر میں تجھ سے وہ تمام آیتیں بیان کردوں جو قرآن سے نکال ڈالی گئیں، تحریف کی گئیں، بدل دی گئیں اور جو کچھ بھی اس قسم کی کارروائیاں ہوئیں تو یہ بہت طویل ہو جائے گا اور تقیہ جس چیز سے روکتا ہے وہ ظاہر ہو جائے گا۔

تعجب ہے کہ قرآن کو محرف کہنے اور جامعین قرآن کو منافق کہنے سے تقیہ نے نہ روکا مگر مقامات تحریف معین کرنے سے تقیہ نے روک دیا، یہ اس لیے کہ مقامات تحریف کے معلوم ہو جانے سے کم از کم بقیہ قرآن تو کارآمد ہو جاتا مگر تقیہ کو یہ کب گوارا تھا۔ اسی روایت میں ہے کہ جناب امیر نے یہ بھی اس زندیق سے کہا:

ولو علم المنافقون لعنھم الله من ترک ھذہ الأیات التی بینت لک تاویلھا الاسقطوھا مع ماسقطوا منه۔[2]	اگر منافقوں کو (خدا انھیں لعنت کرے) معلوم ہو جاتا کہ ان آیتوں کو باقی رکھنے میں کیا خرابی ہے جن کی تاویل میں نے بیان کی تو ضرور وہ ان آیتوں کو بھی نکال ڈالتے جس طرح اور آیتیں نکال ڈالیں۔

(۱۱) تفسیر صافی از علامہ محسن کاشی کے دیباچہ میں تفسیر عیاشی از محمد بن مسعود العیاشی (م۹۳۲ء) سے منقول ہے کہ امام محمد بن باقر علیہ السلام نے فرمایا:

---

۱ تنبیہ الحائرین، ص۲۸ ۲ تنبیہ الحائرین، ص۲۸-۲۹

ان القرآن قد طرح منه اٰی کثیرة۔[1] بہ تحقیق قرآن سے بہت سی آیتیں نکال ڈالی گئیں۔

اسی کتاب میں امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

ولوقرئ القران کما انزل لالفیتنا فیه مسمّین۔[2] اگر قرآن اسی طرح پڑھا جائے جیسا کہ نازل کیا گیا تھا تو یقیناً تم قرآن میں ہمارے نام پاؤ گے۔

(۱۲) تفسیر قمی جس کے مصنف علی بن ابراہیم قمی (م ۹۱۹ء) امام حسن عسکری کے شاگرد اور محمد بن یعقوب کلینی کے استاذ ہیں شیعوں کی بہت معتبر کتاب ہے اور روایات تحریف سے لبریز ہے۔

منجملہ ان میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ:

واما هو محذوف عنه فهو قوله لٰكن الله يشهد بما انزل اليک فی علی كذا انزلت (ثم قال) و مثله كثير۔[3] لیکن وہ آیتیں جو قرآن سے نکال ڈالی گئیں ان کی ایک مثال یہ ہے لٰکن اللہ یشہد بما انزل الیک فی علیٰ یہ آیت اس طرح نازل ہوئی (پھر چند مثالوں کے بعد لکھا ہے کہ) اس جیسی مثال اور بھی بہت ہیں۔

قرآن مجید میں بڑھائے جانے کی روایتیں

کتاب احتجاج طبرسی میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اس زندیق کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ خدا نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت تمام نبیوں پر بیان کی ہے حالانکہ جتنی تعریف بیان کی ہے اُس سے کہیں زیادہ اُن کی بُرائی اور توہین قرآن میں ہے کہ اس قدر توہین کسی اور نبی کی قرآن میں نہیں ہے۔ زندیق کے اس اعتراض کو بھی شیعوں کے جناب امیر نے تسلیم کر لیا اور تسلیم کر کے حسب ذیل جواب دیا:

(۱) والذی بدأفی الكتاب من الازراء علی النبی صلی الله علیه وآله من فرية الملحدين۔[4] کتاب یعنی قرآن میں جو برائی نبی صلی اللہ علیہ والہ کی ہے یہ ملحدوں کی افتراء کی ہوئی ہے (یعنی جامعین قرآن کی بڑھائی ہوئی ہے)

(۲) اسی روایت میں ہے کہ جناب امیر نے اس زندیق سے کہا:

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۲۹ [2] ایضاً، ص ۲۹ [3] ایضاً، ص ۲۹ [4] ایضاً، ص ۳۰

انھم اثبتوا فی الکتاب مالم یقله الله لیلبسوا علیٰ الخلیقة۔[1]

ان منافقوں نے قرآن میں وہ باتیں درج کر دی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی تھیں تا کہ وہ مخلوق کو فریب دے سکیں۔

(۳) اسی روایت میں ہے کہ جناب امیر نے کہا:

ولیس یسوغ مع عموم التقیة التصریح باسماء المبدلین ولا الزیادہ فی أیاته مااثبتوه من تلقائھم فی الکتاب لما فی ذالک من تقویة حجج اھل التعطیل والکفر و الملل المنحرفة عن قبلتنا وابطال ھٰذا العلم الظاھر الذی قد استکان له الموافق والمخالف۔[2]

تقیہ کی ضرورت اس قدر ہے کہ نہ میں ان لوگوں کے نام بتا سکتا ہوں جنھوں نے قرآن میں تحریف کی ہے اور نہ اس زیادتی کو بتا سکتا ہوں جو انھوں نے قرآن میں درج کر دی ہیں جس سے اہلِ تعطیل وکفر اور مذاہب مخالفہ اسلام کی تائید ہوتی ہے اور اس علم ظاہر کا ابطال ہوتا ہے جس کے موافق و مخالف سب ہی لوگ قائل ہیں۔

(۴) اسی روایت میں ہے کہ اس زندیق سے جناب امیر نے جمع قرآن کا قصہ یوں بیان کیا تھا:

ثم دفعھم الاضطرار بورود المسائل عمّا لایعلمون تاویله الله جمعه وتالیفه وتضمینه من تلقائھم مایقیمون به دعائم کفرھم فصرخ منادیھم من کان عندہ شئی من القرآن فلیأ تنابه وو کلوا تالیفه و نظمه الیٰ بعض من وافقھم الیٰ معاداۃ اولیاءِ الله فالفه علیٰ اختیارھم۔[3]

پھر جب ان منافقوں سے وہ مسائل پوچھے جانے لگے جن کو وہ نہ جانتے تھے تو مجبور ہوئے کہ قرآن کو جمع کریں اور اس کی تفسیر کریں اور قرآن میں وہ باتیں بڑھائیں جن سے وہ اپنے کفر کے ستونوں کو قائم کر سکیں، لہٰذا ان کے منادی نے اعلان کر دیا کہ جس کے پاس کوئی حصہ قرآن کا ہو وہ ہمارے پاس لے آئے اور (پھر) ان منافقوں نے قرآن کی جمع وترتیب کا کام اس شخص کے سپرد کر دیا جو دوستانِ خدا کی دشمنی میں ان کا ہم خیال تھا اور اس نے ان کی پسند کے موافق قرآن کو جمع کیا۔

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۳۰ [2] ایضاً ص ۳۰-۳۱ [3] ایضاً ص ۳۱

(۵) پھر اسی روایت میں بڑی وضاحت کے ساتھ جناب امیر کا یہ قول بھی ہے:

وزادو فیہ ماظہر تناکرہ وتنافرہ[1]	اور بڑھادیں انھوں نے قرآن میں وہ عبارتیں جن کا خلافِ فصاحت اور قابلِ نفرت ہونا ظاہر ہے۔

احتجاج طبرسی کی مذکورہ بالا روایت سے حسبِ ذیل امور معلوم ہوئے:

اوّل: قرآن جمع کرنے والوں نے قرآن میں نبیؐ کی توہین کرنے والے الفاظ بڑھائے ہیں۔

دوم: قرآن مذاہبِ باطلہ اور مخالفینِ اسلام کی تائید کرتا ہے، شریعت کو مٹاتا ہے اور اس سے کفر کے ستون قائم ہوتے ہیں۔

سوم: اس قرآن میں ایسی عبارتیں بڑھادی گئی ہیں جو قابلِ نفرت اور خلافِ فصاحت ہیں۔

چہارم: یہ معلوم نہیں کہ یہ بڑھائی ہوئی عبارتیں کون کون سی ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔

پنجم: اس قرآن کے جمع کرنے والے منافق، کفر کے ستون قائم کرنے والے اور دوستانِ خدا کے دشمن تھے، انھوں نے اپنی پسند اور خواہش کے مطابق قرآن کو جمع کیا ہے۔[2]

(۶) تفسیر صافی میں تفسیر عیاشی سے منقول ہے کہ امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

لولا انہ زید فی القرآن ونقص ماخفی حقنا علیٰ ذی حجی۔[3]	اگر قرآن میں بڑھایا گھٹایا گیا نہ ہوتا تو ہمارا حق کسی عقلمند پر پوشیدہ نہ رہتا۔

مذکورہ بالا روایت سے اور کچھ ہو نہ ہو مگر اتنا تو معلوم ہی ہو رہا ہے کہ یہ قرآن مجید مذہبِ شیعہ کے بالکل خلاف ہے حتیٰ کہ مسئلہ امامت اور ائمہ کا حق بھی اس سے ثابت نہیں ہوتا، اور مزید یہ کہ یہ سنیوں کی تائید کرتا ہے اور کفر کے ستون قائم کرتا ہے۔

قرآن مجید کے حروف والفاظ بدلے جانے کی روایتیں

(۱) تفسیر قمی میں ہے کہ:

واما کان خلاف ماانزل اللہ فھو قولہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس الایۃ قال ابو	اور وہ چیزیں جو قرآن میں موجود ہیں خلاف ماانزل اللہ ہیں (مثلاً وہ) یہ آیت ہے کنتم خیرا مۃ یعنی تم لوگ تمام اُن امتوں سے بہتر ہو جو لوگوں کے

[1] تنبیہ الحائرین ص ۳۱ [2] ایضاً ص ۳۱ [3] ایضاً ص ۳۱

عبداللہ علیہ السلام لقاری ھٰذہ الایة خیرامة یقتلون امیر المومنین والحسین بن علی فقیل له کیف نزلت یا ابن رسول اللہ فقال انما انزلت خیر ائمة اخرجت للناس۔[۱]

لیے ظاہر کی گئیں، امام جعفر صادق نے اس آیت کے پڑھنے والے سے کہا کہ واہ کیا اچھی امت ہے جس نے امیر المومنین کو اور حسین بن علی کو قتل کر دیا۔ پوچھا گیا کہ پھر یہ آیت کس طرح اتری تھی اے فرزند رسول؟ تو آپ نے فرمایا کہ یہ آیت اس طرح اتری تھی کنتم خیر ائمة یعنی اے ائمۂ اثنا عشر، تم تمام اماموں سے بہتر ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں خیر امة کے الفاظ غلط ہیں بلکہ ان کی جگہ خیر ائمة کے الفاظ نازل ہوئے تھے، اس طرح یہاں الفاظ کی تبدیلی ہوگئی۔

(۲)۔ نیز اسی تفسیر میں ہے:

قُرِئَ علیٰ ابی عبداللّٰه الذین یقولون ربنا هب لنا من ازواجنا و ذریاتنا قرة اعین وجعلنا للمتقین اماما۔ فقال علیه السلام لقد سألوا اللہ عظیما ان یجعلهم للمتقین اماما فقیل له یا ابن رسول اللّٰه کیف نزلت فقال انما نزلت و اجعل لنا من المتقین اماما۔[۲]

امام جعفر صادق کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی الذین یقولون الیٰ اٰخرہ یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب بخش دے ہم کو ہماری بیبیوں اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا دے ہم کو متقیوں کا امام۔ اس پر امام جعفر صادق نے فرمایا کہ انھوں نے اللہ سے بڑی چیز مانگی ہے کہ وہ ان کو متقیوں کا امام بنا دے (لہٰذا) پوچھا گیا کہ اے فرزند رسول اللہ! یہ آیت کس طرح اتری تھی تو انھوں نے فرمایا کہ اس طرح اتری تھی واجعل لنا من المتقین اماما یعنی ہمارے لیے متقیوں میں سے کوئی ہمارا امام مقرر کر دے۔

امامت کا مرتبہ شیعوں کے یہاں نبوت سے بھی بڑھا ہوا ہے اس لیے امام نے اس آیت کو غلط کہہ دیا کیونکہ اس میں امامت کی درخواست خدا سے کی گئی ہے۔ اس آیت میں حروف کی

۱۔ تنبیہ الحائرین، ص ۳۱-۳۲ ۲۔ ایضاً ص ۳۲

تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

(۳) اصول کافی میں ہے:

قرأ رجل عند ابی عبدالله علیه السلام قل اعملوا فسیری الله عملکم ورسوله والمومنون فقال لیس هٰکذا هی انما هی والمامونون فنحن المامونون۔[1]

ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے یہ آیت پڑھی قل اعملوا...... یعنی اے نبی کہہ دو کہ تم لوگ عمل کرو، تمھارا عمل اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے دیکھیں گے۔ امام نے فرمایا کہ آیت اس طرح نہیں تھی بلکہ یوں تھی والمامونون (یعنی مامون لوگ دیکھیں گے) اور مامون ہم (ائمہ اثنا عشر) ہیں۔

(۴) احتجاج طبرسی کی زندیق والی روایت میں ہے کہ اس نے ایک اعتراض یہ بھی کیا تھا کہ قرآن میں پیغمبروں کی مذمت تو نام لے کر خدا نے بیان کی ہے مگر منافقوں کی مذمت اشارات وکنایات میں ہے اور ان کا نام نہیں لیا گیا ہے، یہ کیا بات ہے؟ تو جناب امیر نے جواب دیا:

ان الکنایة عن اسماء اصحاب الجزائر العظیمة من المنافقین (فی القراٰن) لیست من فعله تعالیٰ وانها من فعل المغیرین والمبدلین الذین جعلو القراٰن عضین واعتاضوا الدنیا من الدین۔[2]

بڑے بڑے جرم والے منافقین کے نام کا کنایات میں ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو صاف صاف نام ذکر کیے تھے بلکہ یہ فعل ان تحریف کرنے والوں اور بدلنے والوں کا ہے، جنھوں نے قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور دنیا کے عوض میں دین کو بیچ ڈالا (یعنی انھوں نے ناموں کو نکال ڈالا اور ان کی جگہ پر کنایہ کے الفاظ رکھ دیے)

اسی روایت میں ہے کہ جناب امیر نے اس زندیق کو یہ نفیس جواب دے کر فرمایا:

فحسبک فی الجواب عن هٰذا الموضع ماسمعت فان شریعة التقیة تحظر التصریح باکثر منه۔[3]

لہٰذا اس جگہ یہ جواب تجھ کو کافی ہیں جو تو نے سنے کیونکہ تقیہ کی شریعت اس سے زیادہ صاف بیان کرنے سے روکتی ہے۔

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۳۲، بحوالہ اصول کافی، ص ۲۶۸ [2] تنبیہ الحائرین، ص ۳۳، بحوالہ احتجاج طبرسی [3] ایضاً

اس طرح تحریف قرآن کی چار قسموں کی چند روایتیں یہاں نقل کی گئی ہیں، اگر کوئی شخص کتبِ شیعہ کو دیکھے تو اس قسم کی روایتوں کا انبار پائے گا جن سے ایک بڑا ضخیم مجلد تیار ہو سکتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سب سے اہم مقصد یہی (تحریفِ قرآن) ہے۔ اب رہی تحریف کی پانچویں قسم یعنی ترتیب آیات اور ترتیب سور تو وہ اس قدر مشہور ہے کہ اس کے لیے کسی حوالہ کی ضرورت نہیں، مزید یہ کہ منقولہ بالا روایات سے وہ بھی ثابت ہو رہی ہے اور آئندہ بھی اس کے متعلق عبارتیں نقل کی جائیں گی، اس وقت بھی اس کا ایک حوالہ پیش کیا جا رہا ہے۔[1]

علامہ نوری طبرسی شیعی (م ۱۹۰۲ء) اپنی کتاب فصل الخطاب میں تحریر کرتے ہیں:

كان لامير المومنين عليه السلام قرانا مخصوصاً جمعه بنفسه بعد وفات رسول الله صلى الله عليه واله وعرضه على القوم فاعرضوا عنه فحجبه عن اعينهم وكان عند ولده عليه السلام يتوارثونه امام عن امام كسائر خصائص الامامة وخزائن النبوة وهو عند الحجة عجل الله فرجه يظهره للناس بعد ظهوره ويامرهم بقرأته وهو مخالف لهذا القرآن الموجود من حيث التاليف وترتيب السور والأيات بل الكلمات ايضاً ومن جهة الزيادة والنقيصة وحيث ان الحق مع علي عليه السلام وعلي مع الحق ففي القرآن الموجود تغير من جهتين وهو المطلوب۔[2]

امیر المومنین علیہ السلام کا ایک قرآن مخصوص تھا جس کو انھوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ کے بعد خود جمع کیا تھا اور اس کو صحابہ کے سامنے پیش کیا مگر ان لوگوں نے کوئی توجہ نہ کی لہٰذا اس کو انھوں نے (حضرت علیؓ نے) لوگوں سے پوشیدہ کر دیا پھر وہ قرآن ان کی اولاد کے پاس رہا اور ایک امام سے دوسرے امام کو میراث میں ملتا رہا مثل اور خصائصِ امامت وخزائنِ نبوت کے، اب وہ قرآن امام مہدی کے پاس ہے، خدا ان کی مشکل جلد آسان کر دے، وہ اس قرآن کو اپنے ظاہر ہونے کے بعد نکالیں گے اور لوگوں کو اس کی تلاوت کا حکم دیں گے اور وہ قرآن اس موجودہ قرآن کے خلاف ہے۔ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب میں بھی بلکہ الفاظ کی ترتیب اور کمی بیشی کے لحاظ سے بھی، چونکہ حق علی علیہ السلام کے ساتھ ہے اور علی حق کے ساتھ ہیں لہٰذا ثابت ہو گیا کہ موجودہ قرآن میں دونوں حیثیتوں سے تحریف ہوئی ہے اور یہی (ہم شیعوں کا) مقصود ہے۔

---

[1] تنبیہ الحائرین، بحوالہ احتجاج طبرسی [2] تنبیہ الحائرین، ص ۳۴

مذکورہ بالا شیعی کتب سے تحریف قرآن کی پانچوں قسموں کی کچھ روایات پیش کی گئی ہیں۔ اب اس سلسلہ میں علماء شیعہ کے تینوں اقرار ملاحظہ کریں یعنی تحریفِ قرآن کی روایات کے کثیر اور متواتر ہونے کا اقرار، ان روایات کا صراحۃً تحریف پر دلالت کرنے کا اقرار اور یہ اقرار کہ انھیں روایات کے مطابق ان کا عقیدہ بھی ہے۔

علماء شیعہ کے تین اقرار

مذہبِ شیعہ کا مقصد اصلی قرآن مجید کو مشکوک بنانا اور اس پردہ میں دین اسلام کو مٹانا تھا اس لیے بڑے اہتمام کے ساتھ انھوں نے تحریفِ قرآن کی روایتیں اپنے ائمہ کے نام سے تصنیف کیں اور ان روایتوں کو مذکورہ بالا تینوں اقراروں سے مزین کیا مگر بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ ہماری یہ تمام کوششیں خاک میں مل جائیں گی اور قرآن مجید کی ضوفشانی اسی طرح قائم رہے گی۔ اب یہ اقرار ملاحظہ کریں۔

(۱) علامہ نوری طبرسی اپنی کتاب فصل الخطاب میں تحریر کرتے ہیں:

الاخبار الصريحة المعتبرة الصريحة فی وقوع السقط و دخول النقصان فی الموجود من القراٰن زیادة علی امامرّ متفرقا فی ضمن الا دلة السابقة و انه اقل من تمام مانزل اعجازًا علیٰ قلب سید الانس والجان من غیر اختصاصها باٰیة او سورة وهی متفرقة فی الکتب المعتبرة التی علیها المعول عند الا صحاب جمعت ماعثرت علیها فی هٰذا الباب[1]

بہت سی حدیثیں جو معتبرہ ہیں اور قرآنِ موجود میں کمی اور نقصان پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں، علاوہ اُن احادیث کے جو دلائلِ سابقہ کے ضمن میں بیان ہوچکیں اور وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ قرآن مقدارِ نزول سے بہت کم ہے اور یہ کمی کسی آیت یا کسی سورت کے ساتھ مخصوص نہیں، اور یہ حدیثیں ان کتب متفرقہ میں پھیلی ہوئی ہیں جن پر ہمارے مذہب کا اعتماد اور اہل مذہب کا ان کی طرف رجوع ہے۔ میں نے وہ سب حدیثیں جو اس سلسلہ میں میری نظر سے گزری ہیں جمع کردی ہیں۔

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص۳۴-۳۵، بحوالہ فصل الخطاب، علامہ نوری طبرسی (شیعی) ص۲۱۱

اس کے بعد انھوں نے بکثرت کتابوں کے نام گنائے ہیں اور روایاتِ تحریف کے انبار لگادیئے ہیں۔

(۲) اسی کتاب میں محدث جزائری (م ۱۷۰۰ء) کا قول نقل کیا گیا ہے کہ:

قال السید المحدث الجزائری فی الانوار مامعناه ان الاصحاب قد اطبقوا علیٰ صحة الاخبار المستفیضة بل المتواترة الدالة بصریحنا علیٰ وقوع التحریف فی القراٰن کلاماً ومادةً واعراباً والتصدیق بها[1]

سید محدث جزائری نے کتاب 'انوار' میں لکھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اصحاب امامیہ نے اتفاق کیا ہے ان روایاتِ مستفیضہ بلکہ متواترہ کی صحت پر جو قرآن کے محرف ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ تحریف کلام میں بھی ہے، مادہ میں بھی، اعراب میں بھی، اور اتفاق کیا ہے روایت کی تصدیق پر۔

(۳) اسی کتاب میں محدث جزائری کے علاوہ اپنے دوسرے علماء سے بھی روایاتِ تحریف کا متواتر ہونا نقل کیا ہے:

وهی کثیرة جدًا حتی قال السید نعمت الله الجزائری فی بعض مؤلفاته کماحکی عنه ان الاخبار الدالة علیٰ ذلک تزید علیٰ الفی حدیث وادعیٰ افاضتها جماعة کالمفید والمحقق الدامادوالعلامة المجلسی وغیرهم بل الشیخ ایضا صرح فی التبیان بکثرتها بل ادعیٰ تواترها جماعة یاتی ذکرهم فی اٰخر المبحث[2]

روایاتِ تحریفِ قرآن یقیناً بہت ہیں۔ حتیٰ کہ سید نعمت اللہ جزائری نے اپنی بعض تالیفات میں لکھا ہے کہ جو حدیثیں تحریف پر دلالت کرتی ہیں وہ دو ہزار سے زیادہ ہیں، اور ایک جماعت نے ان کے مستفیض ہونے کا دعویٰ کیا ہے جیسے شیخ مفید محقق داماد، اور علامہ مجلسی وغیرہم۔ شیخ مفید نے تو 'تبیان' میں اس کی بھی تصریح کی ہے کہ یہ روایات بکثرت ہیں۔ محدثین کی ایک جماعت نے ان روایتوں کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

پھر بفاصلہ چند سطور انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۳۵، ۳۶، بحوالہ فصل الخطاب، علامہ نوری طبرسی، ص ۲۲۷ [2] ایضاً

واعلم ان تلک الاخبار منقولة من الکتب المعتبرة التی علیها معول اصحابنا فی اثبات الاحکام الشرعیة والآثار النبویة۔[1]

جاننا چاہیے کہ تحریف کی یہ حدیثیں ان معتبر کتابوں سے نقل کی گئی ہیں جن پر ہمارے اصحاب کا اعتماد احکام شرعیہ کے ثابت کرنے اور آثار نبویہ کے نقل کرنے میں ہے۔

(۴) صاحبِ فصل الخطاب نے اپنے مذکورہ بالا وعدہ کو پورا کیا ہے اور آخر کتاب میں اُن تمام محدثین کے نام لکھے ہیں جنھوں نے روایاتِ تحریف کو متواتر کہا ہے۔ ان ناموں میں علامہ باقر مجلسی کا نام بھی ہے جن کی عبارت کا حسب ذیل فقرہ قابلِ دید ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وعندی ان الاخبار فی ھٰذا لباب متواترة معنیً وطرح جمیعها یوجب رفع الاعتماد عن الاخبار رأسًا بل ظنی ان الاخبار فی ھٰذا الباب لایقصر عن اخبار الامامة فکیف یثبتونها بالخبر۔[2]

میرے نزدیک تحریف قرآن کی روایتیں متواتر ہیں اور ان سب روایتوں کو ترک کر دینے سے ہمارے تمام فن حدیث کا اعتبار اٹھ جائے گا، بلکہ میرا علم یہ ہے کہ تحریف قرآن کی روایتیں مسئلہ امامت کی روایتوں سے کم نہیں ہیں لہٰذا اگر تحریف قرآن کی روایتوں کا اعتبار نہ ہو تو مسئلہ امامت بھی روایتوں سے ثابت نہ ہو سکے گا۔

(۵) علامہ محسن کاشی تفسیر صافی کے دیباچہ میں تحریف کی (نجس) روایات ذکر کر کے لکھتے ہیں:

المستفاد من مجموع ھٰذه الاخبار وغیره من الروایات من طریق اهل البیت علیهم السلام ان القرآن الذی بین اظهرنا لیس بتمامه کما انزل علیٰ محمد صلی الله علیه وآله بل منه ماهو خلاف ماانزل الله ومنه ماهو مغیرو هو محرف و انه قد حذف منه اشیاء کثیرة منها اسم علی

ان تمام حدیثوں کا اور ان کے علاوہ جس قدر حدیثیں اہل بیت علیہم السلام کی سند سے نقل کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جو قرآن ہمارے درمیان ہے وہ پورا جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ والہٖ پر نازل ہوا تھا نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے خلاف ہے اور کچھ مغیر و محرف ہے اور یقیناً اس میں سے بہت سی چیزیں نکال ڈالی گئی ہیں جیسے علی کا نام بہت سے مقامات سے (نکال دیا گیا

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۳۵-۳۶، بحوالہ فصل الخطاب، علامہ نوری طبرسی، ص ۲۲۷ [2] ایضاً

فی کثیر من المواضع ومنها غیر ذٰلک وانہ لیس ایضاً علی الترتیب المرضی عند اللہ وعند رسولہ وبہٖ قال علی بن ابراھیم۔[1]

ہے) اس کے علاوہ ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قرآن کی ترتیب بھی خدا اور اس کے رسول کی پسند کی ہوئی ترتیب نہیں ہے چنانچہ علی بن ابراہیم قمی بھی انھی سب باتوں کے قائل ہیں۔

(۶) دورِ آخر کے مجتہدِ اعظم مولوی (سیّد) دلدار علی (مجتہد نصیر آبادی المعروف بہ غفراں مآب (م۱۸۱۹ء) جن کو شیعوں کے امام والا مقام مولوی (سیّد) حامد حسین (کنتوری م۱۸۸۸ء) ''آیۃ اللہ فی العالمین'' کہتے ہیں، ''عماد الاسلام'' میں لکھتے ہیں:

قال اٰیۃ اللہ فی العالمین احلہ اللہ دار السلام فی عماد الاسلام بعد ذکر نبذ من احادیث التحریف الماثورۃ عن سادات الانام علیھم اٰلاف التحیۃ و السلام مقتضی تلک الاخبار ان التحریف فی الجملۃ فی ھٰذا القراٰن الذی بین ایدینا بحسب زیادۃ بعض الحروف و نقصانہ بل بحسب بعض الالفاظ و بحسب الترتیب فی بعض المواضع قدوقع بحیث لایشک فیہ مع تسلیم تلک الاخبار۔[2]

آیۃ اللہ فی العالمین (مولوی دلدار علی) اپنی کتاب عماد الاسلام میں چند احادیث تحریف نقل کرنے کے بعد، جو سرداران خلق یعنی ائمہ اثنا عشر علیہم آلاف التحیۃ والسلام سے منقول ہیں، فرماتے ہیں کہ ان روایات کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ تحریف اس قرآن میں جو ہمارے سامنے ہے بلحاظ بعض حروف کے زیادہ ہونے، بعض کے کم ہو جانے بلکہ بعض الفاظ کے بھی کم ہو جانے اور بلحاظ ترتیب بعض مقامات میں (تحریف) یقیناً واقع ہوئی ہے، اس طرح ان روایتوں کے تسلیم کرنے کے بعد تحریف قرآن میں شک نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد مولوی دلدار علی نے تحریف قرآن کی مختلف صورتیں تحریر کی ہیں۔ امام الشیعہ مولوی (سید) حامد حسین (کنتوری) استقصاء الافہام میں لکھتے ہیں:

''ورود روایات تحریف قرآن بطریق اہل حق[3] اگر بے چارہ شیعے بمقتضائے احادیث کثیرہ اہل بیت طاہرین مصرحہ بوقوع نقصان در قرآن حرف تحریف ونقصان برزبان آرد ہدف سہام طعن و

۱۔ تنبیہ الحائرین، ص ۳۶-۳۷، بحوالہ تفسیر صافی علامہ محسن کاشی (شیعی)

۲۔ تنبیہ الحائرین، ص ۳۷ بحوالہ استقصاء الافہام، مولوی سید حامد حسین (شیعی) ص ۶۱ ۳۔ ایضاً، جلد اوّل، ص ۹۰

ملام و مورد استہزاء و تشنیع گردو[1] اگر اہل حق از حافظان اسرار الٰہی و حاملان آثار جناب رسالت پناہی کہ ہداۃِ اسلام و ائمہ انام اند روایت کنند احادیثے را کہ حال است بر آنکہ در قرآن شریف مبطلین و اہل ضلال تحریف نمودند و تصحیفش با عمل آوردند و اصل قرآن کما انزل نزد حافظانِ شریعت موجود است کہ دریں صورت اصلا بر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ نقصے و طعنے عائد نمی شود فریاد و فغاں آغاز می کنند و کلمات ناشائستہ دور از کار کہ بادنیٰ عاقلے نمی زیبد بر زباں آرند[2]

عبارت مذکورہ بالا سے حسبِ ذیل امور معلوم ہوئے:

۱۔ روایات تحریف قرآن شیعوں کی اُن اعلیٰ معتبر کتابوں میں ہیں جن پر مذہبِ شیعہ کی بنیاد ہے۔

۲۔ روایاتِ تحریف کثیر و مستفیض بلکہ متواتر ہیں۔

۳۔ روایاتِ تحریف اگر رد کردی جائیں تو شیعوں کا فن حدیث بے کار و بے اعتبار ہو جائے گا۔

۴۔ تحریف قرآن کی روایتیں شیعوں کی کتابِ معتبرہ میں دو ہزار سے زیادہ ہیں۔

۵۔ تحریفِ قرآن کی روایتیں مسئلہ امامت سے کم نہیں ہیں۔ جن سے معلوم ہوا کہ مذہبِ شیعہ میں جتنا ضروری مسئلہ امامت ہے اتنا ہی ضروری تحریف قرآن بھی ہے۔ حضرت علیؓ اور دوسرے ائمہ کی امامت کا ماننا جیسا فرض ہے اسی درجہ کا فرض قرآن کو محرف ماننا بھی ہے۔ جو شخص قرآن کو محرف نہ مانے وہ از روئے مذہبِ شیعہ ویسا ہی گنہگار و بددین اور مذہب شیعہ سے خارج سمجھا جائے گا جیسا کہ ائمہ اثنا عشر کی امامت کا منکر[3]

یہ روایات قرآن کے محرف ہونے اور پانچوں قسم کی تحریف سے ملوث ہونے پر ایسی صاف اور واضح دلالت کرتی ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ ان عبارتوں میں دو اقرار تو بالکل واضح ہیں یعنی ان روایات کے کثیر و متواتر ہونے کا اور ان روایات کے تحریف پر دلالت کرنے کا مگر تیسرا اقرار یعنی تحریف کے معتقد ہونے کا اس درجہ واضح نہیں ہے لہٰذا اس کے لیے چند اور عبارتیں درج ذیل ہیں۔

(۷) علامہ محسن کاشی تفسیر صافی میں لکھتے ہیں:

---

۱ تنبیہ الحائرین، جلد اوّل، ص ۱۰ ۲ تنبیہ الحائرین، ص ۳۸

واما اعتقاد مشائخنا رحم الله فی ذٰلک فالظاهر من ثقة الاسلام محمدبن یعقوب الکلینی طاب ثراہ انه کان یعتقد التحریف و النقصان فی القراٰن لانه روٰی روایات فی هٰذا المعنی فی کتابه الکافی ولم یتعرض لقدح فیها مع انه ذکر فی اول الکتب انه کان یثق بما رواہ فیه وکذٰلک استاذہ علی بن ابراهیم القمی فان تفسیرہ مملوء منه وله غلوفیه وکذٰلک الشیخ احمد بن ابی طالب الطبرسی قدس سرہ فانه نسج علیٰ منوالهما فی کتاب الاحتجاج۔[1]

ہمارے بزرگوں کا اعتقاد اس بارے میں یہ ہے کہ ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی قرآن کی تحریف و نقصان کے قائل تھے کیونکہ انھوں نے اس مضمون کی روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں اور ان روایتوں پر کوئی جرح نہیں کی باوجودیکہ انھوں نے آغاز کتاب میں لکھ دیا ہے کہ جتنی روایتیں اس کتاب میں ہیں ان پر مجھے وثوق ہے۔ اسی طرح ان کے استاذ علی بن ابراہیم قمی کی تفسیر بھی روایاتِ تحریف سے پُر ہے اور ان کو اس عقیدہ میں غلو ہے۔ اسی طرح شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی بھی کتاب احتجاج میں انھی دونوں کے طرز پر چلے ہیں۔

(۸) علامہ نوری طبرسی فصل الخطاب کے صفحہ ۲۵ میں لکھتے ہیں:

الاول وقوع التغییر والنقصان فیه وهو مذهب الشیخ الجلیل علی بن ابراهیم القمی شیخ الکلینی فی تفسیرہ صرح بذٰلک فی اوّله و ملاء کتابه من اخبارہ مع التزامه فی اوله بان لایذکر فیه الامار واہ مشائخه وثقاته' و مذهب تلمیذہ ثقة الاسلام الکلینی رحمه الله علیٰ

پہلا قول یہ ہے کہ قرآن میں تغیر ونقصان ہوگیا ہے، یہی مذہب شیخ جلیل علی بن ابراہیم قمی استاذ کلینی کا ہے، انھوں نے اپنی تفسیر کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے اور اپنی اس کتاب کو روایاتِ تحریف سے بھر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی تفسیر کے شروع میں یہ پابندی ظاہر کی ہے کہ میں وہی روایات ذکر کروں گا جو میرے اساتذہ اور معتبر لوگوں نے روایت کی ہیں۔ یہی مذہب ثقۃ الاسلام

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۳۸

مانسبه اليه جماعة لنقله الاخبار الكثيرة الصريحة فى هٰذا لمعنىٰ فى كتابه الحجة خصوصاً فى باب النكت والنتف من التنزيل وفى الروضة من غير تعرض لردها لردها اوتاويلها و استظهر المحقق السيّد محسن الكاظمى فى شرح الوافية مذهبه من الباب الذى عقده فيه و سماه باب انه' لم يجمع القرآن كله الاالائمة عليهم السلام فن الظاهر من طريقته انه انما يعقد الباب لمايرتضيه قلت وهو كما ذكره فان مذاهب القدماء تعلم غالباً من عناوين ابوابهم وبه صرح ايضًا العلامة المجلسى فى مرأة العقول۔[1]

کلینی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جیسا کہ ایک جماعت نے ان کی طرف یہ منسوب کیا ہے کیونکہ انھوں نے اس مضمون کی بہت سی صریح روایتیں کافی کی کتاب الحجۃ میں خصوصاً باب النکت والنتف من التنزیل میں اور 'روضۃ' میں نقل کی ہیں۔ انھوں نے ان روایات کا نہ رد کیا اور نہ ہی ان کی کچھ تاویل کی۔ محقق سید محسن کاظمی نے شرح وافیہ میں کلینی کا مذہب اس بات سے ثابت کیا ہے جو انھوں نے کافی میں منعقد کیا ہے اور اس کا نام باب انہ لم یجمع القرآن کلہ الا الائمۃ علیہم السلام رکھا ہے۔ کیونکہ ان کے طریقہ سے ظاہر ہے کہ وہ اسی مضمون کے لیے باب قائم کرتے ہیں جو مضمون ان کو پسند آتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محقق کاظمی کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ متقدمین کا مذہب اکثر ان کے ابواب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کلینی کے مذہب کی تصریح علامہ مجلسی نے مرأۃ العقول میں بھی کی ہے۔

پھر اس کے بعد صاحب ''فصل الخطاب'' نے اپنے اکابر علماء متقدمین میں سے کئی درجن علماء شیعہ کے نام مع ان کی تصانیف کے اپنی کتاب میں تحریر کیے ہیں کہ جو تحریف قرآن کے معتقد ہیں۔

تحریف قرآن کے سلسلہ میں مذکورہ بالا شیعی روایات جو ان کی نہایت معتبر و مستند کتابوں سے حضرت مولانا لکھنویؒ نے اخذ کر کے اپنی مختلف تصانیف میں جمع کر دی ہیں جن میں سے چند ہم نے یہاں بطور نمونہ پیش کی ہیں۔ اس مبحثِ خاص پر مولاناؒ کی تفصیلی تحقیقات اگر دیکھنا ہوں تو سب سے پہلے ان کی کتاب ''تنبیہ الحائرین بحمایۃ الکتاب المبین'' الملقب ''بہ سوط العذاب علی

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۳۸-۳۹

اعداء الکتاب'' المشہور بہ ''شیعہ اور قرآن'' کو دیکھنا چاہیے جو شیعہ مجتہد مولوی سید علی الحائری لاہوری کی کتاب ''موعظۂ تحریف قرآن'' کے جواب میں لکھی گئی تھی، اس کے علاوہ ''الاوّل من المأتین'' کے چاروں حصے، ''مناظرہ و اظہار حق'' میں تحریف سے متعلق ابواب اور ان کے علاوہ تفسیر آیات کے بعض رسائل اور النجم کے متعدد مقالات و مضامین کو دیکھنا چاہیے، پھر اسی خاص موضوع پر آپ کے بعض معرکۃ الآراء مناظرے بھی علماء شیعہ سے ہوئے تھے جن میں مناظرۂ امروہہ (۱۹۲۰ء) مناظرۂ منٹگمری (۱۹۳۰ء) اور مناظرۂ بمبئی (۱۹۳۶ء) کی مکمل رودادیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں جو دستیاب ہیں۔ مختلف ہندوستانی علماء اہلسنّت کی اس مسئلہ خصوصی پر خامہ فرسائی کے بعد حضرت لکھنویؒ نے اپنے ان اکابر کی تحقیقات کی روشنی میں مسلک اہلسنّت و جماعت کی نصرت و حمایت کا جس طرح حق ادا کیا ہے اور بلا خوف لومۃ لائم صحابۂ کرامؓ کے مقام و مرتبہ سے مسلمانوں کو واقف کراتے ہوئے اس مسئلہ خصوصی کو جس تفصیل کے ساتھ اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے وہ سابقہ اکابر کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ اسی لیے ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے والے حضرات آپ کی تحقیقات عالیہ سے استفادہ کیے بغیر کوئی معتبر خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ آپ نے مذہبِ شیعہ کے تمام اصولی و فروعی مسائل کا رد کرتے ہوئے خاص طور پر ان کے عقیدہ تحریف قرآن اور مسئلہ امامت پر اپنی توجہ مرکوز کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شیعوں کا ایمان قرآن مجید پر نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے اور ان کا عقیدۂ امامت تو مسلمانوں کے عقیدۂ ختم نبوت پر ایک ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی ان تحقیقات کی روشنی میں آپ نے بے لاگ انداز میں یہ لکھا ہے:

''ہندوستان کے تمام باخبر اصحاب اس بات سے واقف ہیں کہ تقریباً بیس بائیس سال (اور اب ۷۵ سال) سے النجم میں نہایت کامل تحقیقات کی بنیاد پر پے دَر پے یہ اعلان ہو رہا ہے کہ شیعوں کا ایمان قرآن شریف پر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے، یہ اعلان بھی دیا گیا کہ کوئی مجتہد شیعہ اس بات کا اگر اطمینان دلا دیں کہ شیعہ ہونے کے بعد قرآن مجید پر ایمان ہو سکے گا تو قسم ہے رب العرش کی میں اسی وقت فی الفور شیعہ ہونے کے لیے آمادہ ہوں۔ ان اعلانات سے سرزمین ہند کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا مگر کسی شیعہ مجتہد کی رگِ حمیت کو جنبش نہ ہوئی۔ ایڈیٹر صاحبان ''اصلاح''، ''الشمس'' زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ملاتے تھک کر خاموش ہو گئے مگر کچھ نتیجہ

برآمد نہ ہوا سوا اس کے کہ الزام اور قوی ہو گیا جرم اور سنگین بن گیا اور صاف صاف بایں الفاظ ان کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ یہ قرآن چند جہلائے عرب کا جمع کیا ہوا ہے اس پر اعتراض نہ ہو تو کیا ہو۔ نعوذ باللہ منہ۔"[1]

ضمیر کی پکار: انکارِ تحریف

تحریف قرآن کے بارے میں اسلامی تاریخ کے ابتدائی ساڑھے تین سو سال تک تمام اکابر علماء شیعہ کا یہی متفقہ عقیدہ رہا کہ موجودہ قرآن محرف ہے اور اس میں وہ تمام قسم کی تحریفات واقع ہوئی ہیں جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اس کے بعد مصلحتًا یا مجبورًا اس عقیدہ سے "جان چھڑانے" کے لیے اور اس کی طرف سے عالم اسلام کی توجہ ہٹانے کے لیے کچھ تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ چنانچہ بقول حضرت لکھنویؒ تقیہ کر کے تحریف قرآن کے عقیدہ سے انکار کر دیا گیا مگر افسوس ایسے کام کا ارادہ کیا گیا جس میں کامیابی محال تھی کیونکہ اس دعوے کی کوئی دلیل مذہبِ شیعہ کے اصول کے مطابق پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ پوری تلاش و تتبع کے بعد معلوم ہوا کہ گنتی کے چار شخص اکابر قدمائے شیعہ میں ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ازراہِ تقیہ قرآن مجید کی تحریف کا انکار کیا ہے۔ اور اسے ہر قسم کی تحریف سے پاک بتلایا ہے۔ ان چار علماء کے نام یہ ہیں۔ شریف مرتضٰی (م ۴۳۶ھ) ابو جعفر طوسی (م ۴۶۰ھ) شیخ صدوق (م ۳۸۱ھ) اور شیخ ابو علی طبرسی (م ۵۴۸ھ)

متقدمین شیعہ میں ان چار علماء کے علاوہ کسی دوسرے نے ازراہِ تقیہ بھی تحریف قرآن کا انکار نہیں کیا۔[2] خود اکابر شیعہ نے اپنی کتابوں میں انھیں چاروں کے معتقد عدم تحریف ہونے کا اقرار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ نوری طبرسی صاحب "فصل الخطاب" تحریر کرتے ہیں:

الثانی عدم وقوع التغیر و النقصان فیہ وجمیع مانزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ ھوا لموجود بایدی الناس فیما بین دفتین و الیہ	دوسرا قول یہ ہے کہ قرآن میں تحریف اور کمی نہیں ہوئی اور یہ کہ جس قدر قرآن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل ہوا وہ لوگوں کے ہاتھوں میں اور دفتیوں کے بیچ میں موجود ہے، اسی طرف گئے ہیں، شیخ صدوق

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۲-۳ [2] تنبیہ الحائرین، ص ۴۰-۴۲

ذھب الصدوق فی عقائدہ والسید المرتضیٰ وشیخ الطائفة فی التبیان ولم یعرف من القدماء موافق لھم۔[1]

اپنی کتاب عقائد میں اور سید مرتضٰی اور شیخ الطائفہ (ابوجعفر طوسی) تبیان میں اور (ان کے علاوہ) متقدمین میں کوئی ان کا موافق معلوم نہیں ہوا۔

اسی کتاب میں چند اوراق کے بعد مزید یہ تحریر ہے:

والیٰ طبقته (ای المرتضیٰ) لم یعرف الخلاف صریحاً الا من ھٰذہ المشائخ الاربعة۔[2]

شریف مرتضٰی کے طبقہ تک مسئلہ تحریف قرآن کی صراحتہً مخالف سوا ان چار بزرگوں کے اور کسی سے معلوم نہیں ہوئی۔

منکرینِ تحریف کا رد

ان چاروں قدماء شیعہ کے انکار تحریفِ قرآن کے اقوال اور ان کے دلائل کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد ان کے ہر ایک دعویٰ کا رد کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ از روئے کتبِ مذہبِ شیعہ تحریفِ قرآن کا منکر ہونا ممکن نہیں ہے۔ خود اکابر علماء شیعہ نے بھی ان چاروں منکرینِ تحریف کا اپنی کتابوں میں خوب رد کیا ہے، ان رد کرنے والے شیعی علماء میں علامہ محسن کاشی صاحبِ تفسیر صافی، علامہ خلیل قزوینی صاحبِ صافی شرحِ کافی اور پھر آخر میں علامہ نوری طبرسی صاحبِ الخطاب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے بہت تفصیل کے ساتھ منکرینِ تحریف کا رد کیا ہے اور ان کے دلائل کو توڑا ہے۔ خاص طور سے شیخ صدوق کی تو بہت سی علمی خیانتیں پکڑی ہیں اور آخر میں صاف طور سے یہ لکھ دیا ہے کہ تحریف کے انکار میں جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ مذہبِ شیعہ کے لیے سمِّ قاتل ہیں۔ اس سلسلہ کی اگر تفصیل دیکھنا ہو تو تنبیہ الحائرین کے صفحات ملاحظہ فرمائے جائیں۔ ان چاروں منکرین تحریف کے اقوال و دلائل کے بارے میں مولاناؒ کے خیالات یہ ہیں:

یہ چاروں اشخاص اوّل تو از راہِ تقیہ تحریف کا انکار کر رہے ہیں، ان کے انکار کے از راہِ تقیہ ہونے کی روشن دلیلیں تین ہیں:

"اوّل: یہ کہ وہ اپنی سند میں کوئی حدیثِ امام معصوم نہیں پیش کرتے اور نہ ہی وہ پیش کرسکتے ہیں

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۴۰-۴۲ بحوالہ فصل الخطاب علامہ نوری طبرسی، ص ۳۲ مطبوعہ تہران ۱۲۹۸ھ [2] ایضاً

اور (اسی طرح) نہ ہی اُن کے زائد از دو ہزار احادیثِ ائمہ کا جواب دیتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ انکار ان کا اصل عقیدہ نہ تھا۔

دوم: یہ کہ وہ قائلین تحریف کو کافر کیا معنی گمراہ بھی نہیں کہتے۔ اگر واقعی ان چاروں کا اصلی عقیدہ یہی ہوتا جو وہ زبان سے کہہ رہے ہیں تو وہ قرآن پر ایمان رکھنا ضروریاتِ دین سمجھتے اور قائلین تحریف کو ہماری طرح کافر اکفر جانتے۔

سوم: یہ کہ یہ چاروں صاحبان (منکرین تحریف) قرآن شریف کے محفوظ ہونے کو صحابۂ کرام کی مساعیٔ جمیلہ اور ان کی حمیتِ دینی اور قوتِ ایمانی سے ثابت کرتے ہیں۔ بھلا اگر انھوں نے تقیہ نہ کیا ہوتا تو وہ صحابۂ کرام کے ان اوصاف کا اقرار کرتے؟ کیا اگر کوئی مرزائی کہے کہ میں مرزا غلام احمد کو نہ نبی مانتا ہوں نہ مجدد، تو کیا اس کا یہ قول صحیح سمجھا جاسکتا ہے؟ اسی طرح اگر کوئی خارجی کہے کہ میں حضرت علیؓ سے حُسنِ ظن ومحبت رکھتا ہوں تو اس کی بات قابلِ اعتبار ہوسکتی ہے؟

بہرکیف ان چار اشخاص کا انکار خواہ از راہِ تقیہ ہو یا نہ ہو مگر جبکہ زائد از دو ہزار احادیث ائمہ معصومین ان کے قول کے خلاف ہیں اور کوئی ایک ٹوٹی پھوٹی روایت بھی ان کے موافق نہیں ہے اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اگر ان کی دلیل مان لی جائے تو مذہبِ شیعہ فنا ہوا جاتا ہے لہٰذا ان کا یہ انکار ہرگز ہرگز از روئے مذہبِ شیعہ قابلِ اقتدا نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس کی بنا پر شیعوں کو منکرِ تحریف کہنا کسی طرح صحیح ہوسکتا ہے[1]"

عام طور سے شیعہ، اہلسنّت کے درمیان آکر عقیدۂ تحریفِ قرآن کا انکار کردیتے ہیں اور اپنے انھی چاروں علماء کے اقوال پیش کردیتے ہیں اور ناواقفوں کو چپ کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہم لوگ تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں، لہٰذا حضرت لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اپنی پیشانی سے تحریفِ قرآن کے عقیدہ کا داغ مٹانا چاہتے ہیں تو ان کو حسب ذیل تین کام کرنا ضروری ہیں:

"اوّل: یہ کہ یہ زائد از دو ہزار روایاتِ تحریفِ قرآن جو ان کی کتابوں میں ہیں جن کو محدثینِ شیعہ متواتر اور مستفیض کہتے ہیں ان کے غیر معتبر ہونے کی کوئی ایسی معقول وجہ بیان کریں جو ان کے اصولِ حدیث کے مطابق ہو اور ان روایات کے غیر معتبر ہونے سے کوئی اثر ان کے فن حدیث خصوصاً روایاتِ امامت پر نہ پڑنے پائے۔

دوم: یہ کہ اپنی کتابوں سے کچھ ایسی معتبر حدیثیں ائمہ معصومین کی پیش کریں جن میں اس مضمون

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۴۳-۴۲

کی تصریح ہو کہ قرآن میں تحریف نہیں ہوئی ہے، اگر کوئی صحیح روایت دستیاب نہ ہو تو کوئی ضعیف روایت ہی دکھلادیں۔

سوم: یہ کہ ایک فتویٰ تیار کریں کہ جو شخص تحریفِ قرآن کا قائل ہو وہ کافر ہے اور قطعاً دائرہ اسلام سے خارج ہے اور ان علماء واکابر شیعہ کو جو تحریف کے قائل تھے جن میں اصحابِ ائمہ وسفرائے امام غائب بھی ہیں انھیں کافر نہ سہی تو گمراہ ہی لکھ دیں اور اس فتویٰ پر اپنی مہر ثبت کر کے شائع کردیں اور اچھا ہو کہ دوسرے مجتہدینِ شیعہ سے بھی اس فتویٰ پر تصدیقی مہریں لگوائیں۔

بغیر ان تین کاموں کے کیے صرف یہ کہہ دینا کہ ہم تحریف کے قائل نہیں ہیں کسی طرح لائقِ سماعت نہیں ہوسکتا بلکہ بدیہیات کا انکار بے حیائی کی دلیل ہوگا[1]۔"

اہلسنّت پر تحریف کا الزام اور اس کی تردید

تحریفِ قرآن کے موضوع پر حضرت لکھنویؒ سے کئی بار علماء شیعہ سے مناظرے ہو چکے ہیں اور اس موضوع پر انھوں نے النجم میں اور اپنی دوسری تصنیفات میں بہت تفصیل سے لکھا ہے مگر علماء شیعہ کی طرف سے اس کی تردید میں کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑا بلکہ اس موضوع کا ذکر آتے ہی ان کے اندر ایک قسم کی سراسیمگی پیدا ہو جاتی ہے جس کی مثال مختلف مناظروں کی روداروں میں بکثرت ملتی ہے۔ جب سے تحریفِ قرآن کے عقیدہ پر پکڑ دھکڑ عام طور پر ہونے لگی ہے۔ اس وقت سے انھوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ وہ اس عقیدہ کی تردید کے بجائے یہ الزامی دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ اہلسنّت کے یہاں بھی تو تحریف کی روایات پائی جاتی ہیں، یعنی ہم تو قائل ہیں ہی ہمارے علاوہ اہلسنّت بھی اس کے قائل ہیں نعوذ باللہ منہ۔

بقول حضرت لکھنویؒ:

> "یہ بے حیائی اور بے انصافی تو اب چند روز سے شروع ہوئی ہے غالباً مولوی دلدار علی ومرزا محمد کشمیری (شیعی) پہلے شخص ہیں جنھوں نے تحفۂ اثنا عشریہ کے جواب میں مبہوت ہو کر یہ بانگِ بے ہنگام اٹھائی ہے کہ سنّیوں کی روایات سے بھی تحریفِ قرآن ثابت ہے[2]۔"

ان دونوں کے بعد مولوی حامد حسین مجتہد شیعہ مصنّف استقصاء الافحام نے بھی اس الزام کی تائید کرتے ہوئے طبع آزمائی کی ہے۔ یہ سب الزام تراشیاں صرف اس لیے کی گئی ہیں کہ کسی طرح ان کے سر سے عقیدۂ تحریف قرآن کا جرم اتر جائے مگر یہ ناممکن اور محال ہے۔ اس الزام کا جواب

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۵۱ [2] ایضاً ص ٦٠

دیتے ہوئے مولانا لکھنویؒ نے لکھا ہے:

''سنّیوں کے یہاں ہرگز ہرگز کوئی روایت تحریف کی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی سنّی کبھی تحریف کا قائل ہوا اور نہ ہوسکتا ہے۔ مذہبِ اہلسنّت میں جو شخص تحریف قرآن کا قائل ہو وہ قطعاً کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے[1]''

پھر اس کے آگے مزید لکھتے ہیں:

''شیعوں کو اس موقع پر لازم تھا کہ جس طرح ہم نے ان کی معتبر کتابوں سے تحریف قرآن کی روایتیں ان کے تین اقراروں کے ساتھ نقل کی ہیں اسی طرح وہ بھی ہماری معتبر کتابوں کی روایتیں پیش کر کے ہمارے علماء کا اقرار دکھاتے کہ یہ روایات متواتر ہیں اور تحریفِ قرآن پر دلالت کرتی ہیں اور انھی روایات کے مطابق سنّی تحریف کے معتقد بھی ہیں۔ مگر کسی شیعہ مجتہد نے ایسا نہ کیا اور نہ کر سکتا ہے۔ وہ صرف بغیر ان تین اقراروں کے روایت نقل کرتے ہیں اور اس کا غلط مطلب بھی اپنی طرف سے بیان کر کے کہہ دیتے ہیں کہ تحریف ثابت ہوگئی[2]''

مخالفین کی طرف سے یہ ساری باتیں محض لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کی جاتی ہیں تاکہ فریقِ مقابلہ حملہ آور ہونے کے بجائے اپنی صفائی میں مصروف ہوجائے۔ اس قسم کے جوابی الزام کی حقیقت مخالفین خود سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ان میں کوئی سچائی نہیں ہے مگر تھوڑی دیر کے لیے انھیں اپنے نزدیک سانس لینے کی مہلت مل جاتی ہے۔ مولانا لکھنویؒ نے اس الزام کا دنداں شکن جواب اپنی مختلف کتابوں میں دے کر بات صاف کردی ہے۔ تنبیہ الحائرین میں صفحہ ۵۲ سے لے کر صفحہ ۱۱۹ تک اسی قسم کے الزامات کی تردید میں صرف ہوئے ہیں چنانچہ انھیں صفحات سے ہم یہ پانچ دلائل اخذ کر کے یہاں نقل کر رہے ہیں جو مولانا نے اہلسنّت پر الزام تحریف کے رد میں تحریر کیے ہیں:

''(ا) اہلسنت کی وہ روایتیں جن کو یہ دھوکہ دینے والے تحریف کی روایتیں کہتے ہیں وہ نسخ کی اور اختلافِ قرأت کی روایتیں ہیں، جیسا کہ علماء اہلسنّت نے تصریح کی ہے۔ کسی ایک (سنّی) عالم نے بھی ان روایات سے تحریف نہیں سمجھی اور نہ سمجھ سکتا ہے، لطف یہ ہے کہ علماء شیعہ نے بھی اپنی جگہ بیٹھ کر اس امر کا اقرار کیا ہے کہ یہ روایات نسخ کی ہیں نہ کہ تحریف کی، بخلاف اس کے شیعوں کی روایات صراحتۂ تحریف قرآن کو بیان کر رہی ہیں کہ وہ سوا تحریف کے نسخ یا اختلاف قرأت پر کسی طرح بھی محمول نہیں ہوسکتیں۔

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص۵۲ [2] تنبیہ الحائرین، ص۵۳

(۲) اہلسنّت کی یہ روایتیں اخبار آحاد ہیں، متواتر نہیں ہیں بلکہ ان روایات میں سے اکثر کے صحیح ہونے میں بھی کلام ہے لہٰذا بالفرض محال اگر یہ روایتیں تحریف پر دلالت بھی کرتیں تو بھی اہلسنّت کے نزدیک قابل اعتبار نہ ہوتیں کیونکہ قرآن شریف متواتر ہے اور کوئی غیر متواتر شے متواتر کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور نہ ہی وہ بنیاد اعتقاد بن سکتی ہے۔ بخلاف اس کے شیعوں کی روایاتِ تحریف متواتر ہیں، ان کے متواتر ہونے کا اور زائد از دو ہزار ہونے کا خود علماء شیعہ نے اقرار کیا ہے جیسا کہ اوپر منقول ہوا۔

(۳) اہلسنّت کے یہاں تحریفِ قرآن کا ناممکن ومحال ہونا قرآن مجید سے اور متواتر حدیثوں سے اور اجماع متواتر سے ثابت ہے۔ لہٰذا بالفرض کفرض شریک الباری اگر کوئی روایت تحریف قرآن کی کتب اہلسنّت میں معاذ اللہ موجود بھی ہوتی تو قطعاً واجب الرد ہوتی بخلاف اس کے شیعوں کے یہاں تحریف کا ناممکن ہونا نہ قرآن سے ثابت ہے، یہ نہ متواتر وغیر متواتر کسی قسم کی حدیث سے اور نہ ہی ان کے اجماع سے بلکہ تحریف کا وقوع ان کے نزدیک قرآن سے اور متواتر وغیر متواتر احادیث سے اور ان کے اجماع سے ثابت ہے لہٰذا بالفرض اگر کوئی روایت عدمِ تحریفِ قرآن کی ان کی کتابوں میں موجود بھی ہوتی تو وہ قطعاً واجب الرد ہوتی۔

(۴) اہلسنّت کی جن روایتوں کو یہ لوگ تحریف کی روایتیں کہتے ہیں ان روایتوں میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول نہیں بیان کیا گیا ہے اور اہلسنّت کے مذہب میں رسول کے سوا اور کوئی معصوم نہیں ہے لہٰذا یہ روایات بالفرض کفرض اجتماع النقیضین تحریف قرآن پر دلالت بھی کرتیں اور بالفرض متواتر بھی ہوتیں تو بھی لائق اعتبار نہ ہوتیں کیونکہ غیر معصوم سے غلط فہمی، سہو ونسیان اور ہر طرح کی خطائے اجتہادی وغیر اجتہادی ممکن ہے، اس لیے غیر معصوم کا قول وفعل بالاتفاق حجت نہیں، اس پر اعتقاد تو بڑی چیز ہے عمل کی بنیاد رکھنا بھی حرام ہے بخلاف اس کے شیعوں کی روایات تحریف میں ائمہ معصومین کے اقوال ہیں جو ان کے زعم باطل میں مثل پیغمبر کے معصوم وواجب الاطاعت ہیں۔

(۵) اہلسنّت تحریفِ قرآن کے معتقد نہیں ہیں بلکہ معتقد تحریف کو قطعی کافر جانتے ہیں لہٰذا بالفرض کفرض المحالات ہزاروں روایتیں بھی تحریف کی ہوتیں تو یہ نہ کہا جاتا کہ ان کے مذہب کی رُو سے قرآن محرف ہے بخلاف اس کے شیعہ تحریف قرآن کے معتقد ہیں۔ معتقدین تحریف کو کافر کہنا تو کجا ان کو اپنا پیشوا مانتے ہیں لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ اُن کے مذہب کی رُو سے قرآن محرّف ہے[1]"

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۵۴-۵۶

مذکورہ بالا ان پانچ پختہ اور اصولی باتوں کے سمجھ لینے کے بعد کوئی کم فہم بھی کسی کے فریب میں نہیں آسکتا اور وہ اچھی طرح یہ معلوم کرسکتا ہے کہ بحث تحریف میں شیعوں کو معارضہ بالمثل کی ہوس سوا ذلت ورسوائی کے اور کچھ نتیجہ نہیں دے سکتی۔

جمع وترتیب قرآن

قرآن مجید کی جمع وترتیب کے بارے میں اکثر لوگوں کا خیال یہ رہا ہے اور بعض روایات کے ظاہری الفاظ سے بھی ایسا وہم ہوتا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن مجید مجموع ومرتب نہ تھا چنانچہ ابتداءً یہ کام حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد مبارک میں ہوا مگر اس وقت اس کی اشاعت نہ ہوسکی پھر حضرت عمرؓ کو بھی اپنے زمانہ خلافت میں اس کی اشاعت کا موقع نہ مل سکا یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پندرہ برس بعد ۲۵ھ میں حضرت ابوبکرؓ صدیقؓ کے جمع کیے ہوئے قرآن کی نقلیں کرا کے تمام ممالک اسلامیہ میں روانہ کیں۔ اس تصور کے بارے میں مولانا لکھنویؒ تحریر کرتے ہیں:

"اس حقیر راقم سطور کا خیال بھی (ابتداءً) تقلیدی طور پر ایسا ہی تھا چنانچہ النجم کے "مناظرہ اور اظہار حق" حصہ اوّل میں میں نے ایسا ہی لکھا بھی ہے مگر اس کے بعد نور توفیق نے مدد کی اور تحقیق کا دروازہ کھلا، بے شمار دلائلِ عقلیہ فطریہ اور براہین نقلیہ نے میرے خیال سابق کو محو کردیا اور روز روشن کی طرح یہ بات ظاہر ہوگئی کہ خود رسول رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپؐ کے اہتمام سے قرآن مجید کی جمع وترتیب کا کام نہایت کامل طریقہ سے ہوچکا تھا اور اس کی اشاعت بھی خود آپؐ ہی کے سامنے ہوچکی تھی۔ جس وقت آپؐ نے رفیقِ اعلیٰ کی طرف رحلت کی تو (آپؐ) بے شمار سینوں اور سفینوں میں پورا قرآن مجید محفوظ کرچکے تھے۔ تواتر قرآن مجید کا جو سلسلہ آپ کے سامنے شروع ہوا تھا وہی سلسلہ اُسی شان کے ساتھ اب تک چلا آرہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک (چلتا) رہے گا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ محققین سابقین سے بھی اس کی تصدیق منقول ہے اور کوئی صحیح روایت اس تحقیق کو مزاحمت نہیں کرتی۔ اس تحقیق کو بیان کرنے کے لیے ایک مستقل تصنیف کی حاجت ہے جس کو ایک حد تک میرے ایک فاضل دوست نے اپنی کتاب "تاریخ القرآن" میں پورا کردیا ہے جو کئی سال ہوئے چھپ چکی ہے۔ واللہ ولی التوفیق وھو الہادی الیٰ سواء الطریق۔"[1]

---

[1] تنبیہ الحائرین، ص ۹۰-۹۱

لٰہذا جب قرآن مجید آج ہی کی موجودہ شکل وترتیب کے ساتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہتمام سے آپ کی نظر مبارک کے سامنے جمع ومرتب ہو چکا تھا تو پھر اس میں کسی صحابی کی طرف سے خواہ وہ کتنا ہی مقرب اور مقتدر کیوں نہ ہو کسی قسم کا اختلاف یا اس مصحف کے خلاف اپنا کوئی دوسرا مصحف مرتب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایسی کوئی روایت کہیں ملے بھی تو یقیناً وہ موضوع، بے بنیاد اور کسی دشمنِ قرآن کی خانہ زاد سمجھی جائے گی۔

تحدیث نعمت

شیعوں کے عقیدۂ تحریفِ قرآن پر اپنی توجہ مرکوز کر کے جس تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر مولاناؒ نے لکھا ہے وہ اپنے پیش رو علماء سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ نے مخالفین کی تقریباً تمام ہی کتب اور خاص طور سے ان کے اصولِ اربعہ کو جس طرح کھنگال کر ایک حتمی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے وہ آپ کے اختصاص اور تفردات میں سے ہے۔ خود آپ کو بھی اس کا احساس تھا چنانچہ آخری دور کے بعض ہندی علماء حق مثل حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ نے اپنے اس احساس کو بڑی شائستگی اور متانت سے اپنی بعض تحریروں میں ظاہر کیا ہے چنانچہ ہم ان کی اس تحدیث نعمت کو خود انھی کے الفاظ میں ان کی ایک تحریر سے نقل کر کے یہاں پیش کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی تحقیقات عالیہ پر کس قدر یقین اور وثوق حاصل تھا۔ آپ لکھتے ہیں:

> ''سب جانتے ہیں کہ کچھ دنوں پہلے مذہبِ شیعہ کی اصلی حقیقت اس طرح پردۂ راز میں تھی کہ عوام تو عوام علماء بھی اس سے واقف نہ تھے۔ اہلسنت کا کیا ذکر خود شیعہ بھی عام طور پر اس سے آشنا نہ تھے۔ ہمارے علماء کرام زیادہ سے زیادہ صرف اس قدر جانتے تھے کہ کلمہ گویانِ اسلام میں ایک فرقہ شیعہ بھی ہے جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو نہیں مانتا، ان کے فضائل کا منکر ہے، ان سے بغض رکھتا ہے اور وہ حضرت علی مرتضیٰؓ اور ان کی اولاد کے چند بزرگوں سے محبت کا مدعی ہے۔ یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ مذہبِ شیعہ کی اصل بنیاد قرآن کریم کی عداوت اور حضرت محمد مصطفیٰ بابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وختم نبوت کی مخالفت پر ہے۔ اسی طرح یہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا کہ صحابہ کرام پر فرد جرم لگانے کی کوشش محض اس لیے ہے کہ وہی جماعت نبوت اور دلائلِ نبوت کی چشم دید گواہ اور قرآن مجید کو بلا واسطہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے

نقل کرنے والی ہے۔ جب تک کسی واقعہ کے چشم دید گواہ مجروح نہ کیے جائیں اس وقت تک وہ واقعہ مشکوک نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا کہ شیعوں نے قرآن مجید کی مخالفت میں کیا کیا کارروائیاں کی ہیں اور اس کتاب مقدس کی مخالفت ان کے مذہب کی رگ رگ میں کس طرح موجزن ہے۔

اس سربستہ راز کی اشاعت عنایت ازلی نے اس عاجز بندہ کے لیے مقدر فرمائی تھی اور اس پاک بے نیاز نے اپنی باعزت کتاب کے چھپے ہوئے دشمنوں کے حق میں انتقام خداوندی کا آلہ بننے کی دولت اس حقیر کی قسمت میں رکھی تھی۔ ذالک فضل الله علینا وعلی الناس ولکن اکثر الناس لایشکرون۔

اگر ہر موئے من گردد زبانے زتو رانم بہ ہریک داستانے[1]

اس تحدیث نعمت کے بعد مولاناؒ نے لکھا ہے کہ عقیدۂ تحریفِ قرآن کے منکشف ہونے سے شیعہ و سنّی دونوں کے لیے بڑے فوائد متوقع ہیں منجملہ ان میں سے ایک یہ ہے کہ شیعہ عوام میں جن لوگوں نے مذہبِ شیعہ کو حق سمجھ کر محض نجات آخرت کے خیال سے اختیار کیا ہے وہ اس راز سے واقف ہوجائیں کہ مذہب شیعہ میں رہ کر قرآن مجید پر ایمان نصیب نہیں ہوسکتا لہٰذا امید ہے کہ اگر ان پر یہ راز منکشف ہوجائے تو شاید وہ متنبہ ہوجائیں اور ایسے مذہب کو ترک کر کے صدق دلی کے ساتھ اسلام کے ظل رحمت میں آجائیں۔ قرآن مجید کی عظمت وجلالت اور اس کی عزت ورفعت کا عالم یہ ہے کہ آج علماء شیعہ بھی باآں ہمہ جسارت کھلم کھلا قرآن پر ایمان نہ رکھنے کا اقرار نہیں کرتے، وہ اپنے اس بنیادی عقیدہ کو اپنے عوام سے بھی چھپاتے ہیں۔ دوسرا متوقع فائدہ یہ ہے کہ شیعوں کو مومن بالقرآن سمجھ کر اور ان کی ضلالت کو صرف بعض صحابہ ہی میں منحصر خیال کر کے جو نقصان اہلسنّت اب تک اٹھا رہے ہیں وہ اس سے بچ جائیں گے۔ گذشتہ نقصان سے تو اس طرح بچیں گے کہ ہمارے محدثین نے جو روایتیں بعض شیعہ راویوں سے یہ خیال کر کے لے لی تھیں کہ ان کی بدعت حد کفر تک نہیں پہنچی ہے اور نہ ہی یہ روایت ان کی بدعت کی مؤید ہے اب ان روایتوں سے دھوکہ نہ ہوگا کیونکہ بفضلہٖ تعالیٰ ہمارا اسماء الرجال ایسا کامل ومکمل ہے کہ ہر راوی کا حال معلوم ہوجاتا ہے کہ کون کس مذہب کا تھا الاّ نادراً۔ آئندہ کے نقصان سے اس طرح حفاظت ہوسکے گی کہ شیعوں کے ساتھ مناکحت کا جواز یا ان کے ذبیحہ کی حلت اور اسی قسم

---

[1] النجم لکھنؤ، ۷؍شوال ۱۳۴۵ھ

کے بہت سے دوسرے مختلف فیہ مسائل جو اَب تک مسلمانوں کی بربادی کا سبب بن رہے تھے اس عقیدہ کے انکشاف کے بعد انشاء اللہ مٹ جائیں گے۔[1]

فقہی نقطۂ نظر سے مختتم فیصلہ

عقیدۂ تحریفِ قرآن کے انکشاف اور ان کے دیگر عقائد کے جو اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم ہیں افشاء و اظہار سے جو بدیہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس کے بارے میں مولاناؒ نے اپنی رائے کو اس طرح تحریر فرمایا ہے:

"ہمارے فقہاء کرام اس مسئلہ (تکفیر شیعہ) میں مختلف تھے، بعض تو شیعوں کے خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ دیتے تھے کما فی العالمگیریہ وغیرہا اور بعض حضرات اس فتویٰ کو خلافِ تحقیق و احتیاط جانتے تھے کیونکہ جو وجوہ کفر کی بیان کی گئی تھیں مثلاً سبِ شیخینؓ، انکار صحبت حضرت صدیقؓ یا قذفِ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ وغیرہ میں بہت کچھ کلام کی گنجائش تھی۔ ان وجوہ میں بعض تو وہ ہیں جن کا موجب کفر ہونا نظری ہے اور بعض وہ ہیں جن کا قائل شیعوں کا ہر فرقہ نہیں ہے۔ کسی کے کفر کا فتویٰ دینا بڑا نازک کام ہے اس کے لیے نہایت قوی دلائل کی ضرورت ہے۔ کاش ہمارے فقہائے سابقین کو مذہبِ شیعہ کا یہ راز معلوم ہو جاتا اور اس بنیاد پر وہ ان کے خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ دے دیتے تو کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ قرآن مجید کے ایک حرف کا بھی انکار کرنا یا اس میں شک کرنا ایسا کفر صریح ہے کہ اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگر قرآن مجید کا انکار بھی کفر نہ ہو تو پھر کوئی چیز بھی کفر نہ رہے گی۔

یہ ناچیز بھی پیشتر مذہبِ شیعہ کی اس حقیقت سے آگاہ نہ تھا اسی وجہ سے علم الفقہ جلد ششم (مطبوعہ ۱۳۳۰ھ) جو آج سے بائیس سال پہلے کی کتاب ہے اس میں شیعوں سے مناکحت کا جواز لکھا تھا لیکن جب کتب شیعہ پر عبور ہوا اور اس راز پر اطلاع ملی تو اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع کیا مگر یہ رجوع بھی بہ آسانی نہیں ہوا، مدتوں یہ خیال دامنگیر رہا کہ شاید مجھے بیجا تعصب پیدا ہو گیا ہو اس لیے ایسی حالت میں مجھے فتویٰ دینے سے بچنا چاہیے۔ برسوں یہ حالت رہی کہ جب کوئی استفتاء اس معاملے میں میرے پاس آتا تو میں یہ لکھ کر واپس کر دیتا تھا کہ کسی دوسرے عالم سے دریافت کرو میں اپنی رائے کو اس مسئلہ میں متہم سمجھتا ہوں، یہاں تک کہ نورِ توفیق نے حقیقتِ حال کو مثل سفیدۂ صبح کے منکشف کر دیا اور معلوم ہوا کہ جس طرح کسی کلمہ گو کو باوجود

---

[1] النجم، لکھنؤ، ۷ رشوال ۱۳۴۵ھ

احتمالاتِ اسلام کے کافر کہہ دینا جرم ہے اُسی طرح کفر کے موجباتِ قطعیہ کے ہوتے ہوئے اس کو مسلمان سمجھنا بھی (جرم ہے) پھر ہندوستان کے مختلف الخیال علماء سے اس مسئلہ میں محققانہ گفتگوئیں بھی ہوئیں، سب نے میرے ساتھ اتفاق کیا۔ آخرالامر میں نے اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع کیا اور اب میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے سابق فتویٰ اگر کسی کے پاس ہوں یا میری سابقہ تحریرات جن میں شیعوں کا مسلمان ہونا اور ان کے ساتھ مناکحت وغیرہ کا جواز مندرج ہو تو اس کو مسترد سمجھیں۔

یہ بالکل ایسا ہی معاملہ ہے کہ علامہ بحر العلوم فرنگی محلیؒ کو اتفاق سے شیعوں کی تفسیر ''مجمع البیان'' از ابوعلی طبرسی (م ۵۴۳ھ) کہیں سے مل گئی اور ان کو شیعوں کے عقیدۂ تحریف قرآن پر اطلاع ہوگئی تو انھوں نے اپنے سابقہ فتوؤں سے رجوع کرلیا اور اپنی کتاب ''فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت[1]'' میں صاف لکھ دیا کہ تفسیر مجمع البیان کے دیکھنے سے مجھے شیعوں کا یہ عقیدہ معلوم ہوا لہٰذا جو شخص بھی قرآن کے کم ہوجانے کا قائل ہو وہ قطعاً کافر ہے حالانکہ تفسیر مجمع البیان کا مصنف منجملہ ان چار اشخاص کے ہے جو تحریف کے منکر ہیں اور اس نے اس مسئلہ کو بہت ہلکا کرکے دکھایا ہے۔

''علمائے ہندوستان میں صرف ایک ذات ملکوتی صفات حضرت شیخ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی ہے کہ ان پر مذہبِ شیعہ کی یہ حقیقت منکشف ہوئی اور انھوں نے جابجا اپنی کتاب ''ازالۃ الخفاء'' میں اس کو ظاہر بھی فرمایا ہے لیکن چونکہ زیادہ توضیح نہیں فرمائی اس لیے اکثر لوگوں کا ذہن ان کے اصل مفہوم کی طرف نہیں پہنچتا۔ خود یہ حقیر بھی اس تحقیق سے پہلے ان کی مجمل عبارت کے اس مقصد تک پہنچنے سے قاصر رہا[2]۔''

فتویٰ کفر شیعہ اثنا عشریہ

اس طرح جب مولانا لکھنویؒ کو اپنی تحقیقات پر پوری طرح ایقان و وثوق حاصل ہوگیا تو آپ نے اپنی حتمی اور آخری رائے کو چھ صفحہ کے اندر ایک فتویٰ کی شکل میں مرتب کر کے شائع کردیا جس پر اس وقت کے مختلف اکابر علماء اہلسنّت کی تصدیقات بھی شامل تھیں۔ اس فتویٰ کے

---

1. تفصیل کے لیے دیکھیں ''فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت'' علامہ بحر العلوم فرنگی محلیؒ، ص ۶۱۷

2. النجم لکھنؤ، ۷ رشوال ۱۳۴۵ھ

صدور کی سب سے بڑی وجہ یہی عقیدۂ تحریف قرآن ہی ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔
اس فتوٰی کی عبارت تحریر کرنے سے پہلے آپ نے بطور تمہید لکھا تھا:

''بعض برادرانِ دینی کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ اہلسنت بوجہ اپنی ناواقفیت کے شیعوں کو مسلمان سمجھ کر ان کے ساتھ مناکحت سے پرہیز نہیں کرتے جس کے تلخ ترین نتائج سامنے آ کر سوہانِ روح بن رہے ہیں۔ شیعہ لڑکی سنیوں کے یہاں آ کر تقیہ کر لیتی ہے اور پوشیدہ طور پر اپنی اولاد کو اپنا مذہب تعلیم دیتی ہے اور مرتے وقت ظاہر کرتی ہے کہ میں شیعہ ہوں اور سنی لڑکی شیعہ کے گھر پہنچتے ہی طرح طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بن کر مجبور ہو جاتی ہے کہ شیعہ ہو جائے، یہ خرابی علاوہ ارتکاب حرام کے ہے جو ناجائز نکاح کے سبب سے ہوتا ہے، پھر شیعوں کے ہاتھ کا ذبیحہ بھی استعمال کر لیا جاتا ہے اور ان کو جنازہ میں بھی شریک کیا جاتا ہے لہٰذا ان حضرات کا اصرار ہوا کہ علمائے کرام کا ایک متفقہ فتوٰی اس کے متعلق شائع کر دیا جائے تا کہ ان فسادات کا سدّ باب ہو...... اس میں شک نہیں کہ کسی کلمہ گو کو کافر کہنا بہت سخت کام ہے اور علمائے اسلام کو ہمیشہ اس معاملہ میں بڑی احتیاط رہی ہے۔ ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بڑی تاکید کے ساتھ ہدایت کی ہے کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہنا چاہیے مگر اس صورت میں کہ ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا کھلم کھلا انکار اس سے صادر ہو۔ اب عقیدۂ تحریفِ قرآن کے ظاہر ہونے کے بعد شیعوں کی تکفیر میں کسی کو اختلاف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ مسئلہ علمائے مسلمین میں بلا اختلاف مسلّم ہے کہ قرآن مجید کے ایک حرف کا انکار بھی کفر ہے[1]۔''

اس تمہیدی تحریر کے بعد اب ہم اس فتوٰی کی اصل عبارت کو جو آج سے تقریباً ستر سال پہلے دفتر النجم لکھنؤ کی طرف سے شائع ہوئی تھی یہاں نقل کر رہے ہیں یہی فتوٰی دوسری بار ۱۳۴۵ھ میں بھی شائع کیا گیا تھا۔

استفتاء

''کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ شیعہ اثنا عشری مسلمان ہیں یا خارج از اسلام، ان کے ساتھ مناکحت جائز اور ان کا ذبیحہ حلال ہے کہ نہیں؟ ان کے جنازہ کی نماز پڑھنا یا ان کو اپنے جنازہ میں شریک کرنا درست ہے کہ نہیں؟ نیز اگر وہ کسی مسجد کی تعمیر کے لیے چندہ دینا چاہیں تو یہ چندہ لیا جائے یا نہیں؟''

---

[1] علمائے کرام کا متفقہ فتوٰی، ص ۱-۲، مرتبہ حضرت مولانا لکھنوی

الجواب و هوالموفق للصواب

''شیعہ اثنا عشری قطعاً خارج از اسلام ہیں۔ ہمارے علمائے سابقین کو چونکہ ان کے مذہب کی حقیقت کماینبغی معلوم نہ تھی بوجہ اس کے کہ یہ لوگ اپنے مذہب کو چھپاتے ہیں اور کتابیں بھی ان کی نایاب تھیں لہٰذا بعض محققین نے بنابر احتیاط ان کی تکفیر نہ کی تھی مگر آج ان کی کتابیں نایاب نہیں رہیں اور ان کے مذہب کی حقیقت منکشف ہوگئی ہے اس لیے تمام محققین ان کی تکفیر پر متفق ہوگئے ہیں۔ ضروریاتِ دین کا انکار کفر ہے اور قرآن شریف ضروریاتِ دین میں سب سے اعلیٰ وارفع چیز ہے اور شیعہ بلا اختلاف، کیا ان کے متقدمین اور کیا متاخرین، سب کے سب تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ ان کی معتبر کتابوں میں زائد از دو ہزار روایات تحریف قرآن کی موجود ہیں جن میں پانچ قسم کی تحریف قرآن شریف میں بیان کی گئی ہے (۱) کمی (۲) بیشی (۳) تبدُّلِ الفاظ (۴) تبدُّل حروف اور (۵) خرابی ترتیب۔ ترتیب کی یہ خرابی سورتوں میں بھی، آیتوں میں بھی اور کلمات میں بھی ہے۔ ان پانچ قسم کی روایاتِ تحریف کے ساتھ ان کے علماء کے یہ تین اقرار بھی ساتھ میں ہیں کہ (۱) یہ روایات متواتر ہیں (۲) تحریفِ قرآن پر صریح الدلالۃ بھی ہیں اور (۳) انھی کے مطابق اعتقاد بھی ہے۔ علمائے شیعہ میں گنتی کے چار آدمی تحریفِ قرآن کے منکر ہیں۔ شیخ صدوق، ابن بابویہ قمی، شریف مرتضیٰ، اور ابو علی طبرسی مصنف ''تفسیر مجمع البیان'' ان چار اشخاص کے اقوال چونکہ محض بے دلیل اور روایاتِ متواترہ کے خلاف ہیں اس لیے خود علمائے شیعہ نے ان کو رد کر دیا ہے۔ پوری تحقیق اس مبحث کی میری کتاب ''تنبیہ الحائرین'' میں ہے من شاء فلیطالعہ۔ علامہ بحر العلوم فرنگی محلیؒ پہلے شیعوں کے مسلمان ہونے کا فتویٰ دیتے تھے مگر تفسیر ''مجمع البیان'' از ابو علی طبرسی (م ۱۵۳ھ) کے دیکھنے سے ان کو معلوم ہوا کہ وہ تحریفِ قرآن کے قائل ہیں لہٰذا انھوں نے فواتح الرحموت شرح مسلّم الثبوت[1] میں شیعوں کے کفر کا فتویٰ دیا اور لکھا کہ قرآن شریف کی تحریف کا جو قائل ہو وہ قطعاً کافر ہے۔ المختصر شیعوں کا کفر بر بنائے عقیدۂ تحریف قرآن محل تردد نہیں ہے، علاوہ اس کے دوسرے وجوہِ کفر بھی ہیں مثل عقیدۂ بدا اور قذف امّ المومنین (حضرت عائشہؓ) وغیرہ کے مگر ان میں کچھ تاویل کی گنجائش ہے لہٰذا شیعوں کے ساتھ مناکحت قطعاً ناجائز اور ان کا ذبیحہ حرام، ان کا چندہ مسجد میں لینا ناروا ہے۔ ان کا جنازہ

---

1. فواتح الرحموت، ص ۶۱۷

پڑھنا یا ان کو اپنے جنازہ میں شریک کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ ان کی مذہبی تعلیم ان کی مذہبی کتابوں میں یہ ہے کہ سنّیوں کے جنازہ میں شریک ہو کر یہ دعا کرنا چاہیے کہ یا اللہ اس کی قبر کو آگ سے بھر دے اور اس پر عذاب نازل کر۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ افقر العباد محمد عبدالشکور عافاہ مولاہ [1]

اس فتویٰ پر مندرجہ ذیل حضرات اور اس دور کے دیگر اکابر علماء واصحاب فتویٰ کے دستخط ہیں۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہویؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ، حضرت مولانا مفتی مہدی حسن شاہجہانپوریؒ، حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا اصغر حسینؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا محمد رسول خانؒ، حضرت مولانا نبیہ حسنؒ اور حضرت مولانا انوار الحق امروہویؒ اور کچھ عرصہ کے بعد یہ فتویٰ غیر منقسم ہندوستان کے مزید اور بہت سے دوسرے اکابر علماء کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا مگر وہ ہمیں دستیاب نہ ہوسکا۔ اب آخر میں ۱۹۸۷ء میں مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی نے حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے مقدمہ واستفتاء کے ساتھ جو مجموعہ فتویٰ بنام ''خمینی اور اثنا عشریہ کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ [1]'' شائع کیا ہے اس میں بھی یہ پورا فتویٰ شامل ہے۔

حضرت لکھنویؒ کی ان کاوشات اور جدوجہد سے اب الحمدللہ حق وباطل میں امتیاز قائم ہوگیا ہے اور سوائے چند مصلحت کوش، مفاد پرست اور مذہب سے لاتعلق نام نہاد سیکولر افراد کے تمام مسلمان اس فرقہ کے خارج از اسلام ہونے میں متفق ہیں اور اب آپس میں مناکحت اور ذبیحہ وغیرہ کے استعمال سے عام طور پر اجتناب ہونے لگا ہے یہاں تک کہ ان کی مسجدیں اور ان کے قبرستان وغیرہ بھی علیحدہ ہوچکے ہیں۔

---

[1] متفقہ فتویٰ، باہتمام دار المبلغین، لکھنؤ، ص ۳-۸

پچیسواں باب

وفات، تکفین وتدفین اور اولاد واحفاد

زندگی بھر تصنیف وتالیف درس وتدریس، تصحیح عقائد، اصلاحِ باطن اور دین کی تبلیغ واشاعت کی خاطر دن رات سفر کرنے والے مسافر کی منزل بالآخر آ ہی گئی اور تعلق ومحبت رکھنے والوں کو ہمیشہ جس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا وہ وقت قریب آ پہنچا۔ حضرت لکھنویؒ کی عمر نواسی سال کی ہوچکی تھی، ہاتھ پیر بھی پیرانہ سالی کی وجہ سے کانپنے لگے تھے اور ضعف ونقاہت بھی روز بروز بڑھنے لگی تھی مگر اس کے باوجود پوری مداومت کے ساتھ پانچوں وقت مسجد جاکر جماعت میں شریک ہونا اور فجر کے بعد ختم خواجگان میں بڑی پابندی کے ساتھ شرکت کرنا بدستور جاری تھا پہلے کی بہ نسبت اسفار اگرچہ کم ہوگئے تھے لیکن پھر بھی چند مخصوص جگہیں ایسی تھیں جہاں حتی المقدور آخر تک جاتے رہے، دن میں دو ایک بار اعزہ کے گھروں میں بھی آنا ہوتا تھا۔ اس طرح روز مرہ کے معمولات کسی نہ کسی طرح پورے ہو ہی رہے تھے کہ رجب ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں ایک روز دارالمبلغین لکھنؤ کے بالائی حصہ میں جہاں آپ کا قیام رہتا تھا، بیت الخلاء سے اترتے ہوئے گر گئے، اتفاق سے راقم الحروف اور عم محترم مولانا عبدالسلام صاحبؒ قریب ہی میں موجود تھے فوراً دوڑ پڑے، عم محترم اپنے دونوں ہاتھوں پر ان کو اٹھا کر لائے۔ اس وقت تو گرنے کی انھیں تکلیف بہت تھی مگر جب کچھ دیر کے بعد ہوش وحواس درست ہوئے تو بتایا کہ میں قدمچہ پر سے اترتے وقت اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اس لیے پیر پھسل گیا۔

علالت کا آغاز

اس طرح پیر پھسلنے سے علالت کا آغاز ہوا اور پھر یہی علالت آگے چل کر مرض الموت میں

تبدیل ہوگئی۔ گرنے کی وجہ سے گھٹنوں اور پیر کے پنجوں پر چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے اکثر پیروں پر ورم آجایا کرتا تھا جس سے مسجد آنے جانے میں دشواری ہونے لگی تھی اور اکثر وقتوں کی نمازیں قیام گاہ پر ہی مجبوراً پڑھنا پڑتی تھیں جس کی انھیں بڑی اذیت محسوس ہوتی تھی۔ اس چوٹ کا اثر ہڈی تک نہیں پہنچا تھا اس لیے اس کا مقامی طور پر ہی مختلف لوگوں کا علاج ہوتا رہا خاص طور سے حکیم رحیم الدین صاحب ساکن چکمنڈی جو جراحی میں بہت ماہر تھے اور حضرت سے بڑا تعلق رکھتے تھے روزانہ آتے دواؤں کی مالش کرتے اور سینکائی وغیرہ کرتے تھے جس سے کافی راحت ملی اور افاقہ ہوا۔ اس طرح چوٹ کا اثر تو زائل ہوگیا مگر صحت معمول پر نہیں آئی، کچھ نہ کچھ تکلیفیں بدستور لگی رہیں جس سے نقاہت اور کمزوری دن بدن بڑھتی رہی۔ جب کسی دن طبیعت کچھ بحال رہتی تو صاحبزادگان کے گھروں پر بھی تشریف لے جاتے، تھوڑی دیر وہاں بیٹھتے اور خیر و عافیت معلوم کر کے واپس تشریف لے آتے۔ جن دنوں گھر آنا نہیں ہو پاتا تھا تو ان ایام میں گھر کی مستورات اجازت لے کر خود کسی سہولت کے وقت آ کر عیادت کر جاتی تھیں مگر ان کا وہاں آنا آپ کی طبیعت کے خلاف ہوتا تھا اس لیے جلد ہی انھیں رخصت کر دیتے تھے۔ یکم رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ کو روزہ رکھ کر وہ آخری بار اپنی قیام گاہ سے گھر آئے تھے پھر اس کے بعد ان کا آنا نہیں ہوسکا۔ روزہ رکھنے سے بیماری اور کمزوری میں اچانک اشتداد پیدا ہوگیا اور اب تقریباً صاحبِ فراش ہوگئے۔ لکھنؤ کے نامور طبیب حکیم خواجہ شمس الدین صاحب اس علالت کی خبر سن کر خود دیکھنے کے لیے آگئے، معائنہ کیا اور نبض دیکھی تو کمزوری اور نقاہت کافی محسوس کی جس سے انھیں بھی تشویش ہوئی۔ نسخہ تجویز کیا اور منجملہ دوسری دواؤں کے خود اپنا تیار کردہ جواہر مہرہ بھی پیش کیا۔ ان چیزوں نے ایک حد تک تو اثر کیا مگر نئے نئے عوارض پیدا ہوتے رہے جس سے کمزوری و نقاہت اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ ان باتوں کے پیش نظر اربابِ تعلق اور گھر والوں کے بے پناہ اصرار پر روزے کے چھوڑنے پر راضی ہوئے مگر اس کا بہت صدمہ رہا۔ اس عرصہ میں قبض کی شکایت بہت بڑھ گئی تھی، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قبض ہمارا خاندانی مرض ہے۔ اکثر پیروں پر ورم بھی آجاتا تھا اور چہرہ پر تہبج کی کیفیت بھی محسوس ہوتی تھی جس کی بنا پر اطباء نے نمک بند کر دیا تھا جس سے بہت تکلیف محسوس کیا کرتے تھے۔

دنیا سے بے تعلّقی و بے رغبتی

اہل اللہ اور خاصانِ خدا کا جب دنیا سے جانے کا اور لقاء رب کا وقت قریب آتا ہے تو ان کی توجہ دنیا اور متاعِ دنیا سے ہٹ کر صرف حق تعالیٰ جل مجدہٗ کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور ہر آن و ہر لحہ ان پر قرب و معیت کی کیفیت سایہ فگن ہو جاتی ہے، چنانچہ یہی حال آپ کا ہوا۔ تمام مرغوبات سے یک گونہ نفرت پیدا ہو گئی تھی، جن اعزہ سے خصوصی لگاؤ تھا ان سے بھی طبیعت میں بعد پیدا ہو گیا تھا چنانچہ اگر کسی ایسے فرد کے بارے میں پوچھا جاتا کہ انھیں آپ کی علالت کی اطلاع کر کے بلوالیں تو سختی سے منع فرما دیتے تھے۔ کسی قسم کی کوئی فرمائش یا کوئی خواہش نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب اپنے آپ کو سفر آخرت کے لیے بالکل تیار کر چکے تھے اور اب ہمہ تن مشتاق و منتظر رہتے تھے کہ کب وہاں سے حکم آئے اور یہ مسافر راہ حق اپنے آخری سفر پر روانہ ہو جائے۔ حالات کا اندازہ سب ہی کو ہو رہا تھا چنانچہ صاحبزادوں میں حضرت مولانا عبدالمومن صاحبؒ اور مولانا عبدالمہیمن صاحبؒ نے آغاز رمضان ہی سے دارالمبلغین میں آپ کے قریب رہنا شروع کر دیا تھا۔ حضرت مولانا عبدالسلام صاحبؒ نے بیرونی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لی تھیں۔ اطباء و معالجین سے رابطہ رکھنا اور عیادت و مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کی رہنمائی و دیکھ بھال انھیں کے ذمہ تھی۔ اس طرح ان تینوں بھائیوں نے پوری طرح خدمت کر کے اپنی آخرت سنوار لی تھی۔ چونکہ طاقت روز بروز جواب دیتی جا رہی تھی اور ہاتھ پیر بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہے تھے اس وجہ سے رفعِ حاجت کے لیے قریب ہی میں چوکی لگا دی گئی تھی مگر اب اس تک لے جانے میں بھی بڑی دقّت پیش آتی تھی۔ مگر بھلا ہو اخلاص و محبت رکھنے والے تیمارداروں کا جنھوں نے ہر مشکل سے مشکل کام کو بڑے سلیقہ اور صفائی و ستھرائی کے ساتھ انجام دیا۔ آپ اپنے علاج سے ہمیشہ ناخوش رہتے تھے اسی لیے جب تک کچھ بھی طاقت رہی دواؤں سے بچتے رہے۔ لیکن پھر مخلصین اور اہلِ تعلق حضرات کے اصرار سے علاج کی اجازت دے دی مگر خواہش و کوشش یہی رہتی تھی کہ دیندار اطباء کا علاج رہے کیونکہ ایلوپیتھک دواؤں اور انجکشن وغیرہ کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے اور ان کی شرعی طہارت کی طرف سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ آپ کے معالجین میں جن حضرات نے بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ حصہ لیا تھا ان میں شفاء الملک

حکیم عبدالمعید، حکیم خواجہ شمس الدین، ڈاکٹر عبدالحمید سابق سول سرجن لکھنؤ اور ڈاکٹر کے، ایل، ناٹو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ تیمارداری اور آخری خدمات کے سلسلہ میں صاحبزادوں اور اعزہ کے علاوہ الحاج غلام حسنین صاحب لکھنویؒ، مولانا مغیث الدین الہ آبادی، حاجی بشیر الدین لکھنویؒ، حافظ صدرالدین سلطانپوری، حاجی محمد حامد محمود آبادی اور خادم عمر محمود آبادی وغیرہ نے اپنی محبت، عقیدت اور خدمت کا بے پناہ ثبوت دیا۔

عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

جس ناگزیر وقت کے لیے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا اور جس خبر کے سننے کے لیے دل و دماغ تیار نہ تھا وہ وقت اب قریب تر آ پہنچا تھا۔ بیماری میں جوں جوں شدّت بڑھتی گئی شہر اور بیرونِ شہر کے اعزہ، احباب، متوسلین اور معتقدین کی آمد میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ یہ تعداد بعض دنوں میں سیکڑوں تک جا پہنچی تھی۔ وفات سے تقریباً دو ہفتہ پہلے ایک دن اچانک طاقت گویائی ختم ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ حس و حرکت اور ہوش و حواس بھی معطل ہوگئے اور اب گویا کوما کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس پورے عرصہ میں عیادت کرنے والوں کا لامتناہی سلسلہ قائم تھا، لوگ آتے، تھوڑی دیر بیٹھتے اور چلے جاتے پھر ان کی جگہ دوسرے آجاتے، ان میں شہری عوام کے علاوہ علماء، ادباء، حفاظ، قراء، اساتذہ اور مسترشدین وغیرہ سبھی شامل تھے، اس حالت بیہوشی میں کسی قسم کی غذا یا دوا نہیں دی جاسکی البتہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد زمزم کی کچھ مقدار چمچوں سے ضرور دی جاتی رہی جو حلق سے اتر بھی جاتی تھی۔ چہرہ پر انتہائی بشاشت، سکون اور وقار تھا اور بیماری کی ادنیٰ سی بھی کوئی کلفت محسوس نہ ہوتی تھی۔ سارا جسم خاموش ہو چکا تھا مگر دل جاگ رہا تھا جس سے پورے ماحول پر ایک قابلِ غبطہ سکینہ نازل ہو رہا تھا۔ آخر کار قضا و قدر کا حکم آ پہنچا اور ۷ار ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق ۲۳ر اپریل ۱۹۶۲ء بروز دوشنبہ بعد نماز عصر ۶ بج کر بیس منٹ پر روح قفس عنصری سے پَرواز کرگئی۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون.

وصال کے وقت آپ کا پلنگ دارالمبلّغین کے بالائی مشرقی کمرہ کے مغربی در میں تھا جو بعد نماز مغرب صحن میں لاکر رکھ دیا گیا۔ وفات کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی، آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے بھی وفات کی خبر نشر ہو چکی تھی جس سے دوسرے قریبی شہروں سے لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔ شہر کے مختلف محلّوں میں لوگوں نے اپنے طور پر وفات کا اعلان کرانا شروع کردیا۔

دارالمبلغین کی عمارت، محلّہ کی سڑک اور گلیاں لوگوں سے بھر گئیں، مجبوراً فیصلہ کرنا پڑا کہ تدفین کے انتظامات صبح کیے جائیں گے۔ اعزہ کی رائے تھی کہ جنازہ کاکوری لے جایا جائے اور اسی باغ میں تدفین عمل میں لائی جائے جہاں اس سے قبل خود آپ نے اپنے کئی قریبی عزیزوں کو دفن کیا تھا مگر شہر کے اہل تعلّق حضرات کا اصرار تھا کہ تدفین لکھنؤ میں کی جائے بالخصوص محلہ چکمنڈی (مولوی گنج) کے حضرات اپنے محلّہ میں چاہتے تھے جہاں سے آپ کو خصوصی لگاؤ تھا اور وہاں بھی آپ اپنے کئی اعزہ کو اپنے ہاتھوں دفن کر چکے تھے۔ چنانچہ اسی رائے پر اتفاق ہو گیا۔

غسل وتکفین

نماز فجر سے قبل جنازہ کو لا کر اس دالان میں رکھا گیا جو کمرے اور زینے کے درمیان واقع تھی۔ اب یہ دالان ایک کوٹھری میں تبدیل کر دی گئی ہے جس میں مدرسہ کا فاضل سامان رکھا جاتا ہے۔ غسل دینے کے لیے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدیر الفرقان لکھنؤ تشریف لا چکے تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ خصوصی شرف عنایت فرمایا ہے کہ انھوں نے بہت سے مشاہیر علماء و مشائخ کو اپنے ہاتھوں غسل دیا ہے، غسل میں مدد دینے والوں میں مولانا عبدالسلام صاحبؒ، مولانا عبدالمومن صاحبؒ، مولانا عبدالمہیمن صاحبؒ اور مولانا بشیر حسن صاحبؒ کے علاوہ دوسرے حضرات بھی شامل تھے۔ اس طرح غسل وکفن دے کر دارالمبلغین کے نیچے والے صحن میں جنازہ لا کر اور چہرہ مبارک کھول کر رکھ دیا گیا، تمام مجمع کو قطار بنا کر زیارت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس دن کتنوں نے آکر آخری زیارت کی تھی۔ اس موقع کی منظر کشی کرتے ہوئے مولانا علیم اللہ صاحب نوری حسینی تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس وقت کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جو پھوٹ پھوٹ کر نہ رو رہا ہو، دیکھنے سے بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حضرت سو رہے ہیں، چہرہ کی چمک کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس وقت وہاں موجود تھے، غرضکہ چہرہ اور آنکھوں وغیرہ کے دیکھنے سے یہ کسی طرح سے یقین نہیں ہوتا تھا کہ حضرت اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، چہرہ مبارک خود بخود قبلہ کی جانب ہو گیا تھا۔ داڑھی اور سر کے بالوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ آسمان سے نور کی بارش ہو رہی ہے۔''[1]

---

[1] ہفت روزہ ''حرم'' لکھنؤ، امام اہل سنت نمبر، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

نماز جنازہ اور تدفین

ٹھیک سوا سات بجے صبح جنازہ دارالمبلغین سے روانہ ہوا، مجمع کی کثرت نے کسی انتظام کو پورا نہیں ہونے دیا۔ پلنگ اٹھانے کے لیے بلّیاں باندھی گئیں مگر مجمع کی کثرت کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، تقریباً ایک میل لمبے راستے میں عورتوں اور مردوں کے سروں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ شریک جنازہ تھے۔ جنازہ کا یہ سفر دارالمبلغین سے شروع ہو کر ڈیوڑھی آغا میر کے چوراہے سے گزر کر رکاب گنج کے پُل پر آ کر مولوی گنج سے ہوتا ہوا امین آباد کی طرف روانہ ہوا۔ اس تمام راستے پر سوائے غمزدہ ہجوم کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا، جنازہ منتظمین کے ہاتھوں سے نکل کر مجمع کے ہاتھوں اور سروں سے گذر رہا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک پھول سمندر کی لہروں میں گھرا ہوا اِدھر سے اُدھر تیر رہا ہو۔ جوں جوں جنازہ آگے بڑھتا جاتا مجمع بے قابو ہوتا جاتا تھا۔ راستہ میں تمام بسیں، موٹریں، رکشے اور یکے وتانگے چلنا بند ہو گئے تھے۔ اس طرح یہ راستہ کسی نہ کسی طرح تقریباً تین گھنٹہ میں طے ہوا اور پھر لکھنؤ کے مرکزی اور وسیع علاقہ امین آباد پارک میں پہنچ کر نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا جہاں صفوں کی درستگی کے بعد حضرت کے بڑے صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحبؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، مجمع اس قدر زیادہ ہو چکا تھا کہ پارک کے بھر جانے کے بعد چاروں طرف کی سڑکیں بھی بھر گئی تھیں پھر بھی ہزاروں لوگ نماز سے محروم رہ گئے۔ نماز کے بعد امین آباد پارک سے مولوی گنج کی طرف سے جنازہ کو چکمنڈی لایا گیا اور مزار چپ شاہ میاں کے احاطہ میں ہجوم کی کثرت کی وجہ سے صدر دروازہ سے داخل نہ ہو کر پشت کی طرف جنوبی دیوار توڑ کر پہنچایا گیا۔ اس احاطہ میں جہاں آپ خود اپنے ہاتھوں اپنے ایک بھائی ایک صاحبزادہ اور ایک پوتے کو دفن فرما چکے تھے آج وہیں اس آفتاب علم و معرفت کو بھی سپرد خاک کیا جا رہا تھا۔ احاطہ کے درمیان میں قبر تیار کی گئی تھی۔ مولانا عبدالسلام صاحبؒ اور مولانا عبدالمومن صاحبؒ نے قبر میں اتر کر بعض دوسرے اعزہ اور خدام کی مدد سے آپ کو بہ چشم گریاں قبر میں اتارا اور تختے لگائے، پہلے اعزہ کو مٹی دینے کا موقع دیا گیا اس کے بعد عوام کو اجازت دی گئی، پورے تین دن اور تین راتوں تک برابر لوگ آتے رہے اور مٹی دیتے رہے، ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے وہ جرنیل گنج، گونڈہ، سلطانپور، فیض آباد، سیتاپور،

بہرائچ، بارہ بنکی، اناؤ، کانپور، رائے بریلی اور دیگر مقامات سے لکھنؤ پہنچ رہے تھے۔

اس طرح حضرت مولانا دنیا سے تشریف لے گئے مگر اپنے پیچھے ہزاروں ہزار دل شکستہ اور غمزدہ عقیدت مندوں کی ایک دنیا چھوڑ گئے۔ اپنی علمی اور دینی یادگار کے طور پر دارالمبلغین جیسا بہترین ادارہ، اپنی تصنیفات و تالیفات، النجم کے قیمتی نادر اور مفید مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ، عظیم الشان کتب خانہ، شہدائے اسلام کے پندرہ روزہ جلسے اور پھر سب سے بڑھ کر تحفظ ناموس صحابہ کا ایک زندہ وجاوید مشن آپ ملتِ اسلامیہ کے سپرد کر گئے جو انشاء اللہ ان کے لیے ہمیشہ صدقۂ جاریہ کے طور سے کام آئے گا۔ آپ طبعاً بڑے حلیم، بردبار، صابر اور مرنجا مرنج تھے۔ سنت کے حریص اور فرائض کے سختی سے پابند تھے۔ جن لوگوں کی ظاہری شکل وصورت اور لباس ووضع خلافِ شریعت ہوتی یا اعمال ٹھیک نہ ہوتے تو ان سے ہمیشہ ناراضگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ دنیا سے رغبت بہت کم تھی، مال ودولت جمع کرنے یا جائیدادیں خریدنے کا کبھی شوق نہیں ہوا، سوائے چند بیگھے زمین اور آبائی مکان کے کوئی چیز اپنے بعد نہیں چھوڑی۔ وفات کے بعد ان کی استعمالی اشیاء کو جمع کیا گیا تو ایک ٹوٹا ہوا بے تالے کا بکس، چار جوڑے کپڑے، دو عمامے، دو صدریاں، ایک جوڑ نیا جوتا اور تھوڑے سے لکھنے پڑھنے کے سامان کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ وفات کے وقت آپ کے چار بیٹے، ان کی بیویاں، دو بیوہ بہویں، بارہ پوتے، پندرہ پوتیاں اور پوتے پوتیوں کی دس اولادیں موجود تھیں۔ ایک اکیلی چہیتی بیٹی، چار بیٹے اور ایک کمسن پوتے میاں عبدالہادی کا آپ کی زندگی میں انتقال ہو چکا تھا۔ ان چار بیٹوں میں دو بیٹے عبدالرؤف (م ۱۹۰۸ء) اور عبدالرب (م ۱۹۲۱ء) نے صغرسنی میں وفات پائی تھی۔ باقی دو بیٹے مولانا عبدالغفور صاحبؒ اور مولانا عبدالعزیز صاحبؒ صاحبِ اولاد ہو کر دنیا سے تشریف لے گئے۔۔۔ اب ہم آپ کی ان اولادوں کے حالات کچھ تفصیل سے ذکر کریں گے جو بڑے ہو کر صاحب اولاد ہوئے اور پھر انھی سے آپ کی نسل چلی۔

مولانا حافظ محمد عبدالغفور صاحب فاروقیؒ (۱۹۰۲ء-۱۹۳۵ء)

مولانا مرحوم کی پیدائش ۱۹۰۲ء میں کاکوری میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی کاکوری ہی میں ہوئی پھر لکھنؤ آ کر حافظ قاری عبدالصمد صاحبؒ سے قرآن مجید حفظ کیا، فارسی اور عربی کی کچھ ابتدائی

کتابیں اپنے والد ماجد حضرت لکھنویؒ سے پڑھیں۔ باقی درسیات کا کچھ حصہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے مختلف اساتذہ سے پڑھا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ السنۂ شرقیہ سے فارسی اور عربی کے بعض امتحانات امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیے، اس کے بعد اپنے چھوٹے بھائی مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ کے ساتھ مدرسہ امدادیہ مرادآباد تشریف لے گئے جہاں ایک سال تک قیام رہا۔ مرادآباد ہی کے قیام کے دوران صحت خراب ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ لکھنؤ لوٹ آئے، پھر دو تین بار بغرض تعلیم آپ کو لکھنؤ سے باہر بھیجا گیا مگر باہر جا کر آپ کی صحت ساتھ نہیں دیتی تھی اور مجبوراً واپس آجانا پڑتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم نامکمل رہ گئی۔

۱۹۳۰ء میں ہریش چند ہائی اسکول لکھنؤ میں جو بعد میں کالج بھی ہوگیا فارسی کے استاذ مقرر ہوئے۔ آپ کی یہ ملازمت سال وفات تک جاری رہی، وہاں کے اساتذہ اور ذمہ داران آپ کے اخلاق اور علمی لیاقت کے بہت معترف تھے، چنانچہ جب آپ کی وفات ہوئی تو وہ سب لوگ تعزیت میں گھر پر آئے اور جو تعزیتی تجویز پاس کر کے لائے تھے اس میں آپ کے جملہ اوصافِ حمیدہ اور علمی صلاحیت کا بجا طور پر اعتراف کیا گیا تھا۔ طبعاً انتہائی نیک، عابد و زاہد اور رقیق القلب تھے۔ قرآن مجید کے نہایت عمدہ حافظ تھے۔ تراویح میں ہر سال کئی قرآن مجید سنانے کا معمول تھا، تقریر بھی کرتے تھے مگر وہ بہت مختصر اور جامع ہوتی تھی۔ تسخیر اجنّہ اور عملیات میں بھی کافی مہارت تھی، اس سلسلہ میں لوگ آپ کے بہت معتقد تھے اور قیام گاہ پر بڑا ہجوم رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے آپ کے ہاتھوں ہر ایک کا کام بن جاتا تھا۔ مشہور تھا کہ جو زبان سے کہہ دیتے تھے ہو جاتا تھا۔

۱۹۲۳ء میں کاکوری میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ آپ کا عقد ہوا تھا جن سے دو بیٹے پیدا ہوئے، بڑے بیٹے مولانا عبدالاوّل صاحب فاروقیؒ تھے جو ۱۹۲۷ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے ان سے چھوٹے عبدالنور رتھے جن کا ۱۹۳۴ء میں صغر سنی ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔

مولانا عبدالاوّل صاحب نے مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں حافظ معصوم علی صاحب سے حفظ قرآن مجید کیا اور پھر فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں بھی وہیں کے مختلف اساتذہ سے پڑھیں، اس کے بعد آپ کو مدرسہ عالیہ عربیہ چلّہ امروہہ ضلع مرادآباد بھیج دیا گیا جہاں درسیات کا بڑا حصہ مکمل کیا۔ دورۂ حدیث کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے

کی۔آپ کی پوری تعلیم وتربیت اپنے جدّ امجد حضرت لکھنویؒ کی زیر نگرانی ہوئی تھی۔کیونکہ والد ماجد کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔آپ بہت عمدہ حافظ تھے، ہر سال پابندی کے ساتھ تراویح میں قرآن مجید سُنانے کا معمول تھا۔خاندانی ذہانت انھیں ورثہ میں ملی تھی۔درسیات پر پورا عبور حاصل تھا اسی لیے نہایت کامیاب مدرس تھے۔دھولیہ (مہاراشٹر) اور سلطانپور (یوپی) کے مدارس میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد دارالمبلّغین میں استاذ مقرر ہوگئے تھے مگر زندگی کے آخری چند برسوں میں وہاں سے علیحدگی اختیار کرکے دوسرے علمی کاموں میں مصروف ہوگئے تھے، شعروسخن سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔خود بھی خوب کہتے تھے اور دوسروں کے کلام کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ انھیں یاد تھا۔دینی جلسوں کے مقبول مقرر تھے اور اس سلسلہ میں دور دور بلائے جاتے تھے۔تقریروں میں بھی برمحل اشعار بہ کثرت پڑھتے تھے اور لوگ پسند کرتے تھے۔ تقریر کے ساتھ انھیں تحریر سے بھی دلچسپی تھی۔دارالمبلّغین کے ترجمان پندرہ روزہ 'ندائے سنّت' میں انھوں نے تحریک مدح صحابہ کی تاریخ مرتب کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور اس کی چند قسطیں شائع بھی کی تھیں مگر اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باعث اسے مکمل نہیں کرسکے۔اس کے علاوہ ان کے مرتّبہ دو رسالے 'سیّدنا حسینؓ' اور 'بزرگانِ دین' بھی نظر سے گذرے ہیں جو اُن کے تصنیفی اور علمی ذوق کے آئینہ دار ہیں۔

مولانا عبدالاوّل صاحبؒ کا پہلا عقد گونڈہ میں حکیم عبدالباری انصاری مرحوم کے یہاں ہوا تھا جن سے دو بیٹے عبدالاعلیٰ فاروقی اور عبدالوالی فاروقی پیدا ہوئے جو بحمداللہ موجود ہیں۔ان اہلیہ صاحبہ سے عدم توافق طبع کی وجہ سے زیادہ دنوں نباہ نہ ہوسکا چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد کاکوری کے اپنے خاندان ہی میں دوسرا عقد ہوا جن سے چار بیٹے، عبدالباقی فاروقی، عبدالخالق فاروقی، عبدالرزاق فاروقی اور عبدالغفار فاروقی پیدا ہوئے۔یہ بھی بحمداللہ موجود ہیں۔مولانا عبدالاوّل صاحب مرحوم نے زیادہ عمر نہیں پائی چند ماہ علیل رہ کر جنوری ۱۹۹۲ء میں اس دنیائے ناپائیدار سے رخصت ہوکر مالکِ حقیقی سے جاملے۔آپ کی تدفین بھی چکمنڈی کے احاطہ میاں چپ شاہ میں عمل میں آئی۔

مولانا عبدالغفور صاحبؒ کا وصال بھی جوانی ہی میں ہوا۔۸/شعبان المعظم ۱۳۴۵ھ کو بخار آیا جو آناً فاناً بڑھتا گیا اور پھر اسی میں سرسامی کیفیت پیدا ہوگئی۔چنانچہ ایک دن اسی عالم میں

اپنے والد ماجد حضرت لکھنویؒ سے جو سرہانے ہی بیٹھے تھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''ابا! ابا! دیکھیے یہ کون لوگ ہیں جو یہ پڑھتے ہوئے جا رہے ہیں۔ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا. حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ۔[1]''

والد ماجد نے فرمایا:

ہاں ہاں بیٹے! یہ تمھیں صحت کی خوشخبری دی جا رہی ہے۔

آپ کے انتقال کے بعد حضرت لکھنویؒ نے گھر والوں سے کہا کہ یہ آیت ان کی موت اور پھر موت کے بعد ان کی مغفرت کی بشارت کے طور پر انھیں سُنائی جا رہی تھی اور مجھے اس سے احساس بھی ہو گیا تھا کہ وقت موعود آ چکا ہے مگر اس وقت اس کا اظہار کرنا مناسب نہ تھا۔ چنانچہ ۱۴ر شعبان ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو آپ کی اسی علالت میں وفات ہو گئی جنازہ کاکوری لے جایا گیا اور اسی باغ میں جہاں ان کے دادا مولوی حافظ ناظر علیؒ اور والدہ محترمہؒ پہلے سے دفن تھیں وہیں آپ کو بھی دفن کر دیا گیا۔

حضرت مولانا حافظ محمد عبدالسلام صاحب فاروقیؒ (۱۹۰۷ء-۱۹۷۳ء)

آپ کی پیدائش ۱۹۰۷ء میں اپنے آبائی وطن کاکوری ضلع لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتداءً تعلیم کا آغاز گھریلو طور پر ہوا، پھر ہوش سنبھالنے کے بعد مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں لا کر داخل کر دیئے گئے، وہاں آپ نے مشہور و معروف استاذ حافظ قاری عبدالصمد صاحبؒ اور حافظ غلام رزّاق صاحبؒ سے قرآن مجید حفظ کیا۔ تجوید کی تعلیم اور مشق شیخ القراء قاری عبدالمالک صاحبؒ سے کی۔ حفظ و قرآت سے فراغت کے بعد متوسطات اور بعض علیاء کی کتابیں لکھنؤ میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا لکھنویؒ، اپنے چچا حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب فاروقیؒ اور مولانا سیّد علی زینبی امروہویؒ سے پڑھیں۔ اسی عرصہ میں شعبۂ السنۂ شرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی کے بعض امتحانات میں

---

[1] (ترجمہ) اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کو گروہ گروہ بنا کر بہشت کی طرف لے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تو اس کے داروغہ ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام ہو اور تم بہت اچھے رہے، اب اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔ سورۂ زمر: ۷۳ (ترجمہ مولانا فتح محمد خاں جالندھریؒ)

بھی شرکت کر کے اعلیٰ نمبرات سے کامیابی حاصل کی تھی۔ایک سال تک اپنے بڑے بھائی مولانا حافظ عبدالغفورؒ کے ساتھ مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی جہاں مولانا سیّد مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ بھی آپ کے استاذ تھے پھر وہاں سے مدرسہ عالیہ عربیہ امروہہ ضلع مراد آباد آگئے۔ کچھ عرصہ کے بعد والد ماجدؒ نے آپ کو مظاہر علوم سہارنپور بھیج دیا۔ جہاں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اور بعض دیگر اساتذہ سے کسب علم کیا—اس کے بعد دو سال کے لیے آپ دارالعلوم دیوبند آگئے جہاں ۱۹۳۰ء میں آپ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔حضرت مدنیؒ کے علاوہ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں جن اساتذہ سے استفادہ کیا تھا ان میں حضرت میاں اصغر حسین صاحبؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے اسماء گرامی خاص طور سے لائقِ ذکر ہیں۔بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والدِ ماجد سے فن مناظرہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھ کر اس کی مکمل تربیت بھی حاصل کی تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انجمن اسلامیہ گورکھپور کے مدرسہ میں جو اس زمانہ میں مشرقی یوپی کی مشہور دینی درسگاہ تھی، درس دینا شروع کیا جس کا سلسلہ ۱۹۳۶ء تک چلتا رہا۔اس دور کے شاگردوں میں تبلیغی جماعت کے مشہور بزرگ و عالم حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاویؒ اور مشرقی یوپی کے مشہور طبیب حکیم وصی احمد گورکھپوریؒ قابلِ ذکر ہیں۔اس دوران لکھنؤ میں دارالمبلّغین کا قیام عمل میں آچکا تھا چنانچہ بانی مدرسہ حضرت لکھنویؒ نے ۱۹۳۶ء میں آپ کو لکھنؤ بلاکر دارالمبلّغین میں تدریس کی ذمہ داری سپرد کردی جہاں ایک وقت وہ آیا جبکہ انھوں نے اپنی پیرانہ سالی کے پیشِ نظر آپ کو مہتمم مدرسہ و صدرالمدرسین مقرر کر کے اپنے کو سُبک دوش کرلیا۔

مولانا عبدالسلام صاحبؒ نے اپنی ساری زندگی دارالمبلّغین کی خدمت میں گذار دی۔اور بانی مدرسہ کی زیر سرپرستی ہر طرح کی تدریس میں بھرپور حصہ لیا اور پورے انہماک و دل جمعی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دیئے۔آپ کے اس طویل تدریسی دور میں جن مشاہیر نے دارالمبلّغین میں آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا ان میں سے چند حضرات یہ ہیں۔

مشہور مناظر مولانا لال حسین اختر پاکستان، مولانا انصار الحق امروہویؒ سابق شیخ الحدیث

مدرسہ عالیہ چلّہ امروہہ، مولانا عبدالحق صاحب مؤلف اشرف السوانح، مولانا عبدالحق غازی پوری سابق پیشکار دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد حسین بخاری پاکستان، مولانا سید نورالحسن بخاری پاکستان، مولانا قاری محمد صدیق لکھنویؒ، مولانا کلیم اللہ الہ آبادیؒ، مولانا سید ہدایت جہاں بستوی، سابق مبلّغ دارالعلوم دیوبند، مولانا نبی رحم بستوی، مولانا محمد سلیمان خیرآبادی اعظمی سابق شیخ الحدیث بیت العلوم مالیگاؤں، مولانا عبدالسلام زید پوری سابق شیخ الحدیث مدرسہ مدینۃ العلوم رسولی، بارہ بنکی، مولانا محمد عمر مبارکپوری، مولانا محمد یحییٰ مبارکپوری، مولانا کلیم اللہ بہرائچی، مولانا مجید الدین آثر زبیری، مولانا حکیم عبدالباری شاد بہرائچی، مولانا بلا آلی علی آبادی، مولانا مبین الحق صاحب فتح پوری شیخ الحدیث جامع العلوم کانپور، مولوی قاری عبدالرزّاق گونڈوی، ردشیعیت کے سلسلہ میں ممتاز عالم دین اور مبلّغ مولانا عبدالستار تونسوی پاکستان، مولانا جمال الدین غازی پوری، مولانا بشیر حسن لکھنوی، مولانا محمد حنیف آروی، مولانا حکیم الطاف حسین غازی پوری، مولانا نجم الدین احیائی مبارکپوری، مولانا سمیع الدین تمبوری سیتاپوری، اور مولانا ولی محمد صاحب سیتاپوری۔

حضرت لکھنویؒ کی حیات تک دارالمبلّغین میں مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل طلباء کو مناظرہ اور مختلف مذاہب ومسالک کے تقابلی مطالعہ کی تعلیم وتربیت دی جاتی تھی۔ مگران کے بعد جب مدرسہ کی ساری ذمّہ داری آپ کے سپرد ہوئی تو آپ نے اپنے رفقاء کے تعاون سے مدرسہ کی اس بنیادی خصوصیت کو بدستور باقی رکھتے ہوئے کچھ جدید شعبہ جات بھی کھولے تاکہ دارالمبلّغین کی برکات وخدمات کا دائرہ اور وسیع ہوجائے چنانچہ جب ۱۹۶۱ء میں مدرسہ میں ایک نئی شاخ 'خزینۃ العلوم' کے نام سے قائم کی گئی اور اس میں درس نظامی کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا اور حفظ وناظرہ کے درجات کا بھی اضافہ کیا گیا تو اہلِ محلّہ واہلِ شہر اور آس پاس کے علاقے کے لوگوں کو بہت فیض پہنچا اور معصوم بچّوں کے ذریعہ کتاب اللہ کی دلنواز تلاوت سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ آپ کے دَور میں اس سے دارالمبلّغین کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آئی۔ طلباء واساتذہ کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اقامتی طلباء کی تعداد بڑھنے سے مدرسہ کی طرف سے باقاعدہ مطبخ کا بندوبست کیا گیا۔ اس طرح دارالمبلّغین کی وہ عمارت جس میں مدرسہ قائم تھا اور خود حضرت لکھنویؒ نے جس میں اپنی حیات کے آخری تیس پینتیس سال گذارے تھے ناکافی محسوس ہونے

لگی لہٰذا مخلصین کی خواہش و اصرار پر احاطہ شیخ شوکت علی کو جہاں سے حضرت لکھنویؒ نے اپنی پوری تحریک کا آغاز کیا تھا، خریدنے کا بندوبست کیا گیا۔ مگر افسوس آپ کی زندگی میں یہ معاملہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔

مولانا عبدالسلام صاحب علیہ الرحمۃ انتہائی ذہین اور بے باک شخصیت کے مالک تھے، نمود ونمائش، ظاہری شان وشوکت اور عالمانہ تام جھام سے کوسوں دور تھے۔ بے حد سادگی پسند، انتہائی منکسرالمزاج اور ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہونے کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ یہ سب خوبیاں کیوں نہ ہوتیں۔ جبکہ آپ کے والد ماجد حضرت لکھنوی قدس سرہٗ خود بھی آپ کے لیے یہ دعا فرما گئے تھے:

''میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو اگر پدر نتواند پسر تمام کند کا مصداق بنادے۔ آمین[1]''

مضبوط اور گٹھے ہوئے صحت مند جسم پر ململ کا لمبا کرتہ اور مردانی شلوار جس کو ہمارے عرف میں 'شرعی پاجامہ' کہتے ہیں، پیروں میں ہلکا پھلکا سیاہ یا کتھی رنگ کا جوتا اور سر پر دوپلّی ٹوپی یہ آپ کا عمومی حلیہ تھا۔ سردیوں میں کبھی کبھی عمامہ اور صدری بھی استعمال کرتے تھے، ہمیشہ ہر موسم میں نماز فجر سے پہلے ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کا معمول تھا۔ چہرہ پر علم وفضل، تقویٰ وطہارت، انابت الی اللہ اور سِیمَاھُمْ فِی وُجُوْھِھِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ کی تابانی بدرجۂ اتم تھی۔ سنّت نبویؐ کی اتباع میں اپنے گھر کا بیشتر کام خود انجام دیتے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے اعزاء اقرباء کے گھروں میں جا کر ان کے کاموں کو بھی اپنے ذمہ لے لیتے تھے۔ اپنے وقت کے جیّد حافظ تھے اور بہت اچھی صحت وہمّت کے مالک تھے، اس لیے عموماً ہر سال رمضان المبارک میں چار قرآن مجید تراویح کے اندر مختلف مساجد میں سُناتے تھے۔ ان کے عزم وارادہ اور عالی ہمّتی کے سامنے اچھے اچھے نوجوان پس پشت ہوجاتے تھے، وہ اپنے تمام معاملات میں رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کرتے تھے۔ اس طرح علم وعمل کے ہر میدان میں وہ اپنے والد کے عظیم بیٹے ثابت ہوئے اور ان کی نیابت وجانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کئی بار اپنے والد کی معیت میں سفر حج کی سعادت بھی عنایت فرمائی تھی۔ جہاں انوارِ الٰہی، فیضانِ رسالت اور برکاتِ صحابہ وتابعین سے اپنے دامن مراد کو مالا مال کیا تھا۔

---

[1] کتاب الاحکام برائے دار المبلغین لکھنؤ، مخزونہ مدرسہ ہٰذا، ص ۳۱

والدگرامی کی وفات کے بعد اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے اہلِ سنّت کے مسائل کو سلجھانے کی ذمہ داری اور دینی حلقوں کی رہنمائی آپ کے سپرد ہوئی جسے آپ نے بڑی خیر و خوبی، دور اندیشی تحمل و بردباری اور عزم واستقلال کے ساتھ انجام دی۔ آپ تشدد اور ٹکراؤ کے خلاف تھے اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں حزم واحتیاط، غور و تدبّر اور صبر و برداشت سے کام لیتے تھے۔ عوامی خدمت اور اہل شہر کی معاونت کا جذبہ بھی آپ میں بے حد تھا چنانچہ ۱۹۶۰ء اور پھر ستمبر ۱۹۷۱ء میں جب لکھنؤ میں دریائے گومتی میں سیلاب آیا جس میں شہر کا ایک بڑا حصہ زیر آب ہوگیا اور لاکھوں لوگ بے گھر و بے در ہوگئے اس موقع پر آپ نے دارالمبلّغین کی جانب سے ٹیلہ شاہ پیر محمدؒ پر ایک ریلیف کیمپ قائم کیا جہاں سے ہزاروں لوگوں کو روزانہ کھانے، کپڑے اور دواؤں کی شکل میں امداد بہم پہنچائی جاتی تھی۔ اسی موقع پر وزیر اعلیٰ یوپی اور ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بھی سیلاب زدہ لوگوں کی امداد کے لیے لکھنؤ آئی تھیں اور انھوں نے بچشم خود دارالمبلّغین کے ریلیف کیمپ کو دیکھ کر حضرت مولانا عبدالسلام صاحب کے عوامی جذبۂ خدمت کو خراج تحسین پیش کیا تھا اور یہ الفاظ کہے تھے:

> "یہ کام ہمارا (حکومت کا) تھا جس کو ایک مذہبی ادارہ نے اس حسن و خوبی سے انجام دیا کہ حکومت کی پوری مشنری بھی انجام نہ دے پاتی[1]۔"

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں آپ کسی رُو رعایت کے قائل نہ تھے، اور ہر موقع پر حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ امر حق کو واضح کر دیتے تھے۔ آپ کی خدمات میں سب سے زیادہ لائقِ ذکر چیز دارالمبلّغین کی بقا اور اس کی ترقی ہے۔ اسی طرح لکھنؤ کے پندرہ روزہ شہدائے اسلام کے جلسوں کا حسبِ دستور قدیم انعقاد عمل میں آتے رہنا آپ ہی کی بیدار مغزی اور فرض شناسی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ تحریک مدحِ صحابہؓ کے اوّلین قائدین میں آپ کا شمار ہوتا تھا اس سلسلہ میں کئی بار قید و بند کی سزائیں بھی کاٹیں اور جانی و مالی نقصانات بھی برداشت کیے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آپ نے اپنے والد ماجدؒ سے فن مناظرہ کی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے والد ماجدؒ کے ساتھ ان کے اکثر مناظروں میں شریک و معاون رہے۔ اسی طرح آپ نے بذاتِ خود بھی مختلف فرقوں سے متعدد مناظرے کیے اور احقاقِ حق کا

---

[1] روداد دارالمبلّغین لکھنؤ، مرتبہ مولانا عبدالسلام فاروقی، ص ۷

فریضہ انجام دیا۔ زیادہ تر آپ کے مناظرے آریہ سماجیوں، قادیانیوں اور متشدد بریلوی علماء سے ہوئے، آج ہمارے پاس اِن تمام مناظروں کا کوئی تفصیلی ریکارڈ محفوظ نہیں ہے، اس لیے حتمی طور پر تو یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے کتنے مناظرے کہاں اور کن سے کیے تھے، البتہ چند مشہور مناظروں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے جن کی جستہ جستہ خبریں النجم لکھنؤ میں شائع ہوتی رہی تھیں، ورنہ خود مولانا مرحوم نے کبھی اپنی زبان سے کسی سے ذکر نہیں کیا۔

مشہور آریہ سماجی رہنما پنڈت رام چندر سے آپ کا مناظرہ لکھنؤ میں ہوا تھا۔ اس مناظرہ میں اُس دَور کے مناظر اسلام مولانا لال حسین اختر بھی شریک تھے۔ پنڈت رام چندر اس مقابلہ میں لاجواب ہوگئے اور مناظرے سے روگردانی اختیار کرلی۔ ایک مناظرہ کٹک (اڑیسہ) میں کسی بریلوی عالم سے ہوا تھا جس میں مقابل مناظر کو شکستِ فاش ہوئی تھی۔ ۱۹۵۵ء میں بریلوی مناظر مولوی حشمت علی پیلی بھیتی سے دو مناظرے ہوئے جن میں سے ایک دھانے پور ضلع گونڈہ، یوپی میں ہوا تھا جس میں مولوی موصوف کو ایسی شکست فاش ہوئی کہ پھر اس کے بعد زندگی بھر انھوں نے کسی سے مناظرہ نہیں کیا۔ مرزا کمال الدین قادیانی کے تعاقب میں جب حضرت لکھنویؒ کا سفر رنگون ہوا تھا تو اس سفر میں بھی آپ ہمراہ تھے۔ بھیمڑی ضلع تھانے مہاراشٹر کے اس مباحثہ میں بھی آپ کی عملی شرکت بڑی اہم تھی جس میں ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء سے مسلسل آٹھ روز تک علماء اہل سنت دیوبند اور علماء بریلی نے آمنے سامنے بیٹھ کر بعض اختلافی مسائل پر کھل کر مباحثہ کیا تھا، دراصل یہ مباحثہ نومبر ۷۳ء میں ہونے والے ایک مناظرہ کے لیے شرائط اور موضوعات طے کرنے کے لیے ہوا تھا، اس کی مختلف نشستوں میں فریقِ مخالف کی طرف سے بعض بڑی مضحکہ خیز باتیں ہوئیں جن کے علمائے اہل سنت کی طرف سے تشفی بخش جوابات اور ٹھوس علمی دلائل دیئے گئے۔ یہ پورا مباحثہ ٹیپ کرلیا گیا تھا اور اسی ٹیپ کی مدد سے اس کو کتابچہ کی شکل میں منتقل کرکے شائع کردیا گیا تھا۔ اس مباحثہ میں علمائے اہل سنت کی طرف سے تیرہ حضرات شریک ہوئے تھے جن میں حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مولانا سیّد ارشاد احمد صاحبؒ فیض آبادی مبلّغ دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اصل نمائندگی مولانا عبدالسلام صاحبؒ اور مولانا سیّد ارشاد احمد صاحبؒ کررہے تھے۔ فریقِ مخالف کی طرف سے مولانا حبیب الرحمٰن اڑیسہ، مولانا ارشد القادری، مولانا سیّد محمد ہاشمی

میاں، مولانا سیّد محمد محامد میاں جیلانی، مولانا سیّد آل مصطفیٰ اور مولانا عبدالشکور اعظمی نمائندگی کررہے تھے۔ یہ مباحثہ فریقِ مخالف کے لیے انتہائی ہزیمت اور شکست خوردگی کا سبب بنا اور اہل سنت و جماعت کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی۔[1]

آپ کے تبلیغی اسفار بھی بہت ہوتے تھے۔ یوپی کے اضلاع میں بہرائچ، گونڈہ، بستی فیض آباد، جونپور، غازی پور، مرزاپور، الٰہ آباد، مرادآباد، بجنور، اور مظفرنگر کے علاقوں میں آپ کی تقریری جدوجہد سے بہت سے خاندانوں کی اصلاح ہوئی۔ آج بھی وہاں کے لوگ آپ کو یاد کرتے ہیں۔ تقریر بڑی متین، سنجیدہ اور پُروقار ہوتی تھی۔ عام مقررین کی طرح گھن گرج اور پُرجوش انداز نہیں ہوتا تھا، پوری تقریر سیرت نبویہ، فضائل صحابہ اور بزرگانِ دین کی تعلیمات پر مبنی ہوتی تھی اور جہاں کہیں مخالفین و معترضین کے جوابات دینا ہوتے تھے وہاں انتہائی وزنی اور مسکت دلائل کے ساتھ اپنی بات کہتے تھے، آپ کا میدانِ عمل ہمیشہ خطابت رہا، تحریری کاموں کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے پھر بھی ایک رسالہ ''شیعوں کے گیارہ مایۂ ناز سوالات اور ان کے جوابات'' آپ کے قلم سے مطبوعہ شکل میں ملتا ہے۔ جو آپ کے عمیق مطالعہ کا روشن ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ حضرت لکھنویؒ کے کچھ مناظروں کی رودادیں بھی آپ نے مرتب کرکے شائع کی تھیں اور بعض تصنیفات بھی اپنے زیرِ اہتمام شائع کی تھیں۔

سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب مجددی، بھوپالی قدس سرّہٗ سے آپ کا بیعت کا تعلّق تھا لیکن اس تعلّق کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کا وصال ہوگیا اس لیے بقیہ سلوک کی تعلیم و تربیت آپ نے اپنے والد حضرت لکھنویؒ سے حاصل کی۔ اخفاءِ حال اور منکسر المزاجی کی وجہ سے کسی کو بیعت نہیں کیا اور نہ ہی کوئی سجّادگی یا جانشینی کا تصوّر کسی کو ہونے دیا۔ والد ماجدؒ کے زمانہ سے دارالمبلّغین میں بعد نماز فجر ختم خواجگان کا جو معمول تھا اسے اپنی حیات تک بدستور باقی رکھا اور الحمدللہ آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آخری دور میں عوام الناس کے قلوب کو آپ کی طرف بہت مائل کردیا تھا جس سے لوگوں میں مقبولیت بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ حاجت مندوں اور دعا کے خواستگاروں کا ہجوم رہنے لگا تھا۔

مولانا کا پہلا نکاح ۱۹۲۳ء میں بنارس کے اطراف میں ہوا تھا، ان اہلیہ صاحبہ کا ساتھ کافی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں مناظرہ بھیمڑی نزد بمبئی، مرتبہ شبیر احمد راہی، ایم اے، سکریٹری انجمن اہلسنّت و جماعت، بھیمڑی

دن تک رہا مگر اختلافِ معاشرت اور مزاج کی عدم مطابقت کی بنا پر کچھ عرصہ کے بعد ان سے علیحدگی اختیار کرلی اور ۱۹۳۷ء میں کھیولی ضلع بارہ بنکی کے ایک دیندار سیّد گھرانے کے سربراہ حاجی سیّد ارشاد حسین مرحوم کے یہاں آپ نے عقد ثانی کیا۔ پہلی اہلیہ سے کوئی اولاد نہ تھی مگر دوسری اہلیہ صاحبہ سے چار بیٹیاں اور دو بیٹے ماشاء اللہ موجود ہیں، سب کی شادیاں ہوچکی ہیں اور سب الحمدللہ صاحب اولاد ہیں۔ بیٹوں میں سب سے بڑے عزیز گرامی مولانا عبدالعلیم فاروقی سلّمہٗ ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور اب دارالمبلّغین لکھنؤ کے مہتمم ہیں۔ ملک کے نامور مقرر ہیں اور ہندو بیرونِ ہند دونوں جگہ یکساں طور پر مقبول ہیں۔ فی الوقت جمعیۃ علماء ہند کے ناظم عمومی بھی ہیں۔ ان کے دور اہتمام میں دارالمبلّغین نے الحمدللہ بڑی ترقی کی ہے، احاطہ شیخ شوکت علی جس کی خریداری کی کوشش حضرت مولانا عبدالسلام صاحبؒ کی حیات ہی میں شروع ہوچکی تھی، ان کے دَور میں خرید لیا گیا اور اب اس پر ایک شاندار عمارت تعمیر ہوچکی ہے جس کو 'مولانا عبدالشکورؒ ہال' کا نام دیا گیا ہے۔ اسی عمارت کے بالائی حصہ پر دارالمبلّغین کے درجات اس کے دفاتر، کتب خانہ اور طلباء کی رہائش بھی وہیں منتقل کردی گئی ہے۔ 'مولانا عبدالشکورؒ ہال' نہایت وسیع خوصورت کشادہ اور جدید سہولتوں سے آراستہ ہال ہے۔ اکثر ملّی تقریبات اور جلسے وغیرہ اب اسی میں منعقد ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالعلیم فاروقی سلّمہٗ کا نکاح دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں مولوی سیّد محمد مجتبیٰ حسنی کے یہاں ہوا ہے جن سے تین بیٹے مولوی عبدالرحمٰن فاروقی، مولوی عبدالباری فاروقی اور عبدالمالک فاروقی اور ایک بیٹی ہے۔ پہلے دو بیٹوں نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کرلی ہے اب یہ دونوں دارالمبلّغین میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مولانا عبدالسلام صاحبؒ کے چھوٹے صاحبزادہ مولوی حافظ عبدالعظیم فاروقی سلّمہٗ بھی دارالمبلّغین کی انتظامیہ کے رکن ہیں اور بڑی تندہی کے ساتھ اپنے اسلاف کی یادگار کی بقاو ترقی میں شب و روز مصروف ہیں۔ ان کا عقد ضلع لکھیم پور کھیری کے ایک دیندار گھرانے میں ہوا ہے جن سے ایک بیٹا حسن عبدالسلام اور دو بیٹیاں بحمدللہ موجود ہیں نصف صدی سے زائد عرصہ تک انتھک جدوجہد اور دین کے راستے میں ساری عمر صرف کرنے والے مسافر کو بالآخر نیند کی جھپکی آہی گئی، چنانچہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ ایک مختصر علالت کے بعد ۱۴/اگست ۱۹۷۳ء کی شب میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ ۱۵/اگست ۱۹۷۳ء

کو لکھنؤ اور قرب و جوار کے ہزاروں ہزار غم رسیدہ و نم دیدہ مسلمانوں نے مولانا عبدالعلیم فاروقی سلّمہٗ کی امامت میں نماز جنازہ ادا کر کے محلہ چکمنڈی لکھنؤ کے اسی احاطہ میں جہاں حضرت مولانا لکھنویؒ قدس سرہٗ آرام فرما ہیں، آپ کو بھی انھی کے پہلو میں لاکر سُلا دیا گیا۔ ملک کے مشہور عالم دین اور ادیب و صحافی مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم نے آپ کی وفات پر اپنے تاثرات اس طرح پیش کیے تھے:

"مولانا مرحوم بلند پایہ عالم اور خوش بیان مقرر ہونے کے علاوہ بڑے صالح اور متقی بھی تھے، فقہ ان کا خاص فن تھا اور استعداد بڑی پختہ تھی، اپنے معمولات کے بڑے پابند اور جو بھی ان کے افکار و خیالات تھے ان میں سخت جامد اور کٹّر تھے، تواضع فروتنی، سادگی اور بے لوثی ان کے اوصاف خصوصی تھے۔ ان اوصاف و کمالات کے باعث لکھنؤ کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے...... مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر گروہ کے لوگوں کے علاوہ ان کی تعزیت کرنے والوں میں غیر مسلم حضرات کی بھی معتد بہ تعداد موجود تھی۔ عمل اور اخلاق کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے...... اب ایسے باوضع، پاک باطن اور پاک نظر لوگ کہاں ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات و مراتب بلند فرمائے۔ آمین[1]"

حضرت مولانا حافظ محمد عبدالمومن صاحب فاروقیؒ (۱۹۰۹ء-۱۹۶۷ء)

آپ کی پیدائش ۸/اپریل ۱۹۰۹ء کو کاکوری ضلع لکھنؤ میں ہوئی، حفظ قرآن مجید حافظ قاری عبدالصمد صاحبؒ سے کیا، اس کے بعد ابتدائی درسی کتابیں اپنے والد ماجد حضرت لکھنویؒ سے اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے دوسرے اساتذہ سے پڑھیں، بعدہٗ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں تعلیم حاصل کی جہاں مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید انصاری فرنگی محلیؒ آپ کے خصوصی اساتذہ میں تھے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۸ء تک لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ السنۂ شرقیہ میں داخلہ لے کر فارسی اور عربی کے امتحانات اعلیٰ نمبروں میں پاس کیے۔ اس دور میں مولانا مصطفیٰ حسن علوی کاکورویؒ اور مولانا سیّد علی زینبیؒ آپ کے استاذ تھے۔ کچھ عرصہ مظاہر علوم سہارنپور میں بھی پڑھا جہاں مولانا عبداللطیف صاحبؒ جیسا شفیق استاذ ملا۔ آپ کے والد ماجدؒ کو امروہہ سے

---

[1] ماہنامہ "برہان" دہلی، ستمبر ۱۹۷۳ء

خصوصی تعلق تھا اس لیے انھوں نے آپ کو مدرسہ عالیہ عربیہ امروہہ ضلع مراد آباد بھیج دیا جہاں آپ نے بقیہ ساری تعلیم پوری کی، یہاں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک آپ کا قیام رہا، اور پھر وہیں سے ۱۹۳۲ء میں درس نظامی کی تکمیل کر کے لکھنؤ واپس آ گئے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد لکھنؤ میں اپنے والد ماجدؒ کے تحریری کاموں میں شریک و معاون ہو گئے، چنانچہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک والد کی سرپرستی میں ان کے دینی صحیفہ النجم کی ادارت سنبھالی، اسی عرصہ میں ۱۹۳۶ء کے آس پاس اخبار ''حرم'' کا اجراء کیا۔ پھر النجم کے بند ہو جانے کے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ سے ہفت روزہ آفتاب نکالا۔ جو بعد میں روزنامہ بھی ہو گیا تھا، اس اخبار نے اودھ میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس طرح آپ نے صحافت اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ اختیار کیا۔ آپ نے عمر میں صرف دو بار ملازمت کی۔ پہلی بار ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کنور تیج بہادر بھارگو وارث منشی نول کشور لکھنؤ کے مشہور مطبع میں شعبۂ تصنیف و تالیف کے انچارج رہے۔ جہاں سے آپ نے کئی ادبی کتابیں مدوّن و مرتب اور ترجمہ کیں جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک گورنمنٹ اورنٹیل کالج (مدرسہ عالیہ) رام پور، یوپی کے پرنسپل کے عہدہ پر فائض رہے۔ اس طرح ان سات آٹھ برسوں کے علاوہ آپ نے کبھی ملازمت نہیں کی اور ہمیشہ آزادرہ کر علمی و دینی کاموں میں زندگی گذار دی۔

مولانا مرحوم نے اپنا میدانِ کار تحریری خدمات کو بنایا تھا۔ آپ نے جو کتابیں اور رسائل تصنیف کیے اور النجم، حرم و آفتاب میں جو کتاب اللہ کے اسرار و رموز، سیرت نبویہ اور بزرگانِ دین کے حالات و تعلیمات زیبِ رقم کیے پھر سب سے بڑھ کے خلفاء راشدین اور صحابۂ کرام کی حیاتِ مقدسہ اور ان کے فضائل و مناقب میں جو کچھ لکھ دیا ہے اگر ان سب کو یکجا کر دیا جائے تو بلاشبہ وہ ہزاروں صفحات پر مشتمل ہوگا۔ اس سلسلہ میں خود اپنے قلم سے ایک جگہ آپ نے تحریر فرمایا ہے:

بلبل زادب پا نہ نہد در صفِ گلزار
تا گل بہ طلبگاریٔ اُولب نہ کشاید

''واقفین و احباب کو معلوم ہے کہ مجھ سیہ کار کی باہوش زندگی تقریباً پوری کی پوری مذہبی مضامین اور کتابیں ہی لکھتے گذری ہے۔ خصوصیت کے ساتھ حضرات صحابہؓ کے متعلق جو لٹریچر اس حقیر کے قلم سے نکل چکا ہے وہ اگر صرف النجم حرم، آفتاب، خضر اور ہادی وغیرہ ہی سے علیحدہ کتابی

صورت میں منتقل کر دیا جائے تو پانچ ہزار صفحات سے کم نہ ہوگا۔تحریک مدح صحابہؓ کے سلسلہ میں بھی تحدیث بالنعمۃ کے طور پر میں اپنی ناچیز قلمی خدمات کے متعلق یہ یقین رکھتا ہوں کہ وہ بھی میدان حشر میں انشاء اللہ ایک خصوصی وزن رکھیں گی:

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

حضرت لکھنویؒ کی حیات میں النجم کا حلقہ اہلِ علم اور خواص تک تھا لیکن مولانا مرحوم نے جب اس کی ادارت سنبھالی تو اس کو وسعت دے کر عوام تک پہنچا دیا۔ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ النجم اخباری سائز پر نکلنے لگا۔اس کی بنیادی پالیسی تو وہی تحفظِ سُنّیت اور فضائل صحابہؓ واہل بیت ہی رہی مگر ساتھ ہی ساتھ نئے کالم بھی بڑھائے گئے۔مثلاً منظومات اور ملکی وغیر ملکی خبروں کے کالم کا بھی اضافہ کیا گیا۔اس طرح اب النجم عوام کے ہاتھوں میں آنے لگا اور اس کی روش اب محض دفاع کی نہیں بلکہ جدوجہد اور اپنے وجود کو برتر ثابت کرنے کی ہوئی۔مولانا مرحوم نے اپنے زمانہ میں النجم اور آفتاب کے بہت سے ضخیم اور خصوصی نمبر بھی نکالے اور ہر نمبر اپنی جگہ مکمل دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا۔اس جگہ ہم چند اہم نمبروں کی ایک فہرست دے رہے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے النجم اور آفتاب کے ذریعہ ان نمبروں کی شکل میں کتنا عظیم الشان دینی لٹریچر ملت کے ہاتھوں تک پہنچا دیا تھا۔

النجم کے خصوصی نمبر: احتجاج نمبر، امامت نمبر، ذبیح اللہ نمبر، تحریک نمبر، ناموسِ اسلام نمبر، خلافت نمبر، کربلا نمبر، شہداء نمبر، رسالت نمبر، عاشوراء نمبر، صحابہؓ نمبر، ہجرت نمبر، خاتون نمبر، مدح صحابہؓ نمبر، عتیق نمبر، استقلال نمبر، اور کمیشن نمبر وغیرہ۔

آفتاب کے خصوصی نمبر: عید نمبر، کعبہ نمبر، شہید نمبر، فیصلہ نمبر، صفدرؒ نمبر، معاویہ نمبر، سیف اللہ نمبر، معراج نمبر، اور سیاست نمبر وغیرہ۔

یہ تمام خصوصی نمبر مولانا ہی نے مرتب کر کے شائع کیے تھے جو اچھے خاصے ضخیم تھے۔مضامین کے علاوہ اِن نمبروں میں اُس دَور کے مقبول اور نامور شعراء کا نعتیہ کلام اور فضائل و منقبت پر مشتمل نظموں کی بھی خاصی تعداد ہوتی تھی۔صحافتی ذمّہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیفی مشاغل بھی جاری تھے۔ان میں اکثر تصنیفات شائع ہو چکی ہیں البتہ کچھ شائع نہیں ہو سکیں اور

چند نامکمل بھی رہ گئیں۔ تحقیق و جستجو کے بعد ہمارے علم میں جتنی بھی تصنیفات آچکی ہیں ان کی مختصر فہرست ہم ذیل میں دے رہے ہیں:

مطبوعہ تصانیف

۱۔ کلّیات نظیرا کبرآبادی:

اس کلّیات کے گیارہویں ایڈیشن کو جب ناشرین نے شائع کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اس پر ایک مفصل اور مبسوط مقدمہ سپرد قلم کیا اور اس پورے ایڈیشن پر نظر ثانی کر کے نظیرا کبرآبادی' کے کچھ نئے دستیاب شدہ کلام کا اضافہ بھی کیا۔ اس طرح یہ نیا گیارہواں ایڈیشن منشی نول کشور لکھنؤ کے مطبع کے وارث کنور تیج کمار بھارگو نے اپنے پریس سے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا جس کو علمی و ادبی حلقوں میں بہت سَراہا گیا۔

۲۔ لغات کشوری:

اسی مطبع کی مشہور اور متداول اُردو لغت لغاتِ کشوری کے جدید ایڈیشن کی طباعت کے وقت آپ نے اس پر نظر ثانی کی اور تقریباً پچاس ہزار نئے الفاظ کا اضافہ کیا۔

۳۔ مقدمہ ترجمہ قرآن مجید-۱:

اسی مطبع سے آپ کی نگرانی میں ایک مترجم قرآن مجید شائع ہوا تھا جس میں دو ترجمے تھے، پہلا حضرت شاہ رفیع الدین صاحب محدّث دہلویؒ کا اور دوسرا حکیم الامّت حضرتِ مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ کا تھا۔ حواشی میں آیات و سور کا شانِ نزول، ضروری توضیحات اور تفسیری حقائق درج تھے۔ ایک خصوصیت اس ایڈیشن کی یہ بھی تھی کہ اس کی کتابت یوپی کے مشہور خطاط مولوی عبدالصمد نعمانی نے کی تھی جو قرآن نگاری اور عربی خطاطی کے میدان میں ایک بلند مقام کے مالک تھے۔ ان تمام خوبیوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مولانا علیہ الرحمۃ نے اس پر ایک مفصّل مقدمہ لکھا اور چوبیس صفحوں پر مشتمل کچھ اہم قرآنی مضامین کی ایک فہرست بھی مرتب کر کے شامل کی اور پورے طور پر نظر ثانی کر کے جنوری ۱۹۵۲ء میں اسے شائع کرایا۔

۴۔ مقدمہ ترجمۂ قرآن مجید-۲:

قرآن مجید کی تاریخی جمع و ترتیب، شانِ نزول، فضائل اور آدابِ تلاوت، مختلف آیات و

سور کے خواص اور ان کے اجر وثواب پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ آپ نے حضرت مولانا قاضی سجاد حسین صاحبؒ صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری، دہلی کی فرمائش پر تحریر کیا تھا جسے قاضی صاحب مرحوم ہی نے اپنے مکتبہ 'سب رنگ کتاب گھر' دہلی کی طرف سے ۱۹۵۷ء کے آس پاس شائع کیا تھا۔ اس مقدمہ کو علمی اور دینی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔

۵۔ اُردو ترجمہ نسخۂ تعلیمیہ (فارسی):

نسخۂ تعلیمیہ مولفہ مولانا عبدالعزیز آرویؒ ایک زمانہ میں مدارس عربیہ کے نصابِ فارسی میں داخل تھی اور اساتذہ وطلباء میں بہت مقبول تھی، آپ نے اس کتاب کے فارسی متن کی تصحیح کر کے سلیس اور آسان اُردو میں اس کا ترجمہ کیا تھا جسے متن کے ساتھ اپریل ۱۹۵۱ء میں منشی تیج کمار بھارگو وارث نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ ۷۴ صفحات پر مشتمل یہ پورا رسالہ سوال و جواب کے طرز پر تالیف کیا گیا ہے جس سے طلباء کو فارسی لکھنے اور بولنے کی مشق ہوتی ہے۔

۶۔ بَرزخ کی باتیں:

اس عنوان سے ۱۹۴۰ء میں اپنے اخبار 'آفتاب' لکھنؤ میں آپ نے ایک قسط وار مضمون شائع کیا تھا جس میں معتبر و مستند کتابوں کے حوالہ سے ایسے تاریخی واقعات کو جمع کیا گیا تھا جس میں کچھ خواب دیکھنے والوں نے بعض مرحوم شخصیتوں سے ان کے برزخی احوال اور مختلف اعمال کے ثواب وعذاب کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں پھر ان جوابات سے انھوں نے دوسرے لوگوں کو آگاہ کیا۔ چونکہ ایسے واقعات بڑے سبق آموز اور عبرت ناک ہوتے ہیں اس لیے یہ ہر حلقہ میں دلچسپی کے ساتھ پڑھے گئے۔ چنانچہ بعد میں انھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ اب آج کل یہی رسالہ 'موت کے عبرت انگیز واقعات'، کے نام سے آفسیٹ پر شائع کر دیا گیا ہے اور عام طور پر دستیاب ہو جاتا ہے۔

۷۔ اسلامی تاریخی کہانیاں:

یہ کتاب مختلف عربی کتابوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھی جس میں عبرت انگیز وسبق آموز سچے واقعات کا ایک دلچسپ ذخیرہ ہے۔ اسے شمع بکڈپو کے مکتبہ دینیات آصف علی روڈ نئی دہلی نے دسمبر ۱۹۵۷ء میں شائع کیا تھا۔ پھر اس کے بعد سے اب تک اس کے بہت سے ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۸۔ کریما:

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا مشہور منظوم رسالہ جو مدارسِ عربیہ کے فارسی نصاب میں عرصۂ دراز سے پڑھایا جاتا ہے۔ اس کا متن کے ساتھ اُردو ترجمہ اور حواشی آپ نے مرتب کیے تھے جو نولکشور پریس سے شائع ہو چکا ہے مگر اب نایاب ہے۔

۹۔ مامقیماں:

مولانا شیخ علاء الدین نیلیؒ (م ۷۶۲ھ) کا یہ فارسی منظوم کتابچہ بھی مدارس میں داخل درس رہ چکا ہے۔ یہ ایک ترجیع بند مثنوی ہے جس کو مولانا مرحوم نے ترجمہ وتشریحی نوٹس کے ساتھ مرتب کیا تھا یہ بھی چھپ چکا ہے مگر اب نایاب ہے۔

۱۰۔ ابرام الوفاء بذکر الخلفاء:

مصر کے مشہور عالم اور سابق وزیر اوقاف علامہ محمد عفیفی المعروف بہ شیخ خضری (م ۱۳۴۵ھ) کی عربی کتاب 'اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء' کا یہ اُردو ترجمہ ہے جو کافی ضخیم ہے اور النجم میں پینتیس چالیس قسطوں میں شائع ہو چکا ہے۔ خلفاء راشدینؓ کے معتبر ومستند حالات میں یہ مفصل کتاب ہے۔

۱۱۔ شمامۃ العنبر:

مشہور بزرگ اور عالم دین مولانا شاہ وارث حسن[۱] صاحب کوڑہ جہان آبادیؒ کے صاحبزادہ اور جانشین مولانا شاہ واعظ حسن صاحب مرحوم کی فرمائش پر ان کے والد کی حیات اور تعلیمات پر مشتمل یہ کتاب آپ کی نظر ثانی، اضافہ اور مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

۱۔ مولانا شاہ وارث حسن صاحبؒ اپنے وقت کے مشہور علماء ومشائخ میں سے تھے۔ کوڑہ جہان آباد ضلع فتح پور یوپی میں پیدا ہوئے، جہاں سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے دار العلوم دیوبند پہنچے اور وہیں سے فراغت حاصل کی، پھر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے سند حدیث لی اور انھی سے بیعت بھی کی۔ بسلسلۂ حج حجاز کا سفر کیا اور وہاں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانویؒ مہاجر مکی کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ ہندوستانؒ واپس آ کر بنارس اور مظفر پور کے مدارس میں عرصہ تک درس دیا۔ آخر میں شیخ حسن علی نقشبندیؒ سے بھی فیض حاصل کیا اور پھر لکھنؤ آ کر ٹیلہ شاہ پیر محمدؒ کی مسجد اقامت کے لیے اختیار کی۔ آپ کی طرف لوگوں کو رجوعات بہت تھی۔ خاص طور سے امراء اور اونچے عہدہ دار آپ کے بہت معتقد تھے۔ عقائد میں توسع بہت تھا۔ رسوماتِ فاتحہ اور اعراس وغیرہ کے پابند تھے۔ ۱۰ ارجمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ میں لکھنؤ میں وفات ہوئی اور ٹیلہ شاہ پیر محمدؒ کی مسجد کے قریب دفن ہوئے۔ (الاعلام، جلد ۸، ص ۵۳۸)

۱۲۔ آل عثمان:

یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے مگر راقم کی نظر سے نہیں گذری۔

۱۳۔ اعجاز القرآن:

اس موضوع پر آغاز اسلام سے ہر دور میں علماء نے نہایت مفید کتابیں تصنیف کی ہیں چنانچہ اس مبارک زمرہ میں اپنے کو بھی شامل کرنے کی نیت سے مولانا مرحوم نے بھی ایک مختصر رسالہ تحریر کیا تھا۔ جس میں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے بہت سے دلائل میں سے صرف آٹھ دلائل کا امثال و نظائر کے ساتھ ذکر کیا ہے جو یہ ہیں: تحدّی، اخبار بالغیب، فصاحت و بلاغت، عدم تضاد معنی، سہولت حفظ، احتواء علوم، محل استعمال اور جاذبہ اثر۔ اس طرح یہ رسالہ نہایت آسان اور سلیس اُردو میں اعجاز قرآنی پر ایک مفید رسالہ ہے۔ یہ بھی ابتداءً النجم ۱۳۵۱ھ کے شمارہ میں شائع ہوا تھا اور پھر بعد میں کتابی شکل میں بھی اشاعت پذیر ہوا۔

۱۴۔ سیف اللہ الجبارؓ:

یہ رسالہ مشہور صحابی رسول حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب اور ان کے عظیم الشان کارناموں پر مشتمل ہے۔ پہلی مرتبہ النجم کے صفحات پر اور بعد میں علیحدہ سے کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۵۔ سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ رسالہ عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی حیات و خدمات پر اُردو میں بہترین رسالہ ہے، یہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۶۔ عقد ام کلثومؓ:

یہ رسالہ ایک شیعی ماہنامہ 'اصلاح' کھجوہ ضلع سیوان کے ایک مضمون کے جواب میں ہے جس میں علماء شیعہ اور علماء اسلام کے اقوال کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت ام کلثوم بنت امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ کا نکاح امیر المومنین فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا اور ان سے اولاد بھی ہوئی تھی۔ یہ ام کلثوم حضرات حسنینؓ کی حقیقی بہن اور حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا بنت رسولؐ کی صاحبزادی تھیں۔ یہ نکاح منجملہ اور دلائل کے اس بات کی روشن دلیل ہے کہ خلفاء ثلاثہؓ اور اہلِ بیت رسول میں بے حد

مخلصانہ تعلقات تھے۔ یہ رسالہ سب سے پہلے ربیع الاول ۱۹۳۱ء میں النجم میں شائع ہوا تھا پھر اس کے بعد سے اب تک اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

۱۷۔ سراج الدولہ:

یہ اُردو میں ایک دلچسپ اور سبق آموز تاریخی واخلاقی ڈرامہ لکھا گیا تھا جو کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۸۔ فارسی مقدمہ، تدوین وتہذیب مثنوی مولانا رومؒ:

یہ کام بھی چھپ چکا ہے مگر اب نایاب ہے اور راقم کی نظر سے نہیں گذرا ہے۔

غیر مطبوعہ

۱۹۔ تاریخ ایجاد وآغاز:

عربی کتاب 'محاضرۃ الاوائل و مسامرۃ الاواخر، مؤلفہ علامہ شیخ علاء الدین علی سکنواریؒ (۹۹۸ھ-م۱۵۸۹ء) کا یہ اُردو ترجمہ ہے جس کو مؤلف نے علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب 'معرفۃ الاوائل' کی تلخیص اور پھر اس میں دوسری معتبر و مستند کتب اخبار و آثار متعلقہ 'الاوائل والاواخر' سے اضافہ کر کے مرتب کیا تھا۔ اصلی عربی متن پہلی مرتبہ ۱۳۱۱ھ-۱۸۹۳ء میں مطبع عامرہ شرفیہ مصر سے شائع ہوا تھا جو ۲۶۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ مولانا مرحوم نے اس کا مکمل اُردو ترجمہ ۱۹۴۹ء میں کیا تھا جو راقم کی نظر سے گذر چکا ہے مگر شائع نہیں ہو سکا۔

۲۰۔ اُردو ترجمہ المستطرف:

یہ علامہ شہاب الدین احمد الابشہی کی مشہور عربی کتاب ہے جو تصوّف میں ہے اس کا حاشیہ علامہ تقی الدین بن ابی بکر علی المعروف بہ ابن حجہ حموی حنفی نے لکھا تھا۔ یہ کتاب مصر میں ۱۳۱۴ھ میں دوسری بار شائع ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم نے اس کا اُردو ترجمہ کیا تھا مگر یہ شائع نہیں ہو سکا اور اب اس کا مسودہ بھی نایاب ہے۔

ناتمام مسودات

۲۱۔ تصویر ایمان واسلام:

قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ سے ایمان اور اسلام کی تفصیل آسان اور عام فہم اُردو زبان

میں آپ نے مرتب کی تھی تا کہ کم تعلیم یافتہ لوگ بھی اس کے بنیادی اصول واحکام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات سے واقف و باخبر ہوسکیں۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ کتاب آپ نے اپنی اخروی نجات کی نیت سے مرتب کی تھی جس کا ذکر کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ مسودہ تشنہ تکمیل رہ گیا ہے۔

۲۲۔ روزنامچۂ اسلام:

اس ناتمام مسودہ میں عہد نبوی سے دور حاضر تک کے تمام مخصوص واہم واقعات کا تحقیقی و تاریخی نچوڑ پیش کرنے کا ارادہ تھا۔ پوری کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا تھا مگر افسوس ہے کہ یہ ارادہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا اور مسورہ ناتمام رہ گیا۔

۲۳۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی:

اس کتاب میں یہ نقشہ پیش کرنے کا ارادہ تھا کہ انگریزوں کے بے پناہ جعل وفریب، ظلم و ستم، لوٹ کھسوٹ اور نہایت جابرانہ قبضہ واقتدار کے بعد صدیوں کے ننگے بھوکے اور بالکل نہتے پراگندہ حال ہندوستانی غلام کس طرح آزاد ہوئے۔ یہ کتاب بھی دس ابواب میں منقسم ہونا تھی مگر اس کا مسودہ بھی ناتمام رہ گیا۔

۲۴۔ حسین شہیدؓ:

اس نام کی کتاب مرتب کرنے کا ارادہ ۱۳۸۰ھ میں کیا تھا چنانچہ اس کے تعارف میں خود مولانا مرحوم نے چند جملے ایسے تحریر فرمائے تھے جن کے مختلف فقرات سے ۱۳۸۰ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ وہ فقرات یہ تھے:

> ''اس کتاب میں نواسۂ رسول حضرت حسین قتیل الفرات (۱۳۸۰ھ) کے واقعہ شہادت کا مفصل تذکرہ ہے جس سے ہر پڑھنے والے کو ذکر جہاد حسین شہیدؓ (۱۳۸۰ھ) کے ساتھ ردکید رافضیاں (۱۳۸۰ھ) سے بھی اچھی طرح واقفیت حاصل ہوجاوے گی۔ مزید برآں فریقین کی کتب معتبرہ سے دین خیر وشر (۱۳۸۰ھ) پر اس خوبی سے بحث کی گئی ہے کہ اس سے حضرتِ حسین رضی اللہ عنہ کی فضیلت کلی (۱۳۸۰ھ) کو کسی قسم کا داغ نہیں لگنے پایا ہے۔''

اس کتاب کے مسودہ کا صرف خاکہ ہی راقم کی نظر سے گذرا ہے۔

مذکورہ کتب ومسودات کے علاوہ آپ نے اپنی ایک تحریر میں چند اور رسائل کے نام بھی تحریر

کیے تھے مگر ان کا کوئی جزو بھی نظر سے نہیں گذرا۔ مثلاً:

(۲۵) نبی کریمؐ (۲۶) بزرگانِ دین (۲۸) خواتینِ اسلام (۲۹) تاریخی جواہر (۳۰) واقعہ کربلا (۳۱) فلاحِ انسانیت یعنی تعلیماتِ اسلام (۳۲) اپنے اور بیگانے (شخصیات) (۳۳) مسلمان اپنے عہدِ حکومت میں۔

مذکورہ بالا کتب ورسائل سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اسلامی تاریخ اور تحفظ ناموسِ صحابہؓ کے ساتھ ساتھ زبان وادب، تدوین متن اور تراجم وتحشیہ پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ طرزِ تحریر نہایت شگفتہ، رواں اور سلیس تھا، موقع بموقع اشعار بھی درج کرتے تھے۔ شعر وسخن سے بھی بڑی دلچسپی تھی، اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ اخبار آفتاب اور حرم میں برابر آپ کا کلام 'حساس' یا 'شاعر آفتاب' یا 'شاعرِ حرم' کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ آپ زیادہ تر نظم لکھا کرتے تھے جو یا تو حالاتِ حاضرہ سے متعلق ہوتی تھیں یا پھر نعت ومنقبت میں ہوتی تھیں۔ یہ خصوصیت آپ کو اپنے والد ماجدؒ سے ملی تھی، ان کی تحریریں بھی مناسبِ حال اشعار سے مزیّن ہوا کرتی تھیں۔ مولانا مرحوم اپنے اِسی ذوقِ شعر وسخن سے شعراء میں بہت مقبول تھے۔ رام پور کے زمانۂ قیام میں جہاں ادبی سرگرمیاں بہت عروج پر تھیں، وہاں کے مشاعرے اکثر آپ ہی کی صدارت میں ہوا کرتے تھے۔ اچھے اشعار پر کھل کر داد دیا کرتے تھے جس سے شعراء کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی مہینے میں ایک بار خود اپنے گھر پر مشاعرہ کا اہتمام کرتے تھے اور یہ سلسلہ لکھنؤ میں بھی ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اس وقت کے شعراء میں جناب جگرؔ مراد آبادی، فخر مشرق علامہ شفیق جونپوری، علّامہ انور صابری، ابوالفضل شمس لکھنویؒ، زائرِ حرم حمید صدیقی لکھنوی، جناب رشید قمرؔ لکھنوی اور جناب اسلم لکھنوی سے خصوصی تعلّقات تھے۔ اسی طرح رام پور کے شعراء میں جناب محشر عنایتی، شاد عارفی، راز یزدانی اور خیالؔ رام پوری سے بھی روابط تھے۔

آپ بے حد خوش مزاج، متواضع، فیاض اور مہمان نواز تھے، اپنے دوستوں اور اقرباء سے بڑے لطف وکرم اور خاطر مدارات کا معاملہ کرتے تھے، زندگی بھر کسی کی دل شکنی اور دل آزاری نہیں کی، ہمیشہ مروّت، محبت اور تعلقات کا پاس رکھا۔ خانگی زندگی میں اہل وعیال کے آرام وآسائش کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اور اولاد کی تعلیم وتربیت پر بڑی سخت نظر رکھی۔ تربیت کے معاملہ میں ادنیٰ سی لچک اور نرمی گوارا نہ تھی، معمولی سی لغزش پر بھی بھرے مجمع میں ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

سیاسی مسلک کے لحاظ سے کانگریس اور جمعیۃ علماء ہند کی پالیسیوں پر عامل رہے۔ لکھنؤ ضلع کانگریس کمیٹی کے نائب صدر اور شہر کانگریس کمیٹی کے رکن رہے۔ اسی طرح لکھنؤ میں جمعیۃ علماء کا مرکز قائم کرانے اور اس کا حلقۂ اثر بڑھانے میں پیش پیش رہے۔ ان سیاسی نظریات کے باعث کئی بار آپ کے اخبار سے حکومت برطانیہ نے ضمانتیں طلب کیں۔ جرمانے کیے، سنسر شپ عائد کی اور کئی بار اخباری کاغذ کا کوٹہ ضبط کیا گیا۔ اسی طرح متعدد بار جبری طور پر تالا بندی کا قانون بھی نافذ کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں جب آخری بار النجم کی اشاعت بند ہوئی تھی تو اسی قسم کے الزام پر پندرہ سو روپے کی ضمانت اخبار سے مانگی گئی تھی جس کو وقت پر جمع نہ کر سکنے کی وجہ سے اخبار ہمیشہ ہمیش کے لیے بند ہو گیا۔ ان تمام سرگرمیوں کے باوجود قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اپنے دینی مسلک اور تحفظ ناموسِ صحابہ کے موقف سے کبھی بھی سرِ مو انحراف نہیں کیا، اس معاملہ میں اپنے والد ماجد حضرت لکھنویؒ کی روش پر پورے عزم وارادے کے ساتھ کاربند رہے۔ آپ تحریکِ مدحِ صحابہ کے صفِ اول کے قائدین میں تھے اور اس سلسلہ میں کئی بار گرفتاریاں بھی دیں اور سزائے قید وبند بھی کاٹی۔

کہا جاتا ہے کہ نوجوانی کی عمر میں نہایت قیمتی ململ اور مردانی چکن کا کرتہ اور اعلیٰ درجہ کے لٹھے کا پاجامہ اور لکھنوی دوپلی ٹوپی استعمال کرتے تھے، مگر شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی ترغیب سے ایک مرتبہ اچانک فیصلہ کر لیا کہ اب باریک اور قیمتی ولایتی لباس نہیں استعمال کریں گے چنانچہ اس کے بعد دیسی کھدر کا لباس اختیار کر لیا۔ حضرت مدنیؒ نے بھی ان کے اس عمل کی اتنی قدر کی کہ اپنی زندگی بھر سال میں دو ایک تھان کھدر کے ہمیشہ آپ کو بھجواتے رہے۔ حضرت کے وصال کے بعد بھی یہ سلسلہ آپ کے اخلاف نے بدستور جاری رکھا۔ کھدر پوشی اختیار کرنے کے بعد اس معاملہ میں اتنا ثابت قدم رہے کہ پھر ساری عمر کھدر کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا کبھی استعمال نہیں کیا یہاں تک کہ دستی رومال بھی کھدر ہی کا ہوتا تھا۔ جاڑوں میں کبھی کبھی گرم صدری یا کھلے بٹن کی شیروانی اور عربی رومال بھی استعمال کرتے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے وقت ہاتھ میں چھڑی رکھنے کی بھی عادت تھی۔

زندگی کے آخری ایام تک تصنیف وتالیف اور صحافت کا مشغلہ جاری رہا چنانچہ جون ۱۹۶۳ء میں لکھنؤ سے دوسری بار ہفت روزہ حرم جاری کیا جو دو سال تک زندہ رہا، اس درمیان اس کے بھی

کئی خصوصی نمبر مثلاً سیرت نمبر، عید نمبر اور امام اہلسنّت نمبر کے نام سے نکالے۔ اس اخبار کے نکالنے کا عملی بوجھ تنہا انھی کے ذمہ آپڑا تھا اس کی وجہ سے صحت خراب رہنے لگی جس سے وقت پر اخبار نہیں نکل پاتا تھا مگر جہاں تک ہوسکا اس کو بھی نباہتے رہے۔ بالآخر ۱۹۶۵ء میں یہ اخبار بھی بند ہوگیا۔

مولانا مرحوم کا عقد ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یوپی) کے ایک مشہور دیندار سیّد گھرانے کے فرد مولوی سیّد بشیر الدین صاحبؒ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی سے دوشنبہ ۲۵؍شعبان ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں ہوا تھا۔ مولوی سید بشیر الدین صاحبؒ اپنے علاقہ کے اس کھاتے پیتے زمیندار خاندان کے فرد تھے جو علم دین اور علم طریقت دونوں کا گہوارہ تھا۔ مولانا مرحوم کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں ان میں سب سے بڑا یہ راقم الحروف ہے اور سب سے چھوٹے بھائی عزیزی عبدالقیوم فاروقی ہیں جو نئی دہلی میں سرکاری ملازم ہیں۔ بیٹیوں میں بڑی بیٹی کا عقد اپنے خالہ زاد بھائی عزیزی مولانا سیّد ارشد مدنی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، سے ہوا۔ ان کے بفضلہٖ تعالیٰ چھ بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں جن میں چار بیٹوں اور تین بیٹیوں کی شادی ہوچکی ہے۔ مولانا مرحوم کی دوسری بیٹی کا عقد ہنسوہ ضلع فتح پور یوپی میں حضرت مولانا سیّد شاہ عبدالسلام صاحب نقشبندیؒ مجددی کے پرپوتے عزیزی سیّد محمد یونسؒ سے ہوا تھا جن سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں بحمداللہ موجود ہیں۔ مولانا کے تیسرے بیٹے عبدالہادی مرحوم تھے جن کی جون ۱۹۴۸ء میں سوا سال کی عمر میں وفات ہوگئی۔ یہ بیٹا اپنے والدین محترمین اور خصوصاً حضرت لکھنویؒ کو بہت عزیز تھا اور اس کی وفات کا ان حضرات کو بڑا صدمہ ہوا تھا، چنانچہ اسی تعلّق کے پیشِ نظر اہالیان محلہ چکمنڈی (مولوی گنج) لکھنؤ نے حضرت لکھنویؒ سے درخواست کی تھی کہ اس بچہ کی تدفین اسی محلہ کے اُس احاطہ میں کریں جو مزار چپ شاہ میاں کے نام سے مشہور ہے اور اب اس میں ایک اسلامی تعلیمات کا مدرسہ بھی قائم ہے، چنانچہ اس کو وہیں دفن کیا گیا۔ ہمارے خاندان کی یہ سب سے پہلی تدفین تھی جو یہاں ہوئی ورنہ اس سے پہلے مرحومین کو دفن کے لیے آبائی وطن کاکوری لے جایا جاتا تھا۔ مولانا مرحوم کی وہ بیٹی جن کی شادی عزیزی سیّد محمد یونس مرحوم سے ہوئی تھی بڑی ملنسار، ہنس مکھ اور سب سے محبت رکھنے والی اور سب کے کام آنے والی تھیں، انھوں نے عین جوانی میں ایک مختصر سی علالت کے بعد اپنے شوہر اور تین اولادوں کے علاوہ بہت سے اعزاو

اقرباء اور ملنے جلنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر اور خاص طور سے اس ناچیز راقم الحروف بڑے بھائی کو عمر بھر کے لیے مبتلائے رنج ومحن کر کے ۱۶؍جنوری ۱۹۸۷ء کو انتقال کیا اور پھر لکھنؤ کے قدیم عوامی قبرستان 'عیش باغ' میں لا کر انھیں صبحِ قیامت تک کے لیے سُلا دیا گیا۔ ابھی اس قافلۂ غم کا سفر مکمل نہیں ہوا تھا کہ جن کے قدموں کے نیچے ہم بھائی بہنوں کی جنت تھی یعنی ہماری والدۂ محترمہ جوانیِ جوانی میں ایک ہونہار بچہ اور پھر آخری عمر میں شوہر کی جدائی کا غم اٹھا چکی تھیں اور پھر اب جنھیں اس پیرانہ سالی میں ایک نوجوان صاحبِ اولاد، سعادت منداور خدمت گذار بیٹی کا صدمہ بھی جھیلنا پڑا تھا، وہ خود بھی اب پا بہ رکاب ہوگئیں۔ ساری عمر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریزی، عبادت، تقویٰ اور پرہیز گاری میں گذار کر انھوں نے بھی ۲۴؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کی شب میں دس بجے ایک طویل علالت کے بعد مجیدیہ اسپتال، ہمدرد نگر، نئی دہلی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اسی شب میں ان کے جسم ناتواں کو مدنی منزل دیو بند لایا گیا جہاں شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہٗ کی اہلیہ صاحبہ نے جو ان کی حقیقی بڑی بہن اور بمنزلہ شفیق ماں کے ہیں انھوں نے اپنے مبارک ہاتھوں سے نہلا دُھلا کے زمزم میں بھگوئے ہوئے سفید مسنون کپڑوں (کفن) میں ملبوس کر کے آراستہ کیا۔ اور پھر دار العلوم کے قبرستان میں علماء صلحاء، قراء اور حفاظ کے درمیان انھیں لا کر دفن کر دیا گیا، ان کی نماز جنازہ عزیز گرامی مولانا سیّد ارشد مدنی سلمہٗ نے پڑھائی جو اُن کے حقیقی بھانجے اور داماد بھی ہیں۔

والدی الماجد مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی سوجھ بوجھ، ذہانت، اخلاق ومروت اور علم مجلس سے نوازا تھا۔ ساری عمر سیرتِ نبویہ اور صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب تحریر کرتے گذری۔ آزادی سے پہلے برطانوی جبر واستبداد کا مقابلہ کرتے رہے اور پھر آزادی کے بعد فرقہ پرستوں اور تقدس نبوّت اور ناموسِ اہل بیت رسالت کے مخالفوں سے مقابلہ ومقاومت میں مصروف رہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دینی ومذہبی مصلحین اور قومی وملی خدمات انجام دینے والے افراد کی قدردانی ان کی زندگی میں کما حقہٗ نہیں ہوتی، اس طرح نہ جانے کتنے محسنین امّت اور خدامِ ملک وملّت جو نام ونمود اور ریا ونمائش سے کوسوں دور رہ کر اپنے منصب وفرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مشغول رہ کر دنیا سے اٹھ گئے انھیں ملّت نے سپردِ طاقِ نسیاں کر دیا۔ بدقسمتی سے یہی ہمارا ملّی مزاج اور قومی خاصہ بن گیا اس لیے جو لوگ اخلاص اور

نیک نیتی کے ساتھ قوم وملّت کی فلاح و بہبودی میں منہمک ہیں ان کے سامنے اکثر یہ ایک سوالیہ نشان بنا رہتا ہے۔

مولانا مرحوم کے ساتھ اگر چہ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی مگر حالات ضرور تند و تیز اور سنگلاخ پیش آتے رہے اور جن طاقتوں سے وہ ہمیشہ نبرد آزما رہے وہ موقع بموقع نیش زنی اور دکھ پہنچانے کا سامان مہیا کرتی رہیں مگر انھوں نے انتہائی صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ اپنے مشن کو جاری رکھا۔ النجم بند ہوا تو آفتاب نکالا، اس پر آنچ آنے لگی تو حرم نکالا، وہ بند ہوا تو خضر نکالا پھر اس کی زندگی ختم ہوئی تو ہادی نکالا مگر وہ بھی رہزنوں کی نذر ہو گیا۔ عمدۃ المطابع کے نام سے ان کا اپنا پریس تھا مگر وہ بھی کچھ اپنی سادگی اور کچھ دوسروں کی 'موقع شناسی' کے ہاتھوں مختلف حصّوں میں منتشر ہو کر غیروں کے کاشانوں کی زینت بن گیا:

اڑائے کچھ ورق نرگس نے کچھ لالہ نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

ان دلخراش وادیوں سے گذر کر وہ شخص جو اپنوں سے محبت و شفقت سے پیش آتا تھا، دوستوں کا دوست تھا اور جسے غیروں تک کی دل شکنی ایک لمحہ کے لیے گوارا نہ تھی وہ ۲۹؍رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۱؍جنوری ۱۹۶۷ء کو بروز چہارشنبہ بوقت صبحِ صادق عید الفطر سے عین ۴۸ گھنٹہ قبل اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔ ۳۰؍رمضان المبارک بعد نماز ظہر جھاؤ باغ چکمنڈی میں حضرت مولانا عبد السلام صاحب فاروقیؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور پھر وہیں مزار چپ شاہ میاں میں اپنے والد ماجدؒ کے قریب چبوترے اور مغربی دیوار کے درمیان تدفین عمل میں آئی۔

مولانا محمد عبد المہیمن صاحب فاروقیؒ (۱۹۱۳ء-۱۹۹۲ء)

آپ کی پیدائش ۱۹۱۳ء میں کاکوری میں ہوئی، بچپن اور ابتدائی تعلیم کے دن بھی وہیں گذرے، سنِ شعور کو پہنچے تو مدرسہ قدیمہ فرنگی محل اور پھر مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں داخل کر دیئے گئے، کچھ عرصہ کے لیے کانپور اور پھر مدرسہ عالیہ عربیہ امروہہ ضلع مراد آباد میں بھی بغرضِ تعلیم قیام رہا۔ کچھ مدت تک ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ کے زیرِ تربیت مئوناتھ بھنجن (یوپی) میں بھی قیام رہا تھا۔ ان حالات میں صرف متوسطات تک ہی آپ کی تعلیم ہو سکی۔

تعلیمی سلسلہ ختم ہونے کے بعد اپنے والد ماجدؒ کے قائم کردہ مکتبہ اسلامیہ لکھنؤ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ انجم کے انتظامیہ شعبہ سے بھی وابستگی رہی۔ انجم کے بند ہو جانے کے بعد تجارتی سلسلہ شروع کیا جس میں بڑی ترقی ہوئی۔ زندگی کے آخری ایام میں پھر کتابوں کا کاروبار شروع کیا تھا اور مکتبۂ صدیقیہ کے نام سے اپنا ذاتی مکتبہ قائم کر لیا تھا جس کے ذریعہ اپنے والد ماجدؒ کی متعدد کتابیں شائع کیں۔ اسی زمانہ میں کاکوری ریلوے اسٹیشن کے قریب کی بستی درگا گنج میں ایک دینی مدرسہ دارالعلوم عثمانیہ کے نام سے قائم کیا تھا جو آج بھی موجود ہے اور انشاء اللہ ان کے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہوگا۔ اسی عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں حج کی سعادت بھی عنایت فرمائی تھی۔

ان کی شخصی زندگی کی ایک خاص بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ان میں خدمت و محبت کا جذبہ بے پناہ تھا۔ خاندان کے اکثر افراد کی بیماریوں میں انھوں نے تیمارداری کے فرائض بڑی حسن وخوبی سے انجام دیے تھے۔ ایسے حالات میں وہ اپنی تمام نجی مصروفیات کو منسوخ کر کے مریض کی دیکھ بھال اور اس کی ہر طرح کی ہاتھ پیروں کی خدمت کرنا اپنے اوپر لازم کر لیتے تھے۔ یہی کام انھوں نے اپنے والد گرامی حضرت لکھنویؒ کی آخری بیماری میں کیا، ان کے مرضِ وفات کے آغاز سے آخری لمحۂ حیات تک ہمہ قسم کی خدمات انجام دیں اور اس طرح جیتے جی اپنے کو جنت کا مستحق بنا لیا۔

آپ کی شادی کاکوری میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ ہوئی تھی جن سے اس وقت تین بیٹے عزیزان عبدالمتین فاروقی، عبدالقوی فاروقی اور عبدالقدیر فاروقی اور دو بیٹیاں بحمد اللہ موجود ہیں۔ آخری چند برسوں میں آپ کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی مگر پھر بھی اپنی ہمت سے تمام فرائض کی انجام دہی میں منہمک رہے۔ بالآخر جولائی ۱۹۹۲ء میں آپ کا انتقال ہو گیا اور درگاہ شاہ کرامت علی صاحبؒ کاکوری کی مغربی دیوار کے بیرونی جانب اپنے خاندانی قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

بی بی ماریۃ الزہراءؒ (۱۹۱۵ء-۱۹۳۶ء)

آپ کی پیدائش لگ بھگ ۱۹۱۵ء میں کاکوری میں ہوئی، پرورش اور تربیت والدین محترمین کی خصوصی توجہ اور نگہداشت میں ہوئی۔ چونکہ آپ اپنے بھائیوں میں تنہا بہن تھیں اس لیے والدین، سب بھائیوں اور خاندان کے دیگر افراد کی بہت چہیتی اور لاڈلی تھیں، آپ کی گھریلو تعلیم

اور دینی مزاج کی تشکیل میں حضرت لکھنویؒ کا خصوصی دخل تھا اسی لیے تقویٰ اور پرہیز گاری میں آپ اپنی ہم عصر خواتین میں ممتاز حیثیت کی مالک تھیں، قرآن مجید کی نہایت عمدہ تعلیم، اردو زبان میں پڑھنے اور لکھنے کی بہت اچھی مشق اور مسائلِ دینیہ ضروریہ کی پوری معلومات آپ کو خالص گھریلو ماحول میں دلائی گئی تھی۔ آپ کی تحریر کی زیارت کا شرف راقم الحروف کو ہوا ہے جو نہایت پاکیزہ اور پختہ رسم الخط میں تھی۔ فرائض دینیہ کے بعد نوافل کا بے حد اہتمام، رمضان المبارک کے علاوہ احادیث میں جن روزوں کی تاکید آئی ہے ان پر مداومت، قرآن مجید کی بلا ناغہ تلاوت اور شب خیزی کے ساتھ ساتھ والدین کی خدمت اور بھائیوں کی محبت انھیں منجانب اللہ ودیعت ہوئی تھی۔ ان سب خوبیوں کے علاوہ گھریلو کاموں کو خود انجام دیتی تھیں۔ چونکہ والد ماجد حضرت لکھنویؒ کی زندگی بہت منظم اور پابند اوقات تھی اس لیے آپ کے مزاج میں بھی تنظیم اور گھریلو نظم ونسق بدرجۂ اتم تھا۔ اپنے اخلاق واعمال اور کردار میں جس طرح وہ ایک مثالی شخصیت کی مالک تھیں اسی طرح ان کا عقد بھی ایک مثالی طریقہ پر ہوا تھا۔ رشتہ طے ہو جانے کے بعد ایک دن والد معظمؒ نے نماز کے بعد مسجد میں اعلان کیا کہ سب حضرات ٹھہر جائیں میری لڑکی کا نکاح ہے، قریبی لوگ حیرت زدہ رہ گئے چنانچہ جو لوگ وہاں موجود تھے وہ ٹھہر گئے، اور وہیں اپنے بھتیجے مولانا عبدالحلیم فاروقیؒ کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح پڑھ دیا۔ جس وقت مسجد میں یہ سب ہو رہا تھا آپ گھر میں اپنے روزمرّہ کے لباس میں ملبوس حسب معمول گھر کے کاموں میں مشغول تھیں اور پھر شام کو اسی لباس میں آپ کی رخصتی عمل میں آئی۔ اس وقت نہ جہیز کا کوئی چرچا اور نہ ہی شادیوں کی جیسی کوئی بھیڑ بھاڑ اور ہجوم تھا۔ آج اس سادگی کی مثال مسلم عوام میں تو کجا اچھے اچھے علماء کے گھرانوں میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ اتنے عظیم اور صاحبِ حیثیت باپ کی اکلوتی بیٹی اس سادگی کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت ہوئی۔

آپ نے صرف اکیس سال کی مختصر زندگی پائی تھی۔ شادی کے دس ماہ کے بعد ۲۶؍شعبان ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء کو بچہ کی ولادت ہوئی جو چند سانسوں کے بعد اللہ کو پیارا ہو گیا اس کے بعد وہ زچگی کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئیں، مستقل بخار رہنے لگا، چنانچہ ۵؍رمضان المبارک ۵۵ھ کو لکھنؤ کے کوئن میری اسپتال میں ایک پرائیوٹ کمرہ لے کر انھیں داخل کر دیا گیا جہاں جانچ پڑتال کے بعد لیڈی ڈاکٹروں نے نمونیہ تجویز کیا اور یہی نمونیہ آگے چل کر ان کے لیے مرض

الموت بن گیا جس کے نتیجہ میں دسمبر ۱۹۳۶ء میں وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جاملیں۔ جنازہ لکھنؤ سے کاکوری لے جایا گیا اور وہیں ان کے دادا، والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی کے قریب دفن کردیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پاک پر تا قیامت اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے۔[1]

مولانا حافظ محمد عبدالعزیز صاحب فاروقیؒ (۱۹۱۹ء-۱۹۵۴ء)

مولانا مرحوم کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں بمقام کاکوری ہوئی۔ مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں قرآن مجید حفظ کیا۔ کتب عربیہ کی تعلیم کچھ اپنے والد سے کچھ اپنے برادر اکبر مولانا عبدالسلام صاحبؒ سے اور کچھ دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ تجوید کی سند پہلے مدرسہ فرقانیہ کے مشہور استاد قاری عبدالمعبود صاحبؒ سے اور پھر جب ۱۹۳۸ء میں والد ماجدؒ کے ہمراہ حج کو گئے تو وہاں مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ سے بھی حاصل کی۔ اسی سفر میں استاذ المحدثین حضرت مولانا شیخ عبدالغنی محدث دہلویؒ مہاجر مدنی کی صاحبزادی صاحبہ سے تبرکاً حدیث میں صحاح ستہ کی سند بھی اوائل سنا کر حاصل کی تھی۔

آپ کو صغر سنی ہی میں حضرت مولانا شاہ ابو احمد صاحب نقشبندی مجددی، بھوپالیؒ سے بیعت ہونے کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔ آپ جید حافظ تھے، اور فن تجوید کی پوری رعایت رکھتے ہوئے نہایت بلند آواز سے تراویح میں قرآن مجید سُناتے تھے، آپ کے پیچھے سننے والوں کا بڑا مجمع رہا کرتا تھا۔ اکثر جمعہ و عیدین کی نمازیں محلّہ ٹکیٹ گنج لکھنؤ کی بڑی مسجد میں پڑھاتے تھے، آپ کا وعظ بھی بہت پُر جوش اور پُر تاثیر ہوتا تھا۔ ایک عرصہ تک لوگ آپ کے مواعظ کا ذکر کر کے رنج و غم کا اظہار کرتے تھے۔ مدح صحابہ کی تحریک میں اپنے کو خطرہ میں ڈال کر بہت کارہائے نمایاں انجام دیئے اور کئی بار قانون شکنی کر کے جیل بھی گئے۔ آل انڈیا مدح صحابہ مشاعرہ کا سنگِ بنیاد بھی انھی کا رکھا ہوا ہے جو آج تک کسی نہ کسی شکل میں بدستور باقی ہے۔

آپ انتہائی جامہ زیب، وجیہ و پُر وقار اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ بہت جری، بے باک اور باہمت تھے، عمائدینِ شہر اور حکّامِ وقت بھی آپ کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، ضرورت مند اور مظلوم مسلمانوں کی بڑی دستگیری فرماتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں دارالمبلغین میں بحیثیت استاد

---

[1] مرحومہ کے حالات کی مزید تفصیل کیلئے دیکھیں ماہنامہ ''البدر'' کاکوری کا مولانا عبدالحلیم فاروقی نمبر، جولائی - اگست ۱۹۹۴ء

تقرر رہا تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس سے سبکدوشی حاصل کر کے تجارت کا پیشہ اختیار کیا جس میں بڑی ترقی کی۔ایک زمانہ میں کتابوں کی اشاعت کا کام بھی کیا تھا جس کے ذریعہ حضرت لکھنویؒ کے بعض اہم نادر مسوّدات کی اشاعت بھی کی تھی۔ایک مختصر مدّت کے لیے النجم کو بھی دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

ضلع رائے بریلی یوپی میں آپ کا عقد ہوا تھا جس سے پانچ بیٹیاں اور ایک تنہا بیٹے عزیزی حافظ عبدالمقتدر فاروقی پیدا ہوئے تھے۔آپ کی سب اولادوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور سب صاحبِ اولاد ہیں لیکن اب تین بیٹیوں کی وفات ہو چکی ہے۔

صاحبزادہ عبدالمقتدر فاروقی کے بھی ایک بیٹا عبدالقادر فاروقی اور ایک بیٹی ہے۔مولانا مرحوم عرصہ سے جگر کے مریض تھے جس نے رفتہ رفتہ خطرناک صورت اختیار کر لی ہر ممکن تدبیریں کی گئیں مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی بالآخر ۹ محرم الحرام ۱۳۷۴ھ کو آپ کا وصال ہو گیا اور چکمنڈی میں احاطہ مزار چپ شاہ میاں میں تدفین عمل میں آئی۔

مولانا حکیم عبدالغنی صاحب فاروقی مدظلہٗ (پیدائش ۱۹۲۲ء)

آپ کی پیدائش ۱۹۲۲ء میں امروہہ ضلع مرادآباد میں ہوئی تھی۔اس زمانے میں آپ کے والد ماجدؒ مدرسہ عربیہ چلّہ امروہہ میں بسلسلہ تدریس مقیم تھے۔آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر اس کے بعد آپ کو لکھنؤ لاکر ایک پرائمری مکتب میں داخل کر دیا گیا۔اس کے بعد مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں باضابطہ داخل ہو کر ۱۹۴۱ء میں درس نظامی کی تکمیل کی۔بخاری شریف اور دیگر کتبِ حدیث دارالمبلّغین لکھنؤ میں اپنے والد ماجدؒ سے پڑھیں اور انھی سے تین بار پورے قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کا دور بھی کیا۔طب کی تعلیم تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں داخل ہو کر حاصل کی جہاں سے ۱۹۵۰ء میں بی، آئی، ایم، ایس کی ڈگری لی۔عرصہ تک مختلف سرکاری وغیر سرکاری ڈسپنسریوں میں بحیثیت طبیب کام کیا اور اپنا ذاتی مطب بھی کیا۔

آپ کو تصنیف وتالیف سے بھی شغف ہے، جو کچھ بھی لکھا ہے وہ نہایت شگفتہ اور جاذب طرز میں لکھا ہے، حضرت لکھنویؒ کے کچھ رسالے اور بعض مکاتیب بھی آپ نے شائع کیے ہیں۔ طبیب ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دستِ شفا بھی عطا کیا ہے۔آپ نے جب بھی مطب کیا بہت کامیاب رہا۔شعروسخن سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، ہزاروں اشعار آپ کو یاد ہیں۔

خود بھی شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، بہت متحرک اور فعال ہیں۔ سفر بہت کرتے ہیں اور ہر وقت رواں دواں نظر آتے ہیں۔ مستقل رہائش کاکوری میں ہے۔ اس وقت بحمد اللہ اپنے والد ماجدؒ کی اولادوں میں آپ تنہا ہمارے درمیان موجود ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں مزید برکت عطا فرمائے۔ کاکوری کے نواح میں ایک دینی مدرسہ بھی آپ نے قائم کیا ہے جو اس علاقہ میں فیض پہنچا رہا ہے۔

آپ کا عقد کاکوری میں اپنی چچازاد بہن سے ہوا تھا جن سے اس وقت ایک بیٹی اور دو بیٹے عزیزان عبدالمغنی فاروقی اور عبدالمعطی فاروقی بحمد اللہ موجود ہیں۔ یہ دونوں بھائی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں اور درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور سب کی شادیاں ہو چکی ہیں اور صاحب اولاد بھی ہیں۔

اس طرح حضرت لکھنویؒ کو اللہ تعالیٰ نے نو اولادیں عطا کی تھیں جن میں صاحب زادی صرف ایک تھیں۔ دو بچوں کا صغرسنی میں انتقال ہو چکا تھا اور تین اولادیں بڑی اور صاحبِ اولاد ہو کر ان کی حیات میں ہی دنیا سے اٹھ چکی تھیں۔ آپ بہت رقیق القلب اور نرم مزاج تھے، اپنے تمام اعزا سے بہت لگاؤ اور تعلق تھا، ان میں سے جس نے بھی ان کے سامنے وفات پائی اس کا صدمہ انھیں بہت ہوا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ جتنا رقیق القلب تھے اتنا ہی اس قسم کے حادثات بھی انھیں پیش آئے۔ اہل اللہ اور خاصانِ خدا کی آزمائش بھی ان کے مرتبہ اور مقام کو دیکھ کر کی جاتی ہے۔ ان کا جتنا زیادہ بلند مقام ہوتا ہے عموماً اتنی ہی سخت آزمائش بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ کسی کو مال سے اور کسی کو جان سے آزمایا جاتا ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ مولانا علیہ الرحمۃ کو جان کے نقصان سے آزمایا گیا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان امتحانات میں بھی وہ پورے اترے۔ اعزا واقرباء کے اٹھ جانے پر انھوں نے انتہائی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور رضا بالقضاء پر عمل پیرا رہے۔ ان کے سامنے ان کے والدین گئے۔ دو کمسن بچے گئے، تین نوجوان صاحبِ اولاد اولادیں اٹھ گئیں، وفا شعار اور خدمت گذار اہلیہ کی مہجوری برداشت کی اور آخری عمر میں تنہا ایک بھائی تھے انھوں نے بھی ساتھ چھوڑا۔ غرض کہ ان پیہم، پے درپے صدمات نے ان کی دنیاوی زندگی کو بہت متاثر کیا تھا مگر وہ صبر و برداشت کے ایک کوہِ گراں تھے، ہر غم واندوہ کا مردانہ وار استقبال کیا اور کتاب وسنت کے عین مطابق ان سب سے عہدہ برآ ہو کر خود بھی مالکِ کائنات کے حضور اپنا ٹھکانہ بنالیا۔

چھبیسواں باب

حضرت لکھنویؒ اپنے معاصرین کی نظر میں

کسی شخصیت کے بارے میں کچھ جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں اس کے معاصرین کیا رائے رکھتے ہیں کیونکہ معاصرت کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے معاصر کا اعتراف بڑی جانچ پرکھ اور تحقیق و تفتیش کے بعد ہی کرتا ہے، اعزا و اقرباء مریدین و مسترشدین اور شاگردانہ تعلق رکھنے والے افراد تو محبت و احترام کے جذبات رکھتے ہی ہیں مگر دیکھنا یہ چاہیے کہ جو ان طبقوں میں سے کسی سے بھی تعلق نہیں رکھتا ہے اس کے خیالات کیا ہیں۔ حضرت مولانا لکھنویؒ بنیادی طور پر طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایک مبلّغ دین، مصلح امّت اور صاحبِ ارشاد بزرگ بھی تھے لہٰذا ان کے ارادت مندوں میں علماء و خواص کے علاوہ عوام کا بھی ایک بڑا حلقہ تھا جس کا ان سے براہِ راست تعلق تھا۔ ہم اس باب میں ان تمام حلقوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کے تاثرات پیش کرنے کی کوشش کریں گے جو ذاتی طور پر ان کے جاننے و پہچاننے اور دیکھنے و سننے والے ہیں۔ ان میں سے بعض تاثرات تو وہ ہیں جنھیں ان کی حیات ہی میں تحریر کیا گیا تھا اور بعض وہ ہیں جو ان کی وفات کے بعد بطور تعزیت لکھے گئے تھے۔ ان لکھنے والوں میں تقریباً سب ہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا اور سنا ہے۔ البتہ چند حضرات ایسے بھی ہیں جنھوں نے آپ کو دیکھا نہیں بلکہ آپ کے علمی کارناموں سے واقف ہونے کی وجہ سے انھوں نے بعض مواقع پر اپنے خیالات تحریر کیے ہیں۔

مولانا حکیم سیّد عبدالحی حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (م ۱۹۲۳ء)

''شیخ (وقت) فقیہہ و عالم (مولانا) عبدالشکور ابن ناظر علیؒ بن فضل علیؒ کاکوروی مشہور علماء میں

سے ہیں۔ مولانا عین القضاۃ (صاحب) کے مدرسہ فرقانیہ (لکھنؤ) میں ایک مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہنے کے بعد انھوں نے ۱۳۴۴ھ میں وہاں سے سبکدوشی اختیار کر لی اور پھر تصنیف و تالیف، بحث و مناظرہ، تردید مذہبِ شیعہ امامیہ، تائید مذہبِ اہلسنت اور خلفاء راشدین و صحابۂ کرام کی مدافعت اور ان کے فضائل و مناقب کو نمایاں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے اِن (نفوسِ قدسیہ) کے محاسن و کمالات اور امّتِ مسلمہ پر ان کے احسانات کو اس طرح اُجاگر کیا کہ شیعی حکومت کے زیرِ اثر اور ان کے طویل اختلاط سے سنیوں میں جو بدعات، رسومِ فاسدہ اور عقائد ضالّہ پیدا ہو گئے تھے ان کا قلع قمع ہوا اور صحابہؓ کی عظمت اور ان کے تقدس کا سکہ دلوں پر قائم ہوا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کتابیں لکھیں، مناظرے کیے، تقریریں کیں اور اعتراضات کے جوابات دیے۔ اسی طرح انھوں نے شیعوں کے عقائد، ان کے خیالات اور ان تمام چیزوں سے جن کو ان لوگوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں درج کر رکھا تھا پردہ ہٹایا جن سے اخص الخواص حضرات کے سوا عوام اور عام علماء (اب تک) ناواقف تھے۔ اسی لیے وہ ہند اور بیرون ہند میں اس خاص علم میں یکتائے روزگار اور امام وقت تسلیم کر لیے گئے۔ اس موضوع خاص میں ان کے معاصرین علماء میں کوئی بھی ان کا مدمقابل اور ہم پلّہ نہیں ہو سکا سوائے اس کے کہ جس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بے گنتی و بے شمار لوگوں کو نفع پہنچایا۔ انھوں نے ان تمام رسومِ بد کا خاتمہ کیا جو ہندوستان میں شیعوں کے اثر سے پھیلی ہوئی تھیں۔ مثلاً کاغذ سے مقابر کی شبیہ بنانا جنھیں تعزیہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بدظنی اور ان کے شانِ اقدس میں بدگوئی اور ان کی ذواتِ مقدسہ پر آئے دن ہونے والے حملوں کا انھوں نے استیصال کیا جس کے نتیجہ میں لوگوں نے خالص سنّی عقائد کو اختیار کیا جس سے صحابہ کرام کی محبت وان کی تعظیم دلوں میں راسخ ہو گئی —— ان سب باتوں کے باوجود انھیں تقویٰ و پرہیزگاری، تواضع و انکساری، اصلاح نفس، ترکِ تکلّف و گوشہ نشینی، مداومتِ گریہ وزاری، زہد و توکل اور ذکر و مراقبہ کی بھی دولت حاصل تھی[۱]۔"

مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ

سابق صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی (م ۱۹۵۲ء)

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے ایک موقع پر تحریر فرمایا تھا:

"جامع معقول و منقول و حاوی فروع و اصول حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب لکھنوی" مدیر النجم

---

۱ نزہۃ الخواطر، جلد ۸، ص ۲۵۳-۲۵۴، حیدرآباد، ۱۹۷۰ء، (ملخصاً) مع اضافہ از مولانا سید ابوالحسن فاروقیؒ

علماء احناف اہلسنّت و جماعت میں ایک متبحر اور مقدس عالم ہیں۔ مذاہب باطلہ خصوصاً شیعوں کے مقابل میں مولانا موصوف کی خدمات قابلِ قدر و تحسین ہیں، جزاھم اللہ عنی و عن سائر المسلمین۔ حضرت مولانا اس کے مستحق ہیں کہ مذاہب باطلہ کے مقابلہ میں اہلِ اسلام ان کو اپنا نمائندہ منتخب کریں[۱]۔ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی اس دور کے شاہ عبدالعزیزؒ ہیں[۲]۔''

محدّثِ جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مئوی پی (م ۱۹۹۲ء)

''میں نے امام اہلسنّتؒ کو سالہائے دراز تک ہزاروں مجلسوں میں، سیکڑوں جلسوں میں، سفر میں، حضر میں اور اپنے گھر میں بھی، درس دیتے ہوئے بھی، وعظ فرماتے ہوئے بھی، اور نماز پڑھتے ہوئے بھی، سوتے ہوئے بھی، جاگتے ہوئے بھی، ریل میں بھی، اور پانی کے جہاز میں بھی، ہندوستان میں بھی اور مکہ و مدینہ اور عرفات و منیٰ میں بھی، مولانا اسباط[۳] کو سبق پڑھاتے ہوئے بھی، عبدالغنی[۴] کو کھلاتے ہوئے اور مولانا عبدالرحیم صاحب[۵] کو ڈانٹتے ہوئے بھی غرض ہر رنگ اور ہر حال میں بہت ہی نزدیک سے دیکھا ہے۔ ہزاروں صحابہ، تابعین و ائمہ دین، علماء و مشائخ، صوفیا اور فقہاء و محدثین کے تذکرہ اور حالات خوب پڑھ کر اور وسیع مطالعہ کر کے امام اہلسنّتؒ کی کتابِ زندگی کا مطالعہ میں نے اپنی آنکھوں سے پوری بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ امام اہلسنّت مردِ باصفا و حق آگاہ، ہم رنگ کاملین و اہل اللہ، عالم باعمل کے صحیح مصداق، علوم آلیہ و عالیہ میں فرد و طاق، صاحبِ بصیرت فقیہ اور نکتہ رس مفسّر، تحفظ ناموسِ صحابہ کے پُرجوش حامی، ردِّ شیعہ و احقاقِ حق میں اس عہد کے ابن تیمیہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ، معارفِ صوفیہ حقّہ سے کامل بہرہ ور، مکتوباتِ امام ربانی کے حافظ، نماز کے عاشق، سنّت کے شیدائی، دنیا سے بے رغبت اور حطامِ دنیا سے متنفر اور مختصر یہ کہ وہ اس دور کے عالمِ ربانی تھے[۶]۔ اخبارات سے اس عظیم سانحۂ غم و الم کی اطلاع ملی جس سے بڑا کوئی غم

۱۔ علماء کی رائیں، ص ۳۰ ۲۔ تاریخی مضامین، ص ۹

۳۔ مولانا محمد اسباط صاحبؒ حضرت لکھنویؒ کے ایک خصوصی شاگرد اور مدرسہ فرقانیہ کے استاذ تھے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور وہیں وفات پائی۔ ۴۔ مولانا علیہ الرحمہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے

۵۔ مولانا لکھنوی کے حقیقی چھوٹے بھائی ۶۔ ماہنامہ ''البدر'' کاکوری، جولائی - اگست ۱۹۸۱ء

انگیز سانحہ چند برسوں سے پیش نہیں آیا۔جن اکابر علماء ہند کی خدمتوں میں مجھے نیاز حاصل تھا ان میں کسی کے اٹھ جانے کا مجھے اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جدائی کا ہوا بجز ان حضرات کے جن سے میرا رشتہ تلمذ یا استرشاد کا تھا یا بجز مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے کہ ان کی وفات سے بھی میں بہت متاثر ہوا تھا۔حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے علمی و عملی کمالات کے لحاظ سے اس دَور میں بے نظیر اور ان کی شخصیت بالکل منفرد شخصیت تھی[۱]۔"

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور (م ۱۹۷۹ء)

"حضرت مولانا علوم آلیہ و علوم عالیہ دونوں میں یکساں دستگاہ رکھنے والے متبحر عالم تھے۔قدیم بزرگانہ وضع اور سادگی کا پیکر تھے۔وہ مجددی تھے اور ان کے کارناموں میں اس چیز کا ایک مخصوص رنگ نمایاں تھا۔وہ فاروق و فارق بین الحق والباطل بھی تھے اور فاروقی بھی۔ان کی ذاتِ گرامی مجموعۂ کمالات تھی۔انھوں نے اپنی ہشتادونہ سالہ زندگی میں جو عظیم دینی و تبلیغی خدمات انجام دیں اور اس سلسلے میں جو کارنامے انجام دیئے وہ اشاعتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔فرق باطلہ کے خلاف جس جرأتِ مندانہ عزم اور حوصلہ کے ساتھ انھوں نے زبانِ قلم اور قلم زبان سے جہاد کیا ہے وہ منت کشِ اظہار و شرمندۂ توصیف نہیں ہے۔ان کی وفات سے دینی و علمی طبقہ و مذاہب باطلہ کار داور قلع قمع کرنے والے افراد کے حلقہ میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے اس کا مستقبلِ قریب میں تو کیا بعد میں بھی پُر ہونا متوقع نہیں[۲]۔"

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ سابق مدیر الفرقان لکھنؤ (م ۱۹۹۷ء)

"ہمارے دینی اور علمی حلقوں میں حضرت مولانا کی شہرت مسلکِ اہلسنت کے ایک لائق وکیل اور کامیاب مناظر و متکلم کی حیثیت سے رہی ہے اور اس کام کے لیے یہ واقعہ ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں کسی خاص درجہ کے رسوخ علمی کی ضرورت نہیں رہی ہے اس لیے جن لوگوں کو مولاناؒ کے قریب رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا ان کو غالباً بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ ممدوح صرف مناظر اور مصنّف ہی نہیں بلکہ علمائے راسخین میں سے تھے۔نامور اصحابِ درس کی سی ٹھوس علمی استعداد اور

---

۱ ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ، ۲۶ مئی ۱۹۶۴ء ۲ بحوالہ مذکورہ

اپنے دائرے میں مطالعہ بہت وسیع تھا۔اس کے ساتھ قدرت نے حافظہ بھی بے نظیر دیا تھا۔راقم السطور نے اپنی عمر میں بہت کم حضرات ایسے قوی الحافظہ دیکھے ہیں۔ جن لوگوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سُنی ہیں انھیں یاد ہوگا کہ صرف قرآنی آیات واحادیث ہی نہیں بلکہ شیعوں کی کتب حدیث واسماء الرجال اور بعد کے مصنفین کی کتابوں کی بھی لمبی لمبی عبارتیں حتیٰ کہ شاہ نامہ[1] اور حملۂ حیدری[2] کے صفحے کے صفحے مولانا بالکل حافظوں کی طرح پڑھتے تھے۔ بہر حال مولانا اپنے غیر معمولی حافظہ کے لحاظ سے اللہ کی قدرت کی ایک نشانی تھے۔سلامتیٔ فہم کے ساتھ ذہانت و ذکاوت سے بھی اللہ تعالیٰ نے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ان سب چیزوں کے جامع ہونے کی وجہ سے خالص علمی حیثیت سے بھی مولانا کا مقام بہت بلند تھا،علومِ دین کے مختلف شعبوں میں سے علمِ قرآن سے خاص شغف تھا۔آپ کا سلسلہ تفسیر آیات آپ کے تدبّر فی القرآن کی زندہ اور باقی رہنے والی شہادت ہے[3]۔"

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ دارالعلوم دیوبند (م ۱۹۲۸ء)

"حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کی مساعی جمیلہ وخدمات اسلامیہ جوانھوں نے ادیانِ باطلہ کی تردید اور فرقِ ضالّہ کے ابطال وازہاق میں فرمائی ہیں وہ ہر طرح پسندیدہ و مستحسن ہیں۔ درحقیقت حضرت مولانا نے تمام اہلسنّت و جماعت کی طرف سے اس فرض کفایہ کو ادا فرما کر سب کو مرہونِ منّت وسبکدوش فرمایا ہے۔جزاہ اللہ تعالیٰ عنہ و عن جمیع المسلمین المحققین الحنفیین السنیین خیرا الجزاء. ہم ان کو ہمیشہ کے لیے فرق ضالّہ کے مقابلہ میں اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں اوران کا ساختہ وپرداختہ اوران کی ہار جیت کو اپنی ہار جیت تصوّر کرتے ہیں۔واللہ علیٰ مانقول شہید[4]۔"

حضرت مولانا سیّد منت اللہ صاحب رحمانیؒ

سابق امیر شریعت بہار وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ (م ۱۹۹۱ء)

"حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ایک بڑا حادثہ ہے، دینی بھی اور علمی بھی۔حضرت نے جس نوعیت کی دینی اور اسلامی خدمت ہندوستان میں انجام دی وہ اپنی مثال آپ ہے۔آپ کا مشن

---

[1] شاہ نامہ فردوسی [2] حملہ حیدری، مرتبہ علامہ باذل ایرانی [3] ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ، مئی ۱۹۶۲ء

[4] علماء کی رائیں، ص ۵۶

اگر کامیاب نہ ہوتا تو ہندوستانی مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں حق و باطل کا امتیاز مٹ چکا تھا۔ حق تعالیٰ حضرت مرحوم کے مراتب بلند فرمائے اور ہم لوگوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہمارے بزرگوں میں تھے۔ حضرت والد ماجدؒ[۱] سے ان کے جو مراسم تھے ان کی روشنی میں اگر میں یہ کہوں کہ اس غم میں ہم اور آپ برابر کے شریک ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔[۲]"

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (م ۱۹۹۹ء)

"نہ صرف ہمارے شہر لکھنؤ اور نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام اور عصر حاضر کا ایک اہم ملّی اور دینی حادثہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کی وفات ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا اس وقت دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء و مصلحین اور ان چند برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے تاریخِ اسلام کے مختلف زمانوں میں خاص اصلاحی اور تجدیدی کام لیا ہے۔ وہ علاوہ اس کے کہ ایک بڑے متبحر عالم اور عمیق النظر فقیہ تھے ایک کامیاب مصنف اور متکلم، صاحبِ سلوک اور صاحبِ سلسلہ شیخ اور خوش بیان مقرر بھی تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے عامہ مسلمین اور اہلسنّت کے ذہنوں کو صاف کرنے کا اور صحابۂ کرام سے ان کا رابطہ تازہ اور مستحکم کرنے کا ضروری کام انجام دیا اور اس سلسلہ میں ان غلط فہمیوں اور غیر اسلامی اثرات سے بچایا جو ناواقفیت، غلط صحبت، اور غلط پروپیگنڈے سے ان میں سرایت کر گئی تھیں۔ حقیقت میں ہندوستان کی سرزمین میں اس مخصوص سلسلہ کے جس اصلاحی کام کو حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنے اپنے وقت میں انجام دیا تھا مولانا نے اس کو بہت آگے بڑھایا اور اس کی ترقی و تکمیل کی خدمت انجام دی۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ وہ اس موضوعِ خاص اور شیعہ لٹریچر اور ان کے عقائد اور علم کلام کے اس زمانے میں سب سے بڑے عالم اور ناقد تھے اور اس سلسلہ میں نہ صرف یہ کہ عصر

---

[۱] یعنی حضرت مولانا سیّد محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ، سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (م ۱۹۲۷ء)

[۲] ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ، امام اہلسنت نمبر، ۲۶ر مئی ۱۹۶۴ء

حاضر میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی تحقیقات بہت سے قریب العصر متقدمین سے بھی آگے بڑھ گئی تھیں، نہ صرف صحابۂ کرام سے مسلمانوں کا رابطہ پیدا کرنے میں بلکہ قرآن مجید اور دینی عبادات کے ساتھ بھی تعلق پیدا کرنے اور نمازوں کی پابندی اور اس کی تبلیغ واشاعت میں بھی خصوصیت کے ساتھ اودھ اور لکھنؤ کے قرب وجوار میں مولانا کا بہت بڑا حصہ ہے۔

ان تمام علمی کمالات اور اصلاحی خدمات کے ساتھ مولانا کی زندگی بڑی سادہ اور زاہدانہ اور علمائے سلف کی زندگی کا نمونہ تھی۔ انھوں نے آخر وقت تک زہد وقناعت اور تورّع کی زندگی گذاری اور اپنی مقبولیت اور شہرت سے کوئی مادّی منفعت حاصل نہیں کی۔ جو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے وہ اس سادہ اور درویشانہ زندگی سے بہت متاثر ہوتے۔ باوجود اس کے کہ ان کے مریدین اور محبّین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور وہ ہندوستان اور بیرون ہند میں بڑی شہرت اور مقبولیت رکھتے تھے مگر ان کی قیام گاہ پر کسی تجمل وامارت کا ادنیٰ سا نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ مزاج میں نہایت درجہ کی تواضع اور سادگی تھی۔ تقریر وتحریر جچی تلی، حشو وزوائد سے پاک اور تصنّع کے ادنیٰ شائبہ سے بھی بالکل دور تھی۔ اس کے باوجود ان کے مواعظ نہایت مؤثر ودل نشیں اور تحریر نہایت شیریں اور شگفتہ تھی ان کی تصنیفات میں علم الفقہ، سیرۃ النبوی کا رسالہ، سیرت خلفائے راشدین، بعض آیات کی تفاسیر اور بعض اہم تراجم شامل ہیں۔ عرصۂ دراز تک علمی و دینی دنیا میں وہ خلا محسوس کیا جائے گا جو مولانا کی وفات سے پیدا ہو گیا ہے اب موجودہ علمی اور دینی انحطاط کے پیشِ نظر اُس کا پُر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے[1]۔''

حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند دہلی (م ۱۹۷۵ء)

''انتہائی رنج وغم کا مقام ہے کہ علم وفضل کا ایک اور آفتاب غروب ہوا۔ دنیائے اسلام کے مقبول ترین اور مشہور فاضلِ اجل امام اہلسنّت وجماعت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ مرحوم کی دینی اصلاحی اور کلامی خدمات سے مسلمانانِ ہند نصف صدی تک فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ مرحوم صاحبِ تصنیف اور اہل قلم تھے۔ مجلہ النجم کے ادارتی فرائض بھی ایک مدت تک انجام

---

[1] ہفت روزہ ''حرم'' لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

دیتے رہے۔ بہت سی عربی اور فارسی کتابوں کو اُردو کا جامہ بھی پہنایا۔ فقہ پر چھ سات جلدوں میں ایک مبسوط کتاب لکھ کر شائع کی۔ سیرت نبوی پر صرف قرآنِ پاک کی روشنی میں ایک ایسی کتاب لکھ گئے جس سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے خواب کی تعبیر پوری ہوتی ہے، ان کمالات اور اوصاف کے باوجود شہرت سے ہمیشہ دور رہے۔ مزاج میں بے حد انکساری اور فروتنی تھی۔ سادگی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس نقصان کی تلافی کی بظاہر کوئی شکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے۔[1]"

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب

خلیفہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بانی تحریک خدام اہلسنّت چکوال، پاکستان

"امام اہلسنّت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کی زیارت بندہ کو نصیب نہیں ہوئی لیکن آپ کی متعدد تصانیف کے مطالعہ کی بنا پر بہت زیادہ عقیدت مند ہوں۔ آپ حقیقی معنوں میں امام اہلسنّت و جماعت ہیں اور مذہب اہلسنّت و جماعت کے تحفظ اور خلفائے راشدین میں امام الخلفاء حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان ذوالنورینؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ اور حضور خاتم النبیین رحمۃ اللعالمین شفیع المذنبین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع صحابہ و اہلِ بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دفاع کا فریضہ ادا کرنے میں وہ اپنے دور کے عظیم محسنِ اُمت ہیں۔ آپ کو حق تعالیٰ نے سنّی شیعہ نزاعی مسائل میں ایک اجتہادی شان عطا فرمائی تھی۔ آپ نے فاروقی اور مجددی نسبتوں کو مال و جاہ کے حصول کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ توفیق ربانی سے حضرت فاروق اعظم اور امام ربانی مجدد الف ثانی کی عظیم نسبتوں کا پرچم بلند کیا —— امام اہل سنّت مولانا لکھنویؒ نے اعدائے صحابہ کے قلعوں کو مسمار کر کے حضرات خلفائے راشدین اور اصحاب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع فرمایا تھا۔ اپنے دور میں امام اہل سنّت کا یہ وہ تقریری اور تحریری جہاد ہے کہ صدیوں تک اس کا فیض جاری رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔[2]"

---

[1] ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

[2] "حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ" تحریک خدام اہل سنّت چکوال، پاکستان

مولانا محمد اویس نگرامیؒ سابق شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (م ۱۹۷۶ء)

''ہندوستان کی اسلامی تاریخ ایسے مردانِ حق آگاہ کا ایک بڑا سرمایہ اپنے پاس رکھتی ہے جن کی ذات سے اصلاح عقائد، تصحیح اخلاق، تزکیۂ نفس اور علوم کی نشر واشاعت کا وہ کام لیا گیا جس کے احسان سے امت کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ اس سلسلہ علیا میں کچھ خوش نصیب ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے دین کی دوسری خدمات کے ساتھ ساتھ اپنے مذاق کے اعتبار سے وقت کے بنیادی فتنوں کا مقابلہ کرنا بھی اپنی زندگی کا موضوع بنایا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو ملتِ اسلامیہ کو نقصانِ عظیم پہنچتا۔ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہمارے زمانہ میں اسی سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم سے دین کی بڑی خدمت لی۔ مواعظِ حسنہ، فقہ و فتاویٰ، رد بدعات اور تطہیر باطنی جیسے ہر موضوع پر مولانا سے علمی اور عملی انداز میں کام لیا گیا لیکن ان سب کاموں میں جو ممتاز ترین کارنامہ مولانا کے حق میں مقدر ہوچکا تھا جس میں کوئی ان کا شریک نہ تھا اور جس نے ان کو امام اہلسنّت والجماعت، کے جائز لقب سے سرفراز کیا وہ کارنامہ یہ تھا کہ اہل سنّت و جماعت کے افکار و عقائد سے جو جماعتیں عہدِ قدیم سے بنیادی اختلاف رکھتی تھیں ان میں سے ایک جماعت کے افکار وخیالات سے انھوں نے اہل سنّت و جماعت کو تحقیقی انداز میں متنبہ فرمایا۔ میری مراد شیعیت سے ہے۔ اسلامی تاریخ میں اہل سنّت و جماعت کے مقابلہ میں جن جن جماعتوں کا نام آتا ہے ان میں اس جماعت کا مسلمانوں سے اکثر و بیشتر ذہنی وفکری تصادم رہا ہے لیکن اس تصادم کے باوجود یہ عجیب بدقسمتی تھی کہ عام مسلمانوں کے اندر اس جماعت کے خیالات اور اعمال بڑی حد تک شائع اور رائج رہے...... ہر عہد کے مصلحین نے اس صورتِ حال کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا...... لیکن یہ واقعہ ہے کہ مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے اس زمانہ میں جس عالی ہمتی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مسلمانوں کو ان کے صحیح عقائد و اعمال سے ہوشیار فرمایا اور ان کی ذات سے مسلمانوں کو جو عمومی فائدہ پہنچا وہ خود ہی اپنی نظیر ہے۔

مجھ کو اس وقت خصوصیت کے ساتھ جس چیز کی طرف متوجہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اہل سنّت و جماعت کے مقابلہ میں جتنی جماعتیں مسلمانوں میں پیدا ہوئیں انھوں نے یہی دعویٰ کیا کہ ان

کے فکر ونظر کا سرچشمہ قرآن مجید ہے اور انھوں نے اپنے خیالات کی تائید میں آیاتِ قرآنیہ کو ہی استعمال کیا۔ ساتویں صدی ہجری کے مشہور عالم امام احمد بن محمد ابن المظفر ابن المختار الرازیؒ نے اپنی تصنیف حجج القرآن لجمیع اہل الملل والادیان، میں ان تمام آیات کو الگ الگ ابواب کے تحت جمع فرمادیا ہے جن کو یہ جماعتیں دلائل کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ان جماعتوں کی تردید میں ہمارے پاس بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور ان ذخیروں میں ان آیات سے استدلال واستنباط کے جوابات بھی مذکور ہیں جن کو یہ جماعتیں استعمال کرتی رہی تھیں لیکن یہ کہیں نظر نہیں آیا کہ ان جماعتوں نے جن آیات پر اپنا زورِ استدلال صرف کیا تھا ان کو مستقل موضوع بنا کر ان سے بحث کی جاتی۔ موافق ومخالف رائیں جمع کی جاتیں اور تحقیقی انداز میں اصل حقیقت کو ثابت کیا جاتا۔ میں اپنی محدود معلومات کے اعتبار سے کہہ سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے شیعیت کے مقابلہ میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ سے یہ کام لیا۔ انھوں نے ان آیاتِ قرآنیہ کا انتخاب فرمایا جن سے مسلک اہلسنّت والجماعت کی تائید ہوتی تھی یا جن سے حضرات شیعہ اپنے خیالات کو ثابت کرتے تھے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات پر الگ الگ محققانہ انداز میں گفتگو فرمائی اور اس طرح انھوں نے قرآن مجید کی خدمت کا جدید اسلوب اختیار فرمایا۔ آج ہمارے پاس مولانا مرحوم کی تفسیر کردہ آیات کا معتد بہ حصّہ موجود ہے اس کو مطالعہ کرنے سے ایک طرف اہلسنّت والجماعت کے مسلک کی صداقت پر یقین میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف مخالف کے بے وزن دلائل کا بھرم کھل جاتا ہے۔ اس طرح ایک محقق کی یہ شان اپنے بعد کے آنے والوں کے لیے متانت وسنجیدگی کے ساتھ کسی علمی مسئلہ پر گفتگو کرنے کی رہنمائی کرتی ہے[1]۔"

جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ سابق مدیر صدق لکھنؤ (م ۱۹۷۷ء)

"مولاناؒ کا شمار وقت کے ممتاز فضلائے اہلسنّت میں تھا۔ قرآن پاک، حدیث رسول، اور کلامِ فقہاء تینوں پر گہری نظر رکھنے والے اور شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کے بھی رازدار تھے۔ طبعاً بڑے شریف، متین، باوقار، صلح کل اور آشتی پسند تھے۔ مناظرہ کی راہ محض دفاع میں اور مجبوراً اختیار کرنا پڑی تھی۔ دریاباد ایک زمانہ میں برسوں آنا ہوتا رہا تھا، وعظ سادہ و بے تکلف،

---

[1] ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

عام فہم، دلنشیں اور ہمیشہ نماز ہی پر فرماتے اور نماز باجماعت کے فضائل اس خوبی اور دلکشی سے بیان کیے کہ نمازیوں کی تعداد میں مستقل اور نمایاں اضافہ ہوگیا یہاں تک کہ جامع مسجد کی عمارت ناکافی ثابت ہوئی اور اس میں توسیع کرنا پڑی۔

علم الفقہ کی کئی جلدیں لکھ کر انھوں نے علامہ ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلیؒ صاحب السعایہ کی شاگردی بلکہ جانشینی کا حق ادا کردیا۔ اپنے فن پر یہ کتاب جامع ہونے کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے۔ سیرت صحابہؓ پر علامہ ابن اثیر کی اسد الغابہ کا سلیس وشستہ ترجمہ بھی ان کے قلم کی ایک بہترین یادگار ہے۔ اسی طرح ان کا ترجمہ ازالۃ الخفاء اور ان کی اچھوتی تصنیف 'مختصر سیرتِ نبویہ قرآنیہ' ہے۔ یہ روایت سننے میں آئی کہ ابتدائی زندگی میں بہت سا اہم دینی کام کر کے دوسروں کو دے دیا تھا جو ان کے نام سے شائع ہوا۔ وعظ گوئی میں بھی ان کا رنگ سب سے منفرد تھا۔ نہ کہیں جوشِ خطابت، نہ سر گردن اور ہاتھوں میں جنبش نہ خوش الحانی کے ساتھ شعر خوانی، بجائے تقریر کے سارا انداز محض گفتگو کا، اور اس کے باوجود نہایت مؤثر، قناعت، بے لوثی اور بے طمعی کے لحاظ سے زندگی ایک درویش جیسی۔ حق تعالیٰ اپنی بہترین رحمتوں اور نوازشوں سے مالامال کرے[1]۔''

حضرت مولانا محمد عمران خان صاحبؒ

سابق مہتمم دارالعلوم تاج المساجد بھوپال (م۱۹۸۶ء)

''حادثہ جانکاہ ہے۔ یہ عاجز آپ سب کے درد وغم میں دل سے شریک ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس عاجز پر جو شفقت فرماتے تھے اس کی یاد سے آنسو آگئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات صرف آپ کے والد کی وفات نہیں ہے بلکہ مومن خاں مرحوم کے بقول:

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے
زہد و تقویٰ، فقر و دیں، فضل و ہنر، علم و عمل

واعظ خوش بیاں، متبحر عالم، فقیہ نکتہ رس اور ایک مصلح وجود کی وفات سے امت کو جو نقصان پہنچ سکتا ہے، وہ حضرت مولاناؒ کی وفات سے پہنچا ہے۔

---

[1] ہفت روزہ ''حرم'' لکھنؤ، ۲۶؍مئی ۱۹۶۴ء

وما كان قيس هلكه هلك واحد
لكنه بنيان قوم تهدما[1]

مولانا شاہ معین الدین ندویؒ سابق مدیر معارف اعظم گڈھ (م ۱۹۷۴ء)

"ہمارے پرانے نامور علماء ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کی آخری یادگار مولانا عبدالشکور صاحبؒ نے بھی سفر آخرت اختیار کیا، مولانا کی ذات جامع کمالات اور اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ تھی۔ علم و عمل اور دین و تقویٰ میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ تعلیم و تدریس، تالیف و تصنیف، وعظ و تبلیغ، ارشاد و ہدایت ہر راہ میں ان کے نمایاں کارنامے ہیں۔ تقریباً نصف صدی تک ان کا فیض جاری رہا۔ اور ان کے ذریعہ بہتوں کو ہدایت حاصل ہوئی۔ ایک زمانہ میں پورے ہندوستان میں ان کے کارناموں کی شہرت تھی۔ مگر ادھر پچیس تیس سال سے انھوں نے خاموشی اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی اور موتوا قبل ان تموتوا کی عملی تفسیر بن گئے تھے۔ اب ایسے ربانی علماء کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول اور ان کے مدارج بلند فرمائے[2]"

حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مدیر ماہنامہ "مناقب"، بھکر، پاکستان

"اہل علم حضرات سے یہ بات مخفی نہیں کہ اب سے کوئی پون صدی پہلے امام اہلسنّت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھنؤ کو اپنا مرکز بنا کر دفاع صحابہ رضی اللہ عنہم اور مسلک اہلسنّت کی حفاظت و اشاعت کا جو کام کیا وہ ناقابلِ فراموش تاریخی کارنامہ ہے۔ حضرت مولانا نے پورے متحدہ ہندوستان کے تبلیغی دورے کیے، لاجواب مناظرے کیے، لکھنؤ سے رسالہ النجم جاری کر کے اس میں علمی و تحقیقی مضامین لکھے، کتابیں شائع کیں اور باقاعدہ ایک ادارہ دارالمبلّغین قائم کیا جس میں ملک کے ہر صوبے اور ہر علاقے سے آنے والے مستند علماء کرام کو تبلیغ و مناظرہ کی تربیت دیا کرتے تھے[3]۔

---

[1] ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ" ۲۶ مئی ۱۹۶۴ء [2] ماہنامہ "معارف" مئی ۱۹۶۲ء

[3] ماہنامہ "انوارِ مدینہ" لاہور، جنوری-فروری ۱۹۸۵ء

حضرت امام اہلسنّتؒ نے زندگی بھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی کامیاب وکالت فرمائی اور اس مقدس جماعت کی رفعت شان اور بلندی مقام کو زبان اور قلم سے لوگوں پر واضح اور روشن کیا۔ اکابر علماء نے ان کی تحقیقات پر مکمل اعتماد کیا اور ان کی تصنیفات اور مضامین کو ہمیشہ مستند سمجھا۔ ماضی قریب میں جن لوگوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے انھوں نے بلاواسطہ یا بالواسطہ امام اہلسنّت ہی سے استفادہ کیا تھا۔ اب بھی جو لوگ دفاع صحابہؓ کو نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور تقریر یا تحریر کے ذریعہ یہ خدمت انجام دے رہے ہیں وہ سب امام اہلسنّتؒ کے خوشہ چیں اور انھی کے فیضان سے بہرہ یاب ہیں۔ حضرت امام اہلسنّتؒ نے وعظ و تذکیر اور مناظروں کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور لکھنؤ سے النجم رسالہ جاری کر کے اس کے ذریعہ تیس پینتیس سال تک اپنی علمی تحقیقات پیش کیں[۱]۔''

مولانا سلام اللہ صاحب بنارسی

''حضرت موصوف بیک وقت بہترین مفسّر اور بہترین محدّث و مورّخ تھے۔ بلند پایہ فقیہ، زبردست مناظر، جیدترین عالم اور عبقری فاضل تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور علم کلام وغیرہ پر آپ کو یکساں عبور حاصل تھا گویا آپ علم و فضل کے بحرِ بیکراں تھے۔ آپ کے تبحّرِ علمی کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی تحقیق باعمل اور روشن خیال اہلسنّت کے نزدیک عظیم سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں آپ کی نادر کتاب 'علم الفقہ' کو پیش کرسکتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ ضخامت کے لحاظ سے بلکہ تحقیق و تدقیق کے لحاظ سے بھی علماء کی نظر میں خاص مقام حاصل کرچکی ہے۔

مفسرّ کی حیثیت سے اگرچہ آپ نے اپنی کوئی مکمل تفسیر قرآن نہیں چھوڑی پھر بھی نہ جانے کتنی آیات کا ترجمہ بڑی شرح و بسط کے ساتھ کردیا۔ یہ آیات عموماً صحابۂ کرام اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین سے متعلق ہیں، آپ کی تفاسیر اتنی فاضلانہ ہیں کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

''صحابۂ کرامؓ کی شان دیکھنا ہو تو مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کی تفاسیر آیات دیکھو۔''

---

[۱] ماہنامہ ''مناقب'' بھکر (پاکستان)، نومبر ۱۹۸۷ء

تراجم الاعاظم میں علامہ ابن اثیرؒ کی اُسد الغابہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتاب ازالۃ الخفا اور امام ابن حجر کی تطہیر الجنان وغیرہ جیسی کتابیں مختلف موضوع پر مشتمل تحقیق و ریسرچ کی آئینہ دار ہیں۔ زبان شگفتہ و سلیس، استدلال مضبوط و قوی، عبارت تصنع سے پاک اور اسلوبِ نگارش پرزور جس میں ادب لطیف رواں دواں ہے۔

ردشیعہ میں تو آپ شمشیر بے نیام تھے لیکن عالم یہ تھا کہ تصنیف و تالیف کا باب ہو یا میدانِ مناظرہ آپ سنجیدگی و حق گوئی اور متانت و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔

کتنے مقدس تھے آپ، کتنا مقدس تھا آپ کا مشن اور کتنی مقدس تھی آپ کی تحریک جس سے رفض و تشیع کا قلع قمع ہوا۔ جہالت و ضلالت کا قصر ڈھایا گیا، لوگوں کو سیدھی راہ ملی اور نبیؐ کی حقیقی عظمت، صحابہ و اہل بیت کی سچی محبت پہچانی گئی۔ گویا آپ نے امتِ مسلمہ کی صحیح قیادت کا حق ادا کر دیا، دین کو نکھارا اسلام کو سنوارا، اور ایمان و یقین کو روشن کیا۔ یہ وہ صفات ہیں جو مجددینِ امت میں ہی پائی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر کوئی آپ کو وقت کا مجدد کہے تو کون ہے جسے مجالِ انکار ہو۔؟''[1]

مولانا محمد بن ابراہیم صاحب، گجرات

''مولانا محمد عبدالشکور فاروقی متعنا اللہ بطول حیاتہ وفیوضہ وبرکاتہ یکے از افاضل علماء ہندو اکابر مشائخ اہلسنّت است کہ پنجاہ سال از عمر شریفش کہ اکنوں از ہفتاد سال تجاوز کردہ در خدمت دین مبین واعلاء کلمۂ حق گزرانیدہ۔ در اشاعت عقائد حقہ وابطال زیغ و دجل ومکر اہل بدعت وضلالت مجہودات عظمیہ فرمودہ ملقب بہ حجۃ الاسلام وامام اہلسنّت گشتہ اند تقاریر دلپذیرش وتصانیف مؤلفات مفیدہ اش برفرقۂ باطلۂ روافض اتمام حجت است ومصداق آیۂ کریمہ ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔[2]''

مولانا اثر زبیری لکھنوی مقیم کراچی

''حضرت مخدوم القدس اعلیٰ اللہ درجاتہم کی رحلت کی خبر بجلی کی طرح دل و دماغ کو خاکستر کرتی

---

[1] ہفت روزہ ''حرم'' لکھنؤ، ۲۶ مئی ۱۹۶۴ء N [2] باقیات صالحات، فارسی ترجمہ آیات بینات، مولانا لکھنوی مطبوعہ بمبئی ۱۳۶۹ھ

چلی گئی۔ نیاز مندوں، ارادت کیشوں اور خادموں کی بدقسمتی اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ خیر الامت اور امام اہلسنّت کا سایۂ عاطفت ان کے سروں سے اُٹھ جائے۔ دل تھام کر اور کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ کاش کہ پر لگ جاتے اور حضرت رحمۃ اللہ کے آخری دیدار سے دل و نگاہ کو آسودہ کرسکتا۔ افسوس کہ تقسیم نے سب کچھ تقسیم کردیا۔ اپنی محرومی اور ملّت کے نقصان عظیم پر کن آنسوؤں سے روؤں اور کن لفظوں میں اس بے عدیل الیہ پر اظہارِ غم کروں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ مشن اور وہ دعوت جس کی بنیاد ۱۹۰۴ء میں پڑی تھی اور جس نے رفتہ رفتہ لاکھوں نفوس کا دل روشن کردیا تھا آج بے چراغ ہوگیا۔ شکوک وشبہات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے، دجل وفریب کے بگولے، سب وشتم ومطاعن کے طاغوتی نعرے جس بندۂ شکور کے پرتوِ جہاں تاب سے ماند پڑ گئے تھے اب کیا عجب کہ از سرِ نو اپنی پوری بدعتوں کے ساتھ پھر ابھر آئیں۔ مخالف کیمپ میں جس مسرت وخوشی کا جشن ہو رہا ہوگا کسی کو کیا معلوم۔ یہاں حال یہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں تو خیر ہم لوگ مطمئن تھے مگر اب جو نظر اٹھاتے ہیں تو میدان خالی ہی نظر آتا ہے۔

میری دیرینہ خواہش تھی اور اب اس کی شدت زیادہ محسوس کر رہا ہوں کہ درج ذیل صورت پر کوئی اقدام کیا جائے اور وہ یہ کہ حضرت علیہ الرحمۃ کی تصانیف وتالیفات کو سامنے رکھ کر ایک ایسی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جائے جس میں فرقہ باطلہ کی مکمل تاریخ، اس کے کارنامے اور اس کی شاخ درشاخ جماعتوں کے نظام، ان کا مقصد، اس کے پھیلائے ہوئے باطل عقیدوں کی تفصیل ہو۔ اسلام میں اس فرقہ کی ریشہ دوانیاں دکھائی جائیں۔ صحابہ کرام اور ازواجِ مطہرات پر جو اعتراضات اس فرقے نے تصنیف کیے ہیں سب کا ذکر مع مدلل جوابات کے درج ہو۔ غرضکہ ایک ایسی مبسوط اور جامع کتاب ہو جس کے دیکھنے کے بعد مزید کسی اور کتاب کی ضرورت اس ضمن میں پیش نہ آئے۔ یہ ایک لازوال خدمت ہوگی۔

اس کام کی استدعا میں آپ[1] ہی سے کرسکتا ہوں بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کام صرف آپ ہی کے کرنے کا ہے۔ اور انشاء اللہ آپ اس سے پہلو تہی نہ برتیں گے۔ اہلسنّت لٹ چکے ہیں، لکھنؤ لٹ چکا ہے اور امام اہلسنّت کے ارادت مندوں کے دل لٹ چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان پسماندہ اجزاء کو پھر سے ترکیب دے کر ایک زندہ جاوید دستور العمل کی بنیاد رکھی جائے[2]۔"

---

[1] ان تاثرات کے مخاطب حضرت مولانا عبدالمومن فاروقی تھے جو حضرت صاحب تذکرہ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں وفات پاگئے۔ [2] ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

حکیم نثار احمد علوی کاکورویؒ مؤلف ''سخنوران کاکوری'' متوطن کراچی

''مولانا عبدالشکور صاحب نے اپنے اس خاص موضوع (ردشیعیت) پر اس کثرت سے لکھا ہے کہ پوری دنیائے اسلام میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ النجم کا ہر مضمون پوری ایک کتاب کی حیثیت رکھتا تھا اور سیکڑوں لاجواب اور مسکت کتابیں تصنیف فرمائیں۔ محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار صفحات سے زیادہ لٹریچر چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے ــــ انھوں نے عنفوانِ شباب سے عالم پیری تک بلکہ ہنگام وفات تک اپنے قلم اور زبان سے حمایتِ حق، تحفظِ ناموس صحابہؓ اور مدافعت عن الصحابہؓ کے لیے علم جہاد بلند رکھا۔ آپ علم وعرفان کے بحرِ ذخار کے شناور تھے۔ آپ کے علم میں عمق تھا، رسوخ تھا، تبحر تھا۔ آپ اپنے عصر اور عہد کے علماء کی صفِ اولیٰ میں ممتاز مرتبہ اور مقام کے مالک تھے۔ علوم ومعارفِ قرآنی کے آپ عارفِ کامل اور عالم فاضل تھے، آپ کو امام اہلسنّت، کا لقب آپ کے معتقدین اور مداحوں نے اجتماعی طور پر دیا تھا جو آپ کے نام کا جز ہو گیا اور آج اس لقب ہی سے آپ پہچانے جاتے ہیں۔ سنّی فرقہ کی آپ نے تاحیات ایسی خدمت کی ہے کہ جس سے آپ کا نام اور کام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ حجۃ الاسلام مولانا عبدالشکور صاحبؒ کی تحریروں میں علم، اخلاق اور عقائد کی تعلیم ہے۔ وہ تصوّف کو شریعت سے باہر سمجھنا بے دینی سمجھتے تھے۔ آخر عمر میں قرآن پاک بھی حفظ کر لیا تھا اور کئی محرابیں سنائی تھیں۔ ان کے مریدین کی تعداد باوجود بیعت کرنے میں بہت محتاط رہنے کے سیکڑوں (ہزاروں تک) ہے۔ ایک بار عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں سیرت مبارکہ پر تقریر کے لیے علماءِ ہند کو دعوت دی گئی تھی اس میں انھوں نے 'سیرت الحبیب الشفیع من الکتاب العزیز الرفیع' (جس میں قرآن مجید سے سیرتِ نبویہ کو مرتب کیا گیا ہے) کے عنوان سے نہایت معرکۃ الآراء تقریر کی تھی جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی تھی۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود والی حجاز نے آپ کے سفر حرمین میں تمام تصانیف کو اُردو سے عربی میں منتقل کرنے کے لیے اسّی ہزار درہم (ریال) عطا کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن ان کے استغناء نے اسے قبول کرنے نہیں دیا۔ انھوں نے زندگی بھر مروّجہ بدعتوں کے خلاف جہاد کیا اور اعلاء کلمۃ الحق سے کسی لمحہ غافل نہ رہے۔''[1]

مولانا سیّد علی مطہر نقوی امروہوی، متوطن کراچی

''عمومی طور پر تو وہ ہر گوشۂ علم وتحقیق خوش نصیب ہے جس کو امام اہلسنّت حضرت مولانا محمد

---

[1] سخنورانِ کاکوری، مؤلفہ حکیم نثار احمد علوی، ۲۴۱-۲۴۲

عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ رحمۃ اللہ علیہ تقریراً یا تحریراً کسی بھی عنوان سے اپنالیں لیکن مذہبِ شیعہ کی تحقیق و تجزیہ کو تو امام اہلسنتؒ نے اپنی سراپا علم و بصیرت سے زندگی کا اصل موضوع ہی بنا چھوڑا تھا۔ پوری ملت اور انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا کیسا کرم بے پایاں ہے کہ تقیہ کی دبیز ترین تہوں میں دبائی ہوئی مذہبِ متعلقہ کی باریک سے باریک حقیقت کو خواہ وہ بمقابلہ قرآن و خاتم الانبیاء ہو یا بمقابلہ انسانیت و شرافت ہو، امام موصوف اپنے پُروقار علمی و تحقیقی اسلوب میں پوری دیانت و خداترسی اور اخروی احساس ذمہ داری سے منظرِ عام پر لے آئے — مولانا موصوف کے علمی و دینی مقام کے تعین کے اصل مجاز تو علماء اور اربابِ فہم و بصیرت ہی ہیں مگر مجھ ناچیز کا تاثر یہ ہے کہ پوری تاریخِ اسلامی میں امام موصوف کو مذہب مذکورہ بالا کی تحقیق اور اس کے متوازن تجزیہ میں اللہ تعالیٰ نے مجدّد، اور 'حجۃ اللہ فی الارض' بنا کر بھیجا تھا۔ اور بالخصوص قرآنِ مجید جس کو ناقابل اعتبار و التفات اور کالعدم بنا دینے کے لیے ہی یہ سازش مذہب کے مصنوعی چولہ میں نمودار ہی نہیں بلکہ ہماری شومی قسمت کہ تفصیلی حد تک مدوّن بھی ہوگئی۔ اس کے مقابلہ میں تو خالص علمی، تحقیقی اور ورطۂ حیرت میں ڈال دینے والی مثالی دفاعی جنگ حضرت موصوفؒ ایسی فیصلہ کن لڑ کر گئے ہیں کہ وہ امام موصوف کی ۸۸ سالہ علمی زندگی کی اصلی روح بلکہ جملہ علمی کاوشات اور بے پناہ عرق ریزیوں کا محرک و محور ہے جو رہتی دنیا تک قرآن کے زیرِ سایہ علم و تحقیق کی پیشانی پر آویزاں و تابندہ نیز تشنگانِ علم و تحقیق کے لیے مشعلِ راہ اور العلماء ورثۃ الانبیاء کی بیّن تصدیق ہے[۱]۔"

جناب مولانا ماہر القادریؒ سابق مدیر فاران کراچی (م ۱۹۷۸ء)

"تیرہ چودہ سال کی عمر بدءِ شعور کے بعد کی دوسری منزل ہوتی ہے اسی وقت سے ماہنامہ النجم لکھنؤ کے ذریعہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے واقف تھا۔ حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی قدس سرہٗ سے جب بھی نیاز حاصل ہوا بڑی شفقت اور محبت کا اظہار فرمایا۔ یہ بزرگانہ تواضع جس میں خلوص کے سوا اور کسی چیز کی آمیزش نہ تھی۔ ایک بار اپنی بیس پچیس کتابیں عنایت فرمائیں، ان کتابوں کے مطالعہ سے مجھ کم سواد کو بہت کچھ روشنی ملی اور معلومات میں اضافہ ہوا، خاص طور سے 'حدیثِ قرطاس' کے بارے میں جو الجھن تھی وہ دور ہوگئی۔ بعض لوگوں کی زبان سے یہ باتیں بھی ان کانوں سے سنیں کہ رفض کی تردید کرتے کرتے

---

۱ انسانہ تحریف قرآن، مولانا لکھنوی، ص ۵، ۶، ۷، کراچی

مولانا کے مزاج وطبیعت میں خارجیت کی جھلک پیدا ہوگئی ہے مگر مولانا مرحوم نے سیدنا علی کرم اللہ وجہ کے جو حالات لکھے ہیں انھیں پڑھ کر معلوم ہوا کہ ان کی ذات سے خارجیت کی نسبت بے سروپا تہمت ہے اہل بیت کرام سے وہ اسی طرح محبت وعقیدت رکھتے تھے جو اہلسنّت کا شعار ہے بلکہ مجھے تو فضائل علیؓ میں ایک دو مقامات پر مولانا کے قلم سے غلو کی جھلک نظر آئی۔

۱۹۴۷ء کے خونی انقلاب کے بعد، میں پاکستان چلا آیا۔ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب مرحوم پاکستان بننے کے بعد دو تین بار کراچی تشریف لائے۔ گذشتہ سال کراچی کے مشہور بزرگ مخیر شیخ عبداللطیف باوانی مرحوم کی نماز جنازہ میں مولانا مرحوم سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، ان کے بڑھاپے کو دیکھ کر دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ دین واخلاق کی یہ شمع اب زیادہ دنوں تک نہ بھڑک سکے گی۔ چنانچہ اس ملاقات کے چند مہینے بعد اخبارات میں ان کی وفات کی خبر پڑھی۔ حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ جیسے ثقہ اور مخلص عالم روز روز نہیں پیدا ہوتے۔ وہ ایک طرف علم وفضل کا کوہ گراں تھے تو دوسری طرف نیکوکاری اور تقویٰ کا نور ان کے چہرے سے جھلکتا تھا۔ ان کی ذات سلفِ صالحین کا روشن نمونہ تھی۔ رہنا سہنا کس قدر سادہ، لباس معمولی اور چال ڈھال کتنی باوقار اور نستعلیق تھی۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی عصمت وعزت کی مدافعت میں لازوال علمی و دینی کارنامہ انھوں نے انجام دیا ہے۔ اس نے انھیں 'امام اہلسنّت' بنادیا۔ رحمة الله عليه و برد الله مضجعه' نور قبره'۔[۱]

حکیم سیّد محمود صاحب سلطانپوری

''امام اہلسنّتؒ اہل سلطانپور (یوپی) کے لیے اپنی زندگی بھر بہترین رہنما رہے۔ دلی محبت کے ساتھ یہاں کی دعوت کو شرفِ قبولیت بخشتے اور مواعظِ حسنہ سے بہرہ اندوز فرماتے۔ دورانِ قیام میں جوق در جوق مشتاقان استفادہ ملاقات کی برکت سے محظوظ ہوتے۔ اور مجلسوں میں خطابِ عام سے ایمان کو تازہ کرتے، حق کی رہنمائی آپ کی زندگی کا خاص مقصد تھا۔ موصوف حامی سنت اور ماحی بدعت ہونے میں صلحاء امّت کے دوش بدوش تھے۔ فساد دین کے علاج میں ہمیشہ وجادلهم بالتى هى احسن کے فلسفہ پر کاربند رہے۔ اس ضمن میں مزعوماتِ رفض کا تجزیہ جس بالغ نظری اور حقانیت کے ساتھ موصوف نے فرمایا وہ اپنے زمانہ میں انھی کا حصّہ تھا فجزاہ

۱۔ ماہنامہ ''فاران'' کراچی، جولائی ۱۹۶۲ء

الله خیر الجزاء وجعل سعیه مشکوراً انه کان عبداً شکوراً.

آپ کی دینی خدمات، تعلیم وتدریس، تذکیر وتلقین اور تصنیف وتالیف پر علیٰ وجہ الکمال حاوی ہے۔ ان کی کتابوں میں علم الفقہ اور کتاب الصلوٰۃ ہر مسلمان کے گھر میں ہونے اور زیرنظر رہنے کے لائق ہے۔ وقتی دشواریوں نے آپ کی بہت سی گراں قدر کتابوں کو کمیاب کردیا۔ دعا ہے کہ خدائے مسبب الاسباب ان کو پھر منصۂ شہود پر آنے کی سہولت عنایت فرمائیں۔

بھولنا نہ چاہیے کہ النجم نے اپنے وقت میں کیا کام کیا ہے۔ ایسے بہت سے مسلمان جو نادانستہ غلطیوں میں مبتلا ہوکر منکر کو معروف سمجھ رہے تھے یا رواداری کے ناشائستہ اندھیرے میں بھٹک رہے تھے وہ النجم کی تابناکیوں سے راہِ ہدایت پاگئے[1]——"

جناب مولانا بدیع الزماں صاحبؒ

سابق ناظم دارالعلوم مئوناتھ بھنجن (یوپی) م ۱۹۹۴ء

رو کے ہوئے ہیں ضبط وتحمل کی قوتیں
رگ رگ تڑپ رہی ہے دلِ ناصبور کی

اخبارات میں سانحۂ ارتحال کی یہ خبر وحشت اثر نظر سے گذری تھی لیکن اس وجہ سے عریضہ ارسال نہیں کیا گیا کہ آپ کے تازہ زخم کو ٹھیس لگتی، حقیقت یہ ہے کہ:

یہ داغ وہ ہے جو دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

یہ بھی دنیا کا ایک دستور قرار پاگیا ہے کہ جب کسی کا کوئی قریبی اُٹھ جاتا ہے تو لوگ اس کی ماتم پرسی کیا کرتے ہیں لیکن یہ تعزیت نامہ اس دستور کے مطابق نہیں لکھا گیا ہے کیونکہ مصیبت کا یہ پہاڑ تنہا آپ پر نہیں بلکہ مختلف حیثیتوں سے دنیا کے تمام مسلمانوں خصوصاً اہل علم طبقوں پر ٹوٹ پڑا ہے۔ امام اہلسنتؒ کا دنیا سے رخصت ہوجانا ایک ایسا ناقابلِ تلافی نقصان ہے جس سے تمام عالمِ اسلام وحشت زدہ ہے۔ علمی طبقوں کا حضرت مولانا مرحوم سے اور ان کے علم سے جو رشتہ تھا اس کا ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جانا ایک ایسا خلا ہے جس کا پھر ملا میں تبدیل ہونا بہت مشکل ہے۔ دارالعلوم مئوناتھ بھنجن ہر رنج وغم میں آپ سب کے ساتھ برابر کا شریک ہے اور قادر ذوالجلال

---

[1] ہفت روزہ "حرم" لکھنؤ، ۲۶ر مئی ۱۹۶۴ء

کے حضور میں دست بدعا ہے کہ حضرت مرحوم و مغفور کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے[1]۔۔۔‘‘

دیگر اکابر علماء کے تاثّرات

ہم نے اب تک ان حضرات کے تاثرات تحریر کیے ہیں جو نسبتاً کچھ تفصیلی تھے۔ اب ہم بعض ایسے معروف معاصرین کے تقریری یا تحریری خیالات پیش کریں گے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت مرحوم کے کسی مخصوص امتیاز کی نشاندہی کرتے ہیں۔

بعض مشاہیر سے بزرگانہ روابط تھے جن میں حضرت مولانا سیّد محمد علی مونگیریؒ (م ۱۹۲۷ء) اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ (م ۱۹۲۷ء) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا مونگیری علیہ الرحمۃ کے کچھ تاثرات ہم اسی کتاب کے کسی ابتدائی باب میں بیان کر چکے ہیں۔ حضرت مولانا سہارنپوریؒ کو آپ سے بے حد تعلّق تھا اور وہ بڑی شفقت کا معاملہ رکھتے تھے۔ صحابہ کرام اور اہل بیت نبوی سے محبت و عقیدت کے معاملہ میں ان دونوں حضرات کا یکساں ذوق تھا اور اسی مناسبت کی وجہ سے آپ کی آمد و رفت حضرت سہارنپوریؒ کے یہاں اکثر رہا کرتی تھی اور کئی کئی دن قیام رہتا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں آپ نے مسلسلاتِ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی سند بھی ان سے حاصل کی تھی، اسی طرح ان سے اوّلیات کی بھی سند لی تھی چنانچہ آپ جو سندِ فراغت دارالمبلّغین لکھنؤ کے طلباء کو دیا کرتے تھے اس میں یہ عبارت درج ہے کہ میں نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے حدیث پڑھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حضرت سہارنپوریؒ کا اس درجہ احترام کرتے تھے جیسے ایک سعید شاگرد اپنے محسن استاذ کا کرتا ہے، اسی لیے وہ بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی کہ ایک استاذ اپنے شاگرد رشید سے محبت کرتا ہے۔ امروہہ کے مشہور مناظرہ کے موقع پر حضرت سہارنپوریؒ نے برسرِ عام آپ کے لیے یہ اعلان فرمایا تھا کہ مولانا کی جیت میری جیت ہے اور ان کی ہار میری ہار ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض ایسے بلند کلمات آپ نے ارشاد فرمائے تھے جن سے ان کے کلّی اعتماد کا اظہار ہوتا تھا۔ لکھنؤ میں جب آپ رفض و بدعت کے خلاف جدو جہد میں مصروف تھے اس وقت بعض حضرات نے شکایتاً حضرت سہارنپوریؒ سے کہا کہ حضرت! ان باتوں سے لکھنؤ کا امن برباد ہو رہا ہے اس

---

[1] ’’حرم‘‘ لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۴ء

پر انھوں نے فرمایا:

''صحابہ کرامؓ کی عزت و ناموس بچانے کے لیے امنِ لکھنؤ تو کیا اگر امنِ عالم بھی برباد ہو جائے تو کچھ پرواہ نہیں[1]۔''

شیخ وقت حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ (م ۱۹۶۲ء) کے متعلق جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تحریر کرتے ہیں:

''حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ سے بھی خاص محبت و مناسبت تھی کہ حضرت کو صحابۂ کرامؓ سے عشق تھا اور رفض سے بڑی نفرت و عدم مناسبت۔ اور اللہ تعالیٰ نے مولانا عبدالشکور صاحبؒ سے اس سلسلہ میں بڑا کام لیا۔ حضرت نے ان کے بہت سے رسائل اہتمام سے پڑھوا کرسنے تھے[2]۔''

ہندوستان میں تبلیغی سلسلہ کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (م ۱۹۴۴ء) ایک بار تبلیغی اجتماع کے موقعہ پر ۱۹۴۳ء میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تشریف لائے تھے، اس موقع پر آپ نے دارالعلوم کے کچھ اساتذہ کی موجودگی میں مولانا معین اللہ صاحب ندوی، اُس وقت کے ناظم شعبۂ تعمیر و ترقی کو مخاطب کر کے فرمایا:

''میاں مولوی معین اللہ! حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، ہاں حضرت جانتا ہوں اور زیارت بھی کی ہے۔ فرمایا نہیں، تم نہیں جانتے، پھر فرمایا، وہ امامِ وقت ہیں—— ان مشرقی دیار میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کا وہی مقام ہے جو ہمارے مغربی دیار میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا[3]۔''

اسی سفر میں مولانا لکھنویؒ نے دارالمبلّغین لکھنؤ میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب علیہ الرحمۃ اور ان کے رفقاء کی دعوت کی، مولانا بڑے شوق سے تشریف لائے، جب دعا کی درخواست کی گئی تو ان الفاظ میں دُعا کا آغاز کیا اولیائی تحت قبائی لایعرفھم سوائی جس میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مولانا کا جو مقام ہے وہ سب کو معلوم نہیں[4]۔

---

۱ حیاتِ خلیل، مولانا سیّد محمد ثانی ندوی، حصہ دوم، ص ۴۵۹

۲ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۹۰

۳ ماہنامہ ''الفرقان''، لکھنؤ، مئی ۱۹۶۲ء ۴ پرانے چراغ، مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، ص ۲۲۱

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری (م ۱۹۷۷ء) شیخ الحدیث الجامعۃ الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی نے اپنے ایک تبصرہ میں لکھا تھا کہ:

''حضرت العلامہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی قدس سرہٗ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں، حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کی زبان وقلم سے حفاظت سنت اور رد روافض و بدعت کی عظیم خدمت لی جس کی بنا پر انہیں ''امام اہلسنّت'' کا خطاب عطا کیا گیا۔ جب تک النجم لکھنؤ حضرت کی ادارت میں جاری رہا ہندوستان اور ایران کے تمام روافض مل کر بھی اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے[1]''

شیخ الاسلام پاکستان مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (م ۱۹۴۹ء) نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

''شیعوں کے متعلق مولانا عبدالشکور صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں اور ہم مولانا عبدالشکور صاحبؒ پر اعتماد کرتے ہیں[2]''

اسی طرح مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء) نے کہا تھا کہ 'میں مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے علم وفضل اور تدین کا معترف ہوں[3]۔ مولانا سیّد سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ء) نے مولانا لکھنویؒ کی حیات ہی میں ایک موقع پر تحریر کیا تھا۔ ''جناب مولانا عبدالشکور صاحبؒ لکھنوی ایک صالح و متقی و فاضل عالم اہلسنّت واحناف ہیں اور اس عصر میں ان کا وجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسانِ عظیم ہے[4]'' مولانا محمد سرفراز خاں صفدر، شیخ الحدیث و صدر المدرسین مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ نے یک بار دورانِ درسِ حدیث حضرت مولانا لکھنویؒ کی دینی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''حضرت امام اہلسنّت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ کے مضامین اہل علم کے لیے روح کی حیثیت رکھتے ہیں، آپ نے دفاع صحابہؓ کے متعلق اپنے زمانہ میں جو کام کیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی ان کی تحریر کا ایک ورق اگر دس روپیہ میں بھی ملے تو لے لینے میں گریز نہ کیا جائے[5]''

---

[1] افسانۂ تحریف قرآن، مرتبہ حضرت لکھنویؒ، ناشر مولوی سیّد علی مطہر نقوی، کراچی

[2] تاریخی مضامین حضرت لکھنویؒ، ناشر مولوی سیّد علی مطہر نقوی، کراچی

[3] تاریخی مضامین حضرت لکھنوی [4] ایضاً ص ۸

[5] ماہنامہ ''انوار مدینہ'' لاہور، دسمبر ۱۹۸۶ء

ستائیسواں باب

منظوم خراجِ عقیدت

حضرت مولانا لکھنویؒ کی وفات پورے برصغیر کے دیندار اور اہلِ علم حضرات کے لیے ایک صدمۂ عظیم کا باعث تھی۔ اس حادثہ پر مسلمانوں کے علمی مراکز، مدارس اور خانقاہوں میں تعزیتی اجتماعات منعقد ہوئے اور دینی و علمی جرائد، روزناموں اور ہفت روزہ اخباروں نے اس ملّی خسارہ پر اشکِ خونیں بہائے اور اداریے تحریر کیے۔ ان سوگواروں میں دینی درس گاہوں کے اساتذہ و طلباء، صحافی، ادیب و دانشور اور ملّی قائدین کے ساتھ ساتھ برادرانِ وطن بھی برابر کے شریک تھے۔ مولانا علیہ الرحمۃ ایک صاحبِ طرز ادیب، انشاء پرداز اور تجربہ کار صحافی تھے۔ نثری کارناموں کے علاوہ اُردو کے شعری ادب میں بھی مدح صحابہ مشاعروں کی داغ بیل ڈال کر آپ نے اس صنفِ شاعری کی ترویج و اشاعت میں بھرپور حصّہ لیا جس کی طرف اب تک بہت کم توجہ کی جاتی تھی چنانچہ اس کے ذریعہ خلفاء راشدینؓ اور دیگر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شاندار اسلامی خدمات اور بے نظیر فتوحات کا تعارف جس مؤثر انداز سے عوام و خواص میں ہوا وہ کسی دوسرے طریقے سے ہونا مشکل تھا۔ مدح صحابہؓ کے موضوع پر اُس دور کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے بلند پایہ نظمیں لکھ کر اپنی شعری صلاحیتوں کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا تھا، آج بھی یہ صنف اتنی مقبول ہے کہ مذہب پسند شعراء میں حمد و نعت کے بعد مدح صحابہؓ میں فکرِ سخن کرنا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ پورے خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ میں ایسے شعراء کی اچھی خاصی تعداد ہے جنھوں نے اپنے شاعرانہ مستقبل کا آغاز مدح صحابہؓ مشاعروں کے اسٹیج سے کیا اور ''مدّاح اہل بیت و صحابہؓ'' ہونے کی حیثیت سے دنیا نے انھیں جانا اور پہچانا۔ انھی اسباب کی وجہ سے آپ کی وفات کے بعد جہاں ہر علمی و دینی حلقے میں غم کے آنسو بہائے گئے وہیں ہمارے شعراء نے بھی

اپنے جذبات رنج والم ملک کے اخباروں اور جرائد میں اشعار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیے۔ چنانچہ وفات کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد ۳/ جولائی ۱۹۶۳ء کو محلہ چکمنڈی (مولوی گنج) لکھنؤ میں جو بزمِ مناظمہ خود حضراتِ شعراء کی جانب سے منعقد ہوئی تھی وہ اپنی گوناگوں نوعیتوں کے اعتبار سے بے مثال تھی۔ یہ محفلِ شعر وادب آپ کے مزار کے متصل ایک وسیع وعریض کھلے میدان میں منعقد ہوئی تھی جہاں مجمع کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ نصف شب کے بعد آپ کے ایک فدائی اپنی کمر کھول کر کھڑے ہو گئے اور باوجود ایک ہوشیار تاجر ہونے کے بالکل سرمست و سرشار ہو کر شعراء پر روپئے کی بارش کرنے لگے[1]

کتاب کے اس آخری باب کے ذریعہ ہم کچھ ایسے ہی تعزیتی اشعار اور تاریخی قطعات وغیرہ منتخب کر کے ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں جن سے پتہ چلے گا کہ اُس وقت کے علماء ادباء اور شعراء کو آپ کے ساتھ کتنی محبت وعقیدت تھی۔ اس منظوم حصہ میں اکثر نظمیں اور تاریخی قطعات ایسے شعراء سے منسوب ہیں جو اب خود بھی مرحوم ہو چکے ہیں، ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر بھی اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے اور اس طرح مادح وممدوح دونوں کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

۱۔ مولانا آثر زبیری لکھنوی (پاکستان)

متاعِ بندۂ مومن ہے سوز و سازِ حیات
کسے خبر ہے کہ رنگیں ہیں کتنے یہ لمحات

خدا سے پیار خودی سے گریز رہتا ہے
مشامِ روح سدا مشک بیز رہتا ہے

نفس نفس کرمِ کردگار ہے اُس کا
پیام موجِ نسیمِ بہار ہے اس کا

وہ زیب مسندِ ارشاد بَلِّغُوا عَنّیْ
نقیب عظمتِ اصحابؓ واہلِ بیتِ نبیؑ

سلف کا ناز ہے اعجازِ عصر حاضر ہے
قلم نگارشِ مدحت میں جس کے قاصر ہے

مراد ہے مری اُس شیر بیشۂ حق سے
دو نیم جہل ہوا جس کے تیشۂ حق سے

گرہ کشائے حقائق ہے گفتگو جس کی
مشامِ اہلِ وفا میں بسی ہے بُو جس کی

سلام! اے چمن آرائے ملّتِ اسلام
سلام! اے صفِ مردانِ باصفا کے امام

---

[1] ہفت روزہ ''حرم'' لکھنؤ ۱۷/ جون ۱۹۶۳ء

ہوئی ہے تجھ کو ودیعت وہ جرأت بیباک
کہ جس نے کردیا فکر عدو کا دامن چاک

ضمیرِ سینۂ ملّت کو کردیا پُر نور
زہے کرشمۂ شمعِ جمال عبدِ شکورؒ

ہوا کسی سے نہ جو کام وہ کیا تونے
حصارِ رفض کو مسمار کردیا تونے

بتایا عظمت یارانِ مصطفیٰ کا مقام
بدل گیا ترے وعظوں سے ابلہانہ نظام

نکالے گیسوئے باطل کے پیچ وخم تونے
فنا کی نذر کیے کاغذی صنم تونے

یہ کیفیت تری آمد سے پیشتر تھی یہاں
کہ چپہ چپہ پہ ہوتا تھا بتکدہ کا گماں

کہیں ضریح، کہیں تعزیہ، کہیں پہ علم
کہیں تھے کاغذی نقلی قبور پر سرخم

بجائے نغمۂ توحید شورو شیون تھا
یہ لکھنؤ نہ تھا حقانیت کا مدفن تھا

زبانِ طعن تھی ہر ذاکرِ شریر کی تیز
نہ گالیوں سے حجاب اور نہ شتم سے پرہیز

نہ تھا حریفونکو ناموسِ مصطفیٰ کا بھی پاس
چھڑا تھا تذکرۂ اِفک و قصۂ قرطاس

سبائیت کے نشہ میں کچھ ایسے تھے ڈوبے
کہ رسم و راہ شرافت کو بھی وہ لے ڈوبے

خدا کے دین کی توہین ہوتی تھی ہر سُو
بنام کرب و بلا صبح و شام تھی ہرسُو

کچھ اس طرح تھے ہلاکِ فریب پیر وجواں
کہ کرچکے تھے فراموش دولتِ ایماں

شکارِ طعن خود ازواج بھی صحابہؓ بھی
یہ ظلم عام بھی تھا اور بے محابا بھی

مگر کسی میں نہ تھی حیف جرأتِ تردید
فقیہ و عالم دَوراں تھے مصلحت کے مرید

سفینہ حق کا جو طوفان میں گھرا پایا
یکایک اپنا کرم یوں خدا نے فرمایا

کہ ایک صاحبِ برہانِ نور کو بھیجا
فضائے دہر میں عبدالشکورؒ کو بھیجا

پیام دعوتِ اعلانِ حق جو تجھ کو ملا
فضا میں زمزمۂ جبرئیلؑ گونج اٹھا

تری نوا سے مٹی تیرگی مطاعن کی
کہ منتظر نگہِ شوق تھی اِسی دن کی

سلام! اے ادب آموزِ عظمت اصحاب
تری وَفا سے ہوا گلشن وفا شاداب

دلوں کو رمزِ محبت سے آشنا بھی کیا
دفاعِ ملّتِ برحق کا برملا بھی کیا

یہ روز وشب کہ بصد کیف وحال گذرے ہیں
جہادِ عشق میں پنجاہ سالِ گذرے ہیں

نہ کیوں ہو روحِ محمدؐ بھی شادماں تجھ سے
کہ چشمہ فیضِ ہدایت کا ہے رَواں تجھ سے

تجھے نہ کس لیے سرخیلِ عالماں لکھوں
نہ کیوں خلاصۂ ابرار و عارفاں لکھوں

کہ تو نے ردِّ مطاعن کی طرح ڈالی ہے بھنور سے کشتی اہلِ یقیں نکالی ہے
منافقت کی رگوں کا لہو نچوڑ دیا یہودیت کا یہ سانچہ بھی تو نے توڑ دیا
صنم کدے میں اَودھ کے اذان دی تو نے
جہادِ مدحِ صحابہؓ میں جان دی تو نے

۲۔ شاعرِ حرّیت جناب اسلم لکھنوی

فضائے گلستاں بدلی بہاروں کا سماں بدلا ستارے روشنی کھو بیٹھے رنگِ آسماں بدلا
غموں کا نقش ابھرا اور مسرت کا نشاں بدلا ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے رنگِ جہاں بدلا
جہاں کل پھول کھلتے تھے وہاں کانٹوں کا بستر ہے
خدا شاہد گلستاں کا بڑا غمناک منظر ہے
لہو رونے لگیں آنکھیں اک ایسا انقلاب آیا امام اہلسنّتؒ کی جدائی نے ستم ڈھایا
دکھا کر آئینہ غم کا دلِ محزوں کو تڑپایا اندھیرا یاس و محرومی کا تا حدِ نظر چھایا
یہ وہ صدمہ ہے جو مرنے سے پہلے جا نہیں سکتا
دلِ بے تاب کو اپنے قرار اب آ نہیں سکتا
بہت بے لطف ہو کر رہ گئی ہے زندگی اپنی مقدر ایسا بدلا چھن گئی ہر اک خوشی اپنی
کسی کے ساتھ رخصت ہو گئی زندہ دلی اپنی بنی ہے ترجمانِ دردِ فرقت خامشی اپنی
فسانے رنج و حرماں کے مری آنکھوں میں ڈھلتے ہیں
کسی سے بات کرنے میں بھی اب آنسو نکلتے ہیں
وہی دنیا ہے لیکن اجنبی معلوم ہوتی ہے اجل کی گود میں اَب زندگی معلوم ہوتی ہے
ہر اِک سو تیرگی ہی تیرگی معلوم ہوتی ہے ستاروں کی بھی دھندلی روشنی معلوم ہوتی ہے
فقیہ عصر کے اب تذکرے ہر سمت ہوتے ہیں۔
بنی ہے غمکدہ دنیا مسلماں اُن کو روتے ہیں
گلستانِ شریعت کا ہر اک گل چاک داماں ہے خزاں کی گود میں سوئی ہوئی فصلِ بہاراں ہے
فضا خاموش ہے ہر اک کلی تصویرِ حرماں ہے بھرے ہیں اشک آنکھوں میں دلِ مضطر پریشاں ہے

قیامت سے بہت پہلے قیامت آئی جاتی ہے
فضا بدلی ہوئی بزمِ جہاں کی پائی جاتی ہے

رخِ پُرنور کے جلوؤں سے آنکھیں ہوگئیں محروم
خوشی کے دل میں جو جذبات تھے سب ہو گئے معدوم
ابھی کل تک جو انساں شادماں تھے آج ہیں مغموم
ہے منشائے الٰہی کیا کسی کو یہ نہیں معلوم

ستارے ٹوٹتے جاتے ہیں رہبر اُٹھتے جاتے ہیں
ستم ہے داعیٔ دینِ پیمبرؐ اُٹھتے جاتے

ملی تھی دولتِ حج بھی انھیں خالق کی رحمت سے
مشرف ہوکے آئے تھے مدینہ کی زیارت سے
محبت کو خصوصی ربط ہوتا ہے محبت سے
سند بخشش کی حاصل کی تھی دربارِ رسالت سے

مقدر کے دھنی ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں
بڑے آرام سے یہ گوشۂ خلوت میں سوتے ہیں

فدائی تھے ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ وحیدرؓ کے
نگاہوں میں تھے جلوے چار یارانِ پیمبر کے
کیے تقسیم گلہائے مناقب جھولیاں بھر کے
عطا ہونگے انھیں جنت میں ساغر آبِ کوثر کے

صحابہؓ کی محبت کو متاعِ زندگی سمجھے
تقاضائے شریعت کچھ جو سمجھے تو یہی سمجھے

کتاب اللہ کے حافظ بھی تھے عالم بھی عابد بھی
تھا جن پر ناز فرما زہد و تقویٰ ایسے زاہد بھی
مبلّغ بھی تھے اسلم یہ مناظر اور ناقد بھی
خدا کے دوست بھی درویش بھی سالک بھی ساجد بھی

نہیں ممکن قیامت تک ہوں اب ایسے بشر پیدا
بڑی مشکل سے ہوتے ہیں چمن میں دیدہ ور پیدا

۳۔ جناب عبدالرشید خاں قمرؔ افغانی لکھنویؒ

دلدار و دلنواز و دل آرا کہیں جسے
وہ سادگی بشر میں فرشتا کہیں جسے
وہ آنکھ بند ہوگئی بینا کہیں جسے
وہ شکل اَب کہاں رُخِ زیبا کہیں جسے
صدیقیت میں صدقِ سراپا کہیں جسے
فاروقیت کا مقصد و منشا کہیں جسے
عثمانیت کی شرم کا جلوا کہیں جسے
کراریت فروز نظارا کہیں جسے

وہ عندلیب گلشنِ طیبا کہیں جسے — مدّاحِ اہل بیت وصحابا کہیں جسے
صدیقؓ اور عمرؓ کی تمنا کہیں جسے — عثمانؓ اور علیؓ کا ارادا کہیں جسے
خدام میکدہ کہیں مخدوم میکدہ — ایماندار قبلہ و کعبہ کہیں جسے
وہ تلخ تجربات کا زہراب پی گیا — پروردۂ حوادثِ دنیا کہیں جسے
رودادِ رفتگاں لبِ امروز سے کہی — یادش بخیر عظمتِ فردا کہیں جسے
تحریر بے نظیر تھی تقریر دلپذیر — کردار وہ رہا سبھی اچھا کہیں جسے
اہل جنوں کے ہاتھ میں ہے دامنِ خرد — باہوش کون ہے خرد افزا کہیں جسے
داد شہادت آ کے شہیدِ وفا کو دے — کوئی نہیں ہے شاہدِ رعنا کہیں جسے
وہ کیا گیا کہ تابشِ علم و عمل گئی — عالم وہ تھا کہ عالمِ تنہا کہیں جسے
آئینہ دار جہدِ مسلسل تھی زندگی — علم و عمل کا والہؔ و شیدا کہیں جسے
جھوٹوں کے ہر فریب کا پردہ کیا ہے چاک — سچائی کا امین تھا سچا کہیں جسے
برتا کیا مخالفتِ غیر میں خلوص — نادان دوست دشمن دانا کہیں جسے
رازآشنائے مذہبِ اسلام جس کی ذات — رمز آشنائے مسلک عیسا کہیں جسے
جس کی نظر مذاہبِ عالم سے روشناس — اقوامِ کل کا نبض شناسا کہیں جسے
جو منفرد تھے دوسرے عالم میں جا بسے — ایسا نہیں ہے کوئی کہ یکتا کہیں جسے
اپنی مثال عالمِ اسلام میں تھا آپ — یکتائے عالمانِ زمانا کہیں جسے
سب ہیں، امام اہلِ تسنّن نہیں کوئی — غمّاضِ سنّتِ شہِ بطحا کہیں جسے
عبدالشکورؒ بانیٔ دارالمبلّغین — اسلام کا مبلّغِ اعلیٰ کہیں جسے
روشن کیا ہے محفلِ دنیا میں وہ چراغ — حل کردۂ مسائل عقبا کہیں جسے

رخصت ہوا ہے آج وہ کچھ اس طرح قمرؔ
بے ساختہ مشیّتِ مولیٰ کہیں جسے

ایضاً

آج ہے پیشِ نظر معراجِ پروازِ خیال — جلوہ فرما جلوہ ساماں نیّر اوجِ کمال

دیدنی مستقبل روشن کی جلوہ ریزیاں ... ضوفگن ضوبار شمعِ محفل ماضی وحال
اہل عالم کو نظر آیا جواب لا جواب ... اُٹھ رہا تھا پھر مجدّد الف ثانیؒ کا سوال
ہو کے بیتاب آ گیا اک چارہ ساز و چارہ گر ... ہوگئی پھر ملّتِ بیمار کی صحت بحال
گونج اُٹھی آواز قَالَ اللّٰہ وَقَالَ الرَّسُوْلُ ... مسکرا اُٹھے گلستانِ مشیت کے نہال
اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کی تفسیر کا انداز خاص ... مشعلِ تخلیقِ عنوانات شرحِ حال و قال
ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ کا رازِ عیاں ... اور اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ کا جاہ وجلال
واقفِ اسرار اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ ... گفتگوئے اوّلیں میں حرفِ آخر کا کمال
شعلۂ آواز مومن، اخگر طور کلیم ... دیدہ ور نظروں نے دیکھی تابشِ برقِ جمال
زندگی ہر اک نظر، ہر اک نفس، ہر اک قدم ... حشر برپا، عرش پیما، ہر پیام و ہر خیال
بابصارت، بابصیرت، بافراست، باشعور ... خوش نگاہ وخوش مزاج خوش بیان وخوش خصال
اسوۂ آل رسول واہلِ بیتِ مصطفیٰ ... پیرویٔ سیرت خاصانِ ربّ ذی الجلال
ایک عابد، ایک زاہد، ایک رند پارسا ... صاحب پند و نصیحت، واعظِ شیریں مقال
اک مفسر اک محدّث اک مؤرّخ اک خطیب ... اک مبلّغ اک محقق اک فقیہ بے مثال
اک مفکر اک مدبر اک مناظر اک ادیب ... شارحِ اقوالِ مرسل صاحب علم الرّجال
کارنامے وہ کہ جن پر ناز فرمائے حیات ... صفحۂ تاریخِ عالم پر نقوش لازوال
ذکر صدّیق و عمرؓ عثمانؓ وحیدرؓ کے لیے ... فکر الفاظ درخشاں بر سبیل ارتجال
اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وردِ صبح وشام ... طاعت حق میں گذارے زندگی کے ماہ وسال
سر سے پاؤں تک ابوبکر معظمؓ کی ادا ... سیرت وصورت کی تنویروں میں صدیقی جمال
حق و باطل کے لیے فاروقِ اعظمؓ کی نگاہ ... امتیازات نظر کا نام فاروقی جلال
چشمِ ذی النورین کی شرم و حیا مدنظر ... دل میں عثمان غنیؓ کے قلبِ مخلص کا خیال
زعمِ باطل کے لیے خیبر کشا شیرِ خداؓ ... دست و بازو میں سمیٹے حیدریت کا کمال
جاگ اُٹھا ہے آج اُولُوالْاَمْرِ مِنْکُمْ کا نقیب ... زندگی کفر و ضلالت کی ہوئی امرِ محال
اللہ اللہ وہ جواباتِ مدلّل کی گرفت ... سامنے اس کے جواباً کچھ کہے کس کی مجال؟
طنطنہ ادیانِ باطل کا ہوا ہے سرنگوں ... دغدغہ گندے عناصر کا پراگندہ خیال

ردّ بدعت میں جو لکھا، جو کہا اس کے طفیل
چل سکے گا اہلِ بدعت کا نہ کوئی خاص جال
حاصل اتمام حجت بات بھی تحریر بھی
حجۃ الاسلام ہم ان کو کہیں بے قیل و قال
یادگارِ مولوی عبدالشکورؒ خوش صفات
تابشِ ''النجم'' کا نورِ 'حرم' سے اتصال
فی الحقیقت اہلسنّت و الجماعت کے لیے
بے حقیقت فتنۂ ابنِ سبا کا اشتعال
فکر تمثیل امامِ اہلسنّتؒ اے قمر
مل نہیں سکتی امامِ اہلسنّتؒ کی مثال

۴۔ جناب مولوی سیّد علی تجمل خاں تجملؔ حسینی امروہوی

بعد حمد و نعت کاں خارج زِامکاں آمدہ
خامۂ من مادحِ ممدوحِ دَوراں آمدہ
آنکہ در توصیف اوتوصیفِ اللہ و رسول
آنکہ ذاتش افتخارِ اہلِ ایماں آمدہ
حضرتِ علامۂ عبدالشکورِ لکھنویؒ
کوبہ رد شیعیت یکتائے دَوراں آمدہ
مولدش کاکوری است و مستقرش لکھنؤ
کوہِ کاسر برسرِ لعنت فروشاں آمدہ
چوں زِ اخلاف عمر فاروق اعظمؓ ذاتِ او
شہرۂ حق گوئیش در ہند و ایراں آمدہ
عالم و ہم تشنگانِ علم را سر چشمۂ
عارف و ہم رہنمائے راہِ عرفاں آمدہ
ظلمتِ کفر از زبانِ حق بیانش محو شد
چوں دلش آئینہ دار نور ایماں آمدہ
از زبانش بشنوی گر نعت ختم المرسلیں
جانبِ ہند از عرب گوئی کہ حسّاں آمدہ
نقش کلکش دیدۂ باطل پرستاں را جحیم
حرفِ اُو فردوس گوشِ حق نیو شاں آمدہ
آشنا گردو اگر گوشَت زتقریرِ خوشش
درجہاں بارِ دگر گوئی کہ سحباں آمدہ
فکر اوکشاف اسرار حدیث و نطق او
ترجمانِ معنیٔ آیات قرآں آمدہ
ازپئے تجدیدِ سنّت اندریں دَورِ فتن
چوں مجدد ذاتِ اُوبا سازو ساماں آمدہ
سینہ بے کینہ اش گنجینۂ عشقِ نبیؐ
بہرِ حبِ چار یار آئینہ اش جاں آمدہ
یعنی بوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ را بدہر
بے غلو مدحت سرِ او منقبت خواں آمدہ
دامنش لبریز گلہائے دلائے اہل بیت
غیرتِ باغِ جناں زیں نوبہاراں آمدہ

بہرِ اظہار حق و اثبات آئینِ حسینؓ　　خامہ اش چوں ذوالفقار شیر یزداں آمدہ
آنکہ از صدیقؓ فیض صدق میدارد بدل　　آنکہ از فاروق پُراز جوشِ ایماں آمدہ
آنکہ درحلم وحیا بگرفتہ از عثمانؓ سبق　　آنکہ فائض از علیؓ درعلم و عرفاں آمدہ
آنکہ دارد دولتِ حسنِ تکلم از حسنؓ　　آنکہ درحق فدوئ شاہ شہیداں آمدہ

آنکہ علم او علمبردار اہلسنّت است
آنکہ ذاتش حامئ تعلیم قرآں آمدہ[۱]

۵۔ جناب صدرالدین سرشارؔ کسمنڈویؒ

نفس نفس تھا شرابور رنگ وبو میں ترا　　قدم قدم تھا گراں بار جستجو میں ترا
خلوصِ قلب تھا عنوان آرزو میں ترا　　بلیغ تر تھا ہر انداز گفتگو میں ترا

ترا مقام سمجھتے تھے آبرو والے
ہمیشہ تجھ کو دُعا دیں گے لکھنؤ والے

کسی کو جذبۂ ایثار یاد آتا ہے　　کسی کو شیوۂ پندار یاد آتا ہے
کسی کو مسلکِ دشوار یاد آتا ہے　　کسی کو ولولۂ کار یاد آتا ہے

کسی کی آنکھ میں لرزاں ہیں نیلگوں تارے
کسی کے سینے میں غلطاں ہیں سرخ انگارے

اسیرِ کشمکش جبر و اختیار رہا　　حریف لذّت زہراب روزگار رہا
ہر اک فضا میں مگر عزم استوار رہا　　فدائے حرمتِ اصحابِ نامدار رہا

متاعِ دل کی یہ ارزانیاں نہیں دیکھیں
اس اہتمام کی قربانیاں نہیں دیکھیں

لبِ مقال میں صدیقؓ کی صداقت تھی　　خیال و خواب میں فاروقؓ کی جلالت تھی
نگاہ وقلب میں عثمانؓ کی متانت تھی　　دماغ و ذہن میں حیدرؓ کی استقامت تھی

---

[۱] یہ اشعار اس طویل نظم سے منتخب کر کے یہاں شائع کیے گئے ہیں جو تقریباً باسٹھ اشعار پر مشتمل تھی اور حضرت مولانا لکھنویؒ کی حیات ہی میں اخبار ''النجم'' لکھنؤ کے خلافت نمبر بابت ۱۳ / اپریل ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

تو اک چراغ تھا بزمِ شہِ رسالت کا
تو ایک پھول تھا گلدستۂ خلافت کا

تری زبان نے پائی صداقتِ عظمیٰ ترے بیان نے پائی جلالت عظمیٰ
ترے ضمیر نے پائی سعادتِ عظمیٰ تری حیات نے پائی قیادتِ عظمیٰ

مآل یہ ہے کہ فہم اپنی ختم کی تو نے
یقین یہ ہے کہ جنت خرید لی تو نے

ترا ثبات قدم بے مثال بن کے رہا ترا عروجِ نظر لازوال بن کے رہا
ترا کمال فروغِ کمال بن کے رہا ترا خیال حدیثِ جمال بن کے رہا

ضیائے قلب کے دیکھے یہ ہم نے نظارے
ترے مزار سے چلتے ہیں نور کے دھارے

جہاد مدحِ صحابہؓ میں جو قدم بھی اُٹھا وہ قید و بند کے خطروں سے بھی نہ روکے رُکا
کسی سے آنکھ نہ جھپکی کسی سے تو نہ دبا فضائیں بارہا بدلیں مگر نہ تو بدلا

عجیب چیز تھی نیرنگیٔ جنوں تیری
رگوں میں رُک نہ سکی کوئی موجِ خوں تیری

بھٹکنے والے کو رستہ بتا دیا تو نے نشان منزلِ مقصد دکھا دیا تو نے
دلوں پہ نقشِ صحابہؓ جما دیا تو نے بڑے مزے سے یہ سکّہ چلا دیا تو نے

زمانہ نقشِ قدم پر جو چل گیا ہوتا
تو ہر محاذ کا نقشہ بدل گیا ہوتا

رضائے مرضیٔ معبود سامنے آئی فضائے کعبۂ مقصود سامنے آئی
لقائے ساعت مسعود سامنے آئی ہوائے جنتِ موعود سامنے آئی

عروسِ مرگ نے دیکھا جو بانکپن تیرا
لہو سے اپنے معطر کیا کفن تیرا

ترے جہاد کی سب منزلیں تمام ہوئیں اور اس ادا سے کہ مقبولِ خاص و عام ہوئیں
نظر فروز بصد شان و اہتمام ہوئیں حقیقتوں کی طرح زندۂ دوام ہوئیں

ترے مزار پہ ان رحمتوں کے سائے ہیں
جو چار یاروں کا دنیا میں نام پائے ہیں
ترے فراق میں قلب و جگر کو چین نہیں — ترے جنون میں فکر و نظر کو چین نہیں
ترے خیال میں شام و سحر کو چین نہیں — ترے ملال میں دیوار و در کو چین نہیں
جدھر گئی یہ نظر یاس ہی نظر آئی
کہ جیسے ساعتِ محشر قریب تر آئی
وداعِ جانِ تمنا کہیں اگر تو بجا — ترے خیال میں ڈوبے رہیں اگر تو بجا
حدودِ ضبط سے آگے بڑھیں اگر تو بجا — تڑپ تڑپ کے بھی رویا کریں اگر تو بجا
کھٹک رہی ہے جو رہ رہ کے پھانس پہلو میں
وہ دل کا خون ملا کر رہے گی آنسو میں
جوارِ قدس میں تجھ کو جگہ ملی ہوگی — نصیب خلد کی راحت تجھے ہوئی ہوگی
براہِ راست رسائی وہاں تری ہوگی — جہاں جمالِ صحابہؓ کی روشنی ہوگی
سنے گا کانوں سے ہر روز لحن یزداں میں
جو پڑھ چکا ہے تو آیاتِ مدح قرآں میں
جو عرضِ حال کا موقع تجھے ملا ہوگا — تڑپ تڑپ کے بیاں دردِ دل کیا ہوگا
سند میں زخمِ جگر پیش کردیا ہوگا — پھر اس کے بعد متانت سے یہ کہا ہوگا
یہی فضا ہے تو پایانِ کار کچھ تو بتا
بتا بتا مرے پروردگار کچھ تو بتا
پھر اپنی سعی مسلسل بیان کی ہوگی — فضائے قدس میں حیرت سی چھا گئی ہوگی
غضب خدا کا یہ انساں کی خودسری ہوگی — کہ مدح اس کے لیے مرگِ زندگی ہوگی
ترے کرم سے وہ حالات چھوڑا آیا ہوں
فریب کاروں کی نس نس کو توڑ آیا ہوں
کچھ ان شہیدوں کے بھی تذکرے رہے ہونگے — جو عیدگاہ کے میدان میں شہید ہوئے
چنوں کی طرح جو بے جرم گولیوں سے بھنے — جو اپنے خون کے نقش و نگار چھوڑ گئے

انھیں کے خون کے اب تک فضا میں چھالے ہیں
وہ عنقریب گرج کر برسنے والے ہیں
سلام اس پہ غموں میں جو مسکراتا تھا   سلام اس پہ جو دل کے کنول کھلاتا تھا
سلام اس پہ جو روحوں کو گدگداتا تھا   سلام اس پہ جو حق کی طرف بلاتا تھا
خدا پرست و خدا دوست پر ہزار سلام
ہزار بار نہیں بلکہ لاکھ بار سلام

۶۔ مولانا عبدالرؤف صاحب منصف مبارکپوریؒ

وہ جن کی زندگانی ہند میں ملّت کی قائد تھی
وہ جن کی فکر ہر دم وقفِ اصلاحِ عقائد تھی
وہ جن کی سخت کوشش قطعِ تلبیس و مکائد تھی
وہ جن کی ذات شمعِ بزم اور بطلِ شدائد تھی
حق و باطل کتابِ زندگی میں ان کا عنواں تھا
وہ استدلال کے اندر نرالی شان رکھتے تھے
وہ اثباتِ دعاوی کے بڑے سامان رکھتے تھے
مقابل کے غوامض کی بھی وہ پہچان رکھتے تھے
مگر خود رنگِ استدلال کو آسان رکھتے تھے
مصافِ زندگی میں قول ان کا تیغِ برّاں تھا
قلم ان کا سرِ باطل پہ اک پُرزور نیزہ تھا
ضلالِ فکر کی جرّاحیاں جس کا وتیرہ تھا
حقائق بینی کا ان میں بڑا عمدہ سلیقہ تھا
غلط کیشی پہ یلغاریں ہمیشہ ان کا شیوہ تھا
حدیثیں ان کی حجت تھیں، دلیلیں ان کی قرآں تھا

شجاعت اور جرأت میں وہ شیر غاب تھے گویا
وہ عزم و حوصلہ میں فرد اور نایاب تھے گویا
عقائد کی شبِ تاریک میں مہتاب تھے گویا
کہ علم دین سے رخشندہ و پرتاب تھے گویا
گروہِ اہلِ اہوا اُن سے لرزاں اور ترساں تھا

کوئی ''النجم'' کو دیکھے صحافت ان کی روشن ہے
شمارہ کوئی ہو منصف اگر پڑھیئے مبرہن ہے
علوم و فن کے پھولوں کا شگفتہ ایک گلشن ہے
ادب کے موتیوں سے بھی مرصع اور مزین ہے
نگارش ان کی روشن تھی تکلم ان کا بُرہاں تھا

۷۔ حضرت مولانا محمد سلیمان شمسی خیرآبادیؒ

دلوں کو عرشِ معلّٰی بنا دیا تونے
خدا کے ماسوا جو تھا، مٹا دیا تونے

جہاں کو نورِ حقیقت سے کردیا معمور
نشانِ کفر و ضلالت مٹا دیا تو نے

ہے ہر نفس میں تری اک شرار آتش بار
جلا کے خرمن باطل دکھا دیا تونے

کچھ اس طرح سے ہوا گامزن رہِ حق میں
زمیں کو عرشِ معلّٰی بنا دیا تونے

جو پاؤں توڑے ہوئے بتکدے میں بیٹھے تھے
خدا کی راہ پہ ان کو چلا دیا تونے

کہے زمانہ نہ کیونکر تجھے امام اپنا
خدا سے بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا تونے

نبیؐ کے چاروں ستاروں کا نام لے لے کر
جہان سے کفر کی ظلمت مٹا دیا تونے

نثار ہم پہ نہ ہو کیوں سکینہ و رحمت
دلوں میں شمع صداقت جلا دیا تونے

عیاں ہے ذات سے تیری جلالِ فاروقی
سرغرورِ حکومت جھکا دیا تونے

رضاء و صبر و تحمل کا حق ادا کرکے
جہاں کو شیوۂ عثمانؓ سکھا دیا تونے

وطن کو، عیش کو، دولت کو، شان و شوکت کو
عروجِ دین پہ سب کچھ لٹا دیا تونے

ہے کس کے دل میں تڑپ آج دردِ ملت کی
جہاں کو اپنے عمل سے بتا دیا تونے

صدائے حق تری گویا ہے صور بیداری — کہ سوتی قوم کو پل میں جگا دیا تو نے
خدا کے ماننے والے خدا پہ مرنے لگے — کچھ اور آتشِ الفت بڑھا دیا تو نے
بیاں کروں میں تری فیض بخشیاں کیا کیا — ہر ایک قطرہ کو دریا بنا دیا تو نے
زمانہ آج مجھے کہتا ہے ترا شمسی
میں کیا کہوں کہ مجھے کیا بنا دیا تو نے[1]

۸۔ قاری سخاوت حسین خاں مسلم سیوہارویؒ

اے امامِ اہلسنّتؒ، اے امام باوقار — اے امیر ملک و ملّت، اے نثار چاریار
کس طرح بہلائیں دل کو، کس طرح پائیں سکوں — ہیں بہت مجروح ارماں، دل بہت ہے بیقرار
کون پوچھے گا بلاکر بات پروانوں کی اب — تازگی بخشے گا دل کو کون اب جانِ بہار
عمر بھر تو نے سنوارا گلشنِ باغِ رسولؐ — تیری لحدِ پاک پر ہو رحمتِ پروردگار
شیخ[2] جیسا رہنما پیدا نہ ہوگا حشر تک — اور نہ ہوگا کوئی تم جیسا فدائے چار یار
کیسی کیسی صورتیں نظروں سے اوجھل ہوگئیں — یاد کرجاتی ہے جن کی آکے دل کو بیقرار
حُبّ اصحابِ محمدؐ ہے ضمانت خلد کی — کیوں نہ ہوجاؤں میں ناموسِ صحابہؓ پر نثار
بڑھ رہا ہے سوئے طیبہ کاروانِ زندگی — روح شیدائے محمدؐ، دل نثارِ چار یار
تجربہ ہوجائے مسلم نیک و بد اعمال کا
کاش ہوجائے مرا بھی اہلسنّت میں شمار

۹۔ جناب وارث القادری بانسروی

اے امام اہلسنّت، اے فدائے چار یار — تیرے اوصاف حمیدہ کا نہیں کوئی شمار
تو محقق، تو مجدد، تو مبلّغ بے گماں — عالم دیں، عاملِ قرآں، فصیح و نکتہ داں
حجۃ الاسلام، شمع علم، فخرِ اہلِ دیں — نازشِ اہل بصیرت، گوہر بحرِ یقیں

۱۔ یہ نظم حضرت مولانا لکھنویؒ کی حیات میں لکھی گئی تھی اور ماہنامہ ''الداعی'' لکھنؤ، ربیع الآخر ۱۳۵۹ھ میں شائع ہوئی تھی۔

۲۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ

مقتدائے قوم، پابندِ شریعت، با خدا　　زاہد و عابد، مجاہد، متقی وپارسا
ہوگئی اپنی نظر محروم نور اتقا　　آہ اک روشن چراغِ معرفت تھا بجھ گیا
پیروانِ دین و ملّت کو ضرورت تھی ابھی　　تشنہ کا مانِ ہدایت کو ضرورت تھی ابھی
سازشِ اغیار سے ہوشیار تونے کردیا　　سُنیوں کو واقعی بیدار تونے کردیا
تیرا احساں ہے بڑا، اے سنیوں کے پیشوا　　اجر دے اللہ تجھ کو بے حد و بے انتہا
غافلوں کو کردیا لاریب تونے باخبر　　گونج اٹھا ہر طرف نامِ ابوبکرؓ وعمرؓ
بہر قربانی اُٹھے، زحمت اٹھائی جیل کی　　سختیاں جھیلیں، نہ چھوڑا نام اصحاب نبیؐ
اہلسنّت کو عطا کردی نئی اک زندگی　　تیری تحقیقاتِ علمی مٹ نہیں سکتیں کبھی
جانشینانِ نبی کا بول بالا کردیا　　بالیقیں تونے اندھیرے میں اُجالا کردیا
تھا بڑا حیرت فزا انداز تیرے فیض کا　　تیری صحبت میں جو بیٹھا وہ مبلّغ ہوگیا

اے امامِ اہلسنّت، اے فدائے چاریار
چشمِ وارث رہتی ہے فرقت میں تیری اشکبار

قطعاتِ تاریخ

۱۔ فخرِ مشرق حضرت شفیق جونپوریؒ

اٹھ گئے عبدالشکورؒ خوش بیاں　　وعظ سننے کا مزا جاتا رہا
آج وہ شیدائے اصحابِ رسول　　جانبِ دار البقا جاتا رہا
کاشفِ اسرارِ آیات وحدیث　　عالمِ رمز آشنا جاتا رہا
نکتہ فہم و نکتہ پرور، نکتہ جو　　صاحبِ ذہن رسا جاتا رہا
مصرعۂ تاریخِ رحلت لکھ شفیق
یک فقیہِ مقتدا جاتا رہا

۱۳۸۱ھ

۲۔ شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری دیوبندیؒ

نگہبانِ شریعت خلد میں ہے — سرافرازِ طریقت خلد میں ہے
وہ ناموسِ صحابہ کا محافظ — وہ جانبازِ رسالت خلد میں ہے

کہو انور یہ تاریخِ وفات آج
امامِ اہلسنتؒ خلد میں ہے
۴ + ۱۳۷۷ = ۱۳۸۱ھ

۳۔ جناب ابوالفضل شمس لکھنویؒ

اڑ رہی ہے خاک بر روئے زمیں — رو رہا ہے اشکِ خوں چرخِ بریں
سترہ تاریخ تھی ذیقعدہ کی — آسماں ٹوٹا تھا بر روئے زمیں
اُف امامِ اہلسنتؒ کا وصال — ماہی بے آب ہے قلبِ حزیں
وہ بزرگِ وقت ہم سے چھٹ گیا — جس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں
علم و فضل و زہد میں تھے لاجواب — تھا شعار زندگی تبلیغِ دیں
زائرِ حرمین تھے قدسی صفات — عاشقِ اصحابِ ختم المرسلیں
تھیں حدیثیں سیکڑوں وردِ زباں — کرلیا تھا حفظ قرآنِ مبیں
ایسا ہادی ایسا رہبر اب کہاں — زندگی بھر روئیں گے سب اہلِ دیں
جن سے کل تھی رونقِ بزمِ حیات — گلشنِ فردوس میں اب ہیں مکیں
بدعتوں سے بچنے کی راہیں بتائیں — کوئی یہ احساں بھلا سکتا نہیں

شمس از روئے الم سالِ وفات
لکھ دو، حق ہیں، عالم شرع متیں
۱۳۸۱ھ

۴۔ الحاج محمد اصطفا خاں صاحب اصطفاؔ لکھنوی (پاکستان)

عبدالشکورؒ بود مناظر بہ لکھنو بگوید قرب خالق واز خلق دُور شد
شاگرد یک زسید عین القضاۃؒ بود درعلم و فضل شہرتِ اودُور دُور شد
گشتہ رواں بہ دارِ بقا از سرائے دہر داخل بہ قرب رحمت ربِّ غفور شد

کرد اصطفاؔ چو فکر پئے سالِ ارتحال
ہائے بخلد مولوی عبدالشکورؒ شد

ا ۸ ۳ ا ھ

۵۔ مولوی محمد اسحاق صاحب ضیاؔ لکھنویؒ

قبلہ و کعبہ شہ عبدالشکورؒ آج اس دارِ فنا سے چل بسے
موتِ عالم موتِ عالم ہے ضرور مرگئے بے موت ہم سب مرگئے
آپ کے اوصاف میں کیا کیا لکھوں دَورِ حاضر کے مجدد آپ تھے
سترہ ذیقعد دو شنبہ کے روز وقتِ مغرب آپ رخصت ہوگئے

اے ضیاؔ جس شام کو یہ غم ہوا
"شامِ غم" اس شام کی تاریخ ہے

۱۳۸۱ھ

ایضاً

شاہ عبدالشکور فاروقیؒ ہوگئے اس جہان سے رخصت آج
فکر تاریخ جب ہوئی مجھ کو کہا ہاتف نے باستودہ مزاج

اے ضیاؔ لکھ دو یہ بصد افسوس
ہوگیا گل چراغ ہند کا آج

ا ۸ ۳ ا ھ

۶۔ مولانا جمیل الدین صاحب سابق نائب مفتی دارالعلوم دیوبندؒ

دارِ فانی سے روانہ ہوئے جب عبدالشکورؒ
فضل باری سے ہوئے رونقِ بزمِ جنت
ہاتف غیب نے فرمایا کہ تاریخ لکھو
رحلتِ زبدۂ دیں، قدوۂ اہلسنت

۱۳۸۱ھ

ایضاً

جانب خلد ہوگئے عازم
سب کے مخدوم دین کے خادم
یعنی عبدالشکورؒ قدوۂ دیں
فیض جن کا ہے قائم و دائم
ہاتفِ غیب نے کہا لکھیے
موتِ عالم ہے رحلتِ عالِم

۱۳۸۱ھ

۷۔ مولانا قاری ثروت حسین صاحب قاسمی سیوہارویؒ

پہنچے عبدالشکورؒ خلد میں جب
قدسیوں میں چہل پہل تھی عجب
حکم رضواں ہوا کہ لکھ دیجیے
آئے عبدالشکورؒ خلد میں اب

۱۳۸۱ھ

۸۔ حافظ رحمت اللہ صاحب رحمت لکھنوی ؒ

اس دور میں امّت پر کچھ ایسے مقام آئے
کوئی بھی نہ کام آیا اِک تم تھے جو کام آئے

ہاں ساقیٔ کوثر کے ہر رند کے کام آئے
میخانہ پہ میخانہ اور جام پہ جام آئے

اصحاب کے ناموں سے واقف ہی نہ تھی دنیا
یہ فیض تمھارا ہے جو لب پہ وہ نام آئے

صدیقؓ و عمرؓ عثمانؓ حسنینؓ ہوں یا حیدرؓ
ہر اک کی حمایت میں ہر وقت یہ کام آئے

قرآن ہو سیرت ہو، تاریخ وفقہ کچھ ہو
ہر لب پر تمھارے ہی انمول کلام آئے

تم جانِ مجدّد[1] تھے اور شان بہاء الدین[2]
اس راہِ طریقت میں کم ایسے مقام آئے

انوار رخِ مرشد جب چھپ گئے پردے میں
آئے اے اجل تیرا اب جس کو پیام آئے

تم مردِ حق آگہ تھے اخلاق سراپا تھے
اپنے تو پھر اپنے تھے غیروں کے سلام آئے

اے مرشد و مولائی اب تم سا کہاں پاؤں
ہر موڑ پہ کام آئے ہر گام پہ کام آئے

اے صاحبِ میخانہ سب بیٹھے ہیں تشنہ لب
میخانہ سنور جائے پھر دور میں جام آئے

جس شام کو اے رحمتؔ یہ غم ہوا دنیا میں
اللہ نہ کرے ایسا کوئی غمِ شام آئے

۱۳۸۱ھ

۹۔ حکیم سیّد محمود صاحب سلطانپوری

آں امام اہلسنّت بود بر حق
کہ جہاں شد ز رحلتش بہ خروش
نامِ نیکش محمد عبدالشکورؒ
کار خیرش دفاع نیش نیوش
دست بالا کشیدہ بہر دُعا
''باد غفراں مآب'' گفت سروش

۱ ۳ ۸ ۱ ھ

---

[1] امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ [2] امام الطریقۃ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ

۱۰۔ حکیم سید حسن اخترؔ صاحب رائے بریلوی

ہوا کوچ عالِم کا عالَم سے آہ
صَبا لے کے آئی تھی جب بوئے خلد
ہوئے حق سے واصل جب عبدالشکورؒ
تو رضواں نے کھولا در کوئے خلد
یہ تاریخِ رحلت تم اخترؔ لکھو
امام اہلسنت چلے سوئے خلد
۱ ۸ ۳ ۱ ھ

قطعات تعزیت

۱۔ الحاج حافظ محمد نسیم صاحب نسیمؔ انصاری لکھنویؒ

ہمیں صدمہ نہ ہو کیونکر امام اہلسنتؒ کا
کہاں سے آئے گا ہمسر امام اہلسنتؒ کا
اصولِ شرع بتلا کر بچایا شرک و بدعت سے
نسیمؔ احسان ہے ہم پر امام اہلسنتؒ کا

۲۔ الحاج محمد یوسف صاحب یوسفؔ لکھنوی

جو اہل دیں کو تمنائے فضلِ باری ہے
رکوع و سجدہ، قعود و قیام جاری ہے
بہ فیض حضرتِ عبدالشکورؒ اے یوسفؔ
کہ تو بھی سالم الایماں ہے چار یاری ہے

۳۔ حافظ محمد عثمان صاحب خنجر لکھنویؒ

عرشِ اعظم پہ جشن کا ہے سماں
حور و غلماں ہیں سب خوشی میں مگن
شاہ عبدالشکورؒ فاروقیؒ
دارِ فانی سے جاچکے ہیں وطن

۴۔ حافظ رحمت اللہ صاحب رحمت لکھنویؒ

ترا ذکر ہو رہا تھا سرِ عرش لامکاں میں
وہاں شمع تھے محمدؐ، خلفاء تھے شمع خانہ
بخدا میں سن رہا تھا یہ فرشتے کہہ رہے تھے
وہ زمیں[۱] کا ہے جو ٹکڑا وہاں دفن ہے خزانہ

۵۔ جناب وارث بارہ بنکوی

زہے وہ ساقی جام طہور فاروقی
خوشا وہ صاحب فہم و شعور فاروقی
ظہور ہوتا ہے صدیوں میں ایسی ہستی کا
امامِ عصر تھے عبدالشکور فاروقیؒ

۶۔ جناب گوہر جائسی

قرار دادِ مقاصد کے تم مصنف تھے — یہ صور پھونک کے خود سو گئے کہاں آخر
زمانے بھر کی امامت کا آسرا بن کر — رہِ حیات میں گم ہو گئے کہاں آخر
نمازِ عشق اقامت کی منتظر ہے ابھی — اذاں پکار کے تم سو گئے کہاں آخر

---

[۱] یہ اشارہ حضرت مولاناؒ کی قبر کی طرف ہے۔

۷۔ جناب ساجدؔ صدیقی صاحب لکھنوی

اے امام اہلسنت، اے امام المسلمین
آپ تھے عین القضا صاحبؒ کے سچے جانشین
اے امام اہلسنت، واقفِ شرعِ متیں
آپ کی ذاتِ گرامی منبعِ اسرارِ دیں
آپ کا کردار دنیا میں مثالی شاہکار
اس زمانے میں کوئی ہمسر کوئی ثانی نہیں
درحقیقت آپ تھے اپنی مثال اس دور میں
اب مثال ایسی کوئی مل ہی نہیں سکتی کہیں
اک مدبر، اک مبصر، اک مفسر، اک ادیب
نکتہ ور تھے نکتہ رس تھے نکتہ داں تھے نکتہ بیں
مردِ مومن کی فراست تھی فراست آپ کی
آپ کے گلشن کا ہے ہر اک مفسّر خوشہ چین
دی تھی قدرت نے دلوں کو موہ لینے کی ادا
سرپرست اب عالمانِ ہند کا کوئی نہیں
آپ کو قدرت نے بخشا تھا کمالِ معرفت
آپ کے رُخ پر تھا رخشندہ جمالِ عارفیں
محورِ علم و عمل تھے، مرکزِ فکر و نظر
آپ کی ہر بات درسِ علم ایمان و یقیں
دولتِ دنیا کو ٹھکراتے رہے تازندگی
مرحبا صد مرحبا اے صابرِ نانِ جویں
دشمنوں کو بھی گلے اپنے لگایا آپ نے
دشمنی کا ذکر حضرت کی سوانح میں نہیں
موڑ کر منہ کیا گئے اس دارِ فانی سے جناب
آفتابِ علم و دانش ہوگیا زیرِ زمیں
قلبِ ساجدؔ کو سکوں شاید کچھ اس صورت ملے
خاتمہ بالخیر فرمادے جو ربّ العلمین

۸۔ جناب والی آسیؔ لکھنویؒ

تشنہ لب تھے ہم کو مست جامِ عرفاں کردیا
اے امام اہلسنت تونے احساں کردیا
راہِ حق میں زندگی کو نذرِ یزداں کردیا
مسکرا کر یعنی ہر مشکل کو آساں کردیا
تیرے علم و فضل کا قائل رہا ہر اک بشر
فرق کو یوں حق و باطل کے نمایاں کردیا
تیری ذاتِ پاک نے اے واعظِ شیریں بیاں
ازسرِ نو ہر مسلماں کو مسلماں کردیا
مثلِ گوہر، مثلِ شبنم، مثلِ انجم، مثلِ ماہ
لکھنؤ کے ذرّے ذرّے کو درخشاں کردیا
رحمتیں اللہ کی کیونکر نہ ہوں تجھ پر نثار
تونے اصحابِ نبی پر خود کو قرباں کردیا
عمر بھر والیؔ یہ احساں ہم بھلا سکتے نہیں
تونے ہم کو واقفِ اسرارِ قرآں کردیا

منظوم شجرۂ نقشبندیہ مجدّدیہ

جناب ابوالفضل شمس لکھنویؒ

یا الٰہی اپنی ذاتِ باصفا کے واسطے
اپنے جلووں کے لیے، اپنی ولا کے واسطے
رحم کر مجھ پر محمد مصطفیٰؐ کے واسطے

صدق سے سینے کو بھردے، صبر کا حامل بنا
نور ہی ہو نور جس میں میرا ایسا دل بنا
حضرتِ صدیق اکبرؓ کی وَفا کے واسطے

حضرت سلمانؓ کی ایسی محبت کر عطا
رات دن نامِ محمدؐ پر رہوں دل سے فدا
یا الٰہی عاشقِ خیرالوریٰؐ کے واسطے

مکرِ شیطاں سے بچا اور راستہ سیدھا چلا
دور کر دنیا کی اب دل سے مرے حرص و ہوا
حضرتِ قاسمؒ کے زہد و اتقا کے واسطے

تیرا ہی بندہ رہوں اور تیری ہی الفت رہے
جب جھکے یہ سَر ترے ہی آستانے پر جھکے
جعفرِ صادقؒ کی تسلیم و رضا کے واسطے

تیرے ہی جلوے رہیں آنکھوں میں اور تیری ہی دید
کر میسر مجھ کو یارب پیروئ بایزیدؒ
فضل کر بسطام کے لطف و عطا کے واسطے

معرفت مجھ کو عطا کر نورِ ایماں مجھ کو دے
جو بھی دے اے بانٹنے والے فراواں مجھ کو دے
بوالحسنؒ ایسے امام الاولیاء کے واسطے

رحم کر ہاں رحم کر اے مالکِ ہر دوسرا
میرے عصیاں سے تری رحمت کا ہے پلّہ بڑا
بوعلی مخدومؒ شاہِ اتقیاء کے واسطے

لفظِ کُن سے جیسے پیدا کی ہے تو نے کائنات
ویسے ہی دے اک اشارے میں مصیبت سے نجات
خواجۂ یوسف امام الاصفیاء کے واسطے

رات دن روتی ہوئی آنکھوں کے آنسو پونچھ دے
دل پہ رکھ ضبط تسلّی جس سے کچھ تسکیں ملے
شاہ عبدالخالقؒ اہلِ صفا کے واسطے

اے خدا تو دل کو میرے نور سے معمور رکھ　　کبر و نخوت کی کثافت سے ہمیشہ دور رکھ
عارفؒ باللہ شاہِ اولیاء کے واسطے -

حمد تیری لب پہ ہو، نعتِ محمدؐ برزباں　　تیری یکتائی کی ہوں ہر وقت نغمہ سنجیاں
خواجۂ محمودؒ قلبِ پُرضیاء کے واسطے

ہے تجھے پہچاننے کا یہ طریقہ خوشنما　　دے مجھے خواجہ عزیزانِ علیؒ کی اقتدا
رہنمائی کر مری اس رہنما کے واسطے

بخش وہ دل جو تری کہنہ حقیقت جان لے　　آنکھ وہ مجھ کو عطا کر جو تجھے پہچان لے
حضرتِ بابا سماسیؒ حق نما کے واسطے

رنگ میں اپنے سمودے دل کی ہر اک آرزو　　بس رہے تیری ہی الفت اور تیری جستجو
حضرتِ سید کلالِؒ با خدا کے واسطے

پھیر دے دلچسپیٔ دنیا سے دل کو پھیر دے　　مان لے یہ بات صدقے میں بہاء الدینؒ کے
نقشبندیہ امامؒ باصفا کے واسطے

دے دواء دردِ دل یارب ترا بیمار ہوں　　یا الٰہی میں غلامِ حضرتِ عطارؒ ہوں
حق پہ کردے خاتمہ اس حق نما کے واسطے

حوصلوں سے میرے دل کے تیری رحمت ہے سوا　　اے بنانے والے سب کی میری بگڑی بھی بنا
خواجۂ یعقوبؒ مرد باخدا کے واسطے

گرم ہو جب دھوپ کی تیزی سے محشر کی زمیں　　رحمتیں برسانا مجھ پہ، مالکِ دنیاو دیں
خواجۂ احرارؒ تاج الاولیاء کے واسطے

حشر کے دن پرُسش اعمال جب ہونے لگے　　یا الٰہی خاص رحمت کی نظر مجھ پر رہے
حضرت زاہدؒ کے زہد و اتقاء کے واسطے

زندگی جب تک رہے لب پر رہے تیرا ہی نام　　اور ترے محبوب کا کہلاؤں اک ادنیٰ غلام
خواجۂ درویشِ محمدؒ پیشوا کے واسطے

مشکلیں جتنی پڑیں آسان ہوجایا کریں　　غیب سے آرام کے سامان ہوجایا کریں
خواجۂ امکنگیؒ رئیس الاولیاء کے واسطے

ہے بقا تیرے لیے اور ہے فنا میرے لیے　　کر فنا فی اللہ کا دروازہ وا میرے لیے
خواجۂ باقیؒ حبیبِ مصطفیٰؐ کے واسطے

جب فرشتہ موت کا آئے بلانے کے لیے　　یا الٰہی کلمۂ توحید ہو لب پر مرے
شیخ احمدؒ سرگروہ اولیاء کے واسطے

چاہتا ہوں خاص بندوں میں ترے ہوں میں شمار　　آرزو کردے یہ پوری اے مرے پروردگار
خواجۂ معصومؒ کے فیض و عطاء کے واسطے

دور رکھ بدعت سے مجھ کو اور غیبت سے بچا　　ظاہر و باطن مرا یکساں بنا دے اے خدا
شیخ سیف الدینؒ حقیقت آشنا کے واسطے

کر مجھے پابند شرعِ حضرتِ خیرالوریٰؐ　　سب فرائض دین کے ہوتے رہیں مجھ سے ادا
حضرت نورِ محمدؒ پیشوا کے واسطے

خانۂ کعبہ کی مجھ کو بھی زیارت ہو نصیب　　اور وہاں بھی جاؤں سوتا ہے جہاں تیرا حبیبؐ
جان جاناںؒ میرزا حق آشنا کے واسطے

رات دن مجھ پر رہے تیری عنایت کی نظر　　اسکے صدقے میں کہ جو ہے نائبِ خیرالبشرؐ
یعنی عبداللہؒ سلطان الہدیٰ کے واسطے

دشمنوں کے ظلم سے یارب مجھے محفوظ رکھ　　ہوں غلامِ چاریارؓ پاک یہ ملحوظ رکھ
بوسعیدِ حق پرست و باخدا کے واسطے

نام لیوا تیرا ہوں، تیرا سہارا ہے مجھے　　بخش دے میرے گنہ اے میرے مالک بخش دے
حضرتِ عبدالغنیؒ پارسا کے واسطے

حشر ہو میرا ولی و اصفیا کے ساتھ ساتھ　　خلد میں جاؤں میں ختم الانبیاء کے ساتھ ساتھ
شاہ ابو احمدؒ طریقت آشنا کے واسطے

بندگی کے ہوں وہی تیور وہی ماتھے پہ نور　　جیسے تھے آقائے ملّت حضرت عبدالشکورؒ
ویسا ہی مجھ کو بنادے مصطفیٰؐ کے واسطے

نقشبندیہ یہ شجرہ جو پڑھے اور جو سنے　　شمس کے اور اُن سبھوں کے جرم وعصیاں بخش دے
ان بزرگوں اور خاصانِ خدا کے واسطے

مراجع ومصادر

کتابیات

(الف)

۱۔ آبِ کوثر، شیخ محمد اکرام، لاہور، ۱۹۴۰ء۔

۲۔ الآثار المرفوعه فی الاخبار الموضوعه، مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلیؒ، مطبع علوی لاہور، ۱۳۰۴ھ۔

۳۔ آئین اکبری، جلد دوم (اردو ترجمہ)، علامہ ابوالفضل، مترجم مولوی فدا علی طالب حیدرآباد، ۱۹۳۹ء۔

۴۔ آئینۂ کمالات، مرزا، مرتب ناظم دارالاشاعت رحمانی، مونگیر۔

۵۔ ابوالائمہ کی تعلیم، حضرت لکھنویؒ، شاہی پریس، لکھنؤ۔

۶۔ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقهاء المحدثین، نواب صدیق حسن خاں، مطبع نظامی، کانپور ۱۲۸۸ھ۔

۷۔ اجوبة المتحرفین فی ترک الکتاب المبین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم، عمدة المطابع، لکھنؤ، ۱۳۴۴ھ۔

۸۔ احیاء المیت فی تحقیق الآل واهل البیت، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ ماہنامہ ''الداعی'' لکھنؤ، ۱۳۵۹ھ۔

۹۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲/۱۴، طبع اوّل، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۲ء۔

۱۰۔ نسخۂ تعلیمیه (اُردو ترجمہ) مترجم حضرت مولانا عبدالمومن فاروقی، تیج کمار پریس وارث نولکشور پریس، لکھنؤ۔

۱۱۔ ازاحة العیب، مترجمہ حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۲۵ھ۔

۱۲۔ ازالة الخفا، مقصد دوم، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، بھوپال ۱۳۸۶ھ۔
۱۳۔ اسد الغابہ کامل (اردو) مترجمہ حضرت لکھنویؒ، عمدۃ المطابع لکھنؤ ۱۳۲۲ھ-۱۳۲۸ھ۔
۱۴۔ اسلامی تاریخی کہانیاں، حضرت مولانا عبدالمومن فاروقی۔
۱۵۔ اصول کافی، باب التقیہ، یعقوب کلینی، لکھنؤ۔
۱۶۔ اعجاز القرآن، مولانا عبدالمومن فاروقی، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۵۱ھ۔
۱۷۔ الاعلام، جلد ۳، ۵، ۶، ۸، حکیم مولوی سیّد عبدالحیؒ حسنی، مکتبہ عرفات، رائے بریلی، ۱۹۹۳ء
۱۸۔ الاعلام، علامہ خیر الدین زرکلی، جزو ۵ و ۶، طبع ثالث، بیروت، ۱۹۶۹ء۔
۱۹۔ افاضۃ العینین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۳۲ھ
۲۰۔ افسانہ تحریف قرآن، حضرت لکھنویؒ، کراچی۔
۲۱۔ اقامة البرهان علیٰ ان الشیعة اعداء القرآن، حضرت لکھنویؒ مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۴۴ھ۔
۲۲۔ امارت شرعیہ، مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی، پھلواری شریف پٹنہ ۱۹۷۴ء۔
۲۳۔ انتصار الاسلام، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۲۲ھ۔
۲۴۔ انسائیکلوپیڈیا قائداعظم، زاہد حسین انجم، مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۹۱ء۔
۲۵۔ ائمہ اثنا عشر اور ان کا مذہب، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ۔
۲۶۔ اوّل المومنین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۶۲ھ۔
۲۷۔ اوّل من المائتین، نمبر اوّل، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ، ۱۹۲۵ء۔

(ب)

۲۸۔ باقیات صالحات، فارسی ترجمہ آیات بینات، مترجمہ حضرت لکھنویؒ، اجمل پریس، بمبئی، ۱۳۶۸ھ۔
۲۹۔ بحر زخار، مائیکروفلم کاپی مخزونہ سینٹرل لائبریری جامعہ ہمدرد، نئی دہلی، مرتبہ مولانا مفتی وجیہ الدین اشرف گوپامئوی، منقولہ ۱۳۰۳ھ۔
۳۰۔ برزخ کی باتیں، حضرت مولانا عبدالمومن فاروقی لکھنؤ، ۱۹۶۷ء۔

۳۱۔ بزم خوش نفساں، ڈاکٹر جمیل جالبی، مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۵ء۔
۳۲۔ بہشتی گوہر، حضرت تھانویؒ، ربانی بکڈپو، دہلی۔
۳۳۔ پرانے چراغ، حصہ دوم، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مکتبہ فردوس لکھنؤ ۱۹۸۰ء۔

(ت)

۳۴۔ تاریخ اودھ، جلد ۳و۵، مولوی نجم الغنی رامپوری، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۹ء۔
۳۵۔ تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ اوّل، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ ۱۹۶۹ء۔
۳۶۔ تاریخ طبری، حصہ اوّل، اُردو، مترجمہ حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۲۲ھ۔
۳۷۔ تاریخ قصبہ کاکوری، قاضی خادم حسن علوی، نولکشور پریس لکھنؤ، ۱۹۲۵ء۔
۳۸۔ تاریخ ندوۃ العلماء، حصّہ اوّل، مولانا اسحاق جلیس ندوی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء۔
۳۹۔ تاریخی مضامین، حضرت لکھنویؒ، مرتبہ مولوی علی مطہر نقوی، کراچی ۱۹۹۲ء۔
۴۰۔ تحذیر المسلمین عن خداع الکاذبین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ الداعی لکھنؤ۔
۴۱۔ تحریک مدح صحابہ، مولوی مظہر علی اظہر، لاہور۔
۴۲۔ تحفة الانصاف، حضرت لکھنویؒ، عمدۃ المطابع، لکھنؤ۔
۴۳۔ تحفة الاسلام لجمیع الاقوام، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۹۳۶ء۔
۴۴۔ تحفةالبهیه فی نتائج التقیه، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ۔
۴۵۔ تحفۂ ایمانی، دوسرا ایڈیشن، مولوی فقیر محمد، عمدۃ المطابع لکھنؤ ۱۳۴۴ھ۔
۴۶۔ تحفۂ لاثانی برفرقۂ رضاخانی، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۹۲۵ء۔
۴۷۔ تحقیق مسئلہ بدا، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۴۷ھ۔
۴۸۔ تذکرۂ بے بہا، مولوی محمد حسین نوگانوی، جید پریس دہلیٹ
۴۹۔ تذکرہ حضرت شاہ عبدالرحیم وشاہ ابوالرضا محمد دہلوی، مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی، لکھنؤ ۱۹۸۹ء۔
۵۰۔ تذکرہ خاندان عزیزی، پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، علی گڈھ، ۱۹۷۸ء۔
۵۱۔ تذکرہ علماء ہند، مولوی رحمٰن علی، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔

۵۲۔ تذکرہ علماء اہلسنت، مولوی محمود احمد، کانپور، ۱۳۹۱ھ۔
۵۳۔ تذکرہ کاملان رامپور، حافظ احمد علی خاں شوقؔ، دہلی، ۱۹۲۹ء۔
۵۴۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری، مولوی علی حیدر کاکوروی، اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء۔
۵۵۔ ترمذی جلد دوم، ابواب الایمان، امام ابوعیسیٰ ترمذیؒ مطبع مجتبائی دہلی، ۱۳۲۸ھ۔
۵۶۔ تطہیر الجنان، علامہ ابن حجر مکیؒ، اُردو ترجمہ حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ، ۱۳۴۸ھ۔
۵۷۔ تفسیر آیات امامت، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۸ھ۔
۵۸۔ تفسیر آیات متفرقہ، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۵۰ھ۔
۵۹۔ تفسیر آیات مدح مہاجرین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۶ھ۔
۶۰۔ تفسیر آیات مذمت منافقین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۸ھ۔
۶۱۔ تفسیر آیت استخلاف، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ۔
۶۲۔ تفسیر آیت اظہار دین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ۔
۶۳۔ تفسیر آیت اولی الامر، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم، لکھنؤ، ۱۳۴۵ھ۔
۶۴۔ تفسیر آیت تبلیغ، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۸ھ۔
۶۵۔ تفسیر آیت تطہیر، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ۔
۶۶۔ تفسیر آیت تمکین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۴ھ۔
۶۷۔ تفسیر تقسیم مال فئے، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ۔
۶۸۔ تفسیر آیت حفاظت دین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ الداعی، ۱۳۵۷ھ۔
۶۹۔ تفسیر آیت دعوت اعراب، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم ۱۳۵۱ھ۔
۷۰۔ تفسیر آیت رضوان، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم ۱۳۵۱ھ۔
۷۱۔ تفسیر آیت قتال مرتدین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم ۱۳۴۴ھ۔
۷۲۔ تفسیر آیت مباہلہ، حضرت لکھنویؒ ماہنامہ انوار مدینہ لاہور ۱۹۸۷ء۔
۷۳۔ تفسیر آیت معیت، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۹۳۴ء۔
۷۴۔ تفسیر آیت ملک طالوت، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۷ھ۔
۷۵۔ تفسیر آیت مودۃ القربیٰ، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۶ھ۔

۷۶۔ تفسیر آیت میراث ارض، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۵ھ۔
۷۷۔ تفسیر آیت ولایت، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۴۴ھ۔
۷۸۔ تفہیمات الہیہ، جلد اوّل، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، بجنور ۱۹۳۶ء۔
۷۹۔ تفضیح الجائرین، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ عمدۃ المطابع، ۱۹۳۲ء۔
۸۰۔ تنبیہ الحائرین، حضرت لکھنویؒ، دوسرا ایڈیشن، لکھنؤ، ۱۳۴۲ھ۔
۸۱۔ تنویر الایمان اُردو ترجمہ تطہیر الجنان، مترجمہ حضرت لکھنویؒ، طبع ثانی، لکھنؤ۔
۸۲۔ تواریخ اودھ، سید کمال الدین حیدر، نولکشور پریس لکھنؤ ۱۳۴۸ھ۔

(ج)

۸۳۔ جمعیۃ علماء ہند، دستاویزات، جلد دوم، ڈاکٹر پروین روزینہ، اسلام آباد۔
۸۴۔ چہل حدیث، مترجمہ حضرت لکھنویؒ، عمدۃ المطابع، لکھنؤ۔

(ح)

۸۵۔ الحجۃ القویہ بذکر مواقع التقیہ، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ الداعی لکھنؤ۔
۸۶۔ حدیقۃ الاولیاء محمد اقبال مجددی، لاہور، ۱۹۷۶ء۔
۸۷۔ حرمت متعہ، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ الداعی لکھنؤ، ۱۳۶۳ھ۔
۸۸۔ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ، چکوال (پاکستان) ۱۹۸۰ء۔
۸۹۔ حیات ابوالمآثر، ڈاکٹر مسعود احمد۔
۹۰۔ حیات خلیل، حصہ دوم، مولانا سید محمد ثانی حسنی، لکھنؤ، ۱۳۹۶ھ۔
۹۱۔ حیات عبدالحی، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، نامی پریس، لکھنؤ ۱۹۷۰ء۔

(خ)

۹۲۔ الخطبۃ الشوقیہ الی حضرۃ المجددیہ، حضرت لکھنویؒ، عمدۃ المطابع لکھنؤ۔
۹۳۔ خمینی اثنا عشری کے بارے میں علماء کرام کا متفقہ فیصلہ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سجاد

ندوی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء۔

(د)

۹۴۔ دارالمبلغین اور اس کی پنج سالہ سرگذشت، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۹۳۷ء۔
۹۵۔ دبستانِ دبیر ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی شیعی، نسیم بکڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۶ء۔
۹۶۔ دستور العمل برائے دارالمبلغین (قلمی) حضرت لکھنویؒ، مخزونہ دارالمبلغین لکھنؤ۔
۹۷۔ دیوان امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ، مترجمہ مولانا محمد سعید اعظمی، کانپور ۱۹۳۰ء۔
۹۸۔ دنیاء تصوف، مرتبہ مولانا حکیم عبدالغنی صاحب فاروقی، کاکوری ضلع لکھنؤ ۱۴۰۱ھ۔
۹۹۔ دیار پورب میں علم اور علماء، مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۷۹ء۔

(ر)

۱۰۰۔ راحة القلوب بذكر المحبوب (قلمی) حضرت لکھنویؒ، مملوکہ راقم الحروف۔
۱۰۱۔ ردّ مذہب شیعہ (مناظرہ بمبئی)، حصہ اوّل، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ، ۱۳۳۶ھ۔
۱۰۲۔ رودکوثر، شیخ محمد اکرام، لاہور، ۱۹۷۹ء۔
۱۰۳۔ روداد دارالمبلغین لکھنؤ، مرتبہ حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقیؒ لکھنؤ، ۱۹۷۱ء۔
۱۰۴۔ روداد مقدمہ بہاولپور، جلد اوّل، اسلامک فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۸۸ء۔

(س)

۱۰۵۔ سخنوران کاکوری، حکیم نثار احمد علوی، ناظم آباد کراچی، ۱۹۷۱ء۔
۱۰۶۔ سلك المرجان فی مصادر قرآن، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم ۱۳۶۱ھ۔
۱۰۷۔ سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا سید ابوالحسن ندویؒ، لکھنؤ، ۱۹۶۲ء
۱۰۸۔ سيرت الحبيب الشفيع من الكتاب العزيز الرفيق، حضرت لکھنویؒ، ۱۳۳۲ھ۔
۱۰۹۔ سیرت خلفاء راشدین، حضرت لکھنویؒ، پہلا ایڈیشن، لکھنؤ، ۱۳۴۹ھ۔
۱۱۰۔ سیرت خلفاء راشدین حضرت لکھنویؒ چھٹا ایڈیشن، دہلی، ۱۹۸۵ء۔

(ش)

۱۱۱۔ شجرۂ طیبہ، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ، ۱۹۴۵ء۔

۱۱۲۔ شرح سفر السعادہ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، نولکشور، لکھنؤ ۱۲۷۵ھ۔

۱۱۳۔ شرح حدیث ثقلین، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم، لکھنؤ۔

۱۱۴۔ شرح مسئلہ امامت، حصہ اوّل و دوم، حضرت لکھنویؒ، ۱۳۵۰ھ۔

۱۱۵۔ شفاء روحانی، شاہ محمد شفیع کچھوچھوی، عمدۃ المطابع لکھنؤ، ۱۳۴۵ھ۔

۱۱۶۔ شکست عظیم بہ اعداء قرآن کریم، دو حصوں میں، دوسرا ایڈیشن، حضرت لکھنویؒ، ۱۹۳۰ء۔

۱۱۷۔ شمائل النبی اردو ترجمہ شمائل ترمذی، حضرت لکھنویؒ، مکتبہ فاروقیہ لکھنؤ۔

۱۱۸۔ شیعوں کے قبلہ و کعبہ ایڈیٹر اصلاح کی ہزیمت، مولوی عبدالحکیم، مطبع مفید عام پاٹانالہ لکھنؤ۔

۱۱۸ (الف)۔ شیعوں کی بیداری، نواب مرزا سجاد علی خاں، قتیل پریس، وکٹوریا اسٹریٹ لکھنؤ۔

(ص)

۱۱۹۔ صحبتے با اہل دل، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، لکھنؤ، ۱۹۷۰ء۔

۱۲۰۔ صفۃ الصفوہ، جلد اول، پہلا ایڈیشن، علامہ ابن جوزی، حیدرآباد ۱۳۵۵ھ۔

۱۲۱۔ صولت محمدیہ بر فرقہ غلمدیہ، حضرت مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی، لکھنؤ۔

۱۲۲۔ صیحۂ رنگون پر پیروان دجال زبون، مولانا احمد بزرگ سملکی، لکھنؤ۔

(ع)

۱۲۳۔ عبرت نظارہ در واقعۂ ناناپارہ، احمد مرزا ناناپاروی، اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء۔

۱۲۴۔ عدد السنین والحساب، مولانا ابرار حسین فاروقی گوپامئوی، علی گڈھ، ۱۹۶۱ء۔

۱۲۵۔ عرضداشت بخدمت سر ہیری ہیگ، گورنر یوپی، لکھنؤ، ۱۹۳۶ء۔

۱۲۶ عقد ام کلثوم، حضرت عبدالمومن فاروقیؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۲۵۰ھ۔

۱۲۷۔ عقل سلیم اور صراط مستقیم، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ۔

۱۲۸۔ علم الفقہ (چھ جلدوں میں)، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ، ۱۳۳۰ھ۔

۱۲۹۔ علم الفقہ (جدید ایڈیشن) حضرت لکھنویؒ لکھنؤ ۱۹۷۷ء۔

۱۳۰۔ علماء کی رائیں، مولوی مشتاق احمد لدھیانوی، لکھنؤ ۱۹۳۳ء۔

۱۳۱۔ علماء کرام کا متفقہ فتویٰ، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ۔

(ف)

۱۳۲۔ فتح حقانی بر فرقہ رضا خانی، مولوی زاہد حسن رشیدی، لکھنؤ ۱۹۸۲ء۔

۱۳۳۔ فتح مبین بر اعدائے ختم المرسلین، مولوی ابوالخیرات نقشبندی، الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۶ء۔

۱۳۴۔ **فصل الخطاب فی اثبات تحریف کتاب رب الارباب**، علامہ نوری طبرسی، ایران ۱۲۹۸ھ۔

۱۳۵۔ فقہ اکبر، امام ابوحنیفہ کوفی، مترجمہ حضرت لکھنویؒ مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۲۲ھ۔

۱۳۶۔ فواتح الرحموۃ شرح مسلّم الثبوت، علامہ بحر العلوم فرنگی محلیؒ، نولکشور، لکھنؤ۔

(ق)

۱۳۷۔ قاتلانِ حسین کی خانہ تلاشی، حضرت لکھنویؒ، مکتبہ فاروقیہ لکھنؤ ۱۹۶۴ء۔

۱۳۸۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، مرزا جعفر حسین، ترقی اُردو بیورو، دہلی ۱۹۸۱ء۔

۱۳۹۔ قرآنی سیرت نبوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مدراس، ۱۳۶۴ھ۔

۱۴۰۔ قصۂ قرطاس کا مختتم فیصلہ، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ الداعی لکھنؤ ۱۳۶۰ھ۔

۱۴۱۔ قطع الوتین من الذین یستدل الشک بالیقین حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۳۴۴ھ۔

۱۴۲۔ قیصر التواریخ، جلد اوّل، سید کمال الدین حیدر، نولکشور کانپور ۱۹۰۷ء۔

(ک)

۱۴۳۔ کاروانِ احرار، جلد دوم وسوم، جانباز مرزا، گلشن کالونی لاہور ۱۹۷۸ء۔

۱۴۴۔ کتاب الصلوۃ، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ، ۱۹۳۶ء۔
۱۴۵۔ کرامات موسویہ، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۳۳۱ھ۔
۱۴۶۔ کشف الاستار، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۳۳۰ھ۔
۱۴۷۔ کشف اللفافہ، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۳۴۴ھ۔
۱۴۸۔ کشف حقیقت مذہب شیعہ حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۳۴۷ھ۔
۱۴۹۔ کشف الغطاء عن السنة البیضاء اُردو ترجمہ ازالۃ الخفا، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۳۲۹ھ۔
۱۵۰۔ کلیات نظیر (گیارہواں ایڈیشن) مقدمہ حضرت مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ، مطبع تیج کمار وارث نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۵۱ء۔

(گ)

۱۵۱۔ گذشتہ لکھنؤ، مولانا عبدالحلیم شررؔ، نسیم بکڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۵ء۔
۱۵۲۔ گورنمنٹ کمیونک مجریہ ۳۰/ مارچ ۱۹۳۹ء، محکمہ اطلاعات لکھنؤ ۱۹۳۹ء۔
۱۵۳۔ گورنمنٹ گزٹ مجریہ ۲۸/ مارچ ۱۹۳۸ء لکھنؤ ۱۹۳۸ء۔
۱۵۴۔ گورنمنٹ یوپی ریزولیوشن، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۲۷ھ۔

(ل)

۱۵۵۔ لغت نامہ دہخدا، مطبوعہ ایران، ۱۳۵۱ء۔

(م)

۱۵۶۔ مآثر الکرام، دفتر اول، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، آگرہ، ۱۹۱۰ء۔
۱۵۷۔ ماثبت بالسنۃ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، نولکشور کانپور، ۱۸۸۴ء۔
۱۵۸۔ مباحثہ چکوال (پنجاب) پاکستان، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ، ۱۹۱۸ء۔
۱۵۹۔ مباحثہ مکیریاں ضلع ہوشیار پور پنجاب، مولوی سید محمد کامل، لکھنؤ ۱۳۴۷ھ۔

۱۶۰۔ متفقہ فتویٰ، باہتمام دارالمبلغین لکھنؤ، شاہی پریس لکھنؤ، ۱۳۴۵ھ۔
۱۶۱۔ مجموع الفتاویٰ جلد اول ودوم، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ، مطبع شوکت اسلام لکھنؤ، ۱۳۰۷ھ۔
۱۶۲۔ مجموعہ فتاویٰ مدح صحابہ، لکھنؤ، ۱۳۵۵ھ۔
۱۶۳۔ محاسن سجاد، مولانا مسعود عالم ندوی، پٹنہ، ۱۳۶۰ھ۔
۱۶۴۔ مختصر حالات وتعلیمات بزرگانِ دین، مولانا عبدالاول فاروقیؒ، لکھنؤ۔
۱۶۵۔ مختصر سیرت نبویہ، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ ۱۳۳۰ھ۔
۱۶۶۔ مدح صحابہ اور تبرّا، ابوسعید بزمی، مدینہ بجنور، ۱۹۳۹ء۔
۱۶۷۔ مدح صحابہ ایجی ٹیشن کا شرعی پروگرام، حضرت مولانا سید حسین مدنیؒ، لکھنؤ، ۱۳۵۸ھ۔
۱۶۸۔ مدح صحابہ کی مخالفت میں آیت قرآنی سے غلط استدلال، حضرت لکھنویؒ کراچی، ۱۹۹۳ء۔
۱۶۹۔ مدح صحابہ ایجی ٹیشن کی علمی ودینی حیثیت، مولوی سید علی مظہر نقوی، کراچی ۱۹۹۳ء۔
۱۷۰۔ مدح صحابہ شیعوں کی معتبر کتابوں سے، حضرت لکھنویؒ، ۱۹۳۷ء۔
۱۷۱۔ مسئلہ مدح صحابہ پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا بصیرت افروز بیان، مرتبہ مولوی مشتاق احمد لدھیانویؒ، آرٹ پریس لکھنؤ۔
۱۷۲۔ مصباح المشائخ، حکیم ہادی رضا خاں ماہر، منبع الطب پریس لکھنؤ ۱۹۲۸ء۔
۱۷۳۔ معجزۃ القرآن، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ۔
۱۷۴۔ مقامات خیر، مولانا شاہ ابوالحسن زید فاروقیؒ، دہلی، ۱۹۷۲ء۔
۱۷۵۔ مقدمہ آیات خلافت، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ۔
۱۷۶۔ مقدمہ ترجمہ قرآن مجید (۱) مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ، نولکشور لکھنؤ ۱۹۵۰ء۔
۱۷۷۔ مقدمہ ترجمہ قرآن مجید (۲) مولانا عبدالمومن صاحب فاروقیؒ، دہلی، ۱۹۵۷ء۔
۱۷۸۔ مکتوبات امام ربانیؒ، دفتر اوّل ودوم، نولکشور لکھنؤ۔
۱۷۹۔ مکتوبات امام ربانیؒ، دفتر دوم حصہ ششم، مترجمہ مولانا انوار احمد، انارکلی لاہور۔
۱۸۰۔ مکتوبات حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ہنسویؒ (قلمی) مملوکہ راقم الحروف۔
۱۸۱۔ من لایحضرہ الفقیہ، جلد اوّل، شیخ صدوق، مطبع جعفریہ لکھنؤ، ۱۳۰۷ھ۔

۱۸۲۔ مناظرہ اور اظہار حق (نو جلدوں میں) حضرت لکھنویؒ مشمولہ النجم لکھنؤ۔
۱۸۳۔ مناظرہ بھیمڑی، شبیر احمد راہی ایم۔اے، ربانی بکڈپو، دہلی۔
۱۸۴۔ مناظرہ کچھوچھہ، مشمولہ نصرت آسمانی بر فرقہ رضا خانی، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ ۱۹۲۷ء۔
۱۸۵۔ مولانا عبید اللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات وسیاسی افکار، مولانا محمد سرور، لاہور، ۱۹۶۷ء۔
۱۸۶۔ مولوی اعجاز حسین کا جواب، حضرت لکھنویؒ، دوسرا ایڈیشن، لکھنؤ، ۱۹۴۶ء۔

(ن)

۱۸۷۔ نبوت کی ضرورت، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم لکھنؤ، ۱۳۴۴ھ۔
۱۸۸۔ نزہۃ الخواطر، مولانا حکیم عبدالحی حسنیؒ، جلد ۸، طبع اوّل، حیدر آباد ۱۹۷۰ء۔
۱۸۹۔ نصرت آسمانی بر فرقہ رضا خانی، شیخ عبدالوحید و شیخ محمد زبیر، لکھنؤ ۱۹۲۷ء۔
۱۹۰۔ النصرة الغیبیه علی الفرقة الشیعیه، حضرت لکھنویؒ مطبع مجتبائی لکھنؤ۔
۱۹۱۔ نصرۃ القرآن، حضرت لکھنویؒ، مشمولہ النجم، لکھنؤ۔
۱۹۲۔ نفحۂ عنبریه بذکر میلاد خیر البریه، حضرت لکھنویؒ النجم، لکھنؤ ۱۳۴۵ھ۔
۱۹۳۔ نهایة الخسران لمن ترک القرآن، حضرت لکھنویؒ مشمولہ، ماہنامہ انوار مدینہ لاہور ۱۹۸۵ء۔
۱۹۴۔ نہج البلاغہ، مترجم، پانچواں ایڈیشن، شیخ غلام علی اینڈ سنس، لاہور، کراچی ۱۹۷۸ء۔

(و)

۱۹۵۔ وصّاف، اُردو ترجمہ الانصاف شاہ ولی اللہؒ، مترجمہ حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ۔

(ہ)

۱۹۶۔ ہدایت بجواب غوایت، دو حصوں میں، حضرت لکھنویؒ، لکھنؤ، ۱۳۳۳ھ۔
۱۹۷۔ ہزیمت شیعیان پنجاب، مولانا ابوالقاسم محمد حسین، لکھنؤ۔

(ی)

۱۹۸۔ یادایام، مولوی ضیاءالحسن علوی کاکوروی، الہ آباد، ۱۹۵۹ء۔
۱۹۹۔ الیانع الجنی فی اسانید شیخ عبدالغنیؒ، علامہ محسن ترہتی، دہلی، ۱۹۴۹ء۔

200. The History of India - As told by its own Historians, with referen_e to Futuhat-e-Firoz Shahi, Vol. III, Elliot & Dowson, Calcutta, 1953.
201. Separatior Among Indian Muslims - The politics of the United Prc vince's Muslims, (1860 - 1923), by Francis Robinson Cambridge University Press, 1974

اخبارات و رسائل

۱۔ اخبار ''آفتاب''، لکھنؤ (روزنامہ و سہ روزہ)، ۱۵/مارچ ۱۹۳۸ء، یکم اپریل ۱۹۳۸ء، ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۸ء، ۲۳/نومبر ۱۹۳۸ء، ۳۱/مارچ ۱۹۳۹ء، ۲/مئی ۱۹۳۹ء، یم جولائی ۱۹۳۹ء، ۲۵/ستمبر ۱۹۳۹ء۔
۲۔ ماہنامہ ''الاصلاح''، لاہور، ۱۸/اگست ۱۹۳۹ء۔
۳۔ ماہنامہ ''انوارِمدینہ'' لاہور، جنوری-فروری ۱۹۸۵ء، دسمبر ۱۹۸۶ء۔
۴۔ ''اودھ اخبار''، لکھنؤ، ۱۲/نومبر ۱۹۳۸ء۔
۵۔ اخبار ''اہل حدیث'' امرتسر (ہفت روزہ)، ۱۷/دسمبر ۱۹۲۶ء۔
۶۔ ماہنامہ ''البدر''، کاکوری (لکھنؤ)، جولائی-اگست ۱۹۸۱ء، جولائی-ستمبر ۱۹۹۴ء۔
۷۔ ماہنامہ ''برہان'' دہلی، ۱۹۷۵ء۔
۸۔ ''الجمعیۃ'' دہلی (ہفت روزہ)، اکتوبر ۱۹۹۵ء۔
۹۔ اخبار ''حرم''، لکھنؤ (ہفت روز)، ۱۷/جون ۱۹۶۳ء، ۲۶/نومبر ۱۹۶۳ء، ۲۶/مئی ۱۹۶۴ء، ۲۶/جولائی ۱۹۶۴ء۔
۱۰۔ ماہنامہ ''الحق'' آکوڑہ خٹک صوبہ سرحد (پاکستان)، نومبر ۱۹۷۸ء۔
۱۱۔ ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند، جنوری ۱۹۲۷ء، جولائی ۱۹۴۵ء، مارچ ۱۹۹۳ء۔
۱۲۔ ماہنامہ ''الداعی'' لکھنؤ، ربیع الاوّل ۱۳۵۹ھ، جمادی الاخریٰ ۱۳۵۹ھ، ذیقعدہ ۱۳۵۹ھ،

جمادی الاوّل ۱۳۶۱ھ۔
۱۳۔ ماہنامہ ''دلگداز'' لکھنؤ، ۲۶؍نومبر ۱۹۲۶ء۔
۱۴۔ اخبار ''زمیندار'' لاہور، ۱۷؍اکتوبر ۱۹۳۶ء۔
۱۵۔ اخبار ''سچ'' لکھنؤ، ۱۵؍نومبر ۱۹۲۶ء۔
۱۶۔ اخبار ''سرفراز'' لکھنؤ، ۹؍فروری ۱۹۴۱ء۔
۱۷۔ روزنامہ ''سیاست'' لاہور، ۳۱؍جولائی ۱۹۲۹ء۔
۱۸۔ ماہنامہ ''الشمس''، کھجوہ (سیوان، بہار) نمبر ۱۲، جلد ۸، ۱۹۱۳ء۔
۱۹۔ ماہنامہ ''صحیفۂ رحمانیہ''، مونگیر (بہار)، ۱۳۲۵ھ۔
۲۰۔ ماہنامہ ''فاران''، کراچی، جولائی ۱۹۶۲ء۔
۲۱۔ ماہنامہ ''فکرونظر'' علی گڑھ، ناموران علی گڑھ نمبر حصہ دوم۔
۲۲۔ ماہنامہ ''الفرقان''، بریلی/لکھنؤ، ۱۹۶۱ء، مئی ۱۹۶۲ء، اپریل ۱۹۷۷ء، مئی ۱۹۷۷ء۔
۲۳۔ ماہنامہ ''القاسم''، دیوبند، جمادی الاوّل ۱۳۴۵ھ۔
۲۴۔ روزنامہ ''قومی آواز''، نئی دہلی، ۱۶؍اگست ۱۹۸۷ء۔
۲۵۔ ''المآثر'' (سہ ماہی)، مئو (یوپی)، شمارہ ۱، جلد ۸۔
۲۶۔ اخبار ''مدینہ''، بجنور (یوپی) ۱۳؍جون ۱۹۳۶ء، ۱۳؍جون ۱۹۳۹ء۔
۲۷۔ ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۲۶ء۔
۲۸۔ ماہنامہ ''مناقب''، بھکر (پاکستان)، نومبر ۱۹۸۷ء۔
۲۹۔ پندرہ روزہ ''نشانِ منزل''، بھوپال، ۱۵؍اگست ۱۹۷۰ء۔
۳۰۔ ''النجم''، لکھنؤ (ماہنامہ، پندرہ روزہ، سہ روزہ)، ۱۴؍رمضان ۱۳۲۲ھ، ۲۱؍رمضان ۱۳۲۲ھ، ۷؍شوال ۱۳۲۲ھ، ۱۴؍شوال ۱۳۲۲ھ، ۱۴؍ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ، ۷؍محرم ۱۳۲۳ھ ۲۱؍جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ، ۷؍رجب ۱۳۲۳ھ، ۲۱؍صفر ۱۳۲۶ھ، ۲۸؍صفر ۱۳۲۶ھ، ۲۱؍جمادی الاولیٰ ۱۳۲۶ھ، ۲۱؍رمضان ۱۳۲۶ھ، ۱۴؍شوال ۱۳۲۶ھ، ۷؍ذیقعدہ ۱۳۲۶ھ ۲۸؍ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ، ۷؍محرم ۱۳۲۷ھ، ۲۱؍محرم ۱۳۲۷ھ، ۷؍ربیع الاوّل ۱۳۲۷ھ ۲۸؍ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ، ۱۴؍ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ، ۲۱؍ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ، ۲۸؍ذی الحجہ